علم الانسان ما لم يعلم

١٣٣٩

کتبخانہ
جامعہ ملیہ اسلامیہ
دہلی

شعبہ ۵۱۰
شمارہ ۱۲ س
عدد داخلہ ۱۸۰۴۹

کتب خانہ جامعہ ملیہ اسلامیہ
جامعہ نگر دہلی



۱۸۰۴۹

ملنے کا پتہ:- کتب خانہ دار البلاغ - محمد نگر میو روڈ - لاہور

اُردو کی منتخب کتابیں

سیاسی کتابیں

(۱) غبارِ خاطر۔ از ابوالکلام آزاد (آرڈر بُک کیجئے)
(۲) مضامین ابوالکلام آزاد اوّل۔ قیمت للعہ
(۳) ؍؍ ؍؍ دوم ؍؍ للعہ
(۴) مضامین البلاغ ۔۔ ؍؍ سے
(۵) اٹھارہ مہینے ہندوستان میں جواہر لال ؍؍ ہے
(۶) تاریخ آزاد ہند فوج۔ امداد صابری ؍؍ سے
(۷) سرخ چین کا رہنما۔ اسرار احمد ؍؍ سے
(۸) سٹالن۔ از آصف علی بیرسٹر ؍؍ للعہ
(۹) جواہر لال کی کہانی۔ ۔۔ ؍؍ عہ
(۱۰) ہمارے ہندوستانی مسلمان۔ ؍؍ عا

ادبی کتابیں

(۱) شبلی کا مرتبہ اُردو ادب میں قیمت سے
(۲) مقالات اسلم جیراجپوری۔ ؍؍ عا
(۳) جمالیاتی شاعری۔ ۔۔ ؍؍ ۱۴
(۴) خمارستان۔ ۔۔ ؍؍ عا

ناول و افسانے

(۱) شمع۔ اے آر خاتون۔ قیمت صہ
(۲) شمیم۔ فیاض علی۔ ؍؍ سے
(۳) ماہِ درخشاں۔ مسز احمد علی سے
(۴) واردات پریم چند۔ قیمت عا
(۵) بیوہ۔ ؍؍ ؍؍ ؍؍ عا
(۶) آخری تحفہ۔ ؍؍ ؍؍ ؍؍ عا
(۷) موجِ نیل۔ زین العابدین۔ ؍؍ عا
(۸) چوراہا۔ قیسی رامپوری ؍؍ عا
(۹) ہما خانم۔ سجاد حیدر۔ ؍؍ عا
(۱۰) نئے محل۔ ظفر قریشی۔ ؍؍ عا

نظم

(۱) مسدس حالی صدی اڈیشن۔ قیمت عا
(۲) اُردو شاعروں کا البم۔ ؍؍ سے
(۳) جمالیاتی شاعری۔ ؍؍ عا
(۴) آبگینے۔ ۔۔ ؍؍ عہ

مذہبی کتابیں

(۱) اسلام کیسے شروع ہوا۔ قیمت ہے
(۲) اسلام کیسے پھیلا اوّل۔ ؍؍ سے
(۳) ؍؍ ؍؍ ؍؍ دوم۔ ؍؍ عہ
(۴) دربارِ رسولؐ کے فیصلے۔ ؍؍ للعہ
(۵) نظریہ توحید۔
(۶) شاہ ولی اللہ کا فلسفہ۔ ؍؍ عا
(۷) افادات شاہ ولی اللہ۔ ؍؍ عہ
(۸) کتب سماوی پر ایک نظر۔ ؍؍ عا
(۹) لغات القرآن اوّل۔ قیمت ہے
(۱۰) ؍؍ ؍؍ دوم۔ ؍؍ للعہ

مختلف کتابیں

(۱) لندن سے آداب عرض۔ قیمت عہ
(۲) بچوں کا لندن۔ ؍؍ عہ
(۳) آبجیات کے لطیفے۔ ؍؍ عہ
(۴) ہوائی حملے۔ ؍؍ ۱۲

بچوں کی کتابیں

نظم

(۱) اسلامی نظمیں۔ شفیع الدین نیّر۔ قیمت ۱۰
(۲) وطنی نظمیں۔ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ۱۳
(۳) بچوں کا تحفہ اوّل ؍؍ ؍؍ ۸
(۴) ؍؍ ؍؍ دوم ؍؍ ؍؍ ۸

کہانیاں

(۱) چنن منن۔ شفیع الدین نیّر قیمت ۳
(۲) میاں مٹھو ؍؍ ؍؍ ؍؍ ۵
(۳) جادو کی کتاب۔ ۔۔ ؍؍ ۵
(۴) بلّی حج کو چلی۔ ۔۔ ؍؍ ۳

ملنے کا پتہ

اُردو کتابوں کا سب سے بڑا مرکز	حالی پبلشنگ ہاؤس (ای) دہلی؛	بیس روپے کی کتابیں منگانے پر محصولڈاک معاف۔

کتب خانہ جامعہ ملیہ اسلامیہ
١٨٠۴٩

ادارہ
شاہد احمد دہلوی
محمد حسن عسکری

دہلی۔ قرولباغ

جرعات

سالانہ چندہ چھ روپے
ششماہی چندہ نہیں لیا جاتا
سالنامہ تین روپے

جلد ٣٣ | ساقی سالنامہ دہلی، بابت ماہ جنوری سنہ ١٩۴٦ء | نمبر ١

معذرت

افسوس ہے کہ سالنامہ کے لئے جتنے مضمون منتخب کئے گئے تھے اُن میں سے چند شریک نہیں ہوسکے۔ ساقی نادم اور اپنی تنگ دامانی کا شاکیٔ سنج ہے ؎

دامانِ نگہ تنگ وگُلِ حُسنِ تو بسیار
گلچینِ تو از تنگیٔ دامانِ گلہ دارد

باقی ماندہ مضامین ساقی کی آئندہ اشاعتوں میں پیش کئے جائیں گے۔ گو ادائے سپاس کا یہ ایک موزوں پیرایہ نہ ہوگا۔ تاہم اُمید ہے کہ محترم خواتین و حضرات شاکی ہوکر ساقی کو مزید شرمندہ نہ فرمائیں گے۔

(ادارۂ ساقی)

خانم

مرزا عظیم بیگ چغتائی کی وہ ہنسانے والی کتاب، جس میں دیورانی جٹھانی کی خندہ خیز نوک جھونک اور خانم اور خانم کے سادہ لوح شوہر کے پُرلطف قصّے درج ہیں۔ سارے گھر کے پڑھنے کے لائق کتاب۔ قیمت چار روپیہ! اپنے شہر کے کُتب فروشوں یا ساقی بکڈپو۔ دہلی سے خریدیئے!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شاہد احمد دہلوی

نگاہِ اوّلین

الحمدللہ ساقی نے اپنی زندگی کے سولہ سال پورے کئے اور اب سترھویں میں قدم رکھ رہا ہے۔ ۴۵ء میں رسائل نے فراغت کا سانس لیا۔ حکومت نے اخباری کاغذ کی ماہوار مقدار میں اضافہ کر دیا اور ساقی اس لائق ہوا کہ "ظرافت و طنز نمبر" اور "افسانہ نمبر" پیش کر سکے۔ اب نئے سال کا تحفہ سالنامہ کی صورت میں پیش کر رہا ہے۔ سالنامہ کا کام اکتوبر سے شروع کر دیا گیا تھا۔ کاغذ کی فراوانی اور چھاپہ خانوں کی کمی نے پبلشرز کے لئے ایک ایسا پیچیدہ سوال پیدا کر دیا ہے جس کا کوئی حل نہیں ہے۔ پرانی مشینیں کام کی زیادتی کی وجہ سے ٹوٹنے لگیں۔ نئی مشینیں آتے آتے آئیں گی۔ ابھی تو مشین بنانے والے کارخانے بھی نہیں بنے۔ مسابقت نے چھاپہ خانوں میں اندھیر نگری کو جنم دیا۔ چنانچہ چار گنی اجرت پر بھی کام نہیں ہو سکتا کیونکہ چھ گنی اجرت کا کام ہو رہا ہے۔ ہم نے اسی اندیشے کی وجہ سے سالنامہ کا کام تین مہینے پہلے شروع کیا تھا مگر وسط دسمبر میں معلوم ہوا کہ پریس نے ایک کاپی بھی نہیں چھاپی۔ وجہ یہ بیان کی گئی کہ مشین ٹوٹی پڑی ہے اور بہتر ہوگا کہ ساقی کسی اور پریس میں چھپوا لیا جائے۔ اس چھاپہ خانے میں ساقی گذشتہ دس سال سے چھپ رہا ہے۔ اب پہلی بار معلوم ہوا کہ ساقی اس مخصوص ٹوٹی ہوئی مشین پر چھپتا تھا اور باقی مشینیں ساقی کے لئے ممنوع ہیں۔ ناچار ایک اور چھاپہ خانے میں پرچہ بھیجا گیا۔ وہاں بجلی گری۔ کمپنی والوں نے کسی وجہ سے پریس کی بجلی کاٹ دی۔ مگر پریس والوں نے ہمت نہ ہاری اور بڑی کوشش اور تن دہی سے سالنامہ چھاپا۔ ہفتہ عشرہ کی تاخیر سے سالنامہ آپ کو انہی مشکلات کی وجہ سے ملا ہے۔

سالنامہ کے مضامین کے متعلق بہت کچھ لکھنے کو جی چاہتا ہے لیکن ساقی کے خوش ذوق ناظرین پر انکا فیصلہ چھوڑا جاتا ہے کیونکہ اصل پسند اور ناپسند انہی کی ہے۔ اور یہی ساقی کا معیار ہے۔

سالنامہ کے لئے جو مضامین جمع کئے گئے تھے اُن میں سے بعض مذکورۂ صدر مجبوریوں کی وجہ سے روکنے پڑے ورنہ سالنامہ بجائے جنوری کے فروری میں شائع ہوتا۔ اس کا ہمیں بہت افسوس ہے اور اس کی معذرت کہیں اور بھی ہم کر چکے ہیں۔ اسے ساقی کی تنگ دلی پر نہیں تنگ دامانی پر محمول کیجئے۔ یہ مضامین فروری کے ساقی میں شائع ہوں گے۔

"ظرافت و طنز نمبر" حسب معمول یکم اپریل کو شائع ہوگا۔ اس کے لئے چند مضامین انتخاب کئے جا چکے ہیں۔ لکھنے والوں کے نام ہیں:- مرزا فرحت اللہ بیگ۔ غلام یزدانی، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور، چیتن آنند، ہرندر ناتھ چٹوپادھیا۔ سعادت حسن منٹو۔ اور کرشن چندر۔ "ظرافت و طنز نمبر" کے مضامین ۱۵ر فروری تک مکمل کر لئے جائیں گے۔ مارچ کے ساقی میں ان کی فہرست پیش کی جائے گی۔

حضرت خواجہ حسن نظامی دلی کی اُن مخصوص ہستیوں میں سے ہیں جنہوں نے اپنی ساری عمر (اپنی بے شمار مصروفیات کے باوجود) اُردو ادب کی خدمت میں صرف کی ہے۔ خواجہ صاحب نے ایک نہایت دلکش طرز تحریر وضع کیا جس کے لوچ اور لچک نے ثابت کر دیا کہ اُردو میں ہر قسم کے خیالات کے اظہار کی کتنی بڑی صلاحیت ہے۔ خواجہ صاحب کے اسلوب بیان نے اُردو کو وہ ہردلعزیزی بخشی جو ابوالکلامی اندازِ تحریر نے اس سے چھین لی تھی۔ خواجہ صاحب نے بولنے اور لکھنے کی زبان کے فرق کو مٹا کر اُردو کی ایسی خدمت کی ہے کہ ان کا نام ہمیشہ مفتخر رہے گا۔ ہمارے علماء نے اُردو کو اتنا مغلق بنا دیا تھا کہ یہ ہمارے دیس کی زبان ہی نہیں معلوم ہوتی تھی۔ خواجہ صاحب نے اُردو کو عربی اور فارسی کی تاخت سے بچایا اور وہ نحیف آواز جو آج سے چالیس سال پہلے ایک شخص نے اُٹھائی تھی آج ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک گونج رہی ہے۔ آسان اُردو یعنی دیس کی عام زبان خواجہ صاحب کی ایک ہی خدمت ایسی ہے کہ انہیں عظمت کا مستحق بناتی ہے۔ حکومت نے انہیں "شمس العلماء" کا خطاب دے کر ان کی صحیح قدردانی کی ہے "حق بہ حقدار رسید"۔ خدا کرے کہ ان کا سایہ اُردو کے سر پر تادیر قائم رہے۔

محمد حسن عسکری

کتب خانہ جامعہ ملیہ اسلامیہ
دہلی - قرولباغ

جھلکیاں

جیمز جوئس!

آج میں نے عجب مسخرگی اختیار کی ہے: ایک مستقل عنوان قائم کر کے مضمون لکھ رہا ہوں، اور وہ بھی جوئس پر۔ یہ ٹھیک ہے کہ جہاں تک جوئس کا تعلق ہے۔ میں بہت سے لوگوں پر کم سے کم ایک بات میں فوقیت رکھتا ہوں ــ میں نے جوئس کی کتابیں پڑھی ہیں۔ اس سے ممکن تھا کہ میں جوئس پر دس بیس صفحے معقولیت کے ساتھ لکھ سکوں لیکن اس کو کیا کروں کہ نئے ادب کی تحریک میں میں بھی شامل رہا ہوں اور اب اس تحریک میں چند سانس اور باقی رہ گئے ہیں ــ وہ بھی اکھڑے اکھڑے۔ یہ سارا ہنگامہ محض بلوغت کا اُبال تھا، اور زمانۂ بلوغت دائمی نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ پچھلے دس سال میں اس تحریک نے جو ادب پیدا کیا ہے وہ صرف انڈر گریجویٹ ادب ہے۔ عصمت چغتائی کے مضمون "دوزخی" کو چھوڑ کر (ایسی ایک آدھ چیز کوئی اور ہو تو اس وقت یاد نہیں آ رہی) اس ادب میں کوئی چیز ایسی ہے ہی نہیں جو سنجیدہ ذوق والے دماغ کو زیادہ دیر تک مصروف رکھ سکے۔ میٹھا برس لگتا ہے تو اسکول کی لونڈیاں تک ایسا ادب پیدا کر لیتی ہیں۔ ادب میں نئے ادیبوں کا بس وہی درجہ ہے جو عاشقی میں انشا کے اس عاشق کا:

کود اترے گھر میں کوئی یوں دھم سے نہ ہو گا　　　جو کام ہوا ہم سے وہ رستم سے نہ ہو گا

یہ شعر میں نے لطیفے کے طور پر نقل نہیں کیا، بلکہ حقیقت ہے۔ نئے ادیبوں اور شاعروں کو واقعی اس دھم سے کودنے ہی پر فخر ہے، اور ان کے نزدیک یہی ادب ہے۔ لیکن دھما چوکڑی کا نتیجہ صرف ایک ہی ہوتا ہے ــ آدمی تھک کے گر پڑتا ہے۔ چنانچہ نئے ادیبوں کو یہی صورتِ حال درپیش ہے۔ اب تو بس گھنّی ہی گھنّی باقی رہ گئی ہے؛ البتہ مدّاحوں نے ضرور انھیں بانس پر چڑھا رکھا ہے۔ خیر میں ادیب و دیب کس بات کا ہوں، نہ خان میں نہ خان کے اونٹوں میں، لیکن چونکہ اس ٹھپے کے ساتھ مضمون لکھنے بیٹھا ہوں، اس لئے ایمانداری کا تقاضا تو یہی ہے کہ میں اعتراف کر ہی لوں۔ حالانکہ یہ وہی بات ہوگی کہ تم کون، میں خواہ مخواہ۔ اپنا حال تو یہ ہے کہ اب میری کھوپڑی میں ایک خیال تک باقی نہیں ہے۔ اب تو میں اس لائق رہ گیا ہوں کہ الٰہ آباد کے علاوہ کسی اور ہندوستانی یونیورسٹی میں مجھے شعبۂ انگریزی کا صدر بنا دیا جائے۔ لیکن چونکہ ابھی میں اپنے آپ سے بالکل مایوس نہیں ہوا اس لئے یہ منصب قبول نہیں کروں گا۔ . . . . اگر سوال محض جوئس کے طالب علموں کو آسانیاں پہنچانے کا ہوتا تو بغیر خیالات کے بھی کام چل سکتا تھا۔ مگر مشکل تو یہ ہے کہ میرے لئے جوئس ایک عجوبہ نہیں ہے۔ بلکہ بیسویں صدی کا سب سے بڑا ادیب۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جوئس کے طریقہ کار اور ٹیکنیک کو سمجھے اور اسے ذہن میں رکھے بغیر اس کی کتابوں سے لطف نہیں اٹھایا جا سکتا۔ لیکن "یولی سیز" کو شائع ہوئے اب پچیس برس کے قریب ہوتے ہیں، اب ٹیکنیک کی تشریحیں لکھنے، اور اسلوبِ بیان کی گتھیاں سلجھاتے رہنے کا تو زمانہ رہا نہیں۔ جو لوگ کل تک جوئس کے مخالف تھے وہ بھی یہ بات تسلیم کرتے جا رہے ہیں کہ اس کا شمار یورپ کی تہذیب کے پیدا کئے ہوئے بڑے سے بڑے آدمیوں میں ہے۔ چنانچہ اب وقت آگیا ہے کہ جوئس کے کارنامہ کو مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے۔ یہاں آ کر بہت سے سوال اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ نہ صرف آرٹ کے بارے میں، بلکہ یورپ کی تہذیب اور ادب کے بارے میں ایسی باتیں ہیں جن کے بارے میں کچھ کہنے کی صلاحیت آج میرے اندر باقی نہیں ہے۔ ایک سال پہلے بہت کچھ کہہ سکتا تھا، بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ گناہ خواہ کسی کا ہو مگر نتیجہ بھگتنے والوں میں اوروں کے ساتھ میں بھی شامل ہوں۔

اس وقت اردو ادب کا ماحول ہی اس قسم کا نہیں، جہاں کسی مصنف کا ذکر کیا جا سکے۔ ــــ New Writing نے لوگوں کا مذاق خراب کر دیا ہے اور کچھ ترقی پسندوں نے ــ کہ اب تو "عظیم" کا لفظ ہمہ شما ہر ایک کے لئے استعمال کیا جانے لگا ہے۔

تعریف کے جتنے لفظ تھے وہ تو دوسروں نے صرفِ زباں کر دیئے۔ اب بتائیے محل کے اندر رہنے والوں کا ذکر میں کن لفظوں میں کروں۔ اب اس کے بعد جوائس کو نثر نگار کہنا درحقیقت اس کی توہین کرنا ہے۔ ایک اور لفظ ہے جس کی بڑی طرح مٹی پلید ہو رہی ہے — آرٹ اور آرٹسٹ۔ بعض شاعر تو اپنی نظموں تک میں اپنے آپ کو آرٹسٹ کے نام سے یاد فرمانے لگے ہیں۔ یہ لفظ اتنا مجبور ہو گیا ہے کہ میں اسے استعمال کرتے ہوئے کچھ جھجکتا ہوں۔ آرٹ کو تو ان حضرات نے بالکل دال روٹی بنا ڈالا ہے، حالانکہ آرٹ کی تخلیق وہ ہیبت ناک ذمہ داری ہے جس سے بچنے کیلئے لوگ، بقول مارسل پروست فوجی لڑائیوں میں شامل ہو کر جان دے دیتے ہیں، اور شاید اسی کے لئے فراقؔ نے کہا ہے:

حیاتِ نو سی جو پاتے ہیں لوگ اے ساقی   یہ کون درد اٹھاتے ہیں لوگ اے ساقی

کم سے کم میں ایسے ماحول کو اپنے لئے خوشگوار نہیں پاتا۔ جہاں لوگ یہ جاننے کی بھی زحمت گوارا نہیں کرتے کہ کس چیز کی عزت کی جائے اور کس چیز کی نہ کی جائے، جہاں کوئی چیز پاکیزہ اور مقدس نہ رہی ہو بلکہ ابتذال میں تبدیل ہو گئی ہو۔ میں اب بھی آرٹ برائے آرٹ کا قائل ہوں۔ لیکن اس بوالہوسی کے زمانہ میں تو میں چیسٹرٹن کا نعرہ اختیار کرنا چاہتا ہوں: *"No art for God's Sake."*

بہرحال میں نے مار پیٹ کے اپنے آپ کو جوائس پر کچھ لکھنے کیلئے تیار کیا ہے۔ جو کچھ میں لکھوں گا وہ بالکل ذاتی اور شخصی تعبیر ہوگی۔ یہ میری رائیں نہیں ہونگی بلکہ محض تاثرات۔ نہ میرا کوئی نقطۂ نظر ہے۔ اگر میرا کوئی "نقطۂ نظر" قائم ہو گیا تو میں اُسے اپنی سب سے بڑی ناکامیابی سمجھوں گا۔ اگر میرا کوئی "نقطۂ نظر" ہوتا بھی تو مجھے اُسے "عام" کرنے کی کوئی فکر نہ ہوتی۔ میں کسی مسئلے میں بھی کسی کو قائل کرنا نہیں چاہتا۔ اسی لئے میں غیر منطقی باتیں کرنے سے نہیں ڈرتا۔ بعض وقت تو بحث کرنے اور دوسروں کو قائل کرنے سے زیادہ مبتذل بات مجھے اور کوئی نظر نہیں آتی۔ جوائس نے ایک جملہ میں میرے لئے زندگی کا لائحہ عمل مقرر کر دیا ہے:

"He could not strive against another. He knew his part."

آدمی کو صرف ان چیزوں کے متعلق بحث کرنی چاہیئے جن سے قلبی تعلق یونہی ہلکا سا ہو۔ "یولی سیز" میں ایک مقام بہت بلند آتا ہے۔ یہاں پہنچ کر مجھے کچھ وجد سا آنے لگتا ہے۔ حالانکہ اس کے متعلق جوائس کے نقادوں نے کچھ نہیں لکھا۔ اسٹیون شیکسپیئر کے متعلق عجیب وغریب نظریئے پیش کر رہا ہے۔ اور اس نے سب بحث کرنے والوں کو زچ کر رکھا ہے۔ آخر ایک آدمی پوچھتا ہے: "کیا واقعی تمہارا ان سب باتوں پر پورا یقین ہے؟" اسٹیون جواب دیتا ہے: "نہیں، ذرا بھی نہیں۔" اس جملہ میں فن کار بحیثیت خالق کے اپنی پوری قدرت کے ساتھ نظر آتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اس جملہ پر تو ایک مضمون لکھا جائے . . . . . تو یہ ہے ایک مثالی نمونہ غیر اہم چیزوں کے بارے میں فن کار کے طرزِ عمل کا۔ لیکن جو چیزیں واقعی فن کار کی زندگی کے لئے زبردست اہمیت رکھتی ہیں۔ ان کے بارے میں دوسروں سے بحث کرنا کیا معنی۔ اپنے آپ کو قائل کرنا بھی صداقت سے غداری کے مترادف ہے۔ *"Portrait of the Artist"* میں اسٹیون ایک دوست سے کہتا ہے کہ میں مذہبی رسوم پر اعتقاد نہیں رکھتا، اور یہ بات بھی نہیں کہ اعتقاد نہ رکھتا ہوں۔ دوست تجویز کرتا ہے کہ اس قسم کے شکوک پر غلبہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اسٹیون کا جواب ہے: "میں ان پر غلبہ حاصل کرنا نہیں چاہتا۔" . . . . تو مطلب یہ کہ میں فن کار نہ سہی۔ لیکن مجھے لوگوں کو قائل کرنے کا بالکل شوق نہیں۔ اگر میں کبھی بحث کرتا ہوں تو صرف اس وجہ سے کہ مجھے پتنگ اڑانا نہیں آتا۔ چنانچہ میں اس مضمون میں کوئی ایسی بات نہیں لکھوں گا جس سے متعلق مجھے یہ اصرار ہو کہ اگر آپ نے اسے نہ مانا تو نئی دُنیا پیدا نہیں ہوگی۔ زیادہ خطرناک چیز یہ ہے کہ جہاں تک جوائس کا تعلق ہے اپنے دو ایک استادوں کو چھوڑ کر میں ہندستان کے کسی آدمی کی بات سُننے کو تیار نہیں ہوں۔ یہ اپنی علمیت کا غرور نہیں ہے۔ عالم بننے کی مجھ میں اتنی ہی صلاحیت ہے، جتنی ترقی پسندوں میں آرٹ کی اہمیت سمجھنے کی، اور عالم کہلانے کا اتنا ہی اشتیاق ہے جتنا سر پہ دو من بوجھ لاد کے پانچ میل چلنے کی داد پانے کا۔ اگر مجھے غرور ہے تو اپنے تاثرات کا، جو میرے ہیں خواہ تعداد میں چار ہی کیوں نہ ہوں ——— اور میں کسی کی علمیت یا منطق کے رُعب میں آکر انھیں بدلنے پر تیار نہیں ہوں۔

اگر میں جوائس پر ایبا نوٹ کے عاشق ہوا ہوں تو اس کی وجہ بھی تاثراتی ہے۔ جس وقت تک میں صرف منطق سے کام لے رہا تھا میں جوائس کے خلاف تھا۔ بلکہ "یولی سیز" کو بے معنی ثابت کرنے کے لئے میں نے ایک بڑی عمدہ دلیل بھی ڈھونڈی تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ گورکی

نے بھی جوئس پر بھی الزام لگایا تھا۔ میں یہ ثابت نہیں کر رہا ہوں کہ میرا دماغ بھی بڑے آدمیوں کے دماغ کی طرح کام کرتا ہے۔ (اول تو مجھے گورکی کے بڑے ہونے ہی میں شک ہے)۔ میں صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ جب بڑے آدمی اپنی عقل اور منطق کے قائل ہو جاتے ہیں تو وہ بھی اسکول کے لڑکوں کی سی باتیں کرنے لگتے ہیں۔ . . . جوئس کی تعریفیں پڑھ کر بھی میں بدگمان ہی رہا۔ حالانکہ ہربرٹ ریڈ نے جوئس کا مقابلہ شیکسپیر سے کیا تھا۔ لیکن ہربرٹ ریڈ صاحب کو کسی کی تعریف کرتے کرتے جوش آتا ہے تو پھر وہ شیکسپیر سے ادھر نہیں رُکتے۔ بہرحال جب میں نے آخر کار "یولی سیز" پڑھنے کیلئے اٹھائی تو معلوم ہوا کہ آج تک میں نے کوئی ناول اتنی دلچسپی سے پڑھا ہی نہیں تھا۔ یہاں تک کہ جن حصوں کو جوئس کے مداحوں نے بھی خشک سمجھا ہے ان میں سے بھی مجھے انتہائی لطف آیا۔ اس کے بعد مجھے جوئس کی تخلیقی صلاحیت اور اس کی اصلیت میں شک شبہ کی گنجائش رہی نہیں۔ لیکن اب مجھے دو رائیں یاد آئیں۔ A. E. نے کہا ہے کہ "میں ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کر سکا کہ جوئس چہ بچہ ہے یا چشمہ"۔ مڈلٹن مری نے لارنس اور جوئس کا موازنہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ لارنس کو پڑھنے سے نئی زندگی ملتی ہے، لارنس زندگی کا سرچشمہ ہے جوئس بنجر میدان ہے۔ ہاں، تیسری رائے فورسٹر کی تھی۔ وہ یہ کہ جوئس نے کائنات کو گندگی سے ڈھک دیا ہے۔ میرا ذاتی تجربہ یہ تھا کہ کائنات کی تعریف جس طرح جوئس نے کی ہے بیسویں صدی میں کسی نے بھی نہیں کی؛ زندگی کا جو احساس اور جو تر و تازگی کم سے کم مجھے جوئس کے یہاں ملی ویسی لارنس کے یہاں بالکل نہیں۔ اب سوال یہ تھا کہ اپنے تاثرات کو جھٹلاؤں یا ان متصوفین کی رائے کا احترام کروں۔ لیکن میرے لئے اپنا ذاتی تاثر E. A. کی روحانیت سے زیادہ حقیقی بھی تھا۔ اور عزیز بھی۔ اس لئے کان دبا کے اور لوگوں کی رائے مان لینے کی بہ نسبت میں نے اپنے تاثر کو عقلی رنگ دینے کی زیادہ کوشش کی۔

جوئس کے یہاں زندگی کا احساس لارنس سے زیادہ گہرا اور حقیقی ہے۔ کیونکہ جوئس کی تمام تصانیف پر ایک بوجھل افسردگی چھائی ہوئی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں المناک آدمی کو عظیم الشان آدمی سمجھتا ہوں۔ جوئس کی افسردگی رومانی افسردگی سے بالکل مختلف چیز ہے۔ کیونکہ یہ افسردگی اخلاقیاتی ہے۔ عیسوی دینیات کی اصطلاح استعمال کرنے کا شوق ہو تو کہہ سکتے ہیں کہ جوئس کو ابتدائی گناہ پر یقین ہے۔ دوسرے لفظوں میں، جوئس اس وجہ سے افسردہ نہیں کہ وہ "ناممکن نسائی پیکر" اس کے ہاتھ نہیں آتا، یا مستقبل دور سے اس کا مذاق اڑاتا رہتا ہے؛ وہ افسردہ ہے، کیونکہ اسے انسان کے نامکمل ہونے کا بڑا المناک احساس ہے۔ جب جوئس اس نامکمل انسان کو قبول کرکے انسانی زندگی کے حُسن کی تعریف کرتا ہے تو یقیناً اس کی تعریف لارنس کے نغمے سے زیادہ بامعنی اور اہم ہوتی ہے۔ اور عظیم تر بھی۔ ابھی تھوڑے دن ہوئے کسی رومن کیتھلک مصنف کی کتاب نکلی ہے جس نے یورپ کے ادیبوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے ——————

—————— پہلے حصہ میں تو ویلز اور برنرڈ شا جیسے لوگ ہیں جو آزادی پسند انسان کا نظریہ پیش کرتے ہیں۔ دوسرے طبقے میں روسو اور لارنس قسم کے لوگ ہیں جو فطری انسان کے قائل ہیں۔ تیسرے طبقے والے مثلاً ایلیٹ اور جوئس انسان کو نامکمل مانتے ہیں؛ رومن کیتھولک مذہب کے نقطۂ نظر سے تو یہ آخری نقطۂ نظر سب سے زیادہ صحیح ہوگا ہی، لیکن مجھ جیسے کمزور انسان کو بھی لارنس کی ڈینگیں کچھ زیادہ خوش نہیں آئیں۔ ویسے بھی اپنے ذاتی تجربات کے پیش نظر چیسٹرٹن کی طرح میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ انسان کی فطرت کے متعلق اگر کوئی نظریہ امید افزا اور بہت افزا ہے تو یہی ابتدائی گناہ والا۔ اور پھر دیکھیے تو لارنس نے انسانی زندگی کی تعریف کی ہی کب ہے —— یعنی ہم جن معنوں میں اس لفظ کو سمجھتے ہیں۔ لارنس "کاربن ڈائی اوکسائڈ" کا اتنا گرویدہ تھا کہ اُسے تو یہ بھی نہیں پتہ تھا کہ "ہیرے" اور "کوئلے" میں کیا فرق ہوتا ہے۔ "زندگی کے شعلے" کی حمد و ثنا اور تقدیس تو تھوڑی بہت ہر ایک کر سکتا ہے، گو موت میں پیدا ہونے والے انسان کی تعریف میں دو پہلے کرنا کی کوشش کرنے تو پتہ چلتا کہ کتنے پانی میں ہیں۔

لیکن جوئس نے زندگی کو سب سے کم عزیز آدرشی شکل میں قبول کیا ہے —————— یعنی میرم بلوم کی شکل میں۔ یہاں ایک نکتہ قابل لحاظ ہے۔ جوئس "یولی سیز" کے آخری چالیس صفحوں میں Pagan بن گیا ہے۔ اور اخلاقیات سے بلند ہو گیا ہے، لیکن صرف ایک ایسی شخصیت کے سلسلہ میں جو زندگی کو بے چون و چرا کلیتاً قبول کر لیتی ہے، جو سر تا پا اثبات ہے، جو بالکل اسی طرح زمین کی خود رَو پیداوار ہے جیسے جبرالٹر کے پھول۔ لیکن شاید جوئس کو Pagan بنانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ عیسائیت کی روح اتنی تنگ نظر نہیں ہو سکتی کہ مولی بلوم کو رد کر دے۔ آخر چوسر نے بھی تو اس کی بڑی بہن باتھ کی خاتون کو قبول کر لیا تھا۔ . . جوئس کے اندر یہ اخلاقی جدوجہد اس وقت

شروع ہوتی ہے جب کوئی اپنے آپ کو زندگی کے سپرد کر دینے کے بجائے دماغ سے زندگی کا مقابلہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ ذہنی مدافعت جتنی زیادہ شدید ہوگی جوشؔ کے اندر اخلاقی کشمکش بھی اتنی ہی زیادہ شدید اور المناک ہوگی۔ اس کشمکش کا مظہر جوشؔ کی کتابوں میں فنکار کی شخصیت ہے۔ اسی شخصیت کے سلسلہ میں جوشؔ یہ سوال پوچھتا ہے کہ کائنات اور زندگی کے متعلق انسان کا رویّہ کیا ہونا چاہیئے، کیونکہ فن کار بھی ایک حد تک اپنے آپ کو زندگی کے سپرد کر دیتا ہے مگر اس کا کام محض مفعولیت نہیں، فن کار خالق بھی ہے۔ اور اُسے عموماً اپنی قدرتوں کا احساس اور ان پر فخر بھی ہوتا ہے۔ لیکن اپنی تمام صلاحیتوں کے باوجود فن کار بھی آخر انسان ہوتا ہے اور انسانی زندگی کی پابندیوں میں گرفتار۔ فن کار انسان کی قوت اور انسان کی کمزوری دونوں کا اجتماع ہوتا ہے۔ انسان کی ان دونوں حیثیتوں کی کشمکش جیسی شدید اور المناک کیفیت فن کار کے اندر اختیار کر سکتی ہے وہ اوروں کے اندر ممکن نہیں ــ غالباً فاتحوں اور قوم کے معماروں کے اندر بھی نہیں۔ اسی طرح کائنات میں انسان کی حیثیت کا سوال اوروں کیلئے ایسی ہولناک حیثیت نہیں رکھتا جیسی فن کار کے لئے۔ جوشؔ نے فن کار کی شخصیت کے جمال اور ہولناکی دونوں کا اظہار جس خوبصورتی اور درد کے ساتھ کیا ہے ویسا مشکل ہی سے کہیں اور ملے گا۔ ایک طرف تو فن کار کی ہولناکی دیکھیئے، وہ زیادہ سے زیادہ زندگی حاصل کرنے کے لئے بےچین ہے مگر زندگی اس سے دامن چھڑاتی ہے۔ "Portroit" میں اسٹیون کو حیرت اور افسوس ہے کہ اسے کسی عورت کی آنکھوں نے دعوت نہیں دی۔ مگر یہاں ذرا سے انتباہ کی ضرورت ہے۔ اسٹیون کی اس حسرت کو اُردو کے اکثر نئے افسانہ نگاروں کے آدرش سے گڈمڈ نہیں کرنا چاہیئے۔ اُردو کے بہت سے افسانوں کی تہ میں یہ جھلکتا ہے کہ افسانہ نگار کسی ایک خاص عورت یا پچاس عورتوں کے ساتھ نہیں سو سکا۔ لیکن اگر ہم کسی ادیب کا احترام کرتے ہیں تو عورتوں کے ساتھ سونے کی خواہش کرنے یا نہ کرنے کی وجہ سے نہیں بلکہ ان کے وزن کی وجہ سے۔ کم سے کم مجھے کسی کی خواہشوں پر ناک بھوں چڑھانے کا حق نہیں پہنچتا۔ میں تو صرف یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ کوئی آدمی اپنی خواہشوں کو، وہ بُری ہوں یا بھلی اس سے مجھے مطلب نہیں، کیا بناتا ہے۔ اگر بڑے فن کار کے اندر ایسی خواہشیں اور حسرتیں پیدا ہوتی بھی ہیں تو وہ ان کا اظہار ایسے ان گھڑ طریقے سے نہیں کرتا۔ وہ ایلیٹ کی طرح کہتا ہے:

The smell of hyacinths across the garden
Recalling things that other people have desired.

جہاں تک جوشؔ کا تعلق ہے اس نے اپنی اور ہر بڑے فن کار کی ترجمانی خود کر دی ہے۔ اسٹیون کا دوست پوچھتا ہے: "کیا تم کنواری کی عصمت لے سکتے ہو؟" اسٹیون بڑی ملائمت سے جواب دیتا ہے: "معاف کرنا کیا یہ اکثر نوجوانوں کی خواہش نہیں ہوتی؟" اگر فن کار آنکھوں کی دعوت کی تمنا کرتا ہے تو اس کا مطلب صرف اتنا ہے کہ اُسے اوروں سے زیادہ زندگی چاہیئے۔ ایک اور بڑے فن کار نے اس مسئلہ کو زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے:

نہ قرب سے ہمیں مطلب، غرض نہ دوری سے
نہ جانے کیوں ہمہ تن انتظار ہیں ہم لوگ

یہ تو تھا فن کار کی زندگی کا ایک ناکام لمحہ ــ جسے اپنی تخلیقات میں اسے کارآمد بنانا ہے، اب فن کار کی فتح بھی دیکھیئے۔ اُسی شیکسپیئر والی بحث میں اسٹیون نے سب کا قافیہ تنگ کر دیا ہے، اور کسی کو کوئی بات نہیں سوجھ رہی۔ اس موقع پر اسٹیون اپنے آپ سے کہتا ہے:

Why am I Condemned to ds all this?

اس ایک جملہ میں جو درد اور کرب بھرا ہوا ہے وہ ترقی پسندوں یا سیاست میں غرق رہنے والوں کی سمجھ میں آنے والی بات نہیں۔ اب فن کار کی مضبوطی، قوت اور خود اعتمادی بھی دیکھیئے۔ ملک ہو، یا قومیت، یا مذہب، اسٹیون کسی کی بھی خدمت کرنے کو تیار نہیں۔ وہ اکیلا رہنے سے نہیں ڈرتا، نہ غلطی کرنے سے، چاہے غلطی ابد تک ہی برابر کیوں نہ چلی جائے۔ اس خواب کے جسے وہ وجود میں لانا چاہتا ہے [illegible] مگر کسی قسم کا سمجھوتہ منظور نہیں۔ یہ طرزِ عمل فن کار کے لئے ضروری ہے اور اس کے بغیر [illegible] ممکن بھی نہیں۔ خود جوشؔ کو بڑے سے بڑے [illegible] کرنے میں مزا آتا تھا حالانکہ جیسے میں صدی

ہیں اس سے زیادہ منکسر المزاج مصنف بہت ہی کم ہوں گے۔ جوئس نے بیسویں صدی کے فن کار کے لئے عزلت کو لازمی تو مانا ہے لیکن اس کی عظمت اس بات میں ہے کہ وہ صرف اپنے ماحول میں گھٹ کر نہیں رہ گیا۔ اس نے فن کار کو وسیع تر انسانی زندگی اور کائنات کے مقابل رکھ کر بھی دیکھا ہے۔ اور اعتراف کر لیا ہے کہ اپنے دماغ پر عزلت بھی گناہ کبیرہ ہے۔ اس نے "یولی سیز" کے متعلق خود اپنے ایک دوست سے کہا تھا کہ جیسے جیسے کتاب آگے بڑھے گی بلوم اور کرداروں پر غالب آتا چلا جائیگا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ عیز فن کار یا عام آدمی اخلاقی اور روحانی اعتبار سے فن کار پر فتح پائیگا۔ بوژوا ماحول میں تکبر تخلیق کی لازمی شرط سہی لیکن اس گناہ کا مرتکب ہونے کے بعد فن کار بھی اس کے نتائج سے نہیں بچ سکتا۔ اُسے قابیل کی طرح یکہ و تنہا رہنا پڑے گا۔ اپنی خودی کو زندگی سے زیادہ مقدس سمجھنے والوں کے لئے دروازے نہیں کھلیں گے، انھیں باہر ہی کھڑا رہنا پڑے گا۔ جوئس نے فن کار کی شخصیت کی یہ کش مکش صرف ایک جملہ میں بڑی خوبصورتی سے بیان کی ہے۔ اس کی عظمت بھی اور اس کی کوتاہی بھی، یہ دونوں چیزیں ایک فقرے میں آگئی ہیں :

Do you hold yourself then for some god in the manger that you will neither serve nor let serve. pray nor let pray.

یہاں ذرا سی وضاحت کی ضرورت ہے۔ انگریزی کا محاورہ ہے: "Dog in the manger" جسے جوئس نے تبدیل کیا ہے۔ دوسری بات یہ کہ حضرت عیسیٰ آخور میں پیدا ہوئے تھے . . . . فن کار کی شخصیت نے زندگی کے مقابلہ میں اپنی شکست کا مکمل اقرار جوئس کی آخری کتاب کے آخری صفحہ پر کیا ہے۔ اس عبارت کا درد سجات کی رومن کیتھولک دعاؤں کے مقابلہ کا ہے: دو چار جملے دیکھئے :

How small it's all; .... I thought you were all glittering with the noblest of carriage. You are only a bumpkin. I thought you the great in all things, in guilt and in glory. You are but a puny ..... I am passing out..... They will never see. Nor know. Nor miss me. And it's old and old it's sad and old.

فن کار کی شخصیت کی ناکامی دکھانے کے باوجود جوئس کی کتابوں کا آخری تاثر یاس انگیز نہیں ہوتا۔ بلکہ صحیح معنوں میں *Katharsis* کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ یہ قرار پیدا کرنے کے لئے یوں تو جوئس کا آرٹ ہی کافی ہوتا، لیکن جوئس کی کتابوں کے آخر میں ایک اخلاقی معنویت بھی ہوتی ہے۔ اکثر جوئس کے خاتمہ میں فطرت کا ذکر ہوتا ہے۔ شروع شروع میں تو فطرت ایک ہیبت ناک تصور کے طور پر سامنے آتی ہے جس کے مقابل انسان ایک ناچیز ذرہ بن جاتا ہے۔

جوئس کی سب سے بڑی کہانی "The Dead" کے آخر میں فطرت کو اسی طرح پیش کیا گیا ہے۔ یہاں نہ صرف برف نے انسانی زندگی کو چھپا لیا ہے، بلکہ لفظوں کی موسیقی تک انسان کی ہیچ مقداری کا ماتم کر رہی ہے۔ "یولی سیز" میں فطرت انسانی زندگی کی پیچیدگیوں کا حل بن کر آتی ہے۔ اس کتاب میں اصلی مسئلہ یہ ہے کہ ہر آدمی بالکل اکیلا ہے۔ لوگ آپس میں باتیں بھی کرتے ہیں، ہنستے بھی ہیں، مگر یہ سارا ربط و ضبط سماجی اور سطحی ہے، ورنہ درحقیقت ہر آدمی دوسروں سے بالکل الگ تھلگ اور اپنی گہرائیوں میں بند رہتا ہے۔ حالانکہ اسٹیون کو ایک روحانی باپ کی تلاش ہے، اور بلوم کو بیٹے کی، مگر ان دونوں میں روحانی تعلق قائم ہوتا ہے تو محض ایک مختصر سے لمحے کے لئے۔ میں ایڈمنڈ ولسن کی رائے سے پوری طرح متفق ہوں کہ اس لمحے کا اثر کتاب کے تینوں بڑے کرداروں پر بہت گہرا پڑتا ہے۔ مگر بہرحال یہ دونوں بہت جلد جُدا ہو جاتے ہیں۔ بلکہ اور کئی آدمیوں اور چیزوں میں اصلی رابطہ قائم ہوتا ہے تو میرین کی خود کلامی میں، اور آخر یہ سب لوگ گھل مل کر فطرت میں مدغم ہو جاتے ہیں۔ جو ربط و ضبط، سماجی تعلقات اور میل جول کے ذریعے حاصل نہیں ہو سکا تھا وہ فطرت کے تصور سے حاصل ہو جاتا ہے۔ یا فطرت اور انسان کی ہم آہنگی کے تصور سے۔ جس قسم کی سپردگی میرین کو پاکیزہ اور معصوم بنا سکتی ہے اس سے بلوم اور اسٹیون کی روح کے زخم بھی بھر سکتے ہیں۔

فلپ ہنڈرسن جوئس کے اس خاتمہ سے بہت ناراض ہیں۔ ان کے خیال میں جوئس نے اپنے کرداروں کے روحانی مسئلے کی پیچیدگیوں سے بھاگ کر فطرت کے تصور میں پناہ لی ہے۔ غالباً ان کے خیال میں اصلی حل یہ ہوتا کہ اسٹیون، بلوم اور میرین تینوں الل ٹپ ایک تحقیقی گروہ کی ...

روانہ ہوجاتے۔ لیکن اگر اس حل میں کوئی صداقت ہے تو وہ سیاسی آدمی کی صداقت ہے نہ کہ فن کار کی۔ آندرے مالرو نے باوجود ترقی پسند ہونے کے اپنے ایک ناول میں سچ بولا ہے۔ ہیرو چین کی خانہ جنگی میں جمہوریت پسندوں کے ساتھ لڑ رہا ہے۔ لیکن وہ صرف اس وجہ سے شامل ہوا ہے کہ اسے زندگی میں کوئی مقصد ہی نظر نہیں آتا۔ خود مارکسی مصنفوں میں بھی وہی لوگ سچ بول سکے ہیں جنھوں نے اخلاقیات کے متعلق فرد کے نقطۂ نظر سے غور کیا ہے۔ انقلاب میں حصہ لینا اجتماعی مسئلوں کا حل سہی، فرد کی روحانی کشمکش ایسے بہلاووں سے ختم نہیں ہوا کرتی۔ فرد کو اپنے مسئلوں کا انفرادی حل ڈھونڈھنا پڑتا ہے، اس لئے اخلاقیات پر فرد کی حیثیت سے غور کرنے والے زیادہ بنیادی معنویت کے حامل ہیں۔

"یولی سیز" کے آخر میں تو فطرت کا تصور صرف بہجت انگیز ہے۔ لیکن "Finnegans Wake" کے آخر میں سمندر جس میں دریا نے لفی گرنے والا ہے، موت کی علامت بھی بن جاتا ہے۔ خواب دیکھنے والے کے لئے موت لازمی ہے اور دریا کے لئے اپنی ہستی سمندر میں کھو دینا ضروری ہے، اور ان چیزوں سے مفر ممکن نہیں، بلکہ شاید دونوں کو اپنی زندگی کے دکھوں کا مداوا اسی بات میں ملے گا کہ اپنی ہستی کو کسی عظیم تر ہستی میں مدغم کردیں ۔۔ دریا اپنے آپ کو سمندر میں، انسان اپنے آپ کو موت میں، جو بیک وقت حیات بھی ہے، جیسا لفظ Wake کے مختلف معانی سے ظاہر ہے۔ چنانچہ یہاں سمندر کے تصور میں امید بھی شامل ہے اور ہیبت بھی، اضطراب بھی اور سکون بھی۔ اگر "یولی سیز" کے خاتمہ میں Pagan روح پائی جاتی ہے تو اس کتاب کا خاتمہ خالصتہً عیسوی ہے۔ ایک لحاظ سے جوئس کی ساری کتابوں کو ایک سلسلہ وار کتاب سمجھا جا سکتا ہے۔ اس کتاب کے شروع میں فن کار ایک باغی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے جس کا تکبر اسے کسی چیز سے سمجھوتہ کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ ایک زمانہ تک وہ تنہائی اور جلاوطنی کی زندگی بسر کرتا ہے، لیکن آخر اسے پتہ چلتا ہے کہ غرور روح القدس کے خلاف ایک عظیم گناہ ہے۔ چنانچہ Finnegans Wake پر کسی مبہم گناہ کا احساس چھایا ہوا ہے۔ اس کتاب کے آخر میں وہ اعتراف کر لیتا ہے کہ کائنات میں اس کی حیثیت ذرّہ سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔ اور اس کا سارا غرور بے بنیاد تھا۔ اعتراف کے بعد اب اُسے صرف موت کا انتظار ہے۔ اس انتظار میں ڈر تو شامل ہے ہی لیکن ساتھ ہی رحم کی امید بھی ہے، بلکہ شاید یقین ہے کہ خدا گنہگار سے محبت کرنے والے باپ کا سا سلوک کرے گا۔ یہ خاتمہ سراسر عیسائیت کی روح میں ڈوبا ہوا ہے۔ اور اسی وجہ سے مجھے "یولی سیز" کے خاتمہ سے زیادہ پسند ہے۔

جوئس کے یہاں ایک اور اخلاقیاتی معنویت بھی ہے جو مارسل پروست کے یہاں بھی ملتی ہے۔ ابتدائی اور بنیادی انسانی تعلقات کی سچائی اور اہمیت کا احساس اور ان کی طرف دوبارہ واپس ہونا۔ پروست اور جوئس دونوں کے ہیرو اپنے اپنے آدرش کی تلاش میں گھر سے باہر جاتے ہیں لیکن دونوں کو آخر وہیں لوٹنا پڑتا ہے۔ پروست کے ہیرو کو اعلیٰ سوسائٹی میں شامل ہونے کا شوق ہے، لیکن اپنی خواہش میں کامیاب ہونے کے بعد اُسے معلوم ہوتا ہے کہ اگر خلوص اور محبت کا وجود کہیں تھا تو ان لوگوں میں نہیں جن کی خاطر اس نے اپنے محبت کرنے والوں کو چھوڑا بلکہ خود اس کی دادی اور ماں میں، جن کی طرف سے وہ اب تک بے اعتنائی برتتا رہا تھا۔ جوئس بھی اپنے آرٹ کی خاطر ماں باپ سے بغاوت کرکے بھاگتا ہے۔ لیکن اُسے بھی آخر میں پتہ چلتا ہے کہ پوری زندگی کے مقابلہ میں فن کار کی شخصیت اور فن کی تخلیق کی کیا حیثیت ہے۔ اب اُسے احساس ہوتا ہے کہ انسانی زندگی میں کوئی چیز اگر معنویت پیدا کرتی ہے، اور اگر کسی چیز میں روحانی سکون مل سکتا ہے تو وہ یہی روزمرہ کے انسانی تعلقات اور چھوٹی چھوٹی محبتیں ہیں۔ جوئس نے یہ ساری باتیں Finnegans Wake کے آخری صفحے پر صرف ایک جملے میں کہہ دی ہیں۔ اس جملے کی پوری معنویت تو اپنی جگہ پر ہی ظاہر ہوتی ہے، بہرحال وہ جملہ یہ ہے:

"Carry me along, taddy, like you done through the toy fair."

یہاں پھر اس بات پر غور کیجئے کہ جوئس جب کبھی کسی کی تعریف کرنا چاہتا ہے تو اس پر روغن نہیں کرتا بلکہ اس کے کھُردرے پن کو نمایاں کرتے ہوئے تعریف کرتا ہے۔ چنانچہ یہاں اس ایک لفظ taddy میں جوئس نے متضاد جذبوں کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔ اور ایسے موقع پر ایسے لفظ کا استعمال صرف ایک بہت ہی بڑے فن کار کے بس کی بات تھی۔ یہاں تو یہ جملہ Earwicker کے بچے نے کہا ہے۔ اُسے شاید زکام ہے جس کی وجہ سے daddy بگڑ کر taddy بن گیا ہے۔ اس کے قریب قریب دوسرا لفظ ہے teddy جس کے معنی ریچھ کے ہیں۔ چنانچہ اس لفظ taddy میں دو مفہوم شامل ہوئے، ایک تو باپ کا دوسرے ریچھ کا۔ اچھا، غالباً Dubliners کی کسی کہانی میں یہ ذکر ہے کہ اسٹیفن کو اس کے باپ نے کندھے پر بٹھا کر میلے کی سیر کرائی تھی۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے "یولی سیز" میں بھی اسٹیفن نے اس واقعہ کو یاد

[illegible]

کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اسٹیون کے باپ کی مضحکہ خیز شخصیت بھی ذہن میں رکھئے، جس کیلئے ریچھ کی پھبتی کچھ بہت زیادہ ناموزوں نہ ہوگی۔ اب آخری کتاب میں اسٹیون کا خالق پھر اس باپ کو یاد کر رہا ہے جس کی عادتیں ریچھ کی سی سہی مگر جو پھر بھی اسٹیون کا باپ ہے، اور پُرخلوص محبت کر سکتا ہے۔ اب فن کار تخیل میں باپ کی طرف مڑتا ہے؛ طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ نہیں بلکہ اپنی روحانی مشکل میں امداد مانگنے کے لئے ــ اور یہ امداد یقینی ہے۔ اگر موت میں بھی اسے سکون کا ایک پہلو دکھائی دیتا ہے تو صرف اس خیال سے کہ شاید خدا بھی باپ کی طرح محبت کرنے والا ہوگا۔ مارسل پروست کی طرح جوئس بھی یہی گواہی دے رہا ہے کہ اگر زندگی میں حسن، صداقت اور نیکی مل سکتی ہے تو ابتدائی انسانی تعلقات میں۔

تحلیل نفسی کرنے والوں کو اس خاتمہ میں رحم مادر میں واپس جانے کی خواہش اپنی تمام علامتوں کے ساتھ نظر آئیگی، خاص طور پر سمندر اور اس میں دریا کا گرنا۔ لیکن ادب اور تنقید میں اس قسم کے تجربے فردی دلچسپی رکھتے ہیں۔ دراصل مارسل پروست اور جوئس کی کتابیں ہمارے زمانہ کی روحانی تاریخیں ہیں، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر نئی زندگی کا سرچشمہ بھی ہیں۔ جب زندگی کی تمام اقدار باطل ہو گئی ہوں اور کسی چیز میں بھی سچائی نظر نہ آتی ہو تو زندگی کو از سرِ نو تازہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ بالکل ابتدائی چیزوں سے تعمیر شروع کی جائے۔ سیاست دانوں اور ادب کو سیاست بنا دینے والوں سے تو خیر ہمیں مطلب ہی کب ہے۔ لیکن جہاں تک فن کاروں کا تعلق ہے صرف جوئس اور مارسل پروست ہی کو نہیں بلکہ بیسویں صدی کے ہر سچے فن کار کو انھیں ابتدائی تعلقات کی طرف جانا پڑے گا۔ اور ان کی اہمیت کا اعتراف کرنا پڑیگا۔

اب پھر جوئس کی اخلاقیات کے بنیادی تصور کی طرف واپس آئیے، یعنی انسان کے نامکمل ہونے کا احساس۔ یہ بات نہیں کہ جوئس اپنے آپ سے بالکل بیزار تھا۔ اس کے برخلاف جوئس اپنی عظمت کا جتنا قائل تھا اتنا اس کے مداح بھی نہ ہوں گے۔ چنانچہ اپنی آخری کتاب میں اس نے جگہ جگہ اپنی تعریف کی ہے۔ بعض نقاد جوئس کو تشائم پرست سمجھتے ہیں۔ لیکن اس نے اپنی اور فن کار کی نمائندگی کے لئے Grace-hoper (Grasshopper) کو چنا ہے اور ٹڈے کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

hoppy on akkant of his joyicity.

ایک جگہ تو اس نے اپنے آپ کو صاف طور پر شیکسپیئر کا مقابل اور نئی دنیاؤں کا خالق کہا ہے۔ اس فقرے میں شیکسپیئر کے نام کو استعمال کیا گیا ہے:

As the great Shapesphere puns it.

لیکن اپنی عظمت کے اس احساس کے باوجود جوئس انتہائی منکسر المزاج انسان تھا۔ حقیقی انکسار کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آدمی اپنے آپکو ہر ایک سے کمتر سمجھے یہاں تک کہ ترقی پسندوں سے بھی۔ اصلی انکسار کا مطلب ہے کائنات اور زندگی میں اپنی جگہ پہچاننا۔ یہ انکسار جوئس میں بھی موجود ہے اور شیکسپیئر میں بھی۔ شیکسپیئر کو بھی اپنی فن کارانہ قدرت کا پورا علم تھا اور پروسپیرو کی زبان سے اپنی طاقتوں کا اعلان اس نے خود کیا ہے۔ اس نے دوپہر کے سورج کو دھندلا دیا ہے، ہوائیں اور بجلیاں اس کے قبضہ میں ہیں، اس کے حکم سے مُردے جاگ اُٹھے ہیں۔ لیکن شیکسپیئر ہرگز اتنا بڑا فن کار نہ ہوتا اگر اپنی عظمت کے یقین کے ساتھ ساتھ اُسے یہ احساس نہ ہوتا کہ فن کار بڑی قدرتوں والا سہی، لیکن زندگی کے مقابلہ میں فن کی تخلیق بھلا کیا حیثیت رکھتی ہے۔ یہ ساری ہوائی باتیں ہیں، فن کی اچھائی اور بُرائی سب محض خیال پر منحصر ہے۔ جس آدمی نے اتنی ڈینگیں ماری ہیں اس نے یہ بھی تو کہا ہے:

The best in this kind are but shadows.

اسی طرح جوئس نے آخری کتاب میں اپنا اور اپنی کتاب کا مذاق اُڑایا ہے۔ کبھی تو اُسے اپنی یہ ساری کوششیں مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہیں، کبھی اُسے یہ خیال ستاتا ہے کہ شاید وہ جعل ساز اور دھوکے باز ہے۔ ایک دفعہ میں نے کہیں لکھا تھا کہ بودلیر کا یہ جملہ عظیم الشان اخلاقی انقلاب کا حامل ہے: "میرے ریاکار پڑھنے والے، میرے ہمشکل، میرے بھائی۔" ممکن ہے کہ میرے دماغ پر عیسوی تصورات ضرورت سے زیادہ حاوی ہوں، بہرحال مجھے تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ سچی اخلاقیات کی بنیاد مارکسیوں کے بڑبولے پن پر قائم نہیں ہو سکتی، بلکہ اس اعتراف پر کہ ہر آدمی کے اندر ریاکار اور بے خلوص ہونے کی صلاحیت موجود ہے۔ (بقیہ بر صفحہ ۳۰۵)

تاثیر

انسان

(ایک دو نظمہ)

۱۔ دوراہہ* : ۲۔ اجنبی :

(۱) دوراہہ :-

ریل گاڑی پہ یہ گھسان ۔ الہٰی توبہ!
نہ مروّت نہ تکلف نہ تبسم نہ ادا
یونہی اک غیر شعوری سی خشونت کا خروش! ۔
بے ارادہ ہے تو کیا غیر شعوری ہے تو کیا
یہ نئے دَور کے احساسِ غلامی کا ظہور
انتقامانہ تحکّم کی نمود! ۔
خانہ جنگی ہی سہی
اس میں اک اظہارِ بغاوت بھی تو ہے
یونہی، یونہی سہی
اک شائبۂ دادِ شجاعت بھی تو ہے
۔ (چاک تو کرتا ہوں میں ۔ اپنا گریباں ہی سہی) ۔

× × ×

کلبلاتی ہوئی مخلوق کی اس دلدل میں
سینہ تانے ہوئے کچھ لوگ بڑھے جاتے ہیں
خوب پھنکارتے، پھن پھیلائے
لوگ؟ وہ لوگ "کالانعام" نہیں
جن کو ٹھکراتے ہوئے جاتے ہیں
یہ لوگ! ۔ بڑے صاحب لوگ
یہ جو حکام ہمارے ہیں یہ حکّام نہیں
جو ہمیں سے ہیں مگر ہم میں نہیں
یہ جو بندوں کے ہیں آقا مگر آقا کے غلام
باوفا ہوں تو ہوں بے دام نہیں
"(تو دوست کسی کا بھی ستمگر نہ ہوا تھا!)"

× × ×

ان پہ دُنیا کی ہر اک راہ کشادہ ہے مگر
آج اک سنگِ گراں حائل ہے
کہ اٹھائے نہ اٹھے اور ہلائے نہ ہلے! ۔
دوسرے درجے کے دروازے میں
ان کے آقاؤں کا اک فرد ۔ فرنگی گورا
باہیں پھیلائے ہوئے راستہ روکے ہے کھڑا
"(کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق؟)"

× ×

سیٹیاں بجنے لگیں! ۔ خدمتِ سرکار بجا لانا ہے
اور سرکار ہی خود سنگِ رہِ منزل ہے ۔
زندگی آگئی دوراہے پر! ۔

×

دیر کیوں کرتے ہو ۔ بھاگو بھاگو
دوڑ کر تھرڈ کے ڈبے میں گھسو
اپنے ہم جنس غلاموں میں ملو
زندگی آگئی دوراہے پر!

۲۔ اجنبی

اجنبیت کا کچھ احساس تھا اور
ریل گاڑی کا سفر! ہچکولے! ۔
شور! ۔ ایسا کہ خزاں میں جیسے
کسی درّے سے ... کوئی
شاعرانہ سی مثال آپ تصوّر کر لیں! ۔
"[شور کا زور تو خود
شور کے لفظ سے ہی ظاہر ہے
آبشاروں کی طرح، تند شراروں کی طرح] ۔
جب یہ حالت ہو تو پھر
بات کرنے کو کوئی اپنی زباں کیا کھولے! ۔
اور اگر ایسی ہی مجبوری ہو
تو فرنگی سے؟ سفر میں؟ باتیں؟

* یہ حصہ بتغیر شائع ہو چکا ہے (مکمل نظم پہلی مرتبہ ساقی میں شائع ہو رہی ہے)

یہ تو مرجائے تو پھر بھی نہ کسی سے بولے!

x x x

جی میں آتا ہے کہ کچھ کھائیے اور سو رہیے
نیند کیا آئیگی
یونہی میں نے
اپنی آنکھوں کو ذرا بند کیا لیٹ گیا
اور پھر اٹھ کے کھڑا ہو گیا پھر بیٹھ گیا! —
ریل کا شور! — کھچا کھچ — کچ کچ
اور گاڑی میں خموشی جیسے
میں ہی میں ہوں، نہ خدا ہے نہ رسول! —
یہ فرنگی بھی تو انسان ہے؟ مجھ جیسا ہے؟
مگر ان کے ہیں نرالے ہی اصول
مشینوں کی فضاؤں میں پلا پوسا ہے
مگر — انسان ہے! — مجھ جیسا ہے؟ —
ریل کے شور سے یہ بھی تو پریشاں ہوگا
مگر اس کے ہیں نرالے ہی اصول
مشینوں کا پلا پوسا ہے
مگر — انسان ہے! — مجھ جیسا ہے؟ —

x x x

اس نے بھی — میری طرح
اپنی آنکھوں کو ذرا بند کیا لیٹ گیا
اور پھر اٹھ کے کھڑا ہو گیا پھر بیٹھ گیا
ریل کا شور — کھچا کھچ — کچ کچ
اور گاڑی میں خموشی! — جیسے . . .

x x

تجربہ ہی سہی — دیکھوں تو سہی
یہ بھی انسان ہے؟ مجھ جیسا ہے؟
میں نے پوچھا کہ کدھر جاؤ گے
اس نے پوچھا کہ کدھر جاؤ گے
اس نے کچھ مجھ سے کہا، میں نے کہا، اس نے کہا! —
یونہی بے سود ہوائی باتیں
یونہی ہر روز کی، یونہی، باتیں
جیسے گاڑی کا سفر! — ہچکولے!

کبھی دائیں، کبھی بائیں
کبھی آگے، کبھی پیچھے! —

x x

یہ فرنگی سہی، انسان ہے! — مجھ جیسا ہے! —
وہی سگرٹ، وہی سوڈا، وہی وسکی، وہی پیاس
وہی خوشیاں، وہی غصے، وہی حسرت، وہی یاس
وہی گاڑی، وہی گاڑی کا سفر! — ہچکولے! —
ایک جھٹکا جو لگا دھم سے گری ہیٹ، لبالب ساغر
ایسا چھلکا کہ شرابور ہوئے سب کپڑے
سر بہ پا — جیسے کہ مچھلی نے لگا کر ڈبکی
جھیل کی سطح سے سر اپنا نکالا ہو ابھی! —
سر کے بالوں کو وہ ہاتھوں سے جھٹک کر اٹھا
مسکراتا ہوا، کھسیانا سا! —
میں نے بے ساختہ اک قہقہہ یوں برسایا
جیسے گھنگھور گھٹاؤں میں کڑکتی ہوئی رعد! —
اور اس قہقہے کی گونج میں سب ختم ہوئے
ریل گاڑی کا سفر
ہچکولے
ریل کا شور کھچا کھچ — کچ کچ! —
دونوں انسانوں کے ان قہقہوں نے ختم کئے
اجنبیت کے سب احساس
مذاہب کا نفور
رنگ اور نسل کے عفریت
حکومت کا شعور

اور ان سب سے زیادہ مسموم
وہ غلامانہ خودی، خودداری
وطنیت کا غرور! —
نہ میں ہندی، وہ فرنگی، نہ وہ آقا میں غلام
دونوں انسان ہیں
انسان ہیں
انسان ہیں ہم! —

امین حزیں سیالکوٹی

ساقی

تری اک نظر نے ساقی مری چوکڑی بھلا دی   وہ جو خود پرستیاں تھیں انھیں بیخودی پلا دی

مرے سازِ زندگی کو جو ذرا سا تو نے چھیڑا   رگِ جانِ بے نوا نے تری لَے سے لَے ملا دی

—— (۲) ——

مری روح رقص میں ہے لبِ جاں پہ ہیں ترانے   نہیں اب نظر میں جچتے یہ چمن یہ آشیانے

"گلِ گلستاں بکف" پر ہیں جمی ہوئی نگاہیں   تری مسکراہٹوں نے کیا سحر کوئی جانے!

—— (۳) ——

وہی رَو جو جم رہی تھی سوئے یم رَواں دَواں ہے   کوئی اس کو روک دیکھے۔ یہ خضرؑ کا رواں ہے

وہی دشت کا بگولا جو غبار اُڑا رہا تھا   مری کشتِ تشنہ لب پر بخدا گہر فشاں ہے

—— (۴) ——

مرے آشیاں کے تنکے، مری شاخِ آشیانہ   جو بُھلا چکے تھے کب کے وہ بہار کا زمانہ

انھیں پھر سے کر دیا ہے تر و تازہ تو نے ساقی!   مئے ناب جام میں تھی کہ "بہارِ جاودانہ"!

پچاس برس پہلے کی دلّی

غلام یزدانی

وقت گزرتے کچھ دیر نہیں لگتی۔ میں ۱۸۹۵ء میں کشمیری دروازے کے مدرسہ میں پڑھتا تھا۔ اس وقت یہ میونسپلٹی کی مدد سے چلتا تھا۔ اور میونسپل بورڈ ہائی اسکول کہلاتا تھا۔ میں آٹھویں جماعت میں تھا اور مڈل کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا۔ جو جنوری ۱۸۹۶ء میں پاس کیا۔ مدرسہ کے استاد تنخواہ زیادہ نہیں پاتے تھے لیکن علم وفضل کے لحاظ سے باکمال تھے۔ تاہم منشی بھیروں پرشاد کو جو ہمارے ہیڈ ماسٹر تھے ساڑھے تین سو روپیے تنخواہ ملتی تھی۔ یہ بی۔ اے پاس تھے لیکن انگریزی ایسی لکھتے تھے کہ آجکل کے بی۔ اے (آنرس) لکھ سکیں تو لکھ سکیں۔ ہندستان کی موجودہ یونیورسٹیوں کے گریجویٹ تو نہیں لکھ سکتے۔ تعجب ہے کہ اتنی کمیشنیں مقرر ہوتی ہیں۔ ولایت سے بھی بڑے بڑے ماہر آتے ہیں۔ لیکن ہندستان کی یونیورسٹیوں کے گریجویٹوں کا معیار عام طور سے گرتا ہی جاتا ہے۔ وجہ شاید یہ ہے کہ پہلی مشرقی درسگاہوں کے اساتذہ کا معیار قابلیت بہت اعلیٰ تھا۔ ہر استاد اپنے علم کا ماہر ہوتا تھا۔ طالب علم بھی خاص طبقے کے لوگ ہوتے تھے۔ پیشہ وروں اور عام درجے کے بچے اپنے آبائی کاموں میں شروع ہی سے لگ جاتے تھے۔ اس لئے طلبہ کی تعداد زیادہ نہ تھی۔ اور ان کی ذہنیت بھی صدیوں کی دماغی تربیت کی وجہ سے ایک بلند مرتبہ پر پہنچ گئی تھی۔

ہاں میں منشی بھیروں پرشاد کا ذکر کر رہا تھا۔ ان کی لیاقت اور شرافت کا کیا کہنا۔ دلّی کے رہنے والے تھے۔ چیلپوری میں مکان تھا۔ جس کا عالی شان دروازہ مجھے اب تک یاد ہے۔ منشی بھیروں پرشاد ذات کے کالیستھ تھے۔ رنگ گہرا سانولا۔ عینک ہر وقت لگی رہتی تھی۔ جاڑے میں سیاہ مخمل کی اچکن پہنتے تھے۔ اور گرمی میں ململ کی سادہ اچوڑی دار پجامہ۔ سیاہ وارنش کا چمکتا ہوا انگریزی جوتہ۔ سر پر پٹیالہ کی وضع کا عمامہ۔ ریشمی ازار بند اکثر لٹکتا رہتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ منشی بھیروں پرشاد صاحب کو مے نوشی کا بہت شوق تھا۔ اور ہر وقت اک گونہ بے خودی کے عالم میں رہتے تھے۔ علم و فضل اور شرافت کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ تمام استاد ان کا احترام کرتے تھے۔ اور لڑکے تو ان کو پوجتے تھے[1]۔ مسلمان اساتذہ بھی قابل تھے۔ ان میں مولوی عمو جان جو فارسی پڑھاتے خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ صہبائی کے شاگرد تھے۔ یہی ان کی لیاقت کے لئے کہہ دینا کافی ہے۔ طبیعت موزوں پائی تھی۔ شعر فارسی اُردو دونوں زبانوں میں کہتے تھے۔ دہلی کے ڈپٹی کمشنر ڈیوس صاحب کی شان میں ایک قطعہ لکھا تھا جس کے دو شعر مجھے یاد رہ گئے ہیں۔

گورنر کے بیٹے ہیں ڈپٹی کمشنر بس اب فخر لندن ہے دہلی کی قسمت
وَلی قیصری زمزمہ کا مترجم ثنا سے دعا پر لگاتا ہے ہمت

میں نے زمزمہ قیصری نہیں پڑھا۔ اس لئے منشی عمو جان صاحب کی قابلیت پر کچھ نہیں لکھ سکتا۔ مولوی صاحب سے میں نے گلستاں بوستاں اور سکندر نامہ پڑھا۔ اس زمانہ کے استادوں کو درسی کتابیں حفظ ہوتی تھیں۔ اور آجکل کے استادوں کی طرح لُغت اور حوالے کی کتابوں کے ٹٹولنے کی ضرورت نہ ہوتی تھی۔ علم در سینہ باید نہ کہ در سفینہ کے مصداق تھے۔ پڑھنے کے علاوہ طالب علم استاد کے خصائل پر بھی نظر رکھتا ہے۔ مولوی عمو جان صاحب کا لباس، ان کا طرز گفتگو اور تادیب کا طریقہ لڑکوں کو بے اختیار ہنسا دیتے تھے[2]۔

مولوی صاحب صوفی منش بھی تھے۔ بو علی شاہ قلندر پانی پتی کے سلسلہ سے تعلق تھا۔ گیارھویں شریف کی نیاز کیلئے مٹھائی ہمارے ہاں سے بھی مولوی صاحب کے پاس جاتی تھی۔ کچھ حکمت میں بھی

---

[1] ماسٹر بھیروں پرشاد کی طرح سنسکرت اسکول کے ہیڈ ماسٹر بھولا ناتھ صاحب عربک اسکول کے ہیڈ ماسٹر خواجہ شہاب الدین صاحب اور مشن اسکول کے ہیڈ ماسٹر پنڈت جانکی ناتھ بھی اپنی قابلیت اور کردار کے لحاظ سے قابل ستائش تھے۔

[2] مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب نے اپنے مدرسہ کے حالات میں مولوی عمو جان صاحب کے طرز گفتگو اور لڑکوں کو سزا دینے کی بہت پر لطف تصویر کھینچی ہے۔

دخل تھا۔ میری والدہ صاحبہ کو جاڑوں میں نزلہ کی بہت شکایت رہتی تھی۔ اور وہ حبِّ جدوار استعمال کرتی تھیں۔ ان کا نسخہ مولوی محمد جان صاحب کی بیاض سے نقل کیا گیا تھا۔ مولوی صاحب کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بیان کرنے سے میرا مطلب یہ ہے کہ اسکول کا فارسی کا مدرس اس زمانہ میں اپنی علمی حیثیت کے علاوہ شہری اجتماعی زندگی میں بھی خاصا اثر رکھتا تھا۔

میں نے دلی کے پچاس برس پہلے کے حالات لکھنے میں مشن کے استادوں سے مضمون کو اس وجہ سے شروع کیا ہے کہ ان کی قابلیت اور خصائل کے نقوش میرے حافظہ کی لوح پر خوب روشن اور واضح ہیں۔ دلی میں مشن کالج قائم ہو چکا تھا۔ اوّل پادری آلنٹ پرنسپل رہے۔ اور بعد میں رائٹ صاحب۔ آلنٹ فاضل شخص تھے لیکن بعد میں چند استاد ایسے آئے جو ان سے کہیں زیادہ چمکے۔ مثلاً لیفرائی جو آخر میں ہندستان کے لارڈ بشپ (Metropolitan) ہو گئے۔ میں جب کالج میں پہنچا اس وقت سی۔ الف۔ اینڈریوز اور جے۔ جی۔ الف۔ ڈے انگریزی کے استاد تھے۔ اینڈریوز نے ہندوستان کی سماجی، اخلاقی اور سیاسی ترقی کیلئے جو خدمات انجام دی ہیں وہ ہندستان کے تمدن اور تہذیب کی تاریخ میں ہمیشہ نمایاں رہیں گی۔ ڈے صاحب بڑے باپ کے بیٹے تھے۔ ان کے والد آئرلینڈ میں بشپ تھے۔ اور جب یہ خود بھی صحت کی خرابی کی وجہ سے وطن واپس گئے تو جلد وہاں بڑے پادری مقرر ہو گئے اور رفتہ رفتہ کل آئرستان کے اسقف اعظم (Primate) بن گئے۔

ڈے اور اینڈریوز طالب علموں کے ساتھ بے حد ہمدردی کرتے تھے اور میل جول کا طریقہ ایسا تھا کہ کسی قسم کی فوقیت کا اظہار نہ ہونے دیتے تھے۔ اسی وجہ سے جماعت کے کمرے سے زیادہ وہ کھیل کے میدان میں لڑکوں میں گھلے ملے نظر آتے تھے۔ تاکہ ان کے ذہن سے محکومی کی پستی دور کردیں۔ اور نوعمری کی امنگ کے ساتھ جرأت اور اولوالعزمی پیدا ہو۔ ہندستان کے مشن کالجوں کے ابتدائی زمانہ کے استاد عام طور سے جید فاضل رہے ہیں۔ کیمبرج یونیورسٹی کے بورڈ نے بھی جو دلی کے مشن کالج کے لئے استاد مقرر کرکے بھیجتا تھا علمی معیار اور کردار کی خوبی کا خاص خیال رکھا۔ اس وجہ سے ایک طرف تو طالب علموں کی ذہنی نشو و نما اور عام تربیت پر اچھا اثر ہوا۔ دوسری طرف ان پروفیسروں کے دلی کے ایسے علما سے جو غدر سے پہلے کی تہذیب اور فضل و کمال کے نمونہ تھے اچھے روابط پیدا ہو گئے۔

ان مشنری استادوں کی سادہ زندگی اور علمی تبحر اس انگریزی مقولے Plain living high thinking. کا حقیقی مصداق تھا۔

مولانا نذیر احمد، منشی ذکاء اللہ، ماسٹر پیارے لال، ماسٹر ساگر چند جب پنشن لیکر دلی میں جمع ہوئے اور دہلی لٹریری سوسائٹی کی بنیاد ڈالی تو مشن کالج کے پادری استاد ان کے گہرے دوست ہو گئے۔ اینڈریوز نے مولانا نذیر احمد اور منشی ذکاء اللہ سے اپنی ارادت کا اظہار روزمرہ کے میل جول کے علاوہ اپنی کتاب Renaissance in India میں تفصیل سے کیا ہے۔

ماسٹر پیارے لال کے خاندان کا سلسلہ اکبری نو رتن راجہ ٹوڈرمل تک پہنچتا ہے۔ خوش شکل، خوش لباس، خوش خو۔ میں نے ان کو ان کی ضعیفی کے زمانہ میں دیکھا۔ جب ان کے پوتے ہرچند کی وجہ سے جو کالج میں میرے ہم جماعت تھے میرا ان کے مکان پر آنا جانا زیادہ ہوا۔ یہ دریبہ کلاں میں اپنے خاندانی مکان میں رہتے تھے۔ قد ذرا پستہ تھا لیکن چہرہ بہت بارعب۔ آنکھیں بڑی بڑی اور محبت سے بھری ہوئی۔ انگرکھا اور اس پر چغہ، چوڑی دار پیجامہ۔ اور وارنش کا گرگابی یا منڈا جوتہ پہنتے تھے۔ انگریزی خوب لکھتے تھے۔ چنانچہ والسرائے یا گورنر جب دلی آتے تھے تو میونسپلٹی کا انگریزی ایڈریس ماسٹر پیارے لال ہی مرتب کرتے تھے۔ میں نے ہندو کالج کے قیام کے موقع پر ایک دفعہ ان کو تقریر کرتے بھی سنا تھا اور ایک انگرکھا اور چغہ پہننے والے کو ایسی عمدہ انگریزی بولتے ہوئے سننا میرے لئے ضرور باعث تعجب ہوا تھا۔ ماسٹر پیارے لال پنجاب کے محکمہ تعلیمات کے مختلف جلیل القدر عہدوں پر فائز رہے۔ اور ختم خدمت پر انسپکٹر مدارس تھے۔ اور رائے بہادری کا خطاب بھی پایا جس کی اُس زمانہ میں اتنی ہی قدر و منزلت تھی جتنی آجکل نائٹ (Knight) کے اعزاز کی۔ لیکن دلی والے رائے بہادر صاحب کو ان کی مغربی علوم کی اعلیٰ مہارت کی وجہ سے ماسٹر ہی کہتے رہے۔ اور یہ لقب شاید اس وقت تک اتنی ہی اہمیت رکھتا تھا جیسا کہ آکسفورڈ کے بعض کالجوں کے پرنسپلوں کو ماسٹر کہنا۔

ماسٹر پیارے لال کا اُردو زبان پر بھی بڑا احسان ہے۔ پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی کے رکن کی حیثیت سے ان کا اصلاح اور مشورہ اور عالمانہ تنقید زبان میں سلاست اور روانی پیدا کرنے میں بیحد مفید ثابت ہوئی۔ خود بھی کتابیں لکھیں۔ کہتے ہیں کہ

رسوم ہند میں ہندوؤں کے رسم ورواج کا حال مرتب کیا اور خوشحال چند کے دلچسپ قصّوں کی شکل میں ماسٹر صاحب ہی کا لکھا ہوا ہے۔ قصص ہند کا پہلا حصہ بھی شاید انھوں نے ہی تالیف کیا تھا۔ ان کتابوں کی عبارت کی روانی اور مضامین کی دلکشی بچوں کے ذہن پر خاص اثر ڈالتی تھی۔ چنانچہ مجھے خود بچپن میں ان کتابوں کے صفحے کے صفحے حفظ تھے۔ اور میری طرح اور بیسیوں بچوں کو بھی حفظ ہوگئے۔ طریقہ تعلیم اب ایک علم بن گیا ہے۔ اور بچوں کی نفسیات اور ذہنی ترقی کے مدنظر نصاب کی کتابیں جدید اصولوں پر مرتب ہوئی ہیں۔ لیکن زبان کی شستگی اور طرز بیان کے لحاظ سے ان کا مقابلہ جب ماسٹر پیارے لال، محمد حسین آزاد، اور ان کے لائق رفقا کی مرتبہ درسی کتابوں سے کیا جاتا ہے۔ تو آجکل کی کتابیں نہایت پھیکی اور گھٹیا نظر آتی ہیں۔ محکمہ تعلیمات کو بچوں میں ادبی ذوق پیدا کرنے کے لئے درسی کتابوں کی تالیف میں زبان کی شادابی اور لطافت کا بھی ضرور خیال رکھنا چاہئے۔ ماسٹر پیارے لال کی تحریر کو دیکھنا ہو تو اس ترجمے کو ملاحظہ فرمائیے جو انھوں نے دربار قیصری ۱۸۷۷ء کی انگریزی تاریخ کا کیا تھا۔ اصل انگریزی کتاب کی عبارت میں بھی یہ روانی اور سلاست نہیں جو اس ترجمہ میں موجود ہے۔ اور پھر طرز تحریر ایسا دلکش کہ ادب لطیف کی طرح صفحے کے صفحے پڑھ جائیے۔ اور نیت سیر نہیں ہوتی۔

ماسٹر ساگر چند انگریزی کے ایم۔ اے تھے اور یہ بھی انسپکٹری مدارس کے عہدے سے پنشن لے کر علیحدہ ہوئے۔ ان کے علم وفضل کی بڑی دھاک تھی۔ لیکن یہ نہایت خاموش اور سنجیدہ بزرگ تھے۔ جو صفات ان کے لائق بیٹے بابو موتی ساگر مرحوم میں بھی آئیں۔ ماسٹر ساگر چند جینی تھے۔ لیکن اس زمانہ کے دلی کے لوگوں میں کوئی مذہبی تعصب یا تنگ نظری نہ تھی۔ ماسٹر پیارے لال اور ماسٹر ساگر چند دونوں کی میرے والد بزرگوار منشی غلام جیلانی اور چچا ڈپٹی امیر علی سے اچھی رسم و راہ تھی۔ اور بابو موتی ساگر آنجہانی کا تو یہ حال تھا کہ جب حضرت شاہ عبدالسلام رحمۃ اللہ علیہ کا عرس بالس کولی[1] میں ہوتا تھا۔ تو یہ قوالی کی محفل میں بالالتزام شریک ہوتے تھے۔ اور میرے خالو صاحب مرحوم حضرت شاہ عبدالصمد صاحب رح کو بطور عقیدت

نذر پیش کرتے تھے۔

دلی کے پایہ تخت ہونیکی وجہ سے یہاں عربی علوم کے متعدد مدرسے تھے جن میں سے تین اب تک باقی ہیں۔ سنہری مسجد کا مدرسہ، مسجد فتحپوری کا مدرسہ، اور حسین بخش کا مدرسہ۔ ان مدرسوں کے استاد اپنے خاص علم کے ماہر ہوتے تھے۔ لیکن دلی میں پچاس برس پہلے بعض اور یگانہ دہر استاد بھی تھے جن سے شرف تلمذ حاصل کرنے کے لئے افغانستان، ترکستان، ایران، عراق اور عرب کے علماء دلی آتے تھے۔ وہ حلقہ درس میں شریک ہوتے تھے۔ میرے بچپن کے زمانہ میں مولوی نذیر حسین صاحب کی ذات بابرکت، ایسے علماء کی آخری نشانی تھی۔ یہ حدیث میں یکتا سمجھے جاتے تھے۔ دلی کے ایک اور بڑے عالم مولوی محمد اسحٰق مرحوم جو اپنے علم وفضل کے مقابل میں کسی کو نہیں گردانتے تھے خود فرمایا کرتے تھے کہ میں مولوی نذیر حسین صاحب کے درس میں باقاعدہ طور سے شریک رہا ہوں۔ اور یہ شرکت میرے لئے باعث فخر ہے۔ مولوی محمد اسحٰق صاحب ریاضی اور منطق میں بے مثل ہونے کے علاوہ علوم تفسیر اور معنی وبیان کے بھی بڑے ماہر تھے۔ میں نے عربی ایم۔ اے کے امتحان کیلئے مختصر المعانی اور مطوّل انہی سے پڑھی تھی۔ ان کو یہ سب کتابیں ازبر یاد تھیں۔ اور مطالب کو سمجھانے کیلئے کبھی متن کو دیکھنے کی حاجت نہ ہوتی تھی۔

مولوی محمد اسحٰق صاحب کا استغنا اور پابندی وضع بھی عجب کشش رکھتی تھی۔ ان کے حلقہ درس میں بھی ہندو مسلمان سب شریک ہوتے تھے۔ ساری عمر نواب مشرف الدین خاں مرحوم کے ہاں گزار دی۔ جب نواب صاحب کا انتقال ہوگیا تو ان کے بیٹے نواب مصلح الدین مرحوم اور پوتے سعید الدین صاحب کے پاس رہے۔ سعید الدین صاحب اب صوبجات متحدہ میں ڈپٹی کلکٹر ہیں۔ مولوی صاحب کی تجہیز وتکفین سعید الدین صاحب نے ایسی محبت اور ادب سے کی جیسا کہ اپنے خاندان کے بزرگ یا پیر ومرشد کی کرتا ہے۔

مولوی نذیر حسین صاحب کے زمانہ حیات ہی میں یا انکی وفات کے تھوڑے ہی عرصہ بعد تفسیر کا درس مولوی عبد الحق صاحب نے محلہ بلیماران میں جاری کر دیا تھا۔ اور مولانا نذیر احمد صاحب نے عربی ادب کی تعلیم کا سلسلہ گلی بتاشان میں۔ لیکن ان علماء کے درس کی شہرت زیادہ تر بیسویں صدی میں ہوئی۔ دہلی کے پچاس برس پہلے کے علماء میں مولوی ضیاء الدین صاحب کا نام

[1] یہ گانوں اب نئی دہلی کی آبادی میں شامل ہوگیا ہے۔ حضرت شاہ عبدالسلام کی درگاہ کناٹ پلیس کے غربی جانب واقع ہے۔ اور اب بھی مرجع خلائق ہے۔

لینا ضروری ہے۔ یہ مولوی مملوک علی کے شاگرد تھے۔ اور دہلی کالج کے ٹوٹنے سے پہلے شاید وہاں ملازم بھی ہو گئے تھے۔ کالج کے ٹوٹنے کے بعد گورنمنٹ نے ان کو ڈپٹی بنا دیا۔ مولوی صاحب کی علمی قابلیت کی شہرت تو بہت تھی۔ چنانچہ ایڈنبرا یونیورسٹی نے مولانا نذیر احمد صاحب سے بہت پہلے مولوی ضیاء الدین صاحب کو ایل۔ ایل۔ ڈی کی اعزازی ڈگری عطا کی۔ لیکن مولوی صاحب نے کوئی حلقۂ درس قائم نہیں کیا۔ نہ کوئی معرکہ کی کتاب تصنیف کی۔ البتہ یہ اپنے زہد و تقویٰ کی وجہ سے شہر میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ مکان رہٹ کے کوئیں کی گلی میں تھا پانچوں وقت کی نماز پابندی سے جامع مسجد میں ادا کرتے تھے۔ اور رمضان شریف میں اکثر اعتکاف بھی اس حجرے میں کیا کرتے تھے۔ جو پایہ والوں کی جانب مسجد کے شمال مغربی گوشے میں واقع ہے۔

اس زمانہ کی دلی میں فقر و درویشی کا بھی چرچا تھا۔ ظاہری تعلیم کے علاوہ باطنی تعلیم کو بھی ضروری سمجھا جاتا تھا۔ شاہ عبدالسلام صاحب نے جن کی درگاہ واقع بالسنکولی کا ذکر میں اوپر کر چکا ہوں اپنے لڑکے کو جو اس زمانہ میں میاں عبدالصمد صاحب کہلاتے تھے باطنی تعلیم کیلئے حضرت شاہ اللہ بخش صاحب کے پاس تونسہ جو اٹک کے اس پار واقع ہے بھیج دیا تھا۔ حضرت شاہ اللہ بخش کے والد حضرت شاہ سلیمان مولانا فخرؒ کے خلیفہ حضرت نور محمد کے مرید تھے۔ اور اسی وجہ سے ان دو نو خاندانوں میں بیعت کا سلسلہ قائم تھا۔ صوفی منش بزرگوں کا آجکل کی مادی خیالات کی دنیا قدر کرے نہ کرے لیکن اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ کہ ان درویشوں نے ہندوستان کے مختلف مذاہب کی آبادی میں اسلام اور خصوصاً توحید کی نہایت خوش اسلوبی سے تلقین کی۔ اور انہی کے اعلیٰ مشرب کا فیضان تھا جو قدیم زمانہ میں گرونانک اور کبیر جیسے موحد پیدا ہو گئے۔

پچاس برس پہلے کی دلی کے ولی صفت بزرگوں میں حضرت مسیح الدین رحمۃ اللہ علیہ کا نام لینا ضروری ہے۔ یہ بغداد سے تشریف لائے تھے۔ اور قادری سلسلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ حضرت نظام الدین اولیا کی بستی کی ایک مسجد میں آکر مقیم ہو گئے اور پچیس تیس سال عبادت اور ریاضت میں وہیں گذار دیئے۔ بہت نورانی شکل تھی۔ رنگ میدا اور شہاب۔ سفید ڈاڑھی۔ سفید پیرہن اور سفید براق تہبند۔ عرب بزرگانِ دین کی طرح سر پر اوڑھنی ڈالے رہتے تھے۔ مسجد کا دروازہ نماز کے وقت کھلتا تھا اور پھر بند ہو جاتا تھا عام خلائق سے ملنے کیلئے دس اور بارہ بجے کے درمیان کا وقت مقرر تھا۔ مسجد سے باہر صرف صبح کے وقت حضرت سلطان الاولیا کے مزار پر حاضر ہونے کے لئے جاتے تھے۔ جہاں قرآن مجید تلاوت فرماتے تھے۔ اور پھر واپس آجاتے تھے۔ دلی کے امیر و غریب ہندو مسلمان سب ان سے فیض حاصل کرنے کیلئے آتے تھے۔ یہ سب سے ایسی محبت سے ملتے تھے کہ ہر شخص یہی سمجھتا تھا کہ بغدادی صاحب کو مجھ سے سب سے زیادہ محبت ہے۔

اس زمانہ کی ایک اور مقدس ہستی حضرت شاہ محمد عمر صاحب تھے۔ یہ آخوندجی کے نام سے مشہور تھے۔ دلی میں ان کا خاندان قدیم زمانے سے زہد و ورع میں مشہور رہا تھا۔ چنانچہ ان کے نانا بھی جو بڑے اخوند صاحب کہلاتے تھے اپنے زمانہ میں دلی کی ایک برگزیدہ ہستی تھے۔ فراش خانہ میں آخوندجی کی گلی ان ہی کے نام سے آجتک منسوب ہے۔ شاہ محمد عمر صاحب کا قد چھوٹا تھا اور جسم بھاری ہونے کی وجہ سے تناسب اعضا میں فرق آگیا تھا۔ پھر بھی چہرہ بڑا نورانی تھا۔ اور بات چیت نہایت محبت سے کرتے تھے۔ شہر کے ہندو مسلمان ان کے اخلاق اور روحانیت کے گرویدہ تھے۔ شاہ محمد عمر صاحب قادری سلسلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ تاہم ان کا مشرب نہایت وسیع تھا۔ میں نے باوجود نشست و برخاست میں سخت تکلیف ہونے کے ان کو اجمیر میں خواجہ معین الدین چشتیؒ کے عرس میں شریک ہوتے دیکھا ہے۔ قادری اور چشتی عقائد کے اختلافات کا ان میں شائبہ بھی نہیں تھا۔ شاہ محمد عمر صاحب حضرت خواجہ باقی باللہؒ کے مزار پر ہر جمعرات کو بالالتزام حاضر ہوتے تھے ربیع الاول کے مہینہ میں بارھویں تاریخ کو ختم شریف میں ان کی ذات بابرکت کی وجہ سے لوگوں کے اژدہام نے ایک میلے کی صورت پیدا کر دی تھی۔ اور ختم قرآن شریف اور فاتحہ کا انتظام نہایت وسیع اور پاکیزہ طور سے عمل میں آتا تھا۔ دلی کے بہترین نعت خواں اور حافظ اپنی مناجات خوانی اور قرأت کا کمال دکھلاتے تھے۔

علماء کے بعد شاعروں کا اگر ذکر کیا جائے تو دلی اس زمانہ میں اوّل درجہ کے باکمالوں سے ذرا سونی نظر آتی ہے۔ نواب مرزا خاں داغ حیدرآباد چلے گئے۔ حالی سے سرسید نے دلی چھڑا دی۔ اور وہ زیادہ تر علی گڑھ یا پانی پت رہنے لگے۔ اور عربک اسکول دہلی کی فارسی مدرسی کو ایسے عالم اور یگانہ روزگار استاد کا فخر حاصل نہ رہا۔ محمد حسین آزاد کو محکمہ تعلیمات پنجاب اور اہل لاہور کی قدر دانی نے دہلی کا کر لیا۔ انور مرحوم نے کچھ دن اپنی طباعی سے مشاعروں میں جان

رکھی۔ پھر وہ بھی باہر چلے گئے۔ اپنے بچپن کے زمانہ میں جن شعراء کا میں نے نام سنا ہے ان میں میر مہدی مجروح اور منشی بہاری لال مشتاق پرانے لوگوں میں ہیں اور عبدالرحمٰن راسخ، آغا شاعر قزلباش، وحید الدین بیخود اور نواب سراج الدین خاں سائل[۱] متوسط عمر طبقے میں نمایاں تھے۔ مشاعرے البتہ متعدد جگہ ہوتے تھے۔ مثلاً کرم اللہ خاں صاحب عرف ننھے خاں صاحب شیدا، پنڈت امرناتھ صاحب ساحر اور بدری کرشن صاحب کے مکانات پر جو شہر کے مختلف محلوں میں واقع تھے۔ کنور بدری کرشن صاحب وکالت کرتے تھے لیکن ان کا خاندان ہرگوپال تفتہ سے تعلق رکھتا تھا اس لئے مشاعرے کی محفلوں کا انتظام ان کے لئے ایک قدیم خاندانی روایت تھی۔ جو وہ بزرگ نہایت آن بان سے نبھا گئے۔

نثر نویسوں میں سرسید کا نام سب میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن انھوں نے دہلی چھوڑ کو یل (علی گڈھ) کو بسا لیا۔ اس لئے میں پچاس برس پہلے کی دلی میں ان کا نام شامل نہیں کرتا۔ البتہ دو آدمیوں کا تذکرہ کرنا ضروری ہے۔ اول مولوی سید احمد صاحب مؤلف فرہنگ آصفیہ اور دوسرے میر ناصر علی۔ مولوی سید احمد صاحب کا کارنامہ ڈاکٹر فیلن کے مددگار کی حیثیت سے بھی قابل قدر ہے لیکن اردو زبان کی تاریخ میں ان کا نام ان کی اردو لغت کی وجہ سے ہمیشہ زندہ رہے گا۔ مولوی صاحب کا حلیہ اور عادات ڈاکٹر جانسن کی شکل و صورت اور خصائل سے ملتے جلتے تھے۔ دونو کی بصارت کم، دونوں کا مٹاپے کی وجہ سے بے ہنگم جسم، مولوی سید احمد صاحب کی پلکیں بالکل جھڑ گئی تھیں اور برنیوں کی وجہ سے پپوٹوں کے کنارے بالکل سرخ رہتے تھے۔ پھر بھی مطالعہ اور تصنیف کے کام میں مشغول رہتے تھے۔ ایک دفعہ میں کسی لفظ کے معنی کی تلاش میں ان کے گھر پہنچا۔ یہ اس زمانہ میں ایک پتلی سی گلی میں رہتے تھے۔ جو شاہ گنج اور گلی شاہ تارا کے درمیان واقع ہے۔ گرمی کا موسم تھا۔ میں نے مکان پر جا کر کنڈی کھٹکھٹائی۔ مولوی صاحب باہر نکل آئے۔ ننگ دھڑنگ صرف ایک میلا جانگیہ زیب تن تھا۔ میں نے اپنا مطلب عرض کیا۔ فرمایا ذرا ٹھہریئے۔ پھر گھر میں اندر گئے۔ ورکرتا پہن کر اور ایک کنجیوں کا گچھا لیکر باہر آ گئے۔ اور مجھے ساتھ لیکر گلی شاہ تارا کی طرف روانہ ہوئے۔ وہاں ایک لیتھو پریس تھا۔ اور مسودات بھی وہیں رہتے تھے۔ مولوی صاحب ایک ڈیسک نما میز پر بیٹھ گئے۔ بستہ میں سے مسودہ نکالا۔ کچھ ورق گردانے پھر کلاں نما آئینہ اور اپنی عینک۔ دونوں کی مدد سے میری پیش کردہ لفظ کے مختلف معنی اور محل استعمال بیان کرنے شروع کر دیئے۔ میں کھڑا سنتا رہا۔ اور یہ جب تک میری تشفی نہ ہو گئی سمجھاتے رہے۔ کچھ لوگ راہگیر بھی جمع ہو گئے۔ کیونکہ مطبع لب سڑک واقع تھا۔ اور اس کا نقشہ اصطبل کا سا تھا۔ مولوی صاحب ایک کاٹ کی کرسی پر بے تکلف بیٹھے ہوئے تھے۔ اور اطمینان اور فراغت کا یہ حال تھا کہ شاید آکسفورڈ اور کیمبرج کے پروفیسروں کو اپنے مطالعہ کے کمروں میں بھی اتنا ہی سکون حاصل ہوتا ہو۔

مولوی سید احمد صاحب اردو نہایت سہل اور پاکیزہ لکھتے تھے۔ عورتوں کی زبان میں لڑکیوں کیلئے جو انشاء انھوں نے تالیف فرمائی ہے۔ اس کی زبان بھی نہایت شستہ اور صاف ہے ان کے بہت سے مضامین صوبہ پنجاب کی پچھلی صدی کی ابتدائی درسی کتابوں میں شامل تھے۔ سرکار انگریزی نے ان کو خانصاحب کا خطاب عطا فرمایا۔ لیکن فرہنگ آصفیہ کی تالیف سے جو عزت اور شہرت حاصل ہوئی وہ کسی نائٹ کی نذیر کو بھی حاصل نہ ہو گی۔ مولوی سید احمد صاحب شاعر بھی تھے۔ شملہ پر ان کی نظم اردو کورس میں شامل تھی۔ اس کا ٹیپ کا مصرع یہ تھا ع

لیتو ہمیں سناتے ہیں صاحب پہاڑ پر

اس زمانہ کے دوسرے ادیب میر ناصر علی تھے۔ ان کا خاندان علم و فضل کی وجہ سے ہمیشہ ممتاز رہا ہے۔ چنانچہ خود ان کے والد مولوی ناصر الدین ابو منصور پایہ کے عالم تھے۔ اور پادریوں کے ساتھ مناظرہ میں خاص مہارت رکھتے تھے۔ میر ناصر علی نے ابتدائی ملازمت سر رشتہ تعلیمات کی ادنیٰ درجے کی مدرسی سے کی۔ اور بتدریج محکمہ نمک کی سپرنٹنڈنٹی تک پہونچے۔ خانبہادری کا خطاب حاصل کیا۔ اور آخری عمر نہایت عزت اور وقار سے بسر کی۔ میر صاحب کی وضع قطع اور لباس قدیم علماء کا سا تھا۔ ڈاڑھی البتہ خشخاشی رکھتے تھے۔ چہرے اور آنکھوں پر تبسم کی چمک رہتی تھی۔

۱؎ یہ مضمون لکھا جا چکا تھا کہ نواب سراج الدین خاں سائل کے انتقال کی خبر دلی سے آئی۔ اس زمانہ میں ان کا دم بہت غنیمت تھا۔ پرانی طرز کی شاعری میں استاد کا درجہ رکھتے تھے۔ ترنم کے ساتھ پڑھنے کا ڈھنگ بھی خاص تھا۔ اللہ تعالیٰ اعزیق رحمت فرمائے۔

انگریزی افسروں اور اہلِ علم سے نہایت تپاک سے ملتے تھے۔ لیکن ہم عصر مولویوں کی کٹ حجتی سے بیزار تھے۔ کتب بینی کا بے حد شوق تھا۔ قلمی کتابوں کی تلاش میں یہ گدڑی (گدڑی)[1] پر روز نظر آتے تھے۔ فارسی اور اردو کے باکمال شاعروں کے ہزارہا شعر حفظ تھے۔ اور انہیں ایسے برمحل پڑھتے تھے کہ دل پھڑک جاتا تھا طبیعت میں بے حد سادگی تھی۔ اور اسراف سے بے حد محتاط تھے پھر بھی علم کی خدمت اور اہلِ ذوق کی خاطر مدارات میں دل کھول کر روپیہ صرف کرتے تھے۔

میر ناصر علی کا طرزِ تحریر ان کے ہم عصر ادیبوں، سر سید، حالی، نذیر احمد، اور آزاد سے بالکل جُدا گانہ ہے۔ شاعرانہ لطیف ترکیبوں اور دلآویز استعاروں نے ان کی طبیعت پر ایسا اثر کیا تھا کہ ان کی تحریر میں شعر کی سی شان پیدا ہو گئی تھی۔ اور جیسا کہ غزل کے ایک شعر کا مضمون دوسرے سے جُدا ہوتا ہے ایسے ہی ان کی تحریر میں بھی تسلسل باقی نہیں رہتا تھا۔ بلکہ عبارت میں جو شعر کسی خیال کی تصریح میں نقل فرماتے تھے اس کے ذیلی معنیٰ اور محاسن کے بیان کرنے میں مضمون کے اصل موضوع کو چھوڑ دیتے تھے۔ خود بھی اس جرأت کو خوب سمجھتے تھے۔ اور "صلائے عام" میں مضمونِ پریشاں کے عنوان سے عرصہ تک رشحہ افشانی فرماتے رہے "تیرھویں صدی" اور "صلائے عام" کے مضامین میر ناصر علی کی عشقیہ نثر اور طرزِ تحریر کی ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ میر صاحب نے یہ رنگ شاید لکھنؤ کی فضا سے حاصل کیا۔ کیونکہ دلّی میں تو غالب ہی نے نثر کو عشقیہ تکلف سے پاک کر دیا تھا۔ میر صاحب کی تحریر میں جو خصوصیت ہے اس کو کلاسیکل (Classical) یعنی قدیم استادانہ کہنا بیجا نہ ہوگا۔ مطالب کے عدمِ تسلسل کے لحاظ سے آجکل کی رومانی نثر کا بھی اسے پیش خیمہ تصور کیا جا سکتا ہے۔

شاعروں اور ادیبوں کے بعد اس زمانہ کے حکیموں کا ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ان سب میں ممتاز حکیم محمود خاں تھے۔ جن کا مرثیہ حالی نے بڑے درد سے لکھا ہے۔ حکیم محمود خاں کو علم و فضل کے علاوہ حذاقتِ فن بھی خدا تعالیٰ نے بدرجۂ اتم عطا فرمائی تھی۔ ان کے علاج کو عوام معجزہ سا سمجھنے لگے تھے۔ یہ فقط ان کی تشخیص اور نباضی کا کمال تھا۔ امیر، غریب، شہری، بدیسی سب کیلئے ان کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ نہ کوئی نذر، نہ کوئی فیس۔ نسخہ ایسا کہ دو تین پیسے میں کام چل جاتا تھا۔ اور غریبوں پر بھی کچھ بار نہ پڑتا تھا۔ حکیم صاحب کے دو بیٹوں مجید خاں اور واصل خاں نے بھی مطب شروع کر دیا تھا۔ ان میں باپ جیسا علم و فضل تو نہ تھا۔ لیکن خاندانی روایات اور تعلیم نے تشخیص اور نباضی کا ملکہ پیدا کر دیا تھا۔ حکیم محمود خاں میں کسی قسم کا طمطراق نہ تھا۔ لیکن حکیم مجید خاں کی سواری کی ویگنٹ اور گھوڑوں کی جوڑی دیکھنے کے قابل ہوتی تھی۔ خود جوڑی کو ہنکاتے تھے۔ یہ اکثر رجواڑوں سے بغیر کسی طلب کے آتی تھی۔

حکیم مجید خاں ریاستوں میں بھی علاج کے واسطے دلّی سے جانے لگے تھے۔ ہزار روپیہ روزانہ سفر خرچ کے اور ریل کا فرسٹ کلاس کا ڈبہ نشست کیلئے مقرر تھا۔ اپنی عزت کا بڑا خیال تھا۔ ایک دفعہ کسی جگہ گئے اور وہاں استقبال کیلئے کوئی وقت پر نہ پہنچا۔ یہ چڑ گئے۔ اور پھر جب لوگ ان کے اتروانے کو آئے یہ نہ اترے اور دوسری ٹرین سے واپس دلّی آ گئے۔ حکیم مجید خان اور حکیم واصل خاں دونوں کے ہاتھ میں خدا نے بڑی شفا دی تھی۔ اور ان کے علم سے خاندان کا نام اور چمکا۔ دلّی میں اس خاندان کی وجاہت کا بڑا اثر تھا۔ ہر طبقے اور ملت کے لوگ ان کی خوشنودی اور ان سے راہ و رسم رکھنے کو باعثِ فخر سمجھتے تھے۔ دلّی کے مسلمان اور ہندو باشندوں کی یگانگت اور دوستی کا ایک بڑا سبب اس خاندان کا کمالِ فن اور اعلیٰ اخلاق بھی تھے۔

حکیم مجید خاں اور حکیم واصل خاں کو جسمانی ورزش کا بھی شوق تھا۔ گھر میں اکھاڑا تھا۔ صبح ہی لڑنت ہوتی تھی۔ استاد نوکر تھے۔ وہ زور کراتے تھے۔ دنگلوں میں بھی شریک ہوتے اور میلوں ٹھیلوں سے بھی خاص دلچسپی تھی۔ دلّی میں جو دو لوگ کے بعد ٹر کا میلہ ہوتا تھا اس کی رونق بھی ان کے دم سے تھی۔ مطب میں مریضوں کا ہجوم رہتا تھا۔ ایک جانب ایسے شاگردوں کی بھیڑ بیٹھی رہتی تھی جو فارغ التحصیل ہونیوالے ہیں۔ حکیم صاحب نبض پر ہاتھ رکھا اور ہونٹوں کی جنبش سے طالب علموں کو کچھ فرمایا۔ ابھی مریض حال ہی بیان کر رہا ہے کہ نسخہ تیار ہو کر

---

[1] جامع مسجد کے نیچے کے میدان میں پہلے جو پرانی چیزوں کی فروخت کا بازار سہ پہر میں لگتا تھا اس کو پہلے گذری اور بعد میں گدڑی کہنے لگے تھے۔

(یزدانی)

کے ملاحظہ کیلئے پیش ہوگیا۔ اور انھوں نے اس پر ایک نظر ڈال کر مریض کے حوالے کر دیا۔ تفریح طبع کیلئے ارباب نشاط بھی حاضر رہتی تھیں۔ بعض دفعہ ہم سے بھی مذاق ہوتا جاتا تھا۔ ایک مرتبہ مجھے خارشت ہوگئی۔ ... بارہ برس کی عمر ہوگی۔ حکیم صاحب نے فرمایا۔ میاں صاحبزادے ... کیا کھانے آئے ہو۔ گھر میں حلال خوری موجود تھی اس سے گلے لگ لئے ہوتے۔ حاضرین نے قہقہہ لگایا۔ حکیم صاحب بھی مسکرائے ... شرمندہ سا ہوگیا۔

حکیم محمود خاں کا بڑا کارنامہ مدرسہ طبیہ کا قیام ہے۔ یونانی طب کی حالت زبوں ہوتی جا رہی تھی۔ اور مدرسہ کے قیام کی ایک مرکزی مقام پر سخت ضرورت تھی۔ بعد میں ان کے لائق چھوٹے بھائی حکیم اجمل خاں صاحب نے اس مدرسہ کو اور ترقی دی۔ اور کالج کے درجے تک پہنچا دیا۔ ابتدا میں مدرسہ کے سالانہ جلسے جو تقسیم اسناد کی غرض سے منعقد ہوتے تھے۔ ان میں سے ایک دو میں میں بھی شریک ہوا ہوں۔ ایک جلسہ میں سرسید بھی شریک تھے مسٹر ... کمشنر دہلی نے انعامات تقسیم فرمائے۔ مولانا نذیر احمد صاحب کی تقریر سب سے آخر میں رکھی گئی تھی کیونکہ ان کی تقریر کے بعد کسی مقرر کا رنگ نہیں جمتا تھا۔ مولانا نے جو شعر ابتدا میں پڑھا وہ مجھے اب تک یاد ہے ؎

پہلے تو روغن گل بھینس کے انڈے سے نکال
پھر دوا جتنی ہے بھینس کے انڈے سے نکال

مولانا کے مزاحیہ شعر سے سارا جلسہ پھڑک گیا۔ لیکن بعد ... تقریر حکیموں اور دوا فروشوں کی حالت پر کی اس سے سب ... متاثر ہوئے۔

دلی میں اس زمانہ میں حکیم محمود خاں کے خاندان کے علاوہ اور حاذق طبیب بھی تھے۔ مثلاً حکیم محمد حسین اور حکیم بدرالدین خاں فراش خانہ میں، حکیم غلام نجف خاں کٹڑہ دینا بیگ خاں میں اور حکیم لطیف حسین اور حکیم قیام الدین قاضی کے حوض پر گلی حکیم بقا میں۔ حکیم ... الدین خاں صاحب کے خاندان میں اب تک مطب کا سلسلہ جاری ہے۔ اور ان کے چھوٹے صاحبزادے حکیم سراج الدین جن کو سرکار انگریزی سے خانصاحب کا خطاب بھی عطا فرمایا ہے خدمت خلق کر رہے ہیں۔ حکیم غلام نجف خانصاحب کے خاندان میں حکیم ... الدین صاحب کو اس صدی کے شروع میں خاصا عروج ہوا ... کے صاحبزادے حکیم ناصر الدین خانصاحب مطب کو چلا رہے ہیں۔ حکیم بقا کا خاندان امراض چشم کیلئے خاص طور سے مشہور رہا ہے۔ اس خاندان کے ایک لائق فرد یعنی حکیم مصباح الدین صاحب حیدرآباد تشریف لے آئے تھے۔ اور یہاں خلق اللہ کو ان کے علاج سے بہت فائدہ ہوا۔

ڈاکٹری علاج کا بھی اس زمانہ میں دلی میں خاصا چرچا ہوگیا تھا۔ اور دو بنگالی ڈاکٹروں کو بڑی مقبولیت حاصل تھی۔ ایک ڈاکٹر ہیمچندر سین اور دوسرے ڈاکٹر سانیال۔ ڈاکٹر سین کا مطب بہت چلتا تھا۔ اپنے فن کے ماہر تھے اور ساتھ ہی اخلاق بھی پسندیدہ اور شکل بھی اچھی۔ بڑی بڑی آنکھیں، کھلا ہوا رنگ۔ لمبی ڈاڑھی۔ کوٹ پتلون پہنتے تھے۔ لیکن اردو بے تکلف بولتے تھے۔ دو روپے فیس مقرر تھی۔ آٹھ آنہ پالکی گاڑی کا کرایہ، گھر پر بلانے کی صورت میں اور ادا کرنا ہوتا تھا۔ اللہ نے عجیب شفا ان کے ہاتھ میں دی تھی۔ مریضوں کا اژدہام رہتا تھا۔ قوارے پر مطب تھا۔ خدا نے ان کی نیک نیتی اور خدمت خلق کا یہ پھل دیا ہے کہ آج اس مقام پر ان کی اولاد کی ایک عظیم الشان دوا فروشی کی دکان قائم ہے اور خاندان کے بعض افراد مطب بھی کرتے ہیں۔

جراحی عمل کیلئے دلی والے سول سرجن یا ہندستانی ڈاکٹروں کی طرف رجوع ہونے لگے تھے۔ پھر بھی پھنسی پھوڑوں کا علاج عام طور پر محلہ کے حجام کرتے تھے۔ خود ہمارے خاندان کا حجام جس کا نام عبدالرزاق تھا جراحی عمل میں بڑا مشاق تھا۔ سیتارام کے بازار میں اس کی دکان تھی۔ مختلف قسم کے مرہم تیار رہتے تھے۔ اور پھپاروں اور لیپوں کے نسخے یاد تھے۔ عام طور سے اس کے علاج سے اللہ ہمیشہ شفا دیتا تھا اور اگر زخموں کی حالت زیادہ خراب نظر آتی تھی تو عبدالرحمن جراح کو بلا لیا جاتا تھا۔ ان کی نشست چاوڑی بازار میں ایک بالاخانہ پر طوائفوں کے کوٹھوں کے برابر تھی۔ بالاخانہ کا اور صحیح محل وقوع معلوم کرنا ہو تو یہ سنئے کہ نئی سڑک سے جب چاوڑی بازار میں داخل ہوتے ہیں اور حوض قاضی کی طرف مڑتے ہیں تو شروع ہی میں بازار کی دائیں جانب کسیروں کی دکان کے اوپر یہ بالاخانہ واقع تھا۔ عبدالرحمن جراح کا حلیہ تو عجیب وغریب تھا۔ سیاہ فام رنگت اور اس پر کالی خضاب شدہ لمبی ڈاڑھی سوکھا سہما جسم۔ لیکن لباس بہت صاف اجلا پہنتے تھے۔ مرہم کی ڈبیہ چاندی کی تھی۔ اور آلات جراحی بھی چمکتے ہوئے رکھتے تھے مریضوں سے خواہ کوٹھے پر آئیں خواہ گھر پر بلائیں معقول معاوضہ لیتے تھے۔

جو اس وقت گراں سمجھا جاتا تھا۔ لیکن آج کل کے سرجنوں کی فیس کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں۔ یعنی جب گھر پر ان کو بلایا جاتا تھا تو علاوہ دوا کی قیمت کے دو روپئے خاصدان میں رکھ کر پان اور الائچی کے ساتھ بطور نذر دیئے ہوتے تھے۔ ان لوگوں کو آجکل ہتائی کہا جائیگا۔ لیکن جلد کے امراض میں یہ صدیوں کے خاندانی تجربے کی وجہ سے ایسے ماہر ہو گئے تھے کہ ان کا علاج اور جراحی عمل ہمیشہ کامیاب ہوتا تھا۔ عبدالرحمٰن جرّاح کے بعد کچھ دن ان کے بیٹے نے کام چلایا۔ لیکن بعد میں معلوم ہوتا ہے سلسلہ بند ہو گیا۔ سدا رہے نام اللہ کا۔

آنکھوں کے علاج کے بارے میں یہ بیان ہو چکا ہے کہ حکیم بقا کا خاندان بہت مشہور تھا۔ لیکن پہاڑ گنج میں محمد شفیع سرمہ والوں کا ایک اور خاندان تھا۔ جو امراض چشم میں ماہر سمجھا جاتا تھا۔ میری نانی کی آنکھ میں گندہ پانی (Glaucoma) اتر آیا تھا۔ اور سخت تکلیف تھی۔ محمد شفیع صاحب نے کوئی جراحی عمل تو نہیں کیا لیکن اپنے مختلف سرموں سے درد اور تکلیف کو ہمیشہ کیلئے کھو دیا۔ اس خاندان کے ماہر بھی معقول معاوضہ لیتے تھے۔ اب خبر نہیں کوئی فرد اس خاندان کا باقی ہے یا نہیں۔

باکمالوں اور ماہرین میں قانون دانوں کا ذکر کرنا بھی لازمی ہے۔ پچاس برس پہلے کی دلّی نے دو شخص پیدا کیئے۔ ایک آنجہانی مسٹر مدن گوپال اور دوسرے رائے حکم چند۔ لیکن یہ دونوں دلّی سے باہر چلے گئے۔ مدن گوپال آنجہانی ماسٹر پیارے لال کے بھائی تھے۔ لیکن یہ لاہور میں رہ پڑے اور وہاں چیف کورٹ کے جج ہو گئے مدن گوپال کے صاحبزادے لالہ سر سری رام پھر دلّی آ گئے۔ اور ان کا نام "خمخانہ جاوید" کی وجہ سے ہمیشہ زندہ رہے گا۔ لیکن لالہ سری رام کا کام بیسویں صدی سے متعلق ہے۔ رائے حکم چند حیدرآباد چلے گئے۔ جہاں ان کی قانون دانی کی شہرت اب تک باقی ہے۔ رائے حکم چند کے پوتے مسٹر کشن چند اس وقت عثمانیہ یونیورسٹی میں ریاضی کے استاد ہیں۔ کیمبرج کے رنگلر (Wrangler) ہیں۔ اور دلّی والوں کے خاص اخلاق و عادات سے بھی متصف ہیں۔ ان دو بڑی ہستیوں کے علاوہ دلّی کے اس زمانہ کے ممتاز وکیلوں میں دو لوگ گردھاری لال اور حافظ عزیز الدین صاحب تھے۔ بڑے گردھاری لال ذات کے بنئے تھے۔ رنگ سانولا، قد میانہ، بدن بھاری اور توند نکلی ہوئی۔ انگرکھا اور چغہ پہنتے تھے۔ اور سر پر دوپٹہ باندھتے تھے۔ میں تو ان کے قانونی نکات کو سمجھنے کہاں جاتا۔ لیکن والد مرحوم اور اپنے نانا حافظ عزیز الدین صاحب سے اکثر سنتا تھا کہ بڑے گردھاری لال کو خدا نے عجیب دماغ دیا ہے۔ ایسی قانونی حجت پیش کرتا ہے کہ انگریز بیرسٹروں کے مقابلہ میں دانت کھٹے ہو جاتے ہیں۔ ان کا عالی شان کئی منزل کا مکان اس محلہ میں جو چیپی واڑہ اور کناری بازار کے درمیان واقع ہے۔ میرے بچپن میں (سنہ ۹۳ یا سنہ ۹۴ء میں) تعمیر ہوا۔ مجھے اس سے دلچسپی یوں تھی کہ اس کے اجارے اور بازو کی دیواروں پر نٹوں، سازندوں، صحرائی جانوروں اور طرح طرح کی خیالی تصویریں بنائی گئی تھیں۔ جن کو میں اور میرے ہم جماعت مدرسہ سے واپسی کے وقت بڑے شوق سے دیکھا کرتے تھے۔ بڑے گردھاری لال کے صاحبزادے چندو لال بی۔ اے میرے ہم جماعت بھی رہے بی۔ اے پاس کرنے کے بعد یہ آکسفورڈ چلے گئے اور بیلول کالج (Balliol College) میں تعلیم پائی۔ خبر نہیں انکی بیرسٹری کیسی چلی۔ شاید سرگباشی ہو گئے ہیں۔ اور ان کے خاندان میں اب کوئی آبائی پیشے کو نبھا رہا ہے یا نہیں۔

چھوٹے گردھاری لال صاحب ذات کے کھتری تھے گورے اور خوبصورت۔ بات چیت میں متین اور سنجیدہ۔ ان کے خاندان میں لالہ سری رام نے قانونی پیشے کو جاری رکھا۔ لیکن بیسویں صدی کے اوائل کے سب میں بہترین قانون داں بابو موتی ساگر تھے۔ جن کا ذکر میں ان کے والد رائبہادر لالہ ساگر چند کے حال میں ضمناً کر چکا ہوں[1]۔

---

[1] مجھے اس زمانہ میں خبر نہیں تھی کہ میرے ایک ہم جماعت اور ایک ہم مدرسہ بھی آئندہ اپنی قانونی قابلیت سے دلّی میں نام پیدا کرینگے۔ ان میں سے پہلے لالہ رام کشور ہیں جو پہلی جماعت سے لیکر کالج تک میرے ساتھ رہے اور جن کو ان کی اعلیٰ قانون دانی اور وجاہت کے لحاظ سے آج بجائے رائبہادر لالہ رام کشور کے سر رام کشور ہونا چاہیئے تھا۔ دوسرے سر عبدالرحمٰن ہیں جو مدرسہ اور کالج دونوں میں میرے زمانہ میں موجود تھے لیکن دو جماعتیں پیچھے۔ بہ حیثیت وکیل دلّی میں اور بحیثیت ہائیکورٹ جج صوبہ مدراس میں اپنی قانون دانی کا سکہ بٹھا چکے ہیں اور فی الحال لاہور میں پنجاب ہائیکورٹ کی ججی پر فائز ہیں۔ لالہ رام کشور اور سر عبدالرحمٰن دونو بیسویں صدی کی ممتاز ہستیاں ہیں۔

حافظ عزیزالدین صاحب شاہ عبدالحق محدث کی اولاد میں تھے۔ اور رشتہ میں میرے نانا۔ میرے حقیقی نانا کپتان حسین علی اور حافظ عزیزالدین صاحب سگے چچازاد بھائی تھے۔ حافظ صاحب نہایت وجیہ، لسان اور صاحب علم و فضل تھے۔ انگریزی نہیں جانتے تھے پھر بھی ان کی وکالت بہت چلتی تھی اور حکام پر بڑا اثر تھا۔ آواز میں خاص گرج تھی جس سے ہر شخص پر رعب پڑتا تھا۔ لباس سادہ اور علماء کی شان کا پہنتے تھے۔ پابندیٔ شرع کا بڑا خیال تھا۔ پاجامہ ہمیشہ شرعی وضع کا ہوتا تھا۔ اور عمامہ بھی چھوٹا تھا جس کی لمبائی مشکل سے تین گز ہوتی ہوگی۔ زردہ بانات کی جوتی جو خاص طور سے اجمیری دروازہ کا ایک مسلمان موچی ان کے لئے تیار کرتا تھا۔ مذہبی رجحانات کی وجہ سے آخر میں وکالت ترک کر دی۔ شہر میں ان کی بڑی عزت تھی۔ گلی حافظ عزیزالدین اب تک پنڈت کے کوچہ میں ان کے نام سے منسوب ہے حافظ صاحب کی آل میں مشتاق احمد زاہدی ہیں۔ یہ پہلے بہاولپور کالج میں پرنسپل رہے اور جب سے پنشن ہوئی ہے قرولباغ میں رہتے ہیں۔ ادبی ذوق نہایت اچھا ہے اور تحریر بھی پاکیزہ۔ انہی سے اب حافظ عزیزالدین صاحب کے خاندان کا نام باقی ہے۔

علم و فضل کے تذکرے کو ختم کرنے سے پہلے میں دلی کے اخباروں اور مطبعوں کا بھی کچھ حال لکھنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اردو اخباروں کا معیار غدر کے بعد مختلف وجوہ سے گر گیا تھا۔ دو اخبار نکلتے تھے۔ اکمل الاخبار محلہ بلی ماران سے اور افضل الاخبار حویلی اعظم خاں سے۔ دونوں گھٹیا۔ خبریں بھی غیر مکمل اور اداری تحریریں بھی تیسرے کیا چوتھے درجہ کی۔ حالانکہ علی گڑھ سے اس زمانے میں "تہذیب الاخلاق" ایک اعلیٰ معیار پر شائع ہو رہا تھا۔ مزاحیہ رنگ میں "اودھ پنچ" کی نقل میں "دلی پنچ" جاری ہوا۔ جو کچھ دن چلا لیکن مزاح کو پاکیزہ اور برجستہ رکھنے کے لئے بڑی ذہانت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ورنہ بازاری فقرہ بازی اور ہجو اس شروع ہو جاتی ہے۔ اور صحیح ذوق، بیہودہ اور لایعنی لفاظی سے ہمیشہ نفرت کرتا ہے۔ ایسے ہی اسباب کی بنا پر دلی پنچ

دلی کے چھاپہ خانوں میں مطبع مصطفائی اور مطبع مجتبائی کو خاص شہرت حاصل تھی۔ زیادہ تر قرآن شریف اور مذہبی علوم کی کتابیں شائع کرتے تھے۔ دونوں مطبعوں کی قدر و منزلت ان کی اعلیٰ خطاطی کی وجہ سے تھی۔ مطبع مصطفائی میرے بچپن ہی میں بند ہوگیا۔ لیکن اس مطبع کی چھپی ہوئی کتابوں کی بڑی مانگ رہی۔ اس زمانہ میں جید عالموں کو تصحیح کیلئے رکھا جاتا تھا۔ اور باکمال خوشنویس کتابت کا کام کرتے تھے۔ مولوی ممتاز علی صاحب مرحوم کے ہاتھ کے لکھے ہوئے قرآن شریف کو جو مطبع مجتبائی سے شائع ہوا تھا۔ آجکل بھی قدردان اسی ذوق و شوق سے خریدتے ہیں۔ جیسا کہ انگلستان اور فرانس میں مشہور مصنفین کی پہلی مرتبہ چھپی ہوئی کتابوں کو بڑی بڑی قیمتوں پر مول لیا جاتا ہے۔ مطبع مجتبائی کو اب سے پچاس برس قبل مولوی عبدالاحد صاحب نے جو تھانہ بھون کے رہنے والے تھے خرید لیا تھا۔ اور چونکہ وہ نہایت منتظم شخص تھے اور تجارتی کاروبار کا بڑا تجربہ رکھتے تھے اس لئے مطبع کو بڑی ترقی ہوئی اور اس کی مطبوعہ کتابیں تمام ایشیائی اسلامی ممالک اور افریقہ میں بھی پہنچنے لگیں لیکن کتابت کی صحت اور خطاطی کی دیدہ زیبی مصارف کی کمی اور نفع کی فراوانی کی تدابیر کے نذر ہوگئیں۔ دریبہ کلاں میں منشی بلاقی داس کا بھی ایک بہت بڑا مطبع تھا۔ قدیم علوم و فنون کی کتابوں کی اشاعت میں بھی منشی صاحب نے بھی مشرقی ادب کی کم و بیش ویسی ہی خدمت کی جیسا کہ منشی نول کشور کے مطبع نے لکھنؤ میں ادا کی منشی صاحب کے مطبع میں قرآن شریف کی طباعت اور کتابت کا علیحدہ انتظام تھا۔ اور جس جگہ کام ہوتا تھا صرف باوضو شخص داخل ہو سکتا تھا۔ آجکل کے مذہبی جھگڑوں اور دل آزاری کی باتوں پر جب خیال کیا جاتا ہے تو ایک ہندو مذہب والے کی عقیدت اور احترام پر حیرت ہوتی ہے۔ منشی بلاقی داس کا مطبع تجارتی مد و جزر کی نذر ہو گیا۔ لیکن دریبہ میں اب تک ایک محلہ ان کے نام سے آباد ہے۔ اور خدا کرے کہ ان کی نیک نیتی اور پاک طینتی کی وجہ سے ہمیشہ آباد رہے۔ کوچہ بلاقی داس کے سامنے ہی منشی درگا پرشاد صاحب کتب فروش کی دکان تھی۔ یہ خود فارسی کے عالم تھے۔ اور خریداروں کو اچھی اور صحیح چھپی ہوئی کتابوں کے خرید میں مشورہ دیتے تھے۔ ایک ٹانگ میں لنگ تھی۔ پھر بھی کتابوں کے نکالنے میں تکلف نہ کرتے تھے۔ اور بڑے شوق سے قدیم نسخے دکھاتے تھے۔ خود بھی سارے دن عینک لگائے مطالعہ میں مصروف رہتے تھے۔ اور کتب فروشی کا پیشہ صرف نفع

کمانے کیلئے اختیار نہیں کیا تھا بلکہ اہل علم کی خدمت بھی مدنظر تھی۔ اور اپنے ذہن کو بھی راحت و سرور پہنچانا مقصود تھا۔

غدر نے دلّی اور دلّی والوں پر سخت مصیبت ڈھائی۔ پوربیوں نے جو انگریز معصوم بچوں اور بیکس عورتوں پر ظلم توڑے تھے ان کا خمیازہ دلّی والوں کو اٹھانا پڑا۔ قلعہ کی نواح میں بتھر والے کوئیں کے پاس املی کے درختوں کے نیچے پھانسی گڑا گئی تھی۔ اور وہیں فوجی عہدہ داروں نے ایک عدالت سی قائم کر لی تھی۔ محبوب علی خواجہ سرا جیسے چند مخبروں نے مجرمین کی فہرست مرتب کرائی تھی شریف خاندان نوجوانوں کو بغاوت کے الزام میں بڑے تشدد کے ساتھ پکڑ کر لایا جاتا تھا۔ اور سرسری پوچھ گچھ کے بعد پھانسی پر چڑھا دیا جاتا تھا۔ قلعہ کی بہت سی شاہی عمارات مسمار کر دی گئیں۔ اور انکی جگہ بے ہنگم فوجی بارکیں بن گئیں۔ پریڈ کے میدان اور اس سے ملحقہ آراضی پر دو بڑے بازار تھے۔ ایک اردو بازار کہلاتا تھا اور دوسرے کا نام خانم کا بازار تھا۔ ان کے تمام مکانات اور دکانوں کو ڈھا کر زمین کو قلعہ کی حفاظت کے مدنظر صاف کر دیا۔

بادشاہی خاندان کے اخلاق غدر سے پہلے ہی بہت گر گئے تھے۔ صحیح النسبی عنقا ہو گئی تھی۔ مختلف بازیوں کا شوق تھا۔ غدر کے بعد ان کی حالت اور زبوں ہو گئی۔ سرکار انگریزی نے ان کے گزارے کیلئے پنشنیں مقرر کیں۔ لیکن ان کے چٹورپن اور بد افعالیوں نے سب کو ننگ کر دیا۔

پچاس برس پہلے کی دلّی میں کوئی ڈور سوتنا تھا۔ کوئی بٹیر کا کام کرتا تھا۔ کوئی دہی بڑے بیچتا تھا۔ ان کو دیکھکر عبرت ضرور ہوتی تھی۔ لیکن مسرفانہ عادات کا کیا علاج کیا جائے۔ حضرت شاہ نصیر الدین صاحب عرف میاں کالے صاحب کی صاحبزادی فیروز جہاں صاحبہ کے پاس دو شہزادیاں رہتی تھیں۔ ایک کا نام اشرف زمانی تھا اور دوسری کا عباسی بیگم۔ عباسی بیگم میں حبشی میل بھی ضرور تھا۔ جو قلعہ کی صحبت کا نتیجہ تھا۔ رنگ سیاہ فام اور بال گھونگھر والے۔ افیم کا شوق تھا۔ سرکار انگریزی سے دونوں کو تنخواہ ملتی تھی۔ لیکن وہ افیم پر خرچ ہو جاتی تھی۔ یا بالائی اور ایسے لوازمات پر۔ خدا کا شکر ہے کہ ان کو صاحبزادی صاحبہ کی وجہ سے کھانے پینے اور کپڑے لتّے کی کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ جب تک زندہ رہیں چین سے رہیں۔ لیکن جن کو ایسے توسّل حاصل نہ تھے ان کو بھیک مانگنے کی نوبت پہونچی۔ رات کے گیارہ بجے ہمارے محلہ میں ایک شہزادی گداگری کیلئے نکلتی تھیں۔ افلاس نے نابینا کر دیا تھا۔ اس کی وجہ سے بال بھی کتروا دیئے تھے لیکن آواز خدا نے ایسی دی تھی کہ ہر ایک کے دل پر اثر ہوتا تھا۔ ظفر کی یہ غزل بڑے درد سے پڑھتی تھیں۔

گئی یک بیک جو ہوا پلٹ نہیں دل کو میرے قرار ہے

میری نانی صاحبہ مرحومہ اکثر ان شہزادی کو گلی میں سے اندر گھر میں بلا لیتی تھیں اور غزل کو سن کر روتی رہتی تھیں۔ اور اکثر کپڑے اور نقد ان کو دیتی تھیں۔ میرے والد چونکہ اس زمانے میں ڈپٹی کمشنر صاحب کی پیشی میں سررشتہ دار تھے اور شہزادوں کی تنخواہوں کی کارروائیاں اکثر رہتی تھیں۔ اس لئے شہزادے اور شہزادیوں کا ہمارے گھر میں بہت آنا جانا تھا۔ یہ سب مرزا ثریاجاہ مرحوم کے جو صدر خاندان تھے بہت شاکی تھے۔ پچاس برس پہلے کی دلّی میں جو نام نہاد شہزادے خاص دلّی میں رہ گئے تھے ان میں مرزا فرخندہ جمال اور مرزا ابلاقی کی ذرا حیثیت قائم تھی۔ مرزا ابلاقی صوفی منش تھے۔ سماع میں جب کیفیت ہوتی تھی تو ان کا رقص اور حرکات دیکھنے کے قابل ہوتی تھیں۔ اکثر ایک چھوٹے قد کی گھوڑی پر جس کو وہ خود ٹانگن کہا کرتے تھے نکلتے تھے۔ ڈاڑھی اور نقشہ بہادر شاہ بادشاہ آخری تاجدار مغلیہ سے ملتا تھا۔ شہزادیوں میں مطلبی بیگم صاحبہ اور ان کی پوتی رفیع الزمانی کا جو اس وقت کم سن تھیں میری والدہ صاحبہ سے میل جول تھا مطلبی بیگم صاحبہ نے مرزا ولایت شاہ سے دوسری شادی کر لی تھی۔ میرزا صاحب اچھی صفات کے شہزادے تھے اور آن بان سے رہتے تھے۔ سواری کیلئے شاندار جوڑی تھی۔ سترھویں کے موقع پر اپنی باغیچی میں جو حضرت نظام الدین اولیا کی درگاہ سے تھوڑے فاصلہ پر صفدر جنگ کی سڑک کے شمالی جانب واقع تھی۔ شہر کے مسلمان رئیسوں کی بڑی پرتکلف دعوت کیا کرتے تھے۔ رفیع الزمانی صاحبہ آجکل حیدرآباد میں ہیں اور اکثر ہمارے ہاں تشریف لاتی ہیں۔

شہزادوں کے طبقے کے علاوہ دلّی کے باشندوں کی معاشرت اور عام معیار زندگی کچھ پست نہیں ہوئے تھے۔ سرکاری ملازم، تجارت پیشہ لوگ، اور کاریگر سب مرفّہ الحال نظر آتے تھے۔ ہمارے ہی محلہ چوڑی والان میں اس زمانہ میں سات ڈپٹی رہتے تھے۔ جن میں سے چار کے نام مجھے اب تک یاد ہیں۔ ڈپٹی امیر علی

ڈپٹی سلطان خاں، ڈپٹی جانکی ناتھ اور ڈپٹی فخرالدین۔ پیپل والی گلی اور سیتارام کے بازار کے اس حصّے میں جو پیپل والی گلی سے ملحق ہے دو تین معزز کشمیری پنڈتوں کے مکان تھے جو ڈپٹی یا ایسے مماثل عہدوں پر فائز تھے۔ قاضی کے حوض کے قریب ایک گلی میں پنڈت شومیدت صاحب کا مکان تھا جو جج تھے۔ سرکی والان میں ڈپٹی الٰہی بخش صاحب نے جو نہر کے محکمہ کے ڈپٹی تھے اپنی کوٹھی بنائی تھی۔ یہ خاص دلّی کے باشندے نہ تھے مگر پنشن لینے کے بعد دلّی میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ سرکار نے ان کو آنریری مجسٹریٹ مقرر کر دیا تھا۔ ان کے بیٹوں نے بڑی عزّت حاصل کی۔ چنانچہ محمد رفیق سر محمد رفیق ہوئے۔ اور آخر میں وزیر ہند کی کونسل کے رُکن مقرر ہوئے۔ یہ بیسویں صدی کے پہلے ربع کی بات ہے۔ سرکی والوں ہی میں ڈپٹی اکرام اللہ خاں رہتے تھے۔ ان کے والد انعام اللہ خاں (لقب امتوجان) سمیع اللہ خاں صاحب سی۔ ایم۔ جی کے چچا تھے۔ جس زمانہ کا میں ذکر کر رہا ہوں اس وقت اکرام اللہ خاں دلّی میں رجسٹرار تھے۔ یہ اپنے والد کی شاندار حویلی میں مقیم تھے۔ اس حویلی کے کئی حصّے تھے۔ دلّی کی قدیم حویلیوں کا عام نقشہ یہ ہوتا تھا۔ دالان در دالان، پیچھے شہ نشین جس کی کرسی بلند ہوتی تھی۔ دالانوں کے بازوؤں میں چھوٹے دالان جن کے بھی دو درجے ہوتے تھے۔ اور اندر کے درجے سے شاہ نشین میں جانیکا راستہ ہوتا تھا۔ چھوٹے دالانوں میں سامان رکھنے کیلئے حجرے ہوتے تھے۔ بڑے دالانوں کے سامنے چبوترہ جس کے دائیں بائیں سہ دری صحنچیاں ہوتی تھیں۔ چبوترے کے سامنے کے حصّہ پر مہتابی۔ چبوترے کے نیچے چمن اور روشیں اور وسط میں نہر جس میں فوّارے نصب ہوتے تھے۔ چمن کے اختتام پر ایک اور صحن ہوتا تھا۔ جو ڈیوڑھی تک پہونچتا تھا۔ اور اسی حصّہ میں باورچی خانہ، ماماؤں کے حجرے اور سامان کی کوٹھڑیاں ہوتی تھیں۔ یہ نقشہ میں ڈپٹی امیر علی صاحب کے مکان کے زنانہ حصہ کا دیکھ کر لکھ رہا ہوں جہاں میں نے اپنا بچپن گذارا۔ اور شعور کی عمر کو بھی وہیں پہنچا۔ لیکن شہر میں متعدد حویلیاں اسی شان کی تھیں۔ جن کو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ مثلاً مفتی صدرالدین کی حویلی جو ہمارے مکان سے قریب تھی۔ منشی امتوجان کی حویلی جس کا اوپر ذکر آچکا ہے۔ زینت محل کی حویلی جو اب پٹیالہ ہاؤس کے نام سے موسوم ہے۔ کیا اچھا ہو کہ دلّی کا محکمہ آثار قدیمہ ان قدیم حویلیوں میں سے کسی کو درست کر کے اس زمانہ کے ساز و سامان سے سجائے۔ تاکہ غدر سے پہلے اور بعد کے طرز زندگی اور رہنے سہنے کے لوازمات کا صحیح حال معلوم ہو سکے۔ یورپ میں اہل ذوق اور بلدیہ جماعتوں نے مختلف زمانوں کی تمدنی حالت کو دکھانے کے لئے ایسے مکانات کو محفوظ کر دیا ہے۔

ہاں سرکی والوں میں ڈپٹی اکرام اللہ خاں کا میں ذکر کر رہا تھا۔ ان کے مکان کے سامنے ہی نواب محمد حسن خاں صاحب رہتے تھے جو شہر کے شرفا میں سے تھے۔ لیکن کبوتربازی اور قماربازی دو علتوں میں ان کی خاندانی دولت بہت برباد ہوئی۔ پروفیسر آغا حیدر حسن جو اُردو کے اچھے ادیب ہیں اور عورتوں کی زبان لکھنے میں بے مثل ہیں نواب محمد حسن خاں سے قریبی رشتہ دار ہیں۔

پنڈت کے کوچہ کے اندر ڈپٹی نظام الدین خاں کے علاوہ دو تین اور خوشحال خاندان آباد تھے۔ جن میں سے مولوی نصیرالدین خوجم صاحب اور میر عبداللہ کی اولاد کا اب تک دلّی کے شرفا میں شمار ہوتا ہے۔ خوجم صاحب کے پڑپوتے خواجہ منظور آجکل علیگڈھ میں انگریزی کے پروفیسر ہیں۔ انھوں نے آکسفورڈ یونیورسٹی سے بی۔ اے کی ڈگری انگریزی ادب میں اعزازات کے ساتھ حاصل کی ہے۔ اور ذہین ہونے کے علاوہ ذوق بھی نفیس رکھتے ہیں۔

فراش خانہ میں بہت سے شریف خاندان تھے۔ جن میں سے بعض کے لائق افراد کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ اور اب اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ البتہ نواب اکبر علی خاں اور ان کے بھائی نواب محمد علی خاں اور حکیم حسن رضا خاں کا ذکر کرنا ضروری ہے نواب اکبر علی خاں بہت لسّان تھے۔ اور آداب مجلس سے خوب واقف تھے۔ اسی وجہ سے یہ اکثر ریاستوں میں ندمار کی جماعت میں شریک رہے۔ نواب حامد علی خاں والیٔ رامپور سے ان کی گہری راہ و رسم تھی۔ اور نواب صاحب مرحوم جب دلّی تشریف لاتے تھے تو اکبر علی خاں صاحب کے مکان پر ضرور آتے تھے۔ نواب اکبر علی خاں صاحب کو نادر اشیا کی تجارت کا بھی شوق ہو گیا تھا اور وہ اکثر ریاستوں میں عجائبات فروخت کرنے کی غرض سے جاتے تھے۔ حکیم حسن رضا خاں صاحب کا میرے والد مرحوم سے دوستانہ تھا۔ اور چونکہ وہ اکثر ہمارے مکان پر تشریف لاتے تھے اس لئے مجھے انھیں دیکھنے کا خوب موقع ملا ہے۔ متین،

سنجیدہ، بات نہایت آہستگی سے کرتے تھے۔ شکل، صورت معقول اور لباس بھی نفیس پہنتے تھے۔ ان کے بیٹے علی رضا صاحب اپنے آبائی مکان میں رہتے ہیں۔ بہت باوضع اور خوش خو ہیں لیکن ان کی گفتگو میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ایک میں انتہا درجہ کی نرمی اور وقار اور ایک میں انتہا درجے کی شوخی اور بیباکی۔

گلی قاسم جان میں لوہارو والوں کے خاندان کے علاوہ ڈپٹی ہادی حسین خاں کی بھی خاص شخصیت تھی۔ سرکار انگریزی نے ان کو آنریری مجسٹریٹ مقرر کر دیا تھا۔ فوجداری مقدموں کے تصفیہ میں ذرا سخت سزائیں دیتے تھے۔ اور جب مجرم حسرت اور یاس سے ان کی طرف دیکھتا تھا۔ تو فرماتے تھے "میں کیا کروں میری لال کتاب میں یہی لکھا ہے" قد چھوٹا تھا اور بدن مخنی۔ رنگ البتہ بہت گورا تھا۔ لیکن بڑھاپے نے چہرے پر جھریاں ڈال دیں۔ ڈاڑھی صاف۔ البتہ قلمیں اس زمانے کے طرحدار لوگوں کی طرح لمبی رکھتے تھے۔ محرم میں ان کے ہاں بڑے زور کی مجلس ہوتی تھی۔

لوہارو والوں کے خاندان میں دو معزز ہستیاں تھیں۔ نواب سرامیر الدین خاں جو اس وقت نواب لوہارو تھے۔ لیکن وہ اپنے اعلیٰ تدبر اور سیاست ذاتی کی وجہ سے۔ اور ریاستوں میں بحیثیت مشیر کام کرتے تھے۔ اور اکثر دلی سے باہر رہتے تھے۔ دوسری ہستی نواب احمد سعید خاں کی تھی جو نواب ضیاء الدین احمد خاں نیرؔ کے صاحبزادے تھے۔ اور خصائل اور عادات کے لحاظ سے دلی کے نوابوں کا بہترین نمونہ تھے۔ سرکار انگریزی نے ان کو خاندانی وجاہت کے لحاظ سے صوبہ پنجاب میں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر مقرر کر دیا تھا۔ لیکن جس زمانہ کا میں حال لکھ رہا ہوں یہ دلی واپس آ گئے تھے رنگ گورا، جسم کسرتی، خد و خال متناسب، ڈاڑھی البتہ صرف ٹھوڑی پر تھی۔ لیکن اس کو بڑھا کر اس طرح لپیٹتے تھے کہ ان کے چہرے پر بھلی معلوم ہوتی تھی۔ طبیعت موزوں تھی طالبؔ تخلص تھا۔ عشقیہ رنگ میں اچھا کہتے تھے۔ مزاج میں رنگینی اور ساتھ ہی بانکپن بھی تھا۔ گھوڑے کی سواری کا شوق تھا۔ کاٹھیاواڑ اور بالوترے کی نسل کے گھوڑے اپنی سواری میں رکھتے تھے ذرا سی ایڑ کے اشارے سے گھوڑے کو الف کرنا۔ اور پچھلی

دونوں ٹانگوں پر چلانا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ یہ مظاہرے اکثر چاوڑی بازار میں ہوتے تھے۔ طوائفیں بالاخانوں سے نواب صاحب کی شہسواری کی داد میں سلام کرتی تھیں۔ یہ شان سے سلام لیتے ہوئے گھوڑے کو ایڑ لگا کر آگے بڑھ جاتے تھے۔ آداب مجلس اور خاندانی وقار کا یوں بڑا خیال تھا۔ بات چیت میں نہایت مہذب اور متین تھے۔ تاہم گفتگو میں ایک خاص شگفتگی تھی۔

کشمیری دروازے کے قریب نواب سلطان مرزا صاحب دلی کے ایک اور خاندانی امیر رہتے تھے۔ ان کو بھی گورنمنٹ نے آنریری مجسٹریٹ مقرر کر دیا تھا۔ وسط شہر میں منشی جیون لال کا قدیم مکان تھا۔ ان کا خاندان ہمیشہ ممتاز رہا ہے۔ راج نرائن صاحب نے بیرسٹری شروع کر دی تھی۔ لیکن ان کو بہ حیثیت وکیل زیادہ شہرت بیسویں صدی میں حاصل ہوئی۔

زیر جامع مسجد بڑے امام صاحب کی ذات بابرکت سے رونق تھی۔ ان کے مورث اعلیٰ شاہجہاں کے زمانے میں دلی آئے تھے۔ امام صاحب کی قرأت اور روانی مشہور تھی۔ رمضان شریف میں تراویح کی نماز میں ان کی قرآن خوانی کو سننے کیلئے لوگ بڑی کثرت سے جمع ہوتے تھے۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک دریا موجزن ہے۔ پھر ہر لفظ کے حروف کو صحیح مخرج سے ادا کرتے تھے۔ اور وقفوں کا بھی بدرجہ اتم خیال تھا ان کے صاحبزادے سید احمد صاحب بھی جوان ہو گئے تھے۔ یہ اب شمس العلماء کے خطاب سے ممتاز ہیں اور اپنا تمام وقت خدمت خلق میں گذارتے ہیں۔

مٹیا محل پر مفتی صدر الدین خانصاحب کے نام کا جھنڈا بجائے تھے۔ نواب عنایت الرحمٰن خانصاحب ملازمت کے سلسلہ میں حیدرآباد چلے گئے تھے۔ لیکن ان کے دونوں صاحبزادے محمد حسن خاں اور ابو الحسن خاں وہیں مقیم تھے۔ محمد حسن خاں صاحب نے سینٹ اسٹیفنز کالج سے بی۔ اے پاس کیا۔ ان کا شمار در اصل بیسویں صدی کی ابتدا کی ممتاز ہستیوں میں ہونا چاہیئے۔ محمد حسن خانصاحب کے دوستوں میں حکیم اجمل خاں صاحب، نواب فیض احمد خانصاحب مولوی عنایت اللہ صاحب اور زین العابدین خانصاحب تھے۔ زین العابدین خاں صاحب ڈپٹی سلطان خانصاحب کے نواسے تھے۔ یہ سب بیسویں صدی میں چمکے۔

تراہا بیرم خاں میں مولوی انوار الحق صاحب کی ذات علم و فضل کے لحاظ سے خاص امتیاز رکھتی تھی۔ لیکن یہ ایجنٹ گورنر جنرل کے میر منشی کے عہدے پر فائز ہوکر آبو چلے گئے تھے۔ بیسویں صدی میں اس خاندان کے بعض اراکین نے اچھی شہرت حاصل کی۔ مثلاً انعام الحق صاحب جو گورنمنٹ آف انڈیا محکمہ خارجہ کے اسسٹنٹ سکریٹری تھے۔ ڈاکٹر مشرف الحق صاحب مرحوم جو ڈھاکہ یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر رہے۔ سلام الحق صاحب اور صبیح الدین صاحب جو پوسٹ ماسٹر جنرل کے عہدوں تک پہنچے۔ اور احتشام الدین صاحب جن کا انتقال ابھی حال میں ہوا ہے اور جو اُردو لغت کی تدوین میں ایک بڑا کارنامہ چھوڑ گئے ہیں۔

تراہہ بیرام خاں سے قریب سرسید کا مکان تھا جو اب بھی موجود ہے۔ لیکن ان کا خاندان دلّی چھوڑ چکا تھا۔ میر برعلی صاحب کے صاحبزادے بھی دلّی سے باہر چلے گئے تھے۔ اور پنشن لیکر بھی دلّی سے باہر رہے۔ لیکن میر صاحب کے نواسے میرزا محمد سعید صاحب محکمہ تعلیمات کے مختلف اعلیٰ عہدوں پر فائز رہ کر اب دلّی آ گئے ہیں۔ اور اپنے خاندانی مکان میں مقیم ہیں۔ یہ اُردو کے مایہ ناز ادیب ہیں۔

چیلوں کے کوچہ میں نواب شرف الدین صاحب دلّی کے ممتاز شرفا میں سے تھے۔ سرسید نے اپنے لڑکے جسٹس محمود کی شادی انہی کی صاحبزادی سے کی تھی۔

تموّل اور ظاہری ثروت کے لحاظ سے چھنّا مل والوں کا خاندان شہر میں سب پر فوقیت رکھتا تھا۔ میرے بچپن میں رائےبہادر لالہ رام کشن داس اس خاندان کے صدر تھے۔ انھوں نے اپنی جائداد کا نہایت عمدہ انتظام کیا۔ اور آمدنی کو بہت بڑھایا۔ روز صبح کو گھوڑے پر سوار ہوکر دیکھ بھال اور ہدایات دینے کے لئے نکلتے تھے۔ اہل خاندان کی عزّت کا بڑا خیال تھا۔ رہنے سہنے اور سواری کا انتظام صدر خاندان کے ذمّے تھا۔ جیب خرچ کے لئے ہر فرد کے واسطے معقول رقم ماہانہ مقرر تھی۔ شام کے وقت چاندنی چوک میں ان کے کوٹھے کے نیچے شاندار گاڑیوں کی ایک لمبی قطار لگی رہتی تھی۔ بہترین نسل کے گھوڑے جتے ہوتے تھے۔ ساز و سامان بھی چمکدار اور سائیسوں اور کوچوانوں کی وردیاں بھی بھڑک دار۔ تہواروں کے موقع پر مکان کو خوب سجایا جاتا تھا۔ دلّی میں اس وقت بجلی کی روشنی نہیں ہوئی تھی۔ لالہ رام کشن داس نے اپنے مکان کیلئے علیحدہ انجن سے روشنی کا انتظام کر رکھا تھا۔ دیوالی پر کوٹھے کے نیچے زیبائش اور روشنی کو دیکھنے کیلئے تماشائیوں کا ہجوم رہتا تھا۔ میلوں کے موقع پر اس خاندان کے افراد بہت داد و دہش کرتے تھے۔ چنانچہ پھول والوں کی سیر میں ان کے کوٹھوں پر سے پھول والوں کو اور نفیری والوں کو جو پنکھے کے ہمراہ ہوتے تھے بنارسی دوپٹے اور نقد رقوم انعام میں دی جاتی تھیں۔ پچھلے پچاس برس میں اس خاندان میں بہت سی قبل از وقت موتیں ہوئیں۔ جن میں لالہ رادھے موہن کی وفات قابلِ افسوس ہے۔ ان کا نام آئندہ دہلی پولو ٹورنمنٹ شیلڈ سے باقی رہے گا۔ جو انہی کا عطیہ ہے۔ آج کل لالہ لاڈلی پرشاد صاحب صدر خاندان ہیں جو میرے قدیم عنایت فرما ہیں۔

لالہ رام کشن داس صاحب کے مکان کے قریب ہی چاندنی چوک میں رائےبہادر لالہ ہردھیان سنگھ کا مکان تھا۔ یہ اتنے دولت مند تو نہیں تھے۔ پھر بھی سرکار میں ان کا اچھا خاصہ رسوخ تھا۔ اور میونسپلٹی کے وائس پریسیڈنٹ بھی تھے۔ شکل و صورت اچھی تھی۔ مونچھیں سفید ہوگئی تھیں لیکن خاصی گھن دار تھیں اور ان کو خوب تاؤ دیا جاتا تھا۔ طبیعت شوقین تھی۔ میلوں ٹھیلوں میں گھوڑے پر نکلتے تھے۔ بلدار کنارے کی چھوٹی ٹیڑھی ٹوپی تن زیب کا چست انگرکھا جس میں سے کسرتی ڈنٹر اور بازو نمایاں رہتے تھے۔ اور آڑا تنگ چوڑی دار پاجامہ، گلے میں آڑا دوپٹہ بڑے بانکپن سے پڑا ہوتا تھا۔ کبھی کبھی گھوڑے پر سوار ہوکر چاوڑی بازار میں بھی آتے تھے۔ چاوڑی بازار کو اس زمانہ کی لندن کی پکاڈلی (Piccadilly) سمجھنا چاہیئے۔

روپیہ کے لین دین اور ہنڈی پرچے کے کام میں گوڑ والوں کا خاندان دلّی میں سب میں قدیم تھا۔ میرے بچپن میں لالہ سری کشن داس اس خاندان کے صدر تھے۔ بیسویں صدی کے شروع میں ان پر بہت مصیبتیں آئیں۔ اور ان کی کوٹھی کا دیوالہ نکل گیا۔ اپنی ذات سے بہت نیک اور اولوالعزم شخص تھے۔ دلّی میں ہندو کالج کی بنیاد انھوں نے ہی ڈالی تھی۔ جبینی خاندان میں اس زمانہ میں لالہ ایشری پرشاد اور لالہ سلطان سنگھ بہت ممتاز تھے۔ لالہ سلطان سنگھ کو تو بیسویں صدی کے دلّی والوں میں شمار کرنا چاہیئے۔ ان دونوں نیک نفس ہستیوں کی خصائل کا اثر بعد میں ان کی اولاد میں بھی رہا۔ چنانچہ لالہ ایشری پرشاد

کے صاحبزادے لالہ پارس ناتھ مرحوم بھی اپنی نیک صفات اور وسیع مشربی کی وجہ سے شہر میں بہت ہردلعزیز تھے۔ اور لالہ سلطان سنگھ کی مہمان نوازی، علم دوستی اور خدمت خلق کا جذبہ ان کے بیٹے اور پوتے میں اب تک موجود ہے۔ سی۔ ایف۔ اینڈ روز کو لالہ سلطان سنگھ کے خاندان سے بڑی محبت تھی۔ اور یہ محبت ان کے جیتے جی باقی رہی۔ میں سی۔ ایف اینڈ روز سے آخری مرتبہ ۱۹۳۶ء میں انہی کے مکان واقع کشمیری دروازہ میں ملا تھا۔

داد و ستد کے کاروبار میں دلی میں اور بہت سی کوٹھیاں بھی تھیں۔ مثلاً دھولیا والوں کی جو سیتارام کے بازار میں رہتے تھے۔ لیکن ان کا لین دین اور ہنڈی پرچے گوڑ والوں کی طرح سارے ہندستان پر حاوی نہ تھے۔ دلی کی مرفہ الحالی جو غدر کے بعد تھوڑی بہت رہ گئی تھی۔ اس کا دارومدار صنعت و حرفت اور باکمال مزدوروں پر تھا۔ دلی کے ہنرمند، نگینہ تراشنے والوں (حکاکوں) اور خوش ذوق سادہ کاروں اور جڑیوں نے شہر کے جوہریوں کو دولت مند بنا دیا۔ پہلے بھی دلی کے جوہری امیر تھے لیکن میرے بچپن میں دیکھتے ہی دیکھتے یہ کہیں سے کہیں پہنچ گئے۔ بعض کی تو دریبہ کلاں میں چاندی کے سامان کی معمولی دکانیں تھیں۔ اور اب مسوری، آگرہ، دلی میں ان کی بڑی بڑی شاپیں (Shops) ہیں۔ جوہری بازار میں پہلے کوٹھے پر ایک حکاک کی دکان تھی۔ یہ استاد پہاڑ گنج میں رہتے تھے۔ لیکن ہیرے کو ایسا تراشتے تھے۔ اور اس پر ایسی جلا دیتے تھے کہ بلجیم اور ہالینڈ کی تراش کا شبہ ہوتا تھا۔ نمونہ ان کو دید یجیے اور پھر ان کے کمال کو دیکھئے۔ آپ کو یورپ کے تراشیدہ نگینے اور ان کے تراشیدہ جواہر کی آب و تاب میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا تھا۔ دلی کے جڑیوں اور سادہ کاروں کو بعض انگریز جوہریوں نے بھی نوکر رکھ لیا تھا۔ مثلاً ہملٹن اینڈ کمپنی میں بھی دلی کے صناع ملازم تھے۔ لیکن وقت کی پابندی اُن کی سرشت میں نہ تھی۔ اس لئے بیش قرار تنخواہوں کی ملازمت کو چھوڑ کر بھاگ آئے۔ یہ طبقہ خوش صورت، خوش پوشاک اور خوش خوراک ہے لیکن کام میں بے حد دیر لگانے والے اور گاہک کی اعزاض سے سخت لاپروا۔ ان سے کام لینا دلی کے جوہریوں ہی کا حق تھا۔ سادہ کار زیادہ تر زیر جامع مسجد، کوچہ استاد حامد، چاہ رہٹ اور کوچہ رائمان میں رہتے تھے۔ آج کل بھی دلی کے سادہ کاروں کا کام نفاست اور صناعی کے لحاظ سے ہندوستان میں سب سے بہتر سمجھا جاتا ہے۔ اور یہ ان کے بنے ہوئے زیور کو وہی فوقیت حاصل ہے جو یورپ میں پیرس کے زیور کو۔

حکاکی کی صنعت کی ضمن میں مہرکنی کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ میرے بچپن میں چند اہل کمال رہ گئے تھے۔ لیکن مغلیہ بادشاہت کے بعد اس ہنر میں کوئی بدر الدین مہرکن پیدا نہ ہوا۔ جو غدر کے بعد اس صنعت کے آخری استاد تھے۔ مصوری بھی روبہ انحطاط تھی۔ صرف استاد فقنل کا خاندان رہ گیا تھا۔ یہ عجائبات فروشوں کی فرمائش پر قدیم تصویروں کی نقل کرتے تھے۔ جو برسات میں دریوں کے نیچے رکھ دی جاتی تھیں۔ اور جب رنگ ملگجے ہو کر ان کا نیا پن چلا جاتا تھا۔ اور بعض کو جھینگر بھی چاٹ جاتے۔ تھے تو پھر یہ اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کے عہد کی بیان ہو کر یوریپن اور امریکن سیاحوں کے ہاتھ منہ مانگی قیمتوں پر بکتی تھیں۔ اس قسم کی جعل سازی دلی لاہور، بنارس، آگرہ اور جے پور میں اب بھی کھلم کھلا ہو رہی ہے نتیجہ یہ ہے کہ تخلیقی قوت کو کھو کر صرف نقال بن گئے ہیں۔ اب ان سے کوئی تصویر کھنچوائیے تو فوٹو کی نقل کرتے ہیں۔ صاحب شبیہ کے خد و خال اور ذہانت کو اپنے تصوّر سے نمایاں کرنے کے فن کو بھول گئے ہیں۔ رنگ بھی اب ٹکیوں کے استعمال کرتے ہیں۔ جن میں کچھ عرصے کے بعد وہ خوشنمائی اور تازگی نہیں رہتی جو قدیم رنگوں میں صدیاں گزرنے کے بعد بھی موجود ہے۔ ہندستان کے قدیم استادوں نے لاجورد، شنگرف اور سونے کو حل کر کے تو بلاشک بہت پائدار اور نفیس رنگ تیار کئے۔ لیکن ان کا زنگاری رنگ جو شاید طوطیا (Copper Sulphate) سے تیار ہوا تھا وہ شاید کامیاب نہیں ہوا۔ کیونکہ پرانی کتابوں کی اکثر جدولیں اس رنگ کی وجہ سے ضائع ہو گئی ہیں۔ حالانکہ انہی کتابوں کا لاجوردی اور طلائی کام صدیوں بعد بھی بالکل نیا معلوم ہوتا ہے۔

ایک اور بہت بڑی صنعت جس سے غریبوں کے پیٹ بھی پلتے تھے اور دلی کے تجارت پیشہ طبقہ کو اس سے نفع بھی معقول ہوتا تھا۔ گوٹہ کناری، اور زریں مسالہ کی تیاری اور کارچوبی سامان کی تھی۔ جو دساور کے طور پر ہندستان کے بڑے بڑے شہروں میں اور صنعت کے نمونوں کی صورت میں باہر بھی جاتا تھا۔ مسلمان محلوں میں بیسیوں کارخانے دبکی، تارکشی اور بٹائی کے تھے۔ عورتیں گھروں میں ٹھپہ،

وغیرہ اور مختلف قسم کی پیکیں علیحدہ بنتی تھیں۔ گوکھرو، مقیش اور گوٹے پٹھے کا کام زیادہ تر خناری بازار میں ہوتا تھا۔ جہاں کئی سو دکانیں تھیں۔ زردوزی کا کام کارچوب پر بھی ہوتا تھا۔ اور علیحدہ ہاتھوں پر بھی۔ اس کام میں دلی کا نفیس ذوق مشہور تھا۔ اور اچھے زردوز اس زمانہ میں ڈیڑھ روپیہ سے ڈھائی روپیہ تک روزانہ اجرت لیتے تھے۔ بعض بڑے کارخانوں میں ماہانہ معاوضہ پر بھی کام کرتے تھے۔ کارخانہ دار کی اس زمانہ کے معیار زندگی کے لحاظ سے آسودہ حالت تھی۔ ان کو عام پیشہ ور روزمرہ کی گفتگو میں کرخندار کہا کرتے تھے۔ اور ان کی زبان اور محاوروں کو باہر والے کو سمجھنا اتنا ہی دشوار ہے جیسا کہ معمولی انگریزی جاننے والوں کو شہر لندن کے خاص رہنے والوں (Cockneyese) کی گفتگو اور لب و لہجہ کو سمجھنا۔ کارخانہ دار اور کاریگر چونکہ مزدوریاں معقول پاتے تھے اور دن بھر خوب محنت کرتے تھے اس لئے تفریح کیلئے مشاغل بھی پیدا کر لئے تھے۔ خالی وقت میں کبوتر بازی یا پتنگ بازی ہوتی تھی۔ بعض نے گانیوالے پرند مثل اگن، چنڈول، شام دیڑ پال لئے تھے۔ جن کی وہ خوب خدمت کرتے تھے۔ اور بولنا سکھاتے تھے۔ گرمی کے موسم میں یہ اپنے پرندوں کو صبح و شام تازی ہوا کھلانے ٹھنڈی سڑک اور پریڈ کے میدان میں لے جاتے تھے۔ اس سے ان کی خود کی صحت بھی اچھی رہتی تھی۔ اور پرندوں کی بھی۔ اور آپس میں فقرے بازی اور ٹھٹول ہو کر تفریح بھی ہو جاتی تھی۔ چاوڑی بازار کے طوائف کے کوٹھوں کی رونق بھی انہی سے تھی۔ شام کو کاریگر نہا دھو، بن ٹھن، سفید لباس پہن اس بازار میں چکر لگاتے نکل جاتے تھے یہ ستا سماں تھا۔ اگر کاریگر مسلمان ہے تو چکن یا کڑھا کے کرتے پر گورنٹ کی صدری ضرور ہوتی تھی۔ جس کے حاشیہ پر زردوزی کا کام ہوتا تھا۔ جوتی بھی شام کو ہمیشہ اچھی پہنتے تھے جو اکثر ٹاٹ بافی کے کام کی ہوتی تھی۔

اس زمانہ میں گوٹہ کناری اور کارچوبی سامان کے تاجر ہندو اور مسلمان دونوں تھے۔ مسلمانوں میں حاجی علی جان والوں کا کارخانہ اور کوٹھی بہت مشہور تھے۔ یہ زیادہ سامان دیسی ریاستوں میں بھیجتے تھے۔ اب بھی کوٹھی باقی ہے لیکن ذوق بدل جانے سے کاروبار کا وہ زور نہ رہا۔ اس خاندان کے لوگ پابندی شرع میں بھی مشہور رہے ہیں۔ لیکن پتنگ بازی کا شغل اس وقت شاید معیوب نہ سمجھا جاتا تھا۔ کیونکہ حاجی علی جان کے خاندان کے بعض افراد خوب پینچ لڑاتے تھے۔ میرے بچپن میں اس فن کے استاد رنگی مل تھے۔ جن کی جامع مسجد کے نیچے پانوں کی دکان تھی۔

کارچوبی اور کلابتونی کام کے ساتھ ساتھ ٹوپیوں اور جوتیوں کی تجارت کو بھی بڑا فروغ تھا۔ اور کثرت سے مال باہر جاتا تھا۔ دلی کے پیشہ ور اور تاجر جو یہ بیوپار کرتے تھے خوب دولت مند تھے۔ ہمارے محلہ (چوڑی والان) میں جوتوں کی تجارت کرنے والے سوداگروں کے بہت سے گھر تھے۔ یہ سب خوش حال تھے۔ اور دور دور ان کی دکانیں تھیں۔ جن میں بنارس، کلکتہ اور حیدرآباد ان کی تجارت کے بڑے مرکز تھے۔ اب ولایتی سامان کے شوق اور رواج نے ان کے کاروبار پر پانی پھیر دیا۔

ولایتی سامان کی تجارت میں دلی کی آبادی کا ایک طبقہ البتہ امیر کبیر ہو گیا تھا۔ یہ کسی زمانہ میں پنجاب سے آئے تھے اور اس نسبت سے پنجابی کہلاتے تھے۔ لیکن ان کو دلی میں بسے ہوئے ڈیڑھ سو برس کے قریب ہو گئے تھے۔ اور لباس، طرز گفتگو اور عام معاشرت میں دلی والوں میں اور ان میں کوئی فرق نہ تھا۔ یہ زیادہ تر لاہور اور ملتان سے آئے تھے۔ چونکہ انھوں نے شادیاں اپنی ہی برادری میں کیں اور مخلوط النسل نہیں ہوئے اس لئے دلی کے پنجابیوں کے خد و خال پنجاب کے کھتریوں سے ملتے جلتے ہیں۔ دلی کے جوتے والے بھی غالباً پنجاب سے آئے تھے۔ اور ان کے گورے رنگ اور پاکیزہ نقشے آریائی خد و خال سے مشابہت رکھتے ہیں۔ دلی کے پنجابی تجارت کی جانب فطرۃً مائل ہیں۔ اور جو خصائل اور ذہانت تجارت پیشہ لوگوں میں ہونی چاہئیں وہ اللہ تعالیٰ نے ان کو دی ہیں۔ دلی کے بہت سے پنجابی کاروبار کی خاطر کلکتہ چلے گئے ہیں۔ اور وہاں ان کا لاکھوں کا بیوپار ہے۔ اور بڑی بڑی دکانیں ہیں۔ خاص دلی میں صدر کی رونق انہی سے ہے۔ چاندنی چوک میں بھی ان کی بہت سی دکانیں ہیں۔

دلی کی دستی صنعتوں میں پچاس برس پہلے تانبے کے برتنوں کی صنعت بھی خاصی اہمیت رکھتی تھی۔ چاوڑی بازار کے شمالی جانب جامع مسجد سے لیکر قاضی کے حوض تک کسیروں کی دکانیں تھیں جہاں تانبے کے برتن بکتے تھے۔ اس کے علاوہ ملحقہ گلیوں میں ٹھٹھیرے، ڈھلیے اور جتیے کام کرتے تھے۔ ٹھٹھیرے تانبے کو پیٹ کر برتنوں کی شکل درست کرتے تھے۔ ڈھلیے

برتنوں کو ڈھالتے تھے اور چھیتے نقش و نگار کا کام کرتے تھے۔ جہاں یہ کاریگر کام کرتے تھے وہاں اتنا غل و شور ہوتا تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ تانبے کا سامان دلی کے نواح کے دیہات میں بھی جاتا تھا۔ اور دساور کے طور پر دور شہروں میں بھی۔ چینی اور کانچ کے برتنوں کے استعمال نے اس دستی صنعت کو خاصا نقصان پہونچایا ہے۔ کلوں اور بڑی صنعتوں کا رواج میرے بچپن میں عام نہیں ہوا تھا۔ گو ہماری گلی میں لالہ بھ نامل نے اور اجمیری دروازہ کے قریب لالہ نتھے مل جانکی داس نے لوہے کے سامان کو ڈھالنے کے کارخانے جو انجن سے چلتے تھے نئے نئے قائم کئے تھے۔ دہلی کلاتھ مل گنیش فلور مل اور دہلی بسکٹ فیکٹری بھی بن گئی تھیں۔ یا بننے والی تھیں۔ ان بڑے بڑے کارخانوں کے قیام اور ولایت کی بڑھتی ہوئی تجارت نے دلی کے مالدار لوگوں کو تو خوب فائدہ پہنچایا۔ اور وہ لکھ پتی اور کروڑ پتی ہو گئے۔ لیکن دستی صنعت والے طبقے رفتہ رفتہ تباہ ہو گئے۔

پچاس برس پہلے دلی والوں کی عام صحت اب سے کہیں بہتر تھی۔ ہر محلہ اور گلی میں اکھاڑا تھا۔ کثرت ہوتی تھی۔ ورزش جسمانی کا شوق تھا۔ گھروں میں مگدروں کی جوڑیاں اور بل ڈنڈ عام طور سے نظر آتے تھے۔ کھانے پینے کی چیزوں کی فراوانی تھی۔ اور ہر چیز عمدہ اور تازہ ملتی تھی۔ گھی جو عنقا ہو گیا ہے دلی کے دیہات سے ایسا دانہ دار اور خالص آتا تھا کہ جاڑے کے موسم میں روکھا کھانے کو جی چاہتا تھا۔ روپیہ کا ڈیڑھ سیر ملتا تھا۔ دودھ ڈیڑھ آنہ فی سیر۔ سبز ترکاریاں بھی نہایت ارزاں تھیں اور میوہ بھی جن کے مہیا کرنے کے لئے دلی کی نواح کے باغ موجود تھے۔ آبادی اتنی گنجان نہیں تھی۔ میرے بچپن میں دلی شہر کی مردم شماری ایک لاکھ بارہ ہزار تھی۔ اور صدر، کشن گنج، سبزی منڈی۔ اور پہاڑ گنج کو ملا کر کل ڈیڑھ لاکھ۔ اتنے نفوس کی آبادی کے لحاظ سے صفائی کا انتظام بُرا نہیں تھا۔ اور تانگہ والوں کے گھوڑوں کی لید اور فضلے اور کوڑے کرکٹ کے انبار جو اب گلی کوچوں میں نظر آتے ہیں۔ اس وقت دیکھنے میں نہیں آتے تھے۔ نہ سہ منزلہ چہ منزلہ عمارتوں نے مکانوں کو کبوتروں کی کابک بنا دیا تھا۔ اور نہ ٹریموے سے دلی کے بازاروں کی وسعت سکڑی تھی۔ ذوق لطیف والے کے لئے چاندنی چوک کے قدیم بازار میں خاص دلکشی تھی۔ جس کے بیچ میں مسقف نہر تھی۔ اور دو رویہ سایہ دار درخت تھے۔ ہندستان میں یہ بازار اپنی وضع کا ایک ہی تھا۔ اور شاید دمشق اور حلب کے اسلامی نامانہ کے قدیم بازاروں کے طرز پر بنایا گیا تھا۔ یورپ والوں نے اسلامی ممالک سے بازاروں کی اس وضع کو اپنے بڑے بڑے شہروں میں نقل کیا۔ اور فی زمانتا پیرس کے بولواہر (Boulevard) اس طرز کے بازار دنیا میں سب میں زیادہ خوبصورت ہیں۔ نئی دلی کے کنگز وے (Kingsway) کو بھی پیرس اور برسلیز کے بولواہروں کے طرز پر ترتیب دیا گیا ہے۔ مگر اس کو بدمذاقی کہئے یا ستم ظریفی کہ جو قدیم بازار دلی میں اس وضع کا موجود تھا اس کے سایہ دار درختوں اور نہر کو برباد کر کے ٹریموے کی لائنوں کیلئے گنجائش پیدا کی گئی۔

کسی شہر کی معاشی حالت دکھانے کیلئے میلوں اور تہواروں کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ جب لوگ مرفہ الحال ہوتے ہیں۔ اور کاروبار کا زور ہوتا ہے تو تفریح کی بھی سوجھتی ہے۔ دلی کے لوگ ہمیشہ سے سیلانی جیوڑے مشہور ہیں۔ اور یہاں کے متعلق یہ فقرہ بھی تقریباً ضرب المثل بن گیا ہے کہ دلی میں بارہ مہینے بارہ میلے۔ یعنی سارا سال تہواروں میں ہی گزرتا ہے۔ جو بڑی حد تک ٹھیک ہے۔ ابھی بہار کا موسم پورے طور پر شروع بھی نہیں ہوتا کہ بسنتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ بسنت یعنی ہندوؤں کا تہوار ہے لیکن مسلمان درویشوں اور شاعروں کی وسیع مشربی نے ان میلوں کو مزارات سے نسبت دیکر آپس کے میل جول اور دوستی اور یگانگت کا اچھا ذریعہ بنا دیا تھا۔ پہلی بسنت پہاڑوں پر اللہ میاں کے نام کی ہوتی تھی۔ اور پھر دلی کی مختلف درگاہوں پر۔ قطب صاحب سے لیکر سوئی والوں اور بھولو شاہ[1] کے مزار تک جو کابلی دروازہ کے قریب واقع ہے۔ یہ میلہ زیادہ تر طوائفوں اور شوقین مزاجوں کا ہوتا تھا۔ اور بچے بھی کھلونوں، جھولوں اور مٹھائی کی خاطر پہنچ جاتے تھے۔ جس زمانہ کا میں حال لکھ رہا ہوں اس میں موٹروں، تانگوں اور گھوڑا گاڑیوں کا زیادہ رواج نہ تھا۔ طوائف بیل کے تانگوں میں بیٹھ کر

---

[1] ان بزرگ کا صحیح نام شاید بوعلی شاہ ہو۔ لیکن فقرا بعض اوقات ایسے نام بھی رکھ لیتے ہیں۔

نکلی تھیں۔ ان تانگوں کی ساخت بے چھتری کے یکے کی سی ہوتی تھی۔ لیکن ان میں خوبصورت بیلوں کی جوڑیاں جتی ہوتی تھیں۔ اور طوائف تانگ پر ٹانگ رکھ کر ایک دلبایانہ انداز سے ان میں بیٹھتی تھیں۔ اور ہچکولوں کا مطلق خیال نہیں کرتی تھیں۔ میں نے چوتی اور دوتی دونوں بہنوں کو جو ڈیرے دار طوائف تھیں اور اپنے زمانہ میں نہایت خوبصورت مشہور تھیں۔ چاوڑی بازار میں شام کے وقت ایسے تانگے میں نکلتا دیکھا ہے۔ تانگے کے ناگوری بیل جن کے سینگوں پر سنگوٹیاں اور گلے میں گھنٹیاں اور ہیکلیں پڑی ہوتی تھیں تانگہ کو لیکر بازار میں بڑے زور سے دوڑتے تھے۔ اور یہ دونوں بہنیں تانگہ میں شان سے بھی بیٹھی رہتی تھیں۔ جیسے کوئی شہسوار کسی تیز رو گھوڑے پر مطلق نہیں ہلتا۔ کچھ زمانے کے بعد میں نے نورجہاں کو ولایتی لینڈو میں جس میں آسٹریلین گھوڑوں کی جوڑی جتی ہوتی تھی چاوڑی بازار میں سے گزرتے ہوئے دیکھا۔ اور پھر کوئی دس برس بعد ہی بازار میں چھپا کو نفیس موٹر میں بیٹھے دیکھا۔ بعض ثقہ پڑھنے والے شاید مجھ پر چیں بہ جبیں ہوں اور کہیں کہ میں طوائف کا کیا قصہ لیکر بیٹھ گیا لیکن جس زمانہ کا میں حال لکھ رہا ہوں اس وقت شرفا کا طوائف کے کوٹھوں پر اگر نشاط اور سرور کی خاطر نہیں تو کم از کم آداب مجلس اور لب ولہجہ درست کرنے کے لئے جانا روا سمجھا جاتا تھا۔

میں بسنتوں کا ذکر کر رہا تھا۔ ابھی ان کا سلسلہ ختم ہونے نہیں پاتا تھا کہ پھاگن کا مہینہ لگتے ہی جوان لڑکیاں ہولی کے گیت گانے شروع کر دیتی تھیں۔ اور ڈھولک کی آواز بڑی رات گئے تک سنائی دیتی تھی۔ آخری تین دن تو بے حد زور رہتا تھا۔ اور گلی کوچوں میں سے رنگ کی پچکاریوں سے بچ کر نکلنا محال ہوتا تھا۔ آجکل جو جھگڑے مذہبی تنگ نظری کی وجہ سے ہوجاتے ہیں وہ کبھی نہ ہوتے تھے۔ میں نے خود ٹیسو والے اور نیل کے کٹرے میں اپنے مدرسہ کے لڑکوں کے ساتھ رنگ کھیلا ہے۔ دولہنڈی کی شام کو کمپنی باغ میں بڑے زور کا میلا ہوتا تھا جس میں ہندو مسلمان یکساں شریک ہوتے تھے۔ اور آپس میں خلوص ومحبت سے گلے ملتے تھے۔

گرمی کے موسم میں سوائے مسلمان تہواروں کے جو غیر معین وقت پر آتے ہیں اور جن کا میں بعد میں ذکر کروں گا۔ کوئی مشہور میلہ یا تہوار دلی میں نہیں ہوتا تھا۔ البتہ امیر لوگ اپنے ذاتی باغوں میں تفریح کیلئے چلے جاتے تھے۔ اور متوسط طبقہ اور پیشہ ور لوگ قطب صاحب، جوگ مایا، اوکھلے اور دلی کی مشہور شاہی عمارتوں اور باغات میں سیر کیلئے جاتے تھے۔ ان کی ٹولیاں کی ٹولیاں ہمایوں کے مقبرے، صفدر جنگ اور شمسی تالاب پر نظر آتی تھیں۔ گرمی کے موسم میں فالیزوں پر بھی دعوتیں اور ناچ رنگ کے جلسے ہوجاتے تھے۔ جن میں زیادہ تر دلی کے صناع اور پیشہ ور لطف اٹھاتے تھے۔ برسات میں البتہ میلوں اور تہواروں دونوں کا زور ہوجاتا تھا۔ اوّل تو ساون آتے ہی گھر گھر جھولے پڑ جاتے تھے اور ہنڈول اور ملہار گائے جانے لگتے تھے۔ سلونوں کا میلہ شاہدرہ کے شاہی باغ میں بڑے زور سے ہوتا تھا۔ ایک دفعہ میں بھی گیا تھا۔ اور مسیتی جان کا گانا یاد ہے۔ یہ دلی کی مشہور طوائف میں سے تھی شکل تو اچھی نہ تھی۔ لیکن گلا خدا نے عجیب دیا تھا۔ اسی وجہ سے ان کو حکیم واصل خاں کی مجلس میں خاص قرب حاصل ہوگیا تھا۔ سلونو بڑا پُر اثر تہوار ہے۔ بہن بھائیوں کے ہاتھ میں چمکتے ہوئے دست بند باندھتی ہے۔ جن کو راکھی کہتے ہیں۔ اور اس بندش سے اپنے رشتۂ الفت کو مضبوط کر کے انھیں اشیرباد دیتی ہے بھائی جوش محبت سے بہنوں کو تحفے اور نقد رقم بطور نیگ دیتے ہیں۔

برسات میں جب جمنا خوب چڑھتی تھی تو پیراکی کا میلہ ہوتا تھا جوان تیراک دم اور تیزی میں ایک دوسرے سے مقابلہ کرنے کی خاطر مجنوں کے ٹیلے یا ٹوٹے ڈکنوں سے چلتے تھے اور فیروز شاہ کے کوٹلہ کے پاس آکر نکلتے تھے جہاں مسابقت کا فیصلہ کرنے والے ماہرین جمع رہتے تھے۔ پیراکی کے استاد کوٹلے پر اپنے فن کا کمال بھی دکھلاتے تھے۔ کوئی کھڑی لگاتا تھا، کوئی آلتی پالتی مارے صرف انگوٹھے کے ذریعے سے پانی کو چیرتا چلا جاتا تھا۔ شاید یہ میلے اب بھی ہوتے ہیں۔

برسات کا سب میں بڑا میلہ قطب میں ہوتا تھا۔ جس کو پھول والوں کی سیر کہتے تھے۔ یہ بھادوں کے آخر میں ہوتا تھا۔ اور اس میلہ میں دلی کی آبادی کا بڑا حصہ دو تین روز کیلئے شہر چھوڑ کر قطب چلا جاتا تھا۔ اور غریب امیر یکساں رنگ رلیاں مناتے تھے۔ میرے لائق دوست مرزا فرحت اللہ بیگ نے ایک مستقل مضمون اس میلہ کے متعلق لکھا ہے جو علیحدہ کتاب کی صورت میں شائع ہوگیا ہے۔ اور پڑھنے کے قابل ہے۔ بھادوں کے آخر میں بڑے بڑے مندروں میں سانجھیاں نکلتی تھیں۔ اور ساتھ ہی گانے اور ناچ کا انتظام ہوتا تھا۔ سانجھیوں کا مقصد تو مقدس تصویریں بنانا تھا لیکن ان سے

نقاشی کا فن بھی تازہ جان ہوجاتا تھا۔ اور صاحب کمال کو داد بھی مل جاتی تھی۔ لوگ جوق جوق ان سانجھیوں کو دیکھنے کیلئے نکلتے تھے اور گانے کی محفلوں میں بھی شریک ہوتے تھے۔ آشوین کے مہینے میں جس کو دلی والے عام طور سے کوار کہتے ہیں دو بڑے ہندو تہوار آتے ہیں۔ ایک دسہرہ اور دوسرا دیوالی۔ یہ سارے ہندوستان میں منائے جاتے ہیں۔ اور بمبئی کی دیوالی کی روشنی اور ریاست میسور کے دسہرے کا جلوس تزک و احتشام اور شان و شوکت میں سارے ملک میں مشہور ہیں۔ لیکن یہ دونوں تہوار دلی میں پچاس برس پہلے جس طرح منائے جاتے تھے اس کی نمایاں خصوصیت شہر کے باشندوں کی بے لوث مذہبی امنگ اور پُرخلوص عقیدت کا جوش تھا۔ جلوس اور مظاہرے جو رام لیلا کے نام سے موسوم ہیں اور جن کو کھلی فضا کا ناٹک سمجھنا چاہیئے گیارہ دن تک جاری رہتے تھے اور دلی والے اور دلی کے مضافات کے باشندے بڑی کثرت سے تماشہ دیکھنے کیلئے جمع ہوتے تھے۔ دسہرہ کے تین روز پہلے خلقت کا اژدحام بڑھ جاتا تھا۔ اور دسہرے کے روز تو کشمکش اور تماشائیوں کے ریلوں اور دھکا پیل کا ٹھکانا نہیں رہتا تھا۔ لیلا کی واپسی شام کے وقت چاوڑی بازار میں ہوتی تھی۔ جہاں گھنٹوں پہلے سنگھاسن کے آنے کا انتظار رہتا تھا۔ اور نوعمر اور جوانوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگ کر راستہ تقریباً بند ہوجاتا تھا۔ تماشائیوں میں ہندو مسلمان یکساں شریک ہوتے تھے۔ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ رام لیلا کے اژدحام اور میلے کی عام رونق کی کیفیت کچھ ایسی محبوب تھی کہ مہینوں پہلے سے اس میلے اور تہوار کا مجھ کو اور میرے ہم عمر دوستوں کو انتظار رہتا تھا۔

دیوالی کے تہوار کی بھی یہی کیفیت ہوتی تھی۔ اور ہمارے گھر میں تو ہندو دوستوں کے پاس سے مٹھائی کے اتنے تھال آتے تھے کہ دیگیں بھر جاتی تھیں۔ دیوالی کی روشنی کا مرکز دریبہ کا محلہ تھا جہاں گلاب گندی کی دکان شاندار جھاڑوں اور رنگ برنگ کی ہانڈیوں سے سجائی جاتی تھی۔ پوجا کے لئے کھلونے بھی بکتے تھے جن میں کرشن جی اور گوالنوں کی مورتیوں کی خوب بکری ہوتی تھی۔ لیکن غازی کمہار کی دکان پر ہر سال شہر کے کسی عہدہ دار کی شبیہ بھی بنائی جاتی تھی۔ مجھے سینڈے خاں کوتوال اور نجم الدین تحصیلدار کی مورتیں خوب یاد ہیں۔ جن کی بہت تعریف ہوئی تھی۔ اور کثرت سے فروخت ہوئیں۔ غازی کمہار کا خاندان کھلونے بنانے میں مشہور تھا۔ اور اس کے کھلونے یورپ کی نمائشوں میں بھی جاتے تھے۔

مسلمان تہواروں میں محرّم کی مجلسیں نہایت احترام اور مذہبی جوش سے منعقد ہوتی تھیں۔ اور مہندی کے جلوس بھی بڑے کرّ و فر سے نکلتے تھے سبیلوں کا سلسلہ محلّہ در محلّہ ہوتا تھا۔ اور بڑے بازاروں میں تو ان کی آرائش دیکھنے کے قابل ہوتی تھی اعظم خاں کی حویلی میں عبدالرحمٰن زنگساز براق کی تصویر بناتا تھا۔ اور تمام شہر کے معزز لوگوں کو گھر پر جا کر دعوت دیتا تھا۔ کہ وہ آ کر

---

[1] رام لیلا کے ہی موقع پر ٹیسو اور جھانجھیاں نکلتی تھیں۔ ٹیسو ایسے حلال خور جن کو پہلوانی کا شوق ہوتا تھا اور کسی مشہور اکھاڑے سے بھی تعلق رکھتے تھے نکالتے تھے۔ اور جھانجھیاں ان کی بیویاں۔ خود ٹیسو تو ایک سپاہی کی مورت ہوتی تھی۔ مونچھیں چڑھی ہوئی۔ کلڑکی دار پگڑی سر پر۔ مورت کا صرف اوپر کا آدھا دھڑ ہوتا تھا جس کو تین بانسوں کی ایک ٹکٹکی پر جما دیتے تھے۔ ٹیسو کے جلوس والے بانیاں سُناتے تھے۔ بانی شہر کے کسی تازہ واقعہ کا منظوم قصہ ہوتا تھا۔ جس کو یہ لوگ ایسے جذبات کے لحاظ سے تیار کرتے تھے۔ میرے بچپن میں مدیر جان طوائف کا قتل ہوگیا تھا۔ ٹیسو والوں نے اس کی آ

ص۔ بانی بنائی تھی۔ جس میں عشقیہ اور رزمیہ دونوں رنگ موجود تھے۔ اگر ایک اکھاڑے کے ٹیسو والوں کی دوسرے اکھاڑے کے ٹیسو والوں سے راستے میں مڈبھیڑ ہوجاتی تھی تو اکثر لاٹھی چل جاتی تھی۔ ایسے جملے ان کے ورد زبان تھے "ٹیسو ہے شیخو والوں کا۔ جبڑا توڑے گوندی شاہ والوں کا" جھانجھی مٹی کی ایک ہانڈی ہوتی تھی۔ جس کے اندر نوک دار آلوں سے چھید کر دیئے جاتے تھے۔ اور بعض اوقات پھول بھی بنائے جاتے تھے۔ حلال خوریاں ان ہانڈیوں میں مٹی کے چراغ روشن کر کے گھر گھر انعام مانگتی پھرتی تھیں۔ جھانجھیوں کے گیت بندھے ہوئے تھے۔ جن میں گھر کی بہو بیٹیوں کا نام داخل کر کے" اونچی اٹریوں" کا ذکر ہوتا تھا۔ اور آخر میں" اسیس" مانگی جاتی تھی۔ ٹیسو والے جھانجھی کے دشمن ہوتے تھے۔ اور اگر راستے میں دیکھ لیتے تھے تو پتھر مار کر جھانجھی کو پھوڑ دیتے تھے۔

س فن کے کمال کو دیکھیں۔ دلی کے زنگسازوں میں شاید اس فن کا وہ آخری استاد تھا۔ اور جب غدر کے بعد دیوان خاص کی چھت کے سنہری کام کی درستی ہوئی تھی تو وہ کام عبدالرحمٰن نے ہی کیا تھا۔ عام طور سے وہ استاد جبّو کے نام سے مشہور تھا۔ ساتویں کو مہندی کا جلوس چتلی دروازے سے لمبے وزیر کے ہاں سے نکلتا تھا۔ اور نویں کو تعزیے گشت لگاتے تھے۔ خانساماں کا تعزیہ موری دروازے سے اور فوج والوں کا دریا گنج سے آتا تھا۔ اور قاضی کے حوض پر دونوں کا ملاپ ہوتا تھا۔ خانساماں کے تعزیے کو اس کی بلندی کے لحاظ سے دلی والے نوگزا کہا کرتے تھے۔ تعزیوں کے بنانے میں بھی صنعت کا اظہار کیا جاتا تھا۔ اور شہزادوں کے تعزیے کی نفیس گل تراشی ہمیشہ خراج تحسین حاصل کرتی تھی۔ قاضی کے حوض پر سب چھوٹے بڑے تعزیے رات کے ساڑھے گیارہ بارہ بجے تک جمع ہو جاتے تھے۔ اور پھر جامع مسجد کی طرف جاتے تھے۔ جہاں لالہ بھڑبھونجے کی دکان کے سامنے مجرا اٹھتا تھا۔ یہ لال کاغذ سے منڈھا ہوتا تھا۔ اور اندر کھپچیوں اور بانسوں کے ڈھانچ میں گولے اور پٹاخے لگائے جاتے تھے۔ جن کی آواز اور گونج فضا میں دیر تک رہتی تھی۔ بڑے تعزیوں کے آگے پٹہ بازوں، لبر ہم داروں اور بنوٹ پھرانے والوں کی جماعتیں بھی ہوتی تھیں۔ جو مہینوں پہلے سے اپنے اپنے فن کی مشق کرتی تھیں۔ اور تاک میں رہتی تھیں کہ کس طرح دوسری ٹکڑی کے حریف کو نیچا دکھائیں تعزیوں کے ساتھ پیشہ ور مرثیہ خوانوں اور سوز خوانوں کے علاوہ بعض خوش گلو محض عقیدت سے بھی پڑھتے تھے۔ اور جس زمانہ کا میں حال لکھ رہا ہوں اس وقت صاحب عالم مرزا محمد شجاع کی مرثیہ خوانی بہت مشہور تھی۔ یہ شہزادوں کے تعزیے کے ساتھ برہنہ سر، برہنہ پا، سینہ چاک رہتے تھے۔ اور اس درد سے پڑھتے تھے کہ سننے والوں کے دل شق ہوتے تھے۔ بڑا تو صاحب عالم کی خوش گلوئی کا اثر تھا۔ اور پھر مذہبی جوش اور عقیدت کا۔ جب یہ چاوڑی بازار میں پہنچتا تھا طوائف کوٹھوں پر سے اتر کر ساتھ ہو جاتی تھیں۔ اب بھی دلی میں محرم اسی خلوص اور مذہبی عقیدت سے ہوتا ہوگا۔ لیکن لمبے وزیر، خانساماں اور صاحب مرزا محمد شجاع کہاں؟*

دونوں عیدیں بڑے زور سے منائی جاتی تھیں۔ اور ان کے بعد جوڑ کے میلے محلدار خاں اور حکیم عبدالمجید خاں کے باغ میں ہوتے تھے ان میں صناع اور کاریگر لوگوں کی خوشی اور انبساط کی کوئی حد نہیں رہتی تھی۔ ان موقعوں پر شہر کے ہندو مسلمان آپس میں بغل گیر ہوتے تھے۔ اور ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے تھے۔ اگر کسی فریق میں جھگڑا بھی ہو جاتا تھا تو ایسے تہواروں پر پان اور الائچی کی تواضع اور پھولوں کے ہاروں کی مدارات سے رفع ہو جاتا تھا۔ نزاعوں کے طے کرنے میں حکیم مجید خاں اور چھناملوں والوں کا خاندان ہمیشہ نمایاں خدمات انجام دیتا تھا۔

شب برات کا تہوار بچوں کیلئے بیشک خطرناک تھا۔ ہر سال ایک دو بچے آتشبازی کی نذر ہو جاتے تھے۔ کیونکہ پوٹاس کے گولے ہر محلہ میں بچے بناتے تھے۔ اور وہ خطرے کو بالکل نہ سمجھتے تھے۔ نالیں بھی بعض اوقات عمدہ لوہے کی نہیں ہوتی تھیں۔ اور بارود زیادہ بھرنے سے پھٹ جاتی تھیں۔ آتش بازی کی صنعت دلی میں اب باقی نہیں رہی ہے۔ ورنہ براتوں میں انار اور مہتابیوں کا ایسا زور ہوتا تھا کہ فضا روشنی اور رنگ برنگ کے پھولوں سے جگمگا جاتی تھی۔ میرے ہمیشہ کے رفیق اور گہرے دوست میرزا فرحت اللہ بیگ بھی اپنی نانی کے ہاں سے جو فراش خانہ میں رہتی تھیں اڑن انار بنانے کی ترکیب سیکھ آئے تھے۔ اور شب برات کے دنوں میں سامان جیبوں میں بھرا رہتا تھا۔ اور دوستوں کو خوش کرنے یا ان پر رعب جمانے کیلئے شام کو تو کیا دن کو بھی انار اڑائے جاتے تھے۔ یہ حضرت سگریٹ کے ٹین میں چھید کر کے اور اس میں بارود بھر کر اس کو بھی اڑاتے تھے۔ آواز نال سے تو کم لیکن پوٹاس کے گولوں کے برابر ہوتی تھی۔

---

* دلی کی مشہور گانے والی کالی جان نے آخر میں توبہ کر کے صاحب عالم سے شادی کر لی تھی۔ کالی جان کے ریکارڈ ایک زمانہ میں بہت مقبول تھے۔ یہ ڈیرہ دار طوائف میں سے تھیں اور امیر جان پانی پت والوں سے قریبی خاندانی تعلق تھا۔ پچاس برس پہلے کی دلی میں امیر جان کے گانے کی بھی بڑی دھوم تھی۔ آواز نہایت رسیلی اور پاٹ دار تھی۔ اور مجلس پر چھا جاتی تھیں۔ اب سنتے ہیں بی مجیدن جو اسی خاندان سے ہیں اپنی نانی پرنانی کی روایات کو نبھا رہی ہیں۔

مسلمانوں کے مذہبی میلوں میں دونوں ستر ھویاں اور
قدم شریف کا ربیع الاول کے مہینے کا ختم بھی خلقت کے اجتماع کے
لحاظ سے خاصے پر رونق ہوتے تھے۔ ستر ھویں کا لطف سُننا
ہے سیر تماشے کے لحاظ سے اب کم ہو گیا ہے۔ نسق اور مجبوری
عجیب ہے۔ اور اس کا عروج اسنادا ادھُورا ہونا چاہئے۔ لیکن مذہبی
زندگی باتوں کیلئے پابندیاں قائم کرنے میں ایسی وسیع مشربی
برتنی چاہئے جس سے امنگ مردہ نہ ہو۔ کیونکہ جب کسی قوم کی
امنگ تباہ ہو جاتی ہے تو وہ قوم بھی تباہ ہو جاتی ہے۔ قدم شریف
کے ختم کا ذکر میں شاہ محمد عمر صاحب کے حالات میں ضمناً کر چکا ہوں۔
اس لئے میں دوہرانا مناسب نہیں سمجھتا۔ البتہ ختم کے زمانے میں
ربیع الاول کی سترہ ورہ تاریخوں سے قلندر دلی کے دیہات اور
باہر شہروں سے آنے لگتے تھے۔ ان کے سر پر کلاہ اور بدن پر لمبا
جبہ ہوتا تھا۔ دلی والے ان کو ملنگ کہتے تھے۔ یہ گھڑ گھڑ دھم قلندر،
دودھ ملیدا، اللہ ہی دیگا۔ کی صدائیں لگاتے ہوئے پہنچتے تھے۔
اور بڑے تحکم سے چاندی کا چراغ مانگتے تھے۔ اور کوئی پس و پیش
کرتا تھا تو یہ قلندر وار کودتے رہتے تھے۔ اور صدا کے ساتھ یہ جملہ
چاندی کا چراغ اللہ ہی دیگا دہراتے رہتے تھے۔[1]

اس زمانہ کی بڑی بوڑھیوں کا یہ خیال تھا کہ دلی بائیس
خواجہ کی چوکھٹ ہے۔ اور ربیع الاول کے مہینے میں بہت سے
بزرگ اس بھیس میں دلی آتے ہیں۔ اور یہیں سے قطب،
ابدال بنتے ہیں۔ اس لئے ان قلندروں کے سوال کو ہرگز
نہ ٹالنا چاہئے۔ جو مانگیں وہ دینا چاہئے۔ بڑی بوڑھیوں کا
یہ خیال بالکل ٹھیک ہوگا۔ لیکن ہم ظاہر بینوں نے تو ان حضرات
کو سارے دن کی کمائی کے بعد قدم شریف کے تکیوں میں
جہاں یہ آکر اترا کرتے تھے۔ شام کے وقت بھنگ کے پیالے پئے

---

[1] دلی کے تحکم سے مانگنے والے فقیروں میں جٹا دار ہندو سادھو اور
اور مسلمان عقیدے کے منچلے بھی میرے بچپن میں کثرت سے
نظر آتے تھے۔ سادھو ننگ دھڑنگ فقط لنگوٹ لگائے سارے
بدن پر بھبوت ملے اور ہاتھوں میں لوہے کا بڑا چمٹا لئے آن دھمکتے تھے
اور گانجے کے نشے سے یا راکھ وغیرہ ملنے سے ان کی آنکھیں دہکتے
ہوئے انگارے کی طرح چمکتی تھیں۔ عورتیں اور بچے ان سے ڈر جاتے
تھے۔ اور جو سادھو جی مانگتے تھے وہ پیش کیا جاتا تھا۔ منچلوں کی
صدائیں اور اعمال زیادہ دلچسپ تھے۔ ان کے بال لمبے لمبے، ایک
ہاتھ میں لوہے کی چوڑیاں اور چھوٹا سا لکڑی کا ڈنڈا۔ گلے میں جھولی
جس میں لوہے کے سوئے، چھریاں اور اسی قسم کی جارحانہ چیزیں
ہوتی تھیں۔ اکثر ٹولیوں میں نکلتے تھے۔ نظیر کا کلام لوہے کی چوڑیوں
کی جھنکار کے ساتھ پڑھتے تھے۔ زیادہ تر یہ نظم دنیا کی بے ثباتی
پر بہت پڑھی جاتی تھی۔
"آیا تھا بڑی دور سے اک ہنس بچارا"
اپنی صدا سُنانے کے بعد اگر دکاندار بخیل ہوا اور ان کو خاطر خواہ
نذرانہ نہیں دیا تو یہ حضرت بے تکلف سُوا اپنے حلقوم کے
پاس کے گوشت میں بھونک کر آر پار کر لیتے تھے یا ہتھیلی کے
دونوں طرف نکال دیتے تھے۔ اور جب تک دکاندار خطاوار
کی طرح ان کو خوش نہ کر دیتا تھا یہ وہاں سے نہ ٹلتے تھے۔

قدیم دلی کے فقیروں میں خمروں کی جماعت بھی قابل
ذکر ہے۔ یہ غالباً تکیوں کے فقیروں کی بیبیاں ہوتی تھیں۔ کیونکہ
یہ اکثر قدم شریف کے راستے پر یا حضرت نظام الدینؒ کی سڑک
پر یا قطب صاحب کے راستے میں پہاڑ گنج کے قریب ملتی تھیں۔
اور ان سب مقامات پر تکیوں کی کثرت تھی۔ یہ بھی بہت لیچڑ ہوتی تھیں
اور بغیر پیسہ لئے پیچھا نہ چھوڑتی تھیں۔ سوال کا طریقہ ایک قسم کی
ریں ریں ہوتا تھا۔ جس کا نہ کوئی تال نہ سُر۔ اور اس میں ایسے فقرے
"تیرے بٹوے میں پیسہ دھرا ہے دھرا ہے" سننے والے کو ہنسا
دیتے تھے۔ خمرے کا لفظ خمر بمعنی نشہ سے غالباً مشتق ہے خمرے
اردو زبان میں اوباشوں کو کہا جاتا تھا۔ اب بھی مسلمان شادیوں میں
شہدے اور خمرے شاید آتے ہیں۔ نکاح کے ختم کے بعد بھی ان کی
دعا کا یہ جملہ "الہٰی دولہا ست پوتا ہو" میرے کانوں میں بسا ہوا
ہے۔

ان کا کام انعام مانگنے کے علاوہ جہیز کے سامان کا دلہن
والوں کے گھر سے دولہا والوں کے مکان تک پہنچانا بھی تھا۔
نام ان کا شہدا یا خمرا ہو لیکن یہ ایسے امین سمجھے کہ
سامان سپرد ہونے کے بعد ایک چیز ادھر سے
ادھر نہ ہوتی تھی۔ ورنہ شادیوں کی ہڑبونگ اور بے ہنگام
سب کو معلوم ہے۔

وہ منی، جڑھلتے ہوئے یاگا بجے اور جرس کے دم لگاتے دیکھا ہے۔

پچاس برس پہلے کی دلیؔ کی جو تصویر ہم نے آپکے سامنے پیش کی ہے ممکن ہے اس میں بعض ضروری خد وخال چھوٹ گئے ہوں۔ اور وہ کمی کوئی صاحبِ ذوق حسن ادیب پوری کر دے۔ دلیؔ صدیوں سے آباد ہے۔ اور کئی چولے بدل چکی ہے لیکن ہر چولے میں ذہانت، اولوالعزمی اور نیک نفسی اس کا شعار رہے ہیں۔ اس کی طینت میں جذب کرنیکی خاص صلاحیت ہے۔ باہر سے علما اور اہلِ کمال آئے۔ اور اس نے ان کو اپنا لیا۔ اس صدی میں بھی ڈاکٹر انصاری اور محمد علی آئے اور لیڈر بن گئے۔ وقت کے چکر سے بعض ٹیڑھے غار بھی برسرِ اقتدار ہو جاتے ہیں۔ لیکن دلیؔ تھوڑے عرصہ میں ان کو جنتری کے تار کی طرح سیدھا کر دیتی ہے۔ اس شہر کا شعور زمانہ کے رنگ کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ جب سیاسی فضا ہوئی تو ہر دیال کو پیدا کر دیا۔ لیکن اس سپوت کو ساری عمر جلاوطنی میں یورپ میں گزارنی پڑی۔ اور زیادہ کڑی آزمائش کی ضرورت ہوئی تو امیر چند اور ابد بہاری ہنستے ہوئے پھانسی پر چڑھ گئے۔ آجکل اقتصادی ترقی اور سائنس کی رہنمائی کی ضرورت ہے سر سری رام اور سر شانتی بھٹناگر پیدا ہو گئے ہیں۔ اور ایسے ہی باکمال پیدا ہو جائیں گے۔

کروٹیں بدلا کریگا یونہی دورِ آسماں
رات دن بنتے بگڑتے ہی رہینگے یہ نشاں

ہمسرِ کعبہ تجھے سمجھیں اسی قابل ہے تو
نام ہے دلیؔ ترا ہندوستاں کا دل ہے تو

گھونگھٹ میں گوری جلے

کرشن چندر کے چودہ طنزیہ مضامین، افسانوں اور ڈراموں کا تازہ مجموعہ۔ مجلد معہ دلکش سرورق قیمت ایکروپیہ بارہ آنہ

ساقی بکڈپو دہلی سے طلب فرمائیے

دعوتِ سجدہ

رقص میں ماہ و آفتاب
گرم نشاط آسماں
وجد میں شامِ پُرسکوں
صبح بہار گل فشاں
فرش سے لیکے عرش تک
جھوم رہی ہیں مستیاں
کس کے حضور میں اثرؔ زمزمہ خواں ہے کائنات

(۲)

شوق سے گردنِ فلک
سجدہ میں ہے جھکی ہوئی
جوشِ نیاز سے زمیں
قدموں میں ہے بچھی ہوئی
اے دلِ بے خبر اب تجھے
کچھ بھی نہ آگہی ہوئی
سربسجود تو بھی ہو سجدہ کناں ہے کائنات

اثرؔ صہبائی

ہر فرعونے را موسیٰ

(۱)

نعرۂ روحِ مطمئن بن گیا نالۂ جرس
زندہ دلانِ حق طلب گرمِ سفر ہیں پیش و پس
قصرِ "خدائے مصر" میں آئے کلیمِ خوش نفس
سب جسے معجزہ کہیں ان کی زباں میں ہے وہ جس
آنکھ میں اک نیا اثر بات میں ایک عجیب رس
جاہ کی ہی نہیں طمع، مال کی بھی نہیں ہوس

(۲)

عزمِ کلیم سے چلا یادِ کلیم پا گئی
راہِ نجات خود بخود سامنے سب کے آ گئی
چشمِ کلیمِ حق نگر خاص سبق پڑھا گئی
"غاصبِ حق" کے قصر کو سیل کی طرح ڈھا گئی
ہاں یہ نگاہِ نکتہ رس کون و مکاں پہ چھا گئی
کیسے کوئی سمیٹ لے ذوقِ نگاہِ نکتہ رس

(۳)

مالکِ تاج و تخت ہے صورتِ سرو پا بہ گل
مثلِ کلیم خاک ہو اس کا مزاج معتدل
اور بھی اس کو کر دیا تنگ دلی نے منفعل
روح خجل، زباں خجل، قلب خجل، نظر خجل
جلوۂ نگر کلیم سے آنکھ ملائے کور دل!
حسرتِ دید و کم نظر، گوہرِ اشک و بوالہوس!!

(۴)

قدر کرے کلیم کی سرکشِ یکہ تاز کیا
قلبِ "سیہ دروں" میں ہو عظمتِ پاکباز کیا
داد حقیقتوں کی دے معتقدِ مجاز کیا
جاہلِ تنگدل کرے سیرِ جہانِ راز کیا
مردِ خدا کا ساتھ دے فردِ زمانہ ساز کیا
خوش ہمہ داں سے کیوں رہے ہیچمدان و ہیچ کس

(۵)

اب تو "خدائے مصر" کی موت کا راز سمجھئے
سیلِ فنا کی رَو میں کیا "غاصبِ فتنہ گر" بہ گئے
منعمِ زر پرست نے پیش جو منصوبے کئے
ان کو جلا کے آپ نے باغ کئی لگا دیئے
خاص فضا نہ ہو اگر خاص نگاہ کیلئے
ہے یہ متاعِ گلکدہ عام روش میں خار و خس

سیّد علی منظور

مرزا فرحت اللہ بیگ

لاحول ولا

نام تو ان کا نبی اللہ خاں تھا مگر اپنے تخلص کی وجہ سے مولانا وحشی کہلانے لگے۔ اور اس تخلص نے وہ زور پکڑا کہ لوگ ان کے اصلی نام کو بھول گئے۔ ہر مشاعرے میں پہنچتے اور دو غزلہ سہ غزلہ پڑھتے اور بڑے زوروں سے پڑھتے۔ شاگرد بھی بہت سے ہو گئے تھے۔ اس لئے دنیا کا کچھ کام کرنے کو وقت بہت کم ملتا تھا۔ اور جو کچھ وقت ملتا تھا وہ یہ ریاضت اور عبادت میں صرف کر ڈالتے تھے۔ ظاہر ہے کہ جس شخص میں یہ دو صفتیں جمع ہو جائیں وہ بھلا دنیا کے کس کام کا رہتا ہے۔ اور دنیا کا کام نہ کرے تو گذارہ کیسے ہو۔ شاگردوں سے تو کچھ ملنے کی کیا توقع ہو سکتی ہے۔ ہاں پیری مریدی میں بہت کچھ مل سکتا ہے بشرطیکہ روپیہ کھینچنے کی صلاحیت ہو۔ انھوں نے کوشش بھی کی کہ کچھ روپے پیسے والوں کو مرید کریں مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ اور کامیابی بھی کیسے ہوتی جب مرشد کیلئے کسی قدر پولیٹکل ہونا بھی ایک لازمی چیز ہے۔ اور یہ ٹھیرے محض ایک کٹ حجت شاعر۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کمانے نہ پینے کا خرچ نکلنا مشکل ہو گیا۔ خیر یوں بھی کسی نہ کسی طرح گھسٹ ہی جاتی۔ مگر ریاضت کی گرمی نے شادی پر مجبور کیا اور ان کے گلے میں "سنت پیمبر" پڑ گئی۔

یہ تو آپ بھی جانتے ہوں گے کہ ایک اور ایک دو ہوتے ہیں۔ میاں اور بیوی مل کر دو آدمیوں کے برابر ہونے چاہئیں۔ یہاں بھی یہی صورت پیش آئی۔ یہ تو تھے سوکھے سہمے آدمی۔ اور بیوی ملیں "ڈبل وسٹ" اور اس طرح ان دونوں کی جسامت نے مل کر اصول بالا کی تکمیل کر دی۔ خدا معلوم یہ کیا بات ہے کہ ہمیشہ مفلسی میں آٹا گیلا ہوتا ہے۔ بھلا مولانا وحشی اس کلیہ سے کیسے بچتے۔ ایک سے دو ہوئے، پھر دو سے تین۔ اور بڑھتے بڑھتے ایک سے چھ ہو گئے۔ موٹی بیوی کی آواز ہمیشہ کرخت اونچی ہوتی ہے۔ اور ہونی بھی چاہیے۔ کیونکہ پیٹ کا ہیر پھیر گنبد کی گونج کا کام دیتا ہے۔ اس لئے تھوڑے ہی دنوں میں محلہ والوں پر ان کے گھر کا رنگ کھل گیا۔ اور کھانا پینا تو رہا ایک طرف خود ان کی شاعری اور ریاضت پر اثر پڑنے لگا۔ آخر تنگ آ کر انھوں نے اللہ میاں کو "الٹی میٹم" دینے کی ٹھان لی۔ پہلے تو انھوں نے سوچا کہ اللہ میاں سے لڑائی مول لینی ٹھیک نہیں ہے لیکن جب گھر والی کی زیادتیوں نے ان کے انجر پنجر ڈھیلے کر دیئے تو انھوں نے بھی پکا ارادہ کر لیا کہ اب جو ہو سو ہو اللہ میاں کو ایک آخری موقع دیکر ان سے قطع تعلق کر لیا جائے۔ چنانچہ ایک دن تہجد کی نماز پڑھنے کے بعد انھوں نے دعا کو دونوں ہاتھ اٹھائے اور کہا کہ "دیکھئے اللہ میاں ہماری اور آپکی اس طرح نبھنی مشکل ہے۔ اب دو ہی صورتیں ہیں یا تو ہمارے رزق کا دروازہ کھولئے یا ان بیوی بچوں سے ہم کو نجات دلوایئے۔ ورنہ سمجھ لیجئے کہ کل رات کے بارہ بجے سے ہماری اور آپ کی الگ ہے"۔

اللہ میاں کے کارخانوں کو سمجھنا ذرا مشکل کام ہے۔ جب جی چاہتا ہے وہ بغیر مانگے گھر بھر دیتے ہیں۔ اور جی نہیں چاہتا تو کتنی ہی ناک رگڑو۔ ایک پیسہ نہیں دیتے۔ اب رہا بیوی بچوں کو ٹھکانے لگانا تو اللہ میاں سے یہ کیا امید ہو سکتی ہے کہ وہ محض ایک آدمی کے کہنے سے پوری پانچ جانوں کا خاتمہ بالخیر کر دینگے۔ اس لئے مولانا وحشی کی اس ناواجبی دعا کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ اور دوسرے دن ٹن ٹن کر کے رات کے بارہ بج گئے۔ یہ بھی دھن کے پکے تھے۔ مصلیٰ اٹھا کر ایک طرف پھینکا۔ اور ایک ایسی ہستی کی طرف رجوع ہوئے جو اپنے آپ کو اللہ میاں کا مد مقابل سمجھتی ہے۔ اور نہایت خشوع و خضوع سے کہا کہ "اے معلم الملکوت اب تیرے سوا میرا کوئی آسرا نہیں ہے۔ جس در سے بہت کچھ امید ہے اس نے اپنے در سے خالی ہاتھ واپس کیا۔ تو میری مدد فرما اور میری باقی عمر آرام سے گذار دے میں اپنی یہ ناچیز ہستی اب تیرے سپرد کرتا ہوں۔ اگر تو نے بھی مدد نہیں کی تو میں سمجھوں گا کہ دنیا میں غریبوں کا کوئی نہیں ہے"۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ گھر میں گندھک کا سا دھواں بھر گیا۔ اب یہ کیا دیکھتے ہیں کہ جو ہاتھ انھوں نے دعا کیلئے اٹھائے تھے ان کی بائیں ہتھیلی پر کوئی دو تین انچ اونچا ایک آدمی کھڑا ہے۔ لمبا

چہرہ ہے۔ بڑی بڑی مونچھیں ہیں۔ فرینچ فیشن ڈاڑھی ہے سر پر دو سینگ ہیں۔ پاؤں کے بجائے کھُر ہیں۔ پیچھے ایک لمبی سی دم ہے۔ گہرا سرخ رنگ ہے اور سیاہ لباس ہے انھوں نے گھبرا کر ہاتھ کو جھٹکا دیا۔ مگر وہ شخص جس طرح انکی ہتیلی پر جما ہوا تھا اسی طرح چپکا رہا۔ اور کہنے لگا "مولانا! یا تو مجھے اس جوش سے بلایا تھا یا اب اس طرح مجھے دُور کرنیکی فکر کر رہے ہو" انھوں نے کہا کہ "آپ ہیں کون؟" اس نے کہا کہ "میں وہی ہوں جس کو آپ یاد کر رہے تھے۔ اور جس کی مدد کے آپ طالب تھے" انھوں نے کہا "تو آپ شیطان ہیں" اس نے کہا کہ "جی ہاں۔ پہلے میں معلم الملکوت تھا اور اب معلم الانسان ہوں۔ لیکن دینا والے میرے تخلص کے لحاظ سے مجھے شیطان کہنے لگے ہیں۔ فرمائیے کہ میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں" شیطان یہیں تک کہنے پایا تھا کہ مولانا وحشی کی زوجہ محترمہ نے کوٹھڑی میں سے آواز دی کہ "یہ کس سے باتیں ہو رہی ہیں" انھوں نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اب کیا تھا ان کی بیگم صاحبہ آپے سے باہر ہوگئیں۔ اور ایسے شائستہ الفاظ میں گفتگو کی کہ مولانا تو رہے ایک طرف خود شیطان نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ اتنے میں ایک چھوٹا بچہ اٹھ کر رونے لگا۔ بیگم صاحبہ نے اس کی "دھم کٹ" شروع کی۔ اس گڑبڑ سے دوسرے بچوں کی آنکھ بھی کھل گئی۔ اور اب شور قیامت بپا ہوگیا۔ یہ دیکھکر شیطان نے کہا "مولانا۔ جب آپ کے گھر میں آپ کی بیوی جیسی ہستی موجود ہے تو مجھ کو یاد کرنے کی کیا ضرورت تھی" اس کا جواب انھوں نے یہ دیا کہ "لوہا لوہے سے کٹتا ہے" یہ جواب ایسا معقول تھا کہ شیطان کو بھی قائل ہونا پڑا۔ اور اس نے کہا تو "ہاں فرمائیے کہ آپکی کیا خواہش ہے۔ اس وقت میں آپ کی صرف ایک خواہش پوری کر سکتا ہوں۔ اس کے بعد کل اسی وقت حاضر ہوں گا۔ اور آپس کے طرز عمل سے متعلق آپ سے باقاعدہ معاہدہ ہوجائیگا۔ چونکہ بیوی کی "صور اسرافیلی" آواز سے یہ بہت پریشان تھے۔ اس لئے انھوں نے کہا کہ "میری پہلی خواہش تو یہ ہے کہ آئندہ اس عورت کی آواز میرے کانوں تک نہ پہنچے" شیطان نے کہا "منظور" اور یہ کہکر ہتیلی پر سے غائب ہوگیا۔

اب صبح کی سنئے۔ کوئی دس بجے جو مولانا کی بیگم صاحبہ اٹھیں تو حسب عادت ان کو آواز دی۔ یہ آواز گو بہت اونچی تھی لیکن مولانا وحشی تک نہیں گئی۔ بلکہ ہونٹوں ہی میں چکر کھا کر رہ گئی۔ بیوی نے دوسری آواز دی اس کا بھی وہی حشر ہوا۔ یہ دیکھ کر وہ عورت تو آگ بگولا ہوگئی۔ ہزاروں صلواتیں سنائیں۔ مگر وہ بھی مولانا تک نہ پہنچیں۔ اگر پہنچتیں تو ضرور کچھ نہ کچھ جواب دیتے۔ اب کیا تھا بیگم صاحبہ اٹھیں اور سیدھی ان کے پاس پہنچیں۔ وہاں پہنچ کر بہت اونچی آواز میں ان سے بہت کچھ کہا۔ مگر ظاہر ہے کہ جو بات سُنی نہ جائے اس کا جواب کیا دیا جائے۔ انھوں نے کہا بھی تو یہی کہا کہ "تم کچھ بولتی تو ہو نہیں اور یونہی منہ چلائے چلی جا رہی ہو" بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ بیگم صاحبہ کے متعلق "منہ چلانے" کا رکیک محاورہ استعمال کیا جاتا اور وہ خاموش رہتیں۔ اس لئے انھوں نے باورچی خانہ کا رُخ کیا۔ اور وہاں سے وہ سلاحِ مہلک لیکر آئیں۔ جو در اصل تو بانس کی پوری ہے مگر اصطلاح عام میں اس کو پھکنی کہا جاتا ہے۔ اور جو عموماً آگ جلانے اور بعض دفعہ ضرب شدید پہنچانے کے کام آتی ہے۔ ایک دو ہی ہاتھ پڑے تھے کہ بیوی کی آواز ان کی حد تک تو بیٹھی تھی مگر خود ان کی آواز پوری طرح کھل گئی۔ بیوی کی گل فشانی، میاں کی "دہائی۔ تہائی" اور بچوں کے رونے دھونے نے گھر میں ایک میلہ کی سی کیفیت پیدا کر دی۔ جب یہ اودھم حد سے زیادہ بڑھ گیا تو بی ہمسائی نے اپنی ماما کو حالات معلوم کرنے کیلئے بھیجا۔ اس نے آکر بیوی کا ہاتھ پکڑا اور وجہ پوچھی۔ انھوں نے کہا "یہ مردوا کل سے میری بات کا جواب نہیں دیتا" ماما نے کہا "میاں آخر یہ تو بتائیے کہ آپ ان کی بات کا جواب کیوں نہیں دیتے" مولانا وحشی نے کہا "بوا۔ جواب کیا دوں۔ یہ کچھ بولتی ہوں تو جواب دوں" یہ سن کر بیوی تو آگ بگولا ہوگئیں۔ اور کہنے لگیں "دیکھا بوا۔ دیکھا تم نے۔ موا کہتا ہے کہ یہ کچھ بولیں تو جواب دوں۔ اب تم ہی دیکھو۔ میں بول رہی ہوں یا نہیں" ماما نے کہا۔ "میاں یہ سچ تو کہتی ہیں" میاں نے کہا "تم تو خاصی طرح بول رہی ہو مگر ان کے صرف ہونٹ ہلتے ہیں۔ آواز تو خاک

نہیں نکلتی " ماما بولی " اے واہ میاں یہ بھی خوب ہوئی ۔ بیوی خاصی اچھی طرح تو بات کر رہی ہیں ۔ اور تم کہتے ہو یہ بول نہیں رہیں ۔ ہونٹ ہلا رہی ہیں ۔ نہیں ۔ میاں ایسی باتیں نہیں کیا کرتے اس سے گھر بگڑ جاتے ہیں ۔ لو بھئی لو ۔ میاں نے مجھے بھی دیوانہ سمجھا ہے ۔ میں تو جاتی ہوں ۔ اب آپ جانیں اور آپکی بیوی جانیں ۔ میاں بیوی آپس میں روٹھتے بھی ہیں ۔ ملتے بھی ہیں ۔ مگر یہ کبھی نہیں ہوتا کہ بیوی تو بیوی باہر والوں کو بھی دیوانہ بنایا جائے " یہ کہہ وہ ماما تو واپس ہوئی اور یہاں تھوڑی دیر "دنا دن" کرنے کے بعد بیوی نے میاں پر رحم کھا کر ہاتھ روک لیا ۔ میاں لوتھ ہو کر پڑ گئے ۔ اور بیوی اوڑھ لپیٹ چارپائی پر جا پڑیں ۔ غرض سارا دن اس طرح گذر گیا کہ میاں بیوی تو زہر ایک طرف بچارے بچوں کے منہ میں ایک کھیل اڑکر نہیں گئی ۔ رات آئی ۔ بیوی اپنے بچوں کو لیکر کوٹھڑی میں گھسیں اور اندر سے کنڈی لگالی ۔ میاں یونہی دالان میں پڑے رہے ۔ کمر پر جو پھکنیاں پڑی تھیں اس کی کسک رہ رہ کر ہوتی تھی ۔ مگر وہ جو کہتے ہیں کہ سولی پر بھی نیند آتی ہے ۔ آخر ان کی بھی کوئی گیارہ بجے آنکھ لگ گئی ۔

ٹھیک بارہ بجے شیطان صاحب تشریف لائے ۔ اور ان کے کان میں کہا "حضرت اٹھئے ۔ میں حاضر ہو گیا ہوں ۔ معاہدہ کے شرائط جلد طے ہو جائیں تو بہتر ہے کیونکہ بغیر ان کے آپ کا مجھ سے کچھ مانگنا یا میرا کچھ دینا نہ اخلاقاً صحیح ہے اور نہ اصولاً" مولانا وحشی کراہتے ہوئے اٹھے اور کہا " مسٹر میری حالت ایسی زدہ ہو گئی ہے کہ کسی شرط کا سمجھنا اور سمجھ کر اس پر اپنی رضامندی ظاہر کرنا ممکن نہیں ہے ۔ اور آپ جانتے ہیں کہ ایسی حالت میں جو معاہدہ مجھ سے کیا جائے گا اس کا نہ اخلاقاً میں پابند ہو سکتا ہوں نہ قانوناً اور نہ اصولاً " شیطان نے کہا " تو اب یہ فرمائیے کہ آپ کیا چاہتے ہیں ۔ بلا معاہدہ کے کسی کی خواہشات کو پورا کرنا میری عادت میں داخل نہیں ہے ۔ مگر چونکہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو منطق میں بہت کچھ دخل ہے ۔ اور منطقی آدمی میرے بہت کام کے لوگ ہوتے ہیں اس لئے میں آج بھی آپ کی ایک خواہش کو پورا کرنے پر آمادہ ہوں ۔ معاہدہ کی تکمیل کل ہو جائیگی " مولانا وحشی نے کہا " میری خواہش یہ ہے کہ اپنی بیوی کی آواز کے متعلق جو پابندی میں نے قائم کرائی تھی وہ اب اٹھا لیجئے ۔ اور میری ان چوٹوں کی تکالیف کو رفع کیا جائے " شیطان نے کہا کہ " میں ایک خواہش کی تکمیل کر سکتا ہوں اور یہ دو خواہشیں ہیں " مولانا نے کہا " یہ آپ کی غلطی ہے ۔ دوسری خواہش پہلی خواہش کا نتیجہ ہے ۔ اور چونکہ یہ اسی طرح لازم و ملزوم کی صورت میں داخل ہوتی ہیں ، اس لئے ان کو دو مختلف خواہشیں سمجھنا آپ جیسے عقلمند شخص کے لئے شایان شان نہیں ہے " شیطان نے کہا " مولانا آپ سے مل کر مجھے بیحد خوشی ہوئی ۔ آپ ہی جیسے لوگوں کی مجھے تلاش رہتی ہے ۔ جو اپنی زبان کی تیزی سے سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ ثابت کر سکیں ۔ مجھے پورا یقین ہے کہ مجھ میں اور آپ میں خوب نبھے گی ۔ اور تھوڑے ہی دنوں میں ہم دونوں مل کر اس مذہبی دنیا میں انقلاب کا ایک ایسا سیلاب لائیں گے کہ اس کا روکنا مشکل ہو جائیگا ۔ جائیے آپکی پہلی خواہش اور اس کے نتیجہ کو منسوخ کیا جاتا ہے ۔ کل سنیچر کا دن ہے ۔ میں رات کو بارہ بجے حاضر ہوں گا ۔ یہ دن اور وقت دونوں ایسے کاموں کیلئے بہت مبارک ہیں ۔ آپ معاہدہ کے لئے آمادہ رہئے ۔ اچھا آداب عرض ہے "

شیطان تو یہ کہہ کر رخصت ہوا ۔ اور مولانا وحشی کی چوٹوں میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں وہ ایک دم جاتی رہیں ۔ یہ کمر پر ہاتھ پھیر کر دیکھ رہے تھے کہ کہیں کوئی کسک تو نہیں رہی ہے ۔ کہ بیوی نے کوٹھڑی میں سے آواز دی کہ " یہ تم کس سے باتیں کر رہے تھے " مولانا نے جواب دیا " کسی سے نہیں اپنے نفس سے باتیں کر رہا تھا " بیوی نے کہا " تو کل تمہیں کیا ہوا تھا کہ میری بات کا جواب ہی نہیں دیتے تھے " اس سوال کو انھوں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ " وقت کی بات تھی ۔ بعض دفعہ انسان اپنی بیوقوفی سے وہ کچھ کر جاتا ہے کہ اس کا خمیازہ بھگتنا اور بری طرح بھگتنا پڑتا ہے " چلو میاں بیوی میں صفائی ہو گئی ۔ بیوی کا غصہ گیا اور میاں کا درد گیا ۔ اور دونوں پڑکر سو گئے ۔

سنیچر کے دن شیطان رات کے بارہ بجے پھر آیا ۔ اور دونوں میں ایک مختصر سا معاہدہ طے پایا ۔ شرائط یہ تھے کہ جب مولانا ضرورت سمجھیں شیطان کو طلب کر کے اپنی کوئی خواہش ظاہر کریں اور وہ اس کو پورا کرے ۔ اور وہ بھی اس کے مقابلہ میں جو خواہش کرے اس کی یہ تکمیل کریں ۔ لیکن دونوں میں اسے

کسی کی بھی خواہش ایسی نہ ہونی چاہیے جو خلافِ اخلاق ہو۔ یا جس کا انجام دنیا دونوں میں سے کسی کی بدنامی کا باعث ہو۔"

مولانا قلم دوات لائے۔ معاہدہ ضبطِ تحریر میں آیا۔ مولانا وحشی نے قلم سے اور شیطان نے دوات میں ڈبو کر اپنی دُم سے دستخط کیے۔ اور اس طرح یہ معاہدہ دونوں کیلئے واجب التعمیل ہو گیا۔

اس کے بعد شیطان نے کہا کہ "اس پر آج ہی سے عمل شروع ہو جائے تو اچھا ہے۔ پہلے آپ اپنی خواہش ظاہر کیجئے۔" چونکہ مولانا وحشی کا ہاتھ بہت تنگ تھا اس لئے انھوں نے کہا کہ "فی الحال تو میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ مجھے دو سو روپے عنایت کیجئے۔ تاکہ گھر کا خرچ چل سکے۔" شیطان نے اسی وقت دو سو روپے کا چیک بینک کے نام لکھ دیا۔ اور کہا کہ "اب میری خواہش بھی سُن لیجئے۔ وہ یہ ہے کہ کل شام کو آپ مولوی لعنت اللہ کے وعظ میں جائیے۔ اور منطق کے زور سے ان کے بیانات کی تردید کیجئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میری یہ خواہش نہ خلافِ اخلاق ہے اور نہ آپ کی بدنامی کا باعث ہو سکتی ہے۔ اس لئے آپ اس کو منظور کرنے سے حسبِ شرائطِ معاہدہ انکار نہیں کر سکتے۔" مولانا وحشی نے کہا "اس میں کیا ہرج ہے عقل خدا نے ہر شخص کو دی ہے گو مکمل نہیں۔ دماغ ہر شخص کو عطا ہوا ہے۔ گو ایک سا نہیں۔ ایسی صورت میں یہ ضرور نہیں کہ جو کچھ مولوی لعنت اللہ فرمائیں اس پر آمنا و صدقنا کہا جائے اور اس کی تردید کی کوشش نہ کی جائے۔" شیطان نے کہا "کہ اس کیلئے ہمت کی ضرورت ہے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ آجکل مولوی لعنت اللہ کا لوگوں پر بہت اثر ہے۔ ممکن ہے کہ ان کے ہوا خواہ آپ کو کچھ نقصان پہنچا دیں۔" انھوں نے کہا کہ "آپ اس سے پریشان نہ ہو جیئے۔ میں اور مولوی صاحب ایک ہی مدرسے کے پڑھے ہیں۔ میں ان کے مبلغ علم کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ ان کی منطق ہمیشہ کمزور رہی ہے۔ اس لئے ان کو دبا لینا کچھ مشکل کام نہیں ہے۔" غرض ان دونوں نے اس تصفیہ کے بعد ہاتھ ملائے۔ شیطان رخصت ہوا۔ اور مولانا وحشی دو سو روپے ملنے کی خوشی میں رات بھر جاگتے رہے۔

دوسرے دن مولوی صاحب بینک گئے۔ چیک پیش کیا۔ چونکہ بحیثیت شاعر ہر شخص ان سے واقف تھا اس لئے بآسانی چیک کا روپیہ مل گیا۔ راستہ میں آتے آتے انھوں نے اپنے اور بیوی بچوں کیلئے کپڑا خریدا۔ کھانے پینے کا کچھ سامان لیا۔ بہت اینٹھتے ہوئے گھر آئے۔ سارا لایا ہوا سامان بیوی کے حوالے کیا۔ انھوں نے پوچھا بھی کہ "آخر یہ سامان خریدنے کو تمہارے پاس روپیہ کہاں سے آیا؟" مگر ان کے اس کہنے پر کہ "میرے ایک شاگرد نے دیا ہے۔" یہ گفتگو ختم ہوئی اور ختم ہونی بھی چاہیے تھی۔ کیونکہ بیوی کو روپے سے غرض ہوتی ہے۔ اس سے تھوڑی غرض ہوتی ہے کہ یہ روپیہ کہاں سے آیا۔ حلال کا ہے یا حرام کا۔ اگر بیوی اس طرح کے معاملات میں دخل دینے لگیں تو رشوت کا بازار مدھم پڑنے سے دُنیا کے کام ہی بند ہو جائیں۔

غرض سارے دن ماروں مار کپڑے سلے۔ اور شام کو مولانا وحشی نہایت شاندار جبہ پہن اور بڑا سا شملہ باندھ مولوی لعنت اللہ کی مجلس وعظ میں پہونچے۔ اور ایک طرف بیٹھ گئے۔ وہ اس وقت "حیا" پر وعظ کہہ رہے تھے۔ جب وعظ ختم ہوا تو یہ اٹھے اور کہا "جناب والا میں اس بارے میں آپ سے سوالات کرنا چاہتا ہوں۔" یہ پہلا موقع تھا کہ کسی نے ان سے ان کے وعظ کے متعلق سوالات کرنے کی جرأت کی ہو اس لئے پہلے تو وہ بہت سٹپٹائے اور اس کے بعد کہا۔ "فرمائیے۔ وہ کیا سوال ہیں؟" انھوں نے کہا کہ اگر "حیا" کا وہی درجہ ہے جو آپ نے ارشاد فرمایا تو پھر اس صفت انسانی کی مانگ اس قدر کیوں کم ہے۔ اور کیوں یہ صفت رفتہ رفتہ دُنیا سے کم ہوتی جاتی ہے۔" مولوی لعنت اللہ نے کہا "اچھی چیز کو نہ کوئی سمجھتا ہے نہ اس پر عمل کرتا ہے۔ دنیا بیوقوفوں سے بھری پڑی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حیا کی خوبی لوگوں کی نظروں میں نہیں سماتی۔" مولوی وحشی نے کہا "تو اس کے بعد میں یہ دریافت کروں گا کہ "آپ کے وعظ میں کوئی خوبی ہے یا نہیں۔ میں تو کیا سب ہی کہیں گے کہ ہے اور بہت کچھ ہے۔ اس لئے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب اچھی چیز کی طرف لوگ رغبت کم کرتے ہیں تو آپ کے وعظ میں یہ ہزاروں آدمی کیوں اکٹھے ہو گئے ہیں؟ اب میں آپ کی دوسری حجت کو لیتا ہوں۔ آپ فرماتے ہیں کہ اچھی چیز کو نہ کوئی سمجھتا ہے اور نہ اس پر عمل کرتا ہے تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ یہ جتنے

اصحاب تشریف فرما ہیں انھوں نے نہ آپ کے وعظ کو سمجھا اور نہ وہ اس پر عمل کریں گے۔ اور اس لئے یہ آپ کے ارشاد کے بموجب بیوقوف ہیں۔"

مولانا لعنت اللہ اس نئی قسم کی حجت سے کچھ گھبرا سے گئے۔ لیکن پھر سنبھل کر کہا کہ "آپ کی یہ منطق بنیاد ہی غلط ہے کہ میرا وعظ خوبیوں کا حامل ہے۔ اور چونکہ بنیاد ہی غلط ہے اس لئے آپ نے جو نتیجہ نکالا ہے وہ بھی غلط ہے۔" مولانا وحشی نے کہا کہ "اچھا تو اب اسی پہلو سے اس بحث کو لیجیے۔ آپ فرماتے ہیں کہ میری بحث کی ابتدائی منطق بنیاد اس لئے صحیح نہیں ہے کہ آپ کے وعظ میں کوئی خوبی نہیں ہے۔ تو میں یہ دریافت کروں گا کہ ایسے بیکار وعظ سے اپنے اور ان بھلے مانسوں کے قیمتی وقت کو ضائع کرنے سے آپ کا کیا مطلب ہے؟" مولوی صاحب نے کہا کہ "میں ناچیز ہستی ہوں۔ البتہ جو کچھ میں کہتا ہوں وہ سننے اور غور کرنے کے قابل ہے۔" اس کا جواب یہ ملا "تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ آپ کا وعظ اور آپکی ذات دو علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں۔ اگر آپ کے خیالات وہ نہیں ہیں جو آپ ارشاد فرماتے ہیں تو معاف فرمائیے اس کو شریفوں کی زبان میں ریاکاری اور مکاری کہتے ہیں۔ اور اگر آپ دوسروں کے خیالات اپنے ذاتی ظاہر کر کے لوگوں کے سامنے بیان کرتے ہیں تو اس کو شاعروں کی زبان میں سرقہ کہا جاتا ہے۔ آپ یہ ضرور فرمائیں گے کہ دوسروں کے خیالات کا ظاہر کرنا منع نہیں ہے لیکن ایمانداری کی شرط یہ ہے کہ ہر خیال کے ساتھ یہ ظاہر کر دیا جائے کہ یہ فلاں شخص کا قول ہے۔ اور آپ نے اپنے سارے وعظ میں کسی ایک شخص کا بھی نام نہیں لیا جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ لوگوں پر اثر ڈالنے کیلئے یہ بتانا چاہتے تھے کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں یہ میرا ذاتی قول اور خیال ہے۔" مولوی لعنت اللہ نے کہا "میں نہیں سمجھ سکتا کہ ہر خیال کے متعلق راوی کا حوالہ دینا ضروری ہے۔" مولانا وحشی نے کہا "مجھے معاف فرمائیے اگر میں یہ کہوں کہ مذہبی کتابوں میں راویوں کے حوالہ دینے کی کیا ضرورت تھی۔ کیونکہ ان میں جتنے مقولے ہیں وہ اس پایہ کے ہیں کہ ہر شخص کو ان کی خوبی کا بے اختیار اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے اگر راویوں کا سلسلہ قائم نہ کیا جاتا تو ہر واعظ اپنے مقولے کو اپنے سے منسوب کر کے۔ تو پھر تم پیمبری کا دعویدار ہو سکتا تھا۔" مولوی لعنت اللہ نے کہا "تو کافر ہے۔" اس کا جواب مولانا وحشی نے دیا کہ "مولوی صاحب آپ ہزار دفعہ بھی مجھے کافر کہیں تو مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔ میں آپ سے کچھ سیکھنے آیا ہوں۔ میری تشفی کر دیجیے۔ ورنہ کہہ دیجیے کہ میں تیرے سوالات کا جواب نہیں دے سکتا۔ چلو قصہ ختم ہوا۔ آپ کے محض کافر کہہ دینے سے میرا کچھ نہیں بگڑتا۔ ہاں آپ کے اخلاق کا اظہار ہوتا ہے۔"

اس پر لوگوں نے غل مچایا کہ "آپ مولوی وحشی کا جواب دیجیے۔ وہ زمانہ گیا جب آپ جس کسی کو چاہتے تھے کافر کہہ دیتے تھے۔ اور ہم مان لیتے تھے۔" یہ سننا تھا کہ مولوی لعنت اللہ آپے سے باہر ہو گئے اور کہنے لگے کہ "ایسے ہی بدمعاش حرامزادوں نے الٹی سیدھی منطق سے لوگوں کو گمراہ کیا ہے۔ لعنت ہے اس پر اور اسکی ماں پر جس نے اسے جنا ہے۔" یہ سن کر لوگ بگڑ گئے اور ممکن تھا کہ مولوی لعنت اللہ کی شان میں کچھ گستاخی کر بیٹھتے۔ مگر مولانا وحشی نے سب کے جوش کو ٹھنڈا کر کے دھیما کیا اور کہا "لوگو! خدا کیلئے مولوی صاحب کے اخلاق کے ساتھ اپنے اخلاق کو تباہ نہ کرو۔ مولوی صاحب نے بُرا کہا تو مجھ کو کہا۔ میں ان کو معاف کرتا ہوں خدا بھی ان کو معاف کرے۔" آپ سمجھ لیجیے کہ اس شریفانہ گفتگو کا لوگوں پر کیا کچھ اثر نہ ہوا ہوگا بالآخر سارا مجمع یہ کہتا ہوا منتشر ہو گیا کہ "مولوی لعنت اللہ دانستہ ہیں نہ گرنا کرنا چاہتے تھے۔ وہ تو خدا مولانا وحشی کا بھلا کرے جو یوں معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ ورنہ فوجداری کی نوبت آ گئی تھی۔"

رات کو بارہ بجے پھر مسٹر شیطان آ گئے۔ مولانا وحشی پڑے خراٹے لے رہے تھے۔ انھوں نے آہستہ سے ان کو جگایا۔ یہ آنکھیں ملتے ہوئے اٹھے پہلے تو بہت بُرا بھلا کہا کہ کیوں مجھے سوتے سے جگایا۔ اس کے بعد دونوں میں یہ گفتگو ہوئی:۔

شیطان:۔ جناب مولانا! کل میں مولوی لعنت اللہ کی وعظ کی محفل میں موجود تھا جس طریقے سے آپ نے گفتگو

فرمائی اور جس طرح منطق کے مغالطے کی شکل کا استعمال کیا وہ بس دیکھنے اور سننے کے قابل تھا لیکن مجھے سخت تعجب ہوا کہ ہزاروں آدمیوں میں سے کوئی بھی نہ سمجھا کہ آپ جو بحث کر رہے تھے اس کا منطق سے کوئی تعلق نہیں ہے اور محض لفظوں کا الٹ پھیر ہے۔

مولانا:۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ جیسی ہستی اتنے دنوں سے لوگوں کی حالت کو دیکھ رہی اور سمجھ رہی ہے لیکن اب تک اس پر غور نہیں کیا گیا۔ کہ عام لوگ محض جانور بلکہ اس سے بھی بدتر ہوتے ہیں۔ یہ وعظوں اور جلسوں میں اس لئے نہیں جاتے کہ اس سے کچھ حاصل کریں۔ بلکہ اس لئے جاتے ہیں کہ بیکاری میں وقت گذاریں۔ ہا۔ ہا۔ ھو۔ ھو۔ کریں۔ تالیاں بجائیں۔ اور بحث کے وقت جو فریق دب جائے اس کی "لو۔ لو" کریں۔ اور اسکی اصلی وجہ یہ ہوتی ہے کہ جو صاحب وعظ کرتے یا اسپیچ دیتے ہیں ان کا ظاہر و باطن یکساں نہیں ہوتا۔ وہ کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ ہیں۔ اور جب تک واعظ یا اسپیکر کا دل ایک نہو اس وقت تک اس کے کلام میں اثر نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اس دُنیا کی ایک بلند ترین ہستی کا یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ ایک بُڑھیا ان کے پاس حاضر ہوئی اور کہا کہ "حضرت میرے بیٹے کو مٹھاس کا بہت شوق ہے۔ اس کی صحت کے لحاظ سے حکیم اس کو مٹھاس کھانے سے منع کرتے ہیں۔ مگر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ آپ دعا فرمایئے کہ وہ مٹھاس کھانا چھوڑ دے" آپ نے فرمایا کہ "بڑی بی آٹھ دن کے بعد آنا۔ میں دعا کروں گا اور امید ہے کہ میری دعا اثر کریگی" آٹھ دن کے بعد وہ بُڑھیا آئی۔ آپ نے دعا فرمائی اور اس کے بیٹے نے مٹھاس کھانی چھوڑ دی۔ بُڑھیا کے جانے کے بعد اصحاب نے دریافت کیا کہ "حضرت جب دعا ہی کرنی تھی تو پھر یہ آٹھ دن کی مہلت کیوں مانگی گئی تھی" اس کا جواب یہ دیا گیا کہ "مجھے خود مٹھاس کا بہت شوق تھا۔ ایسی صورت میں مجھے کیا حق تھا کہ میں دوسروں کے متعلق مٹھاس چھوڑنے کی دعا کرتا۔ اور دعا کرتا بھی تو وہ کس طرح پایہ قبول کو پہنچتی۔ پہلے میں نے خود مٹھاس چھوڑ دی۔ اس کے بعد دعا کی اور وہ مقبول ہوئی"۔ تو جناب

یہی صورت مولوی نعمت اللہ کے وعظ میں بھی تھی۔ اب رہی دوسری صورت کہ میرے اعتراضات میں لفاظی ہی لفاظی تھی تو آپ کا یہ کہنا بالکل بجا و درست ہے۔ اگر لفظ برمحل کہے جائیں اور ان میں مذاق کا پہلو بھی ہو تو عوام پر منطقی حجتوں سے زیادہ اثر کرتے ہیں۔

شیطان:۔ ہاں یہ آپ کا کہنا صحیح ہے۔ میں نے بھی ایک جگہ یہ لطف دیکھا ہے۔ ہوا یہ کہ دہلی میں ایک اندھے حافظ جی تھے۔ نام ان کا عبد اللہ تھا۔ میری ہی کوششوں سے انھوں نے تبدیل مذہب کیا اور عیسائی ہو گئے۔ بیوی مل گئی۔ کھانے پینے سے بے فکر ہو گئے۔ اب ان کا یہ کام رہ گیا تھا کہ شام کو چاندنی چوک میں فوارہ پر جاتے۔ اور ہر مذہب والے پر بلا ڈرے الٹے سیدھے حملے کرتے اور کیوں نہ کرتے جب عیسائی ہونے کی وجہ سے گورنمنٹ ان کے ساتھ تھی۔ اس زمانہ میں الفریڈ تھیٹریکل کمپنی دہلی میں آئی ہوئی تھی۔ اس کمپنی میں آغا حشر کاشمیری نوکر تھے۔ شام کو یہ اپنے دوستوں حکیم مقصود علی خاں اور حکیم فقیر محمد کے ساتھ فوارے جاتے اور جاتے ہی حافظ عبد اللہ سے الجھ پڑتے۔ بڑے زوردار فقرے کسے جاتے، پھبتیاں اڑتیں۔ حافظ جی کا مذاق اڑایا جاتا۔ ہزاروں آدمی جمع ہو جاتے اور فریقین کے دلچسپ مباحث کا لطف اٹھاتے مگر مولانا یقین مانیئے کہ وہ اندھا بھی غضب کا چلتا پُرزہ تھا۔ تین ایک طرف اور وہ اکیلا ایک طرف۔ مگر کیا مجال ہے کہ کبھی اس کی زبان رکتی ہو۔ اور وہ فقرہ پر فقرہ نہ کستا ہو۔ مگر ایک مولوی صاحب نے اس کو ایسی پٹخنی دی کہ پھر اس کا فوارہ پر آنا بھی موقوف ہو گیا[1]۔

مولانا:۔ تعجب کی بات ہے کہ ایسا لسّان آدمی لوگوں سے دب جائے۔ اور میدان سے بھاگ جائے۔

۱۔ یہ واقعہ میرا دیکھا ہوا ہے اور میں یقین دلاتا ہوں کہ شیطان نے جو کچھ کہا اس کا ایک ایک لفظ صحیح ہے۔ آغا حشر کے ساتھ ساتھ میں بھی کبھی کبھی ان مباحثوں میں جاتا اور اس "پاپی کی چونچلوں" کا لطف اٹھاتا تھا۔

شیطان:۔ اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ ہوا یہ کہ دلی میں ایک مولوی صاحب رہتے تھے۔ مولوی کہلاتے تو ضرور تھے۔ مگر پڑھے لکھے خاک نہیں تھے۔ ہاں زبان بہت چلتی تھی۔ جب وعظ کہنے یا مباحثہ کرنے آتے تو بڑے ٹھاٹھ سے آتے۔ صاف ستھرا جبّہ پہنتے، بڑا سا عمامہ باندھتے۔ بغل میں ایک جزدان لیتے۔ ہر بات پر کہتے "نکالوں میں اپنی کتاب"۔ مگر تمام عمر ان کی وہ کتاب ان کے جزدان سے باہر نہیں آئی اور آتی تو کیونکر آتی جب جزدان میں بجائے کتاب کے یہ موٹی اینٹ لپٹی ہوئی تھی۔ بہرحال یہ مولوی صاحب دن بھر محنت مزدوری کرتے اور شام کو اپنی جون بدل کر فوّارے پر آتے تھے۔ ایک روز ان کی اور حافظ عبداللہ کی چل گئی۔ خدا جانے پہلی ہجری کا ایک عجیب و غریب واقعہ کہاں سے سن لیا تھا۔ اس کو انھوں نے اپنی حجت کی دلیل میں پیش کیا۔ اندھے حافظ جی نے کہا کہ "اس کا ثبوت لائیے"۔ پہلے تو مولوی صاحب نے اپنے جزدان کی طرف اشارہ کر کے غنغناتے ہوئے کہا کہ "نکالوں اپنی کتاب"۔ مگر جب کہا گیا کہ "نکالتے کیوں نہیں، اس سے کون روکتا ہے"۔ تو یہ گھبرائے، کچھ الٹے سیدھے دلائل بھی پیش کئے۔ مگر حافظ جی یہی کہتے رہے کہ "واقعہ دلیلوں سے ثابت نہیں ہوتا۔ ثبوت لائیے ثبوت"۔ جب یہ تنگ ہو گئے تو کہنے لگے "حافظ جی۔ آپ تیرہ سو برس پہلے واقعہ کے متعلق مجھ سے ثبوت مانگ رہے ہیں۔ ذرا آپ یہی ثبوت لائیے کہ آپ حلالی ہیں یا حرامی"۔ ان کا یہ فقرہ حافظ جی پر ایسا چپکا کہ اکھڑنا مشکل ہو گیا۔ جہاں انھوں نے کچھ کہا اور مجمع نے غل مچایا کہ "پہلے یہ ثابت کیجئے کہ آپ حلالی ہیں یا حرامی" آخر حافظ جی بھاگے اور مجمع کا مجمع ان کے پیچھے یہی ثبوت طلب کرتا ساتھ ساتھ ہوا کہ "آپ حلالی ہیں یا حرامی"۔ اس کے بعد تو یہ نوبت آگئی کہ حافظ جی کا باہر نکلنا مشکل ہو گیا۔ یہ ذرا نکلے اور کسی نہ کسی نے ان کے "حلالی یا حرامی ہونے کا ثبوت طلب کیا۔

مولانا:۔ بالکل صحیح ارشاد ہوا۔ اور اسی لئے میں نے عرض کیا تھا کہ باوجود اس کے کہ میں مولوی نعمت اللہ جیسے بااثر شخص سے مقابلہ کرنے کھڑا ہوا تھا۔ مگر جانتا تھا کہ میں اپنی لفاظی سے ان کو دبا لوں گا۔ اور چونکہ آجکل کے مولوی ذرا سی دیر میں آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ اس لئے مجھے یقین تھا کہ مجلس میں جو بن پڑھے ہیں وہ میرے طرز بیان سے اور جو سمجھدار لوگ ہیں وہ مولوی صاحب کی بیہودگی سے میری ساتھ ہو جائیں گے۔ اور آخر فتح مجھ ہی کو نصیب ہو گی۔

شیطان:۔ خیر یہ تو ہوا سو ہوا۔ اب یہ فرمائیے کہ آج آپ کی کیا خواہش ہے۔

مولانا:۔ آجکل کی دُنیا میں کسی کو سوائے روپے کے اور کیا خواہش ہو سکتی ہے۔ اور اب تو رفتہ رفتہ اسی خواہش نے جنّت کی خواہش کو بھی دبا لیا ہے۔

شیطان:۔ اس میں انسانوں کی غلطی ہی کیا ہے انسان فطرۃً اس چیز کی طرف زیادہ راغب ہوتا ہے جس کو وہ برت سکے۔ اور اس کا لطف اٹھا سکے۔ جنّت کیا ہے؟ صرف ایک وعدہ ہے۔ اور وہ بھی ایک لامتناہی زمانہ آئندہ کیلئے۔ اس لئے وہ موجودہ لطفِ زندگی کو کھو کر آئندہ کے وعدہ پر جینا نہیں چاہتا۔ اور یہی وجہ ہے کہ دُنیا کا کوئی حصہ نہیں جہاں روپے پیسے کی بدولت خون خرابے نہ ہوتے ہوں۔ بدکاریاں نہ ہوتی ہوں۔ بے ایمانیاں نہ ہوتی ہوں اور مجھے اور میری امّت کو خوش ہونے اور بغلیں بجانے کا موقع نہ ملتا ہو۔

مولانا:۔ تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ میں جو روپیہ آپ سے لے رہا ہوں اس کی وجہ سے میں بھی اسی جال میں پھنس جاؤں گا۔

شیطان:۔ (ہنس کر) آپ پیش از مرگ واویلا کیوں کرتے ہیں۔ آپ جیسے سمجھدار لوگ بھی اگر اس جال میں پھنس جائیں تو غضب ہے۔ اچھا آپ آج کتنی رقم چاہتے ہیں؟

مولانا نے کچھ سوچ کر کہا کہ "ایک ہزار روپیہ"۔

شیطان نے اسی وقت چک کاٹ کر ان کے حوالہ کیا اور کہا کہ میری یہ خواہش ہے کہ چوبیس گھنٹے کے لئے ہم اور آپ جون بدل لیں۔ آپ میرے تختِ سلطنت پر جلوس فرمائیں اور میں آپ کی شکل میں مولوی نعمت اللہ سے مباحثہ کروں۔ ظاہر ہے کہ اس تبدیل ہیئت سے ہمارے معاہدہ کی کسی شرط کی خلاف ورزی نہیں ہوتی۔ مولانا نے کہا۔

"اور میری بیوی" شیطان نے جواب دیا کہ "آپ اپنی بیگم صاحبہ کی طرف سے بالکل مطمئن رہیئے۔ میں ان کا رنگ دیکھ چکا ہوں اور جانتا ہوں کہ ذرا ہیں اپنی حد سے آگے بڑھا اور میری ساری شیطنت خاک میں مل کر رہ گئی۔ ایسی عورتیں میری رائے میں کسی کی بیویاں بننے کے قابل نہیں ہوتیں۔ ان کو ہم جیسوں کی مائیں بننا چاہیئے۔" یہ سنکر مولانا نے کہا "تو مجھے آپ کی خواہش منظور ہے۔" ان کا یہ کہنا تھا کہ مولانا کے پاؤں پھٹ کر کھُر بن گئے۔ سر پر دو سینگ نکل آئے۔ ڈاڑھی مونچھیں کٹ کٹا کر فرنچ فیشن ہو گئیں۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ دُم نکل آئی۔ اور شیطان جُون بدل کر مولانا وحشی ہو گیا۔

اس کے بعد مولانا وحشی نے شیطان کے دارالسلطنت کی راہ لی۔ اور خود شیطان نے مولانا وحشی کی چارپائی پر لوٹ ماری۔ شیطان کا دیوان خاص پہاڑ کی ایک کھوہ میں تھا۔ اس میں جو مولانا وحشی داخل ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ دربار جما ہوا ہے۔ فاسفورس کی روشنی سے ساری کھوہ بڑی جگمگ جگمگ کر رہی ہے۔ شیطان کی ساری ذرّیات ہاتھوں میں اپنے کارنامے لئے صف بہ صف نہایت ادب سے استادہ ہے۔ اور سامنے آبنوس کا ایک سیاہ تخت رکھا ہے۔ مولانا وحشی نہایت ٹھاٹھ سے سب کا سلام لیتے ہوئے اس مجمع میں سے گذرے اور تخت پر متمکن ہو گئے۔ اور حکم دیا کہ "ہر ایک نے آج جو جو خدمات انجام دی ہیں وہ بیان کی جائیں۔" سب سے پہلے مسٹر خناس آگے بڑھے اور عرض کی کہ "جناب والا میں نے بڑی کوشش کے بعد ایک ستر برس کے بڈھے کا بیاہ ایک سولہ برس کی لڑکی سے کرا دیا ہے۔ بہت دنوں سے میں اسی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ مگر کامیابی نہیں ہو رہی تھی۔ آخر روپے کے زور سے یہ مشکل آسان ہوئی۔ اور بیاہ ہو کر دونوں خاندانوں کی بدنامی کی صورت نکل آئی۔"

مولانا وحشی:۔ مسٹر خناس! مجھے تمہارے اس فعل پر ہنسی آتی ہے۔ یہ کوئی ایسا کارنامہ نہیں ہے کہ اس پر فخر کیا جائے۔ یہ ضرور ہے کہ وہ لڑکی جوانی کے جوش میں ممکن ہے کہ ایسا کچھ کر بیٹھے جس سے اس کے اور اس کے خاندان کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ لگ جائے۔ لیکن علی التعمیم مذاق و خیالی کے بعد شریف خاندانوں میں ایسی عورتیں بہت کچھ پیش آ رہی ہیں۔ اور آئیں گی۔ اس لئے صرف ایک لڑکی کے راہ راست سے بھٹک جانے کے احتمال پر تمہارا اس قدر مغرور ہونا تمہاری کارگذاری پر دلالت نہیں کرتا۔ مجھے افسوس ہے کہ تم نے اپنا اس قدر قیمتی وقت اس معمولی اور بیکار کارروائی میں صرف کیا۔ تمہارے متعلق اظہار ناراضگی کیا جاتا ہے۔ اچھا مسٹر نناس اب تم اپنی رپورٹ پیش کرو۔"

مسٹر نناس:۔ عالی جناب۔ میں نے بڑی کوشش کر کے دو لیڈروں میں لڑائی کرا دی ہے۔ اور مجھے امید ہے کہ اس سے بہت اچھے نتیجے برامد ہونگے۔

مولانا وحشی:۔ میں تمہاری اس کارروائی میں کوئی خوبی نہیں دیکھتا۔ دُنیا میں ایسے کونسے دو لیڈر ہیں جو ہم خیال ہوں اور جن کے دل صاف ہوں۔ ہر لیڈر اپنے ساتھی سے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور جہاں یہ صورت ہوتی ہے وہاں تمہاری دخل دہی کے بغیر بھی ان لیڈروں میں لڑائی ہو جانا ایک لازمی امر ہے۔ علاوہ ازیں جب دو لیڈر بظاہر ملے ہوئے ہوں مگر دل صاف نہ ہوں تو وہ ان دو لیڈروں سے زیادہ ملک کو نقصان پہنچا سکتے ہیں جن میں کھلی ہوئی مخالفت ہو۔ کیونکہ صورت اول الذکر میں ہر لیڈر ریاکاری کو اپنا شعار بنائیگا۔ اور جہاں ریاکاری لیڈری کی بنیاد ہوگی وہاں عوام کا ایک نہ ایک دن راہ راست سے بھٹک جانا لازمی ہوگا۔ مجھے تعجب ہوتا ہے کہ تم جیسے بڑے عہدہ دار ایسے چھوٹے چھوٹے کاموں میں ہاتھ ڈالکر اپنا اور میرا وقت ضائع کرتے ہو۔ اچھا اب مسٹر خبیث اپنی رپورٹ پیش کریں۔

مسٹر خبیث:۔ جناب والا آج سارے دن میں عالموں کی مجلس میں پھرا۔ مگر کسی کو بہکانے کا موقع نہیں ملا۔ واپس آ رہا تھا کہ رات کے کوئی دس بجے مجھے ایک اندھے ویدانتی راستہ میں ملے۔ لکڑی ٹیکتے چلے آ رہے تھے۔ راستہ میں نشیب و فراز بہت تھا۔ میں نے یہ کیا کہ ان کی لکڑی تھام کر ذرا اس کا رُخ ایک گڑھے کی طرف موڑ دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انکی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی۔ اور ابھی تک وہ اسی گڑھے میں پڑے کراہ رہے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ میرا یہ فعل کارنامہ نہیں کہا جا سکتا۔ پھر بھی نہیں سے ہاں ضرور ہے۔

مولانا وحشی:۔ مجھے معلوم ہوتا ہے کہ آپ لوگوں کو جو تعلیم دی گئی ہے وہ بہت ناقص ہے۔ اور تم میں سے کوئی اپنے فعل کی خوبی اور برائی کو پوری طرح سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا۔ تم سمجھتے ہو کہ کیا ایک اندھے کو گڑھے میں گرا کر تم اپنے فرض سے سبکدوش ہو گئے۔ مگر میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ تمھارے اس فعل سے ہم کو کیا فائدہ پہنچا۔

مسٹر خبیث:۔ جناب والا میں تو سمجھتا ہوں کہ فائدہ ہی پہنچا ہے۔

مولانا وحشی:۔ یہ کس طرح؟

مسٹر خبیث:۔ یہ اس طرح۔ کہ وہ اندھا لوگوں میں نیک کاموں کا پرچار کرتا پھرتا تھا۔ اور ٹانگ ٹوٹ جانے کی وجہ سے اس کو یہ موقع نہیں ملے گا۔

مولانا وحشی:۔ تم جانتے ہو کہ اندھے ہمیشہ بے ایمان ہوتے ہیں۔ جب ہر شخص ان کو بے ایمان سمجھتا ہے تو ان کے اقوال پر کیوں عمل کرنے لگا۔ سمجھتے ہیں کہ اندھا بکتا ہے۔ بکنے دو۔ اور پھر یہ بھی تو سمجھو کہ اس پھرنے پھرانے میں یہ شخص لوگوں کی بے اعتنائی کی وجہ سے جل کر سب کو جو برا بھلا کہتا تھا وہ صورت اب کہاں باقی رہے گی۔ اور اس کے طرز عمل سے جو ثواب ہم کو مل سکتا تھا وہ اب کس طرح مل سکے گا۔ علاوہ ازیں پاؤں کے بیکار ہو جانے کی وجہ سے ممکن ہے کہ وہ گھر میں پڑا رہے۔ اور بجائے اِدھر اُدھر مارے پھرنے کے اپنا وقت ایسی ہستی کی یاد میں گذارے جس سے تم سب کی ازلی مخالفت ہے۔ مسٹر خبیث تم نے بجائے فائدہ پہنچانے کے اپنی قوم کو نقصان پہنچایا ہے۔ مجھے امید ہے کہ آئندہ کسی کام میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے تم اس کے ماعلیہ و مالہ پر غور کر لیا کرو گے۔ فی الحال میں تمہارا ایک گریڈ توڑتا ہوں۔ بس حسبہ عمل ہو۔

غرض اسی طرح رپورٹیں پیش ہوتی رہیں۔ اور مولانا وحشی ان پر اپنے ریمارکس پاس کرتے رہے۔ آخر میں ایک بڈھا رہ گیا۔ جس کو نہ کانوں سے پوری طرح سنائی دیتا تھا نہ آنکھوں سے دکھائی۔ اس کو بھی حکم دیا گیا کہ اپنی رپورٹ پیش کرے۔ وہ آگے بڑھا اور کہا۔

ولی:۔ میرے سردار میں اب اس قابل نہیں رہا ہوں کہ کوئی قابل قدر کام کر سکوں۔ کئی دفعہ وظیفہ کی درخواست پیش کر چکا ہوں۔ مگر وہ منظور نہیں ہوتی۔ اور ہر روز کالم خراب کرنے کی پاداش میں مجھ پر جھڑکیاں پڑتی ہیں۔

مولانا وحشی:۔ ہم تمہاری یہ کتھا سننے نہیں بیٹھے ہیں۔ ہم یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ تم نے کچھ کام کیا بھی یا مفت کی روٹیاں توڑیں؟

ولی:۔ کیا تو ہے مگر وہ ایسا نہیں ہے کہ جناب والا کے گوش گزار کر سکوں۔

مولانا وحشی:۔ اس کے اچھے ہونے یا نہ ہونے کا ہم تصفیہ کریں گے۔ تم واقعہ بیان کرو۔

ولی:۔ جناب والا ہوا یہ کہ میں تھک تھکا کر ایک باغ کے کنارے بیٹھا تھا کہ اتنے میں میرے پاس سے ایک لڑکا گزرا وہ کتابیں بغل میں مارے مدرسہ جا رہا تھا۔ میں نے اتنا کیا کہ صرف یہ کیا کہ اس کی ٹھوڑی کو ہاتھ لگا کر اس کا منہ ذرا اونچا کر دیا۔ اور اس طرح اس کی نظر سامنے کی بیری پر پڑی۔ بیری میں یہ بڑے بڑے لال لال بیر لگے ہوئے تھے۔ بیروں کو دیکھ کر اس کا جی للچایا اور وہ باغ کی دیوار پھاند کر اندر گیا۔ درخت پر چڑھا۔ اور بیر کھانے لگا۔ بیروں کے توڑنے اور کھانے میں اس کا اتنا وقت گزر گیا کہ مدرسہ کو دیر ہو گئی۔ اور وہ درخت سے اتر کر دیوار کے سایہ میں سو گیا۔ اس کے بعد میں وہاں سے چلا آیا۔

مولانا وحشی:۔ ول مسٹر۔ تم نے آج وہ کام کیا ہے کہ اس کی جتنی تعریف کی جائے وہ کم ہے۔ تم نے ایک طالب علم کو مدرسے جانے سے روکا ہے۔ اس کا مناسب صلہ تم کو دیا جائے گا۔ کیونکہ علم ہی وہ چیز ہے جو انسان کو سیدھے راستے پر چلاتا اور اس میں اچھے برے کی تمیز پیدا کرتا ہے۔ اگر شروع ہی سے اس بنیاد کو کھوکھلا کر دیا جائے تو ہماری حکومت میں بہت کچھ وسعت ہو سکتی ہے۔ اس کے سوا تم نے اس طالب علم میں چوری کی بھی عادت پیدا کر دی ہے۔ اگر بفرض محال یہ لڑکا پڑھ پڑھا کر عالم بھی ہو گیا تو چوری کا جو چسکا اس کو بچپن میں پڑ گیا ہے وہ آئندہ چل کر رنگ لائیگا۔ اور وہ اپنے کردار سے علم جیسی چیز کو بیکار کر دے گا۔ یاد رکھو کہ طالب علموں کو راہ سے بھٹکانا سب کا فرض ہے۔ اور اگر تم اس میں کامیاب

ہو گئے تو سمجھ لو کہ بیڑا پار ہے۔ ہمارے اس دوست کو مسٹر خبیث کی جگہ پر ترقی دی جائے۔ اور شراب کا جو پیپا بطور کارگذاری آج دیا جانے والا تھا وہ ان کو عطا کیا جائے۔ اچھا دربار برخاست ہو۔

اب یہ سنئے کہ ادھر تو مسٹر شیطان مولانا وحشی کی جون بدلے چارپائی پر پڑے یہ سوچ رہے تھے کہ مولانا نعمت اللہ سے کل کس پیچ پر گفتگو کروں۔ اور ادھر مولوی نعمت اللہ نے اپنے حاشیہ کے لوگوں کو اس لئے جمع کیا کہ مولانا وحشی سے بدلہ کس طرح لیا جائے۔ آخر یہ قرار پایا کہ چند آدمی جو ہاتھ پاؤں کے ذرا تگڑے ہوں وہ ان کے مکان پر جائیں۔ اور ان کو اس بیہودگی کا مزا چکھائیں۔ اسی وقت چھ آدمیوں کا انتخاب ہوا۔ اور ان لوگوں نے جا کر مولانا وحشی کا دروازہ رات کے کوئی دو بجے کھٹکھٹایا۔ مسٹر شیطان نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ دروازہ کھولنا تھا کہ چھؤں آدمی ان پر لوٹ پڑے۔ اور ان کی کندی کرنی شروع کردی۔ انھوں نے کہا بھی کہ "بھائیو! میں مولانا وحشی نہیں شیطان ہوں" مگر انھوں نے یہ کہہ کر کہ "تجھ کو ہم شیطان ہی سمجھ کر مار رہے ہیں" ان کو اچھی طرح زم[1] کر دیا۔ اس مارپیٹ کو مولانا وحشی کی بیوی نے کوٹھڑی میں سے جھانک کر دیکھا۔ اور دروازہ بند کر لیا۔ سمجھ گئیں کہ آج شام کو مولانا جو شیخی بگھار رہے تھے کہ میں نے مولوی نعمت اللہ کو یوں زک دی اور یوں زک دی۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے۔ جب یہ لوگ مارپیٹ سے فراغت پا کر رخصت ہوئے تو وہ کوٹھڑی سے باہر آئیں۔ باورچی خانہ میں جا کر اپنا ہتھیار یعنی پھکنی لائیں۔ اور دل کھول کر مسٹر شیطان پر برسانی شروع کیں۔ مارتی تھیں اور کہتی تھیں "اور جا۔ جا کر مولویوں سے جھگڑا کرو۔ گھر کی یہ حالت اور تمہاری یہ کیفیت۔ میں تو اپنے میکہ جاتی ہوں۔ تم جانو، بچے جانیں اور یہ گھر جانے۔ غضب خدا کا جاتے بوجھتے نوخاک نہیں۔ اور لڑنے کو کھڑے ہوتے ہیں مولوی نعمت اللہ سے جو میری بھاوج کے ماموں زاد بھائی کے پیر ہیں" غرض

جب یہ بھی مارتے مارتے تھک کر چور ہو گئیں اس وقت انھوں نے ہاتھ روکا۔ اور اس میدان جنگ میں امن ہوا۔ آپ یہاں یہ سوال ضرور کرینگے کہ شیطان نے ان حملوں کے مقابلہ میں اپنی طاقت کیوں استعمال نہیں کی۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ مولانا وحشی بننے کے بعد یہ شیطان نہیں رہے تھے انسان ہو گئے تھے۔ اور ظاہر ہے کہ انسانوں میں ایک کی دوا دو ہوتے ہیں۔ اور پٹنے کے بعد ان کی چوٹوں پر ہلدی چونہ تھوپنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ انسان ہونے کے بعد شیطان میں طاقت کہاں رہتی ہے۔ کہ "چھو" کیا اور غائب ہو گئے۔ یا ہاتھ پھیرا اور زخم اچھے ہو گئے۔ خیر ان دو حملوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ مسٹر شیطان رات تو کیا سارے دن اسی طرح بے حال پڑے رہے۔ نہ کسی نے ان کے زخموں کی خبر لی، نہ چوٹوں کو سینکا، نہ کھانا دیا اور نہ پانی۔ اور اسی طرح ہوتے ہوتے رات کے بارہ بجنے کے قریب ہو گئے۔ اس وقت مولانا وحشی اپنے گھر میں تشریف فرما ہوئے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ان کے یار عزیز نیم بیہوشی کی حالت میں پڑے ہیں۔

انھوں نے دوست کے منہ پر پانی چھڑکا۔ ایک دو گھونٹ پانی پلایا۔ اس وقت اس بیچارے کے کچھ دم میں دم آیا۔ اور اس نے نیچی آواز میں کہا کہ "مولانا آپ آ گئے خدا کیلئے مجھے اس مصیبت سے نجات دلائیے۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ شیطان بننا آسان ہے اور انسان بننا مشکل" مولانا وحشی نے کہا "آخر ہوا کیا" اس پر مسٹر شیطان نے سارا واقعہ بیان کیا۔ چونکہ چولا بدلنے کی مدت پورے چوبیس گھنٹے تھی۔ اس لئے ادھر بارہ کا گجر بجا اور ادھر دونوں اپنی اصلی شکل میں آ گئے۔ مگر مولانا وحشی نے اپنی شکل میں آتے ہی درد سے چیخیں مارنی شروع کیں۔ شیطان نے کہا "مولانا ٹھیرو۔ میں ابھی آپکی حالت درست کئے دیتا ہوں" یہ کہہ کر اس نے کچھ پڑھ کر ان پر دم کیا۔ اور اس کے ساتھ ہی ان کی تکلیف رفع ہو گئی۔ اس کے بعد شیطان نے کہا "مولانا اس وقت میرے حواس درست نہیں۔ میں کل آؤں گا۔ اور ہم دونوں مل کر اس پر غور کریں گے کہ آئندہ کیا کیا جائے۔ کیونکہ مجھے یہ بھی معلوم کرنا ہے کہ آپ نے میری جگہ کس طرح کام انجام دیا" یہ کہہ کر وہ تو رخصت ہوا اور مولانا وحشی پڑ کر سو گئے۔

---

[1] محاورہ تو یہ ہے کہ ہڈیاں پسلیاں نرم کردیں۔ مگر چونکہ مجھے یہ معلوم نہیں کہ شیطان کی ہڈیاں پسلیاں ہوتی بھی ہیں یا نہیں اس لئے میں نے محاورہ میں کچھ ادل بدل کر دیا ہے۔ معاف فرمائیے گا۔

دوسرے دن وقت مقررہ پر مسٹر شیطان نازل ہوئے مولانا اس وقت تک جاگ رہے تھے اور طرح طرح کے منصوبے دل میں گانٹھ رہے تھے " آداب عرض " ہے کی آواز پر اٹھ بیٹھے اور کہا۔

ملا :- میں نے آج ایک ایسی ترکیب نکالی ہے کہ میں بھی اس روز روز کے مانگنے کی مصیبت سے بچ جاؤں گا اور تمہاری بھی کچھ مدد کر سکوں گا۔

شیطان :- مولانا آخر ہم بھی تو سنیں کہ وہ کیا ترکیب ہے۔

ملا :- ترکیب یہ ہے کہ اخبار نکالا جائے اور اپنا پروپیگنڈا کیا جائے کیونکہ آجکل پروپیگنڈا کرنے سے بآسانی ایک مفلس لکھ پتی بن سکتا ہے۔ مگر اخبار نکالنے کیلئے پیسے کی ضرورت ہے۔

شیطان :- ترکیب تو اچھی ہے اب رہا روپیہ پیسہ۔ تو اس سے آپ بےفکر رہیے۔ فرمائیے کہ مطبع کھولنے میں کیا خرچ ہوگا؟

ملا :- میرے خیال میں اگر ایک لاکھ روپیہ مل جائے تو یہ کام قابلِ اطمینان طریقے پر چل سکتا ہے۔ اب رہی رقم کی ادائی تو کام چل نکلنے پر معہ سود آپ کو ادا کر دی جائیگی۔

شیطان :- ادائی کی آپ فکر نہ کیجئے۔ یہ لیجئے ایک لاکھ روپے کا چک۔ اب اس کے بعد میری خواہش بھی سن لیجئے۔ وہ یہ ہے کہ آپ اخبار نکالیے۔ مگر اس میں مضمون ایسے لکھا کیجئے کہ ان کو پڑھ کر دُنیا کے جتنے مذہب ہیں ان کے پیرو اُچھل پڑیں، آپس میں لٹھ چلے اور اس طرح آپ کا نام دُنیا میں روشن ہو۔ کل جو میری کرسی پر بیٹھ کر آپ نے فیصلے کئے ہیں اس کے لحاظ سے مجھے یقین ہے کہ آپ کا اخبار چلے گا اور خوب چلے گا۔

ملا :- مگر مسٹر۔ آجکل قانون کا بڑا زور ہے۔ لڑائی تو ہوگی بعد میں شروع ہی میں مجھے یہ لوگ، عدالت میں دھر گھسیٹیں گے۔

شیطان :- تعجب ہے کہ آپ اتنے ہوشیار ہونے کے بعد بھی قانون سے ڈرتے ہیں۔ قانون ہے ہی کیا۔ صرف لفظوں کا گورکھ دھندا ہے۔ جب آپ نے اپنی لفاظی سے مولوی نعمت اللہ جیسے قابل شخص کو دبا لیا تو عدالت کے ایک معمولی جج کو دبا لینا آپ کے نزدیک کونسی بڑی بات ہے۔ اور جب میں آپ کی مدد کو ہر وقت تیار ہوں اور روپیہ پیسہ پانی کی طرح بہانے پر آمادہ ہوں تو پھر یہ تو خیال میں بھی نہیں آ سکتا کہ کوئی فیصلہ آپ کے خلاف ہوگا یا ہو سکے گا۔

ملا :- میں تو چاہتا تھا کہ اخبار میں پولیٹکل مضمون دیا کروں۔ اور اس طرح تھوڑے دنوں میں کسی نہ کسی پارٹی کا لیڈر ہو جاؤں۔ اور آپ اس کے بجائے مجھ سے مذہبی امور پر لکھنے کی خواہش کرتے ہیں۔ ذرا یہ تو غور کیجئے کہ فی زمانہ مذہبی امور سے کون بھلا مائلِ دلچسپی لیتا ہے۔

شیطان :- میرا منشا مذہبی امور سے خالص مذہبی امور نہیں ہیں۔ میرا تو یہ مقصد ہے کہ آپ ہر مذہب کے اصولوں پر حملہ کریں۔ ہر مقتدرِ مذہب کا خاکہ اُڑائیں۔ اور اس طرح ان حامیانِ مذہب کا کچا چٹھا کھول کر دُنیا کے سامنے رکھ دیں۔

ملا :- مگر اس سے مجھے کیا فائدہ پہنچ گا یا پہنچ سکتا ہے۔

شیطان :- مجھے ان باتوں کا بہت تجربہ ہے۔ ابھی کچھ عرصہ ہوا کہ اسی ملک کے ایک حصہ میں ایک صاحب پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں ہر مذہب پر ایسے ایسے الٹے سیدھے اعتراض کرنے شروع کئے کہ سارے ملک میں ایک آگ سی لگ گئی۔ پہلے تو آپس میں تو تکار رہوئی۔ اس کے بعد لپاڈگی ہوئی۔ پھر سر پھٹول ہوئی۔ آخر نتیجہ یہ نکلا کہ وہ صاحب پورے ایک فرقہ کے بانی ہو گئے اور اب اُن کے لاکھوں پیرو ہیں۔ تو مولانا میرا یہ کہنا ہے کہ آپ کے اس عجیب و غریب ملک میں انسان مار پیٹ اور جیل جانے کے بعد ہی لیڈر بنتا ہے۔ خواہ اس میں لیڈر بننے کی صلاحیت ہو یا نہ ہو۔ فرمائیے کہ اس کے بعد آپ کی کیا رائے قرار پائی ہے۔

ملا :- میں نے اس مسئلہ پر اس پہلو سے غور نہیں کیا تھا۔ اب آپکی حجت سُننے کے بعد میں یہی مناسب سمجھتا ہوں کہ اخبار کا لہجہ ذرا سخت اور اعتراضات کا پہلو لئے ہوئے ہونا چاہیے۔ اب رہا اس کا پولیٹکل پہلو تو مذہبی

چاہت کی وجہ سے ہوگی میں خود پولیٹکل پہلو نکل آتا ہے۔ کیونکہ کہتے کہ ہمارے ملک میں تو ہر اخبار اور ہر تحریر کا پولیٹکل پہلو دراصل مذہبی پہلو ہے۔

شیطان:۔ تو پھر کل ہی اخبار جاری کرنے کی اجازت لے لیجئے۔ مجھے اب ہر روز حاضر ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ جب یاد کیجئے گا حاضر ہو جاؤں گا۔ اور ہاں آپ نے اپنے اخبار کا نام کیا تجویز کیا ہے۔

میں:۔ میں اس کا نام **لاحول ولا قوۃ الا باللہ** رکھنا چاہتا ہوں۔

شیطان:۔ دیکھئے اس نام سے نہ صرف میری توہین بلکہ اس معاہدہ کی اس شرط کی بھی خلاف ورزی ہوتی ہے جو ہمارے اور آپ کے درمیان ہوا تھا۔

میں:۔ تو پھر میں اس فقرے کو ذرا مختصر کر دیتا ہوں اور اخبار کا نام صرف **لاحول ولا** رکھتا ہوں۔ کہئے منظور ہے؟

مسٹر شیطان نے کچھ تھوڑی دیر غور کر کے کہا کہ "مجھے منظور ہے۔ اچھا اب اجازت چاہتا ہوں۔ آداب عرض ہے۔"

الغرض دوسرے ہی دن اخبار کی اجراء کی درخواست دے دی گئی۔ اور اسی روز مناسب پیروی کے بعد منظور ہو گئی۔ پہلا پرچہ نکلا۔ اور سارے شہر میں ایک اودھم مچ گیا۔ اخباروں نے اس نئے پرچے کے لہجہ پر اعتراض کئے۔ اور اس طرح اس کی اشاعت تھوڑے ہی دنوں میں ہزاروں تک پہونچ گئی۔ اور ساتھ ہی ساتھ مولانا وحشی کے معتقدین کی تعداد بھی بڑھنے لگی۔ دوسرا حملہ اس پر ایک مذہبی پیشوا نے کیا۔ اور مولانا وحشی کو عدالت میں گھسیٹ لایا۔ یہاں کچھ تو مولانا کی تقدیر سے، کچھ روپے کے زور سے اور کچھ ان وسوسوں کی وجہ سے جو مسٹر شیطان نے مجسٹریٹ کے دل میں پیدا کر دیئے تھے مقدمہ اخبار کے موافق طے پایا۔ اور اس کے ساتھ ہی مولانا وحشی کی شہرت میں چار چاند لگ گئے۔ اور ان کی ایک خاصی اچھی پارٹی قائم ہو گئی۔ اس کے مقابلہ کی پارٹی ایک اور پارٹی میں جس کے خلاف اخبار لاحول [illegible] زہر اگلا کرتا تھا کچھ مار ادھیڑ ہوئی۔ چونکہ ان کی پارٹی والوں کا [illegible] ہوئے "ٹھوکائی" ان ہی کی ہوئی۔ مقدمہ از [illegible] مخالف پارٹی والے سزایاب ہوئے۔ اب کیا تھا سارے ملک میں مولانا وحشی اور ان کے اخبار کی دھوم مچ گئی۔ ہزاروں کی تعداد میں چھپتا اور گھنٹے دو گھنٹے ہی میں سارے پرچے نکل جاتے۔

اس اخبار میں کیا کیا چھپا۔ کس کس مذہب پر حملے کئے گئے۔ کن کن لوگوں کو برا بھلا کہا گیا۔ اور کس کس رنگ میں مولانا نے اپنے نام اور کام کو اُجاگر کیا۔ اس کا اظہار میں غیر ضروری سمجھتا ہوں اور اس لئے غیر ضروری سمجھتا ہوں کہ اس اخبار کے پرچے ہر جگہ ملتے ہیں۔ آپ خود خرید کر یا مانگ کر یا چُرا کر دیکھ لیجئے۔ اگر میں نے کہیں اپنے اس مضمون میں اس کا کچھ حصہ نقل کر دیا۔ تو معلوم نہیں کہ مجھ پر کیا مصیبت نازل ہو۔ اور کس کس عدالت میں گھسیٹنا پڑے۔

بہر حال تھوڑے ہی دنوں میں مولانا وحشی نے ایک بہت بڑا باغ خریدا۔ اس میں ایک عالی شان مکان تعمیر کرایا۔ بہت سی آراضی نیلام میں لی۔ کئی مکان گروی لئے اور اس طرح رفتہ رفتہ یہ کچھ سے کچھ ہو گئے۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ بڑے آدمیوں کے بڑے ہی خیالات ہوتے ہیں۔ اب ان کو خیال آیا کہ اگر اپنی پارٹی میں پیری مریدی کا رنگ ڈالا جائے تو اس سے بہت کچھ "دست غیب" کا کام لیا جا سکتا ہے۔ خیال آنا تھا کہ اس کو عملی جامہ پہنا دیا گیا۔ اور مولانا وحشی کی جگہ یہ اب "پیرو مرشد" کہلانے لگے۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے اپنے اخبار کے ذریعے سے اپنے سلسلہ کے ایسے عجیب وغریب پہلو ظاہر کئے کہ ہر شخص کل حب یدخلون فی دین اللہ کا خیال کر کے ان کے سلسلہ میں داخل اور مولانا کے کمال کا دم بھرنے اور ان کا کلمہ پڑھنے لگا۔ اب رہا آمدنی کا سوال تو جہاں مرید اپنے مرشد کے ایسے گرویدہ ہوں وہاں آمدنی کا روز بروز بڑھنا ایک لازمی امر ہے۔ چونکہ انھوں نے اپنے مریدوں کو نئی نئی قسم کے اعمال کی تلقین کی تھی۔ اس لئے مذہبی مقتداؤں نے ان کے کافر ہونے کا فتویٰ دے دیا۔ اور آپ جانتے ہی ہیں کہ کافر بننے یا بنائے جانے کے بعد انسان کی شہرت کو پر لگ جاتے ہیں۔ جب اس کشاکش نے ذرا سخت صورت اختیار کی تو انھوں نے ایک نئے فرقے کی بنیاد ڈالی۔ اور "پیرو مرشد" سے بڑھ کر ایک دم "نبی" ہو گئے۔ ان کے نبی ہونے کا اعلان ہونا تھا کہ سارے ملک میں ایک آگ سی لگ گئی۔ مگر آجکل دنیا میں تھا اس تیزی

کرسے ہیں کہ تھوڑے ہی دنوں میں یہ آگ یکہ ٹھنڈی پڑ کر رہ گئی۔

اب کیا ہے۔ یہ ہمیشہ دوسرے پہ نکلتے ہیں۔ جا بجا دھوتیں کھاتے ہیں۔ روپیہ اکٹھے کرتے ہیں۔ اپنا سید ھا کرتے ہیں۔ دوسرے مذہب والوں کو صلواتیں سناتے ہیں۔ اور گھر پہ آکو مزے اُڑاتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ جہاں یہ جاتے ہیں وہاں کچھ نہ کچھ ضرور چل جاتی ہے۔ اس سے کیا ہوتا ہے۔ بس زیادہ سے زیادہ یہی ہوتا ہے کہ اگر ان کی پارٹی والوں میں سے دس پانچ کو سزا ہو جاتی ہے تو دوسرے فریق کے بیس پچیس آدمی جیل جاتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ یہ جھاڑو کی تیلیوں کی طرح ملے ہوتے اور دوسرے بکھرے ہوئے ہیں۔ اس کے پاس روپیہ ہے اور دوسرے قلاش۔ غرض بڑے مزے میں گذر رہی ہے۔

ایک روز رات کے بارہ بجے جناب "نبی جدید" اکیلے بیٹھے آمد و خرچ کا حساب کر رہے تھے کہ آواز آئی "آداب عرض کرتا ہوں"۔ انھوں نے کہا "اوہو آپ ہیں۔ بہت دنوں میں تشریف آوری ہوئی"۔ ان کے دوست مسٹر شیطان نے کہا۔ "جناب والا۔ جس ڈھنگ سے جس طرح آپ اس مذہبی کارروائی کو چلا رہے ہیں وہ ایسی مکمل ہے کہ مجھے آنے یا مشورہ دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور اب تو آپ نبی ہو کر مجھ سے بھی بڑھ گئے ہیں۔ میں شیطان ہوں مگر میں نے کبھی نبوت کا دعوےٰ نہیں کیا۔ اور کیسے کر سکتا تھا۔ جب میں جانتا تھا کہ اس رتبے پر پہنچنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔ بہرحال میں مبارکباد دینے حاضر ہوا ہوں۔ اب آپ کو میری ضرورت نہیں رہی ہے اس لئے شاید اب حاضر بھی نہ ہوں۔ البتہ اس کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ کے طریقہ عمل سے میری کارگذاری کو بہت تقویت پہونچ رہی ہے۔ اور میں آپ کا بیحد مشکور ہوں۔ اچھا۔ اجازت ہے۔

نبی:- مسٹر ذرا ٹھیرو۔ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اگر تم میری امّت میں داخل ہو جاؤ تو کیسا ہو؟

شیطان:- جناب والا۔ مجھے شاگرد ہونے میں تو کوئی تامل نہیں ہے مگر میرے شاگرد ہونے سے جناب والا کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ مجھ سے کہیں زیادہ تیز اور کارگذار لوگ آپکی امّت میں موجود ہیں۔ اچھا آداب عرض ہے۔

یہ کہتے ہی رہے کہ "ذرا ٹھیرو تو ٹھیرو تو" مگر شیطان یہ کہتا ہوا بھاگ گیا کہ "جناب معاف فرمایئے۔ مجھے ڈر ہے کہ میں اگر تھوڑی دیر اور آپ کے پاس ٹھیر گیا تو کہیں میرا ایمان نہ بگڑ جائے۔"

ساقی بکڈپو دہلی کی مطبوعات

حضرت بہزاد لکھنوی کے مجموعے

نغمۂ نور ۔ کیف و سرور
موج طہور ۔ چراغ طور

ہر مجموعہ میں حمد، نعت، غزلیں، گیت، نظمیں اور مضمین شامل ہیں۔ ہر کتاب مجلد اور دلکش سرورق سے آراستہ ہے۔ ہر مجموعہ کی قیمت ایک روپیہ۔

موج نور بہزاد لکھنوی کے سو گیتوں کا مجموعہ۔ قیمت ۱۲؍

بیان حضور حضور سرور کائنات صلعم سے بہزاد لکھنوی کے والہانہ عشق کا پاکیزہ حاصل "بیان حضور" کی صورت میں ظاہر ہوا۔ قیمت ۸؍

آئینۂ حیرت سیّد رفیق حسین مرحوم نے وحشی اور گھریلو جانوروں کے خصائل و شمائل افسانہ کے پیرایہ میں پیش کر کے ایک انوکھی طرز کی کہانیاں لکھی ہیں۔ یہ مجموعہ ایسی ہی آٹھ دلکش کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ قیمت دو روپے۔

منیجر ساقی بکڈپو دہلی سے طلب فرمایئے

میرا دل پسند صفحہ

سراج حسین نقوی

اخبار اور رسائل کے ازدواجی مسئلوں سے تعلق رکھنے والے کالم یا صفحہ کو میری اولین توجہ کا شرف حاصل ہے اس لئے نہیں کہ میں خدانخواستہ کنوارا ہوں۔ خوش قسمتی یا بدقسمتی سے تعدد ازدواج کا بھی قائل نہیں ہوں۔ خدا کو حاضر ناظر جان کر ڈنکے کی چوٹ پر کیا "ساقی" کے صفحات میں بھی یہ اعلان کرسکتا ہوں کہ میری ازدواجی زندگی نہایت پُرامن اور مسرت آمیز ہے۔ نکاح پڑھانے کی بھی ٹوہ میں نہیں رہتا۔ گو اس پیشے میں کشش بہت ہے لیکن باپ کی نصیحت اور دادا کی وصیت ہے کہ بے گناہوں کے خون سے نامہ اعمال سیاہ نہ کرنا۔ پیشے کا معلم ہوں۔ اور خاندان میں کوئی وکیل ہے نہ مجسٹریٹ جن کی آمدنی کیلئے ازدواجی جھگڑوں اور طلاق کی خبروں کا متلاشی رہوں۔ لیکن پڑھتا ہوں یہی صفحہ سب سے پہلے۔ اس لئے کہ تاریخ عالم کا دارومدار اسی پر ہے۔ تہذیب کی ترقی کے راز اسی میں مضمر ہیں۔ جیل خانے، ہسپتال، فنونِ لطیفہ، ادب جدید وصیت نامے اور پاگل خانے غرض کہ ہر قسم کی تمام چیزیں الفت جنسی ہی کی مرہونِ منت ہیں۔ دنیا کے ہست و بود میں ہر طرف اسی کی کارفرمائی ہے۔ یہ ایک بے پناہ جذبہ ہے۔ اور تعلقاتِ انسانی میں اس سے زیادہ طاقتور رشتہ دوسرا نہیں۔ دُنیا کی نیکیوں اور بدیوں کا تجزیہ کیجئے سب میں یہی جذبہ عیاں یا نہاں طور پر نظر آئیگا۔ مجھے یہ دیکھ کر اچنبھا ہوتا ہے کہ شہروں کو دریا کے سیلاب سے بچانے اور گھروں کو آگ سے محفوظ رکھنے کی تدبیریں تو انسان نے کیں۔ لیکن جنسی جذبات کا دھارا بے روک ٹوک بہہ رہا ہے۔ آتش نفسانی گھروں کو خاکستر کئے ڈالتی ہے۔ اور کوئی پابندیاں اس پر عائد نہیں کی جاتیں۔

اخباروں میں "ضرورت رشتہ" چھاپ دیجئے اور بیسیوں درخواستیں لے لیجئے۔ ایک دلچسپ اشتہار ملاحظہ فرمائیے اعلان ہوتا ہے کہ "ایک خوش نظم، ہر دلعزیز معزز رئیس کو جن کی سالانہ آمدنی تقریباً چوبیس ہزار روپیہ ہے اپنے اکلوتے صاحبزادے (نبیرہ خان بہادر) کیلئے رفیقہ زندگی کی تلاش ہے۔ موصوف کا پارۂ جگر بعمرہ ۱۸ سال حسین، ذہین، تندرست، تمام صوری و معنوی سعادت مندانہ خصوصیات سے ممتاز اور ایف۔ اے کی تعلیم حاصل کرنے میں مصروف ہے۔ کثیر اندوختہ رقم کے علاوہ سالانہ بارہ ہزار آمدنی کا بلاشرکت غیرے مالک ہے۔ اس نور دیدہ کے عروسانہ رشتے کیلئے ذی عزت خاندان کی دوشیزہ لڑکی پسند کی جائے گی۔ جو اپنے نسبی وقار، ذاتی وجاہت، شخصی جاہ و حشمت جسمانی خدوخال کی امتیازی موزونیت، نسوانی دلکشی، شریفانہ معاشرت ظاہری باطنی زیورات کا تمغہ امتیاز رکھنے کی وجہ سے اس زرین خاندان کی صحیح حقدار ہوسکے۔ اگر بآسانی ممکن ہو تو تصویر بھی پردۂ احتیاط میں دیکھی جاسکتی ہے۔ محرکین رشتہ پتہ ذیل پر مراسلت شروع کریں۔ ..."

اس کو پڑھ کر میرے ذہن نے حالات کا نقشہ یوں کھینچا۔ بہتیرے والدین کے منہ میں پانی بھر آیا۔ تحریکیں شروع ہوئیں، کاغذی گھوڑے دوڑے، درمیانی لوگوں کی بے مانگے مراد آئی، جاسوس چھوڑے گئے۔ کٹنیاں دوڑائی گئیں۔ "پردہ احتیاط" میں تصویروں کا تبادلہ ہوا۔ شرطیں طے ہوئیں۔ مہر کا تصفیہ ہوا۔ جہیز کی فہرست مرتب ہوئی۔ دھوم دھام سے برات آئی۔ لوگوں نے مرغن اڑائے۔ نکاح ہوا۔ کہرام برپا ہوا۔ اور گھر سے جنازہ نکل گیا۔

اشتہار سے لیکر نکاح کے وقت تک آپ کہیں بھی اس کا ذکر دیکھیں گے نہ سنیں گے کہ لڑکے کے ذہنی رجحانات کیا ہیں۔ تندرستی میں اس کی کوئی فتور تو نہیں۔ خاندان میں کسی قسم کی متعدی یا ہلاک بیماری تو نہیں ہے۔ اور نہ لڑکے والے ہونے والی رفیقۂ حیات کے متعلق اس قسم کی چھان بین کی زحمت گوارا کرتے ہیں۔ بعد میں جب اصلیتیں بے نقاب ہوتی ہیں تو

قسمت کو سورد الزام ٹھیرا کر سب کے سب بری الذمہ ہو جاتے ہیں۔ ہندستان کے شرفا ابھی تک طلاق کو مذموم سمجھتے ہیں۔ لہٰذا میاں بیوی کی زندگی جیسی گزرتی ہے وہ تو ابھی دونوں کا دل جانتا ہوگا۔ لیکن نہ جانے اللہ میاں کی اس میں کیا مصلحت ہے کہ روگی انسانوں کو چھپر پھاڑ کر اولاد کی نعمت سے مالا مال کر دیا کرتے ہیں۔ یہ ہے وہ ذہنیت جس کا ماتم میرا دل کیا کرتا ہے اور سماج اور حکومت کی بے پروائیوں سے انتقام لینے کا جذبہ بھڑک اٹھتا ہے۔ نسل انسانی میں جسمانی کمزوریوں اور دماغی خرابیوں کی روز افزوں زیادتی اسی ذہنیت کی آئینہ دار ہے۔ ایک دائم المریض یا پیدائشی مجرم کو پوری آزادی حاصل ہے کہ جس عورت کے ساتھ چاہے شادی کر کے درجنوں اولادیں پیدا کرے۔ سماج اور حکومت اپنا فرض صرف یہ سمجھتے ہیں کہ والدین کے ارتکاب جرم کی سزا میں اولادوں کے واسطے پاگل خانے، جیل خانے اور شفا خانے قائم کر دیں یا پھر اس کے "انسداد" کیلئے ادب جدید کی داغ بیل ڈال دیں۔ حفظ ماتقدم کا زریں اصول تو اس کا متقاضی ہے کہ ایسے روگی افراد قوم کی تولیدی صلاحیت طبی ذرائع سے مفقود کر دی جائے تاکہ امراض جسمانی و دماغی انہیں کے ہمراہ دفن ہو جائیں۔ آئندہ نسل کو اس کا خمیازہ نہ بھگتنا پڑے اور قوم کی گاڑھی کمائی زیادہ مفید کاموں میں صرف کی جا سکے۔

زمانہ قدیم میں مشرقی رواج کی شادیاں بہت کامیاب ثابت ہوئیں۔ تاریخ اس کی شاہد ہے اور سبب بھی بآسانی سمجھ میں آ جاتا ہے۔ اس وقت مقصد حیات اور زندگی کی دلچسپیاں محدود تھیں۔ مرد کو ایسی بیوی درکار تھی جو وفادار، باعصمت اور امور خانہ داری میں ماہر ہو۔ عورت اور مرد اپنی عادتوں میں ردّ و بدل کر کے ایک دوسرے کے مذاق کے مطابق اپنے آپ کو بنا لیتے تھے۔ لیکن مغربی تمدّن کے اثرات سے اب ہماری ذہنیت میں انقلاب ہو رہا ہے۔ چنانچہ شادی کے طریقوں میں بھی اسی قسم کا رجحان پایا جاتا ہے۔ البتہ ابھی آدھا تیتر آدھا بٹیر والی نوعیت ہے۔ معاشرتی انقلاب کی جھلکیاں اس میں ضرور نظر آ رہی ہیں۔ تعلیم یافتہ والدین نے اپنی اولادوں کو کافی آزادی دینی شروع کر دی ہے۔ لڑکیوں کو بھی اعلیٰ تعلیم دلائی جانے لگی ہے۔ انھیں اعلیٰ سوسائٹی میں شرکت کی سہولتیں مل رہی ہیں۔

عشق و الفت کی داستانوں اور رومانی ناولوں سے ان کی الماریاں بھری رہتی ہیں۔ اور اپنی دلپسند ہیروئن کے نقش قدم پر چلنے کی آرزو ان کے دلوں میں غیر ارادی طور پر پیدا ہو جاتی ہے۔ اس تخیل پر فلموں کی مزید جلاکاری سونے پر سہاگہ کا کام کر رہی ہے۔ اس تمام ماحول کا اثر یہ ہوتا ہے کہ اپنے ہونے والے شوہر کے متعلق وہ میٹھے میٹھے سپنے دیکھنا شروع کر دیتی ہیں۔ لیکن والدین کو یہ گوارا نہیں کہ ان کی رائے کے خلاف لڑکیاں شادی کریں۔ نتیجہ اس کا گھریلو کشمکش اور بے چینی ہے۔ جس کا ردّعمل یہ ہوتا ہے کہ بعض اوقات لڑکی اپنے منتخب کئے ہوئے مرد کے ساتھ خفیہ طور پر مفرور ہو جاتی ہے۔ اور ایسے افعال کی ذمہ دار مغربی تعلیم قرار دی جاتی ہے۔ لڑکوں کی حالت یہ ہے کہ شباب کے نشہ سے ان کی آنکھیں زندگی کو اصلی رنگ میں دیکھنے سے قاصر ہوتی ہیں۔ لہٰذا وہ ظاہری حُسن اور نمائشی دلفریبیوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ لیکن شادی کے بعد جب اصل عورت سے سابقہ پڑتا ہے تو سارا نشہ ہرن ہو جاتا ہے۔ اور دونو یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ شادی سے پہلے ان کی زندگی زیادہ خوشگوار تھی۔ اس بے لطفی اور ناگوار تعلقات کا کیا سبب ہے؟ قدامت پسند اور اولاد کی شادی کے تمام اختیارات کی چودھریت کے سبب ہم والدین کو ملزم نہیں ٹھیرا سکتے۔ کیونکہ انھیں اس نظام میں کوئی خامی نظر آ ہی نہیں سکتی۔ جس سے ان کی اور ان کے بزرگوں کی ازدواجی زندگی پُرسکون اور اطمینان بخش رہی۔

اس سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جدید طریقہ میں کشش، عارضی مسرّت، ہنگامے اور رومان ضرور ہیں۔ لیکن ایسی شادی لازمی ہوا کرتی ہے جس میں محرومیاں زیادہ اور کامیابیاں بہت کم ہوا کرتی ہیں۔ ہندستان میں ان دونوں نظام میں ابھی کشمکش ہو رہی ہے۔ اس انقلابی دَور میں کبھی ایک کی جیت ہوتی ہے تو کبھی دوسرے کی۔ لیکن نتائج زیادہ صورتوں میں ناگوار ہی ہوتے ہیں۔ نئے رواج کے مطابق منگنی یا سگائی کے اعلان کا مطالعہ میرے ذہن میں دو طرح کی تصویریں بناتا اور بگاڑتا رہتا ہے۔ ایک تو سادہ لوح حماقت کے پُتلے مرد کی اور دوسری بے درد اور خود فریب عورت کی۔ اس دلچسپ ڈرامے کی ابتدا عموماً پھولوں اور سالگرہ کے تحفوں سے ہوتی ہے۔ کبھی تو میں کسی باغ کے

ایک خاموش گوشہ نشیں ہوتا ہوں۔ اور کبھی کسی مکان کے برامدہ میں جہاں دھیمی دھیمی روشنی میں دو دلدار اپنے بہترین شاہکار پیش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ہیروئن میں خوبصورتی سے زیادہ عیاری اور محبت سے زیادہ نمائش ہے۔ وہ ایک تجربہ کار ناخدا کی طرح اپنے مستقبل کی کشتی پہلے سے سوچے ہوئے محفوظ راستے پر کھیتی ہوئی اپنے محبوب بندرگاہ کی طرف لئے جا رہی ہے۔ دوسری طرف ہیرو اپنے ادراک سے زیادہ احمق، ضرورت سے زیادہ مدہوش تمام احتیاطیں اور عاقبت اندیشیاں نذر باد و باراں کئے ہوئے بڑی سے بڑی قربانی کیلئے تیار۔ ہر لفظ پر سمعاً وطاعتاً کہتا چلا جاتا ہے۔ خدا خدا کر کے ناخدا اپنے لنگر ڈالا کشتی محبت ساحل پر آ رکی ہیروں آئینے کے سامنے کھڑے ہو ہو کر جس تقریر کو حضرت حماقت مآب نے حفظ کیا تھا آخر بھیگی بلی بن کر لڑکھڑاتی زبان پر اسے جاری کر ہی دیا۔ تقریر کیا ہوتی ہے چند حماقت بھرے معصوم بھینسے الفاظ کمزوری کے لمحات میں ایک بدقسمت انسان کے منہ سے نکلتے ہیں۔ جسے ان کا خمیازہ ساری عمر بھگتنا ہے۔ بولتا تو مرد ہے لیکن سنتے عورت دیتی ہے۔ اور جب مرد اپنی ملکہ تقدیر کے حسب منشا سب کچھ کہہ چکتا ہے اس وقت کی دلربا اداکاریاں ایسی ہوتی ہیں کہ ہالی وڈ کی حسینائیں بھی ان کے آگے زانوئے تلمذ تہ کرنے پر مجبور ہوں۔ اب وہ وقت آتا ہے کہ ہیرو کی جیب سے ایک انگشتری نکلتی ہے۔ اور ہیروئن کے بائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں پہنائی جاتی ہے۔ اس وقت یہ بت طناز بہ ہزار دربائی طمانیت کا سانس لیتی ہے۔ اور نگاہیں فاتحانہ انداز سے دنیا والوں کو یہ مژدہ سناتی ہیں کہ لو آج ایک اور مرد معقول سے دنیا خالی ہوگئی۔ اخباروں میں اس خبر جانکاہ کو پڑھ کر ہم جیسے "حسرت یاس مسافر بیکس کی روئیے" کی زندہ تصویر بن جاتے ہیں۔

دستور متروک ہوتے گئے۔ اور ان کی جگہ مکاری نے لے لی۔ شادی کی خواہش ظاہر کرنے میں فریب سے کام لیا جانے لگا۔ اے ملکہ تصور تیری آنکھیں رشک غزالاں، تیرا چہرہ غیرت حور، تیری پلکیں نوک پیکاں، تیری نگاہیں ہوشربا، تو شمع میں پروانہ . . . وغیرہ۔ لیکن عورت ان بے پناہ تعریفوں کو کافی نہیں سمجھتی۔ ان سے اس کا مقصد حل نہیں ہوتا۔ وہ تو یہ سننا چاہتی ہے کہ میرے پاس ایک عالی شان مکان ہے۔ اس سے ملحق ایک پائیں باغ ہے۔ بنک میں کافی سرمایہ ہے جس سے تمام تفریح کے سامان مہیا ہو سکتے ہیں۔ لیکن شادی کی درخواست میں چونکہ ان سب کا ذکر معیوب خیال کیا جاتا ہے اس لئے فکر یہ کی جاتی ہے کہ تجویز پیش کرنے سے قبل عورت کو رفتہ رفتہ مکان جائداد، آمدنی، بنک کی پونجی وغیرہ سے آگاہی ہو جائے لیکن کچھ عرصے سے زمانہ نے پھر پلٹا کھایا ہے۔ مرد پھر حقیقت شناس اور اصلیت پسند ہو چلا ہے بلکہ دن کو دن اور رات کو رات کہنے کی خطرناک عادت اس میں آ رہی ہے جس کے ثبوت میں ہمارا اپنا ادب ملاحظہ ہو۔ کیا عجب جو کچھ عرصے بعد شگفتہ مزاج بیسویں صدی کے قیس اپنی لیلیٰ کو یوں مخاطب کرنے لگیں "تم مصائب کی پوٹلی ہو۔ اور میں نے تم سے محبت کرنے کی حماقت کی ہے۔ بہرحال میں زندگی کے چند لمحات کیلئے یہ درد سری مول لینا چاہتا ہوں" مجھے یقین تو نہیں کہ اس طرز کی تجویزیں کامیاب ہو سکیں گی۔ لیکن "امیدوار" قسم کے ناظرین چاہیں تو آزما دیکھیں۔ البتہ اگر آزمائش میں درد سر ہاتھ آ جائے تو خاکسار ذمہ دار نہیں۔

کہا جاتا ہے کہ زمانہ قدیم میں جوانمرد سپاہی کسی حسین دوشیزہ سے شادی کی تجویز کرتے وقت کہا کرتا تھا کہ "اے بنت حوا تو جتنی خوبصورت اور دلکش ہے میں اتنا ہی تندرست اور بہادر ہوں۔ کیا تو میرے بچوں کی ماں بننا پسند کریگی" اس وقت تہذیب نے اتنی ترقی نہ کی تھی۔ کہ عورت جواب میں یہ کہتی کہ اگر بچوں کو باپ کا حسن اور ماں کی بہادری ورثہ میں ملی تو نسل کا کیا حال ہوگا۔ رفتہ رفتہ انسان میں زیادہ سمجھ آ گئی۔ زمانہ قدیم کے بھونڈے

حسب عادت ایک دن میں سگائی کے اعلانات پڑھ رہا تھا۔ اور کچھ اصولی بحث ہو رہی تھی کہ ایک مرد بزرگ پوچھ بیٹھے۔ جناب اگر ہمارا اپنا دستور برا اور مغربی نظام مذموم ہے تو پھر آپ ہی فرمائیے کہ ازدواجی رشتے کس طرح قائم کئے جائیں۔ میں نے کہا سنئے یہ تخیل نہایت مہمل ہے کہ بغیر پہلے سے محبت کئے ازدواجی زندگی کامیاب نہیں بن سکتی۔ کہنے لگے۔ ہمارا بھی یہی خیال ہے۔ اگر صحت عقل،

مناسب انتخاب اور سماجی وقار کا لحاظ رکھتے ہوئے رشتہ قائم کیا جائے تو طرفین میں محبت کا پیدا ہو جانا لازمی ہے چونکہ ہم مذاق لوگوں میں ایک جگہ رہنے سہنے سے دوستی اور دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور رفتہ رفتہ دائمی محبت قائم ہو جاتی ہے۔ میں نے عرض کیا، بجا ارشاد ہوا۔ شادی تو مقصد حیات ہے۔ اور محبت مادی مسرت کا نام ہے۔ یہ عفت اور نفس کشی کی طرح ایک جذبہ ہے جو ہر طرح کی قید و بند سے آزاد ہے۔ مادی تحریکیں ختم ہو جانے پر بھی ازدواجی زندگی پُر کیف رہ سکتی ہے۔ اور جذباتِ جنسی سے کہیں زیادہ اہم اغراض زندگی کو پورا کرتی ہے۔ لہٰذا اگر دولہا دولہن یہ عہد کر لیں کہ وہ تاحیات ایک دوسرے سے الگ نہ ہوں گے اور بجائے ایسے رفیق کی تلاش جو انھیں خوش کر سکے اپنے انتخاب کردہ رفیق کو خوش کرنے میں منہمک رہیں تو یہ گتھی بڑی حد تک سلجھ سکتی ہے۔

شادی کو رومان سے کوئی واسطہ نہیں، یہ تو ایک اصول زندگی ہے جس کا دارومدار طبعی میلان پر ہے۔ اس کی کامیابی کیلئے محض مادی کشش نہیں بلکہ ارادے کی استواری قناعت اور ایک دوسرے کا ہم خیال بننا بھی نہایت ضروری ہیں۔ اگر اس مطمح نظر کا پرچار عام ہو جائے اور لوگوں کی ذہنیت اسے قبول کرے تو دائمی محبت کی راہ میں بچھے ہوئے تمام کانٹے دور ہو جائیں۔ اور یگانگت، جنسی مسرت، ایک دوسرے کی توقیر، یکجا ہو کر صحیح معنوں میں میاں بیوی کو ایک جان دو قالب بنا دیں۔ پیر فرتوت نے بتایا کہ میاں یہ تو تم لوگوں کا شیوہ ہے کہ خوبصورت اور سامعہ نواز الفاظ سے زندگی کے اصول بیان کر دیا کرتے ہو۔ لیکن آخر ان زریں مقاصد کے حصول کیلئے لائحہ عمل کیا تجویز کرتے ہو۔ میں نے کہا بہت آسان ہے۔ جب لڑکی سمجھدار ہو جائے تو اس کے حلقۂ احباب میں ایسے نوجوان لڑکوں کو شامل کیا جائے جنھیں والدین اس کے شوہر ہونے کا اہل سمجھتے ہوں۔ کہنے لگے پھر وہی مغربیت میں نے عرض کیا سنئے تو مغرب میں لڑکی خود لڑکوں سے محبت اور دوستی کرتی ہے اور والدین مزاحم نہیں ہوتے۔ مگر میری تجویز کے مطابق پہلا انتخاب والدین کا اور پھر لڑکی کی پسند۔

کہنے لگے اگر لونڈیا کسی کے ساتھ بھاگ گئی تو خاندان کی ناک نہ کٹ جائے گی۔ میں نے کہا "قبلہ! وہ ضرورت رشتہ والا اشتہار آپ نے شاید نہیں دیکھا جس میں تصویر، پردہ احتیاط، بن کھائی جاسکتی ہے۔" کہنے لگے کیا مطلب؟ میں نے کہا مطلب یہ کہ والدین کو لڑکی کے منتخب کردہ لڑکوں سے ملاقات کا موقع پردہ اختلاط میں نہیں پردہ احتیاط میں دیئے جائیں تاکہ آپ کا اندیشہ بھی دور ہو جائے اور طرفین کو آزادی سے تبادلہ خیالات کے موقعے بھی مل جائیں۔ باپ بھائی، ماں، بہنوں کی موجودگی میں لڑکی کو زیادہ سہولتیں مہیا ہو سکتی ہیں۔ اور وہ ان کی مدد سے امیدواروں کے نظریہ حیات کا صحیح مطالعہ کر سکتی ہے۔ گھا گھ صاحب بولے یہ سب لغویت ہے۔ تم کوئی ترقی پسند ادیب معلوم ہوتے ہو۔ میں نے کہا قبلہ، آپ حضرات کا یہ تشدد ہی نئی پود کو بغاوت پر ابھار رہا ہے۔ اگر آپ لوگ اب بھی نہ سنبھلے تو مغرب کی لعنت اپنی تمام برائیوں اور رسوائیوں کے ساتھ یہاں بھی تسلط کر لیگی۔ آپ لوگوں کو چاہیئے کہ میری طرح اخباروں اور رسالوں میں ازدواجی مسئلوں والا صفحہ بغور پڑھا کیجئے اور نفسیات انسانی اور موجودہ رجحانات سے کما حقہٗ آگاہی حاصل کر کے ہوش کے ناخن لیجئے۔ ورنہ سر پر ہاتھ دھرے روتے ہی رہئے گا۔

نورِ مشرق

ضیا فتح آبادی ایم اے پنجاب کے ان چند معتدر شعرا میں سے ہیں جنھوں نے جدید اردو شاعری کی بنیادوں کو مستحکم کرنے میں اہم حصہ لیا۔ نورِ مشرق کا مطالعہ جدید شاعری کو سمجھنے کیلئے ضروری ہے۔ اس میں شاعر کی نظمیں بھی ہیں، سانیٹ بھی، اور گیت بھی۔ اس کا تعارف جوش ملیح آبادی نے لکھا ہے۔ قیمت ایک روپیہ

ضیا کے قطعات کا مجموعہ
طلوع قیمت ۲/
ضیا کے سو شعر قیمت ۴/
ملنے کا پتہ: گجندلال سونی نمبر ۲۱ دریا گنج دھلی

ماہتابِ فردا

شام افسردہ و پژمردہ سہی
میں تو محرابِ افق دیکھ رہا ہوں ہمدم
ایک دُھندلی سی تجلّی کا وہ موہوم سا خم
بیکراں چرخ میں آزردہ سہی
اک دمکتی ہوئی انگڑائی کی تمہید تو ہے
عزمِ تجدید تو ہے
عزم یہ تیرے لئے مُردہ سہی

آگیا وہ مرا معبودِ کہن
سُرمئی جھیل پہ تاروں کے سفینے کھیتا
شام کے عارضِ شب رنگ کے بوسے لیتا
ڈالتا چہرۂ ظلمت پہ شکن
میں اسے گردشِ ایام کا گرداب کہوں
یا وہ مہتاب کہوں
میرے فردا پہ جو ہے عکس فگن

اب تو ہر شے ہے برافگندہ نقاب
یہ کسی شوخ کے گلنار لبوں کی محراب
یہ تبسم کی چکاچوند، یہ گالوں کے گلاب
نیم وا آنکھوں میں نظروں کی شراب
یہ سمٹتی ہوئی باہوں میں لپٹنے کی اُمنگ
آتے جاتے ہوئے رنگ
یہ تقاضوں کا حیاؤں سے خطاب

مہ تاباں مرے فانوسِ خیال
اپنی کرنوں کو ذرا اور بکھر جانے دے
تیرۂ و تار گپھاؤں میں اتر جانے دے
تیرا پرتو ہو اگر شاملِ حال
اپنا جینا کسی جبار کا مرہون نہ ہو
زیست کا خون نہ ہو
اے مری مشعلِ مریخ جلال

احمد ندیم قاسمی (اے۔ آئی۔ آر۔ لاہور)

راجاؤں کیلئے اور کب مل سکتا تھا۔ جو مغلوں کی حکومت کا خاتمہ کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ جب اورنگ زیب نے حریفوں کو شکست دیکر بادشاہت حاصل کی تو کئی سال تک ان ہندو راجاؤں کو مغلوب کرتا رہا۔ جو مختار ہو گئے تھے۔ لیکن یہ سب سیاسی جنگیں تھیں ان کی بنا کسی مذہبی تعصب پر نہ تھی۔ ان میں سے کسی نے اسلام کے خلاف جہاد نہیں کیا تھا۔ اور جب تک ایسا نہیں ہوا عالمگیر نے جزیہ جاری نہیں کیا۔ عالمگیر کے سن جلوس کیس کے آغاز میں نارنول میں ایک مذہبی فرقہ ست نامی کے نام سے جاری ہوا۔ اور کسی جھگڑے کی بنا پر اس فرقے نے مسلمانوں کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا۔ اور ان کو اس قدر کامیابی ہوئی کہ اسلام اور اسلامی حکومت ہند کی سخت تحقیر اور توہین کی نوبت آ گئی۔ عالمگیر نے مقابلہ کو جو فوج بھیجی ان کے جھنڈوں پر کلمہ طیبہ لکھ کر مسلمانوں کا خوف رفع کیا۔ بہرحال بغاوت رفع ہو گئی۔ اسی طرح متھرا میں ایک مذہبی رنگ کی بغاوت ہوئی۔ اور بہت سے راجہ ایک مندر میں سازش کرنے کیلئے جمع ہوئے۔ اس بغاوت کو بھی رفع کیا۔ مگر عالمگیر پر یہ ثابت ہو گیا کہ اب تک سیاسی مخالفت ہوتی تھی۔ اب مذہبی سازشیں ہونے لگی ہے۔ اس لئے دار الحرب کے قاعدے سے جو علاقہ مطیع الاسلام نہ ہو اس پر جزیہ لگا دیا جاوے۔ چنانچہ ان حالات میں جزیہ لازم ہونے کی وجہ سے اس عالمگیر نے اس اسلامی قانون کا اجرا کر دیا۔ اگر عالمگیر ذاتی طور پر متعصب تھا تو جس دن تخت پر بیٹھا تھا۔ اسی دن سے جزیہ لگوا دیتا۔ مگر یہ بات نہ تھی۔ اس نے بائیس برس تک صبر سے کام لیا۔ *Constitutional* (پابند قانون) بادشاہ تھا۔ ہر معاملہ میں اس نے قانون کی مدد حاصل کی ہے۔

اس موقع پر یہ بیان کر دینا بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ یہ الزام کہ فقط ہندوؤں پر ہی ٹیکس لگایا گیا تھا غلط ہے۔ جہاں جزیہ ہندوؤں پر لگایا گیا وہاں مسلمانوں پر زکواۃ کا ٹیکس جو شرعاً لازمی ہے سرکاری طور پر وصول کرنے کا حکم صادر کر دیا گیا۔ اور یہ ٹیکس چونکہ تمدنی اور ملکیت پر ہوتا تھا اس لئے جزیہ سے زیادہ رقم میں دینا ہوتا تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی اسلامی احکام کی پابندی کے احکام جاری کئے گئے۔ مثلاً ہندستان میں

آداب اور کورنش و تسلیمات کا دستور ہو گیا تھا۔ عالمگیر نے حکم جاری کیا کہ یہ خلاف شرع ہے۔ ہر شخص ایک دوسرے کو سلام علیک کہے حتیٰ کہ عدالت میں محکوم حاکم کو اور حاکم محکوم کو بھی اسلامی سلام کرے۔ شرع میں صرف زمین کا لگان جائز ہے۔ اس بنا پر عالمگیر نے حکم جاری کیا کہ تمام مزاروں، عرسوں اور جاترا کے موقع پر جو ٹیکس لئے جاتے تھے ان کو معاف کیا جاتا ہے۔ اسی طرح راہداری کا ٹیکس یعنی روڈ ٹیکس معاف کر دیا جس سے مسلمان ہندو سب کو برابر فائدہ پہنچا۔ ان ٹیکسوں کے بند کرنے سے سالانہ بجٹ میں پانچ کروڑ روپیہ کا خسارہ ہوا۔ مگر عالمگیر شرع کی پابندی کا قائل تھا۔ وہ ذاتی فائدے کو پیش نظر نہ رکھتا تھا۔

دوسرا الزام یہ ہے کہ عالمگیر نے ایک حکم جاری کیا کہ ہندو ملازمین کی جگہ مسلمانوں کو دی جائے۔ اس کی اصلیت صرف یہ ہے کہ محکمہ حساب میں خاص طور پر افسر و ماتحت ہندو تھے اور بادشاہ کے پاس بہت شکایتیں پہنچی تھیں کہ وہ مسلمانوں کو بہت تنگ کرتے ہیں۔ مثلاً عالمگیر کے زمانہ میں اتی رائے برہمن صدر دفتر کے صیغۂ حساب و تنخواہ کا دیوان اعلیٰ یعنی اکونٹنٹ جنرل تھا۔ مسلمان اس سے اتنے نالاں تھے کہ جب وہ مرا تو خود عالمگیر کے معتمد امیر نعمت خان عالی نے جو اسکی ہجو لکھی اس کے تین شعر ملاحظہ ہوں:-

آں صورت جہادت فیلاں ہتیا بول
ما را چہ فیل بند حساب و کتاب کرد
یا رب نصیب ہیچ مسلمان دگر مباد
ظلمیکہ آں برہمن خانہ خراب کرد
تحقیق داں کہ آں خر عیسیٰ مردہ است
در سایہ رسید و علف خورد و خواب کرد

یہ ضرور نہیں کہ سب شکایتیں لفظ بلفظ صحیح ہوں مگر عالمگیر نے یہ مناسب سمجھا کہ محکمہ حساب میں مسلمانوں کی تعداد بڑھائی جائے۔ اور اس نے حکم دیا کہ جو جگہ خالی ہو مسلمانوں کو دی جائے مگر فوراً ہی دوسرا حکم صادر کیا کہ حساب کے عہدوں پر دو افسر رکھے جائیں ایک ہندو اور ایک مسلمان۔ اس زمانہ میں اقلیت کے حقوق کا غل نہیں مچتا تھا۔ بادشاہ خود رعایا کا نگران و محافظ تھا۔ بایں ہمہ فارسی مورخوں کا بیان ہے کہ عالمگیر کے اس حکم پر

[illegible]

عہد میں بڑا اقتدار تھا۔ شاہجہاں کی ماں عالمگیر کی بھی دادی تھی لہٰذا
جسونت سنگھ رشتے میں اورنگ زیب کا بھائی تھا۔ شجاع پر جب
عالمگیر نے حملہ کیا تو جسونت سنگھ اورنگ زیب کے ساتھ تھا۔ مگر
اندرونی طور پر شجاع سے ملا ہوا تھا۔ دونوں آپس میں یہ فیصلہ ہوا تھا
کہ موقع پا کر جسونت سنگھ اورنگ زیب کے خیموں کو شبخون مار کر لوٹ
لے۔ اور اس گڑبڑ میں شجاع اس پر حملہ کر دے۔ چنانچہ جسونت سنگھ
نے یہی کیا۔ اور لوٹ مار کر اپنے وطن بھاگ گیا۔ شجاع سے فارغ
ہو کر اورنگ زیب نے جودھپور کا رخ کیا۔ مگر جسونت سنگھ کی بھائی
نے تقصیر کے عفو کی درخواست کی اور اورنگ زیب نے معاف کر دیا
اور کابل کا صوبہ دار بنا کر بھیج دیا۔ کیا موجودہ سیاسیات میں ایسی
رواداری کی مثال مل سکتی ہے۔ مگر تذکرہ اجیت سنگھ پسر جسونت سنگھ
کا تھا۔ اس کی اصلیت یہ ہے کہ جسونت سنگھ کا بیٹا کنور پرتھی
سنگھ جسونت سنگھ کی زندگی میں مر چکا تھا۔ کابل میں وفات کے وقت
جسونت سنگھ کی دو رانیاں حاملہ بیان کی گئیں۔ ان رانیوں کو
بادشاہ کی اجازت بغیر راجپوت کابل سے لانے لگے۔ اٹک دریا
کے گھاٹ پر پروانہ راہداری مانگا گیا۔ تو راجپوتوں نے تلواریں
نکال لیں۔ کشت و خون ہوا۔ آخر سب کو گرفتار کر کے لاہور لایا
گیا۔ یہاں پہنچ کر دونوں رانیوں کے ہاں بیٹے پیدا ہوئے ایک
کا نام دل تھمن اور دوسرے کا اجیت سنگھ رکھا گیا۔ لاہور سے
یہ لوگ حراست میں دلی لائے گئے۔ اور عالمگیر نے ان رانیوں
کو اس تحقیقات کیلئے کہ یہ بچے اصلی ہیں یا فرضی دلی میں نظر بند
رکھا۔ سوال جودھپور کی گدی کا تھا کہ جسونت سنگھ کے بعد کس کو
ملے۔ حقیقت میں جسونت سنگھ بھی حقدار نہ تھا۔ اس کے باپ
راجہ گج سنگھ راٹھور تھے۔ ان کی بڑی بیوی سے راؤ امر سنگھ
پیدا ہوا۔ اس کے بہت دن بعد چھوٹی بیوی سے جو بہت
چہیتی تھی جسونت سنگھ ہوا۔ راجہ گج سنگھ نے بیوی کے کہنے میں
آ کر بڑے بیٹے کا حق مارا۔ اور جسونت سنگھ کو اپنا ولیعہد مقرر کر دیا
اور چونکہ شاہجہاں کو راجہ کی خوشی منظور تھی بادشاہ نے بھی اس
فیصلے کو مان لیا۔ چنانچہ باپ کے مرنے کے بعد جسونت سنگھ گدی
پر بیٹھا۔ اب جبکہ جسونت سنگھ مر گیا تو امر سنگھ کے پوتے اندر سنگھ
نے عالمگیر کو اپنے حق کے متعلق درخواست دی اور جودھپور کی گدی
کا دعویٰ کیا۔ اور دل تھمن اور اجیت سنگھ کو مشتبہ بتایا۔ ان کے
باپ کے منصب کا حوالہ دیا۔ عالمگیر کیلئے ضروری ہوا کہ اس معاملہ
کی تحقیقات کرے۔ اسی لئے ان بچوں اور رانیوں کو دلی میں مقدمہ
فیصل ہونے تک رکھنا چاہا۔ جس طرح چال کر کے سیواجی بھاگ گیا
تھا اسی طرح راجپوت جسونت سنگھ کی رانیوں اور اجیت سنگھ کو بھگا
کر جودھپور لے گئے۔ اور وہاں پہنچ کر بغاوت شروع کر دی۔ طاہر خاں
فوجدار جودھپور اور اندر سنگھ حاکم جودھپور بغاوت کو فرو نہ کر سکے۔
طاہر خاں کو اس جرم میں موقوف کر دیا گیا۔ اور اندر سنگھ نے دلی
آ کر پناہ لی۔ عالمگیر نے فوج بھیجی۔ اس موقع پر راجپوتوں نے
شہزادہ اکبر کو اپنی طرف کر لیا تھا۔ قصہ مختصر ایک طویل جنگ کے بعد
راجپوتوں کا زور توڑ دیا گیا۔ اجیت سنگھ اور اس کے رفقا پہاڑوں
میں جا چھپے۔ جودھپور کا انتظام مناسب کیا گیا۔ اندر سنگھ کو جس کا
حق ثابت ہو گیا تھا قوم راٹھور اور حکومت جودھپور پر سرفراز کیا گیا۔
اس طویل واقعے کو اس لئے بیان کیا گیا ہے کہ اجیت سنگھ کے معاملہ
میں جو سلوک عالمگیر نے کیا وہ محض سیاسی تھا۔ مذہبی تعصب سے
اسے کچھ تعلق نہ تھا۔ اگر مذہبی تعصب ہوتا تو جودھپور کی گدی پر اندر
سنگھ کو کیوں بٹھایا جاتا کسی مسلمان کو بٹھا دیا جاتا۔

عالمگیر کا سلوک ہندو امراء کے ساتھ باوجود انکی سازشوں
اور بغاوتوں کے کیا تھا اس سلسلہ میں راجہ جسونت سنگھ کا ذکر ہو چکا
ہے۔ اب درگاداس کا ذکر سنئے۔

یہ شخص جسونت سنگھ کا رشتہ دار تھا۔ اس نے راٹھوروں کی بغاوت
جودھپور کے موقع پر شہزادہ محمد اکبر کو عالمگیر کے خلاف کیا تھا۔ اور محمد اکبر
کے بیٹے بلند اختر کو غائب کر دیا تھا۔ جب جودھپور کا فتنہ رفع ہو گیا تو درگا
داس شجاعت خاں صوبیدار دکن کے توسل سے معافی کیلئے ہاتھ باندھے
ہوئے دربار میں حاضر ہوا۔ عالمگیر نے معافی دی اور سہ ہزاری اور دو ہزار
سوار کے منصب پر سرفراز ہوا۔ بھاگو بنجارہ دکن کی مہم میں عالمگیر کا ساتھ چھوڑ کر
مرہٹوں سے جا ملا تھا اسے بھی معافی دی گئی اور چار ہزار سوار کے منصب پر سرفراز
کیا۔ ان ہندو امرا کے علاوہ جو عالمگیر سے قبل صاحب منصب تھے خود اورنگ زیب نے بہت ہندو
کو امرا کے زمرہ میں شامل کیا۔ پرسوجی اور مالوجی دو مرہٹہ سردار جنہوں نے جنگ
برادران میں عالمگیر کے خلاف دارا شکوہ کا ساتھ دیا شجاعت دی تھی جنگ کے خاتمہ پر
گو ان کو ملازمت سے برخاست کر دیا مگر پرسوجی کو جو چھوٹا بھائی تھا بیس ہزار اور
مالوجی کو تیس ہزار روپیہ سالانہ کی پنشن مقرر کر دی۔

مندرجہ بالا واقعات کو باوجود اگر یہ کہا جائے کہ اورنگ زیب متعصب تھا
تو اکثر سوا اس کے کیا کہا جا سکتا ہے کہ ہٹ دھرمی کا کوئی علاج نہیں ہے حقیقت یہ کہ عالمگیر
ایک کارکن منتظم بادشاہ ہونے کی وجہ سے قابلیت اور لیاقت [illegible] کا قائل ضرور تھا اور

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

اسکے ڈھولے یعنی دیہاتی گیت بہت مشہور رہتے۔ عیدین اور بیساکھی کے موقع پر جب بستی میں میلہ لگتا تو ادھر ادھر کے لوگ لالو کے ڈھولے سننے کیلئے وہاں آجاتے تھے۔ لالو کی آواز میں لوچ بھی تھا اور سوز بھی۔ اور قدرت نے اُسے مردانہ حسن بھی بہت فراخ دلی سے عطا کیا تھا۔ مہراں اور لالو بچپن سے ایک دوسرے کے ساتھی تھے۔ جیسے جیسے عمر اپنی منزلیں طے کر رہی تھی اسی طرح قدرت جذبات میں بھی رنگ بھر رہی تھی۔

مہراں نے تو شاید کبھی اظہارِ محبت کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ لیکن لالو جن نظروں سے دیکھتا وہ پوری طرح محبت کی ترجمانی کر رہی تھیں۔ اور دیکھنے والے بھی اس کی ان نگاہوں کو خوب سمجھتے تھے۔ مردوں کی نسبت عورتوں کو ان باتوں کا زیادہ احساس ہوتا ہے۔ چنانچہ عورتوں میں اسی قسم کی سرگوشیاں اکثر ہوا کرتی تھیں۔ جب چوہدرانی کے کانوں تک یہ باتیں پہونچیں تو اس کے کان کھڑے ہوئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ عورتوں کا لالو کے پاس آنا جانا کم ہوگیا۔ پردہ تو ان لوگوں میں ہوتا نہیں۔ مرد اپنے ہوں یا بیگانے کھلے بندوں مستورات کے پاس آتے جاتے ہیں۔ اور گھر کے ملازم دونوں وقت روٹی بھی اپنی مالکن کے پاس ہی بیٹھ کر کھاتے ہیں۔

کچھ روز اس طرح بھی گذرے۔ لیکن مہراں اور لالو کو ایک دوسرے سے بات چیت کرنے کا موقع مل ہی جاتا۔ کبھی گھر میں کبھی کنوئیں پر۔ کبھی دریا پر۔ اور باتیں کرنے والیاں بات کا بتنگڑ بنا کر چوہدرانی کو سُناتیں۔ چوہدرانی بیٹی سے تو کچھ نہ کہتی لیکن لالو پر آئے دن ناراض ہوتی رہتی۔ اور ان ملاقاتوں کی روک تھام کیلئے گھر میں کام کرنے والی ایک عورت کو تاکید کر دی کہ مہراں جب کہیں جائے وہ بھی اس کے ساتھ جایا کرے۔ اسی اثنا میں مہراں کی ایک گاؤں میں جو دریا کے پار کہیں دور فاصلہ پر تھا سگائی ہوگئی۔ لالو کے دل پر سخت چرکا لگا۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ اب اسے مہراں سے کچھ کہنے سننے کا بہت کم موقع ملتا تھا۔ اور جو ملتا بھی تو بس یہی ایک آدھ بات کرنے کا وقت۔ لالو جب بھینسیں لیکر جنگل میں جاتا تو فراق کے گیت (ڈھولے) گاتا۔ لیکن ایسی آواز سے جو دُور تک نہ پہنچ سکے یعنی ع

دل ہی دل میں ہم انھیں یاد کیا کرتے ہیں

ایک روز مہراں سہیلیوں کے ساتھ دریا پر نہانے جو گئی تو لالو بھی اس کے باپ کی بھینس لیکر دریا پر گیا ہوا تھا۔ بھینسیں دریا میں کنارے کے پاس پانی میں بیٹھی ہوئی تھیں بس سر پانی سے باہر تھے اور کبھی کالی کالی پیٹھیں بھی نظر آنے لگتیں۔ لالو کنارے پر بیٹھا ریت پر ہاتھ سے مختلف شکلیں بناتا اور مٹا دیتا۔ دریا کے کنارے ایک جگہ سرکنڈے اُگے ہوئے تھے۔ سب سہیلیاں سرکنڈوں کی اوٹ میں ہو کر دریا میں تیرنے لگیں۔ مہراں چپکے سے لالو کے پاس آگئی۔ اور آتے ہی ذرا غصہ سے بولی:۔

"لالو! تم مجھے جینے بھی دو گے یا نہیں۔ کیا بکھیڑا پھیلا رکھا ہے تم نے؟"

"کیسا بکھیڑا؟" لالو نے سر اٹھائے بغیر پوچھا۔

"بکھیڑا نہیں تو اور کیا!" مہراں نے جواب دیا۔ "جدھر جاتی ہوں یہی طعنے ملتے ہیں"۔

"کیسے طعنے؟" لالو نے پوچھا۔ "کون دیتا ہے طعنے؟"

"تمھیں معلوم نہیں" مہراں نے پوچھا۔ "کوئی منہ پر تو نہیں کہتا لیکن زبان بھی تو کسی کی بند نہیں کی جاسکتی"۔

"سب قصور میرا ہی ہے" لالو نے کہا۔

"تمھارا نہیں تو اور کس کا!" مہراں نے کہا۔ "تم عقل والے ہوتے تو یہ پابندیاں کیوں ہوتیں!"

"جب دل قابو میں نہ ہو تو عقل کی آواز کانوں تک نہیں پہونچتی" لالو نے جواب دیا۔

"دل کب تک قابو میں نہ رہے گا" مہراں نے پوچھا۔ "پرائی چیز پر کافر کی نظر ہوتی ہے"۔

"پرائی چیز" لالو نے ذرا مسکرا کر کہا۔

"پرائی نہیں تو اور کیا" مہراں نے جواب دیا۔ "مسافر آج بھی گیا اور کل بھی"۔

"تم خوش تو ہوگی؟" لالو نے پوچھا۔

"خوش تو تم بھی رہ سکتے تھے" مہراں نے کہا۔

"میں تو اب بھی خوش ہوں" لالو نے کہا۔

"مجھے بدنام کرکے؟" مہراں نے پوچھا۔ "آفرین ہے تم پر"۔

"میں تو پہلے ہی کہہ چکا ہوں" لالو نے جواب دیا کہ "جو قصور ہے میرا ہی ہے"۔

"میرا بھی تو نہیں" مہراں نے کہا۔ "سانڈنی کی مُہار سلبا

کے ہاتھ ہوتی ہے۔ جدھر لے جائے جانا ہی پڑتا ہے۔ ماں باپ کی مرضی کے آگے سر جھکانا ہی پڑتا ہے۔"

"مہراں!" لالو نے ایک آہ بھر کر کہا "تم جو کچھ کہہ رہی ہو ٹھیک ہے لیکن محبت کی راہ اور ہوتی ہے۔"

"وہ کونسی راہ ہے؟" مہراں نے پوچھا۔

"جو عشق کے مجرم ہوتے ہیں وہ طعنوں اور جگ ہنسائی کی پرواہ نہیں کرتے۔" لالو نے جواب دیا "جو عشق کی راہ میں مرتا ہے زندگی اسی کو ملتی ہے۔"

"تو میں کیا کروں؟" مہراں بولی "کچھ مجھے بھی بتاؤ۔"

"تم کو جو کچھ کرنا تھا وہ تو تم کر چکیں۔" لالو نے جواب دیا۔

"لالو!" مہراں نے جواب دیا "تم مرد ہو میں عورت ہوں تم اس مہرے[1] کی طرح ہو جس کی ناک میں نکیل ابھی نہیں پڑی۔ میں اس ڈاچی کی طرح ہوں جس کے ماتھے پر قدرت نے روز پیدائش سے ہی عزیز کی بندش کی مہر لگا دی ہے۔ میں جھوٹی تب تھی جب میرے بس میں کچھ ہوتا۔ جب تک مجھ پر قید نہ تھی میں ہر روز تم سے ملتی تھی۔ صرف دن ہی کو نہیں بلکہ راتوں کو بھی۔ لیکن آج جو کچھ ہو رہا ہے آخر ایک روز ہونا ہی تھا۔"

"قسمت کی بات ہے مہراں۔" لالو نے ایک آہ بھر کر کہا۔ "میرے پاس بھی دس بیس بھینسیں ہوتیں۔ ڈوم کو میرے کسب کا شجرہ بھی یاد ہوتا۔ میں بھی لوگوں کے ساتھ ایک چارپائی پر بیٹھ سکتا۔ تو شاید آج جب تم مجھے کہیں ملتیں تو کسی ساتھ والی کی اوٹ میں ہو کر چلتیں۔ میں غریب تو ہوں اور تمہارے باپ کا نوکر بھی۔ لیکن نہ میرا دل غریب ہے اور نہ کسی کا نوکر ہے۔ لیکن دل پر میرا اختیار نہیں۔"

اور مہراں نے طنزاً کہا "جس مرد کو دل پر قابو نہ ہو وہ مرد ہی نہیں۔ جس مرد کو کسی عورت سے محبت ہو وہ اس کی عزت اور آبرو کیلئے شوق سے سر کٹواتا ہے۔"

"اور عورت!" لالو نے پوچھا "عورت ہمیشہ مرد سے بے وفائی ہی کیا کرتی ہے کیا؟"

مہراں نے جواب دیا "عورت بے وفا ہوتی ہے جو اپنے شوہر کی عزت کا خیال نہ رکھے۔"

"سچ ہے مہراں۔" لالو نے ایک آہ بھر کر کہا۔

مہراں نے کہا "مجھ پر جب تک بندش نہ تھی کیا میں تم سے ہر روز نہیں ملتی تھی۔ کیا میں نہیں اپنے ہاتھ سے روٹی پکا کر تمہیں کھلاتی تھی۔ کیا میں تمہیں تنور سے میں لسی ڈال کر تمہیں نہیں پلاتی تھی۔ کیا میں نے ماں سے چھپا چھپا کر تازہ مکھن نہیں کھلایا۔ کیا میں تمہارے ساتھ چلو کھانے نہیں جایا کرتی تھی۔ افسوس! تم نے یہ سب باتیں بھلا دیں۔"

"نہیں مہراں۔" لالو نے ایک آہ بھر کر کہا "میں یہ باتیں نہیں بھولا۔ بلکہ ان باتوں نے مجھے دھوکا دیا۔ میں نے سمجھا کچھ اور تھا اور ہو گیا کچھ اور۔"

"لالو!" مہراں بولی "میں تمہاری دشمن نہیں۔ میری بات سنو۔ یہ باتیں اب بھول جاؤ۔ وہ کون لڑکی ہے جسے ایک نہ ایک دن دوسرے گھر نہیں جانا۔ پرائی چیز کی دیوانے آس لگاتے ہیں۔"

دونوں میں یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ مہراں کی سہیلیاں اسے آوازیں دینے لگیں۔ مہراں بولی "لالو۔ لو اب تو میں جاتی ہوں۔ میں کسی روز ماں سے کہوں گی وہ تمہاری شادی کا کہیں انتظام کر دیگی۔"

لالو صرف مسکرا دیا۔ آوازیں اب لحظہ بہ لحظہ نزدیک سے آ رہی تھیں۔ مہراں لمبے لمبے ڈگ بھرتی سرکنڈوں کی طرف چلی گئی۔

آخر ایک روز مہراں کی برات آ گئی۔ چوہدری نبو نے دس تولے سونا، پچاس تولے چاندی، پانچ بھینسیں اور تین اونٹ بیٹی کو جہیز میں دیئے۔ برات کی خدمت کرنے والوں میں لالو بھی تھا۔ جس وقت کہاروں نے ڈولی اٹھائی وہ صحن میں ایک طرف دیوار سے لگا کھڑا تھا۔ دولہا والوں نے جب دولھن کی ڈولی پر سے پیسے نچھاور کئے تو بھک منگے اور گاؤں کے لڑکے لوٹنے کیلئے ٹوٹ پڑے لیکن لالو جہاں کھڑا تھا وہیں کھڑا رہا۔ جب ڈولی چلی تو وہ بھی پیچھے ہو لیا۔ آٹھ کہار اٹھانے والے تھے۔ براتی گھوڑوں اور اونٹوں پر سوار تھے۔ لالو کیسے ساتھ دے سکتا تھا۔ وہ ڈولی کو ایسی حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتا تھا جیسے زخمی کونج ڈار کو اڑتے ہوئے۔ آخر وہ

۱۔ مہرا۔ اونٹ ۔ ۲۔ گاؤں میں شادی بیاہ کے موقع پر اچھے گھرانوں کا حسب و نسب بڑے فخر سے بیان کرتے ہیں۔ ۳۔ یعنی ممکن تھا کہ تم سے میری منگنی ہو جاتی۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

(٨)

[illegible]

(٩)

[illegible]

[illegible]

(٧)

[illegible]

کتابیں ہوتی ہیں۔ دماغ اکثر غیر حاضر رہتا ہے۔ خود ہمیشہ کلاس میں رہتے ہیں۔ فیصلہ کی قوت سے زیادہ ہاضمہ کی قوت ہوتی ہے۔ پڑھنے لکھنے میں شوق کو نہیں خود آزاری کو دخل دیتے ہیں۔ وہ صرف اتنا ہی سیکھنا پڑھنا چاہتے ہیں جتنا روزی کھانے کمانے کے کام میں آئے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کبھی کسی خبط میں مبتلا نہیں ہوسکتے۔ ان کی ساری امیدیں دُنیا سے وابستہ ہوتی ہیں دُنیا کی کوئی امید ان سے وابستہ نہیں ہوتی۔

طالب علموں کا خبط کسی طرح کا ہوتا ہے۔ ان میں بیشتر کتابی خبطی ہوتے ہیں جن کی طرف اس سے پہلے میں اشارہ کرچکا ہوں۔ بعض آرٹ۔ ادب و انقلاب کا خبط رکھتے ہیں۔ کچھ قوم کا خبط رکھتے ہیں۔ قوم کا بھلا دیکھ سکتے ہیں نہ بُرا۔ بقیہ خبطی بصیغۂ متفرقات ہوتے ہیں۔ اب میں جستہ جستہ ان خبطیوں کے اخلاق و اطوار پر خبط دوں گا۔ میری مراد خبطی پر خطبہ ہے۔

کتابی خبطی سے میری مراد ان سے ہے جو کتاب پڑھ کر خبطی ہوجاتے ہیں۔ یہ سمجھتا ہوں کہ جس طرح بعض طبائع کے لئے یا بعض امراض میں بہت سے بہتر مقامات مضر صحت ہوتے ہیں بعض بہترین کتابیں بعض طالب علموں کیلئے نقصان دہ ہوتی ہیں۔ ہمارے بعض طلبا محض اس بنا پر تباہ ہوجاتے ہیں کہ وہ انسانوں سے زیادہ کتابوں پر بھروسہ کرتے ہیں۔ پھر کتاب ہر طالب علم کیلئے مفید نہیں ہوتی۔ کتابی خبطی قابل رحم خبطی ہوتا ہے۔ مجھے ہر خبطی سے محبت ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ مجھے نمائشی یا مصنوعی خبطی سے اتنی ہی نفرت بھی ہے۔

دُنیا کا دستور یہ ہے کہ سچے خبطی کو ہر طرح ستاتی ہے اور جھوٹے خبطی کی پرورش کرتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہر بڑے شاعر، آرٹسٹ اور مصلح کے گرد بے شمار مصنوعی خبطی جمع ہوجاتے ہیں۔ دراصل یہ خبطی نہیں چیلے ہوتے ہیں۔ یہ خبطی اس لئے بنتے ہیں کہ ان کی بیہودگی یا نکمے پن کا محاسبہ نہ کیا جائے۔ نہ صرف یہ بلکہ اپنی اس حرکت سے یہ دوسرے کی نظر میں اصطلاحاً محترم بنے رہتے ہیں۔ اس سے خوب نفع کماتے ہیں اور شریفوں کی آبروریزی کرتے ہیں۔ ہم اپنی زندگی کے ہر شعبے میں ایسے چیلے پاتے ہیں۔ اور ان سے ایک اعلیٰ مقصد، ایک اعلیٰ شخصیت اور ایک اعلیٰ قدر کو جو نقصان پہنچتا ہے اس کا ہم اندازہ نہیں کرسکتے۔ ممکن ہے کہ اس کا سبب یہ ہو کہ ہم خود جعلی خبطیوں کے زمرے میں آتے ہیں۔

آرٹ کا خبط دراصل آرٹ کا خبط نہیں ہوتا بلکہ اپنے آرٹ کا پروپیگنڈا ہوتا ہے۔ اور "اپنا آرٹ" جن لوگوں کا جیسا کچھ ہوتا ہے وہ ظاہر ہے۔ میں ایسے آرٹ کے سامنے سر خم کرنے کو تیار ہوں جس سے انسان کی عظمت و منزلت متعین ہوتی ہو۔ اور ایسے آرٹ کا بالکل قائل نہیں ہوں جس کی خصوصیت صرف اتنی ہو کہ میں یا آپ اس کے واضع ہوں۔ اور جس کی ہر کمزوری پر صرف اس لئے فخر کیا جائے یا اس کو نظر انداز کیا جائے کہ وہ میری یا آپ کی انفرادی کمزوری ہے۔ آرٹ میں انفرادیت یا جمہوریت کے ہرگز یہ معنی نہیں ہیں کہ ہر سفلہ یا ناکارہ آرٹ کو ہاتھ لگائے اور یہ دعویٰ کرے کہ ہمارا ابھی آرٹ ہے، آرٹ خدائے فن ڈھونڈھتا ہے ٹکڑ گدوں سے اس کا کوئی علاقہ نہیں۔ اور خدائے فن محض ایک ووٹ سے خدائے فن کبھی قرار نہیں پاتا۔

میری قطعی رائے ہے کہ آرٹ میں انفرادیت اور جمہوریت کے خبط کی روک تھام ہونی چاہئے۔ اور وہ صرف اس طور پر ممکن ہے کہ جس طرح بڑی بڑی مجلسوں اور نمائشوں میں اس سال کے شاہکار یا فن کار متعین کئے جاتے ہیں ان کو شہرت دی جاتی ہے اور ان کو نوازا جاتا ہے۔ اسی طرح اس سال کے نالائقوں اور ان کے مزخرفات کی بھی نمائش کی جائے۔ اور عین انصاف ہے۔ اگر ہر کس و ناکس کو اس کا حق پہنچتا ہے کہ وہ عظیم المرتبت شخصیتوں کو بے نور یا اپنی شخصیت کو اجاگر کرے تو اس کو اس بات پر بھی تیار رہنا چاہئے کہ نالائق ثابت ہوجانے پر مردود قرار دیا جائے۔ اور عبرت کیلئے وہ یا اس کا شاہکار خود وضاحتی طریقے پر کہیں لٹکا ہوا نظر آئے۔

ہندوستان میں قومی خبطیوں کی کمی نہیں۔ قومی خبطی سے مراد وہ لوگ ہیں جو قوم کو نہ اچھی حالت میں دیکھ سکتے ہیں اور نہ بُری حالت میں۔ قوم کے ایک فرد ہونے کی حیثیت سے مجھے بھی قوم کی خدمت کرنے کا خبط ہے۔ لیکن میں نے خدمت قوم کا خبط کسی ملازمت دلانے والی ایجنسی یا نوٹ کے تبادلے سے نہیں حاصل کیا ہے بلکہ میں نے اس کیلئے تھوڑا بہت لہو پانی کیا ہے لیکن اس کا لحاظ رکھا ہے کہ تھوڑا کیا ہو۔ اور بہت

کیا ہو گا کس کا ہو۔ پانی کس کا۔ کس وقت لہو کو گاڑھا رکھا جائے
اور کس وقت پانی کو۔ جب تک لہو اور پانی کے ان تمام رشتوں
کو پورے طور سے ذہن نشین نہ کر لیا جائے قوم کی کما حقہٗ
خدمت نہیں کی جا سکتی۔ میں جھوٹ نہ بولوں گا۔ اس لئے کہ
یہاں اور اس وقت سچ سچ بولنے میں کوئی مضائقہ نہیں دیکھتا۔
میں قوم کیلئے سر کی بازی تو نہیں لگا سکتا لیکن پگڑی کی بازی لگانے
کیلئے آمادہ ہوں۔ باوجود اس کے کہ میں نے سر پر پگڑی کبھی استعمال
نہیں کی ہے۔ میں اپنے ملک کی بڑی عزت کرتا ہوں اس لئے
کہ دنیا میں میرا ہی یہ ایک ملک ہے جو اپنے خدمت گذاروں
کو کبھی آسائش میں نہیں گھولتا اور خود ہمیشہ ہمیش سے آزمائش
اٹھاتا چلا آرہا ہے۔ مجھ میں کوئی اور عیب نہیں سوائے ان
عیبوں کے جو ہم قومی کارکنوں کے محاسن قرار دیئے گئے ہیں۔
اگر قوم کا راس المال بننے کی مجھ میں اہلیت نہیں ہے تو بیت المال
بننے میں کیا قباحت لازم آتی ہے۔

بات کچھ یوں ہے کہ زندگی کے اصول دو طرح بنتے ہیں
انجام پر نظر رکھ کر اور انجام سے بے نیاز ہو کر۔ ایک کو تجربہ
کہتے ہیں دوسرے کو خبط۔ اکثر یہ دونوں اس طرح ملے جلے رہتے
ہیں کہ یہ فیصلہ کرنا دشوار ہوتا ہے کہ کون کہاں ہے۔ شاید
اسی لئے یہ بھی مانتے ہیں کہ سب کچھ کھو ڈالنے کے عمل کو خبط
کہتے ہیں اور سب کچھ کھو چکنے کے بعد جو باقی بچے اس کو تجربہ،
اصولاً تو یہ ٹھیک ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ اصولاً جو بات ٹھیک
ہوتی ہے اس کے برتنے میں بڑی بے اصولیوں سے سابقہ
پڑتا ہے۔ پھر خبط کے معاملہ میں تو یوں بھی جو اصول کا قائل ہوا
لوگوں کو اس کے بارے میں بڑے شبہات ہونے لگتے ہیں۔
کون کہہ سکتا ہے کہ خبط کب خبط کو چھوڑ کر تجربہ کے حدود میں داخل
ہو جائیگا۔ یا کب تجربہ خبط کیلئے درس عبرت بن جائیگا۔ خاص
طور سے ہمارے ہندوستان ایسے ملک میں جہاں جسم کم اور
روحیں زیادہ نظر آتی ہیں۔

میری سمجھ میں کچھ ایسا آتا ہے کہ ہندوستان کی بر عظمت
کی طرح اس کی روحانیت بھی جو بر اعظم ہی کے پیمانے پر اس میں
ملتی ہے اس کیلئے بیک وقت مفید بھی ہے اور مضر بھی۔ خیال
اور عمل کے درمیان جتنی گہری خلیج یہاں ہے وہ کہیں اور ملنی
مشکل ہے۔

یہاں اصولوں کے قطب مینار بھی ملیں گے۔ تخیل کے تاج
محل بھی۔ فن کے اجنٹا بھی اور فطرت کے ہمالیہ بھی۔ لیکن ہے
کچھ یہی کہ زندگی کی مدھم خزینہ نے ان سب سے بے نیاز اور سب
سے الگ تھلگ افلاس، بے عملی اور ناکامی کے شکستہ آرزو
تاروں میں کھوئی کھوئی سی رہتی ہے۔ یہاں سورج بہت چمکتا
ہے لیکن پانی بھی بہت برستا ہے اس لئے پیٹ میں آگ لگی
ہونے کے باوجود آنکھوں میں ہریالی چھائی رہتی ہے۔ یہاں
ہر دن ایک ہی طرح سے شروع ہوتا ہے اور ایک ہی ڈھنگ
سے ختم ہوتا ہے۔ زمانہ بدلنے میں صدیاں لگتی ہیں۔ ماضی کی
پناہ ڈھونڈھتے ہیں مستقبل پر عمل کرنے سے گریز کرتے
ہیں۔ اس طور پر ماضی تو در کنار مستقبل بھی ان کے ہاں ماضی
ہی بن کر آتا ہے۔ اس سے اس میں کاہلی، قناعت، بیکسی
اور مایوسی آگئی ہے۔ اور ان سب نے گڈمڈ ہو کر ان کو دو چیزوں
کا بڑا معتقد بنا دیا ہے ایک خبط دوسرا مذہب!

آپ کے کہنے سے یہ مان لوں گا کہ یہ دونوں چیزیں
ایک دوسرے سے مختلف نہیں ہیں لیکن اگر خواص کے بہکانے
سے عوام نے یا عوام سے ووٹ حاصل کرنے کیلئے خواص نے
آپ کی جان و آبرو کی دھمکی دی تو پھر ان دونوں کو ایک دوسرے
سے علیحدہ رکھوں گا۔ لیکن اتنا تو ماننا پڑے گا کہ ہمارے ہاں
ہر خبط کی اس طرح پرستش ہوتی ہے جس طرح فرانس میں عورت
امریکہ میں دولت، روس میں انقلاب، انگلستان میں گنجے
سروں، جاپان میں شہنشاہ اور جمہوریت میں خروں کی!

خبط دراصل حوصلے کی اڑان اور عمل کی اس تازہ کاری
کا نام ہے جس سے انسانی کارناموں کی طویل داستان میں ربط
اور تسلسل پیدا ہوتا ہے اور اس میں جان پڑتی ہے۔ یہ زندگی
کا طوق گلو افتار نہیں، زندگی کی بازی ہے جس کو ہار جیت سے
سروکار نہیں۔ یہ مردانِ کار کے کندھوں کو کچھ نہ کچھ کر گذرنے
اور کرتے رہنے کے بوجھ سے گرانبار رکھتا ہے۔ اس کی جبین
بڑی کشش والی بیباک، اس کا تصور بڑا انوکھا اور چالاک، اس
کے اعضا بڑے مطمئن اور لاپرواہ ہوتے ہیں۔ اس کا سرمایہ مستقبل
کے وہ خواب ہوتے ہیں جو اُسے گھوڑدوڑ کے کھلے میدانوں،
تجارت کی بڑی منڈیوں، جنگ و صدف کے اتھاہ سمندروں،
عشق کے حسین خارزاروں، سیاست کی دلدلوں اور شعر و ادب

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

———— [illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

———— [illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

———— [illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

———— [illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

———— [illegible]

[illegible]

[illegible]

قرۃ العین حیدر

رقصِ شرر

پارٹ ون ـ کشتی پر!

جیسو ماریہ!

تُم ـ جیسو ماریہ!! (بالکل ولایتی ہو)

اوہ ـ ادھر دیکھو ـ چھتر منزل کے نیچے نیچے درختوں کے سائے میں گومتی کا رنگ کتنا گہرا سبز نظر آرہا ہے ـ

تمہاری آنکھوں کا رنگ بھی تو ایسا ہی ہے ـ دھندلا سا سبز اور جھلکتا ہوا جیسا ـ

ہوں ـ

کیسی ـ میرا مطلب ہے کہ ـ نفیس بات ہے (دراصل مجھے اس سے بہتر اُردو بولنی نہیں آتی)

بہت نفیس ـ (افسوس کہ مجھے بھی نہیں آتی)

کیونکہ ہم دونوں ہندستان کے ہو کر بھی ہندستان کے نہیں ہیں ـ

ہیں ہیں ـ

کس قدر بری بات ہے یہ ـ

بے انتہا ـ

غروبِ آفتاب کی خاموش قرمزی موسیقی کے ساتھ ساتھ کشتی کھینا تمہیں پسند آرہا ہے ـ

خاصا ـ (اے میرے گیتوں کے ملاح)

اجازت دو کہ عرض کروں کہ کاش شفق کی سُرخی پانیوں پر چلتی رہے ـ شام کی دبیز ہوائیں تمہارے خوبصورت بال اسی طرح پریشان کرتی رہیں ـ اور یہ کشتی ان نامعلوم آبی راستوں پر یوں ہی رواں رہے ـ (ٹیگور کی اُس دُھن پر میں اپنی الفاظ کا بہترین انگریزی ترجمہ کر دیا کرتا تھا)

میرا خیال نہیں ـ

اور جب میں نے تمہیں پہلی مرتبہ ۱۹۴۰ء کے جاڑوں میں مے فیئر بال روم کی اسٹیج پر سفید پھولوں کا تاج پہنے جنوبی اطالیہ کے ساحلوں کا رقص کرتے دیکھا تھا ـ (جہاں تمہارے کالج کا ڈرامہ "ماہی گیر کی لڑکی" پیش کیا جا رہا تھا) اور پھر پچھلے ہفتے جب تم پھولوں کے ڈبے سنبھالے کینٹین سے نکل کر اپنی کار کی طرف بڑھ رہی تھیں ـ

بعد طویل عبارتیں زبانی کہہ ڈالتے ہو ـ ذرا مختصر الفاظ میں اپنا مطلب بیان کرو ـ

ار ـ میں یہ کہہ رہا تھا کہ چھتر منزل کے سائے دریا پر پھیلتے جا رہے ہیں ـ اور میں بے انتہا خوش قسمت ہوں ـ

ظاہر ہے ـ

شپ ـ شپ ـ شپ ـ شپ ـ

تمہیں میرا شہر کیسا لگا؟

اچھا ہے ـ خصوصاً نیو انڈیا کی بالکونی اور امیدٹر پر پُرسکون ندی ـ اور وہ دوسرے کنارے پر بندھی ہوئی لمبی ناؤ کا سلہٹ اور اس کے سائے میں چھپا ہوا امپوٹس کا گھر ـ

جناب وہ ہمارے ہاں کا بوٹ کلب ہے ـ

تمہارے ہاں کا؟

جی یونیورسٹی کا ہمارا ـ

اور وہ مسجد شاندار سا پُل ـ

موتی محل برج ـ

اسی پر سے رومان خوابوں کے گیت گاتا ہوا گذرتا ہے ـ!

معلوم نہیں ـ

شپ ـ شپ ـ شپ ـ چاروں طرف یہ سائے طویل ہوتے جا رہے ہیں ـ فطرت کے یہ مبہم بے معنی سے اشارے ـ ایک نظم سنو گی ـ ہم تین دوست ہیں ـ میں اور میرا سایہ اور زرد چاند ـ شنتوفو کی رات میں جب ستاروں کے دیوتا فیوجی کو کا مقدس بربط بجاتے ہیں تو میں چیری کے درخت کے نیچے بیٹھ کر یاماسشیتا کے چاولوں کی سرخ شراب پیتا ہوں ـ لیکن چاند اور میرا سایہ شراب نہیں پی سکتے ـ پھر

میں شاکو مارا کے مندر میں • ایس چلا آتا ہوں ۔ ہم تین دوست
ہیں ۔ یہ دیاپانی نظم تھی ۔ چینی نظم سناؤں ۔ یاروی !
اُف ۔ خدا کیلئے چپ رہو ۔
شپ ۔ جیپ ۔ شپ ۔
کیا سوچ رہی ہو ؟
کچھ نہیں ۔ ارے یہ کون ؟
کہاں ؟ آنکھوں کے پپوٹے بھاری ۔ ہونٹوں پہ
تیغ کی دھاری ۔ یہ کون آیا ۔ یہ کون آیا ؟
بیہودہ لغو ہو ۔
لیکن اس طرف اتنی دلچسپی سے کیا دیکھ رہی ہو ۔ اس
جھونپڑے کے پیچھے سے کوئی رومال ہلا رہا ہے ۔ ہوگا کوئی ۔
[illegible] انوی نغمہ سولہویں سترھویں صدی کی ۔
ارے وکٹر ۔ قطعی وکٹر ہے ۔ دیو آؤٹ کر رہا ہے
بیوی دائی رہے ۔
کون ہیں یہ بزرگ ؟
وکی ۔ وکی ۔ ٹر ۔ ہیلو ۔ سنی ۔ سنی ۔ شو ۔
اس نے تمہاری آواز نہیں سنی ۔ ہنہ ۔
وکی ۔ آ رہی ہے ۔ شو شو شو (وہ بھی سیٹی بجا رہا
ہے ۔ بہترین سیٹی بجاتا ہے)
آخر یہ کون صاحب ہیں جن سے آپ اتنی بے تکلف
ہیں ۔
ہکٹر رونلڈ اجیت کمار سنگھ ۔ لا مارٹینیر میں میرے
ساتھ پڑھتا تھا ۔
بہرحال ۔ ایک تھرڈ کلاس اینگلو انڈین لڑکے کا یہیں
اس طرح رومال ہلانا میری نظروں میں سخت نامناسب اور معیوب
بات ہے ۔
کیا فرمایا آپ نے ۔ تھرڈ کلاس ۔ جناب والا وہ
سر مہاراج سنگھ کا خالص سگا ۔
فوۃ ۔
شپ ۔ شپ ۔ جیپ ۔ شپ ۔
فوۃ ۔ شوۃ ۔
لالا !
فرمائیے !

میں تم سے صمیم قلب سے معافی چاہتا ہوں ۔
اور میں آپ کو اسی صمیم قلب سے معاف کرتی ہوں ۔
اچھا تو باتیں کرو ۔
گومتی کے پانیوں پر اڑنے والے نیلے پرندے دیکھے
ہیں تم نے ۔ (جنرل قسم کے Topics پر گفتگو کی
جائے گی ۔)
ہُم ۔ راوی کی جھیل میں دیکھے تھے ۔ اور سارس ۔ اس کے
علاوہ بطخ بھی نہایت عمدہ اور مفید پرندہ ہوتا ہے ۔
کس قدر زبردست بور ہیں آپ ۔
لالہ ۔
ارشاد ۔
کبھی تم نے یہ بھی غور کیا (قطع نظر اور تمام باتوں کے)
کہ محبت کتنا شیریں ، خوبصورت ، پیارا خیال ہے ۔
بس ۔ (لطیفوں سے محبت پر آپ خوب پہنچ گئے)
لالہ ۔ ایسے خوبصورت وقت میں (جبکہ آئینہ آب پر
موجہ ستادہ اب پر ، سایہ مہتاب پر ، منظر شب تاب پر ۔ ہے
مری کشتی وال اور میں ہوں نغمہ بار) اگر تم نے اپنی فلسفیانہ
سنجیدگی چھوڑ کر تھوڑی دیر رومان کی باتیں نہ کیں تو یقین جانو
ان تمام چیزوں کے ساتھ (جن کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے) سخت
زیادتی ہوگی ۔ (لہٰذا محبت کے متعلق اپنی رائے مفصل بیان
کرو)
روٹ ۔
ایں !
ہوۃ !
جاپانی زبان میں بولتی ہو ۔) تو یہ افواہ درست تھی کہ
آپ انتہا سے زیادہ میٹر آف فیکٹ ہیں ۔
قطعی درست ۔ تم سے کس نے کہا تھا ۔
عارف کہہ رہا تھا بیچارہ ۔ حالانکہ اس کا خیال تھا کہ یہ
اس کی پسند کی منگنی ہے ۔
پسند کی منگنی ۔ اس سے زیادہ تو کاروباری قسم کی
اور کوئی چیز ہو ہی نہیں سکتی ۔ جیسے دنیا کی اور [illegible]
خالص پروگرام کے ماتحت چل رہی ہیں ۔ [illegible] کی
جائے ۔ دوپہر کو یونیورسٹی کے لیکچر ، شام کو [illegible] ۔ ۔

[illegible]

مس لالہ رُخ ـــ !
ڈیلائیڈ ٹو میٹ یو ـــ
یقین جانو ہم بہترین دوست ثابت ہوں گے ۔
سیلما ماریتا ۔ کیسا رومانٹک اور حسین جیسا نام ہے (میری انتہائی ٹوٹی پھوٹی فرنچ کا سارا زور لگا دینے پر بھی تم خفیف سا مسکرا رہی ہو ۔ یہ بات ٹھیک نہیں)
تمہارے کیتھولک کا سٹیڈ بہت پیارا ہے ۔
نارچ کے تہوار کے بعد بھی ہم ملا کریں گے نا ۔ تم لکھنؤ ہی میں رہتی ہو ۔ لا بلازمیں ۔ مجھے تم بہت اچھی لڑکی معلوم ہو رہی ہو ۔ حالانکہ عموماً غیر ملکی مجھے ذرا نہیں بھاتے ۔ (کیونکہ ہم لوگ بہت سخت قوم پرست ہیں ۔) میرا بھائی بھی تمہیں بہت پسند کرتا ہے ۔
تمہارا بھائی ؟
ہاں ۔ بہترین لیڈی کلر ہے ۔ اس کینٹین کا ٹھیکہ اسی کے پاس ہے ۔
میں اس سے مل کر بہت خوش ہونگی ۔
ــ سیلما ۔ آج کی رات ۔ آج کی رات ۔ کتنی بیوقوفی کی باتیں ہیں یہ ساری کی ساری ۔ جبکہ ۔ جبکہ خاموش ہوا پام کے پتوں کو آہستہ آہستہ ہلا رہی ہے اور اوپر سبز آسمان پر روپہلے ستارے جھلملا رہے ہیں ۔ اور کل جب میں یہاں سے سینکڑوں میل دور جا چکا ہوں گا ۔ یہ پتے اور یہ ہوائیں یونہی گاتی رہیں گی ۔
سیلما ۔
ہوں ـــ
کیا سوچ رہی ہو ؟
وہ کون ہے ؟
میرا منگیتر ـــ آفیشل فیالنسے ـــ
آفیشل فیالنسے ۔
بیپ ۔
اور وہ ـــ دوسرا ۔
وہ کمال ہے ـــ انتہائی باتونی آدمی ـــ اور یہ میں ہوں ـــ لالہ رُخ (میرا اصل یہ نام نہیں ہے ۔ لیکن چونکہ اس نام میں رومان زیادہ نظر آتا ہے اس لئے میں اپنے آپ کو یہی کہلوانا زیادہ پسند کرتی ہوں) ۔ اور تم ـــ محض ایک ہنگرین سی بال روم ڈانسر ـــ اور یہ اپریل کی رات ہے ۔ اور ہم کینٹین کے باہر پائن کے سائے میں سبز بید کی کرسیوں پر بیٹھے انتہائی بے معنی باتیں کر کر کے بیحد خوش ہو رہے ہیں ۔ اور پہلی مئی کے جشن بہاراں کی شام کو تم نیلے ڈینیوب کے سبزہ زاروں کا ناچ دکھلاؤ گی جس کیلئے تم کو ساڑھے تین سو روپے پیشگی فنڈ میں سے دیئے جائیں گے ـــ سیلما ۔
ہاں ۔
کیا خیال ہے تمہارا ؟
سب خوب ۔
تمہیں میرا منگیتر پسند آیا ؟
نہیں ۔
اور کمال ؟
نہیں ۔
میرا بھائی ؟
وہ بھی نہیں ۔
اوہ ۔ پھر تمہارے لئے کیا کیا جائے ؟
کچھ نہیں ۔ شکریہ ۔
تمہیں ہندوستان کے لڑکے اچھے نہیں لگتے ۔
بہت اچھے لگتے ہیں ۔
کیونکہ بہت ویل ٹریڈ ہوتے ہیں ۔ بڑی عمدہ انگریزی بولتے ہیں ۔ بیحد اسٹائیل سے پیار کرتے ہیں ۔ انتہائی احمق ہوتے ہیں ۔ لیکن انتہائی عقل مند نظر آنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ تمہارے ملک کے لڑکے ایسے نہیں ہوتے ۔
نہیں ۔
ـــ فراالین سیلما ۔
ہاں ۔
تمہاری ماں کون تھی ؟
اس کنٹریکٹ میں میری ماں کا ذکر بھی ضروری ہے ۔ ؟
نہیں یونہی پوچھ رہی ہوں ۔ از راہ ہمدردی ۔

[illegible]

لیکن مجھے آپ سے کچھ عرض کرنا ہے۔

ارشاد۔

کیا آپ واقعی عارف سے، اس نامعقول سے جس کے آگے سارے کافی ہاؤس ڈیڈی پانی بھرتے ہیں، (اور جو اپنے انتہائی اسٹائل سے ہکلا کر پانی پیتے ہوئے خالص ولایتی انگریزی بولتا ہے) شادی کر رہی ہیں۔

جی۔ (اور کل تک آپ اس کی ترجمانی در نمائندگی فرما رہے تھے)

لیکن —

اچھا کمال صاحب ایک کام کیجئے۔ یہاں سے تشریف لے جائیے فی الحال۔

. . . .

— اوہ اللہ یہ کتنے خوش رنگ، پیارے سے پھول ہیں۔ کہاں سے خریدے ہے؟

شکریہ۔ ہمارے ہاں پھول خریدے نہیں جاتے ہیں میرے منگیتر نے اپنے باغ سے بھیجے تھے (ہماری دکانوں میں صرف مصنوعی پھول بکتے ہیں)

اوہ۔ تمہارا منگیتر۔ آفیشل بنیا لئے آئی ہیں۔

ہاں اس سے ملو۔ دفتر سے آکر صوفے پر بیٹھا کتابا پڑھتا سا بیٹھا ہے۔ جوائنٹ مجسٹریٹ ہے یا اسی قسم کا کوئی بڑا سا کام کرتا ہے۔ اور آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھ پر ایسا رعب ڈالنا چاہتا ہے جیسے مجھ سے شادی کر کے مجھ پر بڑا عظیم الشان احسان کئے دے رہا ہے۔ سلی گوس۔

ہماری منگنی کی اطلاع گزشتہ مہینے آفیشیل طور پر اخباروں میں چھپ چکی ہے لیکن ہم نے اب تک بہت کم باتیں کی ہیں۔ (موسم اور سینما کے متعلق) ہم دونوں اپنی اپنی جگہ پر بہترین قسم کے منگیتر ثابت ہوئے ہیں۔ کرکٹ اور مثالی۔ وہ ستر میل کی رفتار سے کبھی ڈرائیو نہیں کرتا۔ پن اپ گرلز کی تصویروں سے اسے کوئی دلچسپی نہیں۔ پکچرز کو موویز یا فلیکس کہتے اسے نہیں سنا گیا۔ چار آنہ پوائنٹ سے بھی برج نہیں کھیلتا۔ صبح بہت جلد اٹھ جاتا ہے۔ سگریٹ کے دھوئیں کے حلقے ہرگز نہیں بناتا۔ (اور کمال صاحب جو کچھ اس کے متعلق بیان کرتے ہیں وہ بالکل غلط ہے۔ بس اور تو کیا

اور تو پ نہیں کہتا۔ ہم دونوں کا جب کسی دوسری جگہ پر ملنا ہو جاتا ہے تو دونوں فوراً از راہ اخلاق تھوڑا سا شرما کر دوسروں سے مختلف سنجیدہ و رباتوں میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ (اسی لئے میں تم سے یہ باتیں کر رہی ہوں —)

مجھے انتہائی مسرت ہوئی تمہارے منگیتر سے مل کر۔

اور یہ کمال صاحب ہیں۔ آپ چار پانچ لڑکیوں سے بیک وقت عشق فرماتے ہیں۔ اور ہر تیسرے منٹ پر شعر پڑھتے ہیں۔

شعر!

ہاں۔ ہمارے ہاں کے ڈائن جان شاعروں اور کتابوں کے حوالے پہلے دیتے ہیں اور اپنا مطلب بعد میں بیان کرتے ہیں۔

اس کم عمری میں خاصا وسیع تجربہ رکھتی ہو۔ یہ بھی تمہارے ملک کی خصوصیت ہے۔

دراصل ہمارے خطۂ زمین کی گرم ٹروپیکل آب و ہوا کی وجہ سے —

قطعی۔

تم لپ اسٹک نہیں استعمال کرتی ہو —

تم بھی تو —

لیکن میں محض ایک... بال روم ڈانسر ہوں۔ ہمارے ہاں کوئی اعلیٰ خاندان لڑکی میک اپ کا استعمال نہیں کر سکتی۔

تم نے زندگی کو جمالیاتی احساسات سے علیحدہ کر دیا ہے۔ اور ہم جذبات و احساسات پر مرتے ہیں۔ آرٹ اور خوبصورتی کے پرستار ہیں (تم نے لکھنؤ آرٹ اسکول کی نمائش دیکھی ہوگی)

یقیناً۔ یہی وجہ ہے غالباً کہ تمہارے کافی ہاؤس آرٹ اور خوبصورتی کے پرستاروں سے پر ہوتے ہیں۔

اوہ کسبلا۔ نہ جانے تمہارے کیسے خیالات ہیں۔

تمہارے علاوہ کوئی اور غیر ملکی خصوصاً امریکن جب ہم سے ملتے ہیں، ہماری ایک ایک چیز کی تعریف کرتے ہیں۔ ہماری رنگ رنگی ساریاں، ہمارے سیاہ لمبے لمبے بالوں میں سجے ہوئے کنول اور یاسمین کے پھول، ہمارے مانی پوری رقص — وہ کہتے

ہیں کہ جنتائی کے نقوش اور اجنتا کے ابھاروں میں جان پڑگئی
ہے۔ (اس اتوار کو ایسٹ اینڈ ویسٹ فریٹرنٹی کی میٹنگ
میں چلنا تمہارے خیالات ٹھیک ہوجائیں گے)
اور یہ میرا بھائی ہے۔ فوج میں تھا لیکن جب ہمارے
یہاں ٹھیکوں کا کام حد سے زیادہ بڑھ گیا۔ تو وہ کسی ترکیب
سے ملازمت چھوڑ کر گھر آگیا۔ بڑی بڑی تجارتی اور قومی فائدہ
کی اسکیمیں ہیں۔ اس کے دماغ میں۔ علی گڑھ میں میڈیکل کالج
قائم ہوجانے پر وہاں ایک کافی ہاؤس کھولے گا۔ (تاکہ ملت
کے فرزندوں کو اسٹیشن جانے سے نجات ملے۔) اور پھر اعلیٰ
کاروباری تجربہ حاصل کرنے امریکہ جائیگا۔

پارٹ تھری — فائنل

— اپنے نیلے پردوں والے دریچے میں سے صرف
ایک بار اور جھانک لو۔ آخری بار۔ پھر جب تمہیں نیند
آجائیگی اس وقت ساحل بہت پیچھے رہ چکا ہوگا۔ اس گیت کی
لہریں تمہیں فراموش کردینگی جن کے سہارے سہارے
بہار کا چاند آسمان کا چکر لگاتا ہے۔ آہستہ آہستہ قدم رکھو
سمندر کی سبز موجیں ریت پر اپنے نشان چھوڑتی ہوئی گزر
رہی ہیں۔ بہت دور تمہاری خوابوں کی کشتی سمندر کی ایک اجنبی
کرخت چٹان سے ٹکرا کر ڈوب چکی ہے۔ اس کے ٹوٹنے کی
آواز، لہروں کا غمگین نغمہ اب بھی تمہیں سنائی دے رہا ہے
دھوئیں کے ان نیلے بادلوں کے پرے سے کوئی تمہیں پکار
رہا ہے۔ آخری بار انھیں جواب دیدو۔ پھر وہ آوازیں واپس
چلی جائیں گی۔ اپنا دریچہ بند کرنے سے پہلے، سوچو۔ وہ گیت
وہ گیت جو تم انھیں نہ دے سکیں۔ وہ بہت آگے نکل چکے
ہیں۔ ان کا پیچھا کرنے کی تم میں ہمت نہیں۔ اس شکست کا
خیال کرو جو ایک شاہین کو ایک اونچی چٹان پر سے گرتے ہوئے
محسوس ہوتی ہے۔ وہ رہیں کہار کھوکھیں جن کے سبز کناروں
پر مسرتوں کے جوان اور خوبصورت چہرے اپنی رنگین بالنیاں
سجایا کرتے تھے۔ اور جہاں پہاڑیوں کے پرے سے روپہلی
آبشاروں کی جھنکاریں سنائی دیتی تھیں۔ اپنی آنکھیں، اپنے
لب بند کرلو۔ اپنی پگڈنڈیوں پر سے گذرتے ہوئے ہم نے
خیالوں کے اونچے ایوان سجائے تھے۔ ہم ان چٹانوں پر کھڑے
تھے۔ لیکن ہمارے پرچم مخالف طوفانی ہواؤں کا مقابلہ
نہ کرسکے۔ اور آج جبکہ تم زرد بالوں اور نیلی آنکھوں والے
سیگفرڈ سے بہت دور ہو جو تمہارے دریچے کے نیچے آتا
ہے وہ سیگفرڈ گنگناتا ہے۔ سیلما، سیلما۔
— فوتو — ہل — وناسمتی کی دوغلی چھوکری جو
ہماری کینٹین کے ہندستانی کنٹریکٹر کو رینس کے اسٹال پر کھو
آزمیجی ہوئی مل گئی تھی۔
ہنری! مجھے پچاس روپے چاہئیں۔
ہم۔ نہیں دے سکتا۔
ایک ہفتے سے مانگ رہی ہوں۔
میرے پاس نہیں ہیں۔ اپنے کالے ہندستانی دوستوں
سے لو۔
تم — بیحد سور ہو۔
اور تم شیطان کی اپنی گڑیا۔ فائی فائی — فو —
(جنگ ختم ہوگئی۔ ہم فاتح ہیں)
— فائی فو — جنگ ختم ہوگئی — خدایا تیرا شکر۔
آج شام کو ہم چراغاں دیکھنے گنج حضرت گنج چلیں گے اور دیکھو
امیابدر دیکھو کتنی دوتوں کافی ہاؤسوں میں ساری یونیورسٹی
اس قدر کھڑی ہوتی ہے کہ بڑا ہی عجیب سا لگتا ہے وہاں جانا۔
اوہ۔ کتنے خوش ہیں ہم آج۔ اور سیلما تم چرچ کیلئے ابتک
تیار نہیں ہوئیں۔ چھاؤنی کی طویل اور چمکیلی سڑکوں پر پولیس
کی گاریں خاموشی سے ٹہل رہی ہے کیونکہ کوئی ہنگامہ۔ کنگ سروس
چلیئے یہنٹ رہ جانے والا ہے۔ اور مہاراجہ مہا جگر آباد کی
اندر سیاہ کار بھی انتظام کے سلسلہ میں ان سڑکوں پر سے بار بار
تیزی سے گزر رہی ہے۔ اور ان کی کوٹھی کے پھاٹک میں سے
نکل کر کلکتہ لا مارٹینر کے سیاہ پوش لڑکے قطار در قطار سیٹیاں
بجاتے چرچ جا رہے ہیں۔ لفٹ۔ رائٹ۔ لفٹ۔ رائٹ۔
اوہ خدا۔ ہماری آزمائش کا صبر آزما زمانہ نفرت کے ترانے
گاتا ہوا آج آخر ختم ہوگیا۔ ظلم اور تشدد کی اندھیری طاقتوں
کے طوفان کے مقابلہ میں ہم اور ہمارے ساتھیوں نے کتنی
عظیم الشان قربانیاں پیش کیں۔ مصائب کا کیسی بہادری اور
مسکراہٹ کے ساتھ سامنا کیا۔ اور کیا مضائقہ تھا جو ہندستان
کے ایک پست سے خطے کے چند لاکھ نفوس (جو صدیوں سے

چاول کھا کھا کر ذہن پر رینگنے آ گئے تھے۔ اور جنھیں ٹن فروٹ کھانے کی تمیز نہیں آئی تھی۔ اسٹالوں پر بیٹ لیٹ کر مر گئے۔ یا جنھوں نے دہلی کلاتھ مِل کے دروازوں پر بلوے کے غیر ملکیوں کو کتابیں لکھنے اور کمیونسٹوں کے کونا گوں فارت میں اضافہ کرنے کا موقع بہم پہنچایا۔ یہ ہماری طرف سے آزادی اور جمہوریت کی قربان گاہ پر ایک معمولی سی پیشکش تھی۔ جسے اکارنلاٹ نے ازراہ لطف و کرم قبول فرمایا۔ ہم اپنی کوششوں میں اپنے ساتھی ملکوں سے پیچھے نہیں رہے (دیکھو ریڈیو اسٹیشن، کونسل چیمبر گنج کی اونچی اونچی عمارتوں اور ہماری موٹروں پر ہماری ساتھی قوموں کے پرچم کس خوبصورتی سے لہرا رہے ہیں۔ یونین جیک اپنی کار کے ریڈی ایٹر پر لگانے کے لئے تم بھی خرید لو۔ صرف ساڑھے چار آنہ کا ہے) ہُنہ۔ تم۔ تم جو ہمیں چین اور روس کی عورتوں کے کارنامے سناتے ہو۔ چین اور روس۔ چین اور روس۔ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ ہفتوں۔ دن دن اور رات رات بھر بیٹھ کر اس پارٹیوں کے ساتھ بعض مرتبہ صرف ٹن کے پھلوں اور کریم کریکز پر گذارا کر کے ہم نے محاذ پر بھیجنے کیلئے اونی چیزیں، مٹھائیاں اور تحفوں کی پارسلیں تیار کیں۔ اے آر۔ پی کی ریہرسلوں کے بعد گورنمنٹ ہاؤس کی پارٹیوں کا انتظام کیا۔ ہفتہ میں صرف ایک بار سینما دیکھا۔ اور باقی کے روپئے سے رسالے اور کتابیں خرید کر ہسپتالوں میں بھیجیں۔ اس کے علاوہ بنگال ریلیف کیلئے ٹیگور اور شا کے ڈرامے اسٹیج کئے۔ خود اپنے ہوسٹل میں شاندار مشاعرے منعقد کروائے۔ ہم نے دنیا کو جمہوریت کیلئے محفوظ بنایا ہے۔ ہم ایک نئے دور کے پیغامبر ہیں۔ یہ امن اور صلح کی خوشگوار دُنیا ہے۔ ایٹم بم کی نئی دنیا (جس میں پاکستان کے خواب دیکھنا انتہائی حماقت ہے) زندہ باد اخوّتِ انسانی۔ پائندہ باد عالمگیر جمہوریت۔

. . . .

فائی فو۔ جنگ ختم ہوگئی۔ اُف کمال۔ مجھے سنبھالو۔ میں بیہوش ہوئی جارہی ہوں۔ *Horro — Horror*۔ جنگ ختم ہوگئی۔ اس نے کہا۔ اور تم فاتح ہو۔ یہ تمہارے جشنِ فتح کی رات ہے۔ اور تم انگریز ہو اور میں جرمن۔ تم میرے پاس رقص کیلئے آؤ گے۔ میں تمہیں پیار کروں گی۔ تم مجھے چومنگم دوگے اور پھر میں تمہیں۔ جانتے ہو۔ میں تمہیں شوٹ کردوں گی۔ بڑی آسان بات ہے۔ میں تمہیں اس ریوالور کے ذریعے (جو اصل جرمن ساخت کا ہے اور جسے سیگفریڈ نے ہٹلر یوتھ میں شامل ہو کر اپنے قصبہ سے رخصت ہونیوالی صبح شراب خانہ کے مالک سے خریدا تھا۔) شوٹ کردونگی۔ پھر تم مر جاؤ گے۔ ایک کے بعد ایک۔ اسکوئش کی بوتلیں لنڈھاتے ہوئے — کینٹین میں کھلبلی مچ جائیگی۔ ملٹری پولس کی لاریاں اور ایمبولینس کاریں چاروں طرف دوڑنے لگیں گی۔ تمہارا آفیسر کمانڈنگ اس ہندستانی آئی سی ایس کو جو اس کیمپ کا انچارج ہے۔ اور وہ ہندستانی آئی سی ایس اپنی منگیتر اس ہندستانی کنٹریکٹر کی بہن کو جو میری دوست ہے یہ دہشت ناک خبر پھولے ہوئے سانس سے سنائیگا۔ اور پھر وہ بیہوش ہوجائیگی۔ سب بیہوش ہوجائیں گے۔ او خدا۔ کس قدر لذیذ، مسرت بخش خیال ہے۔ پھر اس نے سچ مچ تین گوروں کو ریوالور کا نشانہ بنادیا۔ اُف کمال۔ کمال۔

ایں۔ جان سے مار ڈالا۔ اور تم واقعی بیہوش ہوئی جا رہی ہو۔ (کسقدر دلکش انداز ہے۔ کاش میں شاعر ہوتا۔ علاوہ ازیں تم اس وقت قطعی ان بے انتہا ترقی پسند خاتون افسانہ نگار کی طرح ایکٹ کر رہی ہو جنھیں پچھلے دنوں ریڈیو اسٹیشن پر سیاہ رومینٹک قمیص میں ملفوف، ایک ڈرامہ میں حصہ لیتے ہوئے مائیکروفون پر براڈکاسٹ کے دوران میں ایک مرد آرٹسٹ کی زبانی خود کو لفظ "پیاری" سے مخاطب ہوتے سُن کر غشی الفور غش آگیا تھا) یقین کرو تمہارے دوست کی اس سنسنی خیز حرکت سے میرے قلب کو انتہائی صدمہ پہنچا (لیکن مشیت ایزدی میں کیا چارہ ہے) (کتنا لمبا جملہ تھا۔ اسکے ختم ہونے کا انتظار کرتی رہی ورنہ اب تک اطمینان سے بیہوش ہوچکی ہوتی) *Shocking*۔ اور پھر جب عارف معائنہ کیلئے موقعہ واردات پر پہنچا تو شیطان کا چھوٹا بھائی وہ کمبخت بچہ اسکو دیکھتے ہی پپا پپا کہتے ہوئے چلّا چلّا کر دیر تک روتا رہا۔ اف۔ (فائی فو)۔

ابا۔ (فائی فو) لالہ۔ تمہاری دھندلی سی سبز، چھلکتی ہوئی آنکھیں آنسو گرانے پر آمادہ نظر آتی ہیں۔

وہ۔ بچّہ۔ اور۔ عارف۔

یہ بھی زندگی کے کاروبار کی ایک شاخ تھی (یعنی برانچ آفس) رومان اور سچائی۔ اور۔ اور یہ تمام خرافات زندگی کے خالص تجارتی پروگرام میں قطعی نہیں سماسکتیں (لہٰذا لالہ رخ پیاری) اس *Shocking* واقعہ کو بھول کر گومتی کے پُرسکون پانیوں پر چلو جہاں ہمیں وہ جاپانی نظم سنا دینگا جو شستو کی رات میں یاماشیٹا کے سایہ تلے فیوجی کو مار دکر سازپر گائی جاتی ہے۔

[illegible]

اظہار کیا ہے جس سے قدرتی طور پر شعر کی تاثیر میں اضافہ ہو گیا۔ اس کے علاوہ خطاب چونکہ محبوب سے ہے لہٰذا ضمناً یہ بات بھی ادا ہو گئی کہ کوئی جانے یا نہ جانے مگر تم جانتے ہو کہ یہ رونے والا کون ہے اور اس کے گریۂ نیم شبی کا سبب کیا ہے، یعنی تم سے محبت اور اس محبت کی ناکامی۔ اسی کا نام ہے کنایہ جسے "ابلغ من التصریح" کہا گیا ہے۔ اگر براہِ راست اس طرح کہہ دیا جاتا کہ "ہم رات کو اٹھ اٹھ کر روتے ہیں جب سارا زمانہ سوتا ہے" تو یقیناً سننے والے پر اور خصوصاً محبوب پر اس کا اتنا اثر نہ ہوتا جتنا اس طرح پردے پردے میں کہنے کا ہوا ہو گا۔ اور ہونا چاہیے۔

(۲) میں کہوں تو شاید ہی تم کو اعتبار آئے
شب کا ماجرا پوچھو آستین دامانش سے (بزم اکبرآبادی)

ہجور کی ساری رات روتے روتے کٹ گئی، آنسوؤں سے آستین بھیگ گئی۔ تکیہ تر ہو گیا۔ گو شعر میں رونے کا لفظ تک نہیں آیا لیکن اس کی ساری روداد اور قطعی ثبوت موجود ہے۔

تخییل کی بے راہ روی: اس محل پر یہ بات یاد رکھنے قابل ہے کہ جہاں تخییل شعر کی روح رواں ہے وہاں اس کی بے راہ روی اور بے اعتدالی شعر کی موت بھی ہے۔ مثلاً انشاء اللہ خاں انشا فرماتے ہیں:

گل برگ تر سمجھ کے لگا بیٹھی ایک چونچ
بلبل ہمارے زخم جگر کے کھرنڈ پر

اول تو جگر کا زخم، پھر اس کا کھرنڈ اور کھرنڈ بھی ایسا شاداب و گلگوں کہ پھول کی پتی کا اس پر دھوکا ہوا اور دھوکا بھی کیسا کچھ کہ بلبل نے اسے سچ مچ پھول کی ایک تازہ پنکھڑی سمجھ کر اور شاعر کے سینے کے اندر پہنچ کر، پیار سے اس میں چونچ ماردی۔ شعر میں تخییل موجود ہے مگر گمراہ، لہٰذا پوری روداد بے بنیاد، صداقت سے خالی اور اثر سے محروم۔ شعر نہیں، ذہنی جمناسٹک ہے۔ اس سے بھی زیادہ تعریف مقصود ہو تو سرکس کا کرتب کہہ لیجیے جسے دیکھ کر تھوڑی سی تفریح تو ضرور ہوتی ہے اور ہم کرتب دکھانے والے کی تعریف بھی کرتے ہیں لیکن ہمارے

جذبات بیدار نہیں ہوتے۔

حکیم مومن خاں مومن کی ایک مشہور غزل کا مطلع ہے:

دفن جب خاک میں ہم سوختہ ساماں ہوں گے
فلس ماہی کے گلِ شمعِ شبستاں ہوں گے

شاعر کو اپنی سوختہ سامانی کی شدت کا اظہار مقصود ہے۔ مشہور ہے کہ زمین گائے کے سینگ پر قائم ہے اور خود گائے ایک مچھلی پر کھڑی ہے۔ جس وقت عاشق صاحب کو دفن کیا جائے گا تو ان کی سوختہ سامانی کے اثر سے مچھلی کے سفنے جل اٹھیں گے اور اس کی اندھیری قبر کے اندر وہ سفنے گویا چراغ کا گل بن جائیں گے۔

تخییل اس شعر میں بھی موجود ہے مگر بیمار۔ بلند پروازی کی انتہا نہیں مگر گمراہی نے منزلِ مقصود سے بھٹکا دیا۔ شعر خوشنما لفظوں کا ایک گورکھ دھندا بن کر رہ گیا اور بس۔ سوختہ سامانی کی انتہا ہے مگر سننے والا اس کی حرارت کو ذرا بھی محسوس نہیں کرتا۔

تعشق لکھنوی کا ایک شعر ہے:

لکھا تھا خط میں انہیں حال آہِ سوزاں کا
سنا ہے راہ میں بجلی گری کبوتر پر

اللہ اللہ! آہِ سوزاں کی معنوی تاثیر تو دیکھیے کہ بیچارے کبوتر جو خط لے کر جا رہا تھا، راستے ہی میں اس پر بجلی گر پڑی اور وہ جل کر خاک سیاہ ہو گیا۔ بڑی خیر ہوئی کہ وہ خط محبوب تک نہ پہنچا ورنہ شاید اس پر بھی بجلی گرتی۔ سچ کہیے اس شعر کو سن کر آپ نے آہِ سوزاں کی آنچ کچھ محسوس کی!

تخییل کی بے راہ روی کے سلسلے میں مبالغے کے متعلق بھی چند ضروری باتیں سن لیجیے۔ اس میں شک نہیں کہ مبالغے سے کلام میں زور پیدا ہوتا ہے جو تاثیرِ بیان میں مدد دیتا ہے اسی بنا پر کہا گیا ہے کہ "احسن الشعر اکذبہ" بہترین شعر وہ ہے جس میں حد سے زیادہ جھوٹ بولا گیا ہو یعنی مبالغہ انتہا کو پہنچا دیا گیا ہو۔ لیکن جس طرح تخییل کی بے راہ روی شعر کو غارت کر دیتی ہے اسی طرح مبالغے کی بے اعتدالی بھی اس کے حسن کو خاک میں ملا دیتی ہے۔ نہ صرف اس قدر بلکہ بعض اوقات کثرتِ مبالغہ کی بنا پر

تاثیر سے مالا مال ہیں۔ یہی حال فارسی کے بعض قصائد کا ہے۔ حسانِ عجم خاقانی کا نام کون نہیں جانتا۔ سلجوقی دور کے بہترین قصیدہ گویوں میں اس کا شمار ہے لیکن عام طور پر اُس کے قصیدے تاثیر سے محروم ہیں۔ اور کیونکہ محروم نہ ہوں جب ان کا یہ انداز ہو:

دل من پیر تعلیم است و من طفلِ زباں دانش
دمِ تسلیم سرِ عشر و سرِ زانو دبستانش

ترجمہ اس کا یہ ہوا کہ میرا دل میرا معلّم ہے اور میں اس کا طفلِ زباں داں ہوں۔ اور خاموشی یا فرماں برداری سرِ عشر ہے (سرِ عشر وہ پہلی دس آیتیں جو قرآن مجید شروع کرانے سے پہلے بچے کو یاد کراتے ہیں) جو شروع تعلیم سے پہلے مجھے سکھایا گیا ہے۔ اور یہ سب تعلیم میں دبستانِ زانو یعنی مدرسۂ مراقبہ میں حاصل کرتا ہوں۔

انصاف سے کہیے کہ اس شعر کے پڑھنے کے بعد آپ کے جذبات کس حد تک متاثر ہوئے؟ بہت ممکن ہو آپ یہ سوچنے لگے ہوں کہ آیا اس کلام پر صحیح معنی میں شعر کا اطلاق ہو بھی سکتا ہے یا نہیں۔ لیکن یہی خاقانی جب مدائن میں قصرِ نوشیرواں کے کھنڈر دیکھتا ہے اور اس ویران مسکن کی عظمتِ رفتہ کو یاد کرتا ہے تو اس کا دل بھر آتا ہے۔ سینے میں جذبات کا ایک طوفان اُمنڈنے لگتا ہے۔ وہ دل کے سوز اور روح کی تڑپ کے ساتھ "ایوانِ مدائن" کے متعلق ایک قصیدہ لکھتا ہے جس کا ایک ایک لفظ تاثیر میں ڈوبا ہوا ہے اور اس کا سبب وہی خلوصِ جذبات اور شدّتِ احساس ہے۔ اس قصیدے کے دو شعر سنیئے: ایوانِ مدائن زبانِ حال سے کہتا ہے:-

از نوحۂ جغد الحق مائیم بہ دردِ سر
از دیدہ گلابے کن، دردِ سرِ ما بفشاں

اُلّوؤں کے شور سے بخدا سر میں درد ہو گیا ہے۔ اے مخاطب تو اپنی آنکھوں سے تھوڑا سا گلاب بنا کر یعنی دو آنسو بہا کر ہمارے دردِ سر کو دُور کر دے۔

ما بارگہِ دادیم ایں رفت ستم بر ما
بر قصرِ ستمگاراں، آیا چہ رسد خذلاں

یہ نوشیرواں عادل کی بارگاہ ہے۔ اس میں انصاف ہوتا تھا۔ اس پر یہ تباہی آئی۔ خدا جانے ظالموں کے محلوں کا کیا حشر ہوگا؟

جیسا کہ ہم پیشتر بیان کر چکے ہیں، شعر کا ایک نہایت اہم عنصر تخیل ہے۔ اور اس کے بھی مختلف مدارج ہیں۔ ادنیٰ۔ متوسط۔ اعلیٰ۔ تخیل شعر میں تشبیہ و استعارہ اور تلمیح و کنایہ کی صورت اختیار کرتا ہے۔ یہ مسئلہ چند مثالوں سے اچھی طرح واضح ہو جائے گا۔

تشبیہ۔ (۱) سب جانتے ہیں کہ نیا چاند اور پُورا چاند سمندر کے سینے میں ایک تلاطم برپا کر دیتا ہے۔ اور چاند کی کشش سے پانی اپنی سطح سے بلند ہو ہو کر بڑھتا ہے اسی کو ہم مدّ (وجزر) یا جوار (بھاٹا) کہتے ہیں۔ یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ محبوب کے چہرے کو ماہِ کامل سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ اور یہ تشبیہ بہت پامال و فرسودہ ہے، لیکن تخیل نے انہیں مقدمات کو ایک خاص انداز سے ترتیب دے کر ایک نیا نتیجہ نکالا ؎

کشش بدر سے چڑھتا ہوا دریا دیکھا
اللہ اللہ، وہ عالم تری انگڑائی کا (بریم پچاری)

(۲) ایک ایسا آشیانہ جسے طائر نے چھوڑ دیا ہو اور اُڑ کر کہیں اور چلا گیا ہو ظاہر ہے کہ کس قدر سنسان اور ویران ہو گا۔ محبوب سے جدائی کے بعد چاہنے والے کی مہجور آنکھیں، جنہیں اشکباری کے سوا اور کچھ بھی اختیار باقی نہ ہو، جس درجہ سوگوار ہوں گی وہ بھی کسی تشریح کی محتاج نہیں۔ لیکن تشبیہ کے علاقے سے شاعر نے ان دونوں حالتوں کو باہم مربوط کر کے ویرانی کا جو دل دوز منظر پیش کیا ہے وہ قیامت ہے: ؎

رونا مجھے چھوڑ جانے والے ❊ کیا تجھ سے کہوں کہ حال کیا ہے
آنکھیں ہیں کہ آشیانِ ویراں ❊ طائر جس میں سے اُڑ گیا ہے

(بریم پچاری)

(۳) بیس برس گذرے۔ میں اس وقت ایم۔ اے کا طالبِ علم تھا۔ لاہور میں پڑھتا تھا۔ ایک دوست کے یہاں کسی تقریب سے "ایٹ ہوم" میں شرکت کا اتفاق ہوا۔ پائیں باغ میں نشستوں کا انتظام تھا۔ سبزہ و گل کا ہجوم، گلاب کے تختے پھولوں سے لدے ہوئے، خواتین کی رنگا رنگ،

زرق برق پوشاکیں، شفق اور دھنک کو شرمانے والی۔ عجب رُوح پرور منظر تھا۔ ایک خوب رُو شوخ لڑکی نے میزبان سے کہا "کیا یہاں بھی آپ نے میونسپلٹی کا قانون جاری کر رکھا ہے؟" میرے دوست نے جو اتفاق سے میونسپل کمشنر بھی تھے، تعجب سے پوچھا "کون سا قانون؟" کہا "یہی کہ پھول توڑنے والے گرفتار کئے جائیں گے"۔ اس پر سب ہنس پڑے اور میرے دوست نے تمام خواتین سے باصرار تمام گل چینی کی درخواست کی۔ اکثر جوان لڑکیاں اور خواتین گلاب کے تختوں میں گھس گئیں۔ جی بھر کے پھول توڑے اور توڑ کر کسی نے اپنے جوڑے میں لگائے، کسی نے ساڑی کی پن میں اٹکائے۔ کسی نے گریبان کی زینت بنائے۔ اتفاق سے اُسی وقت ایک شعر موزوں ہوگیا۔ اور جب میں نے اُسے پڑھ کر سُنایا تو سارا مجمع جھوم گیا: ؎

گریباں میں ہیں اور کچھ پھول بالوں میں سجائے ہیں
چمن کو لُوٹنے والے گلستاں بن کے آئے ہیں

استعارہ:

تم دُور تھے نظر سے اور چاندنی کھلی تھی
آنکھوں سے رات ہم نے ٹوٹا کئے ستارے (پریم پجاری)

چاندنی یوں ہی کیا کم قیامت ہوتی ہے لیکن اگر اسکے ساتھ ماضی کی حسین یادیں بھی وابستہ ہوں تو اس منظر سے ایک حساس دل میں اور بھی نشتر ٹوٹنے لگتے ہیں۔ جی اُمنڈ آتا ہے۔ آنکھیں برستی ہیں۔ آنسوؤں کی تاروں سے تشبیہہ اگر پامال نہیں تو بالکل تازہ بھی نہیں لیکن اشکباری کا ستاروں کے ٹوٹنے سے استعارہ البتہ اپنے اندر ایک نُدرت رکھتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی جس ماحول میں اس استعارے سے کام لیا گیا ہے اس نے شعر کی تاثیر میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے۔

تلمیح:

انع جلوہ گری، خوف ہے رُسوائی کا
بس اسی پر تمہیں دعویٰ ہے زلیخائی کا (پریم پجاری)

زلیخا کو یوسف سے جو والہانہ محبت تھی دُنیا کو معلوم ہے۔ اس محبت نے زلیخا کو رسوائے عالم کیا۔ لوگ اُسے طعنے دیتے تھے۔ شرمندہ کرتے تھے۔ لیکن زلیخا نے رسوائی کے ڈر سے کبھی اپنی طوفانی محبت کو چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ نہ ایک قدم پیچھے ہٹایا۔ شاعر کی محبوبہ کو بھی شاعر سے ایسی ہی محبت ہے جیسی زلیخا کو یوسف سے تھی۔ مگر رسوائی کے خوف سے وہ اُسکے سامنے آنے کی جرأت نہیں کرتی۔ شاعر اُسے طعنہ دیتا ہے کہ تم تو کہتی ہو میں تمہیں اُسی طرح چاہتی ہوں جس طرح زلیخا یوسف کو چاہتی تھی! مگر اس کے باوجود تم نے میری آرزو مند آنکھوں کو اپنے دیدار سے محروم رکھا ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ تمہیں رسوائی کا ڈر ہے لیکن زلیخا نے تو امورِ محبت میں کبھی رسوائی کی پروا نہیں کی۔ معلوم ہوا تمہارا دعویٰ محبت فقط دعویٰ ہی دعویٰ ہے۔ حقیقت نہیں۔ ایک لفظ "زلیخائی" نے یوسف زلیخا کی پوری داستان دُہرا دی۔

کنایہ:

(۱) سُنا ہو تم نے شاید میرے ہمسایوں میں چرچا ہے
کہ اکثر رات کو رونے کی اک آواز آتی ہے
(پریم پجاری)

کہنا یہ مقصود ہے کہ "ہم رات کو اٹھ اٹھ کر روتے ہیں جب سارا عالم سوتا ہے"۔ لیکن اسی طرح کہہ دیا تو بات ہی کیا ہوئی۔ شاعر نے اس کے بجائے "گفتہ آید در حدیثِ دیگراں" کا پیرایہ اختیار کیا۔ یہ نہیں کہا کہ میں روتا ہوں۔ یہ بھی نہیں بتایا کہ کون روتا ہے۔ خود ہمسایوں کو بھی معلوم نہیں کہ رونے والا کون ہے۔ رات کے وقت سونے سے کسی کی آنکھ کھل جاتی ہے تو اُس کے کان میں کسی کے رونے کی آواز آتی ہے۔ خدا جانے وہ کون ہے اور کیوں روتا ہے۔ اسی کا لوگوں میں چرچا ہے۔ رونے کی آواز ہر رات کو نہیں آتی۔ کبھی کبھی آتی ہے۔ اس توضیح نے واقعے کو اور بھی زیادہ نیچرل بنا دیا۔ پھر "سنا ہو تم نے شاید" کہہ کر اس بات کا اظہار بھی کر دیا کہ یہ کوئی ایسا اہم واقعہ نہیں کہ ہر جگہ اس کی شہرت ہو اور لازمی طور پر تم نے سُنا ہی ہو۔ ممکن ہے سُنا ہو۔ یہاں واقعہ کی اہمیت کو گھٹا کر رونے والے کی کس مپرسی کا

اور نہ ہو سکے گی۔ ان اصولوں سے مُراد اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ ایک خاص عہد کے میلانات ہیں۔ اور یہ میلانات ہر دور میں مخصوص اور عہدِ گذشتہ سے مختلف ہوتے ہیں۔ ایک وقت ہومر اور ورجل کا دور دورہ تھا دوسرے وقت ڈرائیڈن کا۔ اس کے بعد سر والٹر اسکاٹ کا۔ وغیرہ وغیرہ"۔

خود میرے ایک زبان شناس دوست کا قول ہے کہ "حُسن نام ہے پسند کا"۔ با ایں ہمہ جس طرح کائنات کی دیگر اشیاء کی ایک اضافی اور اعتباری حیثیت قائم کی جاتی ہے اسی طرح شعر کے حدود بھی معیّن کئے جا سکتے ہیں اور کئے گئے ہیں[۱]۔

جیسا کہ ہم ابتدا میں بیان کر چکے ہیں اُردو شعر کا ماخذ فارسی اور فارسی کا سرچشمہ عربی ہے۔ اس لئے ہمیں سب سے پہلے اساتذۂ عرب و عجم کے خیالات پر نظر ڈالنی چاہیئے۔ عربی زبان میں سب سے پہلی کتاب جو انتقادِ شعری سے بحث کرتی ہے وہ غالباً ابوالفرج قدامہ بن جعفر کی شہرۂ آفاق تصنیف "نقد الشعر" ہے۔ قدامہ کے نزدیک "شعر ایک قولِ موزوں و مقفیٰ ہے جو کسی معنی پر دلالت کرتا ہو" اور جہاں تک معانی کا تعلق ہے "کُل کے کُل معانی (یعنی مضامینِ شعری) شاعر کے لئے نہایت آزادی کے ساتھ جائز ہیں۔ شاعر کا فریضہ فقط اتنا ہے کہ وہ جس مضمون کو بھی ہاتھ لگائے، خواہ وہ مضمون پست ہو یا بلند، حُسنِ ادا میں اُس کو حدِ اعلیٰ تک پہنچا دے۔ مضمون و تخیل کا بجائے خود فاحش ہونا شعر کی خوبی کو زائل کرنے والی چیز نہیں"۔

اپنے اس خیال کی تائید میں قدامہ یہ مثال پیش کرتا ہے کہ جس طرح ایک ہنرمند بڑھئی ہر قسم کی لکڑی سے (خواہ وہ آم کی ہو یا ساگون کی) بہترین فرنیچر تیار کر سکتا ہے اور ایک ہوشیار سُنار ہر دھات سے (چاہے وہ خالص سونا ہو یا کھوٹی چاندی) نہایت خوبصورت زیور بنا سکتا ہے اسی طرح ایک صنّاع شاعر ہر قسم کے پست و بلند مضامین سے اعلیٰ درجے کے اشعار تیار کر سکتا ہے۔ گویا قدامہ کے نزدیک مضامین و معانی کی چنداں اہمیت نہیں بلکہ "حُسنِ ادا" معتبر ہے۔

حُسنِ ادا کی اہمیت سے نہ تو انکار ممکن ہے اور نہ اُسے نظر انداز ہی کیا جا سکتا ہے۔ لیکن معنی سے قطع نظر کر کے محض حُسنِ ادا ہی کو سب کچھ سمجھ لینا ایک ایسی بات ہے جسے بیسویں صدی کا ذوقِ شعری کبھی تسلیم نہیں کر سکتا۔ سُنار لاکھ ہنرمند ہو لیکن اُس کی صنعت کے بہترین نمونے جو کھوٹی چاندی سے تیار کئے گئے ہوں، خود اُسی کے بنائے ہوئے بہترین طلائی زیوروں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ بلکہ سچ پوچھئے تو ایک ماہر صنّاع ادنیٰ درجے کے مواد پر انتہائی کوشش کے باوجود اپنے کمال کا اظہار بدرجۂ اتم کر ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ اس مادّہ میں اتنی قابلیت ہی نہیں ہوتی کہ کمالِ صنعت کو قبول کر سکے۔ کیا ایک ماہر سنگ تراش اینٹوں میں بھی ویسی ہی نازک، سُتھری اور حسین جالیاں تراش سکتا ہے جیسی ایک سنگِ مرمر کی تختی میں تراشی جا سکتی ہیں؟ یہی حال شاعر کا ہے کہ وہ ایک باکمال آرٹسٹ ہوتے ہوئے بھی ادنیٰ اور پست مضامین سے بلند پایہ قابلِ قدر اشعار تیار نہیں کر سکتا۔

آج یہ مسئلہ بالکل طے ہو چکا ہے کہ اعلیٰ شاعری صرف وزن و قافیہ کا نام نہیں بلکہ اُس کی رُوحِ رواں تخیل ہے۔ اساتذۂ فارس نے بھی تخیل ہی کو شاعری کی جان مانا ہے۔ نظامی عروضی سمرقندی جو چھٹی صدی ہجری کا ایک ممتاز شاعر اور جیّد فاضل ہے۔ اپنی گراں مایہ تصنیف "چہار مقالہ" میں فنِ شعر کے متعلق لکھتا ہے کہ:

"شاعری وہ فن ہے جس کے ذریعے سے شاعر مقدماتِ موہومہ کو اس طرح مُرتّب کرتا ہے کہ چھوٹی بات کو بڑی اور بڑی بات کو چھوٹی، خوبی کو زشتی اور زشتی کو خوبی کر دکھاتا ہے اور ایہام کی مدد سے قوتِ غضبی و شہوی کو مشتعل کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ اس ایہام سے دلوں میں شگفتگی اور گرفتگی پیدا ہو جاتی ہے"۔

یورپ کے نکتہ سنجوں نے اس مسئلہ پر نہایت نازک اور لطیف بحثیں کی ہیں۔ اُن سب کا خلاصہ شعر کی وہ حسبِ ذیل تعریف ہے جو "انسائکلوپیڈیا بریٹانیکا" میں بیان کی گئی ہے:

"شعر مطلق وہ جذبات انگیز اور موزوں کلام ہے جو

---

[۱] مقدمۂ متاعِ درد (مجموعۂ کلام ثاقب کانپوری) نوشتۂ عندلیب شادانی۔

انسان کے قلبی کیفیات کو اس خوبصورتی سے بیان کرے کہ وہ مجسم ہو کر سامنے آ جائیں۔"

متاخرین میں صاحب "آتش کدہ" مرزا لطف علی بیگ آذر جو اپنے زمانے کا ایک خوش گو شاعر ہونے کے علاوہ نقدِ شعر کا بھی اچھا ذوق اور سلیقہ رکھتا ہے' اہلی شیرازی کے ذکر میں لکھتا ہے کہ:

"اہلی نے صنعت ذو بحرین و ذو قافیتین میں ایک مثنوی بھی لکھی ہے اور اس میں بڑی جگر کاوی کی ہے لیکن فقیر کے نزدیک یہ صنائع محاسن شعری سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے۔ محاسن شعری مستمع کے لئے "تغیر حالی" کا باعث ہوتے ہیں۔ اور شعر کی غرض کلی یہی ہے کہ سننے والا اس سے متاثر ہو۔"

آذر کی اس رائے سے اختلاف کرنا غالباً ممکن نہیں کہ شعر کی اصلی غرض و غایت سننے والے کو متاثر کرنا ہے۔ اب جو شعر جتنا زیادہ پُر تاثیر ہو گا وہ اتنا ہی زیادہ کامیاب سمجھا جائے گا۔ بعض لوگوں کو یہ کہتے سنا ہے کہ "ہم کسی دوسرے کے لئے شعر نہیں کہتے بلکہ صرف اپنے لئے کہتے ہیں۔" چنانچہ اکبر الہ آبادی مرحوم نے بھی اس خیال کو نظم کیا ہے:

نہ ان کے لئے ہیں نہ اُن کے لئے
کہ میں شعر کہتا ہوں اپنے لئے

مگر آج تک غالباً ایسا کبھی نہیں ہوا کہ شاعر نے بالقصد اپنے کلام کو دوسروں سے چھپا چھپا کر صرف اپنی ذات تک محدود رکھا ہو۔ نہ کبھی کسی کو دکھایا ہو نہ سنایا ہو۔ نہ کسی دوسرے ذریعے سے اس کی اشاعت کی ہو۔ بلکہ اس کے برعکس عام طور پر تو یہی دیکھنے میں آتا ہے کہ شاعر جب تک اپنا کلام دوسروں کو سنا نہ لے اُسے چین نہیں آتا کیونکہ وہ اپنی کیفیت تاثر میں دوسروں کو بھی شریک کرنا چاہتا ہے۔ اور یہ ایک بالکل فطری جذبہ ہے۔ اب اگر کوئی شعر دوسروں کو بالکل بھی متاثر نہ کر سکے تو شاعر کا مقصد تقریباً فوت ہو گیا۔ مگر یہ ممکن ہی نہیں کہ ایک اچھا شعر سن کر سننے والا متاثر نہ ہو۔ اور اس قضیہ کا عکس بھی صحیح ہے یعنی جس شعر کو سن کر سامع پر وجد کی کیفیت طاری ہو جائے یقیناً وہ ایک بلند پایہ شعر ہو گا۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر اچھا شعر ہر محل پر ہر سننے والے کو پسند آنا چاہیئے۔ نہیں۔ مقتضائے حال کی مطابقت اور مخالفت سے شعر کی تاثیر میں کمی بیشی کا پیدا ہو جانا لازمی ہے۔ شادی کے موقع پر اگر ایک نغمۂ مسرت کے بجائے بہترین مرثیہ پڑھا جائے تب بھی وہ ناکامیاب رہے گا۔ اسی طرح اگر غمی کے موقع پر کوئی ایسے اشعار پڑھے جن میں عیش و نشاط کا ذکر ہو تو یقیناً وہ اپنی تمام خوبیوں کے باوجود سننے والوں کو محظوظ نہ کر سکیں گے۔ با ایں ہمہ یہ حقیقت اپنی جگہ پر ثابت ہے کہ ایک اچھا شعر عام حالات میں سننے والے کو ضرور متاثر کرتا ہے اور اسی تاثیر کی نسبت سے ہم شعر کی قدر و قیمت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

اب قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب کمالِ شعر تاثیر پر منحصر ہے تو آخر شعر میں تاثیر پیدا ہونے کے اسباب کیا ہیں؟

اس میں شک نہیں کہ شعر کا ایک نہایت اہم عنصر تخیل ہے۔ تخیل کے بغیر پیکرِ شعر میں جان نہیں پڑتی۔ مگر اس کا مطلب نہیں کہ تمام محاسن شعری کا انحصار اور تاثیر کا دارومدار فقط تخیل پر ہے۔ نہیں۔ بلکہ تخیل کے علاوہ اور بھی کئی عناصر ہیں جنہیں شعر کی تاثیر میں بڑا دخل ہے۔

ایرانی کہتا ہے "آنچہ از دل خیزد، بر دل ریزد" علامہ اقبال مرحوم نے اردو میں اس کا ترجمہ اس طرح کیا ہے۔ ع دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔ فطرت انسانی کے رمز شناسوں نے اس نکتہ کو دریافت کیا اور دنیا کو بتایا کہ صداقت و خلوص جذبات کے بغیر کلام میں تاثیر پیدا نہیں ہو سکتی۔ اور خلوص جذبات کے ساتھ ساتھ شدت احساس کا ہونا بھی ضروری ہے۔ کہنے والا جو کچھ کہے پہلے خود اُسے محسوس کرے اور شدت کے ساتھ محسوس کرے، اس کے بعد کہے تو ممکن نہیں کہ اس کا کلام تاثیر سے خالی ہو۔

قصیدے کو عموماً مصنوعی شاعری سمجھا جاتا ہے اور یہ خیال ایک بڑی حد تک درست بھی ہے لیکن شعرائے عرب کے وہ قصائد جو خلوص جذبات اور شدت احساس کا نتیجہ ہیں۔

لفظی صنعت گری کو حقیقی شاعری سمجھ لیا جاتا ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے یہاں عموماً ایسے شعر کو اچھا شعر کہا جاتا ہے جو خوبصورت لفظوں، حسین ترکیبوں، لفظی رعایتوں اور دوسری صنعتوں کا مجموعہ ہو۔ حسنِ معنی سے چنداں سروکار نہیں ہوتا۔

مشینی اشعار: ہمارے اساتذہ کی کوششوں سے ہماری زبان میں ہر قسم کے شاعرانہ مضامین اور انہیں ادا کرنے کے لئے ہر قسم کے خوبصورت لفظوں اور ترکیبوں، نیز گوناگوں اسالیب کا اتنا وافر ذخیرہ فراہم ہو گیا ہے کہ اب ایک رسمی مگر لفظا ہر لطیف و جمیل شعر کہنے کے لئے تھوڑی سی موزونیٔ طبع اور قدرتِ بیان کے سوا اور کسی سامان کی ضرورت نہیں۔ مضامین و خیالات کی تلاش تو بالکل غیر ضروری ہے کیونکہ کسی ایک ہی خیال کو تھوڑے سے تغیّر کے ساتھ ہر بحر اور ہر زمین میں بہ آسانی ادا کیا جاسکتا ہے۔

شعر و سخن سے دلچسپی رکھنے والے احباب کی ایک صحبت میں ایک بار میں نے یہی دعویٰ پیش کیا تو لوگوں نے اسے مبالغہ سمجھا۔ میں نے کہا امتحان شرط ہے۔ ابھی فیصلہ ہو سکتا ہے۔ کوئی صاحب کسی کا شعر پڑھیں۔ میں اسی مضمون کو تھوڑے سے تغیّر کے ساتھ جس بحر اور جس زمین میں ارشاد ہو نظم کر دوں گا۔ میرے ایک دوست جمیل صاحب نے کسی کا یہ شعر پڑھا:۔

اللہ اللہ پرتوِ خورشید کی جادوگری
خاک کا ایک ایک ذرّہ نجم و اختر بن گیا

میں نے کہا "اب اسی مضمون سے تھوڑی سی کمی بیشی کے ساتھ جتنے اشعار جی چاہے نظم کر لیجئے"۔ ایک اور صاحب بولے۔ "اچھا تو اس مضمون کو مہر صاحب کے اس سانچے میں ڈھالئے:

صبح گذری شام ہونے آئی میرؔ ؎ تو نہ چیتا اور بہت دن کم رہا

دو تین منٹ غور کرنے کے بعد میں نے یہ شعر عرض کیا:

ذرّے بن جائیں گے انجم کا جواب ؎ مہر کا پرتو اگر یہ ہم رہا

جمیل صاحب نے کہا، اختر صاحب آپ نے بھی کیا سہل زمین انتخاب کی۔ اچھا عندلیب صاحب میں سوداؔ کا ایک شعر پڑھتا ہوں۔ اس پر طبع آزمائی کیجئے:۔

ص

کیفیتِ چشم اُس کی مجھے یاد ہے سوداؔ
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

میں نے فی البدیہہ کہا:۔

ہر ذرّے میں ہے مہرِ جہاں تاب کا پرتو
کیوں کر کہوں اللہ سے بندے کو جُدا میں

جمیل صاحب حیرت سے میرا مُنہ تکنے لگے۔ ایک اور صاحب رفیق نامی بولے۔ عندلیب صاحب اجازت ہو تو میں بھی ایک شعر پڑھوں۔ میں نے کہا بسم اللہ ارشاد فرمایئے۔ اُنہوں نے غالبؔ کا یہ شعر پڑھا:۔

اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے مُنہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

تھوڑے سے تفکر کے بعد ایک شعر ذہن میں آیا۔ میں نے کہا رفیق صاحب اگر آپ فرمائیں تو قافیہ بھی یہی رہے۔ اُنہوں نے کہا سبحان اللہ۔ اس سے بہتر اور کیا۔ میں نے یہ دو مصرعے پیش کئے:۔

پرتوِ مہر سے ذرّے میں چمک آتی ہے
سامنے تم ہو تو بیارے مرا حال اچھا ہے

سب نے یک زبان ہو کر کہا۔ عندلیب صاحب خوب کہا۔ کیا کہنا۔ سبحان اللہ۔ میں نے کہا صاحب اس قسم کے اشعار میں خوب اور ناخوب کا سوال ہی نہیں۔ خام مواد تو پہلے سے موجود ہے۔ موزونیٔ طبع کی مشین میں رکھا اور شعر ڈھال دیا۔ رونا تو اسی کا ہے کہ آپ اس قسم کے مشینی اشعار کو فنکاری سمجھتے ہیں۔ ایک صاحب جو اب تک خاموش بیٹھے تھے فرمانے لگے۔ حکیم مومن خاں کا ایک شعر یاد آگیا۔ ذرا اس کو بھی دیکھئے۔

عمر ساری تو کٹی عشقِ بتاں میں مومنؔ
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

اس مرتبہ مجھے کئی منٹ لگ گئے۔ اُنہوں نے سمجھا کہ اس زمین میں شعر نہ نکل سکے گا۔ فرمانے لگے، حضرت یہ مومن خاں ہیں، کوئی اور نہیں۔ میں نے کہا، تو سنئے:۔

دل کے ہر ذرّے میں آسودہ ہے اک مہرِ جمال
[illegible] ہی ہم نہ ترے لئے مہ کنعان ہوں گے

شعر سن کر وہ صاحب کچھ کھسیانے سے ہو گئے۔ بولے یہ مومن خاں کا رنگ نہیں۔ میں نے کہا اس سے مجھے کیا نہ یہ مرا

دعویٰ ہے جس پر صاحب نے کہا۔ عندلیب صاحب آزمائش تو کافی سے زیادہ ہو چکی لیکن اگر آپ کی طبیعت حاضر ہو تو ایک تجربہ اور سہی۔ میں نے کہا ارشاد! اس قسم کے اشعار کے لئے طبیعت کے حاضر ہونے کی کچھ ضرورت نہیں۔ آپ فرمائیں۔ انہوں نے ناسخ کا یہ مشہور مطلع پڑھا:-

مرا سینہ ہے مشرق آفتاب داغ ہجراں کا
طلوع صبح محشر چاک ہے اپنے گریباں کا

حسن اتفاق سے اس مرتبہ دو منٹ بھی نہ لگے اور شعر موزوں ہو گیا:-

یہ کس خورشید کے پرتو سے ہر ذرہ چمک اٹھا
کہ میرے غم کدے میں آج عالم ہے چراغاں کا

سامعین نے بہت پسند کیا۔ اختر صاحب نے کہا۔ عندلیب صاحب آج تو واللہ آپ نے کمال کر دیا۔ میں نے کہا ہائے قسمت! اسے آپ کمال کہتے ہیں۔ اور کمال کہہ کر میرے دعوے کو باطل کر دینا چاہتے ہیں۔ بندہ نواز! اس میں کمال کو ذرہ برابر دخل نہیں۔ اس قسم کے اشعار تو اوسطاً تین منٹ فی شعر کے حساب سے ہر وہ شخص کہہ سکتا ہے جسے نظم پر قدرت ہو۔

میں اس قسم کے اشعار یا غزل کو سائیکل سے تشبیہ دیتا ہوں جس کے تمام کل پرزے یعنی فریم، ہینڈل، پہیے، پیڈل، ٹیوب، ٹائر، گھنٹی، سیڈل، مڈگارڈ وغیرہ ہر چیز پہلے سے ایک مستری کے پاس موجود ہے۔ وہ ان سب کل پرزوں کو جوڑ کر سائیکل آپ کے سامنے کھڑی کر دیتا ہے۔ تو کیا آپ واقعی اس مستری کو سائیکل کا موجد یا صانع کہیں گے؟ نہیں اور ہرگز نہیں۔ یہی حال ہمارے ان شعرا کا ہے جو صرف موزونیٔ طبع کے سہارے، کسی ذہنی کاوش کے بغیر دوسروں کے مضامین و الفاظ کو ایک خاص وضع سے مرتب کر کے ایک نئے شعر کی شکل میں آپ کے سامنے پیش کر دیتے ہیں اور آپ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے کوئی بڑا کمال کیا۔ مگر میرے نزدیک ان کی حیثیت سائیکل کے مستری سے زیادہ نہیں اور انہیں ایک آرٹسٹ یا فن کار کا درجہ دینا صریح ظلم ہے۔

اسلوب بیان کے سلسلے میں طرز ادا کی ندرت کے ساتھ ساتھ اور بھی کئی باتوں کا لحاظ ضروری ہے مثلاً یہ کہ اگر غزل کا شعر ہے تو اس کی زبان بھی غزل کی ہو۔ آمد ہو آورد نہ ہو۔ قافیہ کی مجبوری سے مضمون دب نہ گیا ہو۔ مثلاً ایک مرتبہ مشاعرے کے لئے یہ مصرعہ طرح تجویز ہوا۔ ع:

اب درد بھی نہیں ہے جو درماں نہیں رہا

میں نے بھی چند شعر کہے۔ ان میں سے ایک یہ تھا:-

آخر اس التفات سے دیکھا ہی تم نے کیوں
کس کا تصور شوق جو پنہاں نہیں رہا

مشاعرے میں اس شعر پر بہت داد ملی لیکن قافیہ کی مجبوری سے اس میں جو کمی رہ گئی تھی اس کا مجھے اچھی طرح احساس تھا۔ چند روز کے بعد آخر میں نے اس شعر کو غزل میں سے کاٹ دیا۔ اور علیحدہ اس طرح لکھا:-

آخر اس التفات سے دیکھا ہی تم نے کیوں
کس کا قصور شوق جو بیباک ہو گیا

قارئین خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس تھوڑے سے تغیر سے شعر کتنا بہتر ہو گیا۔ درحقیقت شعر کہتے وقت بھی یہی مضمون میرے دماغ میں آیا تھا مگر قافیہ نے مجبور کر کے دوسری طرح کہلوا لیا۔

شعر میں حسن پیدا کرنے کے لئے زمین اور بحر کی شگفتگی بھی نہایت ضروری ہے۔ بعض بحریں مترنم اور خوش آہنگ ہیں۔ بعض ایسی ہیں کہ ہماری طبائع ان سے بہت کم مناسبت رکھتی ہیں مثلاً:-

تو نے قسم مے کشی کی کھائی ہے غالب
تیری قسم کا کچھ اعتبار نہیں ہے

یا
قسم جنازے پہ آنے کی میرے کھاتے ہیں غالب
ہمیشہ کھاتے تھے جو میری جان کی قسم آگے

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ بحر تو شگفتہ ہے لیکن زمین اچھی نہیں مثلاً ایک استاد کا مطلع ہے:

مری فطرت میں ہے داخل ہوس جام شراب
ساقیا مجھ کو بنا دے مگس جام شراب

اس قسم کی زمینوں میں غزل لکھنا، غزل کی جان نازنین پر انتہائی ظلم کرنا اور اپنی بد ذوقی کا ثبوت دینا ہے۔

تحلیلِ شعر

سطور بالا میں نقدِ شعر کے جو اصول بیان کئے گئے اُن کی مدد سے ہر شعر کی تحلیل کر کے ہم اس کے حسن و قبح کا ایک بڑی حد تک صحیح اندازہ لگا سکتے ہیں۔ جب ہم کوئی شعر پڑھیں یا سُنیں تو اُس کی ظاہری چمک دمک سے مرعوب ہونے کے بجائے سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ

(۱) نفسِ خیال کیا ہے اور کیسا ہے۔ (۲) اور وہ طبع زاد ہے یا سرقہ۔ (۳) اُس میں کوئی تازگی ہے یا عامۃ الورود ہے۔ اس کے بعد یہ دیکھنا چاہیئے کہ (۴) اس میں تخیل کا عنصر کتنا ہے اور کیسا ہے۔ (۵) جذبے میں صداقت اور خلوص ہے یا نہیں؟ اور اگر ہے تو کس حد تک ہے۔ (۶) اور کہنے والے نے کتنی شدت کے ساتھ اُسے محسوس کیا ہے۔

اس کے بعد اسلوبِ بیان کا جائزہ لینا چاہیئے کہ (۷) آیا طرزِ ادا میں کوئی ندرت ہے یا نہیں (۸) اور زبان کیسی ہے (۹) آمد ہے یا آورد (۱۰) قافیہ کی مجبوری سے مضمون میں کتر بیونت تو نہیں کی گئی (۱۱) بحر و زمین شگفتہ و خوش آہنگ ہیں یا نہیں (۱۲) اور بحیثیتِ مجموعی شعر میں تاثیر کتنی ہے۔

ہمیں اُمید ہے کہ شعر و سخن سے دلچسپی رکھنے والے اگر اپنے یا دوسروں کے اشعار کو اس کسوٹی پر کس کر دیکھیں گے تو انہیں کھوٹا کھرا بہت آسانی سے معلوم ہو جائے گا اور وہ مشاہیر و اساتذہ کے ناموں سے مرعوب ہونے کے بجائے شعر کے حقیقی حسن کی بنا پر اُسے اچھا یا بُرا قرار دے سکیں گے۔

مولوی عنایت اللہ دہلوی کے تراجم

سلامبو۔ قرطاجنۂ قدیم کا رومان مشہور عالم تصنیف۔ قیمت للعہ
نجم السحر۔ پانچ ہزار سال پہلے کے مصر کا رومان۔ " سے
تائیس:۔ اناطول فرانس کی شہرۂ آفاق کتاب کا ترجمہ۔ " عہ
ہردو یاس:۔ سالوی کے خونِ آشام حسن کا قصہ۔ " علاہ
انطونی کا لطرہ۔ شیکسپیر کے مشہور ڈرامہ کا ترجمہ۔ " عہ
ملنے کا پتہ:۔ ساقی بُک ڈپو، دہلی؛

فرار

میں نے سوچا ہے کہ اک جنبشِ مژگاں کے طفیل
تلخیٔ زیست کے ہر غم کو نگوں سر کر دوں
رے کے دامن میں فقط ایک دہکتا آنسو
آج تاریک خلاؤں میں ستارے بھر دوں
زامشی جھوم اٹھے گھوم اٹھیں سارے نجوم
کہکشاں بڑھ کے بچھا دے ستاروں کی بساط
جس پہ میں بڑھتی چلی جاؤں بصد ناز و ادا
اپنے قدموں سے جگاتی ہوئی خوابیدہ نجوم
اپنی ٹھوکر سے جلاتی ہوئی تاروں کے چراغ
یوں ہی اک برق کی مانند چمکتی، مرتی
تیرہ و تار ستاروں کو منور کرتی۔
کسی تاریک سی دنیا میں فنا ہو جاؤں

کاش یہ خواب حقیقت میں بدل سکتا کبھی!
کاش یہ سوچ مری بن کے عمل کا پیغام
مجھے اِس قلزمِ ہستی سے دلا سکتی نجات
جس کی ہر موج میں مستور ہے فرسودہ نظام
جس کے بے پایاں سلاسل سے نہیں کوئی بری
جس کی آواز، بھٹکتی ہوئی روحوں کا جمود
جس کا قانون، امارت کے خداؤں کا غلام
جس کی تعمیر میں خوں گشتہ تمناؤں کا جوش
جس کی تخریب میں مصروف ہر اک پیر و جواں
میں نے سوچا ہے کہ اس قلزمِ بے پایاں سے
کاش میں برق کی مانند چمکتی، مرتی
تیرہ و تار ستاروں کو منور کرتی۔
کسی تاریک سی دُنیا میں فنا ہو جاؤں

نصرت آرا نصرت؛

نہال سیوہاروی

دوسری جنگِ عظیم کا آخری منظر

گونجتے ہیں پے بہ پے غمناک انسانوں کے بین مشرق و مغرب سے آتی ہے صدائے شور و شین
خانہ ویرانی پہ اپنی گرم ماتم ہے حیات اک فغانِ بیکسی، اک نالۂ غم ہے حیات
الاماں یہ شکل [illegible] حالِ زبوں تہذیب کا فتنۂ تخریب پر ہے سرنگوں تہذیب کا
امن کے ٹوٹے نکو پر ہے غبارِ انتشار ہے قبائے نظمِ عالم جا بجا سے تار تار
پھونک دے جو خرمنِ راحت وہ ساماں ہیں ہنوز دھیمی دھیمی جنگ کی آتش فروزاں ہیں ہنوز
مل چکا ہے خاک میں جنکی بلندی کا غرور دور تک ایسے نظر آتے ہیں ایوان و قصور
بزمِ عالم دور تک جز عالمِ ویراں نہیں دور تک خاموشیاں ہیں دور تک انساں نہیں
کس قدر سفاکیت کا ہے نمونہ شانِ دہر خونِ آدم سے ہیں رنگیں بیشتر دامانِ دہر
دور تک سایہ فگن تاریکیٔ آلام ہے دور تک صبحِ درخشاں پر یقینِ شام ہے

انتہائے رنج سے کب تک پکاریں کیا ہوئیں
جن سے یہ دنیا تھی جنت وہ بہاریں کیا ہوئیں

وہ فراعینِ جہاں تھا جنکو طاقت پر غرور کاسہ ہائے سر نظر آتے ہیں اُن کے چور چور
ہیبتِ بزمِ جہاں تھی جنکے ماتھے کی شکن وقت لے آیا ہے انکو جانبِ دار و رسن
خندہ زن تھی جنکی نخوت رفعتِ افلاک پر انکا زعمِ نادری دم توڑتا ہے خاک پر
وہ جہانبانی، جہانگیری کا سارا طمطراق فطرتِ گردونِ گرداں کا تھا اک وقتی مذاق

دیدۂ بینا مآلِ گردشِ ایام دیکھ
خسروانہ قہقہوں کا ہولناک انجام دیکھ

زندگی ہے ننگ فاقوں کے ستم سے نیم جاں رہگزاروں میں رواں ہیں مجمعِ پیر و جواں
زرد چہرے جسم فرطِ لاغری سے مثلِ دوک بھوک کے مارے ہوئے چلاتے ہیں بھوک بھوک
شدتِ ناطاقتی پیہم گراتی ہے انہیں موت اپنی سمت رہ رہ کر بلاتی ہے انہیں
آدمی کہتے ہیں جس کو افتخارِ کائنات ننگِ بازارِ جہاں ہے آج عارِ کائنات

الحذر از سختیِ جورِ زمانہ الحذر — آدمی ہے چند ٹکڑوں کے لئے دریوزہ گر
زیرِ گردوں بھوک کی فریاد ہے گونجی ہوئی — داستانِ خاطرِ ناشاد ہے گونجی ہوئی

اس طرح اہلِ دوَل ہیں مطمئن بیٹھے ہوئے
سرکشانہ جیسے ہوں مغرور جن بیٹھے ہوئے

میرے دل کے پار ہے احساسِ غربت کی انی — دیکھتا ہوں ایک ایسا منظرِ عریاں تنی
اُف یہ دردانگیز نظارہ تہِ چرخِ کہن — فکر میں تن ڈھانپنے کی ہیں پریشاں مرد و زن
پاسِ عزت کیا کرے پاسِ شرافت کیا کرے — ہو میسر ہی نہ جب پوشاک عورت کیا کرے
ستر پوشی کیلئے نایاب اک چادر ہے آج — شمع پر ایسی بنی فانوس سے باہر ہے آج
صنفِ نازک اپنے آپ کو چھپا سکتی نہیں — کیا قیامت وقت سے کچھ قبل آسکتی نہیں
دُور اس منظر سے ہیں کچھ لوگ بازیچۂ محن — سینے کاندھوں پہ اٹھائے ایک نعشِ بے کفن
جینے والوں پہ جہاں آسائشِ تن ہو حرام — مرنے والوں کا ہو اس دُنیا میں کیونکر احترام

عہدِ نو آتا ہے کچھ دن اے غریبی صبر کر
صبر کر کچھ دن یونہی اے بدنصیبی صبر کر

انتہائے غیظ میں وہ دیکھنا اک اژدہام — اپنی محکومی سے سرگرمِ بغاوت ہیں غلام
کیوں چمن پر غلبۂ صیاد ہونا چاہیئے — گلستاں میں شور ہے آزاد ہونا چاہیئے
نعرہ زن ہے بندگی یہ تلخ کامی تا کجا — قسمتِ محکوم میں زہرِ غلامی تا کجا
سوچکے اربابِ غفلت دورِ ہشیاری کا ہے — عالمِ مجبور کو ارمان مختاری کا ہے

پھر رہا ہے دیوِ استبداد گھبرایا ہوا
صید کے نالوں سے ہے صیاد گھبرایا ہوا

یہ تری دنیا ہے یا بزمِ غم اے اللہ العالمیں — ہے یہ دُنیا یا جہنم اے اللہ العالمیں
یہ بلکتی زندگانی کے نظارے الاماں — یہ دُھواں آہوں کا، نالوں کے شرارے الاماں

دید کی لاؤں کہاں تک تاب چکراتا ہے سر
ایک ہلکا سا الٰہی خواب چکراتا ہے سر

حجاب امتیاز علی

"وہ طریقہ تو بتا دو تمہیں چاہیں کیونکر؟"

بہار کی اک سنہری صبح میں صوفی اطمینان سے بیٹھی نفسیاتی مباحثہ کی اک کتاب کے دلائل کو کوئے گھونٹوں کی امداد سے دماغ میں اتارنے کی کوشش کر رہی تھی۔

اچانک ریحانی اپنے کالج کا بلیزر پہنے ہانپتے ہوئے دریچے میں سے اندر کمرے میں کود پڑا۔

"تم!"

"میں!"

صوفی:۔ "چوروں کی سی شکل بنائے اِدھر اُدھر کیا دیکھ رہے ہو؟"

ریحانی:۔ "شش تش شش شش! — دادا ابا کا ڈر ہے۔ موجود تو نہیں گھر میں؟"

صوفی:۔ (حقارت سے) "دادا ابا سے ڈرنا کس قدر دقیانوسی بات ہے۔ مزید براں مجھے بزدلی اور بزدلوں سے اتنی نفرت ہے کہ کسی اور چیز سے نہیں!"

ریحانی:۔ "میری جگہ کوئی شیر دل بھی ہوتا تو ایسے موقع پر دادا ابا سے ڈرے بغیر نہ رہ سکتا۔ جانتی بھی ہو ان دنوں سالانہ امتحان ہو رہے ہیں۔ اور میں ایسے موقع پر کالج سے بھاگ کر یہاں آ پہنچا ہوں۔"

صوفی:۔ (بے پروائی سے) "کوئی کتاب لینے آئے ہو؟"

ریحانی:۔ "اب جان بوجھ کر انجان نہ بنو مری جان!"

صوفی:۔ "یہ طرزِ خطاب دقیانوسی ہونے کے علاوہ بہت ارزاں بھی ہے ریحانی۔ خیر جس غرض سے بھی آئے ہو میری بلا سے۔ میرے مطالعہ میں خلل اندازی نہ کرو۔"

یہ کہہ کر وہ کتاب میں غرق ہو گئی۔

ریحانی:۔ "اتنا ظلم؟ آہ۔ کس قدر حسین معلوم ہو رہی ہو کتاب پر جھکے ہوئے! جیسے یونانیوں کی علم کی دیوی! میں کالج سے صرف اس لئے آیا ہوں تاکہ تم پر ثابت کر دوں کہ مجھے تم سے کس قدر محبت ہے۔"

یہ کہہ کر ریحانی ایک ڈھبی پر بیٹھ کر صوفی کے چہرے کو تکنے لگا۔ مگر صوفی کتاب میں غرق تھی۔ اُسنے سُنا ہی نہیں۔

ریحانی (دوبارہ) "تاکہ تم پر ثابت کر دوں کہ مجھے تم سے کس قدر محبت ہے۔"

صوفی:۔ (کتاب سے نظر اُٹھائے بغیر) "کچھ کہا تم نے؟"

ریحانی:۔ "میں نے کہا مجھے تم سے محبت ہے۔"

صوفی:۔ "پھر ——؟ جملہ ختم بھی تو کرو۔"

ریحانی:۔ "اس سے زیادہ مکمل جملہ اور کیا ہوگا بھلا؟ مجھے تم سے محبت ہے۔"

صوفی:۔ "کتنی دقیانوسی باتیں کرتے ہو۔ پچھلی صدی کی مظلوم عورتیں شاید اس قسم کی باتوں سے خوش ہو جاتی ہوں۔ اب ایسی باتوں کا زمانہ لد چکا۔ میں تم سے پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ پچھلی صدی کی سی باتیں نہ کیا کرو۔"

ریحانی:۔ "پچھلی صدی کی سی؟ — آخر محبت جیسی پچھلی صدی میں ہوتی ہوگی ویسی ہی اب ہوتی ہے۔ اسے کیا پھپھوندی لگ سکتی ہے اور اس میں کیا فرق پڑ سکتا ہے؟ مجھے تم سے محبت ہے صوفی۔"

صوفی:۔ (حقارت سے) "کُند ذہن! محبت عملی ہونی چاہیئے عملی۔ نہ کہ لفظی!"

ریحانی:۔ (بے تابانہ بڑھ کر) "یعنی! یعنی! تمہیں اپنے بازوؤں میں ؟——"

صوفی:۔ (ناک پر رومال رکھ کر) "بات مناسب فاصلہ پر رہ کر کرنی چاہیئے۔ قریب ہی آ کر کچھ کہنا ہو تو بات کرتے وقت منہ دوسری طرف پھیر لینا چاہیئے۔ خصوصیت سے ایسی صورت میں جب گذشتہ مہینے انفلوئنزہ ہو چکا ہو۔ تم نے پڑھا ہوگا جراثیم نو فٹ تک اثر کر سکتے ہیں۔ اور انفلوئنزا کے جراثیم عشق کے جراثیم کو مار ڈالتے ہیں۔ تو کیا کہہ رہے تھے تم؟"

ریحانی:۔ (منہ دوسری طرف پھیر کر) "یہی کہ مجھے تم سے عشق ہے۔"

صوفی:۔ یہ اور بھی دقیانوسی بات ہے۔ محبت کہنا بہت کافی

تھا عشق سے خواہ مخواہ دماغی امراض کا خیال آجاتا ہے۔"
ریحانی: "تو یونہی سہی۔ مجھے تم سے محبت ہے۔"
صوفی: "یہ میں چار سال سے سنتی آرہی ہوں۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ اظہارِ محبت سے پہلے اپنے اوپر ایک نگاہِ تنقید ڈالنا بے حد فائدہ مند ہوتا ہے۔"
ریحانی: (نکٹائی کی گرہ درست کرتے ہوئے) "میں نے کل ہی شام سینما جانے سے پہلے ڈالی تھی۔"
صوفی: "میرا مطلب تمہیں تمہاری عنابی نکٹائی کی یاد دلانا نہ تھا۔ اس رنگ کی ٹائی تو ہرا ایرا غیرا لگا سکتا ہے۔ تم نے ہی کونسا تیر مار لیا؟ میرا مطلب تھا عاشق بننے سے پہلے تمہیں وہ باتیں اپنے میں پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہئیں جن پر عورتیں فدا ہوں۔"
ریحانی: "اس سے زیادہ تم مجھ سے اور کیا چاہتی ہو صوفی! میں تمہارا زر خرید غلام بن چکا ہوں۔"
صوفی: "زر خرید سے محبت کرنا احساس کمتری کی دلیل ہے جو پچھلی صدی کی عورتوں میں تھی۔ شکر ہے یہ مرض مجھ میں نہیں ہے۔"
ریحانی: "ٹھیک کہتی ہو۔ گذشتہ ہفتے ڈاکٹر نجم کی محکومی اور فرماں برداری ہی کے باعث ڈاکٹر اور بیگم نجم میں قانونی جدائی ہوتے ہوتے رہ گئی۔"
صوفی: "یہ ہوتے ہوتے رہ جانا اور بھی دقیانوسی بات ہے۔ ہو جانا زیادہ عملی پہلو لئے ہوئے ہے۔ اور زندگی عمل کا نام ہے۔"
ریحانی: "تو میں کہہ رہا تھا کہ تم جو حکم بھی دو گی میں اسی کے مطابق بن جاؤں گا۔ اور وہی حرکتیں کرونگا جن کی تم اجازت دو گی۔ تم بتاؤ مجھے کیا کرنا اور کیا نہیں کرنا چاہیئے؟"
صوفی: "تمہاری یہی باتیں مجھے زہر لگتی ہیں۔ آدمی میں ـــ میرا مطلب ہے عاشق میں طبع زاد باتیں ہونی چاہئیں نہ کہ مانگے تانگے کی ـــ

شعور سیکھ تجھے امتیازِ عشق کہاں
کہاں تو لذتِ سوز و گدازِ عشق کہاں

ریحانی: "طبع زاد باتیں؟ تو میرے خیال میں مجھے سب سے پہلے تمہیں اس بات کا یقین دلانا چاہیئے کہ میں نے آج تک کبھی کسی دوسری لڑکی سے محبت نہیں کی۔"
صوفی: "خطرناک طور پر دقیانوسی بات ہے۔ مزید براں میں نے یہ کب کہا تھا کہ تم بے تعلق باتیں شروع کر دو؟"
ریحانی: "یہ بے تعلق بات تھی؟ تو پھر میں کیا کہکر تمہیں اپنی پہلی گہری اور اٹل محبت کا یقین دلاؤں؟ اچھا یاد آیا ـــ یوں فرض کرو کہ حسین مئی کی ایک دلرُبا چمکیلی صبح تم محوِ گلگشت ہو۔ اور زرد لیموں کی خمیدہ ٹہنی پر سے ایک بُلبل: شاداں! چاک تم پر حملہ آور ہو جائے اور تمہاری ایک سرمگیں نرگسی آنکھ اس ظالم بُلبل کی چونچ کی نذر ہو جائے تو کیا تم سمجھتی ہو کہ میری محبت میں کسی قسم کا فرق پڑ جائے گا؟"
صوفی: "اصولاً پڑ جانا چاہیئے۔"
ریحانی: (فخریہ) "غلط! میری جان! ایک تو کیا تمہاری دونوں آنکھیں پٹ ہو جائیں اور تمہاری ستون جیسی ناک کی نوک پر کسی تیز چاقو کا بدنما داغ بھی پڑ جائے تب بھی میری محبت میں سرِ مو فرق نہیں پڑے گا۔"
صوفی: (حیران ہوکر) "عجیب ہے! کیا سچ کہتے ہو؟"
ریحانی: "بالکل سچ۔"
صوفی: "ہوگا۔ لیکن اگر اس پر یقین کر بھی لیا جائے تو اس سے صرف تمہاری بد مذاقی پر روشنی پڑتی ہے۔ اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ مذاقِ حسن تم کو چھو کر بھی نہیں گیا۔"
ریحانی: "تو آخر میں کیا کہوں؟ کیا کہکر تمہیں اپنی محبت کا قائل کروں؟ یہ کہکر کہ اگر تم زہر کا پیالہ بھی مجھے دو تو میں اُسے امرت سمجھکر پی جاؤں گا؟"
صوفی: "پی جاؤ گے؟"
ریحانی: "یقیناً۔ (ہنستے ہوئے)"
صوفی: "کس قدر بے وقوف ہو! جی چاہتا ہے کہ تمہیں واقعی ایک ہاتھ سے زہر کا پیالہ دوں اور دوسرے سے ایک تھپڑ رسید ـــ"
چشم زدن میں ریحانی کا چہرہ چقندر کی طرح سُرخ ہو گیا۔
ریحانی: (چلاّ کر) "کیا کہا؟ تھپڑ؟ ادھر تو آجو اُٹھا کر

دریچے سے باہر سمندر میں نہ پھینک دیا ہوا اور اگر لہروں میں سے اُبھر آئے تو کیواڑ توڑ کر اُبھری ہوئی پر دھڑ سے نشے مارا ہو! ایک گھنٹے سے بک رہا ہوں کہ مجھے محبت ہے۔ محبت ہے۔ سیدھے منہ بات ہی نہیں کرتی! خیر کہیں کی! کٹھور تو سہی تو!"

صوفی: (مسرت اور خوف کی تیز چیخ کے ساتھ) میری جان ریحانی! تم میں محبت کئے جانے کی صلاحیت ہے! تم قابلِ پرستش ہو! تم میں جدت ہے! تم ماڈرن ہو!"



عورتوں کی
خوب صورتی

اور جوانی گلاب کے اس نازک پھول کے مانند ہے جو ذرا سی بے احتیاطی سے کملا جاتا ہے۔ چنانچہ سو میں سے ننانوے عورتیں وقت سے پہلے بوڑھی ہو جاتی ہیں۔ لیکن ہمدرد کے ماءاللحم نے لاتعداد عورتوں کو نئے سرے سے تندرست اور خوب صورت بنا دیا ہے۔

ماءاللحم

دوا نہیں ہے۔ دوسرے لفظوں میں تازہ خون جو حلق سے اُترتے ہی رگوں میں دوڑنے لگتا ہے۔ ہمدرد کا ماءاللحم عورتوں کا رنگ نکھارتا ہے؛ چہرہ گلاب کی طرح دمکنے لگتا ہے۔ نسوانی بیماریاں خود بخود دور ہو جاتی ہیں۔ رگ پٹھوں کی کمزوری کو فوراً دور کرتا ہے۔

ہمدرد کا ماءاللحم

تازہ پھلوں، مقوی میووں، صحت بخش غذاؤں اور قیمتی دواؤں کے جوہروں سے مشینوں کے ذریعہ سائنٹفک اصول پر تیار کیا جاتا ہے۔ دل، دماغ اور اعضاء رئیسہ میں نئی زندگی پیدا کر کے عورتوں کو نئے سرے سے جوان اور خوب صورت بنا دیتا ہے۔ معالج پورے اطمینان کے ساتھ استعمال کراتے ہیں۔

قیمت فی بوتل پانچ روپے نمونہ کی شیشی ایک روپیہ چار آنے۔

Hamdard ہمدرد دواخانہ دہلی

خانم
(تیسرا ایڈیشن)

مرزا عظیم بیگ چغتائی مرحوم کی بہترین تصنیف ہے۔ اس دلچسپ اور دلکش کتاب کا ہر ایک باب ایک چمکتا ہوا مزاحیہ افسانہ ہے۔ ہر افسانہ ایک علیحدہ کہانی ہے مگر سب کہانیوں کا ہیرو اور کردار ایک ہے۔ ایک سے ایک مزیدار اور ہنستی ہوئی کہانی اس قدر پُرلطف، اس قدر پُرمذاق اس قدر عجیب اور اس قدر مضحکہ خیز اس قدر ظرافت اور لطافت آمیز اور مزیدار پلاٹ کہ جو پڑھے ہنسے۔ اس کے افسانے برسوں اخباروں اور رسالوں میں نقل ہوتے، ہندی، رسالوں میں چھپے بنگلہ زبان میں اور گجراتی میں بھی چھپ گئے۔

یہ چغتائی صاحب کی بہترین کتاب ہے۔ بہترین لکھائی چھپائی۔ مجلد، گرد پوش سے آراستہ قیمت چار روپے (للعہ) علاوہ محصول ڈاک۔

ملنے کا پتہ:-
ساقی بکڈپو، دہلی۔

ایک رہم سے پیچھے سے آکر آغا کو تھام اٹھا کر میں ریل دیا۔ ایک سے سوار کی گانٹھی کی سے "ہفتہ" جڑ نکلے۔ غرض چیونٹیوں کی طرح پٹ گئے۔ آغا ان کو دھکا دیتے ہی رہتے۔ سب نے مل کر ایسا گھیر دیا کہ میاں آغا کا ناک تھوک جاری ہو گیا۔ اس سے پہلے ایسا ہوتا تھا کہ دس بیس ٹکڑے بیٹھے تو بڑے پہلوان پر" بوجھا دست" اور مشکل سے ان کا دم کھاتے یا اب دو ہی تین منٹ میں آغا کو خود "عشق اللہ" مانگنی پڑی۔ اس وقت کے بعد سے آغا کی پہلوانی کا دوسرا دور شروع ہوا۔ اور اس دور میں آغا نے دلی میں صرف ایک کشتی لڑی۔ اور وہ انچھو پہلوان سے ہوئی۔ کشتی "کانٹا" تھی۔ اور یہ فیصلہ ہوتا تھا کہ دلی میں اس وقت کون پہلوان سر والا تھا۔ یہ اعزاز حاصل کرنے کیلئے طرفین کی جانب سے پوری پوری کوشش ہوئی اور "پورا" تین دن مسلسل کشتی جاری رہی۔ اور سر دنگل کنکوے کی طرح پھرتا رہا۔ دور دور سے لوگ اور شوقین آتے رہے۔ مگر خدا کی شان کہ دونو پہلوانوں کے ایسے "کس" ملے کہ باوجود انتہائی سرگرمی کے "گھس بیٹھ" تک نہ ہو سکی۔ دونوں نے داؤں گھات میں کسر نہ اٹھا رکھی۔ لاکھ پینترے بدلے۔ جھکیاں دیں مگر ایک دوسرے کو پکڑ نہ لا سکا۔ بڑے بڑے ماہرین فن اور معتبر لوگ منصف تھے۔ آخر میں یہ ہی فیصلہ ہوا کہ "برابر کی جوڑ" تسلیم کر لئے گئے۔ آغا میں باوجود اس جسم اور ڈیل ڈول کے پھرتی غضب کی تھی۔ لوگوں کو حیرت ہوتی تھی کہ یہ چار ساڑھے چار من کا جسم لنگ جانگیہ باندھتے ہی برق مجسم بن جاتا ہے۔ وہ تڑپ اور پھڑک کہ معاذ اللہ۔ آغا یوں تو پہلوان ہی تھے۔ مگر یہ بات مشہور تھی۔ بلکہ مسلمہ حقیقت تھی کہ پانچ داؤں تو مسلسل ایسے رواں تھے کہ فریق مخالف کو ان داؤں سے بچنا اور "رد کی تھام" مشکل ہو جاتی تھی۔ داؤں ایسے بھرپور ہوتے تھے کہ جن کا "توڑ" کرنے کا موقع ہی مشکل سے ملتا تھا۔ انہوں نے سب سے پہلے "کسوٹا" ہوتا تھا۔ اس سے بچا تو "لوکان" کا داؤں ڈال دیا۔ پہلوانوں کی اصطلاح میں یہ داؤں "ساجھی" کہلاتا ہے۔ اور جس پہلوان کو سوجھ بوجھ اور سرعت زیادہ ہو اس کو فائدہ پہنچا دیتا ہے۔ آغا اس داؤں میں نوے فیصدی سے زیادہ کامیاب ہوتے تھے۔ اور فریق مخالف کو آنا فانا میں آگے رکھ لیتے تھے۔ پہلوان کو آگے لاتے ہی "کھڑا اگھسنا" اس سے بچ نکلا تو فوراً "فلاجنگ"۔ اس سے بچ نکلا تو "گدھا لوٹ"۔ ان پانچوں داؤں کا سلسلہ اس قدر پھرتی کے ساتھ جاری رہتا تھا۔ اور پانچوں داؤں ایسے تار طوڑ کئے جاتے تھے کہ پوری کشتی میں تین منٹ سے زیادہ نہیں لگتے تھے۔ آغا کے کردار میں ایک زبردست اور عدیم المثال طریقہ "تادیب نفسی" کا تھا۔ جب زندگی میں ان سے کوئی غلطی کوئی خطا یا لغزش سرزد ہوئی تو فوراً استرا یا چھری لیکر اپنے جسم کی کہیں نہ کہیں سے ایک بوٹی کاٹ ڈالتے تھے۔ اور اس تادیب نفسی میں اس درجہ سختی برتی جاتی تھی کہ زخم کی مرہم پٹی تو درکنار کبھی پن لپڑا بھی نہ باندھا گیا۔ اپنے نفس کو سزا دینے کا یہ ہولناک اور وحشیانہ طریقہ سہی مگر آغا کو اس پر پورا اعتماد تھا۔ اور یہ ایسا موثر اور کارگر عمل ہوتا تھا کہ اس کے بعد اس غلطی اور جرم کی تلافی فوراً ہوتی تھی اور نتیجہ اس کا یقیناً اصلاح ہی اصلاح تھا۔ اور لطیف بات اس میں یہ تھی کہ آغا پہلوان کا جسم خود ان کی بد اعمالیوں جزا اور سزا کا ایک جیتا جاگتا مرقع تھا اور مکمل فہرست۔ ان کے قصور اور خطا کا حال ان سے نہ پوچھئے ان کے جسم کے داغ گن لیجئے۔ صورت سبب حالش میرس ما۔

اس کشتی کے بعد آغا پہلوان نے کچھ عرصہ تک اور کشتی کے بعد آغا پہلوان نے کچھ عرصے تک کوئی کشتی دہلی کے دنگل میں نہیں لڑی۔ اور لڑتے کیا فی الاصل ان کو کوئی جوڑی نہ ملی۔ البتہ پردیس میں لاتعداد کشتیاں لڑیں۔ اور دھوم دھام سے جیتے۔ دلی والوں کو ان کشتیوں کا حال یوں ہی معلوم ہوتا تھا کہ بسا اوقات ان کے دروازے کے آگے مساکین اور محتاجوں کو کھانا تقسیم ہوتا تھا۔ میلاد کی مٹھائیاں بٹتی تھیں۔ کبھی کپڑا تقسیم ہوتا تھا۔ غرض اس قسم کی داد و دہش عام تھی۔

آغا پہلوان کے تیسرے دور زندگی میں کرداری حیثیت سے ایک اور واقعہ اہم ہے۔ جس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ اس دور میں ایک وقت ایسا آیا کہ کچھ تو لوگوں کے بہکانے سکھانے سے، کچھ اپنی طبیعت کی بغاوت سے آغا پہلوان نے اپنے استاد سے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ "میاں تم استاد بنے پھرتے ہو تم نے مجھے سکھایا ہی کیا۔ بڑے استاد ہو تو مجھے اب چت کر دو۔ جب جانوں۔ اور نہیں تو میں تمہیں چت کرتا ہوں"۔

جن لوگوں نے آغا کی اس بد کلامی کو سنا وہ انگشت بدنداں ہوئے اور بہتوں نے یہ خیال کیا کہ استاد آخر استاد ہیں۔ یہ آغا کی بدنصیبی ہے کہ ایسے شفیق استاد کا مقابلہ کیا۔ یہ مار کھائے گا۔

ادھر استاد کی شرافت اور نجابت دیکھئے کہ شاگرد کی اس حرکت کو ایک دفعہ بہ لطائف الحیل ٹالا۔ مگر آغا نے یہ روز کا مشغلہ سمجھ لیا کہ دم پر دم استاد کو ٹوکنا شروع کیا۔ آخر تابکے استاد ماہرخ کی بھی رگِ حمیت پھڑکی۔ اور ایک دن انھوں نے بھی کہہ دیا کہ "اچھا بیٹا! اگر تیرے دل میں خیال ہے کہ میں نے تجھے کچھ نہیں سکھایا تو اکھاڑا موجود ہے جس دن تیرا جی چاہے ایک پکڑ دیکھ لے۔ مگر ایک شرط ہے۔ تو جوان میں بڈھا۔ تو چار من کا میری پاؤ بھر ہڈیاں۔ تو زور اور بل سے نہیں سر اور داؤں سے مجھے چت کرلے تو میں تیرا شاگرد ہو جاؤں گا۔ اور جو میں نے تجھے مار لیا تو چلو بھر پانی میں ناک ڈبو بیٹھیو۔" لیجئے جو لوگ استاد شاگرد کی پیچ بازی میں دلچسپی لیتے تھے ان کی بن آئی۔ شاگرد نے استاد پر خم مارا۔ اور دونوں کے ہاتھ مل گئے اور کشتی ٹھیر گئی۔

اب اس کشتی کا مزہ اور لطف ان آنکھوں سے پوچھئے جنھوں نے پورا تماشہ دیکھا۔ بڑی خیریت اس کشتی میں یہ ہوئی کہ اور اکھاڑے والوں کو معلوم نہ ہوسکا اور معاملہ خفیہ ہی رہا۔ صرف وہ لوگ اس میں شریک تھے جن کا تعلق شیخو والوں کے اکھاڑے سے تھا کشتی ظاہری صورت سے تو کسی طرح کشتی کہلانے کی مستحق ہی نہ تھی۔ ہڈی اور شتر مرغ کا مقابلہ تھا۔ مگر جن حضرات کو کشتی کے فن سے لگاؤ تھا انھوں نے استاد ماہرخ بیگ کے تیور دیکھے۔ اور معلوم کیا کہ اس وقت استادی اور بزرگی کا پورا پورا اجلال، ان کی شکل و صورت، پیچ درپیچ، پینترا اور ٹھاٹھ پر چھا رہا تھا۔

جس وقت کا یہ تذکرہ ہے اس وقت ہماری دلی میں سو سے زائد مستند اکھاڑے تھے۔ اور ایک سے ایک چیدہ استاد فن موجود تھا۔ مگر استاد ماہرخ بیگ میں اور دیگر اساتذہ میں اتنا ہی فرق تھا جتنا۔ فربہی دیگر است و آماس دیگر۔ استاد نے لنگر باندھتے ہی "یا علی" کا ایک نعرہ لگایا۔ اور اکھاڑے کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پانچ سات ڈھیکیاں لگائیں۔ ان ڈھیکیوں میں کیا اٹھان اور چستی تھی کہ سبحان اللہ۔ بیچ اکھاڑے میں قائم ہو کر پہلے اپنے خم پر مٹی ملی اور پھر قاعدے کے ساتھ دونوں ہاتھوں سے حاضرین کو سلام کر کے پینترا قائم کیا۔ اتنا تو سب نے دیکھا۔ اس کے بعد خدا دے اور بندہ لے۔ وہ پھرت پھرت تھی کہ نگاہ قائم نہیں ہو سکتی تھی۔ جتنے اکھاڑے میں بیٹھے ہوئے تھے سب کے دل میں پنکھے لگے ہوئے تھے۔ ایک ہی منٹ ہوا ہوگا، آغا ایک طرف ناک سنکنے کو جھکا ہی تھا کہ استاد نے ٹھیکی دی اور جھٹ سے بغلی ڈوب کر آغا کو آگے رکھ لیا۔ فوراً ایک چیڑا اس مارا، آغا کے دونوں گھٹنے ٹک گئے۔ ہاتھ ٹیک کر اٹھنا چاہا۔ استاد اتنا کہاں موقع دینے والے تھے فوراً اپنی سیدھی ٹانگ آغا کی الٹی ٹانگ میں پھنسا کر ایک ہاتھ سے جانگیے کو تھاما اور الٹی ٹانگ سے گھستا کیا۔ آغا گیند کی طرح لڑھک گئے کشتی ہو گئی۔ آغا نے وہیں چت پڑے پڑے دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ لیا۔ اور چیخیں مار مار کر رونا شروع کیا۔ ادھر استاد اکھاڑے سے نکل اپنے کپڑے سنبھال چلنے لگے۔ سب سے پہلے ان کے بڑے بیٹے نوزنے دوڑ کر کوئی بولی اور استاد کو اٹھا کر کندھے پر چڑھا لیا۔ دوسری طرف آغا اکھاڑے سے لپک کر اپنے کپڑوں کی طرف آئے اور استرا نکال ران میں سے ایک بوٹی کاٹ لی۔ اور پھر فوراً دوڑ کر استاد کے پاؤں سے لپٹ گئے۔ اپنا منہ اور آنکھیں ان کے پاؤں سے ملیں۔ پھر نوز پہلوان کے کندھے سے اتار کر بچوں کی طرح استاد کو اپنے کندھے پر رکھا اور اجمیری دروازہ کی طرف بھاگے۔ ران میں جو زخم تھا اس سے خون جاری۔ لنگوٹ جانگیہ بندھی ہوئی۔ کمر میں اکھاڑے کی مٹی لگی ہوئی۔ دونوں ہاتھوں سے استاد کی ٹانگیں پکڑے شاہ گنج پہنچے۔ وہاں شیخو والوں کا ڈھول تیار رہتا تھا۔ آواز دیکر بلا لیا۔ آگے آگے ڈھول بج رہا ہے۔ پیچھے آغا استاد کو سوار کئے چلے اور خود نعرہ لگاتے جاتے ہیں۔ آغا کے استاد نے آغا کو . . . . وہ مارا۔ پیچھے سارا ہجوم وہ مارا کا نعرہ لگاتا ہے۔ جس طرح اپنے زعم ناقص میں پھول کر استاد کا مقابلہ کیا تھا آج اپنی شکست کا اعتراف بھی اس سے زیادہ شان سے ہو رہا ہے۔ قدم قدم پر آغا ہی کے منہ سے یہ صدا آ رہی تھی۔ آغا کے استاد نے آغا حرامی کو وہ مارا۔

دوسرے دن دوسرا سین یہ دیکھا کہ شیخو والے اکھاڑے میں صبح ہی دیگیں کھڑک رہی ہیں۔ بریانی دم ہو رہی ہے۔ لولے لنگڑے محتاج فقرا اور مساکین کو کھانا تقسیم ہو رہا ہے استاد ماہرخ بیگ صاحب تک سے سکے، نیا جوڑا نذر بھی کئے

کرسی پر بیٹھے ہیں۔ آغا نیچے بیٹھے ہیں۔ استاد کے پاؤں دبا رہے ہیں۔ لنگوٹ جانگیہ استاد کے قدموں میں رکھا ہے۔ اشارہ ہو رہا کہ یہ لنگوٹ جانگیہ آپ ہی نے بندھوایا تھا اور اب آپ ہی بندھوائیے تو بندھے گا نہیں تو پھونک دوں گا۔ استاد آپ تو استاد اور پھر شریف النسل، نیک دل، کرسی پر سے اٹھ کر آغا کو گلے سے لگا لیا۔ لنگوٹ نکیہ لوبان کی دھونی دیکر اپنے ہاتھ سے بندھوایا۔

آغا نے استاد کو سلام کیا ہاتھ کو بوسہ دیا۔ پانچ ڈنڑ اور پانچ بیٹھک "عشق اللہ" کی کہہ کر اس نئی زندگی کی ابتدا ہوئی۔ فاتحہ ہوئی۔ لیجئے آغا پہلوان . . . کی پہلی اڑان کا انتظام اور شروع ہوا۔ یہ دور تقریباً ڈیڑھ دو سال کا تھا۔ آغا پہلوان اگرچہ پچاس کے لپیٹے میں آ چکے تھے مگر ہاتھ پاؤں برابر ہلا رہے تھے۔ پٹھ خوب چڑھا ہوا تھا۔ اگرچہ توند زیادہ نکل آئی تھی۔ مگر بدن کندن کی طرح چمکتا تھا۔ اور بقول شخصے آنکھ پھسلتی تھی۔ کسرت کا طریقہ بھی نرالا تھا۔ توند کی وجہ سے نہ تو بیل ڈنڑ اور نہ نالی پر ڈنڑ پیل سکتے تھے بلکہ اینٹوں کے چار پختہ پائے ہموار رکھے تھے۔ جس پر دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں رکھ کر زمین سے معلق اور ادھر ادھر ڈنڑ پیلتے تھے۔ جو حضرات اس فن سے واقف ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ طریقہ ڈنڑ پیلنے کا کس قدر دقیق اور مشکل ہے اور ڈنڑ پیلنے والے پر کتنا کسالا پڑتا ہے۔ آغا اس طریقے پر ایسے ڈنڑ پچاس کا پھیر پھیلتے تھے یعنی پچاس سے شروع کرتے ایک ایک ہر دفعہ کم کرتے یہاں تک کہ ایک پر پہنچ گئے۔ اس طرح پر کل ۱۲۷۵ ڈنڑ ہوئے اور اسی طرح سو کا پھیر بیٹھکیاں ہو اس سے دگنی ہوئیں۔ اس کے علاوہ صبح شام کی میل سوا میل کی دوڑ۔ یہ اس دور کی معمولی کسرت تھی۔ اسی دور میں آغا نے آخری کشتی لڑی۔

اور تربیت لی۔ یہ کشتی بھی تاریخی نقطۂ نظر سے خاص اہمیت رکھتی ہے۔ کچھ عرصہ سے دلی میں رحیم خورجہ والا آکر دلی میں کئی کشتیاں نکال چکا تھا۔ دو دنگل سے اس کو جوڑ نہیں ملتی تھی۔ آخر ایک دنگل میں اس نے زعم میں آکر آوازہ کسا اور کہا "دلی والے بہت پہلوانی کا زور باندھتے تھے اب دلی میں میری جوڑ نہیں ملتی۔ آج بھرے دنگل میں کشتی مانگتا ہوں۔ ہے کوئی مائی کا لال جو مجھ سے ہاتھ ملائے۔" روئے سخن اس وقت دنگل کے بانی پیرجی مظفر علی صاحب مرحوم کی طرف تھا۔ آغا

ان کے پاس بیٹھے دنگل دیکھ رہے تھے۔ دلی کا نام سن کر نہ رہا گیا۔ فوراً کھڑے ہو کر جواب دیا "آؤ پہلوان دل چھوٹا نہ کرو ابھی آغا مرا نہیں ہے۔ دلی میں ابھی بہت دم کس ہے۔ میں تم سے لڑوں گا۔" رحیم بولا "جاؤ پہلوان اپنا کام کرو۔ اب تم میں کیا رکھا ہے خالی گوشت ہی گوشت ہے۔ کیوں اپنے ہاتھ پاؤں اینڈکرانے کی فکر میں ہو؟" اتنا سن کر آغا کو تاب نہ رہی۔ بولے "صاحبزادے کیوں گھمنڈ کرتے ہو۔ ہم نے خدا کے فضل سے کشتی نہیں کھائی یہ بھی غرور نہیں کیا۔ تم کو کاغذ کی طرح چیر ڈالوں گا۔ اور پانچ منٹ میں تین دفعہ چت کروں گا۔ آؤ ہاتھ ملاؤ۔"

کشتی کا اعلان ہو گیا۔ آئندہ آنے والے جمعہ کو دنگل بندھا۔ آغا کی کشتی کی دھوم سن کر خلقت کا وہ اژدہام تھا کہ خدا کی پناہ۔ شروع شروع آٹھ دس چھوٹی جوڑیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد نقیب نے ایک دم سے آواز لگائی "آغا پہلوان سبزی والے اور رحیم پہلوان خورجہ والے لنگر باندھیں۔" آواز کا سننا تھا کہ پہلے تو بڑی ہل چل مچی۔ اس کے بعد جب دونوں پہلوان آمنے سامنے آ گئے تو ایک سناٹا چھا گیا۔ دونوں میں انیس بیس ہی کا فرق ہو گا۔ البتہ بہ لحاظ عمر ایک عروج پر تھا دوسرا مائل بہ انحطاط۔ اس روز پون گھنٹہ تک "کچھ بیل" ہی ہوتا رہا کبھی آغا پہلوان ریل کر رحیم کو دور تک لیجاتے۔ کبھی رحیم آغا کو۔ پینترے ہوتے رہے مگر بدن سے بدن نہ ملا۔ واللہ اعلم بالصواب کیا بھید تھا۔ مبصرین نے رائے دی کہ کشتی نورا ہو رہی ہے۔ لوگوں نے تھوڑی دیر تو صبر دیکھا۔ اس کے بعد "کشتی نورا ہے" کے آوازے پڑنے لگے۔ کسی نے کہا "دونوں بھینسوں کو علیحدہ کرو۔ اور چونے کی چکی میں جوڑ دو۔" کوئی کہتا "ان کی اللہ کے نام فتح بانی کر دو۔" کوئی کہتا "دام واپس پھیر دو۔" مگر جو لوگ آغا کی ذہنیت سے واقف تھے وہ "نورا" کشتی کے خلاف تھے۔ قصہ مختصر اس دن کشتی برابر رہی۔ اگلے جمعہ پر جا پڑی۔ آغا کے دوست احباب نے اس واردات کے متعلق لاکھ پوچھا۔ مگر آغا نے نہ بتانا تھا نہ بتایا۔ اگلے جمعہ کا آنا تھا کہ پھر خلقت کی وہی ریل پیل۔ جوڑ ٹھیک وقت پر چھوٹی۔ آج آغا کے تیور ہی کچھ اور تھے۔ آنکھیں غلافی نکلی ہوئیں۔ ناک کے نتھنے پھولے ہوئے۔ ہاتھ ملانے

کی دیر تھی کہ آغا نے "کھسوٹا" کیا۔ اور آن کی آن میں رحیم کو آگے رکھ کلاجنگ پر مار لیا۔ کشتی دنگلی ہوئی۔ ساری خلقت چیخ اٹھی کہ یہ "صحیح" نہیں ہے کشتی آر پار ہوگی۔ دوسری دفعہ پھر دنگلی داؤں پر جیت کیا پھر بھی لوگوں کی اطمینان نہوا۔ رحیم کا یہ حال کہ موم کی گڑیا بن گئے۔ تیسری دفعہ کی کشتی میں سنبھل کر لڑے اور گھٹنا کر کے چھاتی پر سوار ہو گئے۔ وہ مارا وہ مارا کا غل مچ گیا۔ پھول سے کنٹھوں کا ڈھیر ہوگیا۔ دوشالہ اوڑھ اکھاڑے سے باہر آئے۔ لوگوں نے نذریں دینی شروع کیں تو دوشالہ کی جھولی بھر گئی۔ جھڑ اچاندی ہی چاندی ہوگئی۔ کچھ عرصے کے بعد پہلے دن کی کشتی کا حال بھی کھل گیا۔ دنگل کے بانی نے دُکانداری کی۔ اگلے جمعہ کے دنگل میں کمائی کی خاطر آغا سے درخواست کی کہ پہلے دن بیچ کر لیں۔ دوسرے جمعہ کو وار پار۔ اس صلہ میں آغا کو دوسو روپے دنگل کے بانی کی طرف سے عطیہ ملا کشتی کا انعام، نذریں اور عطیہ سب ملا کر کئی ہزار کی رقم پلے پڑ گئی۔ اس کشتی کے بعد ایک تو بھائی کا ندمہ دوسرے استاد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ آغا نے لنگر کھول دیا۔ اور اپنا کامداری کا کارخانہ لیکر بیٹھ گئے۔

(اے۔ آئی۔ آر۔ دلی)

شکست

گزشتہ دس سال کا بہترین ناول

دورِ حاضر کا مشہور صاحبِ طرز انشا پرداز

کرشن چندر

انکا ہنگامہ معرکۃ الآرا ناول شکست اردو افسانوی ادب کا شاہکار ہے ایک مشہور نقاد کہتا ہے "شکست" کرشن چندر کی سب سے بڑی فتح ہے اور صاحبِ ذوق کی رائے ہے کہ "اُردو ناول کے باب میں پریم چند کی انتہا کرشن چندر کا آغاز ہے"

ضخامت ۔۔۔ صفحے قیمت تین روپے۔ اپنے شہر کے کتب فروشوں یا

ساقی بک ڈپو دہلی سے طلب کیجئے

فکر تونسوی

قصۂ ہجر و فراق بہ طرزِ نو میگویم

اے مستِ رنگ و نگار و صورت! اگر تجھے اعتبار آئے

مری نظر ہی نے تیرے شنرنگ گیسوؤں میں دئیے جلائے

کبھی ترے شورِ ہجر ان سے ابھار اُٹھائی خموشیوں کو

کبھی تری بے افق خموشی سے بند نغموں میں سُر ملائے

کبھی نہ سوچا یہ جان کر بھی ۔ کہ میرا دل بھی ہے شعلہ شعلہ

کبھی تری جلتی جلتی راتوں میں سازِ شبنم پہ گیت گائے

تو چاند تاروں سے پوچھ میرے الم کی رنگت غموں کے نقشے

کہ میرے منہ زور آنسوؤں پر جو اس کٹے دل نے ظلم ڈھائے

کبھی نہ سوچا مری بہاروں میں رہ رساکیوں کھلا ہوا ہے

کہ تیرے لب سے بندھے ہوئے عہدِ شکریں پر نہ حرف آئے

سلگتی جلتی یہ خوشبوئیں گرد و پیش میرے کہاں سے آئیں

یہ کون مجھ کو پکارتا ہے یہ کس نے خوشبو کے ہر جلائے

ترے جہاں میں تبسم لبِ بے لبے سے انکار تو نہیں ہے

مگر وہی ایک مسکراہٹ جو کھو چکے ہیں۔ کبھی نہ پائے

میں دور ہوں تو بھی دور ہے ایک استہ پر رواں ہیں دونوں

جدائی کا تو اُسے گلہ ہو۔ جو اپنی رفتار بھول جائے

جب آنکھ کھلی تو

کھیل

جب آنکھ کھلی تو موسمِ گُل
پھولوں کی زباں میں ایک کہانی
ہر برگ و شجر سے کہہ رہا تھا
مقصود تھی دل کی ترجمانی
چہروں سے سرک رہے تھے آنچل
مصروف تھی کھیل میں جوانی
ہر عضو سے پھوٹتے تھے نغمے
آنکھوں سے شراب ڈھل رہی تھی
جسموں سے ابھر رہی تھیں تانیں
ہر پہلو میں آگ جل رہی تھی

جب آنکھ کھلی تو موسمِ گُل
رنگوں کی گھلاوٹوں میں گم تھا

زخم

چھاگل سے اٹھی جو تان غم کی
آنکھوں سے لہو کی دھار پھوٹی
سینے میں دھواں سا پیچ کھا کر
اس طرح اٹھا کہ آس ٹوٹی
سر جھک گیا داغ مسکرائے
تاریکی میں پھلجھڑی سی چھوٹی
وہ قوس قزح وہ دست رنگیں
کیا جانے سمٹ کر رہ گئے کیوں
اک سیمگوں رات میں نہ جانے
آنسو آنکھوں سے بہہ گئے کیوں

میں تھا کہ بھٹک رہا تھا ہر سُو
ہر خواب سُلگ رہا تھا دل میں

[illegible]

[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]

[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible]

نوکری کے مل جانے پر بھی وہ پہلے کی طرح پریشان ہی رہا کرتی تھی۔ اس کے جسم کا ایک ایک جوڑ درد کرتا رہتا۔ اس کو ایسے محسوس ہوتا کہ جیسے منوں مٹی اور چونے کے ڈھیر میں اس کو گاڑ دیا گیا تھا۔ اور اس ڈھیر میں دبے دبے اس کی ہڈی پسلی ایک ہوگئی تھی —— اس کا ذہن ہر وقت تھکا تھکا سا رہتا — اور پھر کے۔جی میں پڑھنے والے بچوں کی بہتی ہوئی ناکیں اور زرد گال اور چرے ہوئے پیچھے کو مڑے ہوئے بال، ان سب سے تو اس کو گھن سی آنے لگی تھی۔ یہ بچے ہر وقت اس کو گھیرے رہتے تھے ——

"مس صاحب جی، اب کونسا سبق ہے؟" کوئی بچہ اپنے گول گول ہونٹوں سے ناک سڑکتے ہوئے کہتا۔ اور خواہ مخواہ مریا مس صاحب کو ابکائی آجاتی اور وہ سوچنے لگتی کہ نہ معلوم کوئی ترکیب ہے بھی کہ نہیں جس سے کہ وہ کے۔جی اور مادام منطیسوری کے سبقوں اور مشغلوں سے باہر نکل سکے —— اور پھر ایکا ایکی اس کو جونس کا وہ خط مل گیا تھا۔

جونس کے ہاں بچہ ہونے والا تھا — اور مریا نے اپنی نوکری سے استعفیٰ دیدیا۔ اور یوں وہ پورے دو مہینے جونس کے ہاں آگئی اسکی ہوکر۔ ان دو مہینوں میں اس کو کس قدر آرام مل گیا تھا اس پر وہ خود بھی حیران تھی۔ اور پھر جونس کا بچہ ان بچوں سے کس قدر مختلف تھا جن کے درمیان وہ اب تک گھری رہی تھی۔ حالانکہ جونس کا خود اپنا رنگ بہت پکا کالا تھا لیکن پھر بھی اس کا بچہ کافی گورا تھا۔ اس کے بال بیشک جونس کے بالوں کی طرح گھنگھریالے کالے تھے لیکن اس کے گورے رنگ کے ساتھ تو یہ بال اور بھی خوبصورت معلوم ہوتے تھے اور اس کی آنکھوں کا رنگ ہلکا سا نیلا گدلا معلوم ہونے لگتا تھا، اور وہ جونس کی شدت پرستش کرنے لگی تھی۔ اور جونس کے مسلمان میاں داؤد سے کہتی تھی ——

"دیکھا جی، آپ نے —— ہماری سہیلی نے کیسا خوبصورت بچہ دیا ہے" وہ یہ الفاظ ایسے کہتی کہ جیسے داؤد کے لئے ایسا بچہ کوئی بہت ہی بڑی نعمت ہے۔ دراصل مریا کو خود ہی جونس کا بچہ بہت ہی بڑی نعمت معلوم ہوتا تھا، اور اسی لئے وہ داؤد سے یہ کہہ دیتی تھی۔ حالانکہ داؤد نے کئی بار اس کو اپنے بچپن کی تصویریں دکھائی تھیں۔ اور کئی بار یہ اشارہ بھی کیا تھا کہ اس کے بچے کی شکل ویسی ہے جیسی کہ اس کی اپنے بچپن میں تھی۔ لیکن پھر بھی مریا اس بچے کو جونس کا ہی کوئی کارنامہ سمجھتی اور ایسے کہتی کہ جیسے داؤد کا اس کارنامے میں کوئی حصہ بھی نہیں ہے —— !

اور پورے دو مہینے تک جو تبدیلیاں جونس میں پیدا ہوتی رہی تھیں ان میں بھی تو اس کو کتنی دلچسپی محسوس ہوتی تھی۔ پہلے پہل تو جب وہ مشن اسکول کی نوکری چھوڑ کے لکھنؤ آئی اور جونس کو اس نے اسٹیشن پر دیکھا تو جونس اس کو اچھی خاصی بھلی چنگی نظر آئی جس سے اس کو ذرا حیرت بھی ہوئی، سوائے اس کے کہ جونس کا جسم ساڑھی میں ضرورت سے زیادہ پھولا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ اور کوئی تبدیلی اس کو نظر نہ آتی تھی اور مریا سمجھی تھی کہ جونس نے محض اس کو بلانے کیلئے یہ مذاق کیا تھا۔ پر وہ کے۔جی میں پڑھنے والے بچوں سے اس قدر اکتا چکی تھی کہ وہ جونس کے اس مذاق پر ذرا بھی نہ بگڑی۔ بلکہ خود بھی وہ جونس کی وقت بے وقت کی ہنسی میں زور شور سے شرکت کرنے کی کوشش کرتی تھی لیکن پھر ایک شام کھانے کے بعد جبکہ جونس کا میاں داؤد کلب گیا ہوا تھا جونس نے آہستہ سے مریا سے کہا:۔

"مریا اب دکھ ہو رہا ہے" —— جونس شکل سے کتنی تھکی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ اور مریا پریشان ہوگئی تھی۔ وہ خود تو جونس سے بھی زیادہ ناتجربہ کار تھی۔ اور اس کو خود بھی کچھ معلوم نہ تھا۔ اور اس نے گھبرا کے جونس کو سب سے آرام دہ پلنگ پر لٹا دیا تھا۔

"کہاں ہو رہا ہے دکھ ——" اس نے سوچا تھا کہ شاید اس کے سینکنے یا دبانے سے جونس کی تکلیف کم ہو جائیگی لیکن جونس کی تکلیف تو برابر بڑھتی ہی چلی گئی تھی حتیٰ کہ جب داؤد کلب سے واپس آیا اور لیڈی ڈاکٹر کو بلا کے لایا تو جونس پڑی اپنے پلنگ پر تڑپ رہی تھی۔ اس نے اپنی مٹھیاں بھینچ لی تھیں۔ اور اپنے ہاتھوں کو پلنگ کی نواڑ میں گھسا دیا تھا۔ اور پھر بیچ رات میں یہ ننھا منا سرخ سے چہرے اور یاقوتی لالا بچہ پیدا ہوا تھا۔ اور مریا کو یقین آیا تھا کہ جونس نے محض مذاق نہ کیا تھا۔

بچے کے پیدا ہونے کے بعد سے مریا جونس کے ہاں

اور کبھی مرنے سے رہنے لگی۔ وہ دونوں کی دونوں دن بھر بچے کے کاموں میں مصروف رہتیں۔ اور جوئس کا میاں داؤد مرنے سے کلب اور دفتر میں لگا رہتا ـــــ وہ دونوں گھر پر حکومت کرتی رہتیں۔

اور جب جوئس اور بچے کے ساتھ مریا اکیلی رہ جاتی تو اس کا دل دھک دھک کرنے لگتا۔ اس کے جسم کے اندر جیسے آہستہ آہستہ کوئی پرندہ پھڑپھڑانے لگتا۔ اور اس کا سانس آہستہ آہستہ پھولنا شروع ہو جاتا۔ اس کو محسوس ہوتا کہ جیسے وہ جوئس کو اپنے اندر چھپی ہوئی بات بتا دے گی۔ لیکن پھر جلدی ہی کوئی نامعلوم خیال اس کو روک دیتا۔ اور وہ بات پلٹنے کیلئے کوئی ادھر ادھر کی بات شروع کر دیتی۔

"اب اس کو ہضم کیسا ہو رہا ہے؟ گرائپ واٹر دیا تھا کل رات؟"

"دودھ پلانے میں دقت تو نہیں ہوتی کوئی ــ؟"

اور اس کے جسم کے اندر جو پھڑپھڑاہٹ ہو رہی تھی وہ آہستہ آہستہ ہوتے ختم ہو جاتی۔ اور وہ سوچتی کہ وہ پھر کسی دن بتا دے گی ابھی جلدی کیا ہے؟"

لیکن یونہی تو پورے دو مہینے گذر گئے تھے۔ جوئس کا بچہ ایک تیزی کے ساتھ بڑھتا چلا گیا تھا۔ تھوڑے دن بعد ہی وہ کافی ہشیار ہو گیا تھا۔ اور اپنی اونچے اونچے کٹہرے والی مسہری میں پڑے پڑے روشنی کو تکا کرتا تھا۔ اور پھر روشنی کو دیکھ کے ہی ہمکنا شروع کر دیتا تھا۔ یا پھر ٹیاؤں ٹیاؤں کرنے لگتا۔ اور ابھی سے وہ کتنی بھاری آواز میں روتا تھا جیسے کوئی خاصا بڑا بچہ ہو۔ لیکن مریا پھر بھی اپنی تمام باتیں جوئس کو نہ بتا پائی تھی۔

حالانکہ اس نے جوئس کو بہت سی ایسی باتیں بتا دی تھیں جن پر بعد میں اکیلے میں سوچنے سے اس کو خود بھی کچھ شرم سی آنے لگتی تھی۔ مثلاً اس نے وہ ڈیو ڈو والا قصہ پورا کا پورا جوئس کو سنا دیا تھا اور اس پر مریا اور جوئس نے مل کر ڈیو ڈ کو گالیاں اور کوسنے بھی دیئے تھے۔ اور پھر دونوں کسی نامعلوم خیال پر ایک ساتھ مل کر ہنسنے بھی لگی تھیں۔

اور جوئس کو اس نے مشن اسکول کی تقریباً تمام باتیں جو ذرا ویسی تھیں بتا دی تھیں۔ ہیڈ مسٹریس والا قصہ؟ ـــــ ہیڈ مسٹریس صاحب اس عمر میں بھی ایسی حرکتیں کرتی تھیں۔ پھر مشن اسکول میں اردو پڑھانے والے منشی جو سارے اسکول بھر میں ایک اکیلے مرد تھے! غرضیکہ مریا نے جوئس کو ہزاروں ہی الٹی سیدھی باتیں بتا دی تھیں لیکن پھر جیسے ہی وہ اپنی بات بتانے کی کوشش کرنے لگتی ویسے ہی اس کے سینے میں، پیٹ میں اور دماغ میں کوئی چیز زور زور سے پھڑپھڑانے لگتی۔ جیسے یہ پھڑپھڑاہٹ اس بات کو اس کے دماغ سے باہر نکال ہی پھینکے گی۔ اور مریا فیصلہ بھی نہ کر پاتی کہ وہ وہ بات جوئس کو بتائے یا نہ بتائے۔

اور پھر جوئس سے اس کی کئی مرتبہ لڑائی بھی تو ہوئی تھی۔ جتنی دفعہ اس کی لڑائی ہوئی۔ وہ سوچتی کہ اچھا ہوا کہ اس نے جوئس کو اپنی باتیں تمام کی تمام نہ بتائی تھیں۔ ورنہ جوئس تو بہت اوچھی ہے۔ نہ معلوم اس وقت وہ اس بات کو کس طرح پر اور لوگوں کے سامنے بیان کرنا شروع کر دیتی۔

ـــ اور وقت گذرتا چلا گیا۔ اور جوئس کے ہاں اس کو پورے دو مہینے ہو گئے۔

حالانکہ جوئس سے اس کی دوستی اتنی پرانی تھی۔ اور اس کو اسکول کی تھکا دینے والی نوکری کے بعد جوئس کے ہاں رہنا بھی بہت اچھا لگتا تھا، لیکن پھر بھی وہ ایک بار جوئس سے بُری طرح لڑ پڑی۔ جوئس سے لڑائی ہو جانے کے بعد اس نے دو دن تک اس سے بات بھی نہ کی، اور الگ پڑی رہی۔ اور جوئس کے میاں داؤد کی بھی اتنی ہمت نہ ہوئی کہ وہ آن کر مریا کو منا سکے۔ حالانکہ شاید کئی بار اس نے کوشش بھی کی تھی۔

اور مریا نے سوچا کہ اب اس کو جوئس کے ہاں اور زیادہ نہ رہنا چاہیئے۔ اور اس نے سوچا کہ جب تک اس کو کسی اور اسکول میں نوکری ملے گی۔ وہ اپنے بھائی کے ہاں رہ لے گی ـــ اور اس کا منصوبہ اتنا تھا کہ وہ تھرڈ کلاس کا سفر اور راستے بھر کی کوفت اور پھر اپنی بھابی کے گنوارانہ طور طریقے بھی برداشت کرنے کیلئے تیار تھی۔ اور خاموشی سے وہ اپنا سامان باندھنے لگی تھی۔

شروع میں تو جوئس نے اس کے سامان باندھنے پر غور ہی نہ کیا۔ جیسے اس کو اس سے کوئی مطلب ہی نہ تھا لیکن پھر تھوڑی دیر بعد اس نے اپنے بچے سے مریا کے سامان باندھنے کے متعلق الٹی سیدھی باتیں کرنی شروع کر دی تھیں۔ مریا بخوبی جانتی تھی کہ جوئس کا بچہ اس کی باتوں کا ایک لفظ بھی نہ سمجھ

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

عبادت بریلوی

ادب کا افادی پہلو

جس روز سے ادب کا سوتا پھوٹا اسی روز سے ان مباحث نے بھی جڑ پکڑ لی کہ ادب کیا ہے؟ وہ کیوں پیدا کیا جاتا ہے؟ کن حالات میں ان کی تخلیق ہوتی ہے؟ کون لوگ ہیں جو اس کی تخلیق کرتے ہیں؟ اس کا انسانی زندگی سے کوئی تعلق ہے یا نہیں۔ اس کے عناصر کیا ہیں؟ زندگی میں اس کی کیا اہمیت ہے؟ اور آیا اس کا کوئی مقصد بھی ہے یا نہیں؟۔ چنانچہ ادبی تاریخ کے سرورق کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے مباحث کم و بیش ہر دور میں جاری رہے ہیں۔ آج بھی جاری ہیں اور رہتی دنیا تک جاری رہیں گے اس لئے ان کی اہمیت سے تو کسی طرح بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ بس جب وہ اہمیت کے مالک ہیں تو پھر ان پر غور و خوض کرنے میں جذبات کی جگہ عقل سے اور دل کی جگہ دماغ سے کام لینا ضروری ہے، ورنہ ان کا حل کسی طرح بھی ممکن نہیں۔ ادب کے متعلق ان خیالات کا مدوجزر ہمیں اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ جتنے دور بھی آئے ان میں اگرچہ ان باتوں پر دل کھول کر بحث کی گئی، لیکن کہیں جذبات سے کام لیا گیا اور کہیں عقل سے! کہیں دل سے نکلی ہوئی بات کہی گئی، کہیں دماغ کی بھٹی میں پکا ہوا کوئی خیال پیش کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اختلافات رہے۔ ہیں۔ اور آئندہ بھی رہیں گے۔ البتہ ایک بات پر کم و بیش ادب کے متعلق ہر غور کرنے والا متفق معلوم ہوتا ہے۔ اور وجہ یہ ہے کہ انسانوں سے دلچسپی لینے کے نتیجے ہی میں ادب کی تخلیق ہوتی ہے۔ چاہے نظریاتی طور پر کوئی کتنا ہی ادب کو زندگی سے دور کر دینے پر ایمان رکھتا ہو۔ چاہے کسی کے نزدیک ادب کتنی ہی بے مقصد لایعنی اور بے نتیجہ چیز ہو۔ چاہے وہ ادب کی ہستی کو کتنی ہی سختی کے ساتھ صرف ادب ہی کی حیثیت سے دیکھنے کا قائل ہو۔ لیکن وہ اس حقیقت سے چشم پوشی یا انکار کی جرأت نہیں کر سکتا کہ ادب کے اندر جب تک ایک انسانی عنصر کا وجود نہ پایا جائیگا اس وقت تک کسی انسان کا اس سے دلچسپی لینا دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن اور محال ہے۔

ادب بہرحال انسانوں کے درمیان رہ کر پیش کیا جاتا ہے۔ اس لئے ادیب کا انسانوں سے دلچسپی لینا ناگزیر ہے جب وہ خود بھی ایک انسان ہے۔ اور اس کی زندگی بھی انسانوں کے درمیان بسر ہو رہی ہے۔ تو پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ اپنے اور ان کے جذبات و احساسات کے مدوجزر، حالات و واقعات کے تلاطم اور زندگی کی مختلف کروٹوں کو اپنی تخلیقات میں سمونے سے باز رہے۔ بعضوں نے تو ادب کی تعریف ہی یہ کی ہے کہ ادب ایسی تخلیقات نظم و نثر کے مجموعہ کا نام ہے جس میں عام انسانوں کی دلچسپی کی باتوں کو موضوع بنا کر پیش کیا گیا ہو۔ یہ تو گویا ادب کی پہلی اور اولین خصوصیت ہوئی۔ اس کے علاوہ اس میں فنی اور جمالیاتی خوبیاں بھی ہونی ضروری ہیں کیونکہ بغیر ان خصوصیات کے ان میں زیادہ کشش باقی نہیں رہے گی۔ اور ادب کی حیثیت سے وہ بلند مرتبہ نہیں کہلایا جا سکے گا۔ بات یہ ہے کہ ادب کا ایک بڑا مقصد عوام کے احساس جمال کی تسکین کا باعث بننا بھی ہے۔ لیکن بہرحال پہلی خصوصیت اس کیلئے بڑی ضروری اور اہم ہے۔ کیونکہ انسانوں کو بہرحال اپنی جنس یعنی انسانوں ہی سے زیادہ دلچسپی ہو سکتی ہے۔ وہ مافوق الفطرت یا مابعد الطبیعاتی چیزوں میں اتنی دلچسپی نہیں لے سکتا جتنی کہ خود اپنے آپ میں! چنانچہ اس وجہ سے اس ادب کو اچھا ادب۔ نہیں نہیں۔ بلکہ ادب ہی نہیں کہا جا سکتا جس میں انسانوں کی دیکھی بھالی، تجربہ کی ہوئی اور سوچ بچار کی ہوئی باتوں کا ذکر نہ ہو۔ یہ خیال حقیقت بن جاتا ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہر ملک، ہر قوم اور ہر زمانہ کے ادبیات میں یہ ایک خصوصیت عام طور پر مشترک پائی جاتی ہے کسی ملک اور کسی قوم کے کسی زمانے اور کسی دور کے ادب کو لے لیجئے۔ اس میں آپ کو اس قوم اور ملک کی اس وقت کی انفرادی او اجتماعی زندگی کی تصویریں بے نقاب نظر آئیں گی۔

اگر یہ ادب میں زندگی کی ترجمانی نہیں ہے۔ اگر یہ ادب کی ہم آہنگی نہیں ہے۔ اگر یہ زندگی کی عکاسی نہیں ہے تو خدارا بتائیے کہ کیا ہے؟ اگر ادب کو ان معاشی معاشرتی حالات سے علیحدہ کر کے دیکھا جائیگا تو کیا وہ ادب کو گلا گھونٹ کر موت کے گھاٹ اتار دینے کے مصداق نہیں ہوگا۔ کیا اس میں زندگی سے دور ہونے کے باعث غیر فطری ہونے کی خرابی پیدا نہیں ہو جائیگی۔ کیا اس میں بے روح ہو جانے کے باعث اثر انگیزی کے عناصر ڈھونڈنے سے بھی مل سکیں گے۔ کیا وہ کسی دوسری دنیا کی چیز نہیں معلوم ہوگا؟

جواب ان عام سوالات کا صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ اگر یہ صورت پیدا ہو تو پھر وہ ادب باقی ہی نہیں رہ سکتا۔ وہ مر جائے گا۔ اور جب وہ ادب باقی ہی نہیں رہتا تو پھر اس کے اہم اور غیر اہم ہونے کی ضرورت باقی ہی نہیں رہ جاتی۔ ادب کی تخلیق تو اس ایک بات کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوتی ہے کہ وہ ادیب کچھ کہنا چاہتا ہے خود اپنے متعلق اور اپنے جذبات و احساسات کو بیان کرنے اور ان کو دوسروں تک پہنچانے کی خواہش اس کو رہتی ہے۔ وہ دوسروں کو بھی ان کیفیات سے واقف کرانا چاہتا ہے۔ جو اس کے دل پر خارجی حالات سے ردعمل کے طور پر پیدا ہوتی ہیں۔ وہ اپنے آس پاس اور گرد و پیش کے لوگوں سے دلچسپی رکھتا ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ وہ ان کی حرکات و سکنات، حالات و واقعات اور جذبات و کیفیات کو اپنی تخلیقات کا موضوع بنا کر دوسروں تک پہنچانا چاہتا ہے۔ جس سے ایک طرف تو خود اس کو تسکین ہوتی ہے۔ اور دوسری طرف پڑھنے والوں کیلئے بھی یہ بات اچھی خاصی دلچسپی کا باعث بنتی ہے کیونکہ اپنے ہی جیسے انسانوں کے حالات کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنی ہر انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ یہی تمام باتیں ہیں جو ادب کو زندگی سے منسلک کرتی ہیں۔ اس لئے یہ بالکل طے ہوا کہ فن کار یا ادیب خواہ وہ کسی نظریئے کا قائل ہو، اپنی تخلیقات میں انسانی زندگی کے مختلف اور متنوع مسائل کو جگہ دینے سے باز نہیں رہ سکتا۔ یہی نہیں بلکہ اس کا آرٹ عبارت ہی ہوگا زندگی کے مختلف مسائل سے۔

زندگی کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک انفرادی، دوسری اجتماعی۔ اول الذکر میں وہ تمام باتیں آجاتی ہیں جن سے ایک خاص انسان بعض خاص حالات میں بعض خاص باتوں سے دوچار ہوتا رہتا ہے اور وہ صرف اسی سے متعلق ہوتی ہیں۔ اور موخر الذکر کا تعلق ان باتوں سے ہے جو نوعی، سماجی اور مجلسی زندگی سے متعلق ہوتی ہیں۔ یعنی ایک ایسا ماحول، ایک ایسی فضا جس میں ہر انسان اپنی انفرادیت کو اس اجتماعیت میں مدغم کر دینے کیلئے مجبور ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ انسانوں کے بعض مسائل انفرادی ہیں بعض اجتماعی جہاں تک اپنی ذات کا تعلق ہے وہ صرف ایک فرد ہے اور اس کے اپنے چند مسائل ہیں۔ اس کی اپنی چند الجھنیں ہیں۔ اس کی اپنی چند پریشانیاں ہیں۔ وہ ان سب سے [illegible] ہوتا ہے۔ ان سب کا تجزیہ کرتا ہے۔ ان سے بچنے، ان پر غالب آنے، ان کا کوئی مخصوص حل تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن اس کے علاوہ اس کی زندگی اجتماعی زندگی بھی ہے۔ جس میں وہ ایک بڑے حلقے اور ایک بڑے گروپ سے متعلق ہو جاتا ہے جس میں اس کو اپنی ذاتی ضروریات، الجھنوں اور پریشانیوں کے دائرے سے نکل کر ذرا بڑے پیمانے پر سوچنا پڑتا ہے۔ بڑے مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس کے انفرادی مسائل بھی اس اجتماعی ناہمواری کے باعث پیدا شدہ مختلف الجھنوں اور پریشانیوں سے تعلق پاتے ہیں کیونکہ بہرحال وہ اپنے سماج کا ایک فرد ہے۔ اور اس پر اس کے اثرات پڑنے ضروری اور لازمی ہیں۔ اب اگر وہ ان سماجی حالات سے اپنے آپ علیحدہ رکھنا چاہے تو ناممکن اور محال ہے۔ کیونکہ اس نے خود اپنے ہاتھوں سے اس سماج کو بنایا ہے۔ وہ بذاتِ خود فطرتاً ایک سماجی مخلوق ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ چند افراد کی بدمستی اور زیادتی کے باعث انھیں کے ہاتھوں تشکیل کردہ سماج کے حالات میں ناہمواری پیدا ہو جائے۔ اگر یہ ناہمواری سماجی زندگی میں پیدا ہوتی ہے تو اس کو ختم کرنے کیلئے اس کو نارمل حالت پر لانے کے لئے ایک اہم فرض کی ذمہ داری اس سماج کے ہر فرد پر ہوتی ہے کیونکہ اس میں خود اپنے نقصان اور فائدہ کا سوال ہے، خود اپنی تکلیف اور راحت کا سوال ہے۔ خود اپنی موت اور زیست کا سوال ہے۔

جب یہ صورت حال نہ ہو تو کیا سماج۔ ہر معقول اور اچھے

فرد کیلئے یہ ضروری نہیں ہو جاتا کہ وہ اپنی اجتماعی زندگی اور اجتماعی زندگی کے اثرات سے تشکیل پانے والی انفرادی زندگی اور ان کے مسائل پر گہری نظر رکھے۔ ان کے تمام نشیب و فراز سے واقف ہو۔ ان کی بیماریوں کا اس کو پورا پورا علم ہو۔ اور ان تمام باتوں کا علم رکھنے کے بعد اس کے اکثر ان تمام موضوعات کا علاج تلاش کرنیکی ایک شعوری کوشش بھی جاری رہے۔ یہ سب ضروری ہے اور ازبس ضروری!

ادیب بھی اسی سماج کا ایک معقول فرد ہوتا ہے جس کی نظر میں دوسرے افراد سے کہیں زیادہ وسعت تخیل میں کہیں زیادہ گہرائی [illegible] دریں، کہیں زیادہ بیداری اور احساس میں، کہیں زیادہ شدت پائی جاتی ہے۔ اگر وہ کسی بڑے انسان کی طرح نہیں سوچ سکتا تو سماج کے ایک عام اور معمولی فرد کی طرح تو ضرور سوچتا ہوگا۔ اور جیسے ایک عام اور معمولی فرد اپنے انفرادی اور اجتماعی مسائل کو حل کرنے کی فکر میں رہتا ہو اسی طرح کیا ممکن نہیں کہ ادیب یا فن کار کو ان باتوں کا خیال نہ رہے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر وہ ادیب تو درکنار سماج کا ایک اچھا فرد بھی نہیں بن سکتا۔ اور جب وہ سماج کا اچھا فرد بھی نہیں بن سکتا تو زندگی میں اس کی کوئی اہمیت ہو ہی نہیں سکتی۔ اس لئے ادیب کیلئے ضروری ہے کہ وہ کم از کم سماج کے ایک عام فرد کی طرح اپنے گرد و پیش اور اپنے اجتماعی اور انفرادی مسائل پر ایک نظر ضرور رکھتا ہو۔ بہرحال وہ سماج سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ وہ ان تمام حالات سے اثر قبول کرتا ہے جو سماجی زندگی میں ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ اور چونکہ وہ حالات خود اس کے اپنے ہوتے ہیں اس لئے ظاہر ہے کہ وہ ان سے منہ نہیں موڑ سکتا۔ وہ اپنے گرد و پیش اور آس پاس ہی سے اپنے موضوعات لیتا ہے۔ اس لئے ان تمام باتوں کو موضوع بنانا اس کیلئے ناگزیر ہے۔

خیر تو یہ بات طے ہو گئی کہ ادیب کی اپنے سماجی ماحول سے چشم پوشی ناممکن ہے۔ وہ اس ماحول اور اس کے مختلف [illegible] مختلف زاویوں سے دیکھتا ہے۔ وہ صرف اسی پر اکتفا نہیں کرتا کہ چونکہ اُسے اپنے ساتھ رہنے والوں سے ہمدردی ہے اس لئے صرف ان کے مختلف جذبات و احساسات کی ترجمانی کر دے۔ یا جس حالت میں وہ ہیں اس کا نقشہ ان کی آنکھوں کے سامنے کھینچ دے۔ بلکہ اس کی کوشش یہ رہتی ہے کہ ان حالات کو سامنے رکھ کر وہ چند ایسے نکتے سماج کے افراد کو سمجھائے جس سے خود ان کے اندر زندگی کے متعلق ایک شعور پیدا ہو۔ وہ خود اس کے تمام اسرار و رموز اور اس کے تمام نشیب و فراز سے واقف ہوں۔ اور اگر ان کے حالات ٹھیک نہیں ہیں، اگر ان میں ناہمواری ہے، اگر ان میں بہت سی خرابیاں پیدا ہو چکی ہیں تو ان کو بدلنے کی کوشش کریں۔ اسی پیمانے سے ادیب کی شخصیت کا پتہ لگایا جاتا ہے۔ اگر وہ کسی بھی شخصیت کا مالک ہے۔ اگر زندگی کا شعور اس میں بدرجہ اتم موجود ہے، اگر اس نے دنیا کے معاملات پر گہری نظر ڈالی ہے، اگر وہ چیزوں کے متعلق صحیح غور و فکر کر سکتا ہے تو پھر اس کیلئے ضروری ہے کہ وہ کوئی ایسی بات کہے، کوئی ایسا پیغام دے کسی ایسے خیال کا اظہار کرے جو خود اس کی ذات اور اس کی سماجی زندگی کیلئے مفید ثابت ہو۔ ورنہ اگر وہ معمولی قسم کا ادیب ہے، اگر اس میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں کم ہیں اگر وہ زندگی اور اس کے مسائل کے متعلق کوئی شعور نہیں رکھتا تو پھر اس کو معمولی شخصیت کا ادیب سمجھا جائیگا۔ وہ کوئی پیغام نہیں دے سکے گا۔ اور اس لئے اس کی حیثیت کسی سماجی اہمیت کی حامل بھی نہیں ہو سکے گی۔ لیکن ادیب اور فن کار کو اس پیغام میں اس بات کی بھی تلاش کرنے کی ضرورت ہے کہ کس حد تک اس نے اپنے سماجی ماحول سے صحت مند اثر قبول کیا ہے۔ اس کا تاثر غلط تو نہیں؟ اس کی سوچ اور تفکر نے جو راستہ بنایا ہے وہ صحیح ہے یا غلط! اگر حالات کے تیور اور شعور کی بیداری اس بات کو صحیح ثابت کر دے کہ جو کچھ ادیب کہتا ہے، جو چیز بھی اس نے پیش کی ہے وہ غیر مناسب اور غیر صحت مند نہیں ہے۔ بلکہ سماجی زندگی کیلئے مفید اور صحت بخش ہے۔ تب اس نے اپنے کام کو پوری طرح انجام دیا اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوا ورنہ نہیں۔

یہی ادب کا افادی پہلو ہے۔ اسی کو "مقصدیت" کہتے ہیں۔ اور ادب میں زندگی کی صحیح ترجمانی بھی یہی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ حالات و واقعات کے تقاضوں سے مختلف زمانوں اور مختلف اوقات میں افادیت کے تصورات بدلتے رہتے ہیں۔ اور یہ پوری طرح سماجی زندگی کی مختلف کروٹوں میں مضمر ہے۔

[illegible]

فرد کیلئے یہ ضروری نہیں ہو جاتا کہ وہ اپنی اجتماعی زندگی اور اجتماعی زندگی کے اثرات سے تشکیل پانے والی انفرادی زندگی اور ان کے مسائل پر گہری نظر رکھے۔ ان کے تمام نشیب و فراز سے واقف ہو۔ ان کی بیماریوں کا اس کو پورا پورا علم ہو۔ اور ان تمام باتوں کا علم رکھنے کے بعد اس کے ہاتھوں ان تمام موضوعات کا علاج تلاش کرنیکی ایک شعوری کوشش بھی جاری رہے۔ یہ سب ضروری ہے اور از بس ضروری!

ادیب بھی اسی سماج کا ایک معقول فرد ہوتا ہے جس کی نظر میں دوسرے افراد سے کہیں زیادہ وسعت تخیل میں کہیں زیادہ گہرائی فکر میں، کہیں زیادہ بیداری اور احساس میں، کہیں زیادہ شدت پائی جاتی ہے۔ اگر وہ کسی بڑے انسان کی طرح نہیں سوچ سکتا تو سماج کے ایک عام اور معمولی فرد کی طرح تو ضرور سوچتا ہوگا۔ اور جیسے ایک عام اور معمولی فرد اپنے انفرادی اور اجتماعی مسائل کو حل کرنے کی فکر میں رہتا ہو اسی طرح کیا ممکن نہیں کہ ادیب یا فن کار کو ان باتوں کا خیال نہ رہے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر وہ ادیب تو درکنار سماج کا ایک اچھا فرد بھی نہیں بن سکتا۔ اور جب وہ سماج کا اچھا فرد بھی نہیں بن سکتا تو زندگی میں اس کی کوئی اہمیت ہو ہی نہیں سکتی۔ اس لئے ادیب کیلئے ضروری ہے کہ وہ کم از کم سماج کے ایک عام فرد کی طرح اپنے گرد و پیش اور اپنے اجتماعی اور انفرادی مسائل پر ایک نظر ضرور رکھتا ہو۔ بہرحال وہ سماج سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ وہ ان تمام حالات سے اثر قبول کرتا ہے جو سماجی زندگی میں ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ اور چونکہ وہ حالات خود اس کے اپنے ہوتے ہیں اس لئے ظاہر ہے کہ وہ ان سے منہ نہیں موڑ سکتا۔ وہ اپنے گرد و پیش اور آس پاس ہی سے اپنے موضوعات لیتا ہے۔ اس لئے ان تمام باتوں کو موضوع بنانا اس کیلئے ناگزیر ہے۔

خیر تو یہ بات طے ہو گئی کہ ادیب کی اپنے سماجی ماحول سے چشم پوشی ناممکن ہے۔ وہ اس ماحول اور اس کے مختلف پہلوؤں کو مختلف زاویوں سے دیکھتا ہے۔ وہ صرف اسی پر اکتفا نہیں کر سکتا کہ چونکہ اُسے اپنے ساتھ رہنے والوں سے ہمدردی ہے اس لئے صرف ان کے مختلف جذبات و احساسات کی ترجمانی کر دے۔ یا جس حالت میں وہ ہیں اس کا نقشہ ان کی آنکھوں کے سامنے کھینچ دے۔ بلکہ اس کی کوشش یہ رہتی ہے کہ ان حالات کو سامنے رکھ کر وہ چند ایسے نکتے سماج کے افراد کو سمجھائے جس سے خود ان کے اندر زندگی کے متعلق ایک شعور پیدا ہو۔ وہ خود اس کے تمام اسرار و رموز اور اس کے تمام نشیب و فراز سے واقف ہوں۔ اور اگر ان کے حالات ٹھیک نہیں ہیں، اگر ان میں ناہمواری ہے، اگر ان میں بہت سی خرابیاں پیدا ہو چکی ہیں تو ان کو بدلنے کی کوشش کریں۔ اسی پیمانے سے ادیب کی شخصیت کا پتہ لگایا جاتا ہے۔ اگر وہ کسی بڑی شخصیت کا مالک ہے۔ اگر زندگی کا شعور اس میں بدرجہ اتم موجود ہے، اگر اس نے دنیا کے معاملات پر گہری نظر ڈالی ہے۔ اگر وہ چیزوں کے متعلق صحیح غور و فکر کر سکتا ہے تو پھر اس کیلئے ضروری ہے کہ وہ کوئی ایسی بات کہے، کوئی ایسا پیغام دے، کسی ایسے خیال کا اظہار کرے جو خود اس کی ذات اور اس کی سماجی زندگی کیلئے مفید ثابت ہو۔ ورنہ اگر وہ معمولی قسم کا ادیب ہے، اگر اس میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں کم ہیں اگر وہ زندگی اور اس کے مسائل کے متعلق کوئی شعور نہیں رکھتا تو پھر اس کو معمولی شخصیت کا ادیب سمجھا جائیگا۔ وہ کوئی پیغام نہیں دے سکے گا۔ اور اس لئے اس کی حیثیت کسی سماجی اہمیت کی مالک بھی نہیں ہو سکے گی۔ لیکن ادیب اور فن کار کے اس پیغام میں اس بات کی بھی تلاش کرنے کی ضرورت ہے کہ کس حد تک اس نے اپنے سماجی ماحول سے صحت مند اثر قبول کیا ہے۔ اس کا تاثر غلط تو نہیں؟ اس کی سوچ اور تفکر نے جو راستہ بنایا ہے وہ صحیح ہے یا غلط! اگر حالات کے تیور اور شعور کی بیداری اس بات کو صحیح ثابت کر دے کہ جو کچھ ادیب کہتا ہے، جو چیز بھی اس نے پیش کی ہے وہ غیر مناسب اور غیر صحت مند نہیں ہے۔ بلکہ سماجی زندگی کیلئے مفید اور صحت بخش ہے۔ تب اس نے اپنے کام کو پوری طرح انجام دیا اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوا ورنہ نہیں۔

یہی ادب کا افادی پہلو ہے۔ اسی کو "مقصدیت" کہتے ہیں۔ اور ادب میں زندگی کی صحیح ترجمانی بھی یہی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ حالات و واقعات کے تقاضوں سے مختلف زمانوں اور مختلف اوقات میں افادیت کے تصورات بدلتے رہتے ہیں۔ اور یہ پوری طرح سماجی زندگی کی مختلف کروٹوں میں منحصر ہے۔

جب سماجی زندگی میں تغیرات ہوں گے عوام کا رجحان جس طرف بھی ہوگا۔ اسی طرف ادب کو بھی اپنی باگ موڑنی پڑے گی۔ کیونکہ وہ اسی کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ اور اگر نہ چلے تو اس کو زندگی کا صحیح ترجمان نہیں کہا جا سکتا۔ یہ بات ناممکن ہے کہ اگر کسی قوم یا ملک پر کوئی بپتا پڑے کوئی مصیبت آئے تو وہاں کے ادیب رنگینیوں اور رعنائیوں کے سرور میں کھوئے ہوئے ہوں۔ ان کو اس بپتا، اس پریشانی اور اس مصیبت کو محسوس کرنا ہوگا۔ اگر وہ ایسا نہیں کریں گے اور صرف خیالی دنیا میں ہوائی باتوں کے تذکرے ہی کو اپنا مشغلہ بنا لیں گے تو ظاہر ہے کہ وہ کسی اہمیت کے مالک نہیں کہے جا سکتے۔ زمانہ ان کو بہت جلد بھلا دے گا۔ زندگی کا قانون ان کو موت کے گھاٹ اتار کر ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ابدی نیند سلا دیگا۔

آج حالات کے پیش نظر افادیت کا تصور کچھ اور ہے، کل کچھ اور تھا، اور آئندہ کون جانے کہ کیا ہوگا۔ لیکن بہر حال اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حالات و واقعات کے تقاضوں اور سماجی زندگی کی ضروریات کے پیش نظر ہی اس کی تشکیل ہوگی۔ آج انسان ہر چیز کو عقل کی روشنی میں دیکھنے اور اس کی تہ تک پہونچنے کا عادی ہو گیا ہے۔ کیونکہ زندگی نے اس کے ذہن و دماغ کو ایک خاص سانچے میں ڈھال کر زیادہ دوررس و دوربیں بنا دیا ہے۔ وہ اب سطحی باتوں پر نظر نہیں ڈالتا۔ کل اس کی یہ حالت نہ تھی۔ آج سے صدیوں پہلے اگر ہم اس زمانہ پر نظر ڈالیں جب انسان اس دنیا میں بالکل نووارد تھا اور اس کی زندگی اپنے بچپن کی ابتدائی منزلیں طے کر رہی تھی، اس وقت اس کے شعور میں بیداری اور عقل میں روشنی کی فراوانی نہیں تھی۔ ہیئت اجتماعی، نظام تمدنی اور سماجی زندگی کا کوئی تصور اس کے سامنے نہیں تھا۔ وہ جذبات کا پتلا تھا۔ زمانے کی کائنات کی ہر چیز تک اس کی پہونچ جذبات ہی کے سہارے ہوتی تھی۔ وہ ہر چیز کے متعلق ایک خاص خیال قائم کر لیا کرتا تھا۔ جس کو عقل و شعور سے کوئی واسطہ نہیں۔ چنانچہ اس وقت کی ادبی تخلیقات میں بھی اس کی طبیعت کا یہی رجحان پوری طرح نمایاں نظر آتا ہے۔ اس میں افادیت کا تصور ظاہر ہے کہ وہ نہیں ہو سکتا تھا جو آج واقعات و حالات کی مختلف کروٹوں نے پیدا کر دیا ہے۔ اس زمانہ میں انسان کے شعور میں بیداری نہیں تھی۔ عقل میں زیادتی نہیں تھی۔ تخیل میں بلند پروازی نہیں تھی۔ نظر میں وسعت اور گہرائی نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر چیز تک جذبات کے سہارے پہنچتا تھا۔ وہ جو کچھ محسوس کرتا تھا۔ خارجی حالات اس کے دل پر جیسا بھی اثر ڈالتے تھے وہ ان پر بغیر کسی غور و فکر کے کسی خیال کا اظہار کر دیا کرتا تھا۔ پھر ان خیالات کے اظہار، ان جذبات و احساسات کے بیان میں سطحیت ہونی ضروری تھی۔ کیونکہ اس کا ذہن و دماغ اس میں سوچ اور تفکر کے عنصر کو پیدا کرنے کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ بات یہ تھی کہ اس وقت حالات ہی کچھ ایسے تھے۔ انسان نے دنیا کی تمام باتوں کے متعلق اور کائنات کی تمام چیزوں کے متعلق کچھ بھی غور نہیں کیا تھا۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ صرف جذباتیت ہی پنپ سکتی اور پروان چڑھ سکتی تھی۔ چنانچہ انسانیت کی اس وقت کی حالت جب وہ کلچر اور تہذیب سے روشناس نہیں ہوئی تھی ہمیں بتاتی ہے کہ اس وقت خیالات میں سطحیت اور سوچ میں جذبات کو زیادہ دخل تھا۔ پھر اس وقت کے مسائل بھی کچھ ایسے زیادہ پیچیدہ نہیں تھے۔ کیونکہ سماجی زندگی اس وقت تک شروع ہی نہیں ہوئی تھی۔ اس وقت کا ادب جو آج مختلف گیتوں وغیرہ کے روپ میں ہمارے سامنے ہے اس کو دیکھنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بھی اپنے زمانے کا پوری طرح ترجمان ہے۔ اس میں چند سطحی باتوں کا بیان ہے۔ چند جذباتی باتوں کا تذکرہ ہے۔ اس میں کسی افادی پہلو کا پتہ نہیں۔ کیونکہ اس وقت خود زندگی میں افادیت کا کوئی پہلو پیدا نہیں ہوا تھا۔ اور جب زندگی میں افادیت کے تصور کا پتہ نہیں تھا تو پھر بھلا ادب میں اس کے اثرات کیسے آ سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ یا تو جنسی جذبات کی مختلف کیفیات کے سطحی بیان پر مشتمل ہیں یا پھر حسن فطرت کی تصویر کشی تک محدود ہیں۔ جنھوں نے اپنے عجیب ہونے کی وجہ سے اس کو حیران کر دیا تھا۔ لیکن انسانی زندگی جامد اور غیر متحرک نہیں تھی۔ اس لئے وہ شروع دن ہی سے ارتقاء کے راستے پر برابر آگے بڑھتی رہی۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ انسان کی سوچ اور تفکر بھی اپنے پاؤں پھیلانے لگا۔ حسن فطرت کے متعلق اس نے یہ سوچا کہ یہ آخر ہے کیا۔ یہ کیسا کارخانہ ہے۔ ان سب کے وجود میں آنے کا کیا مقصد ہے۔ زندگی میں وہ کس اہمیت کے مالک ہیں۔ یہ اور اسی طرح کے سوالات کی لہریں اس کے ذہن اور دماغ میں اٹھنے لگیں۔ دوسرے لفظوں میں اس کے دھیان میں ان باتوں کا شعور پیدا ہوتا گیا۔ اس نے سوچا کہ یہ سب چیزیں بہت عجیب ہیں۔ اس لئے ہو نہ ہو ان کی حیثیت ماورائی اور

مابعد الطبیعاتی ہے۔ چنانچہ اس نے ان سب کو مختلف دیوتا بنادیا۔ اور وہ ان کے گن گانے لگا۔ جس میں ان کی اہمیت کو عوام کے ذہن نشین کرنے، اس کو صحیح ثابت کرنے اور یقین دلانے کا ایک شعوری احساس کار فرما تھا۔ اس طرح اس ادب کی پیدائش ظہور میں آئی۔ جس میں فن اور حسن لسانی حسن کے ساتھ ساتھ عوام کو اس طرف راغب کرنے کی افادی جھلک موجود تھی۔ ویدوں کے اشلوک، ژند و اوستا اور اسی طرح کی دوسری مذہبی کتابوں میں سموئے خیالات اس طرح کے ادب میں شامل ہوتے ہیں۔ ان سب میں افادیت کا پہلو موجود ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ وہ بلا کے خوبصورت بھی ہیں۔

اس کے بعد دنیا اور آگے بڑھی۔ مذہب کا چراغ روشن ہوا ہر شخص اس کے رنگ میں رنگ گیا۔ پروہتوں اور پجاریوں کی بن آئی۔ مہاتما اور سادھو، خدا رسیدہ اور پہنچے ہوئے لوگ پیدا ہونے لگے۔ این جناب اور آنجناب کا ظہور ہوتا رہا۔ جو ایک زمانے تک عوام کے اذہان پر حکمرانی کرتے رہے۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں انھوں نے ان کو ڈھب میں ڈال کر اپنا الو خوب سیدھا کیا۔ اس کے اثرات ادب میں بھی دیکھئے۔ برابر ملتے ہیں۔ ایک زمانہ تک انھیں مذہبی خیالات اور نظریات کا سہ چار ہوتا رہا۔ جس میں اگر ہم اپنے نقطۂ نظر سے افادیت نہ بھی مانیں لیکن اس بات کا ایک شعوری احساس ضرور ملے گا کہ ادب کے ذریعہ سے ان کو پھیلانے کی ایک کوشش کی جارہی تھی۔ پروہتوں، پجاریوں اور مذہبی لوگوں کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اس وقت بھی ادب نے اپنے دامن میں افادیت کو جگہ دی۔ انھوں نے بہت کچھ اس سے کام بھی لیا۔ اور ان کو اپنے مقصد میں کامیابی بھی خاصی ہوئی لوگوں کے دلوں میں مذہب نے گھر کر لیا۔ ہر شخص خدا پرستی کے نشے سے سرشار نظر آنے لگا۔ وہ ماورائی اور مابعد الطبیعاتی باتوں کو صحیح سمجھے۔ اور ان پر یقین رکھنا ان کا ایمان بن گیا۔ اس کام میں ادب کا اچھا خاصہ حصہ ہے۔ اور اس قسم کے ادب کی مثالیں دنیا کے مختلف ممالک کے ادبیات کے ابتدائی ادوار میں بہت کافی ملتی ہیں۔ جس کا سلسلہ آگے چل کر جاگیردارانہ اور سامنتی دور سے مل جاتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان لوگوں نے ادب کو کسی اچھے کام کیلئے استعمال نہیں کیا لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ادب میں وہ خیالات سموئے گئے اور عوام پر اثر انداز ہوئے۔

جاگیردارانہ اور سامنتی دور بھی اسی کے ساتھ ساتھ چلا۔ جب انسان کے دل میں ایک دوسرے پر قابض ہونے، حکومت کرنے اور لوٹ مار مچانے کا خیال پیدا ہوا تو ہوس ملک گیری بڑھی۔ انسان ہنگامے برپا کرنے لگے۔ جس کے نتیجے میں بڑی بڑی لڑائیاں ہوئیں۔ چند مٹھی بھر انسانوں نے اپنے ذاتی مفاد کے پیش نظر ہر زمانہ میں ان گنت انسانوں کا خون بہایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ حاکم ہو گئے کچھ محکوم۔ اور جب محکوم نے حاکم بننے کی کوشش کی، یا کسی ایک حاکم نے دوسرے کو محکوم بنانے کا ارادہ کیا تو جدال و پیکار کا بازار گرم ہوا۔ ہنگامے ہوئے مصیبتیں آئیں۔ خونریزیاں ہوئیں اور ساری دنیا ایک آماجگاہ شر و فساد بن گئی۔ ان حالات کے اثرات بھی ادبیات پر پڑے۔ جو ہنگامہ اور شر و فساد برپا کرنے والوں نے اس کو اپنایا۔ اور اس سے کام لینے کی کوشش کی۔ ماحول انھوں نے پیدا کر ہی دیا تھا۔ چنانچہ ادیبوں کے لئے ان میں سے کسی ایک کا ساتھ دینا ناگزیر تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنی تخلیقات کو ان ہنگاموں اور شر و فساد کی داستانوں کیلئے استعمال کرنے لگے۔ شاعری میں بڑی بڑی لڑائیوں کا ذکر کیا گیا۔ جس میں کسی نہ کسی کے ساتھ دینے پر آمادہ کرنے کی ایک شعوری کوشش موجود تھی۔ اور ان کے خیال میں اپنے نظریات فکر کے مطابق یہی سب سے بڑی افادیت تھی۔ کیونکہ اسی طرح سوچتے تھے۔ انھوں نے اچھائی برائی کے تصورات کو انھیں لڑائیوں اور ہنگاموں کی شرکت اور علیحدگی تک محدود کر لیا تھا۔ ممکن ہے کہ بعضوں کے نقطۂ نظر سے اس دور کے ادیبوں کی حرکات لائق تحسین نہ ہوں۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس وقت بھی ادب میں اس وقت کے اپنے انداز تفکر کے اعتبار سے ادیبوں نے ایک افادی پہلو کو پیدا کرنے کی کوشش کی۔ دوسری طرف اسی سامنتی اور جاگیردارانہ نظام نے ایک ایسے ادب کی تخلیق کیلئے بھی زمین تیار کی جس میں ذہنی عیاشی کو زیادہ دخل تھا یعنی ادب کو ان کی تفریح طبع اور لطف اندوزی کا ذریعہ بھی بنایا گیا۔ بات یہ تھی کہ یہ جاگیردار وقت کے ساتھ ساتھ اپنے اپنے حالات و واقعات کے تقاضوں سے زیادہ عیش پسند ہوتے جارہے تھے۔ اور ہر چیز میں وہ اپنی ذہنی عیاشی کا سامان پیدا کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ جہاں انھوں نے اور چیزوں کو عیاشی کیلئے استعمال کیا، وہاں ادب کو بھی اس کا آلۂ کار بنایا۔ ادبی تخلیقات تفریح طبع کی چیز سمجھی جانے لگیں۔ لیکن اس ادب کا بھی مقصد تھا۔ اس کو بھی صرف برائے ادب نہیں کہا جاسکتا۔ کیونکہ تفریح حاصل کرنا لطف اندوزی اور تعیش پرستی بذات خود مقصد ہے۔ ہر چند وہ ہماری نظروں میں پسندیدہ نہ سہی، بہرحال اس زمانہ میں ادب کے یہ دو پہلو نمایاں

رہے۔ اور دونوں کو دیکھنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اس کے تخلیق کرنے والوں نے اپنے خیالات و نظریات کے پیش نظر اس میں افادیت کا رنگ دینے اور مقصدیت سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔

یہ زمانہ بھی ہمیشہ باقی رہنے والا نہ تھا۔ حالات برابر بدل رہے تھے۔ جس کے نتیجے میں جاگیردارانہ دَور ایک سرمایہ دارانہ نظام میں تبدیل ہوتا جا رہا تھا۔ صنعتی انقلاب نے ساری دُنیا کی صورت بدل دی تھی۔ انسانوں کے مسائل اب پھیل اور بڑھ رہے تھے جس کی وجہ سے انھوں نے بالکل ایک نیا روپ دھار لیا تھا۔ عوام اب سوچنے سمجھنے لگے۔ جاگیردارانہ اور سامنتی دَور نے جس سختی سے ان کو دبایا تھا اسی سختی سے وہ اب اٹھنا چاہتے تھے۔ انھیں اب اپنے مسائل کو سمجھنے کی تمنا تھی۔ اور ان کو یہ احساس بھی ہو چلا تھا کہ انسان کو انسان کا محکوم اور دست نگر نہیں رہنا چاہیئے۔ جب دلوں کے اندر یہ بات بیٹھ گئی تو اس نے اس پامالی، بے حسی اور افتادگی کو متزلزل کر دیا۔ جو جاگیردارانہ اور سامنتی دور میں ساری دُنیا کے انسانوں پر مسلط تھی چنانچہ سماج کے افراد کے اندر اب ایک جارحانہ انداز پیدا ہوا۔ ایک بپھری ہوئی کیفیت نظر آئی جس کے نتیجہ میں جاگیرداری اور سامنتت کال کی عمارت ہلنے لگی۔ اس کے اثرات ادب پر بھی پڑے۔ چنانچہ ادب میں بھی یہی ایک جارحانہ انداز، یہی ایک محدود دائرے سے نکل کر اس کو ختم کر دینے کی خواہش نظر آئی۔ سوچ اور تفکر کا عنصر اس میں گھر کرنے لگا۔ ادبی تخلیقات میں انسانوں کی زبوں حالی، کس مپرسی اور بے بسی کی تصویریں بنائی جانے لگیں۔ مختلف ممالک کی سیاسی زندگی میں انقلاب کے نعرے بلند ہونے لگے۔ مروّجہ سماجی، اقتصادی اور معاشی نظاموں کو درہم برہم کر دینے کا خیال پیدا ہوا۔ ادب بھی ان سے اپنا دامن نہ بچا سکا۔ بلکہ ان حالات کو پیدا کرنے میں تو ادب نے بڑا کام کیا۔ مختلف ممالک کے مختلف ادیبوں نے نہ صرف ان خیالات کو اپنی تخلیقات میں جگہ دی بلکہ ان کے ذریعے ان خیالات کا پرچار کرنے کی کوشش کی۔ اور ادبی تاریخ پر ایک نظر ڈالنے کے بعد اس حقیقت کا اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے عوام کے اندر اس شعور کی بیداری میں بڑا حصّہ لیا۔ جس کی وجہ سے عوام کے قدم ترقی کے راستے پر زیادہ تیزی سے آگے کی طرف بڑھنے لگے۔ انقلاب فرانس کے زمانہ کا ادب اور اسی طرح دوسرے ممالک کے اس قسم کے ادبیات کو دیکھ کر کون ہو گا جو یہ ماننے کیلئے تیار نہ ہو کہ انھوں نے سماج کے افراد کی بیداری میں کوئی نمایاں حصہ نہیں لیا۔ بہرحال اس زمانہ میں بھی ادیبوں نے کچھ کہنے کی کوشش نہ کی ہو۔ کوئی پیغام دینے کا احساس پیدا کیا گیا یہ ادب میں افادیت کی جھلکیاں نہیں تھیں۔ ان تمام باتوں کو مقصدیت سے کوئی تعلق نہیں تھا؟

انسانیت کے اس تاریخی ارتقا پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کم و بیش ہر دور میں افادیت اپنے اپنے وقت، ماحول، نظریات اور انداز تفکر کے اعتبار سے ادبیات سے ہم آہنگ رہی۔ البتہ افادیت کے تصورات بدلتے رہے۔ ایک زمانہ میں ماورائی اور مابعد الطبیعاتی چیزوں میں یقین رکھنے اور ان پر ایمان لانے کا پرچار کیا گیا۔ دوسرے زمانہ میں جاگیرداروں اور سامنتیوں کے گُن گائے گئے۔ اور گُن گا کر عوام کو ان کا غلام بنانے کی کوشش کی گئی۔ اور ہوس ملک گیری کی خاطر لڑائیاں ہوئیں۔ جن کے بیانات ادبیات میں کئے گئے۔ پھر ایک زمانہ اور آیا جب اس نظام کو انسانیت کیلئے لعنت سمجھا گیا۔ عوام میں ایک سیاسی، معاشی اور اقتصادی شعور پیدا ہوا۔ جس کے نتیجے میں اس دور کا ادب بھی ایک انقلابی رنگ میں رنگ گیا۔

آج زمانہ اس سے بھی دو چار قدم آگے بڑھ چکا ہے۔ چنانچہ آج افادیت کے تقاضے بھی کچھ اور ہیں۔ صنعتی انقلاب نے سرمایہ و محنت کی کش مکش کو ساری دُنیا کیلئے ایک بہت بڑا مسئلہ بنا دیا ہے۔ مزدور پامال ہے۔ سرمایہ دار اس کا خون چوسنے میں مشغول ہے۔ آج غلط تقسیم کے باعث نوع انسانی کیلئے مصیبت کا باعث بن رہی ہے۔ اس سے عوام کو آرام ملنے کے بجائے نقصان پہونچ رہا ہے یہ کتنا بڑا تضاد ہے۔ ظاہر ہے کہ زندگی کی اس تضادی کیفیت میں ترقی کرنی مشکل ہی نہیں بلکہ محال ہے۔ ہمارے مروجہ نظام کا یہ تضاد تو خود کسی تیسرے نظام کو جنم دینے کی گواہی دے رہا ہے۔ کیونکہ زندگی اس عالم میں ہمیشہ رہ نہیں سکتی۔ ان متضاد عناصر کا خود بخود اندر ہی اندر برسر پیکار ہونا لازمی ہے جس کے نتیجے میں ایک نئی زندگی، ایک نیا نظام، ایک نئے عالم کا پیدا ہونا بھی ناگزیر ہے یہی زندگی کی جدلیاتی کیفیت ہے۔ یہی جدلیات کا فلسفہ ہے جو انقلاب کو لاتا ہے۔ بشرطیکہ اس میں انسانوں کی شعوری کوششیں بھی شامل ہوں۔ اور یہ ماحول اور سرمایہ و محنت کی کش مکش، یہ ہنگامہ، یہ پریشانی، یہ انتشار، یہ کس مپرسی، یہ زبوں حالی کسی اصلاح اور ریفارم سے ختم نہیں ہو سکتے۔ ان کے درختوں کو تو جڑ سے اکھاڑ کر پھینکنے کی ضرورت ہے۔ جو بغیر ایک انقلاب کے سیلاب کے ناممکن ہے۔ اس لئے دُنیا میں سماجی اقدار کی ناہموار کیفیت کو درست

کرنے کیلئے ایک انقلابی رجحان پیدا کرنا ازبس ضروری ہے۔

اس انقلابی رجحان کے پیدا کرنے کیلئے ظاہر ہے کہ ہر کوشش کو انفرادی بنانے کے بجائے اجتماعی بنانا پڑے گا۔ کسانوں مزدوروں محنت کشوں اور دوسرے پامال طبقوں کو اپنے ساتھ لیکر چلنا ہوگا۔ ورنہ تہذیب و تمدن، ہیئت اجتماعی، سماجی زندگی اور کلچر کی ترقی کو لئے نظام اقدار میں ایک انقلاب کے بعد ہموار ہی پیدا کرنا مشکل ہے۔ چنانچہ آج کا سب سے بڑا ضروری اور اہم کام یہ ہے کہ ان بکھری ہوئی اور انفرادی قوتوں کو ایک اجتماعیت کی لڑی میں پرو دیا جائے۔ تاکہ وہ اس انتشاری اور ہنگامی دور کو ختم کرنے کے لئے زندگی کی جدلیاتی رفتار سے ہم آہنگ ہوں۔ اور ان کی کوششوں سے ایک نئے نظام اور ایک نئی زندگی کا آفتاب طلوع ہو سکے۔ انھیں حالات نے بہت سے ایسے نظریات فکر کو جنم دیا ہے۔ جن میں سے بعض دنیا کی بہتری کیلئے ہیں بعض تباہی و بربادی کیلئے۔ بعض اچھائی کے لئے ہیں اور بعض برائی کیلئے۔ اور وہ سب کے سب ایک دوسرے سے برسرپیکار ہیں۔ کیونکہ خود زندگی میں سکون نہیں۔ اور خود زندگی کے مسائل ایک دوسرے سے دست و گریباں ہیں۔

ادب بھی بہرحال اپنے وقت کی سماجی زندگی کی پیداوار ہوا کرتا ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ وہ ان موجودہ حالات اور موجودہ سماجی ماحول کے پیچیدہ اہم اور ضروری مسائل سے اپنا دامن نہیں بچا سکتا۔ اس کیلئے موجودہ حالات میں ناگزیر ہے کہ سرمایہ و محنت کی کشمکش سے چشم پوشی اختیار کرے۔ اس کیلئے ناگزیر ہے کہ وہ غریبوں، مزدوروں، کسانوں، اور محنت کشوں کو جبر و استبداد کے پیروں تلے تڑپتا اور تلملاتا ہوا دیکھے اور خاموش رہے۔ اور خاموش ہی نہ رہے بلکہ سرور و سرخوشی، عیش و مسرت اور راحت و آرام کے گیت گائے۔ آج حالات کا تقاضہ یہ ہے کہ ادیب ان تمام حالات کو اپنی تخلیقات کا موضوع بنائے۔ اس کو احساس ہو کہ زندگی ایک جدلیاتی حقیقت ہے۔ اور اس میں تضاد کی کیفیت ایک نئے نظام، ایک نئی دنیا اور ایک نئے ماحول کو جنم دیتی ہے۔ تغیر اور انقلاب کے جراثیم خود اس کے وجود میں موجود ہیں۔ اور پھر زندگی کی تضادی کیفیت اس وقت انتہا کو پہنچ گئی ہے۔ جو اس بات کی متقاضی ہے کہ کوئی زبردست سماجی انقلاب ظہور میں آئے۔ اس انقلاب کی رفتار سماج کے افراد کی شعوری کوششوں سے زیادہ تیز ہو جاتی ہے۔ اس لئے آج کے ادیب کا فرض ہے کہ وہ ان حقیقتوں کے پیش نظر شعوری طور پر اس انقلاب کو لانے میں اپنی تخلیقی کوششوں اور صلاحیتوں کو بروئے کار لائے۔

ادیب کو انفرادیت کے محدود دائرے سے نکل کر اجتماعیت کی کھلی ہوئی فضا میں آنا پڑے گا۔ داخلیت کی جگہ خارجیت کو دینی ہوگی عوام کو اپنے ساتھ لیکر چلنا ہوگا۔ غرض یہ کہ اگر وہ اپنی تخلیقات میں ایک اجتماعی شعور کو پیدا نہیں کرے گا اس وقت تک یہ تمام معاملات کسی صورت سے بھی پیدا نہیں ہو سکتے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس کو ایک افادی اور پرولتاری ادب پیدا کرنا ہوگا جس میں آج کی زندگی کے بنیادی مسائل سموئے ہوئے ہوں۔ اور ساتھ ہی ساتھ جس میں ان مسائل کی گتھیوں کو سلجھانے کا ایک شعوری احساس بھی کارفرما ہو۔

یہ مسائل ظاہر ہے کہ اقتصادی ہیں اس لئے ادبیات میں معاشیات و اقتصادیات کی موشگافیوں کو جگہ دینی پڑے گی۔ معاشیات اور اقتصادیات میں آج ساری انسانی زندگی الجھی ہوئی ہے۔ حالات بے انتہا پیچیدہ ہو چکے ہیں۔ کوئی فرد بھی ان سے الگ رہکر زندہ نہیں رہ سکتا۔ ورنہ اس کی اجتماعی زندگی اور ساتھ ہی ساتھ انفرادی زندگی بہت سی الجھنوں کا شکار ہو جائے گی۔ اور وہ سماج کے درمیان کسی اہمیت کا مالک نہیں سمجھا جائیگا۔ یہ معاشی اور اقتصادی مسائل یوں تو ہر زمانے اور ہر دور میں زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں اور ان کی اہمیت کو سمجھا گیا ہے۔ لیکن آج سوچ اور تفکر کی نئی راہوں نے چونکہ ان کو ایک انقلابی رنگ دیدیا ہے۔ اس لئے ان کی اہمیت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ اس لئے آج زندگی میں ان کی اہمیت اور ضرورت کو محسوس کیا جا رہا ہے۔ ادبیات میں اسی وجہ سے ان کی ایک خاص جگہ ہے۔ ادیب اس وجہ سے ان کو اپنی تخلیقات میں سمو رہے ہیں تاکہ وہ وقت کی ضرورت کو پورا کر سکیں۔ اور زندگی کی جیتی جاگتی اور چلتی پھرتی تصویریں ان کے ہاتھوں پیش ہوں۔ انسانوں کے دوسرے جذبات و احساسات اور زندگی کے دوسرے موضوعات ان مسائل کے سامنے اس وقت زیادہ اہمیت نہیں رکھتے چنانچہ وہ پس منظر میں جا پڑے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا تذکرہ ادب میں بھی کم کیا جا رہا ہے۔ اور کم کرنا چاہئے۔ کیونکہ آج ادیبوں کے پیش نظر زیادہ اہم اور زیادہ ضروری یہ اقتصادی اور معاشی مسائل ہیں۔ انسان کے دوسرے جذبات و احساسات بھی انھیں معاشی اور اقتصادی مسائل کے زیر اثر ہی تشکیل پاتے ہیں۔ اس لئے

آج کا احساس ادیب ان کی ناہموار کیفیت کو اس وجہ سے بھی درست کرنے اور درست کرنے کا پیام دینے کو اپنا ضروری فرض سمجھتا ہے کیونکہ اس ماحول میں جو وہ پیدا کرنا چاہتا ہے یہ جذبات و احساسات بھی زیادہ صحت مند اور صحت بخش صورت اختیار کریں گے۔ اور اس وقت گویا ان کو مثالیت سے ہمکنار ہونے کا شرف حاصل ہو سکے گا۔ بہرحال آج ان اقتصادی اور معاشی مسائل کی اہمیت ہماری سماجی زندگی میں وہی ہے جو کسی زمانہ میں مذہبیات و اخلاقیات کی مختلف اقدار کو حاصل تھی۔ اور جس کا پرچار ادیب کیا کرتے تھے۔ اُس وقت ادب کا افادی پہلو وہ تھا آج یہ ہے اور کل جب حالات سُدھر جائیں گے تو ادب کا افادی پہلو کوئی اور روپ اختیار کرے گا۔ البتہ بعض لوگوں کو ادب کے اس افادی رجحان سے ممکن ہے کہ دلچسپی نہ ہو اور وہ اس کو غیر ضروری خیال کرتے ہوں۔ لیکن یہ وہی لوگ ہو سکتے ہیں جن کو حالات و واقعات کی کروٹوں سے آگاہی نہیں۔

عوام کو اقتصادی اور معاشی اعتبار سے بلند کر دینے کے خیال ہی نے ادب کے اندر سیاسیات کے افادی رجحان کو پیدا کیا ہے۔ بات یہ ہے کہ کسی بھی اقتصادی اور معاشی نظام کا چراغ اس وقت تک روشن نہیں کیا جا سکتا جب تک سیاسیات کے راستے سے نہ گزرا جائے۔ چنانچہ آج ساری انسانی زندگی معاشیات اور اقتصادیات کے ساتھ ساتھ سیاسیات میں بھی اُلجھی ہوئی ہے انسان صبح و شام سیاسی ہنگامے دیکھ رہا ہے۔ اس کے آس پاس سیاسی انقلابات ہو رہے ہیں۔ خود اس کے مزاج میں انقلاب ہے۔ ذہنی کیفیات میں انقلاب ہے۔ افتادِ طبع میں انقلاب ہے۔ غرض یہ کہ سیاسی اعتبار سے وہ ایک بدلتی ہوئی دُنیا اور انقلابات سے ایک ہم آغوش و ہمکنار فضا میں سانس لے رہا ہے۔ چنانچہ اس انقلاب میں شریک ہونے کے خیال اور اپنے نظریات فکر کو عام کرنے کی جستجو نے اس کو سیاست میں قدم رکھنے کیلئے مجبور کر دیا ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ اس کی تخلیقات میں سیاسی رنگ ہونا چاہیئے۔ آج سے قبل بھی سیاسی رجحان کا پتہ ادبیات میں چلتا ہے۔ لیکن یہ کیفیت اس کے اندر موجود نہیں تھی۔ آج کا سا انہماک، آج کا سا جوش، آج کی سی تندی اور تیزی کا اس زمانہ میں پتہ نہیں چلتا۔ پچھلی جنگ عظیم سے قبل کے ادیب اور شاعر سیاست سے زیادہ فلسفہ اور مابعد الطبیعیات پر غور کرنا بہتر خیال کرتے تھے۔ غرض یہ ہے کہ وہ سیاسیات کو زندگی میں کوئی اہمیت ہی نہیں دیتے تھے۔ ان کے نزدیک سیاست ایک خاص طبقے کی چیز تھی جس کو عوام سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ لیکن آج سیاست میں حصہ لے کر طاقت کو حاصل کرنا بہت ہی ضروری ہو جانا چاہیئے۔ آج سیاست ایک خاص طبقے کی چیز نہیں رہ گئی ہے۔ آج سیاست عوام کی سیاست ہے۔ اور سیاسی طاقت کا عوام کیلئے حاصل کرنا آج وقت کا سب سے بڑا ضروری اور اہم مسئلہ ہے۔ کیونکہ بغیر اس کے انسانیت امن و سکون اور سرور و مسرت سے ہمکنار نہیں ہو سکتی۔ اس لئے آج کا ادیب سیاست میں حصہ لینے کیلئے مجبور ہو جاتا ہے۔ لوئی میکینس نے لکھا ہے کہ آجکل کی دُنیا میں جو لوگ سیاسیات سے نفرت کرنے کے عادی ہو چکے ہیں ان کے ذاتی مفاد بھی اس وقت تک محفوظ نہیں جب تک وہ ایک معقول صحت مند اور صحت بخش سیاسی نظام کو رواج دینے میں انفرادی اور اجتماعی کوششوں سے کام نہ لیں۔

آج کئی نظریات فکر کی آویزش پوری شدت کے ساتھ جاری ہے۔ اس لئے جب تک ان سب کے نشیب و فراز پر گہری نظر نہ ڈال لی جائے اس وقت تک گوہر مقصود ہاتھ نہیں لگ سکتا۔ یعنی کسی سائنٹیفک اور صحیح نظام سیاسی کو اپنانے کے لئے موجودہ نظریات فکر کے جنگل میں کافی کاوش اور تلاش کی ضرورت ہے۔ آج جمہوریت، فاشیت اور اشتراکیت و اشتمالیت ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہیں۔ فاشیت جس نے پچھلی جنگ عظیم کے بعد سرمایہ دارانہ آمریت کی بدترین شکل اختیار کر لی تھی آج قریب قریب موت کی نیند سو چکی ہے اور جمہوریت جو دیواستبداد کے علاوہ کوئی اور دوسری چیز نہیں دُنیا پر حکمراں ہو چکی ہے۔ لیکن کیا اس میں جمہوریت کی کہیں شکل بھی دکھائی دیتی ہے۔ کیا ان اصولوں میں دور تک بھی کہیں جمہوری اصولوں کا پتہ چلتا ہے۔ جمہوریت آج سرمایہ دارانہ آمریت کا روپ دھار کر اپنے آپ کو فاشیت کی بدترین صورت میں پیش کر رہی ہے۔

ایسی صورت میں موجودہ نظریات افکار میں سے ظاہر ہے کہ ایک ایسے ہی نظریئے کو اپنایا جا سکتا ہے جو ان تمام ہنگاموں کو ختم کرنے کیلئے تیار ہو۔ جو اپنے افعال و اقوال سے اس بات کو ثابت کر چکا ہو کہ وہ دُنیا میں انسانیت کی پریشانیوں اور زبوں حالیوں کا مداوا چاہتا ہے۔ جس نے اپنی تعمیری کوششوں سے

دُنیا کے ایک حصّے کو فردوسِ ارضی کا نمونہ بنا دیا ہو۔ جس نے انسانوں کے اندر ارتقا کے راستے پر گامزن ہونے کیلئے ایک نیا ولولہ، ایک نئی امنگ اور ایک نیا جوش پیدا کر دیا ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ نظام صرف اشتراکی اور اشتمالی نظام ہے۔

ادیب بھی اس حقیقت سے واقف ہے، اور چونکہ آج دُنیا کا سب سے بڑا مسئلہ انسانیت کیلئے یہی ہے کہ موجودہ نظریاتِ فکر کی آویزش، ہنگاموں، پریشانیوں اور انتشار کو ختم کرنے کیلئے کسی ایک معقول اور سائنٹیفک نظام کو اپنائے۔ اس لئے ادیب بھی ان مسائل کی اہمیت کو محسوس کر رہے ہیں۔ اور ان کو کرنا چاہئے کیونکہ آج زندگی کے سب سے زیادہ ضروری، اہم اور بنیادی مسائل یہی ہیں۔ چنانچہ ان کی تخلیقات میں موجودہ نظریاتِ فکر کی آویزش انسانیت کی زبوں حالی اور اشتراکیت و اشتمالیت کے نظریۂ فکر کے اثرات ملتے ہیں۔

ادیب سکون کا متلاشی ہوتا ہے۔ اور جب اس کے سکون میسّر آنے کی راہ میں کوئی چیز حائل ہو تو وہ اس کو موت کے گھاٹ اتارنے سے باز نہیں رہ سکتا۔ چاہے اپنی اس کوشش میں اُسے اپنے فن کو نیچے ہی کیوں نہ لانا پڑے۔ آج بھی یہی حال ہے باشعور اور سمجھدار ادیب اشتراکیت کے پرچار میں مشغول ہیں کیونکہ یہ وقت کا تقاضہ ہے۔ ماحول کی پکار ہے۔ البتہ اس میں شک نہیں کہ اشتراکیت کے زیر اثر اب تک ادبی تخلیقات کم ہی پیش کی جاسکی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی زیادہ تر توجہ اپنے مقصد کی طرف ہوتی ہے۔ فنی اور جمالیاتی خوبیوں کو پیدا کرنے کا احساس اس کے نیچے دب جاتا ہے۔ سیاسی اور معاشی اقتدار کے حاصل کرنے کا خیال ان کی نظروں سے کسی حال میں بھی اوجھل نہیں ہوتا۔ پھر چونکہ ان کی نظروں میں دُنیا کی کوئی غیر متلاطم، غیر سکون یافتہ اور غیر انقلابی شکل نہیں ہوتی۔ اور چونکہ ان کے ذہن میں زندگی ہر آن اور ہر لمحہ رنگ بدلتی رہتی ہے اس لئے ان کو کوئی ایسا ماحول نصیب نہیں ہوتا جو کسی بڑے ادبی تخلیقی کارنامہ کو پیدا کرنے کیلئے زمین تیار کرسکے۔ ان کے خیال میں تخلیق کیلئے سماجی نظام میں سکون اور خوشحالی کی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں سے اکثر بعض اوقات ادب کو چھوڑ کر عملی سیاست میں حصہ لینے لگتے ہیں۔ کوئی کسی جنگ میں مارا جاتا ہے کسی کی شمع حیات عوام کے حقوق کی حفاظت کیلئے لڑتے ہوئے گُل ہو جاتی ہے۔ بہر حال یہ ایک آدرش ہے اور بہت بلند آدرش! کیونکہ اس سے آئندہ بڑے تخلیقی کارناموں کیلئے ایک مناسب فضا اور ایک مناسب ماحول پیدا ہو جانے کے امکانات ہیں۔

ایک سوال یہاں یہ پیدا ہوتا ہے کہ آج سے قبل ادب میں افادیت کے یہ رجحانات کیوں پیدا نہیں ہوئے۔ آج سے قبل ادب نے اشتراکیت اور اس کے اصولوں کو اپنے دامن میں جگہ کیوں نہیں دی۔ بات یہ ہے کہ آج سے قبل ادیبوں کے شعور میں وہ بیداری نہیں پیدا ہوئی تھی جس کی آج فراوانی ہے۔ آج سے قبل حالات نے وہ پیچیدہ صورت اختیار نہیں کی تھی جو آج موجود ہے۔ آج سے قبل ادیب اپنے ماحول سے اتنا زیادہ غیر مطمئن نہ تھا جتنا کہ آج ہے۔ حالات نے اس کیلئے بہت بڑی حد تک اطمینان کا سامان بہم پہنچا دیا تھا۔ اس لئے ظاہر ہے کہ وہ اس کو بدلنے کا خواب نہیں دیکھ سکتا تھا۔ گھمسان کی لڑائیاں ہوتی تھیں ہنگاموں کا دور دورہ ہوتا تھا۔ لیکن ادیب چونکہ براہ راست ان لڑائیوں سے دوچار نہیں ہوتے تھے اس لئے ان پر ان حالات کا اثر پڑنا مشکل تھا۔ وہ خود اس طبقے سے تعلق رکھتے تھے جو دُنیا پر حکومت کر رہا تھا جس نے اپنے ذاتی مفاد کے پیشِ نظر عوام کی بہتری کو پوری طرح نظر انداز کر دیا تھا۔ وہ زندگی کو ایک خاص زاویہ نظر سے دیکھتے تھے۔ ان کا میدان محدود تھا۔ وہ ایک خاص طبقے کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کرتے تھے۔ سیاسی، معاشی اور اقتصادی کشمکش کو انھوں نے گہری نظر سے دیکھا نہیں تھا۔ وہ اس فضا اور اس ماحول سے دور رہتے تھے۔ ادبی تخلیق اُن کے نزدیک الہام کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس لئے وہ علم و عمل دونوں سے بے نیاز تھا۔ لیکن حالات بدلے، دُنیا نے ایک نئی کروٹ لی۔ زمانہ نے ایک نیا رنگ اختیار کیا۔ انسانی سوچ اور تفکر نے ترقی کے نئے راستے دکھلائے۔ زندگی کے مسائل پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتے گئے۔ کیونکہ فطری اصولوں پر کوئی نظام بنایا نہیں گیا تھا۔ ادیب نے سب سے پہلے یہ خیال کیا کہ ادبی تخلیق الہام نہیں بلکہ اس کی شعوری کوششوں کا نتیجہ ہوتی ہے۔ علم نے اس کی نظر میں وسعت، تخیل میں بلند پروازی اور سوچ میں گہرائی پیدا کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے اپنے ماحول کا جائزہ گہری نظر سے لیا۔ اور اس کو وہ سراسر غلط بے بنیاد اور انسانیت کیلئے تباہ کن نظر آیا۔ چنانچہ اس نے اپنی تخلیقات کے ذریعے ان حالات کو بدلنے کی کوشش کی۔ جاگیردارانہ

اب چونکہ خود ختم ہوگیا تھا اس لئے اس کو کہیں جائے پناہ ملنی مشکل تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اپنے ماحول سے غیر مطمئن ہوا۔ اور اسی عدم اطمینانی نے اس کے اندر طبقاتی کشمکش کا بیج بو دیا۔ اس نے محسوس کیا کہ نہ صرف عوام اپنے ماحول کا شکار ہونے کی وجہ سے زبوں حال ہیں بلکہ وہ خود بھی انہی میں کا ایک فرد ہے۔ اور اس وجہ سے سماجی انتشار اور پریشانی سے کسی حال میں بھی بچ نہیں سکتا۔ چنانچہ پریشانیاں اس پر پڑیں مصیبتیں اس نے اٹھائیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس نے اپنی آنکھوں کے سامنے ساری انسانیت کو مستقل اور مسلسل پامالی کا شکار ہوتے دیکھا۔ انھیں چیزوں کے احساس نے اور شعور کی بیداری نے اس کو بالکل ایک نئی مخلوق بنا دیا۔ اس میں حیرت انگیز تبدیلی پیدا ہوگئی۔ اس کو خود اپنی ذات کا احساس پیدا ہوا۔ ادب کی اہمیت کو اس نے جانا۔ زندگی کو اس نے پہچانا۔ بدلتی ہوئی دنیا کا سارا نقشہ اسکی آنکھوں کے سامنے آیا۔ اس نے طبقاتی کشمکش کے روپ میں حیات و موت کی آویزش پائی۔ ہنگامے اپنی آنکھوں سے نہ صرف دیکھے بلکہ خود ان میں شریک ہوا۔ گھمسان کی لڑائیوں کا نہ صرف نظارہ کیا بلکہ خود سپاہی کی حیثیت سے میدان جنگ میں شرکت کی۔ بموں کے شور، توپوں کی سنسناہٹ اور تلواروں کی چمک کے درمیان اس کی زندگی کے دن گذرنے لگے۔ اجتماعی شعور، جماعتی احساس اور ایک نئے نظام اقدار کی ترویج کے خیال نے اس کو ان تمام باتوں سے دلچسپی لینے کیلئے مجبور کیا۔ اس نے ان حالات سے شکست یونہی نہیں کی بلکہ وہ مردانہ وار آگے بڑھا۔ تاکہ یہ ہنگامے اسکی شعوری کوششوں سے جلد از جلد ختم ہو کر ایک نئی دنیا کو جگہ دیں۔ اس نے کہا کہ ہم خاموشی کے ساتھ ان ہنگاموں کو پھیلتے اور بڑھتے ہوئے دیکھکر خاموشی اختیار نہیں کر سکتے۔ ہم ان تمام حالات میں ایک نظم و ضبط پیدا کریں تاکہ انسانیت کو فائدہ ہو۔ اور چونکہ انسانیت کے فائدہ کیلئے وہ صرف اشتراکی اصولوں ہی کو ضروری سمجھتا ہے۔ اس لئے اس نے صاف صاف کہا ہے کہ چاہے دوسرے کسی طرح کا بھی ادب پیش کریں لیکن جو انسانیت کا بہی خواہ ہے، جو عوام کے مفاد کا خیال رکھنا چاہتا ہے، جس کو یہ تمنا ہے کہ کسانوں اور مزدوروں کی حالت بہتر ہو کیونکہ انہی کے سہارے تہذیب زندہ رہتی ہے۔ تمدن میں چار چاند لگتے ہیں تو اس کے لئے ناگزیر ہے کہ اس انتشاری دور میں اپنی تخلیقات کو پوری طرح عوام کا ترجمان اور ان کے مسائل کا پرچارک بنائے۔

اس میں شک نہیں کہ یہ خیال ادب کو پروپیگنڈے کا روپ دیدیتا ہے۔ لیکن اس کی نوعیت اس بھونڈے، غلط اور چھچھورے قسم کے پروپیگنڈے سے مختلف ہے جو ذاتی اور شخصی اغراض کے ماتحت کیا جاتا ہے۔ پروپیگنڈا کوئی ایسی چیز نہیں جس سے خواہ مخواہ بیر باندھ لیا جائے۔ پروپیگنڈا اچھا بھی ہو سکتا ہے۔ برا بھی۔ مفید بھی ہو سکتا ہے مضر بھی۔ صحتمند بھی ہو سکتا ہے، غیر صحتمند بھی۔ اس لئے اگر اچھا، مفید اور صحتمند قسم کا پروپیگنڈا کیا جائے تو کوئی ایسی بری بات نہیں اور پھر پروپیگنڈا تو انسان کے منہ سے نکلی ہوئی ہر بات میں ہوتا ہے۔ ذہن و دماغ سے نکلے ہوئے ہر خیال میں ہوتا ہے۔ جب بھی انسان کو کچھ کہنے کی تمنا ہوتی ہے۔ جب بھی وہ اپنا مقصد و مطلوب دوسروں تک پہنچانا چاہتا ہے اس وقت اسکی بات ایک پروپیگنڈا بن جاتی ہے۔ ادب میں بھی بہرحال کچھ کہا جاتا ہے۔ کوئی خیال اور کوئی نظریہ پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ ہر قسم کا ادب جس میں کوئی نہ کوئی بات کہی جائے۔ کوئی نہ کوئی نظریہ یا خیال پیش کیا جائے پروپیگنڈا ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ ہر دور اور ہر زمانہ کا ادب اپنے وقت اور ماحول کی خصوصیات اور انداز تفکر کا ترجمان ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ وہ اپنے زمانے اور وقت کے خیالات و نظریات کا پروپیگنڈا ہوا۔ ایک زمانہ تک وہ ایک بورژوا تہذیب، ایک بورژوا نظام اور اس کے زیر اثر تشکیل پائے ہوئے مختلف حالات و واقعات کا پروپیگنڈا کرتا رہا۔ آج زمانہ نے ایک نئی کروٹ لی ہے۔ وقت کی ضروریات کچھ اور ہیں۔ خیالات و نظریات میں ایک انقلاب پیدا ہو چکا ہے۔ بورژوا نظام اور اس کی آغوش میں پرورش پائی ہوئی خصوصیات سے سماج کے افراد نفرت کرنے لگے ہیں۔ عوام کے مفاد کے خیال کا ہر طرف شہرہ ہے۔ زندگی ایک نئے راستہ پر گامزن ہے۔ اس لئے آج ادب میں پروپیگنڈے کی نوعیت بدل چکی ہے۔ افادیت کا تصور ایک نیا روپ اختیار کرچکا ہے۔ اور افادیت جس جگہ اور جہاں کہیں بھی ہوگی پروپیگنڈے کی صورت اختیار کئے بغیر نہیں رہ سکتی۔

البتہ ادب میں اس افادی پہلو کے ساتھ ساتھ

فنی اور جمالیاتی خوبیوں سے چشم پوشی ناممکن ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر ادب کو ادب ہی نہیں کہا جا سکتا۔ اور اس میں تاثر کی وہ کیفیت بھی پیدا نہیں ہو سکتی جس کو پیدا کرنے کیلئے ادیب اپنی تخلیقات میں افادی پہلو کو نمایاں کرتا ہے۔ افادیت کے تاثر کو زیادہ گہرا اور زیادہ دیرپا بنانے کے لئے ادیب اپنے فن میں جمالیاتی پہلو کو لانے کے لئے مجبور ہے۔ کیونکہ وہ اس حقیقت سے واقف ہے کہ انسان کے اندر حسن کا احساس بھی بالکل فطری ہے۔ روزمرہ کے استعمال کی چیزوں میں بھی جو صرف مادی اور جسمانی اعتبار سے اس کی راحت و آرام کا باعث بنتی ہیں۔ جب وہ حسن پیدا کرتا ہے تو پھر ادب میں جمالیاتی پہلو کے لانے سے کس طرح باز رہ سکتا ہے لیکن ادب کو صرف جمالیات تک محدود کر دینا عیش پرستی اور لایعنی سی بات ہے۔ جو سماجی زندگی کیلئے کسی طرح بھی مفید نہیں۔ کیونکہ بغیر کسی مقصد کے حسن کاری سماجی زندگی میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ اس کو بہرحال زندگی کے مختلف مسائل کو اپنے دامن میں سمونا چاہئے۔ یہ ٹھیک ہے کہ حسن کی تخلیق بذات خود ایک افادی فعل ہے۔ کیونکہ وہ بہرحال انسانوں کی دلچسپی اور ایک ذہنی سکون کا باعث بنتی ہے۔ لیکن ایسے حسن کی تخلیق کو کوئی لیکر کیا کرے گا جس میں زندگی سے فرار، بنیادی مسائل سے چشم پوشی اور اہم باتوں سے شعوری طور پر بے نیازی برتی جائے۔ ایسی تخلیقات سماجی زندگی کے لئے مضر اور نقصان رساں ثابت ہوں گی۔ کیونکہ افراد کے ذہن تعیش کی فضا سے ہمکنار ہونے کے باعث مفلوج ہو جائیں گے۔

مضراب

زندگی ایک تلخ حقیقت ہے اور کبھی کبھی ایک خوابناک رومان۔

مضراب راجہ مہدی علی خاں کی ساٹھ طنزیہ اور رومانی نظموں کا مجموعہ ہے۔ اس طرز کی نظمیں آجتک اردو ادب میں نہیں لکھی گئیں اُردو شاعری میں ان نظموں سے جدید اضافہ ہوا ہے۔ دیباچہ میراجی نے لکھا ہے۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ۔

مینیجر ساقی بک ڈپو۔ دہلی سے طلب فرمائیے

آغا سرخوش قزلباش

رقیب سے!

مرے رقیب نہ کر مجھ سے نفرت بیہم
کہ تیرے قدموں پہ میں نے لٹا دیا عالم
جوانی اپنی کچل دی وفا کے ہاتھوں سے
رگ حیات پہ خود رکھ لیا ہے نشتر غم
بس اک تسلسل محرومی و الم ہو کیں
میں بے نیاز کرم ہو گیا بے نیاز ستم!
ترے نصیب کو انعام دینے آیا ہوں
یہ ایک تحفۂ بے نام دینے آیا ہوں
مرے رقیب نہ کر مجھ سے نفرت بیہم
کہ تیرے قدموں پہ میں نے لٹا دیا عالم

مرے رقیب مبارک ہو تربت محبوب
کہ میں نے اسکو بہار چمن بنایا تھا
اسے زمانہ کی نیرنگیاں نہیں معلوم
کہ میں نے ایک ہی نغمہ اسے سنایا تھا
عدول حکمی گوارا نہ ہو سکے اس کو
کہ میں نے حکم سے پہلے ہی سر جھکایا تھا
یہ آنسوؤں کے بھی معنی سے نابلد ہے ابھی
کہ میں نے صرف تبسم اسے سکھایا تھا
مرا یہ جرم نہ بخشا گیا کسی عنوان
کہ میں نے اسکی محبت کو آزمایا تھا
مرے رقیب مبارک ہو تربت محبوب
کہ میں نے اسکو بہار چمن بنایا تھا

قدرت اللہ شہاب

جلترنگ!

صبح سے اس کو روبارہ نکسیر پھوٹ چکی تھی۔ حالانکہ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کے نتھنوں میں گرم گرم ریت ڈال کر اندر سے بھس بھر دیا گیا ہو۔ سانس کی ہوا بھڑکتی ہوئی لالٹین کے دھوئیں کی طرح کثیف اور گھٹی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ تنگ آ کر ناک کو رومال سے بند کر لیتا تھا۔ اور منہ کھول کر سانس لینے لگتا تھا۔ لیکن چند ہی لمحوں میں اس کا گلا خشک ہو کر سوکھے ہوئے پتے کی طرح پھڑپھڑانے لگتا تھا۔ وہ زور زور سے رو دینا چاہتا تھا لیکن رو نہ سکتا تھا۔ اب وہ سیانا ہو گیا تھا۔ اگلے سال میٹریکولیشن کے امتحان میں بیٹھنے والا تھا۔ محلہ کی لڑکیاں جن کے ساتھ وہ مٹی کے گھروندے بنا کر کھیلا کرتا تھا اب اس کے سامنے جسم چرا کر سمٹ جاتی تھیں۔ یہاں تک کہ اب جمو پہلوان بھی اس کو اپنے ساتھ چارپائی پر بٹھا کر روزنامہ "انقلاب" زور زور سے پڑھ کر سنانے کو کہا کرتا تھا۔

جمو پہلوان کے ساتھ چارپائی پر بیٹھنے کا اعزاز محلہ میں بہت کم لوگوں کے حصے میں آتا تھا۔ گلی کے نکڑ پر اس کا تنور تھا جس کے ماتھے پر "خوش لذیذ ہوٹل از طرف جمال دین پہلوان خادم قوم" کا سائن بورڈ لٹکا رہتا تھا۔ ہوٹل میں ایک باورچی تھا جس کا نام تاج دین تھا۔ لیکن موقع و محل کے لحاظ سے جمو پہلوان اسے خانساماں، بٹلر، بوائے، تاجو اور الو کی دُم فاختہ کے مناسب القاب سے بُلایا کرتا تھا۔ خوش لذیذ ہوٹل کے عقب میں ایک بوسیدہ چھپر تھا۔ جس کے نیچے بہت سی ٹیڑھی ترچھی چارپائیاں بچھی رہتی تھیں شہر میں آئے ہوئے مقدمہ باز دیہاتیوں میں یہ جگہ بہت ہر دلعزیز تھی۔ کیونکہ جمو پہلوان صرف بارہ آنے نقد کے عوض انھیں کھانے کیلئے گوشت اور چپاتی، سونے کیلئے ایک چارپائی جب جی چاہے اور مقدمہ لڑنے کے لئے مشورہ مفت دیا کرتا تھا۔ ہاری ہوئی انا کیلئے وہ بڑی چابک دستی سے اپیل دائر کرنے کے ٹوٹکے، گڑ میوے والی دہی کی لسی، اور سردیوں میں چائے کے ساتھ تازہ پراٹھے بنتا تھا۔ جیتنے والوں کیلئے تاج دین مُرغ ذبح کر لیتا تھا۔ یا پلاؤ اور قورمے کے ساتھ شامی کباب بنا لیتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ ایسے موقعوں پر خوش لذیذ ہوٹل کے نرخ دو چند لذت کی حد تک اونچے چڑھ جاتے تھے۔ لیکن ڈوبتی ہوئی امیدوں کو تنکے کا سہارا ملے اور بلیوں اچھلتے ہوئے دل کے سامنے عین موقع پر بھنا ہوا مُرغ اور کرارے کرارے شامی کباب رکھ دیئے جائیں تو وکیلوں، مختاروں، پیشکاروں اور کلرکوں کی زد سے بچے ہوئے چند حقیر ٹکے یاروں کے یار جمو پہلوان کے ہوٹل میں خرچ کرنے میں بھلا کس کو اعتراض ہو سکتا تھا۔

ہوٹل کے سامنے سڑک پر ایک مضبوط چارپائی پڑی رہتی تھی۔ اس پر جمو پہلوان تکیہ لگا کر میر مجلس کی حیثیت سے بیٹھا رہتا تھا۔ گاہکوں، ملاقاتیوں اور مسافروں کیلئے آس پاس لکڑی کے بنچ اور لوہے کی کرسیاں پڑی رہتی تھیں۔ بیٹھے بٹھائے کئی بار پہلوان کو شک ہوتا تھا کہ شاید گوشت ٹھیک طرح بھونا نہیں گیا۔ شاید کبابوں میں مرچ زیادہ ہو۔ شاید قیمہ میں نمک کم ہو۔ اس لئے وہ گھڑی دو گھڑی کے بعد اپنے خانساماں، بٹلر یا بوائے کو آواز دے کر گوشت کا بھرا ہوا پیالہ یا کبابوں کی پلیٹ منگوا کر چکھ لیا کرتا تھا۔ کبھی کبھی تاج دین صدائے احتجاج بلند کرتا تھا کہ "پہلوان ایک ہی دفعہ اطمینان سے کیوں نہیں کھا لیتے؟ اب گاہکوں کی بکری کیلئے خاک چیز بچے گی؟"

"ابے چل کہیں کا۔ اُلو کی دُم فاختہ نہ ہو" پہلوان اپنے چوڑے چکلے سینے پر ہاتھ مارتا تھا۔ "جان ہے تو جہان ہے۔ پیارے! تیرے باپ کی کمائی کھاتا ہوں سالے۔ آیا بڑا ہوٹل کا مالک ...!"

مالک تو جو ہو سو ہو لیکن خوش لذیذ ہوٹل کو لذیذ رکھنا تاج دین کا فرض تھا۔ چنانچہ اس فرض کی انجام دہی کیلئے وہ بھی عموماً دروازے کی اوٹ میں بیٹھ کر سالن اور کبابوں کا نمک چکھ لیا کرتا تھا۔ مالک اور خادم ہوٹل کی باہمی فرض شناسی کا سارا نزلہ بیچارے مسافروں پر گرتا تھا۔ لیکن جمو پہلوان کا مربیانہ

بتاؤ اور حکیمانہ چپ زبانی کبھی کسی کو یہ محسوس کرنے کی اجازت نہ دیتی تھی کہ سالن میں بوٹیوں کی جگہ بڑے بڑے پیاز تیر رہے ہیں اور کبابوں میں قیمہ سے زیادہ بیسن کی ملاوٹ ہے۔

شام کے وقت خالد جب اسکول کے کھیلوں سے لوٹتا تو جمو پہلوان اس کی آواز دیکھ اپنی چارپائی پر بٹھا لیتا تھا "آؤ بیٹا خالد بابو ۔۔ ارے او تاج دین ایک پلیٹ میں بھنی ہوئی مصالحہ دار بوٹیاں تو لا ذرا۔ دیکھتے نہیں بیٹا خالد بابو آیا ہوا ہے"۔ جب پہلوان اور خالد دونوں مل کر بوٹیوں کا چٹخارہ ختم کر لیتے تو "روزنامہ انقلاب" کا دور شروع ہوتا تھا۔ خالد فر فر اخبار سُناتا اور جمو پہلوان لیٹے ہی لیٹے خبروں پر تبصرہ جاری رکھتا۔ وہ شہیدانِ طرابلس کے نام پر چندہ اکٹھا کرنے کیلئے رضاکاروں کی ایک ٹولی کے ساتھ بمبئی، کلکتہ اور حیدرآباد کی طرف گھوما ہوا تھا۔ اس لئے وہ بین الاقوامی معاملات پر اظہار رائے زنی کرنا اپنا علمی حق سمجھتا تھا۔ جمو پہلوان کے ریویو میں دو چار چیزیں خاص طور پر نمایاں ہوتی تھیں۔ آگرہ کے بیچم میں چین کا بادشاہ۔ بمبئی کے پاس ہانگ کانگ کا ملک۔ انگریزی ولایت کے عقب میں طرابلس کا میدانِ جنگ۔ توپوں کے دہانوں کو ہاتھوں سے چیر دینے والے جوان ترک ۔۔ کلکتہ کے ہوٹلوں میں ننگی ناچنے والی میمیں ۔۔ خالد کو عموماً اس لے تکی لات بازی پر ہنسی آتی تھی لیکن وہ پہلوان کو ٹوکنا خلافِ مصلحت سمجھتا تھا۔ ایسا کرنے سے نہ صرف جمو پہلوان کی چارپائی پر بیٹھ کر مصالحہ دار بوٹیاں اُڑانے کا مزا کرکرا ہو جانے کا ڈر تھا بلکہ پہلوان کی نظر میں خالد کا علمی درجہ گر جانے کا بھی اندیشہ تھا۔ چنانچہ پہلوان کو ٹوکنے کی بجائے خالد اس کی باتوں کی مناسب طور پر لقمہ ہی دیا کرتا تھا۔ پہلوان خوش ہو کر اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتا ۔۔ "شاباش بیٹا خالد بابو! خوب علم کما رہے ہو بار۔ جلدی جلدی کالج کر لو بیٹا ۔۔ ڈپٹی کمشنر بن کے رہو گے ۔۔ جی ہاں، جمال دین خادم قوم کی بات پتھر پر لکیر سمجھو، ہاں"۔

ڈپٹی کمشنر کا نام سن کر مقدمہ باز مسافروں کے کان کھڑے ہو جاتے تھے۔ وہ دم بھر کے لئے حقّہ کی نے چھوڑ کر خالد کو ایک عجیب سی عقیدت مندی کے ساتھ دیکھنے لگتے تھے۔ اس وقت اُن کے دل میں سفید سے ارمان اٹھتے تھے۔ کہ کسی روز وہ اپنے بیٹوں کو شہر لا کر خالد سے ملا دیں۔ قسمت تو سب کی اپنے اپنے ساتھ ہے۔ لیکن کون جانتا ہے کہ یہ ملاقات کسی وقت ان کے بیٹوں یا پوتوں کی مقدمہ بازی میں کام آ جائے ۔۔" بیٹا پر پوت، گھوڑے پر گھوڑا، بہت نہیں تو تھوڑا تھوڑا"۔ جمو پہلوان کہا کرتا تھا "کیوں نہ ہو اپنے باپ کا بیٹا ہے۔ شاباش میرے شیر جلدی جلدی کالج کر لو ۔۔"

جمو پہلوان کے مُنہ سے اپنے باپ کا ذکر سُن کے خالد کو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ بھی آگرے کے بیچم میں چین کے بادشاہ کی طرح کوئی فرضی ہستی ہے۔ اس نے اپنے ماں باپ کو دیکھا تک نہ تھا۔ وہ ابھی ڈیڑھ برس کا تھا۔ جب اس کے والدین ریل کے حادثہ میں کٹ کر مر گئے تھے۔ خالد کو اس کے ماموں نے اپنے زیرِ سایہ لے لیا تھا۔ ماموں تو تجارت کے لئے زیادہ عرصے باہر رہتے تھے۔ لیکن ممانی نے خاصی توجہ سے اس کو پالا تھا۔ وہ کسی حد تک اس کے ساتھ شفقت کا برتاؤ بھی کرتی تھی۔ البتہ جہاں معاملہ خالد اور عزیزہ کے درمیان ہو وہاں ممانی کا انصاف کھلم کھلا عزیزہ کا ساتھ دیتا تھا۔ عزیزہ ان کی اکلوتی بیٹی تھی۔ وہ عمر میں خالد سے تین برس بڑی تھی۔ لیکن خالد مجبوراً اسے کندھے پر بٹھا کر بازار لے جایا کرتا تھا۔ عزیزہ غصے میں آ کر اس کا مُنہ نوچ لیتی تھی۔ قلم توڑ دیتی تھی، کتاب پھاڑ دیتی تھی۔ اور اگر ممانی سے پٹتا تھا تو غریب خالد۔ ایک روز وہ دونوں رضائی میں لیٹے ہوئے ہمیں تک گنتی یاد کر رہے تھے۔ کسی بات پر اُلجھ گئے۔ عزیزہ نے کھرے سے اس کی گردن میں کاٹ کھایا۔ خالد کی قمیص خون سے لت پت ہو گئی۔ اور وہ شاید پہلا موقع تھا جب ممانی نے خالد کی وجہ سے عزیزہ کے مُنہ پر ایک زور کا تھپڑ مارا۔ خالد کی گردن پر بائیں طرف دانتوں کا ایک گہرا نشان اب تک نئے چاند کی طرح نمایاں تھا۔

شاید یہ بچپن کے دبے ہوئے نقوش تھے جن کی وجہ سے خالد کے دل میں اب تک عزیزہ کیلئے ایک نامفہم سی بے اعتنائی شاید ڈر، شاید نفرت، شاید تینوں کا ملا جُلا جذبہ باقی تھا۔ وہ عزیزہ کے ساتھ نہایت سرد مہری کا برتاؤ کرتا تھا۔ عزیزہ اس کے ساتھ ہنستی تھی، وہ کتاب کھول لیتا۔ عزیزہ اس سے پڑھنے آتی تھی۔ وہ سو جاتا تھا۔ عزیزہ اس کے ساتھ خوبصورت باتیں کرنے کی کوشش کرتی تھی، وہ رُکھائی سے ٹال دیتا تھا۔ لیکن عزیزہ تیوری پر بَل نہ لاتی تھی۔ وہ اس کے آرام کی چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال رکھتی تھی۔ ماں کی نظر بچا کر وہ خالد کے دودھ میں ملائی

کے موٹے موٹے ٹکڑے ڈال دیتی تھی۔ اس کے کپڑوں پر استری کر دیتی تھی۔ کمرے کی چیزیں قرینے سے سجا رکھتی تھی۔ اگر خالد کے سر میں درد ہوتا تھا تو سر دبا دیتی تھی۔ اگر فٹ بال کھیلتے ہوئے اس کے پاؤں میں موچ آجاتی تھی تو اس کی رضائی میں بیٹھ کر گھنٹوں پاؤں دباتی رہتی تھی ـــــ ایک دن ممانی پڑوس کی شادی میں گئی ہوئی تھیں۔ خالد نفلوئنزا کے شدید بخار میں مبتلا پڑا تھا۔ اس کے انگ انگ میں درد کی ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ عزیزہ نے اس کا سر دبایا، بازو دبائے، کمر دبائی، گھٹنے دبائے، لیکن خالد کراہتا رہا۔ عزیزہ نے کہا "میں ایک ترکیب بتاؤں خالد۔ تم سیدھے لیٹ جاؤ میں تمہارے جسم پر ایک ساتھ دباؤ ڈالتی ہوں" عزیزہ نے کمبل ہٹا کر جھک کر اپنے بھرپور جسم کا سارا گداز خالد پر ڈھیر کر دیا۔ خالد ریشم کے تلنے بانے میں الجھ گیا۔ بال کی لڑیاں اس کے بدن میں پیوست ہوتی گئیں۔ عزیزہ نے لاکھ کہا کہ "میرے خالد ذرا ٹھہر جاؤ، تم ابھی ٹھیک ہو جاؤ گے" لیکن وہ جھنجھلا کر اٹھا اور کمبل اوڑھ کر دوسرے پلنگ پر جا لیٹا۔

اگلے سال وہ میٹرک کا امتحان دینے والا تھا۔ اسکول میں گرمی کی چھٹیاں ہو گئی تھیں۔ وہ صبح سویرے کتابیں لے کر کمپنی باغ چلا جاتا تھا، اور دوپہر تک آموں کی چھاؤں میں لیٹ کر پڑھتا رہتا تھا۔ اب وہ کئی روز سے کمپنی باغ نہ جا سکا تھا۔ کیونکہ دوپہر کے وقت اسے نکسیر آجاتی تھی۔ ممانی کا خیال تھا کہ گرمی کا غبار ہے، تھوڑا بہت نکل جائے تو اچھا ہے۔ تاہم احتیاط کے طور پر اس نے خالد کو گاجر وں کی کلونجی بنا دی تھی۔ اور صبح و شام تازہ مکھن میں کالی مرچ اور کدو کے مغز ملا کر اسے چٹا دیتی تھی۔ لیکن آج صبح سے اس کو دو بار نکسیر پھوٹ چکی تھی۔ خالد کو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کے نتھنوں میں گرم گرم ریت ڈال کر اندر سے جھلس دیا ہو۔

اس نے بیزار ہو کر تولیہ کندھے پر ڈالا، اور غسل خانہ کی طرف چل دیا۔ شاید ٹھنڈے پانی کی بالٹی میں سر ڈبو کر اسے تسکین حاصل ہو۔ لیکن غسل خانہ کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ اسے غصہ آیا۔ یہ بھری دوپہر میں بھی کوئی نہانے کا وقت ہے بھلا! وہ غصہ سے بڑبڑاتا ہوا گھوما۔ اور گھومتے ہی یونہی نادانستہ طور پر اس نے کھڑکی کی ایک درز سے اندر کی طرف جھانکا۔ جھانکتے ہی اس نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا۔ اور بجلی کی طرح تڑپ کر پیچھے ہٹ گیا ــــ پھر وہ لمحہ بھر کیلئے رُکا۔ ٹھٹکا، جھجکا اور چوروں کی طرح ادھر اُدھر ایک بار پھر جھانکا۔ گھوما۔ پھر اسے ہچکچایا۔ لیکن پھر جھانکا۔ اس بار اس کی آنکھیں درز کے ساتھ جم کے لگ گئیں۔ جیسے مقناطیس کے ساتھ لوہے کا ٹکڑا چپٹ جائے!

یہ عزیزہ تھی ـــــ وہ جگمگاتے ہوئے موتی کی طرح صدف سے باہر پڑی تھی۔ یا شاید وہ بجلی کی ایک آوارہ لڑی تھی جو کالی گھٹاؤں کے دبیز پردوں سے باہر نکل آئی ہو۔ اس نے اپنے گھنے بالوں کی لٹوں کو کھولا۔ اور ہاتھی دانت کی چھوٹی سی کنگھی کو ان کے پیچ و خم میں الجھا کر دیر تک آنکھ مچولی کھیلتی رہی۔ پھر اس نے زلفوں کے لچھے ادھر چھوڑ دیے۔ بازو اٹھا کر دونوں ہاتھ جوڑے اور کمان کی طرح تن کر انگڑائی لی۔ خالد ڈرا کہ شاید زلزلہ آجائیگا۔ اور سنگ مرمر کے دو تاج محل گر کر چُور چُور ہو جائیں گے۔ آگرہ میں محبت کا ایک مرمریں خواب سویا ہوا ہے۔ آگرہ کے چمچم میں چین کا بادشاہ حکومت کرتا ہے۔ لیکن آگرہ کے اس طرف بھی تاج محل ہیں۔ برفیلی چوٹیوں کی طرح دمکتے ہوئے کوہستان۔ ہمالیہ کی چھاتی پر بنائے ہوئے بلوری منارے۔ عزیزہ نے دونوں ہاتھوں سے بال سمیٹ کر بالٹی میں ڈال دیئے۔ پھر اس نے سر اٹھا کر گردن کو ذرا زور سے جھٹکا دیا۔ برسات کی کالی گھٹائیں بکھر کر چھا گئیں۔ بارش کی پھوار فضا میں جھلملانے لگی۔ ایک گستاخ قطرہ صبح کے ستارے کی طرح تاج محل کے کلس سے لٹک گیا۔ عزیزہ شرارت سے اس پر پھونکیں مارنے لگی۔ وہ جھولتا رہا۔ جیسے سفید گلاب پر چڑھے ہوئے شبنم کے موتی کو نسیم سحر جھولا جھلا رہی ہو ـــ اور جب وہ مجبور ہو کر ایک مچلتے ہوئے آنسو کی طرح گرنے لگا تو عزیزہ نے جھک کر اسے اپنے ہونٹوں کی گود میں دبوچ لیا ـــ وہ نہا رہی تھی، پانی کی لہریں پہاڑی چشموں کی طرح اپنا جلترنگ بجانے لگیں۔ تاج محل کے دامن میں جمنا کے سیمابی دھارے بہنے لگے۔ کوہساروں پر کہکشاں کا غبار سا چھا گیا۔ کائنات کی رگ رگ سے قوس قزح کے فوارے چھوٹنے لگے ـــ یہ مچلتا ہوا سیلاب کہاں جا رہا ہے؟ اس طوفان کی شورش کو کس سمندر کی گود سنبھالے گی۔ خالد کی باہیں سانپ کی طرح بل کھا کر کھڑکی کی سلاخوں کے ساتھ لپٹ گئیں۔ پتھر کی دیوار میں ریشم ایسا لوچ آگیا وہ دمبدم دیوار کے سینے میں سمایا جا رہا تھا۔ شاید اگلے لمحہ وہ چھپاک سے اندر جا گرے گا۔ گرتے گرتے اسکو ایک جھٹکا سا لگا۔ اسکی آنکھیں دم بھر کے لئے بند ہو گئیں۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ برفانی چوٹیوں کے ساتھ لپٹا ہوا لٹو کی طرح گھوم رہا ہے۔ وہ تڑپ کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے سر کو جھٹکا دیکر آنکھیں کھولیں اور جلدی سے اپنی خشک ناک پر گرنے لگا۔ اسے شک ہوا کہ شاید نکسیر پھر بہنے لگی!

کرشن چندر

تاریخ ہند

(داخلی نقطۂ نگاہ سے)

ہندستان کی تاریخ بہت ہی پرانی ہے۔ اتنی پرانی ہے کہ جن دنوں مغربی اقوام جنگل سے لکڑیاں کاٹتی تھیں اور کنوؤں سے پانی بھرتی تھیں۔ ہم لکڑی کے بجائے اُپلے جلاتے تھے۔ اور صندل کا شربت پیتے تھے۔ چنانچہ یہ امر ہمارے لئے باعثِ فخر ہے کہ ہندستان کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ اتنی پرانی کہ اس کے اکثر مقامات تو متداد زمانہ سے معدوم ہو چکے ہیں۔ اور جو باقی رہ گئے ہیں وہ اس قدر بوسیدہ، غلیظ اور گندے، سڑے نظر آتے ہیں کہ ان کا مطالعہ کرنے کیلئے ہر طالب علم کو فنائل کی ایک بوتل اپنے ساتھ رکھنا پڑتی ہے۔ فنائل کے بغیر ہندوستان کی تاریخ کا مطالعہ نہیں ہو سکتا کیونکہ ہندستان کی تاریخ بہت پُرانی ہے۔

ہندستان کی تاریخ کے دو حصّے ہیں:۔

حصّہ اوّل جسے دیمک چاٹ چکی ہے۔

حصّہ دوم:۔ جسے فرنگی چاٹ رہے ہیں۔

حصّہ اول اور حصّہ دوم کے علاوہ ایک حصّہ سوم بھی ہے جسے پتھر اور دھات کا زمانہ کہتے ہیں۔ چونکہ یہ ہندستان کا سنہری زمانہ ہے اس لئے اسے شہد لگا کر چاٹا جاتا ہے۔

آج کا سبق اسی زمانہ سے شروع ہوتا ہے اس لئے سب طالب علم اپنی اپنی شہد کی بوتل کھول کر ڈیسک پر رکھ لیں۔

پتّھر کا زمانہ

پتھر کے زمانہ میں دراوڑ لوگ ہندوستان میں رہتے تھے۔ یہ لوگ بڑے وحشی اور جاہل تھے اور ان کا رنگ کالا ہوتا تھا (آجکل سب ہندستانی پڑھے لکھے ہوتے ہیں اور ان کا رنگ گورا ہوتا ہے) یہ لوگ پتھر کا استعمال بہت زیادہ کرتے تھے۔ چنانچہ یہ لوگ پتھر کے مکانوں میں رہتے تھے۔ یا پتھر کے غاروں میں سوتے تھے کہ جس طرح آجکل انگلستان کے لوگ بمباری سے بچنے کیلئے چاک پہاڑیوں کی غاروں میں سوتے ہیں۔ پتھر کے ہتیار استعمال کرتے تھے۔ پتھر کی چھال اوڑھتے تھے۔ میرا مطلب ہے درخت کی چھال اوڑھتے تھے۔ اور پتھر کے زیور از قسم ہیرا، مرجان، لال، زمرد، نیلم وغیرہ پہنتے تھے۔ الغرض یہ لوگ بڑے وحشی تھے۔ حد تو یہ ہے کہ آگ بھی پتھر کے دو ٹکڑوں کو رگڑ کر پیدا کرتے تھے۔ دیاسلائی اور مسالے کی رگڑ سے آگ نہیں پیدا کر سکتے تھے۔ غیر مہذب تھے نا آخر!

دراوڑ لوگ پوجا بھی پتھروں کی کرتے تھے۔ اس لئے آریاؤں نے ہندستان پر حملہ کرنا مناسب سمجھا۔ تاکہ وہ دراوڑوں کو قدرت کی پوجا کرنا سکھائیں۔

آریاؤں کا زمانہ

ہدایات:۔ شہد کی بوتلیں بند کر لو۔ سنہری زمانہ ختم ہوا۔

آریہ لوگ صوبہ سرحد کے رہنے والے تھے اور درۂ خیبر کی راہ سے ہندستان میں داخل ہوئے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آریہ شمالی یا جنوبی ترکستان سے آئے۔ بعض ان کا ماخذ مشرقی یا مغربی ترکستان بتاتے ہیں۔ پروفیسر منٹر براؤن کی تحقیق ہے کہ آریہ لوگ دراصل یوروپی تھے۔ جو یورال کی پہاڑیوں کو طے کر کے سمرقند بخارا کے راستے ہندستان پہنچے۔ برخلاف اس کے ابو الفتنہ لکھتا ہے کہ آریہ سامی النسل تھے اور غالباً عربوں کی اس شاخ سے تعلق رکھتے تھے جنھوں نے ماورائے قسطنطنیہ بازنطینی تہذیب کی بنیاد مستحکم کی۔ شری پنڈت راگھو چاریہ براہمنم کا خیال ہے کہ آریہ لوگ دیوتا تھے اور آکاش سے اترے تھے۔ بہرحال یہ آریہ لوگ آسمان سے یا زمیں سے کہیں سے بھی اترے ہوں اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ صرف درۂ خیبر کی راہ سے ہندستان میں داخل ہوئے۔

آریہ لوگ بڑے تہذیب یافتہ تھے اس لئے انھوں نے دراوڑوں کو بہت جلد شکست فاش دیدی۔ اور سارے ملک پر قابض ہو گئے۔ آریوں کی فتح کے اسباب مندرجہ ذیل ہیں:۔

۱۔ آریہ لوگ گورے رنگ کی نسل سے تعلق رکھتے تھے،

دراوڑ لوگ کالے تھے۔

۲۔ آریہ لوگوں کو ہندستان سے بڑی محبت تھی۔

۳۔ آریہ پتھروں کی پوجا کے بجائے قدرت کے مظاہر از قسم سورج، آگ، پانی، ہوا، گائے، بیل کی پوجا کرتے تھے۔ وہ پتھروں کو قدرت کے مظاہر میں شمار نہ کرتے تھے۔ اور خدا کی وحدت میں یقین رکھتے تھے۔

۴۔ انھوں نے اپنی عورتوں کو مردوں کے مساوی درجہ دے رکھا تھا۔ چنانچہ انھوں نے سب سے پہلے ہندستان میں ستی کی رسم قائم کی۔ جو مرد اور عورت کی مکمل مساوات کی معراج ہے۔ ستی کا مطلب یہ ہے کہ جب مرد مر جائے تو اسی وقت عورت کی موت بھی ہو جائے۔ مرد کی موت = عورت کی موت = مکمل مساوات۔ اسی لئے مورخ آریوں کے زمانہ کو ستی کا زمانہ بھی کہتے ہیں۔

۵۔ آریہ لوگ ایک بہتر نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ دراوڑ نیٹو تھے۔ یعنی ہندستان کے اصلی باشندے یعنی راکشش۔

۶۔ آریہ لوگوں کے راجہ اور سردار ہوتے تھے جو سبھاؤں کی مدد سے راج کرتے تھے۔ اگر راج سبھا کسی بات پر راجہ کے خلاف ہو جاتی تو راجہ اس وقت بے چون و چرا سبھا کے سامنے اپنا سر جھکا لیتا۔ اور بعد میں سبھا کو معطل کر کے یا اس کے اراکین کو قتل کر کے من مانی کارروائی کرتا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آریہ لوگ بڑے جمہوریت پسند تھے۔ اور دراوڑوں کی طرح بیوقوف نہ تھے جو ہمیشہ اپنے سردار کا کہا مانتے تھے۔

آریوں نے ہندستان پر آٹھ ہزار سال تک راج کیا۔ پھر ہندوؤں نے انھیں شکستِ فاش دیدی۔

ہندوؤں کا زمانہ

ہندو لوگ دریائے گنگا اور برہمپتر کے منبع پر رہتے تھے۔ اور جھیل مانسرور میں تیرتے تھے۔ یہ لوگ ذات کے برہمن تھے، ماتھے پر تلک لگاتے تھے۔ دھوتی پہنتے تھے۔ گیان دھیان کی باتیں کرتے تھے۔ اور ماش کی دال کھاتے تھے۔ یہ لوگ آریاؤں کی طرح جنگ جو نہ تھے بلکہ ہمیشہ فلسفہ بگھارا کرتے تھے۔ اور ہاتھوں کے بجائے دماغ سے کام لیتے تھے۔

جب براہمنوں نے ہندستان پر حملہ کیا تو انھوں نے صوبہ سرحد کے قریب بیٹھ کر ہون کیا۔ اور مقدس اگنی سے چار جنگجو پیدا کئے اور انھیں راجپوت کا خطاب دیا۔ پھر یہ لوگ اپنے بہادروں کو لیکر ہندستان میں داخل ہوئے۔ (درۂ خیبر کی راہ سے) اور دیکھتے دیکھتے سارے ملک میں چھا گئے۔ ہندوؤں کے زمانہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس زمانہ میں راجپوت تخت پر بیٹھتے تھے اور برہمن راج کرتے تھے۔ ان برہمنوں میں منو، چانکیہ اور شنکر اچاریہ بہت مشہور ہیں۔

بکرماجیت

ہندوؤں کا سب سے پہلا راجہ بکرماجیت تھا۔ اس نے ہندوؤں کا سمت ایجاد کیا اور بمبئی میں بکرماجیت کمیٹی بنائی جو آج تک وہاں کام کر رہی ہے۔

بکرماجیت بڑا انصاف پسند بادشاہ تھا۔ کہتے ہیں، اگر کوئی بیوقوف گڈریا بھی اس کے تخت پر بیٹھ جاتا تو بکرماجیت کی طرح انصاف کرنے لگتا۔ اس سے خیال پیدا ہوتا ہے کہ انصاف بکرماجیت کے دماغ میں نہیں اس کے تخت میں تھا۔ یہ تخت آجکل انگریزوں کے قبضے میں ہے اور لندن کے عجائب گھر میں بند ہے۔

بعض مورخین کا خیال ہے کہ بکرماجیت اس کا اصلی نام نہ تھا۔ بکرماجیت دراصل راجہ ہرش تھا یا راجہ بھوج جس کا نام اکثر گنگو تیلی کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ کچھ بھی ہو۔ بکرماجیت کے ماخذ کا آجتک پتہ نہیں چلا۔ ماسوا اس کے کہ وہ ہندوؤں کا پہلا راجہ ہے۔

بکرماجیت نے ہندستان میں اپنے عدل و انصاف کا ڈنکا بجایا۔ اس کے تین سو سال بعد تک ہندستان کی تاریخ کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔

اشوک اعظم

اب راجہ اشوک کا زمانہ آتا ہے۔ اسے اشوک اعظم بھی کہتے ہیں۔ اشوک بڑا امن پسند بادشاہ تھا۔ اس نے اپنی عمر میں صرف ایک لڑائی لڑی۔ کالنگا کی لڑائی۔ اس لڑائی میں تین لاکھ آدمی جان سے مارے گئے۔ اور پندرہ لاکھ زخمی ہوئے۔ اشوک کو ان لوگوں سے بڑی محبت تھی۔ اس کے علاوہ اشوک کسی ذی حس کو دکھ دینا پسند نہ کرتا تھا۔ کہتے ہیں اس نے اپنی عمر کے آخری حصے میں اپنے بیٹے کنال کی آنکھیں نکلوا ڈالی تھیں۔ اشوک بدھ مت کا پیرو تھا۔ اس نے ہندستان میں مختلف جگہوں پر بدھ مت کے اقوال کندہ کرائے۔

نئی دلی میں اس نے ایک سڑک اشوکا روڈ تعمیر کرائی۔ اس کے علاوہ اشوک کی لاٹھ بھی۔ اس لاٹھ پر لکھا ہے "جب تک یہ لاٹھ موجود ہے اشوک کی حکومت ہندستان میں رہے گی" بس واقعی اعتبار سے ہندستان میں آج بھی اشوک کی حکومت ہے۔

لیکن اشوک کی زندگی کا محبوب ترین مشغلہ کتبے تیار کرنا تھا۔ وہ آئے دن پتھروں پر خوبصورت کتبے تحریر کرتا رہتا تھا۔ اس سے مؤرخین نے اندازہ لگایا ہے کہ اشوک اعظم تخت پر بیٹھنے سے پہلے کسی اُردو پریس میں سنگسا ز تھا۔ واللہ اعلم!

اشوک کے بعد اس کا بیٹا بندھوسار تخت پر بیٹھا۔ دراصل بیٹھا کہ اس کے دو سو سال بعد تک ہندی تاریخ کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ فائل چھوڑ کنے سے بھی کوئی افاقہ نہیں ہوتا۔ اس کے بعد چندر گپت موریا کا راج آتا ہے۔

چندر گپت موریا

چندر گپت موریا بڑا ظالم بادشاہ تھا۔ اس نے مگدھ کے نندا خاندان کو شکست (فاش) دیکر تخت حاصل کیا۔

اس نے یونانیوں کو بھی شکست فاش دی (جو درہ خیبر کی راہ سے ہندستان آئے تھے)

اس نے سکندر اعظم کے جنرل سلوکس کی ملیچھ لڑکی سے بیاہ کیا یہ بیاہ ہندوؤں کے رسم ورواج کے خلاف تھا۔ چنانچہ اس پر چندر گپت موریا کو ذات برادری سے خارج کر دیا گیا۔

چندر گپت کا باپ کون تھا؟ اس کے ماخذ کا کچھ پتہ نہیں چلتا البتہ اس کی ماں کا نام موریا تھا۔ اور یہی اس خاندان کی وجہ تسمیہ ہے چندر گپت کا گرو چانکیہ تھا جس نے پہلی بار دُنیا کو بتایا کہ سیاست یعنی راج نیتی دھوکہ کا دوسرا نام ہے۔ چانکیہ ذات کا برہمن تھا اور اس کی راج نیتی دُنیا کی عظیم کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔

چندر گپت موریا کے بعد ہندستان میں کوئی عظیم ہندو بادشاہ نہیں ہوا۔ چھوٹے چھوٹے بادشاہ البتہ بہتیرے ہیں۔ مثال کے طور پر راجہ ہرش، بھوج، شالباہن، کنشک، یہ سب معمولی بادشاہ تھے۔ اور ان میں مذہبی رواداری بہت تھی۔ جس کی وجہ سے ہندوؤں کا شیرازہ حکومت بہت جلد بکھر گیا۔ مختصر طور پر بیان کرتا ہوں۔

۱۔ راجہ ہرش علم دوست راجہ تھا۔ اس کے دربار میں دربار اکبری کی طرح نورتن تھے۔ راجہ ہرش نے "شکنتلا" ناٹک لکھا جسے آجکل کالی داس سے منسوب کیا جاتا ہے۔ دراصل کالی داس راجہ ہرش کا ہی ادبی نام ہے۔ جس طرح مرزا ثناء اللہ کا ادبی نام "میم۔ الف" ہے۔

۲۔ راجہ بھوج نے بھوج پتروں پر سیکڑوں کتابیں لکھیں۔ لیکن اس کی شہرت اس کی کتابوں کی وجہ سے نہیں اس کے دوست گنگو تیلی کی وجہ سے ہے جس طرح ہمایوں کی شہرت سقہ بادشاہ اور امان اللہ کی شہرت بچہ سقہ پر مبنی ہے

۳۔ شالباہن سیالکوٹ میں راج کرتا تھا اور پورن بھگت کا باپ تھا جو بعد میں نیو تھیٹرز میں ملازم ہوا۔

۴۔ کنشک۔ بُدھ مت کا حامی تھا اور پشاور میں رہتا تھا۔ اس لئے اس کی حکومت کا بہت جلد خاتمہ ہو گیا۔

ہندوؤں کے زمانہ میں سکندر کا حملہ ہوا۔ جو ایک مشہور و معروف تاریخی واقعہ ہے۔ اس لئے اس کے ماخذ، وجہ تسمیہ اور اسباب بھی بیان کرنا ضروری ہیں:۔

سکندر کا حملہ

ہندستان پر سکندر کے حملے کے بہت سے اسباب تھے۔

۱۔ وہ سکندر اعظم تھا۔

۲۔ وہ اپنے باپ سے لڑ کر گھر سے نکلا تھا۔

۳۔ وہ پورس والئی سندھ کو اپنا دوست بنانا چاہتا تھا۔

۴۔ اسے ایک دفعہ دیوجانس کلبی نے جھڑک دیا تھا۔

۵۔ اُسے ہندستان سے محبت تھی۔

چنانچہ جب سکندر جسے سکندر اعظم بھی کہتے ہیں ہندستان میں داخل ہوا (درہ خیبر کے راستے) تو ہر جگہ اس کا شاہانہ استقبال کیا گیا۔ پورس نے اس کا شاہانہ استقبال کیا، پھر ملتان میں اس کا شاہانہ استقبال ہوا۔ پھر ستلج پر اس کا وہ شاہانہ استقبال ہوا کہ اس کی فوج آدھی سے کم ہو گئی۔ جب وہ دریائے بیاس کے کنارے پہنچا تو اس کے سپاہی اس شاہانہ استقبال سے اس قدر پریشان ہو گئے کہ انھوں نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ سکندر اعظم بصد انداز تفاخر ہندستان سے واپس چلا گیا۔ اسی لئے اسے "فاتح ہندستان" کہتے ہیں۔ سکندر جب ہندستان سے لوٹا تو اس کے کئی جہاز بیش قیمت کپڑوں اور زر و جواہر سے بھرے ہوئے تھے۔ لیکن جب وہ لوٹتے ہوئے فارس میں مر گیا تو اس کے دونوں ہاتھ خالی کفن سے نکلے۔

سکندر کے حملہ کے بعد ہندستان کی حکومت کا شیرازہ بکھر گیا۔ وہ ان کی مذہبی رواداری بڑھتی گئی۔ آخر میں ہر ہندوستانی گاؤں میں ایک ایک حکومت قائم ہوئی۔ ہر گھر میں تین چولھے بنائے گئے۔ اچھوتوں کو سڑکوں پر چلنے اور مغرور برہمنوں پر اپنی پرچھائیں ڈالنے سے بھی منع کر دیا گیا۔ اور برہمن لوگوں کے علاوہ باقی تمام رعایا کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈال دیا گیا تاکہ وہ وید منتر نہ سن سکیں۔

اس صورت حال کا خاتمہ کرنے کیلئے اور ہندوستان میں اخوت و مساوات پھیلانے کیلئے مسلمانوں نے ہندستان پر حملہ کیا اور ہندوؤں کو شکست فاش دی۔

مسلمانوں کا زمانہ

مسلمانوں کا زمانہ سبکتگین کے خواب سے شروع ہوتا ہے۔ کہتے ہیں ایک دفعہ سبکتگین نے شکار کھیلتے کھیلتے ایک حاملہ ہرنی کی جان بچائی تھی۔ اسی رات کو وہ ہرنی سبکتگین کو خواب میں نظر آئی اور اس سے کہا کہ تو بادشاہ ہوگا۔ اور اگر تو ہندستان پر حملہ کریگا تو فتح یاب ہوگا اور ہندستان پر حکومت کرے گا۔ اس خواب کے بعد سبکتگین نے ہندستان پر حملہ کر دیا۔

پہلے پہل ہندوؤں نے جی توڑ کر ملیچھوں کا مقابلہ کیا۔ راجہ جے پال جو پنجابی تھا اور اس لئے بڑا بہادر تھا کئی بار سبکتگین کے خلاف لڑا۔ لیکن چونکہ سبکتگین کو ایک ہرن کی مدد حاصل تھی، اس لئے اس نے راجہ جے پال کو شکست فاش دی۔ حتیٰ کہ راجہ جے پال خودکشی کر کے مر گیا۔

لیکن اس پر بھی ہندوؤں نے آس نہیں چھوڑی۔ چنانچہ سومنات مندر نے محمود غزنوی پر ہولا ہولا چڑھائی کر کے اس کے ایسے دانت کھٹے کئے کہ محمود غزنوی کو پھر کبھی ہندستان کا رُخ کرنے کا حوصلہ نہ پڑا۔ اور وہیں غزنی میں ایاز کی محبت میں گھل گھل کر مر گیا۔ اس پر بھی ایاز تخت پر نہ بیٹھا۔ بلکہ غلام کا غلام ہی رہا۔ ایاز کے اس شاندار ایثار کو دیکھتے ہوئے ہندستانیوں نے خاندان غلامان قائم کیا کیونکہ ہندستان کو شروع ہی سے غلامی سے محبت رہی ہے۔

ہندوؤں کا آخری راجہ پرتھوی راج چوہان تھا اور پہلا غدار جے چند والیٔ قنوج۔ مؤخر الذکر ہندستان میں غداروں کے اس عظیم الشان غیر مختتم سلسلے کا بانی ہے جو ابھی تک پروان چڑھ رہا ہے۔

مسلمانوں نے فتح پا کر ہندوؤں کے راج کی جگہ اپنی حکومت قائم کی اور اخوت و مساوات کا وہ درس دیا کہ ان کے عہد حکومت میں شاہ و گدا اور امیر و غریب کا فرق بالکل مٹ گیا۔ اور محمود آباد (راجہ آف) اور ایاز (خاکسار بستی ضلع لکھنؤ) ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے مسلمانوں نے آٹھ سو سال تک مساوات کا ڈنکا بجایا۔ ان کی فتح کے اسباب مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ مسلمان درّہ خیبر کی راہ سے آئے تھے۔

۲۔ وہ ہندستان کے نیٹیو نہ تھے۔ بلکہ ایک بہتر نسل سے تعلق رکھتے تھے۔

۳۔ وہ ہندوؤں کی طرح صرف سبزی پر قناعت نہ کرتے تھے بلکہ گوشت بھی کھاتے تھے اور گائے کا گوشت بھی۔

۴۔ وہ بڑے تہذیب یافتہ لوگ تھے۔ جس طرح دراوڑوں سے آریہ، اور آریاؤں سے ہندو زیادہ تہذیب یافتہ قوم تھے۔

۵۔ انھیں ایک ہرنی کی حمایت حاصل تھی (بحوالہ سبکتگین کا خواب) بخلاف اس کے ہندوؤں کو ایک ہرنی کی حمایت تو کجا ایک چڑیا کا سہارا بھی نہ تھا۔

مسلمانوں کے زمانہ میں بھی دو حصے کئے جا سکتے ہیں حصہ اوّل یعنی خاندانوں کا زمانہ اور حصہ دوم یعنی مغلوں کا زمانہ۔

مسلمانوں کے حصہ اول یعنی خاندانوں کے زمانہ میں یہ خاندان بہت مشہور رہیں۔ خاندان غلامان کہ اب تک چلا آتا ہے۔ خلجی خاندان تغلق خاندان، لودھی خاندان، خاندان سادات۔ اور شیر شاہ سوری کہ نو مسلم ہے اس لئے بجائے خود ایک خاندان ہے۔ ان خاندانوں میں ہمیشہ لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں۔ اور کبھی ایک خاندان اور کبھی دوسرا خاندان برسراقتدار آ جاتا تھا۔ اس زمانہ میں رعایا کا کیا حال تھا۔ لگان، کاشتکاری، صنعت و حرفت کے کیا مسائل تھے۔ مجوزہ تاریخ ہند اس کا جواب دینے سے قاصر ہے۔ فائل چھیڑنے سے بھی کچھ پتہ نہیں چلتا۔ ان خاندانوں کے مشہور بادشاہ یہ ہیں:۔

۱۔ قطب الدین ایبک۔ ایک گمنام غلام تھا جسے قطب مینار نے مشہور کیا۔ ورنہ اس بادشاہ میں کوئی خاص بات نہ تھی۔ بس پولو کھیلتے کھیلتے مر گیا۔

۲۔ علاؤ الدین خلجی۔ یہ بڑا علم دوست، ادب نواز بادشاہ تھا۔ "قصہ پدمنی" اسی کا لکھا ہوا ہے۔ یہ ہندوستانی افسانہ نگاروں کا پہلا رُمانی طبعزاد افسانہ ہے جو کسی مغربی شاہکار سے نہیں چرایا گیا۔ قدآم شیشے بنانا اور اپنے دشتہ اردو کے سرسبز میدان میں کھلنا اسکی محبوب مشغل تھے جو لوگ میری طرح ایک رشتہ ارد سے اکتا چکے ہیں وہ اسکے زندہ جاوید کام

ونت سنگھ

چکوری

نزہت گھر میں اکیلی بیٹھی سوائیٹر بن رہی تھی۔ ابا دفتر گئے ہوئے تھے۔ پروفیسر عبداللہ کے ہاں کوئی موت ہو گئی تھی۔ امی کو وہاں جانا تھا۔ چھوٹا بھائی اور بہن اسکول میں تھے۔ صرف ان کا بارہ سالہ نوکر صحن میں بیٹھا دیگچی مانجھ رہا تھا۔ ... امی سالن تیار کرنے کیلئے کہہ گئی تھیں۔ نزہت نے دو مرتبہ ... کا تہیہ کیا۔ لیکن نہ اٹھی۔ آج اس کا دل بس یہی چاہتا تھا ... بنے جائے۔

انھیں سرکاری مکان ملا ہوا تھا۔ مکان کے اردگرد چند ... زمین باغ کیلئے چھوڑ دی گئی تھی۔ مکان میں ایک ہی قطار میں ... بڑے بڑے کمرے تھے۔ دو برآمدے تھے، ایک باہر کی طرف ... اس سرکاری دفتر کی ... بڑی بڑی چقیں پڑی رہتی تھیں۔ ... برآمدہ اندر کی جانب تھا جس کے دونوں سروں پر غسل خانہ ... ایک چھوٹا سا اسٹور بنا ہوا تھا۔ ... صحن تھا صحن کے ... کونے پر باورچی خانہ وغیرہ۔

ابا یوں تو بڑے خوش مزاج اور البیلی طبیعت کے شخص ... لیکن انھیں باغ سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ چنانچہ باغ ویران پڑا ... سبزہ کٹائی نہ ہونے کی وجہ سے بے تحاشہ بڑھی اور ... بوڑھے کی داڑھی کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ بیچ کی چوڑی روش ... دونوں کناروں پر بھی قطاروں میں گڑی ہوئی آڑی اینٹیں بھی ... ادھر گری پڑی تھیں۔ زمین پر خودرو روکھی سوکھی گھاس بہت ... معلوم ہوتی تھی۔ وہ چھوٹا سا چوکور تالاب جو آبیاری کے ... سرکار کی طرف سے بنایا گیا تھا خشک پڑا تھا۔ اس میں تین چار ... مینڈک نہ معلوم کس طرح گر پڑے۔ کہیں بچوں نے دیکھ پائے ... بیچاروں کو شہید کر ڈالا۔ اب تک وہ ڈھیلے اسی طرح ... بے ترتیب پڑے تھے۔ اور وہ مینڈک اپلوں کی طرح خشک ہو گئے تھے۔

... سردی کا رخصت ہو رہی تھی۔ موسم گرما کی آمد آمد تھی۔ لیکن ... کے وقت ہوا خنک ہی ہوتی ہے البتہ دوپہر کو حدت محسوس ہونے لگتی تھی۔ اس لئے دن کا وہ حصہ تو یونہی کمرے سیدھی کرتے اور کروٹیں بدلتے ہی گذر جاتا تھا۔ البتہ صبح کے وقت جبکہ سب لوگ باہر چلے جاتے تھے اور موسم بھی خوشگوار ہوتا تھا۔ کام کرنے میں دل لگ جاتا تھا۔ اس کی انگلیوں میں سلائیاں تیزی سے ادھر ادھر گھوم رہی تھیں۔ وہ اپنے ہاتھوں سے لگائے چنبیلی کے چند پودوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ پچھلی شام کو ان پر چند کلیاں موجود تھیں آج پھول کھل گئے تھے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ نہ معلوم کتنے پھول ہیں۔ پودے ذرا دور تھے۔ اس لئے وہ پھولوں کی تعداد کا صحیح اندازہ نہ لگا سکی تھی۔ ... اتنے میں تقریباً ایک فرلانگ پرے پکی سڑک سے ایک تانگہ ادھر کو گھوما۔ اور گرد ھل کے تین درختوں کے قریب سے ہوتا ہوا بڑھا۔ اس جگہ لاریوں کاروں اور تانگوں کی آمد رفت ریل پیل نہ تھی۔ یہ سرکاری جگہ تھی۔ بلا ضرورت کوئی تانگہ اس طرف کا رخ نہ کر سکتا تھا۔ تانگہ اسی صورت میں نظر آتا تھا جب کسی کو کہیں جانا ہو یا کسی کا کوئی رشتہ دار ملنے کیلئے چلا آئے۔ یہاں سبھی لوگ پردیسی تھے۔ بھلا بغیر کسی خاص ضرورت کے کسی کے رشتہ دار کو کیا پڑی کہ اپنا کام چھوڑ چھاڑ کر اتنی دور ملنے کیلئے چلا آئے۔ ...

نزہت پہلے تو برآمدے کی اٹھی ہوئی چق میں سے تانگہ کی طرف دیکھتی رہی لیکن جب تانگہ چقوں کی اوٹ میں آ گیا تو وہ پھر جرابوں پر جھک گئی۔ البتہ اس کے کانوں میں گھوڑے کی ٹاپوں اور تانگے کی کھڑ کھڑ کی آوازیں آتی رہیں۔ اور پھر دفعتہً تانگہ رک گیا وہ چونک پڑی۔ ...... ان کے ہاں تو کوئی آنے والا نہیں تھا لیکن تانگہ یقیناً انہی کے دروازے پر آن کر رکا تھا۔ ... اگرچہ وہ جس دروازے کے قریب بیٹھی ہوئی تھی اس پر چق پڑی ہوئی تھی۔ تاہم اس نے احتیاط سے اپنا سر ڈھانپ لیا۔ اور پیڑھی کھسکا کر قدرے پیچھے ہٹالی۔ پھر کان دھر کر سننے لگی۔ ..... پاؤں کی آہٹ سنائی دی۔ پھر برآمدے کے فرش پر سامان رکھنے کی آواز آئی۔ [illegible] کے بعد لمحہ بھر تک خاموشی طاری رہی۔ پھر تانگہ والے کی بیٹھی ہوئی آواز سنائی دی "سلام صاحب!"

نزہت نے دروازے کے پٹ بھیڑنے شروع کئے۔ (یہ) وہ دروازہ پورے طور پر بند بھی نہ کرنے پائی تھی کہ بوٹوں کی چُرمُر کا شور بہت قریب سے سنائی دیا۔ اور وہ ہڑبڑ کر پیچھے ہٹ آئی۔ گویا کسی اجنبی نے اسے دیکھ پایا تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ لرزتے ہوئے سینے پر رکھ لیا۔ اس کی سانس نسبتاً تیز چلنے لگی۔ اس کی بڑی بڑی سُرمگیں آنکھیں پھیل کر اور بھی بڑی ہو گئیں۔ اس کے نچلے ہونٹ کا ذرا سا حصہ اس کے دانتوں تلے دب گیا۔ لیکن نہیں اجنبی اسے ہرگز نہ دیکھ پایا ہوگا۔

"خاں صاحب!۔۔۔ خاں صاحب!!"

آواز سے اجنبی نوعمر ہی معلوم ہوتا تھا۔ اس کی آواز ٹھہری نہ تھی نہ اس کی آواز میں پختگی اور بھاری پن ہی پیدا ہوا تھا۔۔۔ نزہت کونے میں چُپ چاپ دبکی کھڑی رہی۔ وہ جواب نہ دے سکتی تھی۔ اجنبی کی آواز بھی اس قدر مدھم تھی کہ صحن میں بیٹھے ہوئے نوکر کے کانوں تک بھی نہ پہنچ سکی تھی۔ شاید وہ یہ سمجھا ہو کہ گھر میں یا کوئی نہ کوئی تو ضرور ہوگا۔ دروازہ ابھی کچھ کھلا ہوا تھا۔ دروازہ کے آگے چق ہی سہی۔ لیکن۔ لیکن۔ اجنبی آگے سے ہٹے تو وہ صحن میں جا کر نوکر کو باہر بھیجے۔ اجنبی مدھم سروں میں آوازیں دیتا ہی چلا گیا۔ نزہت کچھ بے جان بُت بنی کھڑی رہی۔ پھر قدرے سکوت کے بعد بوٹوں کی چرمرکی آواز پرے ہٹنے لگی۔ اس نے دبے پاؤں آگے بڑھ کر دروازہ بند کر دیا۔ اور پھر پنجوں کے بل لمبے لمبے ڈگ بھرتی ہوئی نوکر کے قریب پہونچی۔ اور ہانپتی ہوئی کانپتی آواز میں کہنے لگی۔

"عمرو، عمرو!"

عمرو باہر گیا، پھر اندر آیا۔ پھر باہر بھیجا گیا۔ پھر جواب لیکر اندر آیا۔ اس طرح پانچ سات منٹ اسی ہیرا پھیری میں گذر گئے۔ لیکن عمرو اس قدر احمق لڑکا تھا کہ اس کی باتوں سے نزہت کے پلّے کچھ بھی نہ پڑا۔ بس یہی معلوم ہو سکا کہ نو وارد آپا کے کسی دوست کا لڑکا ہے۔ نزہت بچاری عجب مخمصے میں گرفتار تھی۔ آپا کا ڈر کہ کہیں ڈانٹیں کہ اندر کیوں نہ بٹھلایا۔ اور پھر اس نے اخباروں میں یہ بھی پڑھا تھا کہ کس طرح بعض دھوکے باز ٹھگ مہمان بن کر لوگوں کے گھروں میں پہنچ جاتے ہیں ۔۔۔ ہار کر اس نے اسے کونے والے کمرے میں جسے گھر کی بیٹھک کہنا چاہیئے مہمان کو بٹھلایا۔ اور اس کا سامان، ایک بستر، ایک سوٹ کیس اور ایک بیگ ۔۔۔ اندر منگوا لیا۔ اور پھر گھر کے محل دروازے اندر سے بند کر کے باورچی خانہ میں عمرو کے پاس جا بیٹھی۔

"ارے عمرو! کون ہوگا بھلا؟ تم نے کبھی پہلے بھی دیکھا ہے اسے؟"

تھوڑی دیر بعد امی آ گئیں۔ وہ دونوں باورچی خانہ میں ابکے بیٹھے تھے۔ انھوں نے مہمان سے پانی تک کیلئے نہ پوچھا تھا۔ امی کو یہ سب باتیں معلوم ہوئیں تو انھوں نے فوراً عمرو کو مہمان کے پاس بھیجا۔ امی کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ نوجوان مہمان آپا کے کسی دوست کا لڑکا تھا۔ اور اس جگہ امتحان دینے کیلئے آیا تھا۔

عمرو نے واپس آکر زور زور سے چلّاتے ہوئے کہا "جی وہ پانی مانگتے ہیں۔ لوٹا مانگتے ہیں۔ تولیہ مانگتے ہیں"

امی ہاتھ جھٹکا کر بولیں "کمبخت چلّاتا کیوں ہے۔ دیکھو تو کمرا ہانپ رہا ہے۔۔۔"

پھر امی نے نزہت کو ٹرنک میں سے دھوبی کا دھلا ہوا تولیہ نکالنے کے لئے بھیجا۔ وہ آنچل سنبھالتی ہوئی بڑی پھرتی سے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی چل دی۔ اس کے پیچھے پیچھے عمرو ناک سرسراتا ہوا لپکا چلا جا رہا تھا۔ اندر والے کمرے میں پہنچکر نزہت نے لکڑی کا بڑا بکس کھولنے کیلئے ہاتھ بڑھایا۔ عمرو بولا "انھوں نے کہا تھا میرے ٹرنک میں سے نکال کر دو"

"انھوں نے کس نے؟ امی نے!"

"جی نہیں" عمرو نے ہاتھ اٹھا کر اشارہ کرتے ہوئے خاصی بلند آواز میں کہا "انھوں نے۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔ جو آئے ہوئے ہیں۔۔۔"

نزہت اس کی اس قدر بلند آواز سن کر لرز گئی۔ چپت مارنے کے انداز میں ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولی "تجھ سے آہستہ نہیں بولا جاتا کیا؟"

عمرو اپنے ہونٹوں پر خود ہی انگلی رکھ کر خاموش ہو گیا۔ نزہت دل ہی دل میں کشمکش ماری تھی "بیوقوف عمرو۔ مردود کیسا گلا پھاڑ کر چلّاتا ہے"

چمڑے کا سوٹ کیس ابھی تک پلنگ پر جوں کا توں دھرا تھا۔ کمرے کے باقی جانے پہچانے سامان میں یہ چاکلیٹ رنگ کا سوٹ کیس بالکل اجنبی معلوم ہوتا تھا۔ اس کے دونوں کونوں پر نکل کئے ہوئے لوہے کے ٹکڑے چمک رہے تھے۔۔۔ وہ آگے بڑھی۔ سوٹ کیس کے لمس سے اس کی انگلیوں میں ایک ہلکی سی تھرتھراہٹ

کی نرم سی دور گئی ۔ اس نے اس کے بٹن پر انگوٹھا رکھ کر دبایا لیکن لیے اپنی جگہ سے جنبش نہ ہوئی ۔ اس نے اور زور سے دبایا۔ پھر بھی وہ اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ اسی کش مکش میں اس کے سر سے دوپٹہ کھسک گیا۔ لیکن وہ اُسے کھولنے پر تُلی ہوئی تھی ۔ بٹن زور سے دبانے کی وجہ سے اس کا انگوٹھا پیچھے کی جانب گھوم گیا سا۔ اس کے پوروں پر گہرے سُرخ رنگ کی لکیریں نمایاں طور پر دکھائی دینے لگیں ۔ اور پھر دفعتہً انگوٹھا ہٹا اور کنڈا اپنا رخ سے کھل کر اس کے ہاتھ سے ٹکرایا اور وہ ہاتھ پکڑ کر بیٹھ گئی ۔ ... عمرو کی تیلیں نکل آئی ۔

نوکر تولیہ لیکر چلا گیا۔ اور وہ کھلے ہوئے سوٹ کیس ہی کے قریب کھڑی رہی ۔ سوٹ کیس میں سے فنائل کی گولیوں اور خوشبودار تیل کی ملی جُلی بو آ رہی تھی ۔ کپڑے سلیقے سے رکھے نظر آ رہے تھے تین چار رنگ برنگ کی فوٹل ٹائیاں ، ایک کونے میں چار پانچ کالر سفید رومالوں کی تہیں خراب ہو گئی تھیں ۔ فونٹن پن ، نوٹ بک اور چند رنگین لفافے بکھرے پڑے تھے ۔

شام کو جب ابا گھر آئے تو مہمان سے بڑے تپاک سے ملے اور اندر آ کر پوچھتے رہے کہ کہیں اس کی خاطر داری میں کوئی کسر تو نہیں اٹھا رکھی ۔ ان دونوں کی عمر میں تفاوت بھی ہوا تو کیا وہ چھوٹے چھوٹے بچوں تک میں ہل مل جاتے تھے ۔

تھوڑی دیر بعد بچے بھی اسکول سے واپس آ گئے ۔ خوب ہنگامہ رہا ۔ مہمان کی آمد سے گھر میں خوب چہل پہل ہو رہی تھی — رات کیلئے دو قسم کا گوشت سبزی اور دال وغیرہ کا حکم ملا ۔ مردانہ میں سے ابا کے قہقہوں اور بچوں کے چہچہوں کی صدائیں آ رہی تھیں ... تھوڑی دیر بعد نو سالہ توفیق بھاگتا ہوا اندر آیا " امی — امی ہم نمائش دیکھنے کیلئے جائیں گے ۔ خوشی بھی چلے گی ۔ ابا کہتے ہیں کپڑے پہن کر آؤ تمہیں ممتاز بھیا کے ساتھ نمائش میں لے چلیں ... امی بس جلدی کیجئے ، بہت جلدی "

امی نے توفیق کی پیشانی سے بال ہٹاتے ہوئے نزہت سے کہا کہ بچوں کو کپڑے پہنا دے ۔ نزہت آنچل سنبھالتی ہوئی اندر چلی گئی ۔ پیچھے پیچھے چیختے چلاتے بچے ....

نزہت نے کپڑے ٹرنکوں میں سے نکالے ۔

بچے ہانپ رہے تھے ، اُن کے گال تمتما اٹھے تھے ۔ معلوم ہوتا تھا کہ ممتاز بھیا سے ان کی کافی بے تکلفی ہو گئی تھی ۔ ممتاز بھیا کی یہ بات ، ممتاز بھیا کی وہ بات ...! ... " اور پھر آپا !... آپ جانتی ہیں ممتاز بھیا کیسے بیٹھتے ہیں ... ؟" یہ کہہ کر وہ اسٹول پر ٹانگ پر ٹانگ اور ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کر بڑے دلکش انداز سے بیٹھ گیا ۔ اور مسکرانے لگا ... نزہت اسے کنکھیوں سے دیکھتی رہی ... اور پھر ... " آپا آپ کو معلوم ہے کہ ممتاز بھیا ... "

رات کے ساڑھے دس بجے کے قریب وہ لوگ نمائش گاہ سے واپس آئے ۔ بچے چیختے چلاتے گاتے مٹکتے اور رنگ برنگے رنگدار غبارے اڑاتے ہوئے صحن میں داخل ہوئے ۔ بچاری خوشی کچھ تھک سی گئی تھی ۔ اچھا تو ہماری ننھی خوشی کیا شے خرید کر لائی ہے ایک گڑیا ۔ جتنی بڑی وہ خود ہے اتنی ہی بڑی اس کی گڑیا ! اور یہ کیسا ؟ خوشی بیٹیا ، یہ کیا ہے ؟ خوشی پھونک مارتی ہے اور کاغذ میں لپٹا ہوا سانپ سیٹی کی سی آواز نکالتا ہوا دفعتہً امی کی ناک چھو لیتا ہے خوشی کی نیند کی ماتی آنکھیں چمک اٹھتی ہیں ۔ لیکن .... تھوڑی ہی دیر بعد اس پر غنودگی طاری ہو جاتی ہے ۔ باقی لوگ بھی کھانا وانا کھا کر رفتہ رفتہ سو جاتے ہیں ۔ نزہت کھڑکی کے قریب اپنے بستر پر لیٹی ہے ... موسم بیحد خوشگوار ہے ۔ تارے دُھلے ہوئے موتیوں کی طرح چمک رہے ہیں ۔ چاند بادلوں کی اوٹ میں اُٹھا جا رہا ہے ۔

صبح !!

بچے اسکول جانے کے لئے تیار ہونے لگے ۔ گھر کے پچھواڑے ان کی اُجڑی ہوئی بگیا میں ٹماٹر کے چند پودے اُگے ہوئے تھے ۔ ان کی ٹہنیوں سے چند ٹماٹر توڑے گئے ۔ بچوں کو آلو ٹماٹر دینے تھے ۔ اور پھر اس کے بعد " ممتاز بھیا " کے لئے کیا چیز پکے گی ؟ نہ معلوم انھیں کونسی چیز مرغوب ہے ۔ ان سے کون پوچھے ! نزہت خود یہ بات عمرو سے کہنا مناسب نہ سمجھتی تھی ۔ اور امی کو اس بات کا خیال ہی نہ آ سکتا تھا ۔ پھر اسے یاد آیا کہ نومبر کے مہینہ میں اس نے گوبھی بکھائی تھی شاید وہ رکھی ہو ۔ اس خیال سے وہ اٹھی ۔ جب وہ صحن سے گذر کر برامدے میں پہونچی تو عمرو مردانے سے سرپٹ بھاگتا ہوا نکلا اور اس سے ٹکرا گیا ۔ ہکلا ہکلا کر بولا " آپا جی ! ٹھٹ کیا ہوتا ہے ۔ جی وہ جو آئے ہیں وہ ٹھٹ .... ٹھٹ ... ! "

" مجھے ٹوتھ پیسٹ چاہئے ۔ میرے بیگ میں ... "

مردانے سے یہ آواز سن کر نزہت دم بخود رہ گئی ۔ پہلے

وہ الٹے پاؤں دوڑنے لگی۔ اور پھر وہ کمرے کی طرف . . . لیکن تم کہاں ہو؟ . . . . اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا . کسی نے دیکھا تو نہیں۔ . . . بڑی مشکل سے جاکر اس نے بیگ میں سے ٹوتھ پیسٹ اور برش نکال نوکر سے جان چھڑائی ۔ اور خود جلدی سے باورچی خانہ میں چلی آئی ۔

امی سر جھکائے لہسن کی تریاں چھیل رہی تھیں ۔ نزہت کے کان ابھی تک بج رہے تھے ۔ . . . مجھے ٹوتھ پیسٹ چاہیئے . . اس کے جسم میں سنسنی خیز لہریں دوڑ رہی تھیں ۔ جوں جوں وقت گذرتا گیا اس کے کانوں میں آواز کی بازگشت مدھم ہوتی گئی ۔ یہاں تک کہ اس کے کانوں میں نہایت میٹھا اور رسیلا ترنم سا گونجتا رہ گیا ۔

وہ آواز اسے دن میں کئی مرتبہ سُنائی دیتی تھی ۔ مختلف لہجوں اور لوچ کے ساتھ ۔ کبھی بلند قہقہے ، کبھی دبی دبی ہنسی — گھومتے پھرتے آشنا آوازوں میں اس کے کانوں کو یہ آواز بھلی معلوم ہوتی تھی ۔ وہ صرف آواز ہی سُن کر کئی طرح کے تصورات باندھتی تھی ۔ ہر تصور دلفریب ہوتا تھا ۔ اُسے سُنتے رہنے کی دبی دبی سی تمنا اس کے دل میں کروٹیں لیا کرتی ۔ چوری چھپے مردانہ میں جھانکنے کی اُسے جرأت ہی نہیں ہوسکتی تھی ۔ بلکہ اس کے دل میں اس کا خیال تک نہ آیا تھا ۔ . . . لیکن کوئی نازک سا رشتہ اس خیال سے پیدا ہوگیا تھا ۔

جب وہ اِدھر اُدھر کے کاموں میں مصروف ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جاتی تو زیرلب وہ کچھ گنگنایا کرتی ۔ اس نے کبھی کوئی کام کا گیت یا شعر یاد نہ کیا تھا ۔ لیکن دل میں سے کوئی گیت بن کر اس کے لبوں تک آتا تھا ۔ لیکن اس قدر مبہم اور دھندلا تاثر الفاظ میں نہ ڈھلتا تھا ۔ ان جانی اور اَن سُنی دُھن میں صرف ایک گنگناہٹ سی پیدا ہوکر رہ جاتی تھی ۔

شام کے وقت جب ان کے باورچی خانہ کی لوہے کی چادر والی چھت سورج کی روشنی میں جگمگا اٹھتی تھی ۔ تو اس وقت صحن کی دیوار کے ساتھ باہر کی جانب وہ سب لوگ مل کر بیڈمنٹن کھیلا کرتے تھے ۔ نزہت سوکھے ہوئے کپڑوں کو رسیوں سے اتار اتار کر ان کی تہیں بٹھاتی تو اس کی نگاہیں دیوار کے اوپر اٹھ جاتیں ۔ جہاں ریکٹ ایک لمحہ کیلئے گھومتے ہوئے نظر آتے اور پھر گم ہوجاتے ۔ کھلاڑیوں کے پاؤں تلے سے گرد اُٹھ کر ہوا میں منڈلانے لگتی ۔ اور نزہت سوچنے لگتی ۔ اسی گرد میں وہ گرد بھی مل گئی ہوگی جو . . . . بچوں کے شور مچانے اور تالیاں بجانے کی آوازیں سنائی دیتیں " آہا . . . اب ممتاز بھیا کی سروس ہے . . . . اب ممتاز بھیا . . . . ممتاز بھیا " اور کبھی "چڑیا" اُچھل کر صحن میں آن گرتی ۔ اور اگر کوئی آس پاس موجود نہ ہوتا تو وہ "چڑیا" کو اٹھا لیتی ۔ اور پھر عجب الجھن میں گرفتار ہو جاتی کہ اسے باہر پھینکے یا نہ پھینکے . . . . .

کبھی زینت صحن کے ایک کونے میں باورچی خانہ کے سائے تلے بیٹھی انگلیوں کے ناخن ہموار کیا کرتی ۔ عمرو چولھا لیپنے کے لئے مٹی گوندھنے میں مگن ہوتا ۔ اور امی اسے ہدایتیں کرتیں ۔ مردانے سے آواز آتی " عمرو ! . . . عمرو !! " وہ اس آواز کو ہزاروں آوازوں میں سے پہچان سکتی تھی ۔ لیکن عمرو بے خبری کے عالم میں ناچ ناچ کر پاؤں سے مٹی گوندھے جاتا ۔ امی لاپرواہی سے ہاتھ سے پاؤں کو مل مل کر میل کی بتیاں بناتیں اور پھر انھیں جھاڑ دیتیں ۔ کیا مجال جو ان کے کان پر جوں بھی رینگ جائے نزہت دل ہی دل میں کڑھتی . . . .

ایک روز ممتاز بھیا کا کوئی امتحان نہیں تھا شاید ۔ گھر ہی پر بیٹھے رہے بالکل چُپ چاپ ۔ نزہت کچھ گھبرائی اور کچھ لجائی ہوئی ۔ کچھ سمٹی ہوئی اور کچھ لڑکھڑاتی ہوئی اِدھر اُدھر گھومتی رہی ۔ جب وہ باورچی خانہ سے اندر کی طرف یا اندر سے باورچی خانہ کی جانب جانے کے لئے مردانہ کے قریب سے ہوکر گذرتی تو اس کا دل اچھلنے لگتا ۔ لیکن مردانہ میں مکمل خاموشی طاری تھی ۔ کوئی آواز ، پاؤں کی چاپ ، کاغذوں کی کھُسر پُھسر ، گیت کی گنگناہٹ سیٹی یا کچھ — کچھ بھی نہیں ۔ . . . عمرو مردانے کی طرف جاتا تھا ۔ اور لوٹ آتا تھا ۔ لیکن مُنہ سے کچھ نہ پھوٹتا تھا . . . . ہر کوئی کس قدر مطمئن نظر آتا تھا ۔

جب دوپہر کے وقت امی سو گئیں . . . . تو نزہت نے اندر باہر کے کئی چکر لگائے ۔ اور کوؤں کی کائیں کائیں سُنتی رہی ۔ . . . . اس نے صبح سے غسل ہی نہ کیا تھا ۔ وہ بڑے آئینہ کے سامنے بیٹھ گئی ۔ ہفتہ بھر سے اُسے بال تک دھونے کی فرصت نہ ملی تھی ۔ اس نے سوچا کہ وہ بال دھو ہی ڈالے ۔ . . . چوٹی کھول کر وہ آئینے میں اپنے بالوں کو دیکھنے لگی —

یہ بال کیسے ہیں؟ بُرے تو نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ اچھے ہیں، بہت اچھے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ اگر بالوں کی ایک لٹ اس جگہ ہو تو؟ ۔ ۔ ۔ ۔ یا ایک زلف چوٹی کی گرفت سے آزاد ہو کر رُخسار پر لہراتی رہے تو؟ ۔ ۔ ۔ اس نے کنگھی اٹھائی ۔ ۔ ۔ اس کی قمیص کے سب بٹن کھلے ہوئے تھے۔ اس نے ہاتھ اٹھایا تو گریبان کا کچھ حصہ بھی اوپر کو اٹھ گیا۔ ۔ ۔ وہ گھبرا کر ادھر اُدھر کو دیکھنے لگی امی سو رہی تھیں۔ عمرو گھر پر نہیں تھا۔ ہونٹ دانتوں تلے دبا کر وہ دیر تک بیٹھی رہی۔

پھر وہ غسل خانہ میں نہانے کے لئے گئی۔ وہ چُپ تھی۔ کچھ مطمئن تھی، کچھ خوش تھی۔ کچھ بے چین سی تھی۔ غسل خانہ کی دیواروں پر صابن ملے چھینٹوں سے عجب عجب صورتیں بن گئی تھیں۔ جن، پریاں، جنگل، پہاڑ، دریا، جھیلیں سبھی کچھ بنا ہوا تھا۔ وہ دیر تک ان نقوش کی طرف دیکھتی رہی۔ اس نے پہلے کبھی ان کی طرف دھیان ہی نہ دیا تھا۔ لیکن اب جوں جوں وہ غور کرتی ان بے ڈھنگے خطوط کی نئی سے نئی صورتیں بنتی چلی جاتی تھیں۔ کھڑکی کے قریب جس جگہ صابن والی پڑی رہتی تھی صابن کی جھاگ بہہ جانے سے طویل لکیریں ایسے دکھائی دیتی تھیں جیسے سفیدے کے درخت تنے کھڑے ہوں۔ وہ کچھ دیر ان کی طرف دیکھتی رہی۔ ۔ ۔ ۔

پھر اس نے قمیص اتار دی۔ کھڑکی کے پٹ ذرا سے کھلے ہوئے تھے۔ ان میں سے صحن کے کونے میں کھڑا ہوا پپیتے کا پیڑ نظر آرہا تھا۔ ان میں سے دو تو بالکل پک گئے تھے۔ گول، گول، چکنے، باہر سے سخت اندر سے نرم۔ ان کا رنگ بھی کیسا دلکش تھا۔ کم از کم یہ دونوں تو اس قابل تھے ان کو توڑ لیا جاتا —— پیڑ کے بڑے بڑے پتے ہل رہے تھے۔ جب پتے لرز کر ادھر اُدھر ہو جاتے تو دھوپ کھڑکی کے نارنجی رنگ کے شیشوں میں سے گزر کر اندر داخل ہوتی۔ اور اس کے خوش وضع سفیدی مائل گندمی رنگ کے شانے پر جھلملانے لگتی۔ اس کے جسم کی جلد کا رنگ نارنجی رنگ میں گھل مل کر نیا روپ دھار لیتا تھا۔

ممتاز کے امتحانات ختم ہو گئے۔

آخری پرچہ دیکھتے ہی اس نے واپس جانے کی تیاری شروع کر دی۔ اس کے آبا نے ہدایت کر دی تھی کہ امتحانات ختم ہوتے ہی واپس چلے آنا۔ اس کی جو چھوٹی بڑی چیز گھر کے اندر پڑی رہ گئی تھی وہ عمرو ایک ایک کر کے مردانہ میں لے گیا۔ اس کا تولیہ، کوئی کپڑا اور رومال یا ٹائی یا پن —— ہر چیز عمرو بڑی بے جگری سے اٹھائے لئے جا رہا تھا۔ اس وقت وہ چھوٹے پیمانہ پر نادر خاں یا چنگیز خاں بنا ہوا تھا۔ پھر اُسے تانگہ لانے کے لئے بھیجا گیا۔ اس دوران میں آبا کے بے باک مسرت انگیز اور بلند قہقہے سُنائی دیتے رہے۔ تانگہ آنے پر اس میں سامان رکھا گیا اور پھر تانگہ چرخ چوں کر کے چلا اور گولر کے درختوں کے قریب سے گذرتا ہوا پکی سڑک کی طرف گھوم گیا۔

اور رنہت ۔ ۔ ۔ ۔

ساقی بُک ڈپو کی مطبوعات

جالے شمشیر سنگھ نرولا کے بارہ افسانوں کا مجموعہ۔ نرولا جزئیات نگاری میں اپنا جواب نہیں رکھتے وہ ایک ماہر سائنٹسٹ کی طرح باریک سے باریک اور خفیف سے خفیف جزئیات کا تجزیہ کرتے چلے جاتے۔ مجلد۔ قیمت عہ

جزیرے مشہور افسانہ نگار محمد حسن عسکری ایم۔ اے کے آٹھ افسانوں کا مجموعہ۔ عسکری صاحب نے اردو افسانہ نگاری میں ایک جدید و لذیذ طرز بیان کا اضافہ کیا ہے۔ ان کا تخیل بے باک اور طریقۂ اظہار بے لاگ ہے۔ اس میں مندرجہ ذیل افسانے شامل ہیں۔ کالج سے گھر تک۔ پھسلن۔ حرام جادی۔ میلاد شریف۔ چائے کی پیالی۔ اندھیرے کے پیچھے۔ ایک معمولی خط۔ وہ میں۔ کتاب مجلد اور رنگین سرورق سے آراستہ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

سائے شیر محمد اختر کے پندرہ افسانوں کا مجموعہ۔ اختر کے افسانے زندگی کی تصویر ہوتے ہیں۔ طرز بیان نہایت دلکش اور کہانی نہایت مؤثر ہوتی ہے۔ قیمت عہ

ملنے کا پتہ:۔

ساقی بُک ڈپو۔ دہلی

فراق گورکھپوری

جمالِ یار

سر بسر سوز و ساز کا عالم ‖ تیرا نظارہ راز کا عالم
بل پہ بل کھائے جیسے قوس قزح ‖ تیرے قدِ دراز کا عالم
رنگ امواجِ رقصِ صبحِ بہار ‖ روپ، نو دیتے ساز کا عالم
عنبریں زلف میں سمٹ آیا ‖ کچی راتوں کے راز کا عالم
مد میں ڈوبی لقائے رنگیں میں ‖ یہ گنہ کے جواز کا عالم
رمِ دوشیزگی نگاہوں کی ‖ ایک مانوس راز کا عالم
مد میں ڈوبی فضائے نیم شبی ‖ چشمِ عشوہ طراز کا عالم
پچھلی شب کو وہ جسم سر تا سر ‖ آہوئے نیم باز کا عالم
خم بہ خم گیسوئے مسلسل میں ‖ شبِ افسانہ ساز کا عالم
ان نگاہوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں ‖ گل ستاروں کے راز کا عالم
مسکراہٹ کے نیم شعلوں میں ‖ مثلِ شبنم گداز کا عالم
کیف انگیز مست اداؤں میں ‖ دستِ پیمانہ ساز کا عالم
جسمِ رعنا تمام راز و نیاز ‖ سر بسر ساز باز کا عالم
ناز و انداز کے شگوفوں میں ‖ نرگسِ فتنہ ساز کا عالم
چشمکِ برقِ حسنِ کافر میں ‖ نگہِ پاکباز کا عالم
قدِ رعنا میں بھی نکلتا ہے ‖ تیری زلفِ دراز کا عالم
میرے نغموں کی نرم لے میں دیکھ ‖ جنبشِ پائے ناز کا عالم
ہم نے دیکھا ہے نرم اداؤں میں ‖ نگہِ دلنواز کا عالم
سر بسر سوز و سازِ پنہاں میں ‖ مئے مینا گداز کا عالم
پیچ در پیچ گیسوئے شب تاب ‖ تیری عمرِ دراز کا عالم
کیف و کم میں گلابی آنکھوں کے ‖ بادۂ خانہ ساز کا عالم
ڈھونڈھتا ہوں نظامِ ہستی میں ‖ تیرے راز و نیاز کا عالم
گاہ گاہ اس لقائے رعنا میں ‖ ایک قلبِ گداز کا عالم
ہم نے دیکھا ہے دیر تک کھو کے ‖ غم کی عمرِ دراز کا عالم
نگہِ شوخ کے سبھاؤ نہ پوچھ ‖ لے چلے ترک تاز کا عالم
میرے اشعار کے کناؤں میں ‖ حسن کے نیم ناز کا عالم
ایک عالم ہے خلوتِ شب میں ‖ انکشافاتِ راز کا عالم
تیری آواز نور کا تڑکا ‖ نرم آہنگ ساز کا عالم

ان نگاہوں میں گاہ گاہ فراقؔ
جیسے عرضِ نیاز کا عالم

نشور واحدی

زندگی خواب کے اوہام نہیں میرے لئے

لوگ کہتے ہیں کہ ہے زیست بھی اک عالمِ خواب
اور اک غنچۂ نورس کا تبسم ہے شباب
تشنگی اور سراب
دست بازیِ خزاں شعبدۂ فصلِ بہار
اس گلستاں کا ہر اک پھول جراحت کی پکار
ہر نشہ اپنا اُتار!
میں یہ کہتا ہوں کہ دُنیا کی کہانی پہ نہ جا
خوں رگوں میں ہے تو صہبا کی روانی پہ نہ جا
ذوقِ فانی پہ نہ جا
عشق کا چہرہ بدستور سفید اور سیاہ
سوگیا حشر مگر جاگ رہا ہے یہ گناہ
دل ہمہ چشم و نگاہ
زندگی خواب کے اوہام نہیں میرے لئے ——
دیکھتا ہوں میں پسِ پردۂ دیبا و حریر
حُسن کی خندہ جبینی میں شقاوت کی لکیر
زرخرید ایک تبسم کی طرب خیز بہار
عشوۂ ہوش شکار
تنگ میرے لئے جلووں کی بھی آغوش نہیں
میں کسی ہونٹ کی صہبا سے بھی مدہوش نہیں
جادوئے نرگسِ بیمار سے خاموش نہیں
غم فراموش نہیں
قحطِ بنگال مری چشم جہاں بیں میں ہے بند
اور سسکتی ہوئی لاشیں جو جواں مبر ہیں چند
اُن کی بالیں پہ ہوں اک کاسۂ بے آب لئے
حسرتِ ناب لئے!!
غم کی کھڑکی میں سے جھانکوں مجھے یہ وقت کہاں
اور جلووں کی فضا دامنِ احساس کشاں
توڑ سکتا ہوں میں یہ رسمِ کہن کا در و بام
رُوحِ انساں کا مقام!
آج تہذیب کی بنیاد ہے ساماں طلبی
مقصدِ زیست نہیں کچھ بھی یہی ناں طلبی
کارواں دل کا دھڑکتا ہوا جاتا ہے کہیں
کوئی منزل ہی نہیں
بے محبت نہیں ممکن یہ جہنم کا عذاب
نغمۂ جوش سے خاموش ہے جنت کا رباب
لذتِ خونِ جگر ہستیِ ایجاد کا راز
خاک کی عمر دراز!
زندگی خواب کے اوہام نہیں میرے لئے ——
لوگ کہتے ہیں کہ ہے زیست بھی اک عالمِ خواب
اور اک غنچۂ نورس کا تبسم ہے شباب!!

([illegible])

افسانہ نمبر

سنسکرت ناٹک اور اُس کے کردار

بعض قدامت پسند بزرگوں کا کہنا ہے کہ جب سے ہمارے ملک میں انگریزی تعلیم رائج ہوئی ہے ہم نے اپنے ملک کی ہر چیز سے نفرت کرنی شروع کر دی۔ ممکن ہے کہ ان کی اس رائے میں مبالغہ کے ساتھ ساتھ حق ناحق کی بدگمانی بھی شامل ہو جس پر آپ کا جی چاہے تو ان کی ہنسی اڑا دیجئے۔ لیکن یہ بات دل کو لگتی معلوم ہوتی ہے کہ جب انگریزی حکومت کے قائم ہونے کے ساتھ ہی مغربی اور مشرقی تہذیبیں ٹکرائیں تو مشرقی تمدن کا تام جھام چکنا چور ہو گیا۔ انگریزیت نے ہمارے ہوش و حواس پر تسلط جما لیا۔ یوں تو حاکم کے سکھلائے ہوئے ہر سبق پر آمنّا و صدقنا کہنا محکوم کیلئے ہر حال میں ناگزیر ہے ہی پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نئی نویلی تہذیب کی چمک دمک نے کچھ ایسا چاؤ پیدا کیا کہ ہم اپنی ہر چیز اور ہر فعل کو انہی کی آنکھ سے دیکھنے اور ہر بات کو انہی کی طرح سوچنے پر مجبور ہو گئے۔ رفتہ رفتہ یہ شوق ایسا لاحق ہوا کہ روزمرّہ کی زندگی میں بھی بغیر انگریزی کے نوالہ توڑنا محال ہو گیا۔ یہ نہیں کہ اس طرح ترے گھاٹے ہی میں رہے۔ فائدہ ہوا اور بہتیرا ہوا۔ پر اس کا کیا علاج کہ اپنی بہت سی انمول چیزوں کو جو مغربی عینک سے کچھ لونگی بیڈھنگی سی نظر آئیں دھڑا دھڑ طاقِ نسیاں پر سجاتے رہے۔ اور پھر ہمیشہ کیلئے ان کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں۔ ہمارے بہت سے پرانے فن اسی بے قدری کی نذر ہو گئے۔ جن کا کھوج آج ڈھونڈنے نہیں ملتا۔ ہاں اگر کبھی ہماری کسی گری پڑی چیز کی جھوٹے منہ تعریف ہو گئی تو ہم بھی اس کی طرف بغلیں بجا بجا کر لپکے اور اپنی خوبیٔ قسمت پر ناز کرنے لگے۔ عمر خیام بیچارے کو زندگی بھر اور اس کے بعد بھی کسی نے دو کوڑی کو نہ پوچھا۔ پر جیسے ہی اس کی نظموں کا انگریزی ترجمہ مغربی کسوٹی پر پورا اترا، اور دو ایک مغربی ادیبوں نے اوپری دل سے اس کی تعریف کر دی ہم بھی اس کے جائز وارث بن بیٹھے اور لگے تعریفوں پر تعریفیں کرنے۔ یہی حال ٹیگور کا ہوا۔ مگر شکر ہے کہ ان کی زندگی میں ہی ان کے انگریزی قدردان پیدا ہو گئے۔ جن کی وساطت سے ہم بھی انھیں پہچاننے لگے ورنہ وہ بھی اپنی طرح کے سیکڑوں بدنصیب پیشرؤں کے ساتھ آج تک بن پوچھی پہیلی ہی بنے رہتے۔

کچھ ایسی ہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ جب ۱۷۸۹ء میں سر ولیم جونس نے کالی داس کے ناٹک "شکنتلا" کا انگریزی میں ٹوٹا پھوٹا ترجمہ کیا تو مغربی دُنیا میں ہلچل سی مچ گئی۔ اور انھیں یہ معلوم کر کے بڑی حیرت ہوئی کہ "ہیں! سنسکرت زبان میں بھی ڈرامے ہوتے ہیں"۔ سر ولیم جونس نے سنسکرت زبان کا جلدی ہی آدھا کچّا اور آدھا پکّا جیسا کچھ بھی اوندھا سیدھا علم حاصل کیا تھا اُسی کے سہارے انھوں نے شکنتلا کا ترجمہ کر ڈالا۔ یوں بھی شاعری کا ترجمہ کرنا قریب قریب ناممکن ہے اور پھر کالی داس کی شاعری کا۔ اس لئے یہ کیسے امید کی جا سکتی تھی کہ ان کا ترجمہ، ترجمہ کہلانے کے لائق بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن اس ٹوٹے پھوٹے ترجمے کو دیکھ کر یورپ کے اکثر ادیب مچل گئے۔ اور جب جرمنی کے سب سے بڑے شاعر گوئٹے نے اس کی تعریف کر دی تو اس کی مقبولیت میں اور بھی چار چاند لگ گئے۔ یہاں گوئٹے کی رائے کا انگریزی ترجمہ دلچسپی کیلئے نقل کرتا ہوں۔

Wouldst thou the young year's blos-
soms and the fruits of its decline,
And all by which the soul is charmed,
enraptured, fed,
Wouldst thou the earth and Heaven
itself in one sole name combine,
I name thee O, Shakuntala! and all
once is said.

"کیا آپ بہار کی نو شگفتہ کلیوں اور خزاں سے
بچے ہوئے پھلوں کے خواہاں ہیں۔ کیا آپ کی
ایک ہستی میں دُنیا جہان کی ایسی نعمتیں چاہیے
ہیں جن سے رُوح وجد میں آ جائے بھرا ہے
فرصت اور بالیدگی نصیب ہو تو میں شکنتلا
کا نام لیتا ہوں جس میں یہ ساری خوبیاں موجود ہیں"

گوئٹے کی ان سطروں نے سنسکرت ڈرامے کے مطالعہ کو ترقی دینے میں بڑا کام کیا۔ سچ پوچھئے تو ادبی دنیا میں سنسکرت ڈرامہ کا بھرم ہی گوئٹے کی اس رائے سے قائم ہوا۔ اس کے بعد سنسکرت ڈرامے کو مطالعہ کا شوق ابھرنے لگا۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ آج ہم ہندوستانیوں میں بھی اُن کی طرف جو ذرا اظہار شغف نظر آتا ہے۔ وہ بھی سر ولیم جونس اور گوئٹے کی بدولت ہے تو اسے مبالغہ نہ سمجھئے۔

(اسی کے دیکھا دیکھی اور بھی چند ناٹکوں کے انگریزی ترجمے ہونے شروع ہوئے۔ جن میں راجہ شودرک کا مرچھ کٹیک خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ آرتھر سائمن نے اس کا انگریزی ترجمہ کیا پھر جرمنی اور دوسری زبانوں میں ترجمہ ہوا۔ لندن، برلن اور میونخ میں یہ ڈرامہ کئی بار اسٹیج ہو چکا ہے۔)

نقد حضرات کی توجہ کے باوجود سنسکرت ڈرامے کو جو اہمیت اور مقبولیت حاصل ہونی چاہئے تھی وہ نہ ہو سکی۔ سب پڑھنے والے گوئٹے نہ تھے۔ جو انگریزی یا دوسری زبانوں کے ترجموں سے اصل کی خوبیوں کا اندازہ لگا سکتے۔ اس کے علاوہ انگریزی کا مذاق جو ہمارے رگ و ریشے میں رچا ہوا ہے اس نے سنسکرت ڈرامہ کی اصل خوبیاں سمجھنے میں اُن سے لطف اندوز ہونے میں رکاوٹ ڈالی۔ کسی ملک کے ادب یا فن کو دوسرے ملک کے ادب یا فن کے معیار و اصولوں سے جانچنا بھی بے انصافی ہے۔ اور سنسکرت ڈراموں کے ساتھ جان بوجھ کر یہ بے انصافی روا رکھنے کا سبب ہماری وہی "انگریزیت" کی بے لبسی ہے جو بُری طرح لاحق ہے۔

اس معاملہ میں ایک طالب علم کو جن مشکلوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے ان میں سب سے بڑی یہ ہے کہ اور زبانوں کو چھوڑ خود سنسکرت زبان میں ایک بھی ایسی کتاب نہیں ہے جس سے سلسلہ وار یہ پتہ چل سکے کہ سنسکرت ڈرامہ کس طرح شروع ہوا۔ وہ کون سے اصول تھے جن کی بنیاد پر پہلا سنسکرت ڈرامہ لکھا گیا۔ کس کس نے اس میں سُدھار کئے۔ کون کونسی نئی راہیں نکالیں پھر کس طرح سنسکرت ڈرامہ اپنے عروج تک پہنچا۔

بنیادی اصولوں اور ڈرامے کے ڈھانچے کو سمجھانے والی دو چار کتابیں تو ہیں۔ لیکن ترتیب وار اس کے تمام پہلوؤں کی تدریجی ترقی پر روشنی ڈالنے والی ایک بھی کتاب نہیں۔ اس طرح کی اگر کوئی کتاب بھی ہوتی تو سنسکرت کی تاریخ کے بارے میں جس کھینچا تانی سے آجکل کام لیا جا رہا ہے ایسا نہ ہوتا۔ نام نہاد محققوں کو یہ میدان ایسا اچھوتا مل گیا ہے کہ اپنی اپنی بساط بھر کھل کھیل رہے ہیں اور قیاس کے گھوڑے دوڑا رہے ہیں۔ نت نئے نظریئے قائم کئے جا رہے ہیں۔ اور ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر دُور دُور کی کوڑیاں فراہم کی جا رہی ہیں۔ پھر بھی ٹھیک ٹھیک یہ نہیں بتایا جا سکتا کہ سنسکرت ڈرامہ کب اور کس طرح شروع ہوا اور کن دوروں سے گذرتا ہوا ایسی شکل میں آیا جو کالی داس۔ بھوبھوتی اور راجہ ہرش کے ڈراموں میں نظر آتی ہے۔ ابھی تک اس بارے میں بہت سی الجھنیں ہیں اور محقق کسی ایک رائے پر اتفاق نہیں کرتے۔ یہاں دو ایک ایسے نظریوں کا ذکر دور از کار نہ معلوم ہوگا۔ جو عام طور پر مشہور ہیں۔

سب سے پہلا نظریہ اُن یورپی مستشرقین کی طرف سے پیش کیا گیا ہے جو ایشیا کے ہر کمال علم و فن کا ماخذ آنکھ بند کر کے ایشیا کے باہر دیکھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ سنسکرت ڈرامہ سر تا سر یونانی ڈرامے کی نقل ہے، بلکہ جوش میں یہاں تک کہہ گئے کہ ہندوستان میں ڈرامہ آیا ہی یونان سے۔ اپنے اس دعوے کے ثبوت میں سب سے بڑی دلیل جو یہ لوگ پیش کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ سکندر اعظم کے حملہ کے بعد موریہ اور گپت راجاؤں کے تعلقات یونانی سرداروں سیلوکس وغیرہ سے بڑھے۔ ساتھ ہی تمام مشرقی بندرگاہوں اور تجارتی مرکزوں پر یونانی نو آبادیاں قائم ہوئیں۔ جہاں کہا جاتا ہے کہ یونانی تفریح طبع کیلئے ڈرامے کیا کرتے تھے۔ وہیں سے ان کی نقل پر سنسکرت ڈرامے کی داغ بیل ڈالی گئی۔ اگر یہ ممکنات تسلیم بھی کر لئے جائیں تو بھی یہ نتیجہ لازم نہیں آتا کہ سنسکرت ڈرامہ یونانی آرٹ کی نقل ہے۔ کیونکہ اور باتوں کو چھوڑ دونوں ملکوں کے ڈراموں میں ان کے بنیادی اصولوں اور ترتیب وغیرہ میں اس قدر تضاد ہے کہ ان کے مابین کوئی وجہ اشتباہ باقی نہیں رہتی۔ پھر سنسکرت ڈرامہ تو سکندر کے ہندوستان میں آنے سے بہت پہلے موجود تھا۔ کئی ڈرامے لکھے جا چکے تھے جن کا ذکر رامائن اور مہا بھارت میں ملتا ہے۔ یہ نظریہ محض تعصب پر مبنی ہے۔ اور جدید روشن خیال عالموں (ڈاکٹر میکڈونل۔ ڈاکٹر کیتھ وغیرہ) نے اسے ہر طرح غلط ثابت کر دیا ہے۔

دوسرا نظریہ یہ ہے کہ قدیم ہندوستان میں آریہ ایسے ہَوَن اور یگیہ وغیرہ کیا کرتے تھے جو کئی کئی دنوں کے بعد ختم ہوتے تھے۔

ان میں شریک ہونے کیلئے دور دور سے عالم، گیانی اور ماہرین فن آتے تھے۔ دن اور رات کے تپ کے بعد جب یہ یگیہ ختم ہو جاتے تھے تو تفریحاً گانے بجانے کے جلسے ہوتے تھے۔ سام وید اور سنسکرت کی لمبی لمبی نظمیں لے کے ساتھ پڑھی جاتی تھیں۔ روایت ہے کہ والمیکی نے رامائن کو گا کر پڑھنا پہلے لُو اور کُش کو سکھایا تھا۔ اور جب یہ دونوں رشیوں کی محفل میں دردناک گاتے تھے تو سب جھوم جھوم اٹھتے تھے۔ غرض اس طرح اس محفل میں گانا اور ناچ رنگ ہوتا تھا۔ جس نے آہستہ آہستہ ناٹک کی شکل اختیار کر لی جو اتنے مقبول ہوئے کہ یگیوں کو چھوڑ مذہبی تیوہاروں اور میلوں میں بھی جاری ہو گئے۔ انہی جاتراؤں سے ناٹک کا آغاز ہوا۔ بہت سے ایسے ناٹک ہیں جو اسی طرح کے میلوں اور جاتراؤں کے موقع پر کھیلے گئے۔ بھوبھوتی کے بیشتر ڈرامے پہلی بار جاتراؤں میں ہی پیش کئے گئے۔ بہت سے ڈرامے بسنت اور ہولی کے تیوہاروں پر کھیلنے کے لئے لکھے گئے۔ ان ڈراموں میں بھی اس بات کا ذکر کیا گیا ہے اس لئے بہت سے لوگ یہ مانتے ہیں کہ ہندوستان میں ناٹک پہلے جاتراؤں کیلئے لکھے گئے بعد میں رائج ہو گئے۔

تنبیہ النظر یہ بھرت کی مشہور کتاب "ناٹیہ شاستر" میں ملتا ہے۔ سنسکرت ڈرامے پر سنسکرت میں جو سب سے پرانی اور مستند کتاب ملتی ہے وہ یہی ہے۔ باقی جتنی کتابیں لکھی گئیں وہ سب اسی سے ماخوذ ہیں۔ اس کتاب میں ناٹک شروع ہونے کی داستان اس طرح بیان کی گئی ہے :-

"ترتیا یگ میں جب برہما (قادر مطلق) نے دیوتاؤں کو حواس خمسہ کی نعمت عطا کی تو مخلوق پھولی نہ سمائی مگر کچھ ہی دنوں بعد اداس سی رہنے لگی کیونکہ کوئی چیز ایسی نہ تھی جو بیک وقت چشم و گوش کی ضیافت کا سامان بہم پہنچا سکتی۔ آخر ایک دن سب دیوتا مل کر اندر مہاراج کے پاس گئے اور عرض کی کہ من کی پیاس بجھائے نہیں بجھتی۔ خالی بیٹھے بیٹھے زندگی اجیرن ہو گئی۔ آپ برہما کے حضور میں عرض کریں کہ وہ کسی ایسے سامان کا ڈول ڈال دیں جو جنت نگاہ اور فردوس گوش بن سکے۔ اندر مہاراج تو رنگیلے رسیا ہی تھے فوراً گئے اور برہما کے حضور میں ساری بپتا بیان کر دی۔ اور کہا کہ چاروں ویدوں سے معمولی ان پڑھ آدمی فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ کوئی ایسی تدبیر کیجئے کہ یہ سب لوگ آسانی سے فائدہ بھی اٹھا لیں۔ اور چاروں ویدوں کی اچھی اچھی باتیں بھی سیکھ لیں۔

برہما نے جنسے گیان دھیان کیا اور بجز نکسے ایک چمکیلا موتی "ناٹیہ وید" نکال لائے۔ انھوں نے رگ وید سے خوش الحانی، سام وید سے موسیقی، یجروید سے حرکات و سکنات نقل کرنے کا فن اور اتھروید سے جذبہ و اظہار کی قوت لیکر یہ پانچواں وید مرتب کیا۔ اور کہا کہ اس وید میں تمام علم و فن کہانی کی صورت میں پیش کئے جائیں۔

जग्राह पाम्व मृग्वेदात्सामभ्यो गीत मेव च।
यजुर्वेदादीभनयान रसानाथर्वणादीप॥

جب ناٹیہ وید کی تدوین ختم ہو گئی تو برہما نے سورگ کے سب سے بڑے معمار وشوکرم کو حکم دیا کہ اندر اسن میں ناٹک گھر تیار کریں۔ برہما نے بہت سے دیوتاؤں اور اپسراؤں کو اداکاری کا فن خود سکھلایا اور بھرت نامی رشی کو اسٹیج کا مہتمم مقرر کیا۔

مذہبی روایتوں سے قطع نظر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح ہندوستان کے قدیم حکماء یہاں کے تمام علوم و فنون کو غیر معمولی اہمیت دینے کیلئے اُن کے ماخذ کو دیوتاؤں سے منسوب کرتے تھے۔ اسی طرح بھرت جی نے بھی اپنی تمہید میں ڈرامے کی ایجاد کا سہرا دیوتاؤں کے حوالے سے اپنے سر باندھنے کی کوشش کی۔ جیسے فارسی اُردو والے سبب تالیف کتاب میں ندائے غیبی اور ہاتف سے استصواب کرتے ہیں۔

رگ ستال میں کس قسم کے ڈرامے کھیلے جاتے تھے ان کا ذکر بھی لطف سے خالی نہیں۔ بھرت جی یوں بیان کرتے ہیں :

त्रैलोक्यस्यास्य सर्वस्य नाट्य भावानुकीर्तनम
क्वचिद्धर्मः क्वचित्क्रीडा क्वचिदर्थः क्वचिच्छ्रम.
क्वचिद्धास्यं क्वचिद्युद्धं क्वचित्काम क्वचिद्वध:

लोक वृत्तानुकरणं नाट्यमेतन्मया कृतम्।
उत्तमाधममध्यानां नराणां कर्म संश्रयम्
सर्वोपदेशजननं नाट्यं लोके भविष्यति॥

दुःखार्तानां, श्रमार्तानां, शोकार्तानाम तपस्विनाम
विश्रान्त जननं काले नाट्यमेतद् भविष्यति॥

न तज्ज्ञान न तच्छिल्पं न सा विद्या न सा काला

नासौ योगो न तत्कर्म, नाट्ये ऽस्मिन् यन्न दृश्यते

योऽयं स्वभावो लोकस्य सुखद: खसमन्वित:
सोऽङ्गाद्यभिनयोपेतो नाट्यमित्यभिधीयते॥

"ناٹک میں دُنیا کے تمام لوگوں کے جذبات پیش ہونے لگے۔ کہیں مذہبی باتیں، کہیں کھیل، کہیں ہنسی، کہیں لڑائی، کہیں محبت، کہیں عالم اسباب کی بے ثباتی۔ کہیں ترکِ دُنیا۔ سب ہی باتیں اس میں تھیں دنیا والے جن راستوں پر چلتے ہیں اور جو کچھ کرتے ہیں، اچھے آدمی اور معمولی آدمی اور بڑے آدمی جو جو کچھ اور جس جس طرح کرتے ہیں اسکی نقل اس طرح پیش کرنا کہ وہ اصلی معلوم ہوں اور اس میں نصیحت بھی ہو اور لطف بھی آئے۔ یہ ناٹک کا مقصد ہے۔ دن بھر کے تھکے ہوئے دکھی اور غمگین لوگوں کے دلوں میں یہ ناٹک تازگی، لطف اور خوشی پیدا کرتے ہیں۔ دُنیا کا کوئی ایسا علم نہیں۔ کوئی ایسا فن نہیں اور کوئی ایسا کام نہیں اور نہ ایسے جذبات ہیں جنھیں ان ناٹکوں میں پیش نہیں کیا جاسکتا۔ لوگوں کے سُکھ دکھ، چال ڈھال، بات چیت اور ساری عادتوں کو جسمانی حرکتوں سے، بولوں کے ذریعے، گا کر یا اور بلا بولے صرف ناچ کے ساتھ پیش کرنے کو ناٹک کہتے ہیں۔"

"سببِ تالیفِ کتاب" کچھ ہی ہو اس میں شک نہیں کہ بھرت مُنی کی ناٹیہ شاستر سنسکرت کی اہم ترین تالیف ہے۔ اور سنسکرت ڈرامے کے بارے میں یہی کتاب مُستند پائی جاتی ہے۔

اس کتاب سے ناٹک کے آغاز کے بارے میں ایک اور نظریہ کو تقویت ملتی ہے۔ اور یہ چوتھا نظریہ مختصراً یہ ہے کہ ناٹک۔ ناٹیہ یعنی ناچ کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔ یہی نظریہ قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے۔ اور عام طور پر سنسکرت کے عالم اس پر اتفاقِ رائے بھی رکھتے ہیں۔

کم و بیش سب ہی ناٹکوں میں شاعری کے ساتھ ساتھ سنگیت اور ناچ کا بہت بڑا عنصر ہوتا ہے۔ بھرت کے ناٹیہ شاستر کے مطالعے سے یہ اچھی طرح معلوم ہوسکتا ہے کہ پرانے زمانے میں ناچ کا فن اپنے منتہائے کمال کو پہونچا ہوا تھا۔ اسی کے بارے میں استاذی پنڈت گنگادھر جی کی رائے ہے کہ:۔

"عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ جسم کی حرکت، تڑک بھڑک، طرح طرح کی بنک ٹھنک، آنکھیں تیورانا، کمر لچکانا، کوٹھے مٹکانا، ہاتھ ہلانا ساتھ ساتھ پازیبوں کی چھاچھم سے بول نکالنے کا نام ناچ ہے۔ لیکن جس طرح ایک نظم میں الفاظ چُست اور میٹھے ہوں۔ زبان میں روانی ہو۔ بحر بھی ٹھیک ہو اور قافیہ کا بھی تُک سے تُک ملا ہوا ہو لیکن مطلب کچھ نہ ہو تو یہ تُک بندی نظم نہیں کہلائی جاسکتی۔ اسی طرح جس ناچ میں سب ساز و سامان ٹھیک ہو لیکن کسی جذبے کو پوری اداکاری کے ساتھ نمایاں نہیں کیا گیا ہو تو خود ناچ نہیں ایک طرح کی ہلکی پھلکی ورزش ہوسکتی ہے۔ دل کے اندرونی جذبے کو زبان ہزار کوشش سے بھی پوری طرح بیان نہیں کرسکتی۔ ناچ میں ذرا سی جنبش، ہاتھ یا کمر کے لطیف اشارے سے اس جذبے کا ٹھیک ٹھیک نقشہ کھینچ سکتا ہے۔ گویا جذبات کی مجسم تصویر سامنے آجاتی ہے۔ اسی وجہ سے قدیم حکماء نے ناچ کو سب سے بڑا فن مانا ہے جس کے ذریعے خاموشی مکمل تصویر بن جاتی ہے۔ جس کے مقابلہ میں کلام و بیان کی کوئی حقیقت نہیں۔"

بھرت مُنی نے ناٹیہ شاستر میں ایک سو آٹھ ناچوں کا پوری تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ اور تصویریں اور نقشے بھی دیئے ہیں۔

دیپک کی تین قسمیں مانی گئی ہیں:۔

ناٹیہ:۔ ایسا ناچ جس میں اداکاری کے ساتھ کچھ بولنا بھی ہو۔

نرتیہ:۔ ایسا ناچ جس میں اداکاری ہو۔

نرت:۔ صرف ناچ۔

ان میں پہلی دو قسموں یعنی ناٹیہ اور نرتیہ کی ترقی کے ساتھ ساتھ شاعری اور مکالمے بھی ترقی کرتے گئے اور یوں بھاس اور مہاراجہ شودرک سے لیکر کالیداس، بھوبھوتی اور راجہ ہرش دیو اور ان کے بعد کے دو ایک مصنفین کے ہاتھوں ڈرامے نے ترقی پائی۔

نفسِ مضمون ناٹک کے کردار اور اس میں بنیادی جذبے یا کیفیت کے اعتبار سے سنسکرت ڈرامہ کی ہزار ہا قسمیں ہیں جو صبر آزما تفہیم چاہتی ہیں۔ اصول صرف یہ ہے کہ ہر قسم کے کردار اور ہر ایک رس کیلئے ایک علیحدہ قسم کا ڈرامہ ہوتا تھا۔ چند موٹی موٹی قسموں کا ذکر کرتا ہوں۔

۱۔ ناٹک۔ یہ ڈرامے کا مکمل اور اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔ اس کا قصہ تاریخی ہو یا فرضی یعنی خیالی۔ یا پُران کی یا دیومالا سے اخذ کیا گیا ہو اس ڈرامے کے بڑے کردار اعلیٰ طبقے کے ہوں یعنی دیوتا

او نگار یا راجہ وغیرہ۔ اور زبان نہایت فصیح و بلیغ ہونی چاہیئے۔

کالیداس کے تینوں ڈرامے شکنتلا، وکرم اور وشی اور مال وکاگنی متر اور بھو بھوتی کے دو ڈرامے اتر رام چرتر اور مالتی مادھو اسی قسم کے ہیں۔

۲۔ پرہسن۔ اس کا تعلق ہجو ملیح سے ہے۔ موضوع حد درجہ تمسخر آمیز ہو۔ اسے انگریزی، فارسی اور برلسک کا مترادف سمجھئے۔ اس قسم کے ڈراموں میں بالعموم ناستک، دہریئے اور لالچی برہمنوں کا خاکہ کھینچا جاتا ہے۔ اس میں کرداروں پر کوئی پابندی نہیں۔ پیٹو برہمنوں سے لیکر سپاہی، خواجہ سرا، قاصد اور چور اچکے جواری سب ہی طرح کے لوگ شامل ہو سکتے ہیں۔ مکالمے مزاحیہ ہوتے ہیں اور زبان جان بوجھ کر ادنیٰ قسم کے لوگوں کی غلط سلط لکھی جا سکتی ہے۔

۳۔ سموکار۔ دو یا تین ایکٹ کا سیدھا سادا ڈرامہ جس میں کسی دیوتاؤں اور راکششوں کی جنگ کا قصہ پیش کیا جائے۔ اس قسم کے ڈرامے میں جنگجوئی اور جانبازی کے کارنامے ہونے چاہئیں۔

۴۔ ڈیم۔ اس کا مضمون ہول آفریں، ڈراؤنا اور عبرت انگیز ہوتا ہے۔ محبت اور مسرت کا اس میں نام کو بھی ذکر نہیں ہوتا ظلم اور بھیانک حسد کینہ ضروری ہیں۔ مار دھاڑ۔ پاگلوں کی سی حرکتیں۔ چاند اور سورج گرہن کے مناظر سب جائز ہیں۔ اس کے کردار دیوتا یا راکشش اور شاذ و نادر کوئی بہادر راجہ ہو سکتا ہے۔ ہرلیشچندر اسی قسم کا ڈرامہ ہے۔

۵۔ بھان۔ ایک ایکٹ کا ڈرامہ۔ اس میں ایک ہی شخص آپ بیتی سُناتا ہے۔ اگر کہیں مکالمے کی بھی تو خود ہی دوسرے کی آواز بنا لیتا ہے۔

۶۔ پرکرن۔ یہ ناٹک سے ملتا جلتا ہے صرف اس فرق کے ساتھ کہ ہیرو کیلئے دیوتا یا راجہ ہونا ضروری نہیں۔ کوئی اوسط درجہ کا اہلکار، امیر برہمن، دُکاندار، ساہوکار یا سوداگر اس کا ہیرو ہوتا ہے۔ اور ہیروئن بھی اپسرا یا اپسرا کی بیٹی کی جگہ کوئی اعلیٰ خاندان کی لڑکی یا ویشیا ہو سکتی ہے۔ ویشیا سے مراد فاحشہ نہیں بلکہ ایسی صاحبِ عصمت آزاد خیال لڑکی سے مُراد ہے جو ناچ گانے کی شوقین ہو اور مردوں کی صحبت میں شریک ہوتی ہو۔

۷۔ کھٹی۔ اعلیٰ درجے کی ظرافت کا نمونہ۔ کرداروں کی تعداد دو یا تین جس میں ہیروئن بالخصوص چالباز، مکار اور رموزِ عشق سے واقف ہوتی ہے۔ جو لاگ لپیٹ کی باتوں سے اپنے چاہنے والے کی آتشِ محبت کو بھڑکاتی ہے۔

۸۔ اہام برگ۔ سنجیدہ قسم کا ناٹک جس میں ہیرو کوئی دیوتا اور ہیروئن کوئی رانی ہوتی ہے۔ مضمون درد انگیز لیکن خوش انجام۔

اس تقسیم سے ظاہر ہوگا کہ موضوعِ سخن اور افراد ڈرامہ کا کس التزام سے خیال رکھا جاتا تھا۔ نفسِ مضمون میں کرداری اور اس میں خفیف سا رد و بدل بھی سرے سے ڈرامے کی قسم ہی کو بدل دیتا تھا۔ اس لحاظ سے کسی ڈرامے کی قسم کو جانچنے کیلئے ان تینوں باتوں کا پورا پورا لحاظ رکھا جانا ضروری ہے۔ اوّل وستو یعنی پلاٹ۔ دوم نیتا یعنی ڈرامہ کا ہیرو۔ اور سوم رس یعنی ڈرامہ کا اصل جذبہ۔

وستو یعنی پلاٹ کی ترتیب کے ۵ ارکان ہیں۔

۱۔ مکھم یا آرمبھ۔ ایسے ابتدائی واقعات جن پر قصے کی بنیاد ہو۔ یا کوئی ایسا فعل جس سے قصہ شروع ہوتا ہے (مثلاً رتنا ولی میں منتری ساگاریکا کو راجہ کے حرم میں داخل کرنے کی تدبیریں کرتا ہے۔ یا وکرم اور وشی میں پریوں کے کوبیر کے دربار سے آتے ہوئے کیشی راکشش کا اروشی کو اڑا لے جانا۔)

۲۔ پراتی مکھم یا تین۔ قصہ کی ترقی۔ ایسی باتوں کا ظہور میں آنا جو آئندہ واقعات کا پیش خیمہ ہوں۔ (رتنا ولی میں واسیدوں کو اس کا علم ہونا کہ راجہ ساگریکا فریفتہ ہے۔ مہارانی کا بھی ماتھا ٹھنکتا ہے۔ وکرم اور وشی میں اروشی کا راجہ کے باغ میں آکر ملنا)

۳۔ گربھ۔ ایسے واقعات کا جمع ہونا جن سے امید کے خلاف نتیجہ نکلتا نظر آتا ہے۔ (رتنا ولی میں لباس کی یکسانیت کی وجہ سے راجہ غلطی سے ساگریکا کے بدلے خود رانی سے اظہارِ عشق کرتا ہے۔ وکرم اور وشی میں اروسی اندر کی محفل میں لکشمی سوئمبر کے ڈرامے میں پارٹ کرتے ہوئے بجائے پرشوتم کی بجائے پرور اس کا نام لے ہے۔ بھرت جی ناراض ہو کر شراپ دیتے ہیں)

۴۔ اورکش۔ ایسے واقعات جن سے معلوم ہو کہ قصہ بظاہر رُک گیا اور اب حسبِ توقع نتیجہ کی کوئی امید نہیں۔ (رتنا ولی میں رانی کو سارا حال معلوم ہوتا ہے۔ وہ بُری طرح ناراض ہے اور سب حیران ہیں کہ اب کیا ہوگا۔ وکرم اروشی میں اروشی بیل میں بدل جاتی ہے۔ اور بظاہر مایوسی ہی نظر آتی ہے۔)

۵۔ بھلاگم یا نرودھن یعنی تکمیل کار۔ سارے واقعات کے متوقع

سے ایک مستقل نقش نتیجہ مرتب ہوتا ہے اور قصہ ہنسی خوشی ختم ہوجاتا ہے (رمناولی ۔ غم کے بادل چھٹ جاتے ہیں ۔ اسرار اور بھید کھلتے ہیں اور طالب و مطلوب مل جاتے ہیں ۔ وکرم اروشی راجہ کو سنگ مینا ملتا ہے جس کی وجہ سے اروشی بیل سے پھر انسانی روپ میں آجاتی ہے ۔ اور دونوں ہنسی خوشی مل جاتے ہیں)

تقسیم مضامین اور وستو کی ترتیب ذہن نشین کرنے کے بعد کرداروں کے نقش و نگار اچھی طرح سمجھ میں آسکتے ہیں ۔

کردار :۔ ناٹک کے اہم ترین افراد ہیرو اور ہیروئن ہی ہیں ۔ کم و بیش سارے ہی ڈراموں میں انہی پر زیادہ زور دیا جاتا ہے اور باقی کرداروں کی طرف اتنی توجہ نہیں دی جاتی ۔ چونکہ ناٹک کی ہزار ہا قسمیں مقرر ہیں ۔ اس لئے ہر طبقے کے کیریکٹر کے لئے گنجائش ہے ۔ کہ وہ کسی نہ کسی ڈرامے کا ہیرو بن سکے ۔ لیکن اعلیٰ درجے کے ہیرو (ناٹک) صرف دیوتا، اوتار یا راجہ مہاراجہ ہوتے ہیں ۔ ذاتی اوصاف کے اعتبار سے ناٹک کی چار قسمیں مقرر ہیں ۔

للت :۔ زندہ دل، خلیق، خوش مذاق، فنون لطیفہ کا دلدادہ (جیسے انٹونی)

ودات :۔ سنجیدہ ۔ عالی حوصلہ ۔ اعتدال پسند ۔ مستقل مزاج (جیسے اوتھیلو)

یودت :۔ بلند نظر، پُرجوش، مغرور اور طاقتور (جیسے رچرڈ سوم میکبتھ)

شانت :۔ حلیم اور نیک مزاج (جیسے بروٹس)

ان چار اقسام کی تقسیم در تقسیم ہوتی چلی گئی ہے اور انسانوں کے علاوہ دیوتاؤں کو ملا کر ہیرو یعنی ناٹک کی کل ۱۴۸ قسمیں مقرر ہیں ۔ جن پر تبصرہ کرنا محال ہے ۔ اصول صرف یہ ہے کہ چونکہ ڈراموں میں عام طور پر حسن و عشق کا ذکر ہوتا ہے ۔ اس سے ایک عمدہ ناٹک میں یہ چند صفات لازمی طور پر ہونی چاہئیں ۔

طاقت، شجاعت، روشن دماغی، فصاحت، خوش اخلاقی، قبول صورتی، خوش طبعی اور عیش پرستی ۔

ناٹک کی طرح نائکہ یعنی ہیروئن کی بھی سینکڑوں قسمیں ہیں چند کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا ۔

۱۔ سوادھن پتریکا ۔ سیوبا یا پتی ورتا ۔ یعنی جو اپنے خاوند کی فرمانبردار ہو ۔

۲۔ وسکا سیجا ۔ نوخیز دوشیزہ ۔ سنگار کی دلدادہ، عاشق کی منتظر ۔

۳۔ دربت کنٹھیا ۔ عاشق کی دوری اور فراق سے شکستہ حال و پریشان ۔

۴۔ کلیان تر بیتا ۔ اکھڑ مزاج ، ہر وقت ناک بھوں چڑھنے کوئی نہ کوئی رونا روتی رہے ۔

۵۔ ابھی ساریکا ۔ جو ملنے میں پیش قدمی کرے ۔ عاشق کو بلائے یا خود اس سے ملنے جائے ۔

ہیروئن کیلئے بھی چند النکار یعنی صفات مقرر ہیں ۔ مثلاً

شوبھا :۔ حسن و شباب ۔

دھیریا :۔ وفاداری ۔

بھاؤ اور ہیلا :۔ جذبات قلب کے خفیف اور قوی اظہار کی قدرت ۔ مثلاً چہرے کا رنگ اڑنا اور پھر غش آجانا ۔

لیلا :۔ عاشق کے کلام، لباس اور چال ڈھال کی نقل اتار کر خود عاشق کا یا اپنی سہیلیوں کا دل بہلانا ۔

وچھچھتی :۔ پریشانی اور افکار کے سبب سنگار سے بے پروائی ۔

ولاس :۔ طرز نگاہ ۔ قول یا فعل سے عیش کی خواہش ظاہر کرنا ۔

للت :۔ زور حسن اور لذت وصال کا اظہار ۔ ناز سے اٹھلا کر چلنا ۔ بناؤ سنگار کرنا ۔ پُرتکلف کپڑے پہننا وغیرہ ۔

ہیرو اور ہیروئن کے علاوہ ڈرامے کے دیگر کردار جن سے ڈرامے کا رنگ بنتا ہے یہ ہیں :۔

۱۔ پت مرد :۔ ہیرو کا رفیق اور مددگار ۔

۲۔ پرانی ناٹک ۔ ہیرو کا مخالف یعنی ولین جیسے رام کا پرانی ناٹک راون ۔ سری کرشن کا اشیشال ، یدھشٹر کا دریودھن وغیرہ ۔

۳۔ وروشک :۔ ہیرو کا رازدار ندیم اور مصاحب خاص بلا کا ذہین اور منہ پھٹ ، اپنی بونگی حرکتوں سے اور مصنوعی ظرافت سے ہیرو کا دل بہلاتا ہے اور خوش تدبیری سے معاملات عشق میں مدد دیتا ہے ۔ ساتھ ہی سہو و خطا کا مجموعہ بھی ہوتا ہے ۔ کبھی ایک شخص کی بجائے دوسرے کا نام لے دیتا ہے ۔ کبھی کبھی دینا فرض بھول جاتا ہے ۔ جو چیز اس کو چھپانے کیلئے دی جائے وہ کسی نہ کسی طرح اس کے ہاتھ سے نکل ہی جاتی ہے ۔ کھانے کا شوقین

ہر وقت بھوک سے بیتاب، سنجیدہ سے سنجیدہ مسائل پر گفتگو کرتے کرتے ایک دم رسوئی کی طرف لپکتا ہے۔ ہر وقت کسی نہ کسی مصیبت میں گرفتار نظر آتا ہے۔ روتوں کا ہنسانا اس کا کام ہے۔ وردشک کا کردار سنسکرت ناٹک کے سارے کرداروں میں نمایاں کشش رکھتا ہے۔ قریب قریب تمام ڈرامہ نگاروں نے اس کا کردار ڈھالنے میں اپنے فن کی پوری قوت صرف کر دی ہے۔ کچھ تو پہلا کہ طنز کیلئے اس کے علاوہ اور کوئی آلہ کار نہ تھا۔ کچھ یوں کہ قصے کے اتار چڑھاؤ میں اس کی وجہ سے ہر طرح کی آسانی میسر ہے۔ جو بات بعید از قیاس معلوم ہو اس کے سر منڈھی جا سکتی ہے۔ رتناولی کا تو سارا کھیل اسی کے دم سے ہے۔ وردشک کو نکال لیجئے تو قصہ دو قدم بھی نہیں چل سکتا۔

ہیرو کی طرح ہیروئن کی اطاعت کیلئے کسی نہ کسی محرم راز کا ہونا ضروری ہے۔ اور یہ خدمت سوتیلی بہن، کسی عزیز سکھی یا دائی کے سپرد کی جاتی ہے۔ جیسے شکنتلا کی دلنواز سہیلیاں پریموداا، انوسویا اور رتناولی کی سسم: اروشی کی چتر لیکھا وغیرہ۔

یہ ہیں مختصراً سنسکرت ڈرامے کے کردار لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ سنسکرت ناٹک میں سب سے زیادہ اہمیت اگر کسی چیز کو دی جاتی ہے تو وہ رس یعنی جذبہ ہے۔ اس کے مقابلہ میں نہ کردار نگاری کی طرف زیادہ توجہ دی جاتی ہے نہ پلاٹ کی باریکیوں کا خیال رکھا جاتا ہے۔ زیادہ زور اسی بات پر ہوتا ہے کہ کسی ایک جذبے کا پورا پورا نقشہ کھینچ جائے۔ اسی وجہ سے ناٹکوں میں شاعری ترتیب اور گانے کا حصہ کردار نگاری سے کہیں زیادہ ہے۔ کسی ایک ہی جذبے پر اتنی گہری روشنی ڈالی جاتی ہے کہ اس کی چکاچوند میں دوسری تمام ضروریات ماند پڑ جاتی ہیں۔ اس طرح کہ اگر آپ کسی کردار کا جائزہ لینا چاہیں تو اس کی پوری تفصیل آپ کو نہ مل سکے گی۔ ہاں اگر جذبات کی باریک سے باریک باتیں آپ کے سامنے آ سکیں گی۔ مثلاً اگر کسی راجہ کے عشق کا کردار ہے تو یہ ذکر اس قدر شدومد سے کیا جائیگا اور جذبہ عشق کی ایسی باریکیاں پیش کی جائیں گی کہ ہیرو کے راجہ پن کی تمام شخصی خصوصیات مدھم پڑ جائیں گی۔ اور یہ کسی طرح نہ معلوم ہو سکے گا کہ یہ راجہ دوسرے راجاؤں سے کن کن باتوں میں مختلف ہے۔

شاید اسی سبب سے بعض نقادوں نے سنسکرت کے عام کرداروں کو محض صرف بے جان Mere Types کہا ہے۔ ہر ایک کردار کی عام لگی بندھی خصوصیات مقرر ہیں او

مان لیا جاتا ہے کہ اس میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں۔ اگر راجہ ہے تو بس راجہ ہی ہے جیسے راجہ ہونے چاہئیں۔ البتہ یہ دکھلانے کی کوشش کی جائیگی کہ راجہ کا محبت میں کیا حال ہوا۔ راجہ کو غصہ آیا تو غم و غصے کو ظاہر کرنے کے سارے ارکان ادا ہوئے یا نہیں۔ اسی سبب سے کردار نگاری کا جو مفہوم انگریزیت کی بنا پر جو ہمارے ذہن میں ہے ویسی کردار نگاری سنسکرت ڈرامے میں نام کو نہیں اور نہ اس معیار پر سنسکرت ڈرامے کو جانچنا چاہیئے۔ اصل نکتہ یہی ہے کہ سنسکرت کا ناٹک نگار کسی کردار کو اس کی شخصی خوبیوں یا کمزوریوں کا نمونہ بنا کر نہیں پیش کرتا بلکہ ایک جذبہ کو انتہائی حد تک دکھانا چاہتا ہے۔ اور اس کیلئے جو کردار بھی اسے موزوں ملتا ہے اسے اپنا آلہ کار بنا لیتا ہے۔

اس طرح سنسکرت ڈرامے سے صحیح طور پر لطف اندوز ہونے کے لئے رس یعنی جذبے کی کارفرمائی کا سمجھنا از بس ضروری ہے۔ اور یہ ایک طویل داستان ہے جو پھر کبھی پیش کی جائیگی۔

ساقی بکڈپو کی مطبوعات

آتاترک یہ وہ منفرد اور معرکۃ الآرا کتاب ہے جس سے بہتر کتاب غازی مصطفےٰ کمال آتاترک بانی جمہوریہ ترکیہ کے حالات پر آج تک ہماری زبان میں نہیں لکھی گئی۔ یہ غازی اعظم کی تمام و کمال سوانح عمری ہے۔ اور ان کی زندگی کے ہر پہلو اور کارنامہ سے بحث کی گئی ہے مصنفہ محمد مرزا دہلوی۔ قیمت دو روپیہ۔

چار چاند ناصر نذیر فراق کے مضامین کا مجموعہ۔ دلی کی ٹکسالی زبان اور قلعہ معلی کی نتھری ستھری بول چال اس مجموعہ میں ملاحظہ فرمائیے۔ قیمت ۸ر

لال قلعہ کی ایک جھلک سید ناصر نذیر فراق کی تصنیف ہے جس میں دکھایا گیا ہے کہ سلطنت مغلیہ کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کے زمانہ میں لال قلعہ کی کیا حالت تھی۔ اور اس انتہائی انحطاط کے زمانہ میں بھی وہاں کی دلچسپیوں کا کیا عالم تھا۔ قیمت ۱۲ر

مینیجر ساقی بک ڈپو۔ دہلی

ن م راشد

دُوری

مجھے موت آئے گی ۔ مر جاؤں گا میں،
تجھے موت آئے گی ۔ مر جائے گی تو
وہ پہلی شب مہ ۔ شب ماہ دو نیم بن جائے گی
جس طرح سازِ کہنہ کے تارِ شکستہ کے دونوں سرے
دو اُفق کے کناروں کے مانند
بس دوری ہی دُور سے تھرتھراتے ہیں اور پاس آتے نہیں ہیں!
نہ وہ راز کی بات ہونٹوں پہ لاتے ہیں
جس نے پہلی کو دورِ زمان و مکاں سے نکالا تھا
بخشی تھی خوابِ ابد سے رہائی!
یہ سچ ہے تو پھر کیوں
کوئی ایسی صورت کوئی ایسا حیلہ نہ تھا
جس سے ہم آنیوالے زمانہ کی آہٹ کو سُن کر
وہیں اس کی یورش کو سینوں پہ یوں روک لیتے
کہ ہم تیرا منزل نہیں ۔ تیرا ملجا و ماویٰ نہیں ہیں!
یہ سوچا تھا شاید
کہ خود پہلے اس بُعد کے آفرینندہ بن جائیں گے
(اب جو اک بحرِ خمیازہ کش بن گیا ہے)
تو پھر از سرِ نو مسرت سے، نورس نئی فاتحانہ مسرت سے
پائیں گے بھولی ہوئی زندگی کو!
وہی خود فریبی، وہی اشکِ شوئی کا ادنیٰ بہانہ!
مگر اب وہی بُعد سرگوشیاں کر رہا ہے
کہ "تو اپنی منزل کو واپس نہیں جا سکے گا
نہیں جا سکے گا ۔ ۔ ۔ ۔"
یہ عفریت تجھ سے بھی چُپ چاپ یوں کہتا ہوگا
"وہ اب تیرے پہلو میں واپس نہیں آئے گا
اب نہیں آئے گا ۔ ۔ ۔ ۔"
مجھے موت آئے گی مر جاؤں گا میں
تجھے موت آئے گی ۔ مر جائے گی تو
مگر مجھ کو اس کا یقیں ہے
یہ عفریت پہلے ہزیمت اُٹھائے گا مٹ جائے گا تو!

"ناکارہ"

خندۂ تقدیر

دفتر میں جائیداد کے اُمیدواروں کا انٹرویو تھا۔ بورڈ کے ایک رکن نے ایک اُمیدوار کی ذہانت اور حاضر دماغی کا امتحان لینے کی غرض سے بڑی سادگی سے یہ سوال کیا "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر ہندوستان کی آبادی گھٹنے کیوں نہیں جا رہی ہے؟" حاضر جواب اُمیدوار نے برجستہ جواب دیا "میری سمجھ میں تو اس کی وجہ یہ آتی ہے کہ ہندوستان کے لوگ ضبطِ تولید پر کاربند ہوگئے ہیں!"

اس لطیفہ کا حقیقت سے بہت کم لگاؤ ہے لیکن جو ترقی پسند ہندوستانی مرد و زن ضبطِ تولید پر عمل پیرا ہیں اُن میں مشتاق اور اس کی بیوی شامل تھے۔ بیوی اپنی مرضی سے، شوہر بھی اس کی مرضی سے۔

مگر جب مشتاق نے وہ خوشخبری سُنی تو مارے خوشی کے پھولا نہ سمایا۔ آنے والی چیز کے تصور میں ڈوب گیا۔ لڑکا ہوگا یا لڑکی؟ بچہ خوبصورت ہوگا۔ کیونکہ دونوں میاں بیوی اپنی اپنی جگہ حسن کے اعلیٰ نمونے تھے جو تہذیب و تمدن کے شوکیس میں رکھے ہوئے تھے۔ لیکن بچہ ماں پر جائے گا یا باپ کا ہم شبیہ ہوگا؟ لڑکے تھے تو باپ کے تابع رہے۔ نوکر ہوئے تو اعلیٰ افسروں کے تابع رہے۔ شادی ہوئی تو بیوی کے تابع رہے۔ اب زمانہ آ رہا تھا کہ کوئی ہمارا تابع فرمان بن کر رہے۔ واہ وا! باپ بننا بھی کیا مزے کی بات ہے!

لیکن پھر وہ اپنے آپ میں آکر سوچنے لگا۔ اس کی بیوی نفیس کے تاثرات کیا ہیں؟ کیا وہ اس رضاکارانہ مسرت کا بند ... غیر ... نہ یہ قرار دے گی؟ یعنی بیوی کی اجازت کے بغیر اظہارِ مسرت ... دار ہو؟ وہ ایک بوڑھی سخاں مرنج بلکہ نیا زمند قسم کا شوہر تھا ... بیوی کی آرزو تھی کہ بچے چار چھ سال تک نہ ہو ورنہ عیش میں خلل پڑ جائے گا۔ وہ "دیر آید درست آید" کی قائل تھی۔ مشتاق کو اس باب میں اختلاف تھا۔ جھٹ پٹ باپ بن جانا چاہتا تھا۔ ضبطِ تولید کو غریب غربا کے کام کی چیز سمجھتا تھا۔ مگر حسبِ عادت بیوی کے سامنے "حکمِ سرکار" کہہ کر ہتھیار ڈال دینے پر مجبور ہوگیا۔ ... وہ سب تدبیریں اختیار کی گئیں جو میاں بیوی کو اس نعمت سے محروم رکھنے کے لئے حسبِ جدید تاحال مہیا کرنے کے قابل ہوا ہے۔ اس زمانے میں ضبطِ تولید پر اچھا خاصا لٹریچر مسز مشتاق کے کمرے میں بکھرا نظر آنے لگا۔ فضا اس موضوع پر بحث سے گونجنے لگی۔ وہ لیڈی ڈاکٹر جو اس باب میں سند کا درجہ رکھتی ہیں ان سے مشورے ہونے لگے۔

مگر قدرت تم ظریفی پر آمادہ تھی۔ اللہ میاں اب اتنی جلدی یہ تحفہ بھیج رہے تھے۔ مشتاق نے سوچا اس ناپسندیدہ صورتِ حال پر نفیس کا تبصرہ کیا ہوگا؟ کیا وہ اپنی مراد کے بر نہ آنے پر دلگیر ہوگی؟ کیا وہ اتنی بے حس ہے کہ جس ننھی منی جان نے اپنی آمد کا تار دیا تھا اس کے استقبال کی تیاری ... کرے؟ ... وہ فطرت کے خلاف ہو سکتی ہے؟

مشتاق نے دیکھا نفیس سسرال، میکے اور ملنے جلنے والیوں کے سامنے تو خوشی ظاہر کرتی ہے۔ حسبِ ضرورت شرمانی بھی ہے۔ لیکن اپنے دل کی گہرائیوں میں اس آنے والے کو ناخواندہ مہمان خیال کرتی ہے ایسا مہمان جس کو دیکھ کر مروت سے تو کہتے ہیں "آہا! خوش آمدید! کدھر بھول پڑے؟ عید کا چاند ہوگئے" مگر دل میں کہتے ہیں "کمبخت کیسے بے وقت آ مرا!" یہ دیکھ کر مشتاق کو یہ شعر بار بار یاد آ رہا تھا۔

ہے خبر گرم اُن کے آنے کی ہے آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

غرض مشتاق محسوس کر رہا تھا کہ وہ کیا محسوس کر رہی ہے۔ اور نفیس بھی محسوس کرنے لگی تھی کہ مشتاق محسوس کر رہا ہے کہ وہ کیا محسوس کر رہی ہے۔

لیکن جیسے جیسے دن گزرتے گئے مشتاق کو غیر محسوس طور پر خوشگوار تبدیلی نظر آنے لگی۔ یہ تبدیلی یقیناً مشتاق کی رنجیدگی کا نتیجہ نہ تھی۔ نفیس کے متعلق ایسا نیک گمان نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تبدیلی ... سے ہو رہی تھی۔ نفیس کے پہلو میں جب دو دل دھڑکنے لگے تو اسے سپر ڈال کر اپنے آپ کو سپرد کر دینے کے سوا کوئی اور چارہ کار نظر نہ آیا۔ اکثر وہ جانے کس خیال میں آپ ہی آپ مسکراتی رہتی۔ مشتاق پر غیر معمولی طور پر مہربان نظر آنے لگی۔ اور وہ دل میں پکار اٹھتا "واللہ یار ہم بھی کچھ ہیں!"

مشتاق کی شادی محبت کا ایک کرشمہ تھی۔ کم از کم خیال تو

اس کا یہی تھا۔ لیکن خانہ آبادی کے بعد رفتہ رفتہ اسے محسوس ہونے لگا کہ شوق کا وہ اگلا جوش و خروش گھٹتے گھٹتے صفر کے قریب آگیا ہے البتہ روزمرہ کی سی دوستی دونوں میں قائم رہی۔ بہر صورت اب اسے آس بندھی۔ عنقریب آبادی کا باعث بننے والی معصوم مخلوق کی بدولت محبت کے رشتے پھر مضبوط ہوجائیں گے، انشا اللہ۔

اب نفیس ڈاکٹروں کا نگار خانہ بن گیا۔ خوبصورت سے خوبصورت آدمیوں کی تصاویر جمع کی گئیں۔ بن بیر اکٹروں اور ایکٹرسوں کی تصاویر کو نمایاں مقام حاصل تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا خوبصورتوں کی ایک عالمگیر کانفرنس منعقد کی گئی ہے۔ البم، فریم، کیلنڈر ان سب کی ایک دوکان سی لگ گئی جو نمائش کے اعتبار سے ہیر کٹنگ سیلون کی ہم پلہ نظر آنے لگی۔ مشتاق نے نفیس کو شوہرانہ مشورے دینے شروع کئے "دیکھئے۔ خوشگوار خیالات سے دل بہلایا کیجئے۔ غم و غصہ پیدا کرنے والے خیالات کو دل میں پھٹکنے نہ دیجئے۔ اچھی اچھی فرحت و انبساط پیدا کرنے والی کتابیں پڑھا کیجئے، لطف و مسرت لانے والے گانے ریڈیو پر سنا کیجئے اور خود گایا کیجئے۔" وغیرہ وغیرہ۔ وہ جانتا تھا بلکہ دونوں جانتے تھے کہ اس قسمت ساز دورِ مجبوری میں خوبصورت تخیلات و تصورات بچہ کی شکل و صورت اور سیرت پر گہرا اثر ڈالتے ہیں۔

لیڈی ڈاکٹر سے پہلے کچھ اور مشورے لئے جاتے تھے۔ اب بالکل مختلف بلکہ متضاد مشورے لئے جانے لگے۔ غذا میں احتیاط کی جانے لگی۔ نفیس پہلے بھی کوئی کام کاج نہیں کیا کرتی تھی۔ اب تو زیادہ چلنے پھرنے کا بھی پرہیز ہوگیا۔ سورج گہن کے روز تو وہ تمام وقت بے حس و حرکت لیٹی رہتی۔

بالآخر اس تہذیب زدہ گھرانے پر ایک بدنما موقع ایسا بھی آیا جبکہ بے پردہ نفیس کو اپنے میکے جاکر بالکل پردہ نشین ہوجانا یعنی گھر کی چار دیواری میں مقید ہوجانا پڑا۔ آزادیٔ نسواں اور مساواتِ مرد و زن کے نظریے بس اس حد پر آکر بے بس ہوجاتے ہیں۔

اور جب وہ خوشگوار مگر نازک مرحلہ قریب آنے لگا تو گھر میں بحثا بحثی ہونے لگی کہ یہ مرحلہ کس جگہ طے ہو۔ کسی نے کہا، فلاں عیسائی دائی کو گھر ہی پر بلا یا جائے۔ کسی نے کہا، فلاں لیڈی ڈاکٹر کے نرسنگ ہوم میں یہ کام انجام پائے۔ کسی نے کہا فلاں زچگی خانہ ٹھیک رہے گا۔ کسی نے کہا۔ فلاں ہسپتال کا انتظام اچھا ہے۔

افراد متعلقہ سے رائے لی گئی۔ مشتاق نے رکتے رکتے رائے ظاہر کی کہ فلاں نرسنگ ہوم مناسب رہے گا۔ لیکن نفیس کی رائے تھی کہ فلاں ہسپتال مناسب رہے گا۔ اس کی کئی سہیلیاں اسی ہسپتال کی ہوا کھا آئی تھیں اس کے انتظام اور آرام کی تعریف کرتی تھیں چنانچہ بغلبۂ آراء یہی طے پایا اور مشتاق عادتاً راضی ہوگیا۔

جس طرح ریل سے آنے والے کو لینے لوگ اسٹیشن جایا کرتے ہیں، اسی طرح مشتاق صاحب نو وارد کو لینے وقت سے پہلے ہسپتال پہنچ گئے اور ٹہلنے لگے۔ ہسپتال میں جانے سے ہی مشتاق کو ایک وحشت ہوتی تھی۔ مریضوں کی چیخ پکار، آہ و بکا، دواؤں کی تیز بدبو۔ آواز اس طرح گونجتی تھی جس طرح گنبد والے مقبرے میں۔ اور پھر یہ سفیدی، جس سے کفن کا تصور آتا تھا۔ در و دیوار سفید، پلنگ سفید، زمین سفید، آسمان سفید، نرس کا لباس سفید، رنگ سفید، خون سفید۔ ہسپتال برف کا سرد پہاڑ معلوم ہوتا تھا۔ ویسے بھی وہ اپنی بیوی کی وجہ سے پریشان تھا۔ مگر یہ ماحول۔ اس کی وحشت بڑھ گئی۔ اور وہ اور تیزی سے ٹہلنے لگا۔ یہ مالدار معزز نوجوان جس نے ہسپتال کا سب سے زیادہ کرایہ والا وارڈ لیا تھا، جب اس کو دیکھ کر نرسیں دل لبھانے والی مسکراہٹ میں بجھے ہوئے تیر چلاتیں تو وہ اور گھبرا اٹھتا۔ یہ سفید تیتریاں جو عام وارڈ کے غریب مریضوں سے بے رخی اور بے حد بدتہذیبی اور بدکلامی کے لئے دور دور مشہور تھیں۔ اپنی ساری ہمدردی اور خلوص ذرا بڑی قسم کے مریضوں اور تیمارداروں کے لئے محفوظ رکھتیں۔ جب ان کے جوتہ کی اونچی ایڑی چکنے فرش پر کھٹ کھٹ بولتی تو مشتاق کو محسوس ہوتا کوئی ہتھوڑے لگا رہا ہے۔ گو اس کے ایک دل پھینک دوست کا خیال تھا۔ "تم کیا جانو؟ اس بول میں بڑی موسیقی ہے۔ ان کے ساتھ کبھی تفریح کرو تو روشن ہو۔"

بالآخر ایک نرس مژدۂ جانفزا لائی۔ "مبارکباد۔ لڑکی ہوئی خیریت ہے۔" نرس کے چہرے پر مسکراہٹ کا نقاب پڑا ہوا تھا۔ اندر سے آواز آرہی تھی "ٹیں ٹیں ٹیں" مشتاق نرس کی مسکراہٹ پر گھبرانا بھول گیا۔ مارے خوشی کے جامے سے باہر ہوگیا۔ خدا کا شکر اور نرس کا شکریہ ادا کرنے لگا۔ اس نے پوچھا "کیا میں اندر جاسکتا ہوں؟"

نرس نے وہ نقاب آتارے بغیر جواب دیا۔ "ابھی نہیں بچّہ کو نہلانے لے جا رہے ہیں۔ پھر زچہ بچّہ کو ہال سے وارڈ میں پہنچا دیا جائے گا فکر نہ کیجئے خیریت ہے۔"

مشتاق نے شکریہ ادا کرنے کے خیال سے اُس ڈاکٹر کو پوچھا جس نے یہ فریضہ انجام دیا تھا جواب ملا۔ "وہ ابھی رہی ہیں۔ ابھی ٹمیں اور زچگیاں ہیں۔ بڑی دیر بعد زچہ بچّہ کو وارڈ میں منتقل کیا گیا۔ مشتاق کے والدین آ گئے تھے۔ نئے باپ کے باپ بیٹے کو سُنانے کی خاطر کہیں رنجیدہ خاطر نہ ہو کہنے لگے "بیٹی کیا بیٹا کیا۔ خدا کی دین ہے۔" اور والدہ تشریحاً بولیں "بیٹی رونق"۔

مشتاق جھینپ رہا تھا۔ نفیس نقاہت سے مسکرا رہی تھی۔ مشتاق کے والد جن کو مذہب سے ابھی تھوڑا بہت لگاؤ باقی تھا پوتی کو دیکھ کر آیتیں پڑھ کر دم کرنے لگے۔ اس کے کان میں اذان دی، پھر دعا۔

مشتاق نے بڑے اشتیاق سے جھک کر چھوٹی سی بچّی کو دیکھا۔ رنگ صاف تھا۔ شباہت کس کی تھی یہ ابھی ظاہر نہ ہو رہی تھی۔ تھوڑے دن بعد ظاہر ہو جائے گا۔ بچّی آنکھیں بند کئے کسی گہری سوچ میں پڑی تھی۔ خواب میں اس معصوم کی ہنسی کبھی کبھی ہچکی بن کر سُنائی دیتی تھی۔

ہسپتالوں میں چھوٹی موٹی بدعنوانیاں ہوتی رہتی ہیں۔ جن کی افراد متعلقہ کے سوا دوسروں کو خبر نہیں ہوتی۔ مگر ایک دفعہ ایک ہسپتال میں بلّی نے بچّہ کو چبا ڈالا تھا۔ اس حادثہ پر اخباروں میں ایک اودھم مچا تھا۔ اس لئے نرسوں کو تاکید کی گئی کہ بچّی کی خاص حفاظت کی جائے۔

لڑکی کا نام جلیس رکھا گیا۔ مشتاق کے والد نے کلام مجید کھول کر ایک دوسرا نام تجویز کیا تھا۔ مگر آزاد اور بے قافیہ شاعری کے اس دور میں بھی قافیہ پیمائی ہی کو نفیس کے گھر والوں نے مناسب سمجھا۔

ڈاکٹروں اور نرسوں کو پھل پھلاری اور تحفہ تحائف اور ملازمین کو انعام و اکرام دینے کے بعد نفیس میکے آ گئی۔ خوب شادیانے بجے۔ رسمیں ہوئیں، دعوتیں ہوئیں، عقیقہ کی دعوت تو بڑے زور کی ہوئی۔ لیکن نفیس کی سمجھ میں نہ آتا تھا عقیقہ میں سر کیوں منڈایا جاتا ہے۔ بچی خدا بڑی ہوا اور پہلی بار بال کٹوائے گئے زمانے میں اس رسم کو عقیقہ اسے وں نہ کہا جائے۔

چار سال گذر گئے۔ جلیس نہ ماں پر گئی تھی، نہ باپ کی شباہت لائی تھی۔ کھلتا رنگ تھا۔ ناک نقشہ اچھا ہی تھا۔ نفیس کو بالخصوص مشتاق کو ایک حد تک افسوس تھا کہ اتنی محنتوں کے باوجود بڑی کی شمیم یا نیلا دیسائی بن کر نہیں آئی تھی۔ دُبلی پتلی لڑکی تھی۔ شروع ہی سے ڈاکٹروں کی تجویز کردہ مقوی غذائیں دی جاتی رہیں مگر بچی موٹی ہونے کا نام نہ لیتی تھی۔ خاموش طبیعت کی لڑکی تھی مگر بلا کی ذہین تھی۔ نفیس کی ممی اس کی بلائیں لے کر کہا کرتی تھیں "بیٹی، تجھے نظر لگتی ہے۔ خدا نظر بد سے بچائے۔ تیری ماں بھی تو تیری عمر میں اتنی سمجھ والی نہ تھی۔"

مشتاق تو اپنی بچّی کو بری طرح چاہتا تھا۔ نفیس سوچتی اس صورت پر یہ کیفیت ہے، وہ بہت خوبصورت ہوتی تو خدا معلوم حضرت کا کیا حال ہوتا۔ مشتاق ویسے بھی بچّوں سے بڑی محبت کرتا تھا۔ اُن کو دیکھتے ہی گود میں لے کر پیار کرتا اور میٹھی میٹھی بے معنی باتیں کرنے لگتا۔ اور یہ تو خاص اپنی بچّی تھی اسے جتنا پیار کرتا کم تھا۔ وہ جلیس کے ساتھ کھیلتا ہوا شور مچا کر بچّوں کی سی حرکتیں کرنے لگتا تو جلیس کی دادی خوش ہو ہو کر اپنے شوہر سے کہتیں "یاد ہے اپنا زمانہ؟ ایک وقت آپ بھی تو ایسے ہی دیوانے بنے ہوئے تھے۔" اسی محبت پدری کا نتیجہ تھا کہ جلیس ممی سے زیادہ پاپا سے لاگو تھی۔

عہد حاضر کے بچّوں کا ایک قومی ترانہ آپ نے بھی سُنا ہوگا۔ اس کو یہاں نقل کرنا تحصیل حاصل ہے۔ اس کا یہ ٹیپ کا مصرعہ غالباً آپ کو یاد ہوگا۔

مری پیاری آیا مری جان آیا

ایک دوسرا ترانہ بھی ہے جس کا صرف ایک شعر مجھے یاد ہے۔

آیا کی گود میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں
آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا

ایک زبان زد خاص و عام مقولہ ہے، آیا کی گود بچّے کی پہلی تربیت گاہ ہے۔ مندرجہ بالا شعر اسی مقولہ کی تفسیر ہے آیا کی ممتا پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اسے یہاں بلا حوالے نقل کروں تو سرقے کا الزام آئے گا۔ اُردو کی پہلی کتاب کا وہ جدید ایڈیشن آپ کے بچّے بھی پڑھتے ہوں گے جس کا پہلا سبق یہ ہے "آیا بچّے کو گود میں لئے بیٹھی ہے۔ ماں سینما یا شاید کانفرنس یا شاید کلب گئی ہے۔ باپ سگار پی رہا ہے اور خوش ہو ہو کر آیا کو دیکھ رہا ہے ......"

نفیس نے نئے فیشن کے مطابق آیا رکھی تھی اور بچی کی پرورش اور تربیت کے معاملے میں اپنے دستورالعمل سے لگی تھی۔ جوان آیا پاک صاف سفید ساڑھی باندھے جب جلیس کو پریم میں بٹھا کر سیر کو لے جاتی تھی تو خواہ مخواہ لوگ ٹھٹک ٹھٹک کر دیکھنے لگتے تھے۔ میرا مطلب جلیس کو دیکھتے تھے۔ گھر پر آیا اور کسی دوسرے کے درمیان جھگڑا ہوتا تو نفیس ہر دفعہ آیا کے حق میں فیصلہ صادر کرتی تھی۔

چار سال، چار مہینے، چار دن ہونے پر جلیس کی بسم اللہ بڑے دھوم دھڑلے سے ہوئی۔ بسم اللہ میں مشتاق کا چھوٹا بھائی اشرف جو فوج میں لفٹننٹ تھا چھٹی لے کر شریک ہوا تھا۔ بچی کے دادا نے بسم اللہ پڑھائی۔ جلیس نے اس طرح فر فر سورۂ اقرا اپنی توتلی زبان میں پڑھی کہ جمیع حاضرین مجلس "اللہ اللہ" "ماشاء اللہ" کہنے لگے۔ بے شمار دعائیں دی گئیں اور بلائیں لی گئیں۔

جلیس سے متانت جتنی قریب تھی شرارت اتنی ہی دور تھی۔ نفیس بچپن میں بہت شوخ و شریر تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اپنی بچی بھی ویسی ہی شرارتیں اور دھینگا مشتی کرتی پھرے۔ نفیس کبھی کبھی جلیس کو سامنے بٹھا کر اپنی بڑی بڑی مست آنکھوں سے اس کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی اور مذاق سے کہتی "ہٹو، تم میری بیٹی نہیں" اور جلیس معصومانہ انداز سے جواب دیتی "میں پاپا کی بیتی (بیٹی) ہوں" اور مشتاق خوشی کے مارے بے حال ہو کر جلیس کو گود میں لے لیتا اور رخسار، ہونٹ، آنکھیں چومتے ہوئے بوسوں کی بارش کر کے قہقہے لگا لگا کر کہتا جاتا "یہ میلی بیتی (میری بیٹی) ہے۔ یہ میلی بیتی ہے۔"

انواع و اقسام کے کھلونے جلیس کے لئے جمع کئے گئے تھے۔ ولایت کی گڑیاں، چھوٹی موٹریں، موٹر بسیں، تانگے، چھپرکھٹ، پلنگ، ٹین کے پھول، بائیسکل، ہوائی جہاز اور خدا جانے کیا کیا۔ مگر ان کھلونوں سے جلیس کی دلچسپی رفتہ رفتہ گھٹتی گئی۔ وہ تنہائی میں خاموش نہ جانے کس سوچ میں رہتی۔ گویا زبان بے زبانی سے کہہ رہی ہو؎

کھلونے دے کے بہلائی گئی ہوں

رشتہ داروں اور دوستوں کے بچے آجاتے تو اس کا دل بہل جاتا۔ وہ ان سے کھیلنے میں مشغول رہتی۔ مگر جب گھر بچوں سے خالی ہو جاتا تو وہ اپنے خول میں سکڑ جاتی۔ خدا جانے کس سوچ میں پڑ جاتی، مٹی میں کھیلتی۔ ہاتھ اور کپڑے میلے کر لیتی۔ درخت، آسمان کا سمندر، ابر کے ٹکڑے، چڑیاں، کوے، چیل، ان سب کو غور سے دیکھتی اور جب ہوائی جہاز کی آواز آتی تو دوسرا کام چھوڑ کر اسے دیکھنے آجاتی۔ دوسرے بچے ہوائی جہاز کو دیکھتے ہی ناچ ناچ کر تالیاں بجا بجا کر چلاتے ہیں "ہوائی جہاز! ہوائی جہاز!" لیکن جلیس خاموش کھڑی ہوائی جہاز کے غائب ہونے تک اس کو تکتی رہتی۔ پھر اپنا ہوائی جہاز نکال کر الٹ پلٹ کر دیکھتی۔ مشتاق سے منہ پھلا کر شکایت کے لہجے میں کہتی "پاپا میلا (میرا) ہوائی جہاز اُلتا (اُڑتا) کیوں نہیں؟" مشتاق بیٹی کی آزردگی پر پریشان ہو کر جواب دینے کی کوشش کرتا۔ توجہ پلٹانے کے لئے دوسری پیاری پیاری باتیں کرتا مگر وہ مطمئن نہ ہوتی، پلٹ پلٹ کر وہی سوال دہراتی "میلا ہوائی جہاز اُلتا کیوں نہیں؟" چچا جب تک رہے وہ بھی اپنی فوجی لیاقت بگھار کر جواب دیتے مگر بھتیجی بے اطمینانی کی حالت میں انہیں اس طرح دیکھتی گویا کہہ رہی ہو "اتنے بڑے ہو گئے۔ اتنی بات نہیں معلوم" پھر منہ بنا کر رونے لگتی۔ بہت حساس اور زود رنج تھی۔ کوئی بات ذرا بھی ناگوار ہوتی تو رو دیتی۔

بھتیجی کی اس متانت اور اس تجسس کو دیکھ کر فوجی چچا ہنس کر مشتاق سے کہتے "بھائی مبارک ہو صاحبزادی بڑی ہو کر فلسفی نکلے گی، دنیا کی پہلی فلسفی عورت" اور مشتاق جواب میں کہتا "شکر ہے، وہ فوجی نہیں بنے گی۔"

آیا بھاگ گئی۔ جاتے ہوئے چاندی کی ڈبیہ، جلیس کی ایرنگ اور کچھ روپیوں پر ہاتھ صاف کر گئی۔ ایک ہڑبونگ مچی، لیکن جلیس آیا کی یاد میں رونے لگی۔ آیا کو واپس بلانے کی تدبیریں کی گئیں لیکن وہ عہد رفتہ بن گئی تھی۔ اب ایک نئی آیا کے تقرر کا مرحلہ پیش آیا۔ لڑکی کے لئے انگریزی کے استاد کا مسئلہ بھی کئی دن سے زیر بحث تھا۔ چنانچہ اخبار میں "ضرورت ہے" کے کالم میں دونوں کے لئے اشتہار دئے گئے۔

ضرورت ہے آیا کی

ایک اعلیٰ خاندان کی بچی کے لئے ایک آیا کی فوری ضرورت ہے۔ شوہر والی کو ترجیح دی جائے گی۔ تنخواہ پچیس روپے اور کھانا۔

ضرورت ہے ایک استاد کی

ایک اعلیٰ خاندان کی بچی کے لئے ایک استاد کی ضرورت ہے۔ انگریزی اور اردو کی ابتدائی تعلیم دو گھنٹے دینی ہوگی۔ گریجویٹ کو ترجیح دی جائے گی۔ فیس پندرہ روپے۔

مشتاق نے ان اشتہارات کو دیکھ کر سوچا، یہ اُستاد اور یہ آیا حیثیت اور تنخواہ کے اعتبار سے انہوں نے ایک دوسرے کی جگہ کیوں لے لی ہے؟ کس بات پر یہ موقوف ہے؟ دُنیا میں ہر شخص غلط جگہ پر بیٹھا ہوا ہے۔ مشتاق نے دبی زبان سے اس ناانصافی کی طرف اشارہ کیا۔ مگر نفیس نے "اونہہ" کی رولنگ دے کر بحث ختم کر دی۔

بات یہ ہے، نفیس متوسط طبقہ کے ایک اُستاد کے لئے اس سے زیادہ مالی زیرباری اُٹھانا نہیں چاہتی تھی۔ اس کو متوسط طبقہ سے نفرت تھی۔ یہ جذبہ کچھ تو اُس نے ورثہ میں پایا تھا اور کچھ اس کے کبر و نخوت نے اس کو جلا دی تھی۔ اسکول اور کالج میں وہ متوسط طبقہ کی بعض ہم جماعت ذہین لڑکیوں سے ملا کرتی تھی، اور ظاہری دل سے ان سے محبت سے پیش بھی آتی تھی، مگر دل میں ان سے نفرت کرتی تھی۔ اسے اپنی ساتھیوں سے بھی کد تھی محض اس لئے کہ ان کے آباؤ اجداد کسی طبقہ کے لوگ تھے۔ وہ اکثر تنہا اور کبھی اپنے شوہر کے ساتھ باہر نکلتی۔ اگر معزز طبقہ کے مرد اسے گھورتے تو وہ دل میں خوش ہوتی۔ لیکن متوسط طبقہ کے نوجوان یہی حرکت کرتے تو غصہ کے مارے اس کا چہرہ تمتما اُٹھتا۔ اور شوہر صاحب جو ایسے موقعوں پر فطری شرمیلے پن کے باعث نظریں نیچی کئے رہتے تھے وہ بھی ضرورتاً ان نوجوانوں پر خفگی کی نظر ڈال لیا کرتے حالانکہ ان کا دل بیوی کی اس دشمنی کو حق بجانب ثابت کرنے میں ناکام رہتا تھا۔

نفیس کہتی تھی، اس طبقہ کے وجود کی غرض و غایت؟ : اِدھر کا ہے نہ اُدھر کا۔ بیچ ادھر ہے۔ آدھا تیتر آدھا بٹیر، نقال ہے۔ ہمارا منہ چڑاتا ہے۔ ہمارے طبقہ کی تقلید اس کا وظیفہ ہے۔ ہمارے مرتبہ پر آنا اس کی آرزو ہے۔ بندر رہتے رہتے کوا بن گیا ہے جو ہنس کی چال چلا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب جلیس کا اُستاد انوری۔ اسے کبھی کبھی ناغہ کرتا تو نفیس اتنے دن کی فیس کاٹ کر دینے پر مائل رہتی تھی۔ وہ متوسط طبقہ کے اس خستہ حال نوجوان کو دیکھ کر کراہت سے مُنہ پھیر لیتی تھی۔ وہ مذاق سے کبھی کبھی اپنی بچی کو یہ سبق پڑھاتی "انوری [illegible] استاد کی آئی کمبختی" لیکن اس مذاق کے معنے بہت گہرے ہوتے، اور یہ معنے فقط مشتاق سمجھ سکتا تھا۔

نئی آیا آئی، بچی جلد ہی اس سے مانوس ہوگئی۔ وہ روز شام جلیس کو گاڑی میں باغ لے جاتی۔ ہر دوسرے تیسرے ایک نیا مرد اس کے ساتھ دکھائی دیتا۔ جلیس دن کو گھر میں [illegible] رہتی اور شام کی سیر کی منتظر رہتی۔ باغ میں دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلتی رہتی۔ [illegible] جند شوفر بھی شامل ہو [illegible] گھر والوں [illegible] دوسرے کو دیتے [illegible] مطمئن تھی مگر [illegible]

[illegible] نفیس نے کہا۔ یہ چھٹی ہوئی [illegible] مشتاق نے دوسرے اُستاد [illegible] نفیس [illegible] کی روادار نہ تھی [illegible] انہوں نے بچی کی تعلیم کے لئے ایک [illegible]

[illegible] کی تعلیم و تربیت ہونے لگی۔

نفیس کی [illegible] انگریزی [illegible] بہت بچہ [illegible] اس کی گھٹی میں پڑی ہے۔

مگر کچھ بھی جلیس [illegible] اجنبی کی طرح کسی خیال میں ڈوبی رہتی [illegible] ایک مدرسے میں بھیجا گیا [illegible] دل [illegible] آجائے گی۔ [illegible] پیدا ہوگا۔ نئی نئی باتیں سیکھے گی۔ انگریزی [illegible] سیکھ کر آئے گی۔ شوخی شرارت آجائے گی۔ [illegible] نفیس کو قدرے ملال تھا۔

اوّل اوّل جلیس دن بھر اس کے خیال میں ڈوبی رہتی۔ لیکن رفتہ رفتہ اس کی جدائی کی عادی ہوگئی۔ ملاقاتوں کے سلسلے وہ اپنی بچی کو لپٹا کر بھینچ بھینچ کر اور بوسے لے لے کر کہا کرتی "میری بچی، میری جان، جگر کا ٹکڑا، کلیجہ کی کور"۔ لیکن کبھی کبھی اُس کے دل میں خیال آتا تھا، بچی سے کیوں مجھے اتنی شدید محبت نہیں ہے جتنی مشتاق کو ہے؟ کس لئے باوجود کوشش اپنی اولاد سے دیوانہ وار محبت کرنے میں ناکام ہوں؟ کیا اس لئے کہ وہ اتنی خوبصورت نہیں جتنی میری بچی کو ہونا چاہیئے تھا؟ کیا اس لئے کہ وہ شوخ اور چلبلی نہیں؟ کیا اس لئے کہ ضبطِ تولید کی تدبیر کے باوجود تولد ہو گئی؟ کیا اس لئے

کر لڑکی ہوئی، لڑکا نہ ہوا؟ کیا اس لیے کہ میں اُن عورتوں میں ہوں جو فطرتاً اپنی اولاد پر جان چھڑکنے کے قابل ہوتی ہیں اور اس سے نقطۂ اجنبی درجے کی محبت کرتی ہیں؟

ایسے سوالات وہ اپنے دل سے کیا کرتی تھی؟ لیکن کوئی تشفی بخش جواب اسے نہیں ملتا۔

جواب تو بس قدرت ہی دے سکتی ہے۔ ... قدر ... خشندہ۔ یہ لڑکی جس کا نام جلبیس رکھا گیا تھا اور جسے وہ اپنا سمجھ کر پال رہی تھی۔ دراصل اس کی اپنی لڑکی نہیں تھی جو لڑکی اس کے بطن سے پیدا ہوئی تھی وہ پیدائش کے دن ہسپتال میں نہلاتے وقت نرسوں کی غلطی سے بدل گئی تھی اور یہ لڑکی جلبیس جو یہ سوال کیا کرتی تھی "میلا ہوائی جہاز آتا کیوں نہیں؟" متوسط طبقے کے ماں باپ کی اولاد تھی۔

ساقی بک ڈپو کی مطبوعات

شکست: ملک کے مشہور افسانہ نگار مسٹر کرشن چندر ایم۔اے نے یہ ناول لکھا ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ شکست کو یورپ کی ترقی یافتہ زبانوں کے مقابلے میں پیش کیا جا سکتا ہے ناول کا پس منظر بہشت نظیر کشمیر ہے۔ کرشن چندر نے اس سرزمین حسن میں زندگی کے رومانی پھول کھلائے ہیں۔ قیمت تین روپے۔

نئے فسانے: یہ مجموعہ مسٹر کرشن چندر ایم۔اے نے مرتب کیا ہے۔ یہ کتاب ہندوستان کے جدید افسانوی ادب کی تصویر ہے، اردو، ہندی، گجراتی، مرہٹی، تامل، تلگو، بنگالی بہاری وغیرہ افسانہ نگاروں کے تیس بہترین نقوش اس میں شامل ہیں جان لیمین کہتا ہے "انگریزی افسانہ زوال کی انتہائی پستیوں کی طرف جا رہا ہے" برعکس اسکے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستانی افسانے پر اب بہار آ رہی ہے۔ ضخامت ۴۲۵ صفحے کتاب مجلد قیمت چار روپے۔

گھونگھٹ میں گوری جلے: کرشن چندر کے چودہ طنزیہ مضامین افسانوں اور ڈراموں کا منتخب مجموعہ۔ انہیں مرتب کرنے میں مصنف نے پورے دو سال صرف کئے ہیں۔ دلکش سرورق سے آراستہ۔ مجلد۔ قیمت ایک روپیہ بارہ آنے۔

غزل

جو نظر ہے مطمئن ہے جو نفس ہے شادماں ہے
کہ بقیہ جورِ پیہم کوئی مجھ پہ مہرباں ہے

تری اک نظر کا حاصل عدم و وجودِ جاں ہے
کہیں زندگی کا عالم کہیں مرگِ ناگہاں ہے

ترے حسنِ ضَوفگن سے یہ فروغِ گلستاں ہے
نہ ہو جس میں تیرا پرتو وہ بہار بھی خزاں ہے

مرے تیرے سوزِ دل کا نہیں بوالہوس تقابل
مری آگ میں شرر ہیں تری آگ میں دھواں ہے

کبھی پاؤں لڑکھڑائے تو کہا یہ مجھ سے دل نے
وہ چمک رہی ہے منزل وہ غبارِ کارواں ہے

تری بزم میں رہوں کیا ترے سامنے کہوں کیا
نہ مری نظر نظر ہے نہ مری زباں زباں ہے

جو ہو اذنِ اہلِ گلشن تو میں ہر کلی سے کہہ دوں
ترا مضمحل تبسم مرے ذوق پر گراں ہے

یہی رنگ ہے تو کیونکر ہو رسائی تا بہ منزل
کہیں اہلِ کارواں ہیں کہیں میرِ کارواں ہے

رہوں ترکِ معصیت پر میں شکیل کیسے قائم
ابھی دل میں ولولے ہیں ابھی آرزو جواں ہے

شکیل بدایونی

اشرف صبوحی دہلوی

رُوپا چمار

آج سے پچیس تیس سال پہلے تک دلّی کے چھوٹے بڑے، امیر غریب سَو میں سے ستّر ضرور دیسی جوتی پہنتے۔ بلکہ بعض خاندانوں میں تو انگریزی جوتا پہننے کی قسم تھی۔ بلیماروں کے حکیموں کا بچہ بچہ سلیم شاہی سپاٹ جوتی پہنتا۔ سب سے پہلے مرحوم حکیم اجمل خاں نے انگریزی جوتا استعمال کیا۔ پھر کیا تھا اور بھی پہننے لگے اور اب اُن کے ہاں بھی آدھے تیتر آدھے بیٹر ہیں۔

کوئی ہنر ہو قدردانوں اور شوقینوں کے ہاتھوں پلتا اور ترقی کرتا ہے۔ جب تک انگریزیت نے دلیسیت پر فوقیت حاصل نہیں کی تھی چمار بھی کاریگریاں دکھاتے اور طرح طرح کی صورتیں پیدا کرتے تھے۔ ان میں کبھی شیرازوں کا زور ہوتا تو کبھی چپلیوں میں سے دوچار ایسے نکل آتے جن پر شہر کے سارے شوقین اُمنڈ پڑتے۔ شیرازوں کو شیراز کے رہنے والے نہ سمجھنا یہ لفظ دراصل سراج کا بگڑا ہوا ہے۔ یعنی ان کے باپ دادا کبھی گھوڑوں کا ساز بنایا کرتے تھے۔ گرتے گرتے جوتیاں بنانے لگے۔ لیکن اپنا لقب سرّاج ہی رکھا اور عام چماروں سے اپنے کو کچھ اونچا سمجھا۔

رُوپا تھا تو ٹھیٹ چمار مگر اس نے سلیم شاہی جوتی بنانے میں ایسا کمال دکھایا اور اس کی کاٹ کچھ ایسی خوبصورت رکھی کہ اپنے وقت میں شہر بھر میں مشہور ہوگیا۔ وصلی کی زری ریشم کے کام کی جوتی اس قدر سُبک اور حسین بناتا کہ اس کام کی بھرمار رہتی۔ جو ہے روپا کے ہاتھ کی جوتی کا عاشق۔ فرمائشوں سے فرصت نہ ملتی۔ جبکہ دوسرے چمار بمشکل دھیلی ... آنے کی مزدوری کرتے روپا ڈیڑھ روپیہ روز کما لیتا۔ اس کی عادتیں بھی چماروں جیسی نہ تھیں۔ کبھی اسے کلال خانے جاتے نہیں دیکھا۔ رئیسوں کے ہاں حاضری دینا یا اپنا کام کرتے ... چال چلن اچھا تھا اس لئے اپنے بال بچوں کے ساتھ اطمینان ... دوسروں سے اچھا کھاتا پہنتا اور کچھ پس انداز بھی ...

... بیوی بھی محنت مزدوری کیا کرتی۔ گوبر چُنتی۔ پنساریوں کے ہاں مسالہ کوٹتی، چکی پیستی۔ گھر پیسنے پوتنے کا کام کر کے دوچار آنے کما لاتی اور گھرستی میں اپنے مرد کا ہاتھ بٹاتی۔ اب اس کے دن بھی پلٹ گئے تھے۔ گھر ہی میں رہتی۔ گھر ہی کے دھندوں میں صبح سے شام تک لگی رہتی۔ روپا نے ایک گائے خریدلی تھی۔ اس کی خدمت کرتی۔ دودھ دہی مکھن نکالنا اس کے ذمے تھا۔

اولاد میں صرف موتی ایک لڑکا تھا۔ ماں کی آنکھوں کا تارا۔ باپ کا دلارا، گھر کا اُجالا۔ سارے دن کھیل کود میں گزارتا۔ بہت ہوا تو گائے کو جنگل میں لے جاتا۔ وہ چرتی رہتی یہ گلکڑے لگاتا اور شام کو گھر آجاتا۔ روپا نے ہرچند چاہا اور بیوی سے کہا کہ عمر بیتی جاتی ہے لونڈے کو آوارہ نہ پھرنے دے، میرے پاس بٹھا، کچھ اپنا کام بھی سیکھ لے، کھانے کمانے کا دھندا بھی کرنا چاہیئے۔ میں کب تک ہڈیاں پیلوں گا۔ دُکھ بیماری ساتھ لگی ہوئی ہے۔ ابھی تو میں موجود ہوں اگر ایسی ویسی ہوگئی تو کس کا ہاتھ تکتا پھرے گا لیکن ماں کی ممتا گوارا نہ کرتی تھی کہ اپنے لاڈلے کو دھندے کی قید میں پھنسا کر اس کی تمام خواہشوں کا خون کردے وہ کہہ دیا کرتی کہ ایسی کیا اتاول (جلدی) پڑی ہے۔ سب سیکھ لے گا۔ ابھی عمر ہی کیا ہے۔ اور ... سیکھنے تو جاتا نہیں۔ کچھ دن کھیلنے کھانے دو پھر سکھا دینا۔

محنت مزدوری کی کمائی، سستا سماں، اخراجات کم آمدنی زیادہ، پس انداز کرتے کرتے روپا نے ایک چھوٹا سا مکان بھی اپنا بنا کر کھڑا کرلیا۔ کرایہ کے جھنجھٹ سے فرصت مل گئی تھی مزے سے رہتے سہتے تھے۔ مگر گزرتا ہوا وقت ہوا سے باتیں کرنے لگتا ہے۔ خدا کی قدرت ہوا کا رُخ پلٹا۔ دیسی جوتوں کا رواج کم ہونے لگا۔ جسے دیکھو انگریزی جوتوں کا دلدادہ۔ روپا کا بھی وہ اگلا زمانہ نہ رہا۔ یا تو گھر بیٹھے فرمائشیں آتی تھیں، رئیس امیر اس کی خاطریں کرتے تھے۔ گاہکوں سے فرصت نہیں ملتی تھی۔ شوقین اس کے گھر کا طواف کرتے، ٹھوڑیوں میں ہاتھ دیتے کہ پہلے ہماری ... تیار کردے یا اب یہ وقت آگیا تھا کہ وہ جوتی بنا کر

خود بازار میں بیچنے کے لئے جاتا ... [illegible] کچھ کم کر کے دیکھتا۔ دیکھتا کبھی تو لاگت سے کم دام لگاتا ... [illegible] کی قدر جاتی رہی تھی۔ پمپ شو ... [illegible] اس کا بازار ٹھنڈا کر دیا تھا۔ ردّو بانے بہت چاہا ... [illegible] وہ بھی بنانے شروع کر دے ... [illegible] انگریزی طرز ... [illegible] اور انگلی ... [illegible] عمر دیسی کام ... [illegible] دشوار مشق پیدا کرنے کے لئے ... [illegible] چاہیئے۔ نئے کام میں ہاتھ ڈالنے کی ہمت نہ پڑی۔ دوسرے پمپ شو وغیرہ بنانے میں ایک سیپے کی مشین کی ضرورت ... [illegible] مشین خرید ... [illegible] اس کی بساط سے باہر تھا ... [illegible] وہ اپنی ہمت پر بھروسہ کر کے اپنا ہی کام کرتا رہا اور ... [illegible] گزر ہوتی رہی۔

رفتہ رفتہ ... [illegible] خریدار ... [illegible] کاریگری ہوتی قیمت زیادہ ... [illegible] کئی کئی دن تک کوئی خریدار ہی پیدا نہ ہوتا۔ آخر کار گھاٹے سہنے پڑے۔ بیوی کا گوم چھلا بیت ... [illegible] چلا گیا یہاں تک کہ مکان پر قرض لینے کی نوبت آ گئی۔

ردّو بانے گھر ... [illegible] کا خون جو سینچ ... [illegible] نے پیر جوش ... [illegible] کی حیثیت پیدا کر کے بہت بڑا ... [illegible] کر لی تھی۔ ردّو بان ہی سے قرض لیا کرتا تھا ... [illegible] عام طور پر نہایت ... [illegible] سے رحم ... [illegible] کی ... [illegible] بلکہ ان کی اسامیوں ... [illegible] زیادہ ... [illegible] ہے۔ سیٹھ جی کے دانت ردّو بانے مکان کو کھا جانے کے لئے ہمیشہ کھٹکھٹاتے رہتے تھے۔ انہوں نے کئی بار ردّو با سے باتوں باتوں میں کہا بھی کہ "ارے اس کھنڈرے کو بیچ کیوں نہیں ڈالتا۔ کب تک اس پر قرض کا بوجھ لادے جائے گا۔" بظاہر تو یہ صلاح نیک تھی مگر اصل مطلب یہ تھا کہ اصل و سود میں الٹ ڈال کر غریب کے مکان پر قبضہ کریں۔

ردّو با نجانے کیا سوچتا تھا کہ ہر دفعہ عاجزی سے انکار کر دیتا اور کہتا کہ "سیٹھ جی ابھی قرضہ ہی کونسا ہے۔ انگریزی کام بنانے کی کوشش کر رہا ہوں اگر بھگوان نے دیا کر دی تو مہینے دو مہینے میں اُتر جائے گا۔ سر چھپانے کا ایک ٹھیکرا ہے۔ اسے بھی بیچ ڈالا تو کہاں ٹھوکریں کھاؤں گا۔" سیٹھ جی بھی بظاہر مسکرا کر جواب دیتے کہ "اچھا بھئی بھگوان تمہاری کمائی میں جس ... [illegible] ہمیں بھی تمہارے پڑوس سے کچھ نہ کچھ فائدہ ہی ہے۔" مگر دل ... [illegible] جاتا کہاں ہے۔ سود ہی سود میں مکان برابر ... [illegible] جائے ... [illegible] جائے۔

حقیقت ... [illegible] ایسے غریبوں کا مال بے زبان اور مسکین ڈاکو یونہی ڈکار جاتے ہیں۔ سیٹھ جی کے سامنے جس دن ردّو بانے ہاتھ پسارا ... [illegible] روز انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ ہلدی لگی نہ پھٹکری ... [illegible] گیا۔ پھر جس وقت وہ ان کے پاس جاتا اس کی ... [illegible] ہنس کر بات کرتے۔ ردّو با بچہ نہ تھا۔ ایسے تماشے ... [illegible] دیکھے تھے۔ مگر پگڑی کا سود ... [illegible] تھا۔ ... [illegible] معلوم ہوتی ... [illegible] اندر آ کھڑا ... [illegible]

خدا ہی ... [illegible] اور دنیا میں کسی کا محتاج نہ کرے۔ مطلب ... [illegible] لئے گدھے کو بھی باپ بنا لیا جاتا ہے۔ ردّو با سمجھتا سب کچھ تھا کہ سیٹھ جی کی یہ لّلو پتّو خالی از علت نہیں۔ پھر تقدیر کے آگے اس کی سمجھ کیا کام دیتی۔ غریب کر ہی کیا سکتا تھا۔ اُدھر ان کے چنگل میں پھنس چکا تھا۔ دھل ... [illegible] ... [illegible] نہیں بنتی تھی۔

خرچ چاہے دھیلی روز کا ہو مگر جب آمدنی چار پیسے بھی نہ ہوگی تو چند روز میں کنڈے ... [illegible] خالی ہو جائیں گے۔ ردّو با جتنا ... [illegible] کفایت شعاری سے کام لیتا۔ ہفتوں گوشت کو ہاتھ ... [illegible] کاریاں بھی ... [illegible] چھوڑ دی تھیں ... [illegible] ... [illegible] پھر بھی گزر نہ ہوتی۔ مہینے ... [illegible] دو چار روپے سیٹھ جی سے ضرور قرض لانے پڑتے۔ کام کا بالکل مندا ہو گیا تھا۔ سلیم شاہی کے دام نہ اُٹھتے۔ انگریزی ... [illegible] دو چار دفعہ بنائے تو نگھٹ۔ جو دیکھتا ہنستا۔ شہر میں چار ... [illegible] کے لئے مزدوری کی کیا کمی ہے مگر ایک تو اُس نے ساری عمر کوئی دوسرا کام نہیں کیا تھا۔ دوسرے غموں نے اندر ہی اندر گھلا کر اس کی طاقت سلب کر لی تھی۔ آئے دن بخار رہتا۔

کم بختی جب آتی ہے تو چاروں طرف سے۔ اِدھر ردّو با کو بخار آنے لگا۔ اور اُس کی عورت کو یکایک بیٹھے بیٹھے دست آنے لگے۔ شہر میں ہیضے کی وبا پھیلی ہوئی تھی۔ ردّو با کے پیر تلے کی زمین

نکل گئی۔ اپنے لئے تو وہ کبھی دمڑی کا شربت بھی نہیں لایا تھا۔ یونہی بخار کو ٹال دیتا۔ مگر بیوی کا یہ حال دیکھ کر ڈر گیا۔ سوچنے لگا کیا کروں؟ حکیم وید، ڈاکٹر کوئی مفت دوا نہیں دیتا۔ خیراتی ہسپتالوں میں چماروں کی کیا پرسش۔ وہاں موٹی اسامیاں پوچھی جاتی ہیں۔ گھر میں زہر کھانے کو چار کوڑیاں نہ تھیں۔ ہائے ہائے کرتا ہوا اُٹھا کہ چلو سیٹھ جی سے کچھ روپیہ اور مل جائے تو دوا دارو کا کام چلے۔ اپنے بس تو اپنا گھر اُجاڑنا چاہیئے نہیں۔

آہستہ آہستہ سیٹھ جی کی بیٹھک میں پہنچا۔ منیم جی بہی کھاتہ کھولے حساب کیا اُلٹے کے سیدھے ملا رہے تھے۔

رودپا۔ منیم جی۔ بندگی۔

منیم:۔ (بغیر آنکھ اوپر اُٹھائے) کون رودپا ہے؟

رودپا:۔ ہاں جی۔ سیٹھ جی کہاں ہیں؟

منیم:۔ گھر میں گئے ہیں۔

رودپا:۔ کب تورٹی آئیں گے۔

منیم:۔ اُن کے من کی موج ہے۔

رودپا:۔ تو میں بیٹھوں۔

منیم:۔ تیری خوشی۔

رودپا ایک طرف بیٹھ گیا۔ اتفاق سے زیادہ دیر بیٹھنا نہیں پڑا۔ سیٹھ جی توند سہلاتے ہوئے آگئے۔

سیٹھ جی:۔ (ذرا بے رُخی کے ساتھ) کہو چودھری رودپا؟ آج کیسے آنا ہوا۔ کہیں رستہ تو نہیں بھول گئے۔

رودپا:۔ مہاراج میری حالت بہت خراب ہوتی جاتی ہے۔ کل رات سے لونڈے کی ماں کو بھی دست آرہے ہیں۔

سیٹھ:۔ (جلدی سے) ارے تو کیا اُسے اُلٹیاں بھی ہوتی ہیں۔ تھو تھو۔

رودپا:۔ اُلٹیاں تو نہیں ہوتیں۔ مسّی روٹی کھائی تھی۔ وہیں جا لوں پچی نہیں۔

سیٹھ:۔ ویسے تو اچھی ہے؟

رودپا:۔ ہاں مہاراج۔

سیٹھ:۔ کوئی دوا دی ہوتی۔

رودپا:۔ کہاں سے دوں مہاراج۔ زہر کھانے کو تو پھوٹی کوڑی پاس نہیں۔ آج چودھواں دن ہے بخار میں پڑا ہوں، چار پیسے کی مزدوری نہیں ہوسکی۔

سیٹھ:۔ (منیم سے) منیم جی دیکھنا چودھری کی مدت کب ختم ہوتی ہے؟

رودپا:۔ میری تو سُن لو۔

سیٹھ:۔ کیا سُنوں۔ اچھا کہو۔

رودپا:۔ کچھ روپے کی اور پرورشتی ہو جائے تو بڑی دیا ہو۔

منیم جی نے بھی عینک کی آڑ میں سے دیکھا اور بولے۔

"چودھری دینے میں تو کوئی ہرج نہیں۔ پرکس بھتے پر؟"

رودپا:۔ منیم جی میرے نوٹ نہیں۔ وخت (وقت) کی بات ہے۔ اُدھر میرا کام لوٹ گیا اِدھر بیماری نے دُکھی کر دیا ہے بیاج کو کہتے ہو گے؟ ذرا ٹھیک ہو جاؤں۔ کوڑی کوڑی چکا دونگا۔ دوسرے اپنے مکان پر مانگتا ہوں مفت تو نہیں بیتا۔

سیٹھ جی پاؤں پھیلا کر دل ہی دل میں ہنسے۔ "چکا دونگا۔ اس سے سات جنم بھی اصل تو کیا بیاج بھی ادا نہیں کیا جاسکے گا" اور کہنے لگے "بھئی چودھری یہاں روپے کی ٹکسال تو ہے نہیں۔ سدا برت نہیں بٹتا۔ بیوہار ہے۔ پچھلا دیتے جاؤ۔ آگے لو جتنا چاہو۔ ہم بھی جانیں کہ تم لین دین کے کھرے۔ ہمارا ابھی دینے کا حوصلہ ہو۔ رہا تمہارا مکان۔ اس میں اب مام کیا رہا ہے۔ پھر بھیا جھگڑے میں کون پڑے۔ تم ہی اپنے دل میں سوچو آج تک تم نے بیاج کا بھی تو ایک دھیلا ادا نہیں کیا۔

رودپا:۔ (آنکھوں میں آنسو بھر کر) کیا ڈر ہے مہاراج میں کہیں بھاگا تو جاتا نہیں۔ دوں گا۔ جان رہتے پائی پائی نچکا دوں تو سسر کا بیٹا نہیں۔ اس وقت تو کچھ پرورشتی ہو جائے۔

سیٹھ:۔ (منیم سے کچھ آنکھوں ہی آنکھوں میں باتیں کر کے) اچھا، خیر۔ تم ہمارے پڑوسی ہو۔ تین روپے لے جاؤ۔ اپنا کام چلاؤ۔ پر آگے تکلیف نہ کرنا۔ جب تک مول بیاج ادا نہ کر دو گے ہم چار دھیلے بھی دینے کو تیار نہیں۔ (منیم سے) منیم جی چودھری کو تین روپے دے دو۔ آیا ہے تو خالی ہاتھ نہ جائے۔

رودپا کے دل میں تو آیا کہ تین روپے ٹکے سیٹھ جی کے مُنہ پر مار دے۔ کچھ خیرات مانگنے نہیں آیا تھا۔ اپنے مکان پر لے رہا تھا، لیکن بُرا ہو مفلسی، ناداری، کساد بازاری اور ضرورت کا۔ وہی مثل تھی کہ ؎

آنکہ شیراں راکند روباہ مزاج
احتیاج است احتیاج است احتیاج

اگر اس وقت ذرا اکڑفوں دکھاتا تو سیٹھ جی تین روپے بھی

تجوری میں بند کرکے سوکھا جواب دے دیتے۔ پھر وہ کیا کرتا۔ دوسری جگہ سے دو کوڑیاں بھی ملنے کی اُمید نہ تھی مجبور تھ۔ درویش سجان درویش اننت رو پے آنے میں لگا۔ نیچی نظر کئے ہائے ہائے کرتا ہوا اپنے گھر آگیا۔

روپا کا بیٹا ہوش سنبھال کر اب کچھ زندگی کی مشکلات کو سمجھنے لگا تھا۔ گانے کی تک بکی تھی جسے دیراں لے جاتا۔ باپ کے ساتھ بیٹھ کر اس کا ہاتھ بٹاتا۔ سُماری چلاتا۔ جوتی بنا سکتا۔ باپ بیٹا کاریگر ہوئے نہ تو مدت چاہئے تھی۔ باں صبح سے شام تک کئے رہنے کے بعد معمولی ایک جوڑا تیار کر لیتا۔ بازار بھی جاتا۔ مگر چار باتھوں کے کام سے بھی دو وقت کا پورا نہ پڑتا۔ یہی جوتیوں کی قیمت بہت گر گئی تھی۔ جوڑے پیچھے دو چار آنے مشکل سے ملتے۔

روپا کام تو کرتا مگر ہائے ہائے کرکے۔ بیماری نے اسے چرلیا تھا۔ آخر چند ہی روز کے بعد کھٹیا پر پڑ گیا۔ اور بہت جلد بیوی اور لڑکے کو اپنے دیال اور ایشور کے بھروسے پر چھوڑ دُنیا سے رخصت ہوا۔ قیامت آگئی۔ مثل ہے کہ آدمی کو بیٹھے ہی بیٹھے روزی کو کھڑے ہو کر۔ یہاں ایک ساتھ دونوں بپتائیں پڑ گئیں۔ مگر اپنے بس کی کیا بات تھی۔ کھڑے بیٹھو یا پڑے اللہ میاں کی بے نیازی کو ٹھیس نہیں لگتی۔ وہ جو چاہتے ہیں کرتے ہیں۔

سود خوار پٹھان ناحق بدنام ہیں۔ اُن کی سخت گیری میں شک نہیں۔ قرض دار کے مُردے پر بھی عذاب کے فرشتے کی طرح آ بیٹھتے ہیں لیکن بنیا تو اپنے قرض دار کے کنبے تک کا خون چوس کر بھی دم نہیں لیتا۔ یہ میٹھی چھری چپکے ہی چپکے دیمک کی طرح کھا جاتا ہے۔ روپا جب کھٹیا پر پڑا تھا تو سیٹھ جی کے گھر میں گھی کے چراغ جلنے شروع ہوگئے تھے۔ اب ادھر اُس کا دم نکلا اُدھر منیم جی آموجود ہوئے۔

روپا کا بیٹا یہ سمجھ کر کہ شاید اُٹھاؤنی میں مدد کرنے آئے ہیں) منیم جی آپ نے بڑی کرپا کی۔

منیم :۔ ارے بھئی مجھے تو سیٹھ جی نے یہ پوچھنے بھیجا ہے کہ مرنے والا ہماری رقم کا کیا بندوبست کر گیا۔

روپا کی بیوی :۔ منیم جی کئی کئی مہینے سے بیمار تھے۔ دوا ٹھنڈائی کو کوڑی تھی نہیں سیٹھ کے قرضہ کا کیا بندوبست کرتے۔

منیم :۔ پھر تو بڑی مشکل ہوئی۔ اب تم کہاں سے دوگے؟

روپا کا بیٹا :۔ محنت کریں گے مزدوری کریں گے۔ اور منیم جی اس وقت تو ہمیں اس کی اُٹھاؤنی کا فکر ہے۔

منیم :۔ بھیا۔ سیٹھ جی کے قرضہ کا فکر کرو۔

روپا کی بیوی :۔ جل کر آگ لگے سیٹھ جی کے قرضہ کو۔ ہمارے تو گھر میں آگ لگ گئی اور سیٹھ جی کو اپنے قرضہ کی پڑی ہے۔

اور اس نے ایسی جلی کٹی باتیں سُنائیں کہ منیم جی کان دبا کر چلے گئے۔ لیکن وہاں چراغ بتی سیٹھ جی نے پہلے ہی سے تیار کر رکھی تھی۔ اُسی دن نالش داغ دی اور دو چار پیشیوں کے بعد سیٹھ جی نے اپنے مول بیاج کی رقم کے بدلے مکان قرق کرا لیا۔ دونوں ماں بیٹے جس مصیبت کا مدت سے انتظار کر رہے تھے سر پر آن موجود ہوئی۔

باپ کی موت اور مکان کی قرقی نے نوجوان موتی کی ذمہ داریوں میں بے حد اضافہ کر دیا۔ وہ اپنی رنڈیا دُکھیا ماں کو لیکر چمرواڑے کی ایک چھوٹی سی کوٹھڑی میں رہنے لگا جسب معمول جوتے بناتا اور بیچتا۔ ماں بھی اِدھر اُدھر چلی جاتی۔ دو چار پیسے کی مزدوری کر لیتی اور جس طرح بنتا دونوں بیٹے گزارہ کرتے۔

جس زمانے میں روپا پر لکشمی ماتا کی دیا تھی وہ اپنے گھر جنم اشٹمی بڑی دھوم دھام سے منایا کرتا تھا۔ اس تقریب کے لئے کئی کئی ہفتے پہلے وہ تیاریاں کرتا۔ گھر کو لیپتا پوتتا۔ پنڈال کھڑا کرتا۔ سجاتا اور بھگوان کا جنم دن منا کر پرشاد بانٹتا۔ برادری کی ساری عورتیں اور مرد اکٹھے ہوتے بھجن گاتے، دف بجاتے رات کے بارہ ایک بجے تک خوب چہل پہل رہتی۔ اس کے بعد سب اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے۔

جب تک روپا زندہ رہا۔ نہیں بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ جب تک اُس کے ہاں خوشحالی کا دور دورہ تھا جنم اشٹمی کی یہ تقریب بھی جاری رہی۔ پچھلی جنم اشٹمی پر البتہ اس کی مالی حالت ایسی کمزور ہو گئی تھی کہ وہ یہ تقریب نہ منا سکا تھا۔ پھر اس کے مرنے کے بعد تو بھگوان نے اس کے بیٹے اور بیوی کو اس قابل ہی نہیں رکھا کہ دو پیسے بھی بھگوان کے نام پر خرچ کر سکتے۔ گھر کو آگ لگ گئی۔ اپنا ہی پیٹ بھرنا دشوار تھا۔ پرشاد کہاں سے بانٹتے۔ دُنیا کے ہر شعبے میں دولت کی بہار ہے۔ غریب انسان مذہب کی رسوم بھی ادا نہیں کر سکتا۔

روپا کی بیوی اور بیٹے کے لئے روپا کے مرنے کے بعد جنم اشٹمی کا پہلا تہوار تھا۔ دونوں اپنی پچھلی اچھی زندگی کے دن یاد کرکے رو

رہے تھے۔ ادھر مندروں میں انتہا کی رونق آ رہی تھی۔ دروازوں پر سنکھ اور نفیریاں بج رہی تھیں۔ ہر طرف پھول ہی پھول بکھرے ہوئے تھے۔ ان کی مہک اور اگر وغیرہ کی خوشبو سے فضا معطر تھی۔ عقیدت مند پوجا کرنے والوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ باہر سے اندر تک لگے ہوئے تھے۔ گانے بجانے کی آوازوں نے ایک عجیب سماں باندھ رکھا تھا۔

یہ بہار روپا کے بیٹے کی آنکھوں کے سامنے تھی۔ وہ چاروں طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتا اور چپ ہو جاتا۔ ماں آج کے دن اندھیرے سے اٹھتی اور سویرے سویرے جھاڑو بہارو سے فراغت پا کر کڑھائی چڑھا دیتی۔ گلگلے حلوا پوری اور کئی قسم کے پکوان تلنے میں لگ جاتی۔ چولھے سے ہٹتی تو گھر کو سجاتی۔ اس وقت اس کے دل کی عجب حالت تھی۔ ٹوٹی ہوئی کوٹھڑی، میلے کپڑے، ٹکا گرہ میں نہیں۔ ٹھنڈے ٹھنڈے سانس لیتی اور آنکھوں میں آنسو بھر کر تصور میں بھگوان سے سوال کرتی کہ "ہے دیا سندھو ایسا مجھ سے کیا پاپ ہوا جو میرے اوپر یہ بپتا پڑی۔ سر کا وارث اٹھا۔ روزی میں آگ لگی گھر بار سب لٹ گیا۔" اس کے اندر سے کوئی جواب دیتا کہ پچھلے کرموں کا پھل آتا ہے۔ اس جواب سے دلوں کی تڑپ میں ایک قسم کا سکون ہو جاتا ہے۔ بیوہ بھی آسمان کی طرف دیکھ کر آنسو پونچھ ڈالتی۔

اسی طرح دن گزر گیا۔ رات آئی۔ مندر جگمگانے لگے۔ گھنٹوں کی صدائیں آسمان تک گونجنے لگیں۔ ماں نے ٹھنڈا سانس لے کر گھٹنے سے سر اٹھایا، آنسو پونچھے اور بیٹے کی طرف دیکھ کر بولی۔ "بیٹا اپنے ہاں تو اب جیتے جی کہاں بھگوان کا اتسو منانا نصیب ہوگا۔ جاؤ کسی مندر سے اگر مل سکے تو تھوڑا سا پرشاد لے آؤ۔ شگون تو کر لیں۔ دیکھیو۔ کوئی روکے ٹوکے تو اڑیو نہیں۔ ضد نہ کیجیو۔ باہر ہی سے پرشاد مانگ لیجیو۔ ہم غریبوں سے بھگوان بھی روٹھے ہوئے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ تاؤ میں آ کر کسی سے کچھ کہہ سن بیٹھے۔ میرے لال، ہم اچھوت ہیں۔ نیچ سے نیچ۔ ایشور نے ہمیں اونچی ذات والوں کے پاؤں کی خاک بنایا ہے۔ ہمیں خاک ہی کی طرح رہنا پڑے گا۔ سر چڑھنا ہمارے لئے اچھا نہیں۔"

لڑکا منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑانے کے بعد کسمسا کر اٹھا اور ایک چھوٹا سا گلاس لے کر مندر کی طرف چلا۔ مندر کے دروازے پر بڑی بھیڑ تھی، مگر یہ نیچی گردن کئے دروازے میں داخل ہو ہی گیا۔ دل دھک دھک کر رہا تھا۔ ہر قدم پر ٹھٹکتا اور دیکھتا کہ کوئی روکتا ٹوکتا تو نہیں۔ لیکن نہ کسی نے روکا نہ ٹوکا بلکہ اس کی طرف نگاہ بھر کر بھی نہیں دیکھا۔ اس جیسے میلے کچیلے پھٹے پرانے کپڑے پہنے بہت سے آدمی وہاں موجود تھے۔ شاید وہ سب اونچی ذاتوں والے ہوں گے کیونکہ باوجود غریب ہونے کے ان میں سے ہر ایک بلا خوف مندر میں الا گھلا پھر رہا تھا۔ یہ بھی ایک کونے میں سمٹ کر چپ چاپ بیٹھ گیا۔ گانا بجانا زوروں پر تھا۔ لوگ بڑے دھیان سے سن کر سر اور چٹکیوں سے تال دے رہے تھے۔ کسی طرف کوئی ایسی بات نہ تھی جو مندر کی دلچسپ فضا میں کھنڈت ڈالتی۔ روپا کے بیٹے کا یکایک آپ ہی آپ دل دھڑکنے لگا۔ خوف سا معلوم ہوا۔ آنکھ اٹھا کر دیکھتا ہے تو سیٹھ جی چلے آتے ہیں جنہوں نے پڑوس کا یہ حق ادا کیا تھا کہ بیوہ کے رونے پر خیال کیا نہ لڑکے کی منت سماجت پر، اور کھڑے کھڑے ان کا گھر نیلام کر کے دن کے دن نکال دیا۔ اتنا بھی ترس نہ آیا کہ دوسری جگہ غریب تلاش کر لیتے۔ ان کی صورت کچھ ایسی ڈراونی نظر آئی کہ بیچارے کی سٹی گم ہو گئی۔ ادھر ادھر منہ چھپانے کی کوشش کی، مگر اس بھیڑ میں، اونچی ذات والوں کی بھیڑ میں اسے کہاں پناہ ملتی۔ کوئی کپڑا بھی ایسا پاس نہ تھا جس سے چہرہ چھپا لیتا۔ سیٹھ جی اس کو کڑوی کڑوی تیز تیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

لڑکا سیٹھ صاحب کی خونی آنکھوں سے ڈر گیا اور کسی آنے والی مصیبت کا خیال کر کے دل ہی دل میں کانپ اٹھا۔ بھاگ جانے کا ارادہ کیا۔ قدم نہ اٹھے۔ غریب بیٹھا سوچ رہا تھا کہ کیوں کر جان بچاؤں۔ اتنے میں ایک طرف سے غل مچا، مارو سالے کو۔ جانے نہ پائے۔ مزے سے سب کی آنکھوں میں دھول ڈال کر اندر گھس آیا ہے۔ ڈھیٹ کہیں کا۔ یہ بھی نہ جانا کہ بھگوان کی جنم اشٹمی کا دن ہے۔ کم بخت نے سارے مندر کو اپوتر کر دیا۔

گانا بجانا موقوف ہو گیا۔ لوگوں میں گڑبڑ پڑ گئی۔ دھواں دھوں ہونے لگی۔ بیچارے پر چاروں طرف سے لاتیں، گھونسے، تھپڑ، جوتے پڑ رہے تھے۔ دو چار نیک دل آدمیوں نے اسے بچانے کی بھی کوشش کی مگر کٹروں کے آگے ان کی کیا چلتی۔ مارنے والے یہ کہتے ہوئے کہ "یہ بھی اچھوت ہیں۔ ان کی

بھی مجبر لینا۔" ان کی طرف بڑھے۔ اب کون انہیں کرپا کرتا۔ سب چپ ہو کر اِدھر اُدھر ٹل گئے۔

رُدپا کے بیٹے کا پیٹتے پیٹتے ملیتھن نکل گیا۔ گلاس ہاتھ سے چھوٹ کر کہیں گر پڑا۔ کرتے کی دھجیاں اڑ گئیں۔ دھوتی کے بیرے لگ گئے۔ سارا بدن چوٹوں سے نیلا ہو گیا۔ کان ناک اور مُنہ سے خون کی بوندیں ٹپکنے لگیں۔ اس حالت میں بھگوان جانیں وہ خود کسی نہ کسی طرح مندر سے باہر نکل آیا۔ یا لوگوں نے دھکے دے کر نکال دیا۔ اب وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں کھڑا ڈگمگا رہا تھا۔ چاروں طرف آدمی جمع تھے۔ چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ کوئی ترس کھا کر اس کی طرف داری میں کچھ کہتا تو دوسرے اول فول بکنے لگتے اور ہمدردی کرنے والوں سے اُلجھنے لگتے۔

اسی اثنا میں اسے ذرا ہوش آیا اور اُس نے ایک دفعہ ہی جھرجھری سی لی اور بھیڑ کے بیچ میں سے نکل ایک طرف کو بھاگا۔

رات گزرنے کے بعد صبح ہوئی تو سارے شہر میں یہ مشہور ہو گیا تھا کہ ایک چمار کا لڑکا کرشن مندر کے میدان میں دوسری طرف اپنی دھوتی کا پھندا گلے میں ڈال درخت پر لٹک کر مر گیا۔

ہر شخص کی زبان پر رُدپا کے بیٹے کی موت کا چرچا تھا۔ اور یہ بھی سب کہتے تھے کہ اس نے خودکشی کی۔ مگر اس کی خبر کسی کو نہ تھی کہ کیوں اس کو اس طرح جان دینی پڑی۔ اس بھید کو جاننے والے صرف دو تھے۔ ظالم سیٹھ یا مرنے والے کی آتما۔

جس وقت بھگوان کرشن کے جنم کی خوشیاں منائی جا رہی تھیں ایک نوجوان بھگتی اور دھرم کی بندی پر اپنا جیون بلیدان کر رہا تھا۔

پائل

آتشیں نغموں کا شاعر سلام آپ کیلئے گیتوں کا تحفہ لایا ہے۔ گیت جو آگ سے زیادہ گرم اور شہد سے زیادہ میٹھے ہیں۔

"پائل" آرٹ پیپر پر چھپی ہے۔ کتاب مجلّد اور لطیف فریب جلد پوش سے آراستہ ہے۔

قیمت ایک روپیہ بارہ آنے۔ علاوہ محصول ڈاک؛

ناشر:۔ ساقی بک ڈپو۔ دہلی؛

خمکدہ

غمِ دل کا اُنہیں بھی کچھ یقیں سا ہوتا جاتا ہے
مرا ذوقِ محبّت ہائے رسوا ہوتا جاتا ہے

خیالِ یار آ اور دیکھ یہ کیا ہوتا جاتا ہے
مری اُمید کا ہر رنگ پھیکا ہوتا جاتا ہے

اُدھر اُنکی تجلّی ہے کہ پنہاں ہوتی جاتی ہے
اِدھر ذوقِ تماشا ہے کہ رسوا ہوتا جاتا ہے

مری ناکامیوں پر آج وہ بھی رو دئے آخر
مری مجبوریوں میں درد پیدا ہوتا جاتا ہے

بجھا ہی چاہتا ہے اب چراغِ زندگی شاید
تمنّاؤں کی دُنیا میں اُجالا ہوتا جاتا ہے

زمانے کی ہر اک شے اُن کا پردہ بنتی جاتی ہے
مگر حُسن اور رسوا، اور رسوا ہوتا جاتا ہے

نہیں ہوتا اگر کوئی شریکِ غم، نہ ہو کیا غم
یہ کیا کم ہے کہ غم دل کا سہارا ہوتا جاتا ہے

نہیں کرتا نہ کر لطف و عنایت اپنے بندوں پر
ہمارا کیا ترا برتاؤ رسوا ہوتا جاتا ہے

ضرورت ہی نمک پاشیِ پیہم کی ضرورت ہے
کہ دل مرہونِ احسانِ مداوا ہوتا جاتا ہے

ٹھہر اے صبح کے تارے کہ دل لذّت کشِ غم ہے
مدد اے شامِ تنہائی سویرا ہوتا جاتا ہے

خمار اب دیکھتے ہیں وہ کچھ ایسی مست نظروں سے
کہ دل ہی بے نیازِ جام و صہبا ہوتا جاتا ہے

خمار دہلوی۔

وقار عظیم

کچھ کڑوی گولیاں — افسانہ نگاروں کیلئے

نئے افسانے اور نئے افسانہ نگار کی بھی عجیب حالت ہے۔ فن اور فن کار دونوں مدح و ذم کے اچھے خاصے نرغے میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ایک طرف تو ان کے نام پر عقیدت اور محبت کے پھول برسائے جاتے ہیں اور دوسری طرف اس کے راستے میں ہر طرف کانٹے ہی کانٹے ہیں۔ ایک طرف سے مدح سرائی اور قصیدہ خوانی ہے، دوسری طرف سے ہجو و دشنام۔ لیکن مدح سرائی میں کچھ ایسا نشہ ہے کہ ہمارا نیا افسانہ نگار دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے بنائے ہوئے راستہ سے اپنی خود ساختہ بہشت (اور میرے نزدیک اکثر صورتوں میں دوزخ) کی طرف تیزی سے قدم بڑھائے چلا جا رہا ہے۔ اُس نے اپنے کانوں کو ہجو و دشنام کی طرف سے قطعی بند کر لیا ہے۔ اُس کی "طبع حزیں" پر اب "دشنام یار" گراں نہیں گذرتی۔ یا ممکن ہے سب کچھ سُن کر اور سمجھ کر بھی وہ بے خبر رہنا چاہتا ہے۔ اُسے اپنے گریبان میں جھانکتے ڈر معلوم ہوتا ہے، جھجک محسوس ہوتی ہے۔ شاید اس لئے کہ اُس نے ادب کے بازار میں کھوٹے سکوں کی ساکھ قائم کر لی ہے اور اُسے کسی قیمت پر بھی کھونے کے لئے تیار نہیں۔ اس مرض کا علاج میٹھی باتوں سے ممکن نہیں۔ کڑوی گولیاں ہی ممکن ہے، اس مہلک مرض کا مداوا بن سکیں۔ یہ "کڑوی گولیاں" کھا کر اگر مریض اپنے گریبان میں مُنہ ڈالنا سیکھ لے، اور کھوٹے سکوں کو کھوٹا سمجھنے کا عادی ہو جائے تو ممکن ہے مرض 'وبا' بننے سے پہلے ہی ختم ہو سکے۔ یہ "کڑوی گولیاں" میٹھی تو بے شک نہیں، لیکن کچھ ایسی کڑوی بھی نہیں۔

اِس نسخہ کی سب سے پہلی گولی بے شک ذرا زیادہ کڑوی ہے۔ زیادہ کڑوی اس لئے کہ اس کی کڑواہٹ ہمارے یو۔پی، پنجاب اور بمبئی سب کے حلق کو کڑوا کرتی ہے — زبان و بیان کا مسئلہ اور ہمارے نئے افسانے سے اس کا رشتہ ناتا! بڑی پُرانی بات ہے۔ گڑے مُردوں کو اُکھاڑنا پڑتا ہے۔ لیکن میرا ارادہ مُردے اُکھاڑنے کا بالکل نہیں۔ مجھے تو دو ایک سیدھی سادی باتیں کہنی ہیں۔ اگر آپ کو (یعنی افسانہ نگار کو) کڑوی لگیں تو تھوک دیجئے۔ زبان و بیان کا مسئلہ اُردو میں ہمیشہ سے لڑائی جھگڑے کا گھر رہا ہے۔ ولی سے لے کر داغ تک شاعری کی ساری داستان اِسی اُلجھاوے میں پھنسی ہوئی ہے۔ لیکن یہ تو شاید وہی گڑے مُردے اُکھاڑنے والی بات شروع ہو گئی۔ اس لئے اِسے جانے دیجئے۔ اپنے افسانوں کو دیکھئے۔ ان افسانوں میں ہمارے "ترقی پسند" (ترقی معکوس) افسانہ نگاروں نے زبان اور بیان کی اِصلاح اور اُس کے نظم و نسق کا ایسا زبردست بیڑا اُٹھایا ہے کہ شاید تھوڑے دن میں اس کی صورت شکل کا پہچاننا بھی آسان نہ رہے۔ اس اصلاحی مقصد کی "تاویلیں" بھی بہت سی ہیں اور "جواز" کے مسئلوں کی بھی کمی نہیں۔ "ہم اس لئے یہ محاورہ استعمال کرتے ہیں کہ ہمارے صوبے میں اسی طرح بولا جاتا ہے۔" "ہم نے یہ لفظ اس نئے ان معنوں میں استعمال کیا ہے کہ ہماری والدہ کی زبان پر یوں ہی چڑھا ہوا ہے۔" "ہم نے یہ لفظ پُرانے نہیں بلکہ ایک نئے معنی میں استعمال کیا ہے۔" "ہم زبان و بیان کو نہیں، خیال کو زیادہ اہم سمجھتے ہیں۔" "ہمیں فرسودہ تشبیہوں اور استعاروں سے نفرت ہے۔" "ہم ترقی پسند ہیں۔" "ہم انقلاب کے حامی ہیں۔" "ہم رجعت پسندی اور قدامت کو فنا کر دینا چاہتے ہیں۔" — نئی طرح کی زبان، نئے طرح کے بیان اور نئی اور انوکھی تشبیہوں اور "بے حد لطیف" استعاروں کے استعمال کے جواز میں یہ یا اس سے ملتی جلتی بہت سی باتیں کہی جاتی ہیں — بدقسمتی سے یہ کہنے کی جرأت کسی میں نہیں کہ ہم نے کبھی صحیح زبان بولنے اور لکھنے کی کوشش ہی نہیں کی، ہماری نظر زبان و بیان کے اُس بے پایاں خزانہ تک پہنچی ہی نہیں جس پر نظر ڈالے بغیر زبان و بیان کے اونچ نیچ کا پتہ ہی نہیں چلتا، ہم نے اپنے پُرانے ادب کا مطالعہ ہی نہیں کیا اور اس لئے ہم عاجز اور بے بس ہیں اور جو کچھ کہہ رہے ہیں مجبور اور بے اختیار ہو کر کہہ رہے ہیں۔ مانا کہ ہمیں جو کچھ کہنا ہے، اصل میں اہم وہی ہے، لیکن جو کچھ کہنا ہے اگر اُسے سلیقہ سے نہ کہا جا سکے تو

اُس میں اثر بھی تو پیدا ہونا ممکن نہیں۔ پھر کیوں ہم اپنے دل کے چور کو چھپائیں؟ کیوں اپنی بے بضاعتی کے احساس سے شرمائیں؟ اور کیوں دُنیا کے سامنے "قدامت، رجعت، اور انقلاب" کے نام سے یہ سارے ڈھونگ رچائیں۔ بے شک نئے زمانہ کو نئے خیالات کی ضرورت ہے۔ زندگی کے معنوں میں بے پایاں وسعتیں پیدا ہوئی ہیں اور یہ بے پایاں وسعتیں پُرانے ظرفوں میں نہیں سما سکتیں۔ اِس لئے نئے طرز کی، نئے انداز کی، نئے بیان کی، نئی زبان، نئی تشبیہوں، نئے اشاروں، کنایوں اور استعاروں کی ضرورت ہے۔ لیکن جو کچھ نیا ہے اُسے بھی پُرانے ہی سوتوں سے بہا لایا جاتا ہے۔ زبان و بیان کو ایک مسلسل تاریخی حقیقت سمجھے بغیر اُس میں نیا پن پیدا کرنے کی کوشش، بھدے، بے ڈھنگے نمونے پیدا کرتی ہے، مضحکے کے موقعے دیتی ہے اور زبان کو پستی کی طرف لے جاتی ہے۔ اس لئے ذکر و بیان میں نیا پن پیدا کرنے کا دعویٰ کرنے اور اپنی نئی کوششوں کے جواز میں تاویلیں پیش کرنے سے پہلے، افسانہ نگار کو اپنے پُرانے ادبی سرمایہ کا پاس۔ بیان بننا پڑے گا۔ اُسے اپنی زبان کے سارے ادبی جواہر پاروں سے باخبر ہونا پڑے گا، اُسے اپنی نظر میں زبان و بیان کے مسلسل سفر کی پوری تصویر رکھنی پڑے گی اُسے اپنے دل کے ہر گوشے میں زبان کے قومی سرمایہ کی کھٹک، کسک اور گھلاوٹ محسوس کرنی پڑے گی اُسے بڑی سختیاں جھیلنی ہوں گی، جب کہیں وہ زبان کو اپنے بڑھتے ہوئے خیالات کا ہم نوا بنا سکے گا، جب کہیں وہ ہجو و دشنام سے بچ سکے گا۔ اپنے پرائے کا فرق مٹائے بغیر زبان کو نئی راہوں پر لگانا جان جوکھم کا کام ہے۔ جب یہ سب کچھ ہولے جب اس بات کا دعویٰ ہو سکتا ہے کہ ہم زبان کو اپنے نئے خیال کے ساتھ چلانا چاہتے ہیں —— بڑی کڑوی گولی ہے، لیکن اس کے کھائے بغیر کام نہیں چلتا۔ زہر ہے لیکن دوا جان کر اسے کھانا ہے۔

زبان و بیان کا مسئلہ اُن بہت سے مسئلوں میں سے صرف ایک ہے، جن پر ہمارے نئے افسانہ نگار کی گمراہی کی بنیادیں قائم ہیں۔ تجربہ، اصلاحی مقصد، جدّت اور ترقی (اس کے مقابلہ میں قدامت اور رجعت) جوائس، لارنس، ذلف اور پروست کا فن، مارکس کا معاشی نظریہ، فرائڈ اور اڈلر کی نفسیات، ان بہت سی چیزوں اور ان کی اَن گنت تاویلوں نے نئے افسانہ نگار کے لئے کچھ ایسے راستے کھول دئے ہیں جن پر چل کر وہ اپنے آپ کو تو بے خطر محسوس کرنے لگا ہے، لیکن اُس سے ادب کی میراث بڑے خطرے میں پڑ گئی ہے اور یہ خطرہ چھوٹا موٹا نہیں، اس میں جان جانے کا ڈر ہے، اب تک جو کچھ کیا دھرا ہے اُس کے مٹ جانے کا اندیشہ ہے، ادب کے تاریخی تسلسل میں رخنہ پڑ جانے کا خوف ہے۔ لیکن نیا افسانہ نگار صرف "واہ واہ" کے نعروں سے مطمئن ہو کر ادب کی حیات و ممات کے اندیشہ سے بے نیاز آگے بڑھا چلا جا رہا ہے۔ اور بظاہر اُس کے اِس مالیخولیا کا کوئی علاج نظر نہیں آتا —— سوائے اِن کڑوی گولیوں کے۔

تجربہ کسے کہتے ہیں؟ "جو کچھ آپ نے دیکھا، سُنا یا محسوس کیا"۔ ادب کی دوسری اصناف کی طرح افسانہ بھی انسانی تجربہ کا ترجمان ہے۔ بظاہر بڑی آسان سی بات ہے، لیکن عمل میں آکر یہی بے حد آسان بات، حد سے زیادہ دشوار بن گئی ہے۔ تجربہ کے اس مفہوم نے نئے افسانے کو نوے فی صدی (اسے ریاضی کی تحقیق نہ سمجھئے) رطب و یابس سے بھر دیا ہے۔ ہر وہ چیز جو دیکھی گئی، سُنی گئی یا شاید محسوس بھی کی گئی، گویا افسانے کا موضوع بن سکتی ہے۔ بن سکتی ہے، اس لئے بنائی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں گفتگو کے دو پہلو پیدا ہوتے ہیں۔ ایک میں تو گریبان میں مُنہ ڈالنے کی ضرورت پڑے گی، لیکن دوسری بات یوں ہی سرسری طور پر کہی جا سکتی ہے۔ اس لئے پہلے یہی دوسری بات سُن لیجئے: تجربہ کا مفہوم جو کچھ آپ نے بیان کیا وہ حرف بہ حرف صحیح ہے۔ لیکن سوچنے کی بات صرف یہ ہے کہ کیا ہر تجربہ اس قابل بھی ہے کہ وہ افسانہ بن سکے۔ افسانہ کی نزاکت ہر تجربہ کا بوجھ نہیں اُٹھا سکتی اور نہ ہر بات ایسی ہوتی ہے کہ اُسے کہہ دینے کے بعد بھی اُس میں لطافت باقی رہے۔ اسی لئے ہزاروں برس کے ادبی تجربہ میں یہی ہوتا آیا ہے کہ اچھا فن کار جو دیکھتا، سُنتا یا محسوس کرتا ہے اُسے فن کی لطافت اور نزاکت کی کسوٹی پر بھی کسنا ضروری جانتا ہے۔ اس کسوٹی پر کسے بغیر تجربہ کے متعلق یہ پتہ چلانا کہ وہ کھرا ہے یا کھوٹا، ممکن نہیں یہی لطیف اور نازک کسوٹی ہے جو فن کار کو یہ بتاتی ہے کہ اس تجربہ کا پورا پورا تجزیہ کرو۔ اس کے بال کی کھال نکالو۔ اس کے ہر باریک سے باریک اور چھوٹے سے چھوٹے پہلو پر نظر رکھو اور پھر اس بہت سے مسالے میں سے جو کچھ تھوڑا بہت اپنے

کام کا نکلے اُسے لے کر باقی کو کوڑا سمجھ کر پھینک دو۔ صحیح نقطۂ نظر یہی ہے۔ لیکن ہمارے نئے افسانہ نگار نے اس کی طرف سے شرمناک غفلت برتی ہے۔ اُس نے اس تجربہ کو جو اتفاقاً کبھی اُس کے ساتھ پیش آیا ہے، افسانہ بنانا ضروری سمجھا۔ اور اس لئے اُس کے افسانے زندگی سے قریب رہ کر بھی زندگی سے بہت دور جا پڑے ہیں۔ اُن میں تاثیر نام کو بھی نہیں۔ اور تاثیر یا لذّت کی کمی کی ایک وجہ اور بھی ہے۔ ایک وجہ تو یہی کہ افسانہ نگار موزوں اور غیر موزوں تجربہ میں فرق کئے بغیر اُسے افسانہ بنا لینا چاہتا ہے اور دوسری اُس سے بھی زیادہ اہم یہ کہ وہ کسی تجربہ کو اپنی شخصیت کے رنگ میں نہیں ڈبوتا۔ زندگی کا کوئی تجربہ انسان کی شخصیت، اُس کی انفرادیت اور اُس کے جذباتی میلانات میں گھلے ملے بغیر ادبی تجربہ نہیں بنتا۔ تجربہ کو اپنی اندرونی زندگی کی گہرائیوں میں جذب کر لینے کے بعد ہی اُس میں فنی تجربہ کی نزاکتیں پیدا ہو سکتی ہیں۔ دُنیا میں ہر قدم پر انسان کے لئے افسانے کے ان گنت موضوع موجود ہیں لیکن ان ان گنت موضوعوں میں سے انتخاب کی ضرورت ہے اور پھر انتخاب کے بعد اس پر اپنی اندر بسی ہوئی جذباتی دُنیا کا رنگ چڑھانا ہے۔ جو افسانہ نگار کسی تجربہ کو افسانہ بنانے سے پہلے اُسے ان منزلوں سے نہیں گذار لیتا، وہ افسانوی اور ادبی تجربہ کی اہمیت سے بے بہرہ ہے۔ اور اسی لئے اس کے افسانے نہیں، اور چاہے جو کچھ بھی ہوں۔ اور میرا خیال ہے کہ نئے افسانہ نگار جو کچھ بھی لکھتے ہیں، افسانہ ہی سمجھ کر لکھتے ہیں۔ پھر تجربہ، جو ہر افسانہ کی بنیاد ہے، اس کی طرف سے یہ بے خبری، یہ بے نیازی کیوں؟ اس بے خبری اور بے نیازی کو دور کرنے میں دل پر جبر کرنا پڑے گا، اس کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔

تجربہ انسان کو کچھ دکھاتا، سُناتا یا محسوس کراتا ہے۔ اس دیکھی، سُنی یا محسوس کی ہوئی چیز میں کوئی نہ کوئی بات ایسی ہو جس سے افسانہ نگار کے دل پر چوٹ لگی ہے ـــ یہ بات زندگی کے کسی پہلو سے بھی تعلق رکھ سکتی ہے۔ یہ پہلو خواہ سیاسی و سماجی یا معاشی، خواہ مذہبی، اخلاقی یا نفسیاتی ـــ خواہ اس میں پوری قوم کے دُکھوں کا درد شامل ہو، خواہ کسی فرد کے دل کا۔ دیہاتی کسان، کارخانہ کا مزدور، رکشا چلانے والا، بھیک مانگنے والا، دفتر کا بابو، متوسط طبقے کا کوئی شریف اور باعزّت انسان یا محض کسی جذباتی یا نفسیاتی مرض کا کوئی مریض، اور ان کے مقابلہ میں زمیندار، ساہوکار، افسر اور حاکم یا عام انسان جو کسی کے دُکھ درد کے شریک نہیں ہوتے، جن میں سے ہر ایک محض اپنی ہی غرض میں مبتلا ہے ـــ افسانہ نگار ان سب کے گرد گھومنے والی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو دیکھتا ہے اور اُس کے دل میں ایک تڑپ سی پیدا ہوتی ہے۔ وہ اس سارے نظام کی دھجیاں اُڑا دینے کے لئے بے قرار نظر آنے لگتا ہے جس نے انسانیت کو اس مستقل عذاب میں مبتلا کر رکھا ہے۔ وہ انقلاب چاہتا ہے، پرانی دُنیا کو بدل کر اُسے ایک نیا رنگ روپ دینے کی تڑپ اُسے بے چین کرتی ہے۔ اُس کے دل میں اس ساری بُرائی کو بھلائی سے بدل دینے کا ایک غیر محسوس اور غیر معلوم جذبہ کروٹیں لینے لگتا ہے۔ اچھے فن کار کا ہر افسانہ اسی جذبہ کی پیدا کی ہوئی تڑپ میں رچ بس کر نکلتا ہے ـــ لیکن رونا یہ ہے کہ ہمارے افسانہ نگاروں نے یہاں بھی غفلت اور لاپرواہی سے کام لیا ہے۔ انہوں نے یہ سمجھ کر کہ افسانے میں کسی نہ کسی مقصد کا ہونا ضروری ہے۔ کسی نہ کسی اجتماعی احساس کی ترجمانی اور اس احساس کی پیدا کی ہوئی اصلاحی تحریک اُن کے نزدیک افسانہ کا لازمی جزو ہے۔ یہ صحیح ہے کہ سچا احساس ہمیشہ اصلاح کا طالب ہوتا ہے لیکن فن کی پیدا کی ہوئی چیزوں میں اصلاح کا جذبہ ہمیشہ فنی تقاضوں کا تابع رہتا ہے۔ اصلاح خاموشی اور نرمی سے اپنا کام کرتی رہتی ہے، وہ اشاروں، کنایوں کو اپنا ہم سفر اور ہم صفیر بنا کر آگے کو بڑھتی ہے اور پھر فن اس خاموش اور نرم آگ کو آہستہ آہستہ سلگا کر شعلہ بنا دیتا ہے۔ شعلہ کو بھڑکانا افسانہ نگار کا کام نہیں اس کا کام تو کسی دبی ہوئی چنگاری کو کرید کر دلوں میں اس کا احساس پیدا کرنا ہے۔ احساس اس چنگاری کو خود بھڑکائے گا، وہ خود ہر چیز کو جلا کر خس و خاشاک کر دے گا ـــ پھر افسانہ نگار اپنا منصب کیوں چھوڑے؟ کیوں وہ خطیب اور مُلّا بن کر سامنے آئے؟ کیوں وہ مجمع میں کھڑا ہو کر انقلاب زندہ باد کے نعرے لگائے؟ کیوں وہ خود ہی تلوار کو ہاتھ میں لے کر آگے بڑھے؟ اُس نے یہ سب کچھ کیا تو اُس کا سارا جوش درد کے اُبال کی طرح پیدا ہو کر خود ہی فنا ہو جائے گا۔ دوسروں پر اس کا کوئی اثر نہیں! افسانہ پر اس کا کچھ احساس نہیں۔ مگر یہ سب کچھ کرنا ذرا دشوار ہے۔ یہ کرنے کے لئے اپنے دل پر، اپنے خیال پر اپنے قلم پر قابو رکھنے کی ضرورت ہے بڑی سخت آزمائش ہے، بڑی کڑوی گولی ہے لیکن یہ کڑوی گولی اس بڑے مہلک مرض کا علاج ہے۔

اور اس مرض میں ہمارے بہت سے افسانہ نگار مبتلا ہیں۔ وہ جھوٹے جوش کو فن کے رم اور گہرے اثر سے زیادہ اہم جانتے ہیں۔ اور اسی لئے بہت سوں کے محبوب بن کر بھی وہ محبوبی کے قابل نہیں۔ یہ محبوبی عارضی اور بہت جلد مٹ جانے والی ہے۔ پھر دل کو قابو میں رکھکر کوئی ایسی دولت کیوں نہ حاصل کی جائے جو ابدی ہو، سرمدی ہو، مگر ہے کون؟

پھر کچھ بغیر کام بھی نہیں چلتا۔ مرض بڑھتے ہیں اور مریض دوا پاکر بھی اُسے کام میں نہیں لاتے ـــــ یہ ایک نیا مرض، اور اجدّت پسندی! ہر چیز میں، ہر بات میں کوئی نیا پہلو پیدا کرنے کی کوشش۔ یہ جذبہ بُرا نہیں، محمود اور قابلِ ستائش ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اسے مناسب حدوں میں رکھنے کی ضرورت نہیں محسوس کی گئی، بلکہ شاید ضرورت محسوس کرنے کے باوجود اعتدال اور توازن کی طرف سے لاپرداہی برتی گئی۔ افسانہ فنّی حیثیت سے پچھلے دس برسوں میں بہت آگے بڑھا ہے۔ اور یقیناً اسی لئے آگے بڑھا ہے لوگوں نے اس میں نئی نئی راہیں پیدا کیں۔ لیکن بعض حیثیتوں سے یہ آگے بڑھنے کی جگہ پیچھے بھی ہٹا ہے اور یہ بھی یقیناً اسی لئے کہ لوگوں نے اس میں نئی نئی راہیں نکالنے کی کوشش کی۔ لیکن اس نئے کام میں سمجھ سے کام نہیں لیا۔ اور بہت سی باتوں کو چھوڑ کر نا سمجھی کی بس ایک مثال لے لیجئے۔ پچھلے چند برسوں سے انگریزی تنقید نے جوائس، لارنس، ورجینیا الف اور پروست (پکسلے کا نام میں نے جان بوجھ کر چھوڑ دیا ہے) کے نام بے شمار طریقوں سے اور بے شمار موقعوں پر ہمارے کانوں میں ڈالے ہیں۔ ہمارے کچھ افسانہ نگاروں نے ان لکھنے والوں کی کہانیوں کو پڑھا اور فنّی نقطۂ نظر سے ان سے متاثر بھی ہوئے۔ ان سے متاثر ہو کر کچھ کہانیاں بھی ایسی لکھیں جنہوں نے اُردو کے افسانے کو ایک انقلابی راہ دکھائی۔ یہ مانا کہ ان کی ابتدائی کوششوں میں جابجا مختلف طرح کی خامیاں بھی ہیں، لیکن مجموعی حیثیت سے یہ کام سراہنے کے قابل ہے۔ اس لئے نہیں کہ وہ بجائے خود فن کا کوئی بلند نمونہ ہے، بلکہ اس لئے اس نمونہ نے افسانہ کی فضا کو ایک انقلابی انداز سے روشناس کرایا۔ نئے افسانہ نگار نے ان نمونوں کو پڑھا، یا زیادہ سے زیادہ اُن تنقیدوں کو جن میں انگریزی اور فرانسیسی کے اُن لکھنے والوں کے طرز پر مفصل تبصرے تھے جن کا میں نے ابھی ذکر کیا۔ اکثر صورتوں میں صرف پہلی چیز، اور شاذونادر دوسری چیز بھی، ان جدّت کے متوالوں کے لئے شمعِ ہدایت بن گئی۔ اور ایک انجان مسافر نے، اس اندھیرے راستے پر صرف اس ٹمٹماتی ہوئی شمع کے بھروسے اور سہارے پر چلنا شروع کر دیا۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ ایسی ٹھوکریں کھائیں کہ خود بھی زخمی ہوئے اور ادب کے جسم پر بھی بدنما داغ دھبے لگائے۔ ایک نئے فن کے نام سے افسانہ کو بھول بھلیاں بھی بنایا، اور ایک تنگ، تاریک اور گندی، سڑی ہوئی گلی بھی۔ اس بھول بھلیاں میں کھو کر یا اس تاریک گلی میں جا کر مسرّت کسی کو بھی نہیں، لیکن خلش اور بے چینی بہت سوں کو ملتی ہے۔ جوائس نے، لارنس، ورجینیا دلیف نے اور پروست نے ایک خاص زمانہ کے حالات سے متاثر ہو کر اور ان تاثرات کو اپنی انفرادی جذباتیت میں ڈبو کر افسانہ کے فن کو انقلاب کی راہ دکھائی ہے۔ اور اس راہ میں ہمارے لئے بھی بہت کچھ کام کا ہے۔ اور جو کچھ کام کا ہے اُس سے ہمارے افسانے کو فائدہ بھی پہنچا ہے، لیکن اس سے بھی زیادہ فائدہ اُس صورت میں پہنچ سکتا ہے کہ افسانہ نگار ان سب کو خود جانے پہچانے۔ پہلے اُن حالات سے واقف ہو جن میں رہ کر یہ فن پیدا کیا گیا، پھر اُس جذباتی کیفیت کا رازداں بنے جس نے حالات کو فن کی یہ نئی شکل دی۔ اس ادبی سرمایہ کو اپنے تجربہ کا جزو بنائے جو ایک خاص زمانہ کے حالات اور خاص قسم کی جذباتی کیفیتوں کا آئینہ بن کر نکلا ہے۔ نئے افسانہ نگار کو اگر جوائس، لارنس اور پروست سے کچھ حاصل کرنا ہے تو اُن کی تنقیدیں پڑھ کر نہیں، بلکہ اُن کی کتابیں پڑھکر حاصل کرنا چاہیئے۔ اس میدان میں آنکھ مچولی کھیلنے سے کام نہیں چلتا، نظر کو تیز، ذہن کو فراخ اور جذبات کو آزاد رکھکر مجاہدانہ شان سے آگے بڑھنے کی ضرورت ہے۔ مجاہدانہ شان سے میری مُراد بے جھجک گہرا تنقیدی مطالعہ ہے، لیکن اس گہرے تنقیدی مطالعے کے بعد بھی ساری مشکل حل نہیں ہوتی۔ جوائس، لارنس اور پروست نے جو کچھ لکھا وہ ایک خاص قسم کے حالات میں رہنے والے لوگوں کے لئے لکھا، ایک خاص طرح کے سماجی ماحول میں رہ کر رکھا، اور ہم اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ اس سماجی ماحول کی معاشی اور اخلاقی قدریں ہماری قدروں سے بالکل مختلف ہیں جس بات کو مغرب کا

اخلاق حُسن سمجھتا ہے وہ ہمارے معیار پر ایک بارِ گراں ہے۔ اس لئے ان مصنفوں کے مطالعہ کی پوری دردسری کے بعد بھی افسانہ نگار اُن کی واقعہ نگاری کو اپنے لئے نمونہ نہیں بنا سکتا۔ جو کچھ وہاں واقعہ کی فنی مصوّری ہے وہ ہمارے ادب میں آکر عریاں نگاری بن جاتی ہے۔ اس لئے اُن سے بہت کچھ لے کر بھی ہمیں اُسے اپنی ضرورت اور پسند کے مطابق سلیقے سے برتنا ہے لیکن کیا ہمارے افسانہ نگار نے اب تک یہ سلیقہ برتا ہے؟ جواب کا انتظار کئے بغیر مجھے یہ کہنا ہے کہ خیر اب تک نہ سہی، اب ہی۔ اچھے کام کے لئے کبھی بھی دیر نہیں ہوتی۔ جوائس، لارنس، ورجینیا وُلف اور پروست ـــــ نام ان کے علاوہ اور بھی ہیں۔ لیکن جن ناموں نے ہمارے نئے افسانہ نگار کو گمراہی میں مبتلا کیا ہے اُن میں ایک نام 'مارکس' کا بھی ہے۔ 'مارکس' تو بس بد نام ہی نام ہے۔ اس لئے کہ اس نام کی مالا جپنے والے اور اس کے بتائے ہوئے منتروں کو اپنی معاشی فکر کی بنیاد بتانے والے افسانہ نگاروں میں سے اکثر نے بس 'مارکس' کا نام ہی تو سُنا ہے۔ یا شاید اِدھر اُدھر تاکا جھانکی کر کے اُسکے معاشی نظریوں کے کچھ یوں ہی سے خدوخال دیکھ لئے ہیں، اور لے اُڑے اس نام کو۔ اور اُڑتے اُڑتے کسی ایسی بلندی پر پہنچ گئے، جہاں سے سوائے مارکس کے اور کوئی دکھائی ہی نہیں دیتا ـــــ مزدور کے جسم میں وہ حلول کر گیا ہے، کسان کی روح پر اُس نے قبضہ کر رکھا ہے، دفتر کے کلرک کی فائلوں میں وہ گھُسا بیٹھا ہے، اور زمیندار، ساہوکار اور حاکم کی گردن پر وہ سوار ہے۔ آنکھ پر ایسا پردہ پڑا ہے کہ کچھ اور نظر ہی نہیں آتا۔ حالانکہ مارکس نے خود آنکھوں پہ پردہ ڈالنے کی سخت مخالفت کی ہے۔ اُس نے دنیا کو چلتے پھرتے مسافر کی طرح دیکھا ہے اور اُس کی نظر حال اور مستقبل سے بھی زیادہ ماضی پر ہے۔ ماضی کے رشتہ کو توڑ کر حال اور مستقبل بے معنی بن کر رہ جاتے ہیں۔ پھر کارل مارکس کے نام کا جپ کرنے والے کیوں ماضی کی طرف سے آنکھیں بند کئے ہوئے ہیں؟ کیوں اُنہیں گئے ہوئے زمانہ اور آنے والے دنوں میں گہرا تعلق نظر نہیں آتا؟ کیوں وہ زندگی کو اتنا گھرا ہوا، اتنا محدود اور صرف مادی حقیقتوں سے بھرا ہوا سمجھتے ہیں۔ افسانے کو مارکس کے نظریوں کا ترجمان بنانا ضروری ہے، اُس سے انسان کے بہت سے دُکھ دُور ہوں گے، لیکن پہلے یہ جاننا بھی تو ضروری ہے کہ یہ نظریے کہتے کیا ہیں۔ مارکس، مارکس کہنے سے زبان میں تو ممکن ہے کہ روانی آجائے، لیکن دل پر چوٹ نہیں پڑتی۔ اور یہ چوٹ مارکس کو سمجھنے کے بغیر پڑ بھی نہیں سکتی۔ اس لئے اور بہت سے ناموں کی طرح اس نام کو بھی نام کیلئے نہیں بلکہ کام کے لئے زبان پر لانا ہے کیا افسانہ نگار یہ کریں گے؟ ممکن ہے کریں، مگر کسی فیصلے پر پہنچنے سے پہلے دو ناموں پر اور نظر ڈال لیجئے ـــــ ایڈلر اور فرائڈ۔ بلکہ پہلا نام تو محض تکلّف ہے۔ اصل میں لیس لی گانٹھ تو یہ دوسرا نام ہے۔ ہمارے نئے افسانہ نگار نے فرائڈ کے نام کو بہانہ بنا کر افسانہ میں جو جو گُل کھلائے ہیں وہ کسی دوسرے نام سے نہیں کھلائے۔ نئے افسانے میں زمانہ بھر کی عریانی فحاشی اور تعیّش پسندی اسی ایک نام کے بہانہ سے داخل ہوئی ہے اور ایک لطیف اور نازک علم (نفسیات) کی آڑ میں اُردو کا افسانہ کوک شاستروں کا مجموعہ بن کر رہ گیا ہے۔ اس کی بھی دو وجہیں ہیں ـــــ پہلی تو یہی کہ فرائڈ کے نام کے عاشقوں نے شاید فرائڈ اور اُس کے جنسی نفسیات کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی، یا اگر اُسے سمجھا بھی تو اس کی ترجمانی کرتے وقت اپنے تمدن، اپنی معاشرت اور اپنے سماج کے اخلاقی معیاروں کی طرف سے قطعی آنکھیں بند کر لیں۔ اس طرح آنکھیں بند کر کے چلنے والے افسانہ نگار ادب کے دشمن ہیں، اور سماج کے مجرم۔ اور نئے افسانہ نگاروں میں ایسے دشمنوں اور مجرموں کی کمی نہیں ـــــ اور اس مرض کا علاج صرف یہ کہ انہیں آنکھیں کھول کر چلنا سیکھنا ہے۔ اپنے گرد و پیش سے بے خبر ہو کر سپاہیوں کی طرح آگے بڑھتے رہنے میں بھی ایک بات ہے، لیکن ادب میں نہیں۔ یہاں آنکھ سے آنکھ کا، دل سے دل کا اور دماغ سے دماغ کا پورا کام لینے کی ضرورت ہے۔ بڑی سخت آزمائش ہے، لیکن اس آزمائش پر پورا نہ اُتر سکے اُس کے کلنک کا ٹیکا لگتا ہے، اُس کی جگ ہنسائی ہوتی ہے۔ اُسے شہر بدر کر دیا جاتا ہے۔

نئے افسانہ نگاروں کے پاس اس ساری بات کا یہ جواب ہے کہ ہم نے جو جی میں آیا کیا۔ نئی نئی اصطلاحوں کو بہانہ بنا کر، بڑھتے ہوئے فن کی آڑ لے کر اور بڑے بڑے ناموں

کہ ہمارے بارے ہی سب کچھ لکھا جیسے ایک آواز بڑا کہہ رہی ہے۔ لیکن، نہ ہمارے کلنک کا ٹیکا لگا، نہ ہماری جگ ہنسائی ہوئی اور نہ کسی کی یہ ہمت ہوئی کہ ہمیں شہر بدر کر دے۔ ہم تو دنیا کے محبوب ہیں۔ دنیا ہماری لکھی ہوئی باتوں کو اپنے دلوں میں جگہ دیتی ہے۔ رسالوں کے ایڈیٹر تقاضا کر کر کے ہمارے افسانے چھاپتے ہیں، ہمارے پاس تعریفوں سے بھرے ہوئے خط پہنچے ہیں، ہماری خوشامدیں کرتے ہیں اور ہمیں منہ مانگے دام دیتے ہیں۔ ناشر ہماری کتابوں کے بھوکے ہیں، روپے پہلے اور کتاب بعد میں، لیکن وہ پھر بھی ہمارے احسان مند ہیں۔ بار بار ہماری کتابوں کے ایڈیشن پر ایڈیشن نکل رہے ہیں۔ ادبی مجلسوں میں ہمارے فن پر مقالے پڑھے جا رہے ہیں۔ اور پڑھنے والے ہمارا نام لے کر جیتے ہیں۔ پھر کسی کو ہم سے یہ سب کچھ کہنے کا کیا حق ہے؟ مریض ہم نہیں ہیں، ہمیں کچھ کہنے والا مریض ہے۔ کڑوی گولیوں کی اسے ہم سے زیادہ ضرورت ہے۔ لیکن ان جوشیلی باتوں کے بعد بھی کہنے والا خاموش نہیں ہو جاتا۔ اسے معلوم ہے کہ یہ چار دن کی چاندنی ہے۔ ایک دن ایسا آنے والا ہے کہ یہ سب دعوے دھرے کے دھرے رہ جائیں گے، اور دعویٰ کرنیوالوں کو وقت کے فیصلے کے آگے سر جھکانا پڑے گا۔ وقتی جوش اور ولولے، وقتی پسند اور اسی طرح سراہی ہمیشہ سے ہے ہمیشہ رہے گی، لیکن ان چیزوں کی عمر تھوڑی ہے انہیں ثبات نہیں۔ پھر ان کڑوی گولیوں سے گھبرا کر کسی بے ثبات چیز کا سہارا لینا کیا معنی؟ سب سے بڑا سہارا اپنی سوجھ بوجھ کا، اپنی سوجھ سمجھ کا۔ اپنے مشاہدے اور مطالعے کا۔ اور اس مشاہدہ اور مطالعے سے بھی زیادہ غور و فکر کا۔ تھوڑے دن قائم رہنے والی تعریفوں سے بچنا، دولت کی طمع اور شہرت کے دلاسے تسلی سے دور بھاگنا، دوسروں کی رہبری سے زیادہ اپنی شخصیت، انفرادیت اور جذباتی خلوص کی دکھائی ہوئی راہ پہ چلنا اچھے فنکار کا منصب ہے۔ افسانہ نگار کا اس لئے اور بھی زیادہ کہ حالات نے اسے یکبارگی، ان سارے جالوں میں پھنسا دیا ہے، ان جالوں سے نکلنا آسان نہیں، لیکن حوصلہ کی مردانگی فکر کی توانائی اور جذبات کی سچائی سارے بندھنوں کو، ساری قیدوں کو سارے جالوں کو توڑ سکتی ہے؟ کیا ہمارے افسانہ نگاروں کو یہ قیدیں گراں نہیں گذرتیں؟

غزل

محبت موج بن کر یوں دلِ انساں سے ٹکرائی
کہ گویا کشتیٔ بے ناخدا طوفاں سے ٹکرائی

نگاہِ اولیں اُن کی جگر کی چوٹ تھی یعنی
جوانی کی جبیں سنگِ درِ جاناں سے ٹکرائی

پلائی وہ مے بے جام ساقی نے سرِ محفل
مری توبہ تڑپ کر شیشۂ ایماں سے ٹکرائی

خدائے عشق نے جب جذبِ کامل قلب کو بخشا
تجلّی ہر قدم پر دیدۂ حیراں سے ٹکرائی

ملا ساحل نہ جب دل کو کہیں بحرِ حوادث میں
یہ کشتی تنگ آ کر موت کے طوفاں سے ٹکرائی

چھلک اُٹھا مے رنگیں سے جامِ زرفشاں اُن کا
نگاہِ مستِ جاناں جس گلِ خنداں سے ٹکرائی

طفیلؔ احساس کی دُنیا میں شعلے سے بھڑک اُٹھے
نظر تنہائیوں میں جب مہِ تاباں سے ٹکرائی

طفیل ہوشیارپوری

دیویندر ستیارتھی

لاوارث

کوچ بہار کے پلیٹ فارم پر گاڑی ایک چیخ کے ساتھ رک گئی اور پیری توش کھڑکی کے راستے جھٹ ایک ڈبے میں گھس گیا۔ نیچے سے سانیال اور بوس سب سامان اُسے تھماتے چلے گئے اور بار بار تاکید کرتے رہے کہ وہ ایک پوری سیٹ پر قبضہ جما لے۔

سانیال ہنس ہنس کر کہہ رہا تھا: "پیری توش ہمارا بھائی ہے وہ ناراض نہیں ہو سکتا۔" بوس یونہی مسکرا رہا تھا۔ اور پیری توش ایک کونے میں سمٹ کر بیٹھ گیا۔

پورے ڈبے میں دھکا پیل ہو رہی تھی۔ باہر کا دروازہ بند کر لیا گیا تھا۔ وہی لوگ جو کچھ دیر پہلے پلیٹ فارم پر کھڑے اندر والوں کی منت سماجت کئے جا رہے تھے اب باہر والوں کو اندر آنے کی اجازت دینے کو تیار نہ تھے۔

سامنے کی سیٹ پر پرانے چیتھڑوں میں لپٹی سمٹی ایک زندہ لاش نظر آ رہی تھی جس کے چہرے پر ایسی مُردنی ٹپکتی تھی کہ ہر دیکھنے والے کو خواہ مخواہ گھِن آنے لگتی اور وہ سوچتا رہ جاتا کہ دراصل اس ہڈیوں کے ڈھانچے میں زندگی ہے بھی یا نہیں۔ اس زندہ لاش کے پاؤں کی طرف ایک زرد چہرے والا انسان گٹھڑی بنا بیٹھا نہ جانے کس سوچ میں کھویا ہوا تھا۔

اُدھر ایک کونے میں سفید دھوتی اور قمیص پہنے ہوئے ایک بھاری بھرکم شخص بڑی بے تکلفی سے سگریٹ کے ہلکے ہلکے کش لگا رہا تھا۔ اُس کے چہرے سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوئی بنیا یا فنانسر ہے۔ وہ اپنے سگریٹ کیس کو کبھی کبھی یوں ہاتھوں میں اُچھالنے لگ جاتا جیسے وہ بیڑیوں اور سستے سگریٹوں کے دھوئیں میں لپٹی ہوئی فضا سے جنگ کر کے مہنگے تمباکو کی تعریف میں ایک زوردار تقریر کیا چاہتا ہو۔ پھر اُس کے چہرے پر ایک ہنسی نمودار ہوئی جس کا تعلق اس قحط سے تھا جو بنگال کا گلا گھونٹ رہا تھا۔ وہ یہ کہنا چاہتا تھا کہ اس قحط نے امیروں کو کبھی ایسا تنگ نہیں کیا۔ میں ہمیشہ پانچ سو پچپن کے سگریٹ پسند کرتا تھا اور اب کونڈا سے ہی کام چلا رہا ہوں۔

ڈبے میں ایک طرف نوجی جمع بیٹھے تھے۔ وہ اپنے قہقہوں سے اس فضا میں کچھ عجیب سی بے معنی رنگینی پیدا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پیری توش نے سوچا کہ پاس کے سپاہی سے آسام کے محاذ کے حالات دریافت کرے لیکن دوسرے ہی لمحے وہ کچھ سوچ کر چُپ ہو گیا۔

سانیال اور بوس نے بھی اپنا اپنا سگریٹ سُلگا لیا لیکن بار بار جب اُن کی نگاہیں اُس زندہ لاش کی طرف اُٹھتیں تو اُنہیں ایسا محسوس ہونے لگتا کہ سگریٹ میں تمباکو کی جگہ گوبر بھرا پڑا ہے۔ سانیال نے بوس کی طرف دیکھتے ہوئے ایک کھوکھلا سا قہقہہ لگایا جیسے کہہ رہا ہو آؤ سگریٹ باہر پھینک دیں اور اس سپاہی کو یہی سمجھنے کا موقع دیں کہ ہمیں اُس کے مذہبی جذبات کا احترام منظور ہے۔ لیکن بوس بے جان بُت کی طرح بیٹھا رہا۔ جیسے تیسے وہ زہر مار کرتے گئے۔ ایسے ماحول میں سگریٹ کے بغیر تو چارہ نہ تھا۔

پھر پیری توش کی طرف دیکھتے ہوئے بوس کے چہرے پر ایک شرارت آمیز مسکراہٹ تھرک اُٹھی۔ سانیال بولا۔ "پیری توش کو شاعر کس کمبخت نے بنا یا تھا؟ میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ سگریٹ پئے بغیر وہ کیسے گیت لکھ لیتا ہے؟"

ایک طرف سے ایک آواز آنے پر کہ ہم تباہ ہو گئے ہیں بوس نے زور کا کش لگاتے ہوئے کہا: "پیری توش! اُدھر بھی تمہارا ایک بھائی بیٹھا ہے۔ سب بکواس ہے۔ آخر تم لوگوں سے کوئی پوچھے کہ بتاؤ تم کیوں تباہ ہو گئے۔ اُدھر تو تم دھیان ہی نہ دو گے یونہی خواہ مخواہ چلاتے رہو گے۔"

پیری توش اس کے جواب میں اونچی آواز سے اخبار پڑھنے لگا ——— کلکتے میں ایک ہفتے میں ایک ہزار سے اوپر موتیں ہوئیں۔

سانیال نے بیچ سے ٹوکتے ہوئے کہا: "مر گئے سو مر گئے تم کیوں اُن کا رونا روتے ہو؟"

بوس نے پیری توش کے ہاتھ سے اخبار چھین کر کہا: "بنگال میں لاشیں ہی لاشیں نظر آ رہی ہیں۔"

بیمار نے اپنے زرد چہرے والے ساتھی کی طرف اپنا مریل ہاتھ

اُٹھایا۔ لیکن وہ اُس کے پاس سے بڑھ گیا۔ شاید وہ کہنا چاہتا تھا مجھے مکھیاں دق کر رہی ہیں اور تم انہیں اڑا بھی نہیں سکتے۔

سب لوگوں کی نگاہیں اُس کی طرف اُٹھ گئیں۔ سب حیران تھے کہ ابھی تک یہ لاش اس طرح زندہ رہنے کی کوشش کئے جاتی ہے۔ اُس کے چہرے پر جھریاں سی پڑی ہوئی تھیں۔ اُس کے بال کسی زمانے میں بہت گھنے گھونگھر والے ہوں گے۔ ناز کرتے ہوں گے لیکن اب وہ اُن سے بڑی بھیانک سی کراہت پیدا کر رہی تھیں۔ شاید یہ بیمار اپنے گاؤں میں پہنچ کر مرنا چاہتا تھا۔ لیکن وہ اب بھی کہاں زندہ تھا۔ لاش ہی تو تھا۔ اُس نے پھر ہاتھ پاؤں ہلائے۔ جیسے وہ بدقسمت انسان یہ کہنا چاہتا ہو۔ مجھے لاشوں میں کیوں شمار کرتے ہو۔ میں زندہ ہوں۔ میں زندہ رہوں گا۔

سانیال کہہ رہا تھا "ہری توش کے گیت ایک دن سارے دیس میں گونج اٹھیں گے"

بوس بولا "مجھے ہری توش کا وہ گیت بے حد پسند ہے۔ بکھر جائے گا بنگال"

سب یہی سوچ رہے تھے کہ جانے گاڑی کب چھوٹے گی۔ سب کے حلق خشک ہو رہے تھے۔ لعاب نگلنے کو بھی کسی کا جی نہ چاہتا تھا۔ ڈبے کی گھٹی گھٹی سی فضا اور اُس پر اس زندہ لاش کی سڑاند نے بُری طرح ناک میں دم کر رکھا تھا اور ہر کوئی یہی محسوس کر رہا تھا کہ ابھی تھوڑی دیر میں اُسے متلی ہونے لگے گی۔

ہری توش نے سوچا سب خوشبوئیں مٹتی جا رہی ہیں اور زندگی کو قے پہ قے آ رہی ہے۔ یقیناً میرے گیت اس دُکھ درد کا مداوا نہیں کر سکتے۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ سنگترے والے کو آواز دیتا۔ بنگال مر رہا ہو اور وہ گاڑی میں بیٹھا مزے سے سنگترے کھائے، اُسے کسی بھی صورت منظور نہ تھا۔ آج ریفریشمنٹ روم میں سانیال اور بوس پورا کیک ختم کر گئے تھے۔ لیکن اُس نے تو ایک کپ چائے تک قبول نہ کیا تھا۔ اب پلیٹ فارم سے آتی ہوئی خوانچہ والوں کی صدائیں اُس کے دماغ پر بُری طرح ہتھوڑے چلا رہی تھیں۔

سکھ سپاہی اپنی پگڑی پر ہاتھ پھیرتا ہوا آس پاس کے لوگوں کا خیال اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ کہہ اُٹھا "ہم لوگوں کو سب سے زیادہ دو کھول والے تنگ کرتے ہیں"۔

سانیال اور بوس چونک کر بولے "جی یہ دو کھول والے کیا بلا ہیں؟"

اُس وقت سکھ سپاہی سانیال اور بوس سے زیادہ باتیں نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ کیسے عجیب آدمی ہیں جنہیں زندہ جسم سے بھی مُردہ گوشت کی سڑاند آتی ہے ہمیں تو کبھی مہینے مہینے کے مرے ہوئے جسموں سے بھی ایسی بدبو نہیں آتی۔ لیکن یہ دیکھ کر کہ آخر وہ اُس کی بات میں دلچسپی دکھا رہے ہیں وہ کہہ اُٹھا "یہ لوگ بی۔ اے، ایم۔ اے پاس کر کے اپنے کوٹ پر دو کھول لگا لیتے ہیں اور فوج میں بھرتی ہو کر لفٹن بن جاتے ہیں لیکن وہ بندوق اُٹھانا بھی نہیں جانتے۔ وہ صرف قلم اور حکم چلانا جانتے ہیں!"

ہری توش نے سوچا کیا خوب قلم اور حکم یعنی دو کھول۔ اُسے خیال آیا کہ اس سپاہی سے پوچھے آسامیوں کو اُس نے کیسا پایا اور کیا آسام میں بھی کسی شاعر سے اُس کی ملاقات ہوئی تھی۔ لیکن یہ سوچ کر کہ دو کھول والوں نے اُسے کب یہ اجازت دی ہوگی کہ وہ محاذ کے کام سے فرصت کی گھڑیوں میں آسامیوں سے میل جول بڑھاتے، وہ چپ بیٹھا رہا۔

بیمار کے چہرے پر مکھیاں بدستور بھنبھنا رہی تھیں۔ جنہیں وہ کمزور ہاتھوں سے اُڑانے کی ناکام کوشش کئے جاتا تھا۔ اُسکا ساتھی جانے کس سوچ میں گم سُم بیٹھا اُونگھ رہا تھا۔

ہری توش نے سوچا کہ سانیال اور بوس بھی تو دو کھول والے ہیں اور بی۔ اے، ایم۔ اے پاس کرنے کے سبب تو میں بھی دو کھول والا کہلا سکتا ہوں۔ لیکن میرا تو محض قلم چلتا ہے۔ اُن کے حکم نے میرے قلم کو خرید لیا ہے۔ میرے گیت اب اُن کی جائداد ہیں۔ چاہے میں پنجرے میں نئے پھنسے ہوئے پنچھی کی طرح لاکھ پھڑپھڑاؤں اس سے اب کیا حاصل؟

بیمار نے پھر ہاتھ پاؤں ہلائے۔ مکھیاں بدستور بھنبھنا رہی تھیں۔ اب جیسے کوئی اُس کی طرف دیکھنے کا بھی نہیں۔ سب نے مُنہ پھیر لیا تھا۔ لیکن ہری توش اور سکھ سپاہی کی نگاہیں بار بار بیمار کی طرف اُٹھ جاتیں۔ وہ اُس کی مدد کرنا چاہتے تھے۔ ہری توش نے سوچا یہ سپاہی تو اتنا بھی کر سکتا ہے کہ اب چھٹی پر گھر جانے کی بجائے اس بیمار کو گاڑی سے اُتار کر کسی ہسپتال میں لے جائے اور جب تک یہ اچھا نہیں ہو جاتا اپنی چھٹی میں اضافہ کرتا رہے۔ لیکن میں تو اتنا بھی نہیں کر سکتا۔

سانیال نے بیمار کی طرف حقارت سے دیکھتے ہوئے کہا: "اِس اُمس میں ہم مرے جاتے ہیں اور ابھی نہ جانے یہ گاڑی کب تک اُڑی رہے گی!" دراصل اُس کا دم گھٹنے سے اتنا بُرا حال نہیں ہو رہا تھا جتنا کہ اُس زندہ لاش کی موجودگی سے۔ وہ چاہتا تھا کہ اگر کچھ اور نہیں ہو سکتا تو یہ تو ضرور ہونا چاہئے کہ اُسے سامنے کی سیٹ سے اُٹھوا دیا جائے۔

اُس سے بچنے کے لئے بھاری بھرکم پنشن یافتہ ایک مصوّر رسالے سے اپنے منہ پر پنکھا کرنے لگا۔ اُس نے رسالے کو اُلٹا پکڑ رکھا تھا۔ ہری توش نے محسوس کیا کہ یہ آدمی دو دھول والوں کا بھی دو دھول والا ہے اور اُس نے اِس رسالے کو نہیں بلکہ بنگال کو اُلٹا پکڑ رکھا ہے۔

سانیال بولا: "دِس کیا کوئی ایسا قانون نہیں بنا جس کی رُو سے غلیظ بیماروں کو گاڑی میں سفر کرنے سے روکا جا سکے ۔۔۔۔" وہ کچھ اور بھی کہتا مگر یکایک گاڑی کے چل پڑنے سے اُس کی بات ادھوری ہی رہ گئی۔

سب نے اطمینان کا سانس لیا۔ بیمار نے بھی ادھر اُدھر ہاتھ پاؤں ہلائے۔ مکھیاں کچھ دیر کے لئے اُس کے منہ سے اُڑ گئیں لیکن تھوڑی دیر بعد پھر اُس کے منہ پر بھنبھنانے لگیں جیسے وہ موت ہی کی رٹ لگا رہی تھیں۔ لیکن بیمار ابھی مرنا نہیں چاہتا تھا۔ ابھی تو اُس کا خیال تھا کہ اُس کا خون گرم ہے اور اُس کی ہڈیاں بھی چلنے پھرنے کے قابل ہو سکتی ہیں۔ لیکن مکھیاں تھیں کہ برابر اُسے یقین دلائے جا رہی تھیں کہ اب جینے کی حرص بیکار ہے۔

ہری توش نے ایک اور کروٹ لی اور وہ سوچنے لگا کہ اصل بنگال ہی نہیں کُل ہندوستان اِسی قسم کا ایک مریض ہے۔

بھاری بھرکم پنشن یافتہ نے رومال سے چہرہ پونچھکر نیا سگریٹ سُلگایا اور اب وہ رسالے کے سرِ ورق کی حسینہ کا ملاحظہ کرنے لگا۔

فوجی سپاہی جنگ کی باتیں بھلا کر گھر کی باتیں لے بیٹھے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ گاڑی قحط زدہ بنگال سے گزر کر ان حصوں میں پہنچ جائے گی جہاں آج بھی سُنہری بالیاں زندگی کا پیغام سُناتی ہیں۔

بیمار کا ساتھی اُسی طرح سر گھٹنوں میں دبائے بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ شاید وہ مکھیوں سے خوف کھاتا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کہیں ایک روز میرے منہ پر بھی بھنبھنائیں گی۔

سکھ سپاہی نے اُس کا کندھا جھنجوڑ کر کہا: "کہاں جاؤ گے تم لوگ؟"

اُس نے جیسے خواب سے چونک کر سپاہی کی طرف دیکھا اور جب سپاہی نے ایک بار پھر اپنا سوال دُہرایا تو وہ کہہ اُٹھا: "رنگپور! رنگپور جا رہے ہیں ۔۔۔ رنگپور تو اب نزدیک ہی ہو گا!"

لیکن اس کے بعد اُس نے کچھ اس طرح سپاہی کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہا ہو، تمہیں ہماری کیا فکر پڑی ہے؟ تم آرام سے بیٹھے رہو۔

ہری توش اپنے خیالات میں مگن سوچ رہا تھا کہ یہ دیس کتنا وسیع ہے۔ لیکن یہ غلام کیوں ہے؟ یہ غلام ہے اسی لئے تو قحط کا شکار ہو رہا ہے۔ ہر طرف چور بازار گرم ہے۔ ہر طرف کمینے رذیل نفع بازوں کی چاندی ہے۔ اُس نے سارے ڈبے کا جائزہ لیا۔ اس وقت سکھ سپاہی بھی مزے سے کچھ چبا رہا تھا۔ پھر اُس نے سوچا کہ شاید اب یہ سپاہی اس لئے گھر جا رہا ہے کہ اس کی بیوی نے بیٹا جنا ہے۔ بیوی اور بیٹے کو دیکھکر وہ آسام کے محاذ پر لوٹ آئے گا۔ وہ سپاہی سے کہنا چاہتا تھا کہ آج تم مُردہ دیس کی حفاظت کر رہے ہو، کل تمہارا بیٹا زندہ دیس کی حفاظت کرے گا۔

بار بار ہری توش کی نگاہیں اُس بیمار کی طرف اُٹھ جاتیں۔ سپاہی کے بعد وہی دوسرا شخص تھا جسے بیمار سے گھن نہیں آ رہی تھی۔

بھاری بھرکم پنشن یافتہ نے جانے کیا کیا فیصلے کرتے ہوئے کہا: "سردار صاحب، وہ دو دھول والوں کی بات تو بالکل غلط معلوم ہوتی ہے۔ تعلیم تو بُری چیز نہیں!"

سکھ سپاہی ایکدم ہنس دیا۔ اور بولا: "چھوڑو جی بی۔ اے، ایم۔ اے ہی تو دو دھول والے نہیں۔ دو دھول والے تو ہر جگہ موجود ہیں۔ عدالت کے منشی، چپراسی، گاؤں کے پٹواری، زمیندار کے گماشتے اور پولیس والے ۔۔۔۔ یہ لوگ بھی تو دو دھول والے ہیں!"

بھاری بھرکم پنشن یافتہ کے چہرے پر مسکراہٹ تھرک اُٹھی۔

جیسے کہہ رہا ہو ۔۔۔ شکریہ ۔ کم از کم مجھے تو تم نے دو کھوالوں میں شامل نہیں کیا۔

فوجی سپاہی اب سیٹیاں بجا رہے تھے جیسے ہر تھکے کے بعد وہ اپنے گھروں کے نزدیک پہنچے جا رہے ہوں۔ بندوقوں سے چھوٹتی ہوئی سنسناتی آوازوں کی جگہ اب نرم و نازک کلائیوں میں کھنکتی چوڑیوں کا تصور اُن کی آنکھوں میں نشہ پیدا کر رہا تھا

ساتیال نے سرد لہجہ انداز میں کہا: "بوس برکی تو ش اپنی قیمت نہیں جانتا۔ وہ جوہر ہے۔ جوہر کی قیمت جوہری ہی جانتا ہے"

بوس نے ایک بار برکی توش کی آنکھوں میں جھانک کر یہ دیکھنے کی کوشش کی کہ اُس پر کیا اثر ہوا ہے لیکن وہ تو گم سُم بیٹھا تھا۔ ساتیال نے پھر شہ دی: "برکی توش کے گیت اپنا جواب نہیں رکھتے"

بوس کہہ رہا تھا: "مجھے تو اُس کے کال گیت ہی سب سے زیادہ پسند ہیں۔ یہ ہمارے دیس کے دکھ درد کا مداوا ہیں۔ ذرا انہیں شائع تو ہونے دیجئے۔ پھر ہم انہیں انگریزی میں بھی پیش کریں گے"

"ہم برکی توش کو نوبل پرائز دلائیں گے!"

"ایک ہی شرط پر کہ ایک لاکھ بیس ہزار کی رقم ہمارے "شونار بانگلا ساہتیہ تیرتھ" کے فنڈ میں آجائے۔ ربی بابو نے بھی تو اپنا انعام شانتی نکیتن کو دے دیا تھا۔ برکی توش بھی قربانی کر سکتا ہے"

"قربانی کا کیا مطلب بوس؟ برکی توش ہمارا بھائی ہے"

بوس نے ایک بار پھر برکی توش کے چہرے پر اس گفتگو کے تاثرات دیکھنے کی کوشش کی اور پھر نہ جانے کیا سوچ کر وہ اُس کی پیٹھ تھپتھپانے لگا اور کہتا گیا "برکی توش تمہارے گیت ہمارے گیت ہیں!"

برکی توش نے چونک کر اپنے پبلشروں کی طرف دیکھا اور پھر زندہ لاش کی طرف۔ جیسے وہ اپنے قدر دان پبلشروں سے کہنا چاہتا ہو "ایسی ہی ایک لاش پر بھی تو میرا ایک گیت ہے۔"

بوس کہے جا رہا تھا "تمہارے گیتوں پر دنیا فخر کرے گی برکی توش۔ ان کی نشر و اشاعت ہمارا کام ہے ۔۔۔"

برکی توش کے جی میں تو آیا کہ اپنے پبلشروں سے صاف صاف کہہ دے کہ وہ اپنے گیت شائع نہیں کرانا چاہتا کیونکہ گیتوں سے قحط نہیں مٹ سکتا۔ اور یہ تو ایسے ہی ہے جیسے کوئی مُردے کے کان میں ڈھول بجا کر توقع کرے کہ وہ جی اُٹھے گا۔

ساتیال اور بوس کھڑکی سے اُفق کی طرف دیکھنے لگے۔ شاید وہ "شونار بانگلا ساہتیہ تیرتھ" کے روشن مستقبل کے خواب دیکھ رہے تھے۔ برکی توش کو طالب علمی کا زمانہ یاد آگیا جب وہ دونوں ساتھ ساتھ پڑھتے تھے۔ اُسے کبھی خیال نہ آیا تھا کہ وہ روٹی کے لئے اپنے ہم جماعتوں کا محتاج ہو کر رہ جائیگا۔ اُس کے ذہن میں یہ خیال بجلی کے کوندنے کی طرح پیدا ہوا کہ اُن سے صاف صاف کہہ دے کہ میرے گیت مجھے واپس دے دو۔ میں انہیں کسی بھی قیمت پر تمہیں نہیں دے سکتا۔ میں شاعر بھی نہیں بننا چاہتا۔ میں اب اپنے لئے کوئی نئی راہ تلاش کروں گا۔ لیکن پھر اُس کے ذہن میں ملک کے سب سے بڑے شاعر کے الفاظ گونج اُٹھے ۔۔۔ برکی توش کے گیت ہمیشہ زندہ رہیں گے .... وہ چڑ گیا۔ وہ کچھ فیصلہ نہ کر سکا۔

بیمار کے چہرے پر مکھیاں جیسے جم گئی ہوں معلوم ہوتا تھا یہ مکھیاں نہیں، چیچک کے داغ ہیں۔ سب سے پہلے ان ہی نے بیمار کی موت کو آتے دیکھ لیا تھا۔ زندہ لاش مُردہ لاش میں تبدیل ہو رہی تھی۔ اُس کے ساتھی نے اُسکے سر کو اپنے زانو پر رکھتے ہوئے چلا کر کہا: "دادا! ۔۔۔ دادا! ۔۔۔"

زندہ لاش نے دم توڑ دیا۔

لوگ گھبرا گئے۔ چند نوجوانوں کو تو اس قدر غصہ آیا کہ لاش کو چلتی گاڑی سے نیچے پھینک دیں۔ لیکن وہ لاش کو چھونا بھی تو نہ چاہتے تھے۔

لاش کے ساتھی نے روتے روتے اپنی جیب سے ایک ٹکٹ نکال کر مرحوم دادا کی جیب میں ڈال دیا۔ وہ رو رو کر کہہ رہا تھا: "میرے پاس کچھ نہیں۔ مجھے بچا لو۔ بھگوان کے لئے دادا کو اگلے اسٹیشن پر ہی اُتروا دو"

سکھ سپاہی حیران ہو کر بولا: "تو ٹکٹ کون جائیگا؟"

لاش کا منہ کھلا ہوا تھا جیسے وہ مر کر بھی یہ کہنا چاہتا ہو ۔۔ میں زندہ ہوں۔ میں زندہ رہوں گا۔

پرتی توش سوچنے لگا کہ یہ ملک کبھی نہیں مر سکتا۔ اس کی چھپی ہوئی قوتیں کبھی ختم نہیں ہونگی۔ میرے گیت انہی قوتوں کے مرہونِ منت ہی تو ہیں۔

لاش کا ساتھی رو رو کر کہہ رہا تھا: "مجھے بچاؤ۔ مجھے پولیس پکڑے گی۔ پولیس مجھے پیٹے گی۔ میں مر جاؤنگا۔ وہ میرا خون پی لیں گے۔"

پرتی توش نے اُس کے زرد چہرے کا ملاحظہ کرتے ہوئے سوچا کہ اس ستم رسیدہ شخص کے جسم میں اب اور کتنا خون باقی ہوگا۔ سانیال بوس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا: "میرے گیت تو جب شائع ہونے ہونگے ہو ہی جائیں گے۔ آؤ اس آدمی کی مدد کریں۔"

لیکن سوائے سکھ سپاہی کے کسی نے اُس کی ہاں میں ہاں نہ ملائی۔ دونوں نے لاش کے ساتھی کو سمجھایا کہ وہ اگلے سٹیشن پر گاڑی رُکتے ہی کسی دوسرے ڈبے میں چلا جائے اور وہ سامنے سے یوں احسان مندانہ نگاہوں سے دیکھنے لگا جیسے کہہ رہا ہو مجھے اس مدد کی بہت پہلے سے اُمید تھی۔

جونہی گاڑی اگلے سٹیشن پر رُکی، وہ لپک کر نیچے اُتر گیا اور نہ جانے کہاں غائب ہو گیا۔

پھر بھاری بھرکم پنشن یافتہ ایک تھانیدار کو بلا لایا۔ لاش کے متعلق تفتیش کرنے کی غرض سے گاڑی تھوڑی دیر کے لئے اور رُک گئی۔ سپاہیوں کو آوازیں دی جا رہی تھیں۔ بڑی مشکل سے دو سپاہی موقع پر نمودار ہوئے۔ سپاہی بھنگیوں کو آوازیں دینے لگے۔ لیکن وہ نہ جانے کہاں غائب ہو گئے تھے۔

سکھ سپاہی پرتی توش کے کان کے پاس مُنہ لے جا کر بولا: "یہ سب ڈھکوسلے والے ہیں۔"

پرتی توش نے سکھ سپاہی کی بات سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے سانیال سے کہا: "آؤ ہم لاش کو کندھا دیں۔"

"ہم لاش کو کندھا دیں؟" سانیال نے ناک سکوڑتے ہوئے کہا: "یہ کام تو قلی بہت آسانی سے کر سکتے ہیں۔"

"قلی؟" بوس نے چڑ کر کہا۔ "لیکن پیسے کون دیگا؟"

بھاری بھرکم پنشن یافتہ نے کہا: "یہ لوگ مرتے وقت اتنا پیسہ بھی تو نہیں چھوڑ جاتے کہ قلی کے دام چُکائے جا سکیں۔"

لاش جیسے ہنس رہی تھی، اور اُسکے خاموش قہقہے اس فضا میں عجب پھبتیاں کس رہے تھے۔ جیسے وہ مکروہ مریض کہہ رہا ہو — میں چاہوں تو خود بھی اُٹھ کر پلیٹ فارم پر لیٹ سکتا ہوں۔ مجھ میں ابھی اتنی طاقت باقی ہے۔

سکھ سپاہی کہہ اُٹھا: "محاذ پر میں نے سینکڑوں لاشیں اُٹھائی ہیں۔ یہ بھی اپنے بھائی کی لاش ہے اور یہ کچھ وزنی بھی تو نہ ہوگی۔"

پرتی توش اپنی جگہ سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اُنہوں نے لاش اُٹھا لی۔

وہ لاش کو پلیٹ فارم پر رکھ کر اُس کے سرہانے اور پائنتی کھڑے ہو گئے۔ لوگ جمع ہو رہے تھے۔ طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ تھانیدار، اسٹیشن ماسٹر اور گارڈ لوگوں کو لاش سے پرے رہنے کی تلقین کر رہے تھے۔ سپاہی بھنگیوں کو لے کر ابھی تک نہیں پہنچے تھے۔

پرتی توش اور سکھ سپاہی کی طرف لوگ یوں گھور رہے تھے جیسے وہی دراصل اِس انسان کی موت کے لئے جوابدہ ہوں۔ طرح طرح کی آوازوں کو چیرتی ہوئی گارڈ کی وِسل ایک احتجاجی چیخ کی طرح گونج رہی تھی۔ اُس وقت بجلی کے کوندے کی طرح گھر والوں کے چہرے سکھ سپاہی کی آنکھوں میں پھر گئے اور وہ لپک کر گاڑی میں جا بیٹھا۔

پرتی توش لاش کے سرہانے کھڑا تھا۔ بھیانک سائے دیئے کی لو کو نگل چکے تھے۔ موت نے لوری گا دی تھی۔ شاید وہ سوچ رہا تھا کہ یہ دیا تو دوبارہ روشن کیا جا سکتا ہے اور موت کی لوری کو جھُٹلانا بھی کٹھن نہیں۔

سانیال نے کھڑکی سے مُنہ نکالا اور چلا کر کہا: "یہ تو محض ایک لاش ہے، پرتی توش۔ ہمارا دیش تو ایسی لاکھوں لاشوں سے پٹا پڑا ہے۔"

بوس جو اُس وقت گاڑی سے اُترنے کے انداز میں کھڑا تھا، اپنے ہاتھ میں "کال گیت" کا مسودہ سنبھالے ہوئے رقت سے لبریز لہجے میں بولا: "تمہارے گیتوں سے ان لاشوں کا مداوا ہو جائے گا، پرتی توش۔ تم آ کیوں نہیں جاتے؟"

گارڈ نے آخری وِسل دی اور گاڑی چل پڑی۔

ساتنیال اور لوتس بدستور بری توش کو پکار رہے تھے۔ یکبارگی بری توش کے قدم گاڑی کی جانب اُٹھے، جیسے وہ بھاگ کر ساتنیال کے ہاتھوں سے ... چھین لینا چاہتا ہو۔ لیکن دو قدم چل کر ہی وہ رک گیا اُسے خیال آیا کہ اُس کا ... فارم پر اس کے قدموں میں بے حس و حرکت پڑا ہے۔ اور اُسے اس بے حس گیت کے ٹُنک پیار کو اپنا گرم خون دے کر گرمانا ہے۔ اور اگلے ہی لمحہ وہ ایک ... پرواز سارس کی طرح بازو پھیلائے ہوئے اُس پر جھک گیا۔

Look Out!

چالیس سال کے بعد آپ کو

نیا خون

درکار ہے۔ اس عمر میں اگر اپنی صحت کے متعلق آپ نے ذرا بھی غفلت کی، تو وہی آپ کی کمر جھک جائے گی، بڑھاپا آپ کی زندگی کو تلخ بنا دے گا، تن درست ہوں یا مریض۔ دونوں حالتوں میں آپ کو ہمدرد کے ماء اللحم کی ضرورت ہے، کیونکہ



It's a Blood Bank in a Bottle

MAULLAHAM

ہمدرد کا

ماء اللحم

دوا نہیں ہے۔ بلکہ تازہ خون کا خزانہ ہے۔ یہ حلق سے اُترتے ہی خون بن جاتا ہے : اسے تازہ پھلوں اور مقوی میووں اور صحت بخش غذاؤں اور خاص قیمتی دواؤں کے جوہر سے دواسازی کی جدید ترین مشینوں سے جدید اصول پر تیار کیا جاتا ہے، دل، دماغ اور اعضاء رئیسہ میں نئی زندگی پیدا کرتا ہے۔ معالج استعمال کراتے ہیں : یہ جنرل ٹانک ہے۔ ہر عمر کے لوگ استعمال کر سکتے ہیں، قیمت فی بوتل پانچ روپے۔

Hamdard

اپنے کیمسٹ یا ہمدرد دواخانہ دہلی سے طلب کیجئے

ریزۂ مینا

اُردو کے بہترین پچاس افسانوں کا مجموعہ۔ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۰ء تک ساقی میں سینکڑوں افسانے شائع ہوئے انہی منتخب افسانوں میں سے شاہد احمد دہلوی نے یہ پچاس افسانے انتخاب کئے ہیں۔ مشہور نقادوں کی رائے ہے کہ جدید اردو افسانے کا ایسا کوئی اور مجموعہ شائع نہیں ہوا جو ہمارے افسانے کی تدریجی ترقی کا آئینہ دار ہو۔ ریزۂ مینا افسانوی ادب اُردو کے ذخیرہ میں ایک مینارۂ نور کی حیثیت رکھتا ہے۔

یہ کتاب نایاب تھی۔ اب پھر بڑے اہتمام سے شائع ہوئی ہے۔ ضخامت ۵۵۰ صفحے بہترین لکھائی چھپائی۔ مجلد اور خوشنما پوشش سے آراستہ۔

قیمت پانچ روپے (عہ)

علاوہ محصول ڈاک کے

اپنے شہر کے مشہور کتب فروشوں یا ساقی بکڈپو، دہلی سے طلب فرمائیے۔

حسرت موہانی کی تلمیحات

محمد نعیم الرحمٰن

حضرت حسرت موہانی نہ صرف شعر و سخن کی دُنیا میں بلکہ سیاست کے میدان میں بھی، ایسی وسیع اور زبردست شہرت اور ناموری کے مالک ہیں، کہ انہیں کسی تعارف اور تقریب کی حاجت نہیں ہے غالبًا اتنا تعارف پھر بھی ضروری ہے کہ اُن کا نام فضل الحسن ہے اور یہ کہ کبھی کسی قدیم زمانے میں انہوں نے بی۔ اے کی ڈگری بھی کہیں سے لی تھی۔ اور معاف کیجئے گا، میں پورا نام بتانا بھول رہا تھا، یعنی "سیّد" بھی ہیں! سبحان اللہ! یہ سب اس لئے عرض کیا ہے کہ ایسے حقیقی باکمال شاعروں کے تخلص اس قدر مشہور و معروف ہو جاتے ہیں کہ اکثر خود محبّوں کو بھی ان کا نام یاد نہیں رہا کرتا، بلکہ ان کے نام کے معلوم کرنے کی پروا بھی نہیں ہوا کرتی۔ ان بزرگوں کے نام "نام" نہیں ہوتے کیونکہ انکے تخلص بہت "سامی" ہوتے ہیں۔

اس وقت ہمیں اُن کی سیاست نوازی سے غرض نہیں ہے، بلکہ سخن آرائی پر توجہ ہے، اور وہ بھی خاص اس نگاہ سے کہ ان کے کلامِ مُعجز نظام میں ـــــ اس معجز نظامی پر بزرگانِ ادب آداب شاہد عدل ہیں ـــ تلمیحات کیا اور کیسی ہیں۔ اس موضوع پر مختصرًا ہی کچھ عرض کرنے کا ارادہ ہے۔ تاکہ نہ آپ کو میری تقریر سے ملال ہو، نہ آں جناب سلّمہ اللہ تعالیٰ کے ارشادات کی طرف سے (نعوذ باللہ) کلال ہو۔ میں نے "سلّمہ اللہ تعالیٰ" اس لئے کہا کہ آں قبلہ ابھی باکرامت سلامت ہیں، اور دُعا ہے کہ ابھی تادیر سلامت رہیں یعنی ان کے کلام شریف کا یہ ۳۰۸ صفحے کا مجموعہ جو حیدرآباد کے نظامی پریس نے ۱۹۴۳ء میں شائع کیا ہے (اور وہی اس وقت میرے سامنے ہے) آں جناب کے پورے کلام پر (خدانخواستہ) حاوی نہیں ہے، اور انشاء اللہ ہم تادیر تازہ الہامات سے فیضیاب رہیں گے۔ آمین۔

اس پر شاید یہ کہا جائے کہ چونکہ ابھی حسرت کا کلام ... باقی ہے جو آہستہ آہستہ غیب سے شہود میں ... لئے ان کے کلام کی تلمیحات پر گفتگو ابھی قبل از وقت ہے۔ یہ خیال بالکل بے جا نہیں ہے، مگر جو کچھ کہ از بہارستش پیداست ہے وہ یہ ہے کہ (خوش بختانہ!) جناب حسرت تلمیحات کے بہت شوقین نہیں ہیں، کہیں کہیں لاتے ہیں اور وہ بھی بے ادبی معاف کسی خاص نزاکت یا جدّت کے ساتھ نہیں لاتے۔ لہذا نہ تو یہ اندیشہ ہے کہ اُن کے کلام پر مثلاً آئندہ نسلوں کے پرچوں میں، یہ سوالات ہوں گے کہ اس میں کیا کیا تلمیحات ہیں، اور نہ یہ زیادہ شُبہ ہوتا ہے کہ آئندہ کے استاد ان علم بدیع کی یہ وضع شریف اپنے دل دادگان کردہ غول کے ابتذال کو زیادہ نمایاں کرے گی! مگر کلام حسرت میں تلمیحات کی اس کمی سے یہ نتیجہ نہ نکالنا چاہیئے کہ خاک بدہن معترض اس خاص لحاظ سے اس کلام میں وقعت زیادہ نہیں ہے۔ بلکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ تلمیح کی تعریف میں یہ کہا جاتا ہے کہ اس میں کسی ایسی بات کی طرف اشارہ ہوتا ہے "جس کے معلوم ہوئے بغیر کلام کا مطلب اچھی طرح سمجھ میں نہیں آتا"۔ اگر ایسا ہے، تو پھر تلمیح کا لانا ہی چہ ضرور؟ اس سے تو پڑھنے والا اور بھی پریشان ہوگا، اور جب تک کسی "فاضل مولوی صاحب" سے نہ دریافت کیا جائے شعر اس کی سمجھ ہی میں نہ آئے گا۔ ظاہر ہے کہ جو شاعر تلمیح سے کام لئے بغیر اپنے مافی الضمیر، اپنے احساس، اپنے جذبے کو اس خوبی سے بیان کردے کہ پڑھنے والا آسانی سے، اور پوری طرح اسے سمجھ لے، تو یہ اس شاعر کا کمال ہوگا۔ حسرت کو یہی کمال حاصل ہے۔ ان کا طرزِ کلام شاذ ہی تلمیح جیسی چیز کا محتاج ہوتا ہے، وہ "از دل خیزد بر دل ریزد" کی شان سے شاندار ہے، اور اسمیں ذرّہ بھر شُبہ نہیں کہ اس لحاظ سے حسرت نہ صرف اپنے ہم عصروں میں ممتاز ہیں بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اپنے متقدموں میں بھی ایک نمایاں حیثیت، بلکہ ان پر فوقیت رکھتے ہیں۔ میرے اس خیال سے شاید اہل رائے اور "اہلِ علم" بزرگ اتفاق نہ فرمائیں گے، مگر انکے اس اختلاف رائے سے ہمیں خائف بھی نہ ہونا چاہیئے!

تلمیح کا ذکر ہو رہا ہے، مگر تلمیح ہے کیا؟ ایک فارسی لغت نگار بزرگ[1] نے بتایا ہے کہ تلمیح یہ ہے کہ کلام میں کسی قصے کی طرف اشارہ کیا جائے، یا نجوم اور موسیقی وغیرہ کی اصطلاحیں لائی جائیں، یا قرآن مجید، احادیث (کے فقرے جملے الفاظ) لائے جائیں۔ ایک مشہور و معروف عربی عالم بدیع[2] کہتا ہے ——— اور وہی حق دار ہے کہ اس کی تعریف بتائے کیونکہ وہ اسی علم کا ماہر ہے ——— کہتا ہے کہ تلمیح یہ ہے کہ کلام کے مضمون میں کسی قصے یا شعر یا مثل کی طرف بغیر اس کے بیان کئے ہوئے اشارہ کیا جائے۔ ایک فارسی بدیعی[3] فرماتے ہیں کہ تلمیح "اس طرح پر ہے کہ کلام مشعر ہو کسی واقعۂ مشہورہ پر یا ایسی چیز پر اشارہ کیا جائے کہ کتب مستعملہ میں مذکور ہو۔" اور اس کو انھوں نے مصر کا بازار، لن ترانی اور "اس لئے لوٹے ہے خاک پر غنچہ" (مرض استسقا کا علاج) کی مثالوں سے واضح کیا ہے۔ کس قدر جامع ارشاد ہے کہ "ایسی چیز جو کتب مستعملہ میں مذکور ہو۔" ایک اردو اہل بدیع[4] کی رائے میں "تلمیح اثنائے کلام میں کسی مشہور قصے یا مسئلے کی طرف اشارہ کرنا" ہے۔ ایک اور بزرگ[5] نے ان دونوں کو بڑی خوبی سے جمع کیا ہے کہ "تلمیح یہ ہے کہ کلام میں اشارہ کسی قصۂ مشہورہ کی طرف کیا جاوے یا ایسے مسئلے کا ذکر کریں جو کتب مستعملہ میں مذکور ہو۔"

بظاہر پیغمبر گویائی کی امت کا یہ اختلاف رحمت نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن اگر ان سب آرائے عالیہ کو یک جا جمع کر کے تلمیح کا مفہوم سمجھا جائے تو یہ زحمت ختم ہو جاتی ہے۔ تاہم مولانا غیاث الدین کا اصطلاحات علمیہ کو، اور (تقریباً اسی طرح) قبلہ صہبائی کا علاج استسقاء کے اشارے کو تلمیح میں شامل کر دینا کچھ زبردستی سی معلوم ہوتی ہے، اور اسے تسلیم کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ لیکن ان قبلہ گاہوں پر ایمان بالقلب نہ رکھیے تو خوف ہے کہ ان کے پجاری آپ کو ادبی زندیق اور بدعتی اور غیر مقلد بنا کر "علمائے کرام" کو تکفیر و تفسیق کے بانے تیار کر لینے کا حکم دے دیں گے! جبراً یہ منظور رہی، مگر طوعاً نامنظور رہی ہے۔ طول کے خوف کے باوجود تلمیح کے اوضاع کی ذرا سی تفصیل کرنے کو جی چاہتا ہے۔ تلمیح میں اشارہ ہوتا ہے ذیل کے امور کی طرف:

(۱) مشہور اشخاص و افراد انسانی اور ان کے کام۔

(۲) مشہور نباتات و حیوانات اور ان کا انسان یا انسانی واقعات سے تعلق۔

(۳) خشکی اور تری کے مشہور مکان و مقام، جو کسی واقعے سے متعلق اور اس خاص قوم میں کسی سبب سے اہم ہوں۔

(۴) واقعات: دیومالا، خرافات، روایات، تاریخ، انساب۔

(۵) مشہور مصنفوں یعنی شاعروں اور کاتبوں[6] کے اقوال۔ اسی میں "آسمانی" کتابوں کی آیتیں اور ان کے جملے ترکیبیں اور الفاظ بھی شامل ہیں۔

(۶) مثلیں، اور مثلوں میں جو اشخاص مذکور ہوں ان کے نام۔ اور آخر میں آپ کا جی چاہے تو (۷) اصطلاحات علمیہ کو بھی شامل کر لیجئے۔

انسانوں کے تلمیح میں شامل ہونے کا حال یہ ہے کہ ایک طرف تو اس فہرست میں وہ لوگ ہوتے ہیں جنہوں نے انسان کی تاریخ عالم میں کارہائے نمایاں کئے ہیں اور ایک وقت میں واقعی گوشت و پوست کے بنے ہوئے، جیتے جاگتے، کھاتے پیتے اور بازار میں چلتے پھرتے ہوئے انسان تھے، اور دوسری طرف وہ انسان بھی اس زمرے میں ہیں جو خود ان مشہور بزرگوں کی کتابوں میں خود ان ہی کے پیدا کئے ہوئے اور بالکل فرضی انسان تھے، جیسے سرشار کے میاں خوجی اور لوازعفران، طلسم ہوش ربا کے [illegible] اور گنجاب بن بجور، سروانتیس کا دون کہو[illegible]۔ یہی حال فرضی مقامات کے ناموں کا بھی سمجھئے اور [illegible] اور تخلیق انہیں بزرگوں کی ہوتی ہے جن کی شان خود [illegible] ہے کہ وہ خود بھی تلمیح کے مضمون بن گئے ہیں۔ اور [illegible]

---

۱ صاحب غیاث اللغات۔ ۲ تفتازانی: مختصر المعانی ۳ صہبائی: حدائق البلاغۃ ۴ سجاد میرزا بیگ: تسہیل البلاغۃ ۵ ذوالفقار علی: تذکرۃ البلاغہ۔

۶ شعر کہنے یا لکھنے والے کو جیسے شاعر کہتے ہیں، ویسے ہی اصطلاحاً نثر لکھنے والے کو کاتب کہتے ہیں۔

آخر یہ بھی خلق ہیں۔ اسی طرح اِن قابلِ تلمیح افراد اور مقامات وغیرہ کی زندگی بھی اسی قدر طویل ہوتی ہے جس قدر بلند، وسیع، وردیرپا قدر و قیمت اُس کے خالق (مصنف، شاعر، کاتب وغیرہ) کی ہوتی ہے۔ خالق جتنا بڑا ہوگا، وہ اپنے مخلوق کو بھی اتنا ہی بڑا کر دے گا۔ فتبارک اللہ احسن الخالقین۔ اس کی ایک بدیہی [illegible] مثال یہ ہے کہ ہماری دُنیا میں مسلمان مصنفوں کی [illegible] قرآنی تلمیحات کا شمار یا احاطہ کرنا تقریباً ناممکن ہے اور جس طرح قرآن کو زوال نہیں ہے، اسی طرح اس کے الفاظ، تراکیب، جملات، آیات اور مضامین کی طرف تلمیحات کی زوال سے مستغنی ہیں۔

حسرت کے کلام میں، جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، تلمیحات زیادہ نہیں ہیں: حتیٰ کہ انھوں نے انسان کے افراد و اشخاص کو بھی زیادہ نہیں نوازا ہے، اور ان کی فہرست میں ماضی بعید سے زمانۂ حال تک کے زمانہ کو جو نسبت ہے اسی طرح ان افراد کی تعداد میں بھی نسبت ہے، یعنی ماضی بعید کے [illegible] کم ترین اور زمانۂ حال کے (ہم عصر) زیادہ ترین مذکور [illegible] چنانچہ فہرست ملاحظہ ہو:

[illegible] (۱) حضرت موسیٰ عم۔ (۲) حضرت خضر سلمہ اللہ تعالیٰ (۳) حضرت الیاس طال عمرہ۔ (۴) حضرت یوسف عم (۵) جناب کرشن عم (جن کو نبواری، گردھاری، نندلال، مراری [illegible] شیام کے لقبوں سے بھی یاد فرمایا ہے۔ اُن کی آفت [illegible] بانسری کا بھی ذکر فرمایا ہے، اور گوکل، برساز اور [illegible] گام (گاؤں) کو بھی نہیں بھولے ہیں جہاں، من جملہ اور [illegible] کرشن کے جرنوں سے جوت کھیلا کرتی تھی۔ [illegible] عیسیٰ عم (۷) حضرت خاتم الانبیاء رحمۃ اللعالمین [illegible] علیہ (جن کو امّی لقب [illegible] سراج منیر [illegible] خیر المرسلین، حبیبِ کبریا [illegible] الضحیٰ کے القاب کریمہ سے [illegible] (۹) [illegible] دستر میں [illegible] (۲) [illegible] رسالت [illegible] اللہ وجہہ (جن کا [illegible] شاہِ مرداں، بابِ علم [illegible] سے بھی ذکر کیا ہے) حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ [illegible] چشم فاطمہ، مہر درخشانِ علی، شہید معرکہ کربلا، حسین بن علی، شاہ نجف، شہ کربلا، نوجوانانِ خلد کے سردار، نورِ چشمِ علی، جانِ بتول بھی لکھا ہے) حضرت موسیٰ کاظم رضی اللہ عنہ (۳) جناب شیخ عبدالقادر جیلانی علیہ الرحمۃ (جن کو غوثِ اعظم شاہ جیلان بھی کہا ہے) (۴) خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ (جنھیں خواجۂ اجمیر اور کعبۃ الاولیاء کے القاب گرامی سے بھی یاد کیا ہے) (۵) ابوالحسن خرقانی رحمۃ اللہ علیہ (۶) منصور حلاج رحمۃ اللہ علیہ (۷) حضرت سلمان رضی اللہ عنہ (۸) حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ۔

ج ـ جامی، رومی، شمس تبریز، عراقی، فغانی، نظیری، حافظ، سعدی۔

د ـ غالب، میر تقی میر، نسیم دہلوی، مومن، قائم،

ہ ـ [illegible] مصحفی، شوق، وفا، ضامن، محشر، وحشت، نظر، [illegible] تسنیم، برق، کمل، عزیز، رزاق (رزاق) پیا، [illegible] [illegible] شہاب، والی، عبدالصمد (سہ عبدالصمد) رسوا، اقبال، تلک، ابوالکلام، لینن، گاندھی، مبری کوریلی۔

یہ ہیں وہ اشخاص" حسرت کے۔ ان میں سے ضمیمہ (ہ) کے افراد حسرت کے ہم عصر حضرات ہیں۔ اور ان میں سے بھی بعض ایسے بزرگ ہیں، جن سے اکثر پڑھنے والے واقف نہیں ہیں۔ ایسے حضرات کے بارے میں یا تو کلیات حسرت میں حواشی میں، اگر مفصل نہیں تو مختصر طور پر ہی، کچھ حالات لکھ دینا چاہیئے، یا ان کے حالات پر مختصر مضامین شائع ہونا چاہیئے۔ یہ ایک ایسا امر ہے جس میں اربابِ زبانِ اُردو سخت، بلکہ مجرمانہ سہل انگاری سے کام لے رہے ہیں؟ اور وہ وقت دور نہیں ہے کہ جب [illegible] آنے والی نسل تک، ہمارے نہایت ممدوح اور [illegible] کے ممدوح و موصوف [illegible] ہماری اس سہل [illegible] سے بالکل گم [illegible] اور سب کو جانے [illegible] اُردو [illegible] مشہور شعراء [illegible] میر [illegible] غالب [illegible] کے کلام [illegible] کا [illegible] اور باعث [illegible] ہے ـــــ [illegible] ہم عصر [illegible] اُن میں سے کتنے ایسے ہیں جن کے حالات سے وہ [illegible] متعلق [illegible] ہی سہی) ہم آج واقف ہیں؟ اس باب میں خصوصیت کے ساتھ اکبر [illegible] کے اشخاص کی

طرف آپ کو توجہ دلاتا ہوں۔ کلیات اکبر کے "اشخاص" کی اہمیت اس سبب سے اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے کہ اکبر کا کلام بہ یک وقت اپنے زمانے کی معاشرت، معاش، سیاست اور تاریخ کا آئینہ دار ہے۔ جب تک کہ ہم ان "اشخاص" کے حالات اور کوائف سے واقف نہ ہوں گے، نہ اکبر کا قول ہماری سمجھ میں آ سکتا ہے اور نہ ہم اس کلام سے وہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو اس شاعرِ عظیم کا اصلی مقصد تھا[1]۔ ضرورت ہے کہ اہلِ اردو اس امر کی طرف جدر سے جلد توجہ کریں!

معاذ اللہ! میں کس اور طرف بہکا جا رہا ہوں۔ ان تمام بزرگ "اشخاص" کے بارے میں مجھے صرف یہ عرض کرنا تھا کہ یہ سب (الا ما شاء اللہ) مشہور و معروف اور معظم و مسلم ہستیاں ہیں، جن کے حالات سے کلیات حسرت کے ناظرین عموماً واقف بھی ہیں، اور ان کے حالات آسانی سے "کتب مشہورہ" میں مل بھی جاتے ہیں، لہٰذا میں ان جملہ حضرات کی طرف تلمیح کی تشریح نہ کروں گا۔ البتہ ان میں سے دو چار اسماء اور القاب ضرور توجہ کے مستحق ہیں، اور ان ہی پر کچھ گفتگو کی ضرورت ہے۔ وھو ہذا!

اس گو تیمناً حضور نبی کریم صلعم کے ذکر مبارک سے شروع کرنے کی غرض سے پہلے آں حضرت والا کے القاب پر گفتگو کرتا ہوں۔ مولانا حسرت نے حضورؐ والا کو جن القاب سے یاد کیا ہے اُن میں سے صرف چار ایسے ہیں جو براہ راست قرآن کریم سے ماخوذ ہیں، باقی سب افرادِ اُمت نے محبت کے جوش میں بنائے ہیں۔ ایسے القاب کی تعداد تقریباً بے انتہا ہے۔ محبت کے ولولے نے مسلمانوں کے دل و دماغ نے ان گنت نعتیں نظم اور نثر میں پیدا کی ہیں، اور ہر ایک نے ایسے ایسے القاب پیدا کئے ہیں کہ اس محبت و عقیدت کے جوش اور اس کی ہمہ گیری اور ناپیدا کناری پر حیرت ہوتی ہے۔

حسرت کے القاب نبوی میں سے قرآنی القاب یہ ہیں:-

داعی (بلانے والا) یہ قرآن مجید کی دو آیتوں سے ماخوذ ہے:

(۱) "اے نبی! اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم نے تجھے گواہ (شاہد) اور خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا، اور اللہ کی طرف اُسی کے حکم سے، بلانے والا (داعی) اور روشن کر دینے والا چراغ بنا کر بھیجا ہے۔" (احزاب ۴۵-۴۶)۔ (۲) "اے ہمارے لوگو! اللہ کی طرف بلانے والے (داعی) کے بلاوے کو سنو اور اس پر ایمان لاؤ۔ وہ تمہاری خطائیں تمہیں معاف کر دے گا، اور ایک دردناک عذاب سے تمہیں بچائے گا۔ اور جو کوئی اللہ کے (اس) بلانے والے کی بات نہ سُنے گا وہ زمین میں اللہ کے کام کو بگاڑ نہیں سکتا، اور نہ اسے اُس (اللہ) کے سوا اور کوئی بچانے والا ملے گا۔ یہی لوگ تو کھلی گمراہی میں مبتلا ہیں!" (احقاف ۳۱-۳۲)

رحمت للعالمین (تمام جہانوں کے لئے رحمت): یہ ایک آیت میں ہے: "ہم نے تو تجھے تمام جہانوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔" (انبیاء ۱۰۷)

سراج منیر (روشن کر دینے والا چراغ): یہ لقب صرف ایک آیت میں نازل ہوا ہے (احزاب ۴۶)، جس کا ذکر اوپر داعی میں ابھی گذرا ہے۔

شاہد (گواہ): یہ صفت شریفہ تین آیتوں میں مذکور ہے: (۱) جس کا بیان داعی کے ماتحت اوپر گذرا۔ (۲) بے شک ہم نے تجھے گواہ (شاہد) خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے (فتح ۸) (۳) بے شک ہم نے تمہاری طرف ایک پیغمبر بھیجا ہے، جو تمہارے بارے میں گواہ (شاہد) ہے، بالکل جس طرح ہم نے فرعون کی طرف ایک پیغمبر بھیجا تھا۔

اسی تعلق سے لفظ شاہد کی ایک اور صورت شہید پر بھی غور کر لینا چاہیئے، شہید کے معنی بھی گواہ کے ہیں۔ جن آیتوں میں یہ کلمہ حضور نبی کریم صلعم کے بارے میں نازل ہوا ہے، وہ یہ ہیں: (۱) یوں ہم نے تمہیں بہترین (بیچوں بیچ کی) اُمت بنایا ہے، تاکہ تم لوگوں پر گواہ رہو اور یہ رسولؐ تم پر گواہ (شہید) رہے۔ (بقرۃ ۱۴۳) (۲) تو کیوں کر ہوگا جب ہم ہر ایک اُمت میں سے ایک گواہ لائیں گے،

---

[1] حضرت اکبر کے فرزند ارجمند مکرمی و محترمی جناب سید عشرت حسین صاحب مرحوم و مغفور سے راقم نے کئی بار عرض کیا کہ اس طرف توجہ فرمائیں، مگر یہ استدعا درجۂ قبولیت کو نہ پہنچی۔ اور ظاہر ہے کہ یہ اہم اور نازک کام خوبی، حسنِ اسلوب اور قابلِ اعتماد طور پر آں ممدوح ہی انجام دے سکتے تھے۔ انا للہ!

اور تجھے ان سب لوگوں پر گواہ بنائیں گے (نساء، ۴۱) (۳) ایک دن ہم ہر ایک امت میں، انھیں میں سے اور انھیں پر، ایک گواہ اٹھائیں گے، اور تجھے ان سب پر گواہ بنا کر لائیں گے، اور ہم نے تجھ پر ایک کتاب اتاری ہے، جس میں ہر ایک بات کو معقول کر سمجھا دیا گیا ہے، اور جو مسلموں کے لئے ہدایت اور رحمت اور خوش خبری ہے (نحل، ۸۹) (۴) اور اللہ کے لئے جتنا کچھ کوشش کا حق ہے خوب کوشش کرو۔ اسی نے تم کو چُنا ہے، اور دین کے بارے میں تمہارے اوپر کوئی سختی نہیں رکھی۔ یہ تو تمہارے باپ ابراہیم کا دین ہے: اسی نے تمہارا نام "مسلم" رکھا ہے ـــــ اس سے پہلے بھی، اور اب بھی! ـــــ تاکہ یہ رسول تم پر گواہ رہے اور تم لوگوں پر گواہ رہو۔ ہاں، صلوٰۃ کو قائم رکھو، زکوٰۃ دو۔ اور اللہ کو تھامے رہو: وہی تو تمہارا آقا ہے! (حج، ۷۸)

حضرت عیسیٰ ؑ کے بارے میں بھی یہ لفظ شہید دو جگہ پر وارد ہوا ہے: (۱) اور اہل کتاب میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جسے اُس (یعنی عیسیٰ) پر اس کی وفات سے پہلے ایمان لانا نہ پڑے، اور قیامت کے وقت وہ ان پر گواہ ہوگا (نساء، ۱۵۹)۔ (۲) سورہ مائدہ میں ایک جگہ (آیت ۱۱۹) میں یہ ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ بن مریم ؑ سے پوچھے گا کہ "کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا کہ اللہ کو چھوڑ کے مجھے اور میری ماں کو دو خدا بنا لو؟" اس کے جواب میں آں جناب فرمائیں گے کہ "میں ایسی ناحق بات کہنے والا کون ہوں؟ اور اگر میں نے کہا بھی ہوتا تو تو ضرور جان لیتا۔ میں نے تو اُن سے صرف وہی کچھ کہا تھا جو تو نے مجھے حکم دیا تھا، یعنی یہ کہ میرے اور اپنے پروردگار (اللہ) کو پوجا کرو۔ اور جب تک میں ان لوگوں میں زندہ رہا تو اُن پر گواہ تھا، مگر جب تُو نے مجھے وفات دی تو تُو انکا نگہبان تھا، اور تُو تو ہر ایک چیز پر گواہ ہے" (۱۱۹ ـــ ۱۲۰)

اسی طرح ہر قوم (اُمت) میں ایک گواہ ہوتا ہے۔ سورہ قصص (آیت ۷۵) میں ارشادِ الٰہی ہے کہ "ہم ہر ایک اُمت میں سے ایک گواہ نکالیں گے اور کہیں گے کہ "اپنے ثبوت پیش کرو"۔ تب انہیں پتا چلے گا کہ پورا سچ اللہ ہی کا ہے، اور انہوں نے خود جو جھوٹ تراش رکھے ہیں وہ سب اُن کے ہاتھ سے جاتے رہیں گے!"

دو تین خطاب اور قابل توجہ ہیں:

باب علم: علی آگاہ جس سے ہو کے بابِ علم کہلائے، وہ رازِ عشق ہم کو بھی بتا دو یا رسول اللہ! (ص ۲۰۹[1]) یہ خطاب حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ہے، اور اس حدیث نبوی ؐ سے ماخوذ ہے جس کے الفاظ ہیں: "میں علم کا شہر ہوں اور علی اس (شہر) کا دروازہ (باب) ہے"۔ یہ حدیث بہت مشہور ہے، مگر یہ یقینی امر نہیں ہے کہ یہ بالکل "صحیح حدیث" بھی ہے۔

شَبّیر

نقشِ حق یہ وہ بے شک کہ نہ ہوتے تو نہ ہوتا۔ دنیا میں بپا ماتمِ شبیر ابھی تک (ص ۲۱)

یہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کا ایک نام ہے۔ اصل میں یہ عربی نہیں، بلکہ سریانی لفظ ہے، جہاں اس کا تلفظ پ (تین نقطوں والی) سے ہے۔ عربی میں پ کو ب کر لیا گیا، کیوں کہ اس میں پ نہیں ہوتی۔ اس لفظ کے معنی بالکل حُسین (چھوٹا سا خوبصورت لڑکا) کے بتائے جاتے ہیں۔ اسی نام کی نسبت سے سرکار ممدوح کے برادر بزرگوار حضرت امیر المومنین حَسن رضی اللہ عنہ کا نام مبارک شَبّر بھی رکھ لیا گیا ہے! اور شَبّر کے معنی بھی حَسن (خوبصورت آدمی) بتائے جاتے ہیں۔

شہِ کرب و بلا

خوشنودیِ فجار کے پیرو ہیں یزیدی۔ تقلیدِ شہِ کرب و بلا میرے لئے ہے (ص ۱۱۴) یہ "درد اور آزمائش کا بادشاہ" بھی حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ ہیں۔ اس لقب میں کرب و بلا کے الفاظ مقام کربلا کے حروف کے تجزیے سے شاعرانہ طور پر بنالئے گئے ہیں، گو کربلا میں صرف ایک ہی ب ہے، مگر سرکارِ عالی کو جن مصائب سے اس میدان میں واسطہ

---

[1] یہ شعر اور اس کے آخر میں یہ عدد، حسرت کے باتلمیح اشعار اور اُن کی کلیات کے صفحوں کے عدد ہیں!

پڑا ان کے لحاظ سے ایک دوسرے کر کے ایک مثالی بیانی مرکب بنا لیا گیا ہے، جو ہر طرح قابل داد ہے، اس صاحب کے متعلق آئندہ کسی جگہ اگر بات آئی تو کچھ عرض کروں گا

دو حضرات ہیں جن کو حق تعالی نے حیات جاودان عطا فرمائی ہے۔ گوشت و پوست میں نہ ہو کر زندہ رہنے والوں کی حیات کے حالات کبھی ختم ہوں گے نہ ضبط تحریر میں آ سکتے ہیں۔ تاہم ان جاودان مصوں کے ذکر سے اس مختصر کے لئے کچھ تبرک تو ضروری ہے۔

خضر

بارہا کھائی ہو جس نے لب جاناں کی قسم
خضر کھاتے ہیں یہ کیا چشمۂ حیواں کی قسم (ص: ۲۰)

حضرت خضر (خِ ضْ ر) کا نام قرآن مجید میں تو کہیں مذکور نہیں ہے، البتہ احادیث شریفہ میں سے چند کو آں جناب کے ذکر شریف سے مزین ہونے کا شرف ضرور دیا گیا ہے۔ ان کی وجہ تسمیہ (سبز) بہت دلچسپ ہے، محققین فرماتے ہیں کہ آں جناب جس جگہ بیٹھتے تھے وہاں سبزہ اُگ آتا تھا۔ حضرت مجاہدؒ سے روایت کی جاتی ہے کہ حضرت خضر جہاں نماز میں مشغول ہوتے تو سجدے کی جگہ اور حصیرے اطراف میں سبزہ جم جاتا تھا۔ اسی طرح حضرت ابوہریرہ رضؓ نے ایک روایت حضرت خاتم النبیین صلعم تک پہنچائی ہے (۱) کہ خضر کو خضر (سبز) اس لئے کہتے ہیں کہ آپ ایک سفید پتھر پر بیٹھے تو وہ پتھر سبزے سے لہلہانے لگا۔ آپ کا اسم مبارک بلیا ابن بلکان ہے۔ جناب بلکان حضرت نوح عم کے پوتے کے پوتے تھے۔ بعض کے نزدیک آپ کا اسم شریف الیاس یا عامر یا خضرون یا اُرمیا بھی ہے۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ آپ ایرانی تھے۔ بعض کہتے ہیں کہ حضرت الیاس کے بھتیجے تھے، بعض کی رائے ہے کہ بنو اسرائیل میں سے تھے، اور بعض کا ارشاد ہے کہ آپ اسکندر کے خالہ زاد بھائی تھے، مگر قبلۂ کعبہ

جناب ابوالحسن حسن کاکوروی صاحب[۱] نے بجا فرمایا ہے کہ یہ سب ضعیف ہے قابل اعتبار نہیں، لیکن جو بعض اہل حدیث نے حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹوں میں بیان کیا ہے اس کا عجب نہیں[۲]۔ آپ کا زمانہ "بہ روایت بعض بعد حضرت صالح پیش از ابراہیم عم تھا، اور بعض بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام بتلاتے ہیں۔ الغرض تعین زمان میں اختلاف ہے۔ بیضاوی میں ہے کہ افریدون کے وقت میں تھے اور ذوالقرنین اکبر کے ساتھ سیر ربع مسکون میں موجود تھے، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد تک ظاہر رہے۔ معالم التنزیل میں ہے کہ جب ذوالقرنین بہ طلب آب حیات روانہ ہوا تو خضر علیہ السلام آگے تھے کہ ان کو وہ چشمہ ملا۔ انھوں نے اس سے پانی پیا، اور غسل فرما کر دوگانہ شکر ادا کیا اور درازی عمر پائی، اور ذوالقرنین محروم واپس آیا..... یہ قول ضعیف ہے اگر ہمراہی سکندر اکبر یا سکندر رومی پر مامور ہوئے ہوں تو عجب نہیں، لیکن آب حیات سے درازی عمر کا پانا معتمد نہیں ہے، کیوں کہ حضرت عیسیٰ و الیاس علیہم السلام کہاں تلاش آب حیات کرنے گئے تھے؟..... بیمار بھی ہوتے ہیں اور معالجہ اپنا کرتے ہیں..... قبل بعثت آں حضرت صلعم پانسو برس کے بعد دندان مبارک ان کے ازسرنو نکلے تھے، اور بعد بعثت ایک سو بیس برس کے بعد نکلنے لگے تھے، اور آں جناب نیک خلق و جوان مرد و مشفق تمام خلائق کے ہیں، اور جود و عطا میں بے نظیر۔ ایثار آپ کی عادت ہے، علم کیمیا سے بخوبی آگاہ۔ اور خود قرض لیتے دیتے ہیں، اور بازار میں دلالی بھی کرتے ہیں اور اجرت پر کام کرتے ہیں..... صحیح یہ ہے کہ حضرت خضر عم نبی معمر و محجوب قیامت تک ہیں، بعد رفع قرآن شریف وفات پاویں گے۔ مگر اکثر محدثین، مثل بخاری و ابن مبارک و ابن جوزی حیات خضر عم کا انکار کرتے ہیں[۳]....."

---

[۱] ان دونوں کراماتی روایتوں میں بیان کے افعال کا صیغہ (ماضی) ضرور ذہن میں رکھیے گا، اور یہ بھی نہ بھول جائیے گا کہ جناب خضر عم ہمیشہ زندہ رہیں گے، یعنی آج بھی زندہ ہیں!

---

[۱] مصنف کتاب تفریح الاذکیاء فی احوال الانبیاء (۲ جلد)

[۲] یہ فیصلہ بالکل درست ہے۔ دُعا قبول ہو یا رب! کہ عمر خضر دراز۔ آمین۔

[۳] ایضاً، ص ۵۴۳، ۵۴۴، ج ۱

یہ ہے بہت مختصر سا حال آں جناب کا جو "کتب صحیحہ" میں ملتا ہے، اور اس پر (بحمد اللہ) مزید اور مستزاد بھی ہے۔ قرآن کریم کی سورۂ کہف (آیات ۶۰–۸۲) میں حضرت موسیٰ عم کا ایک واقعہ تمثیلی طور پر بیان ہوا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ آں حضرت نے اپنے ملازم سے فرمایا کہ میں دو دھاراؤں کے سنگم تک جانا چاہتا ہوں اور ضرور جاؤں گا۔ چنانچہ چلتے چلتے جب وہاں پہنچ گئے اور ناشتہ شکنی کے لئے اس سے کھانے کو مچھلی مانگی تو معلوم ہوا کہ وہ تو پہلے ہی کہیں ایک چٹان پر سے جہاں دم لینے کے لئے بیٹھے تھے، کود کے پانی میں جا گری تھی۔ حضرت موسیٰ عم سے صبر نہ ہوا، اور وہ اسے ڈھونڈھنے کے لئے واپس چلے۔ راستے میں ایک بھلے مانس ان کو مل گئے اور ان کے ساتھ ہو لئے اور درخواست کی کہ مجھے بھی کچھ بتائیے۔ اُن قبلہ نے کہا کہ آپ میرا ساتھ کہاں تک دیں گے؟ آپ سے میری حرکتوں پر صبر نہ ہوگا، اور بے سمجھے آپ مجھ سے سوال کریں گے۔ انھوں نے صبر کا وعدہ کیا، تو انھوں نے ساتھ لے لیا۔ راستے میں اُن جناب نے تین بار کچھ ایسے ایسے کام کئے جن پر حضرت موسیٰ عم نے اعتراض اور سوال کیا۔ بہ شرط جو لوٹی، تو وہ حضرت بگڑ گئے، اپنا طرزِ عمل حضرت موسیٰ کو سمجھایا، اور انہیں چھوڑ کے اپنے رستے پر لمبے ہوئے۔ اللہ اللہ خیر صلاح!

ان بزرگوار کو حضرات کرام نے تجویز فرمایا ہے کہ یہی خضر علیہ السلام تھے، اور یہی وہ بزرگ تھے ——— اور ہیں — جو سکندر کے ساتھ ایک تنگ و تاریک مقام پر ایک چشمے سے آبِ حیات لے کے پی گئے تھے، جس کی برکت سے ابدی زندگی پا گئے، مگر وہ بیچارہ کم نصیب ہی رہ گیا! اسی لئے تو ان کے سپرد اللہ تعالےٰ نے یہ خدمت کر دی ہے کہ پانی میں بھولے بھٹکوں کو راستہ بتایا کریں۔ گم کردہ راہ کو راہ پر لانے سے بہتر کون سی خدمت ہو سکتی ہے؟

الیاس

بحرِ عرب میں بہ سکونِ تمام
مرکبِ الیاس ہوا خوش خرام (نظم الجج، ص ۲۰۴)

قرآن مجید میں حضرت الیاس عم کو رسول (مرسل) بتایا ہے۔ سورہ صافات (آیات ۱۲۳–۱۳۲) میں کچھ تفصیل کے ساتھ ذکر ہے۔ "اور بے شک الیاس بھی رسولوں میں سے تھا۔ (یاد رہے) جب اس نے اپنی قوم سے کہا کہ "تو کیا تم (اللہ سے) نہیں ڈرتے؟ کیا تم سب سے اچھے پیدا کرنے والے کو چھوڑ کر بعل کو پکارو گے؟ اللہ کو چھوڑ کر، جو تمہارا بھی پروردگار ہے اور تمہارے اگلے باپ دادا کا بھی؟" مگر انھوں نے اسے جھٹلا دیا، اور وہ لوگ ضرور پکڑ کر حاضر کئے جائیں گے، سوا اُن کے جو اللہ کے خالص کام کرنے والے بندے ہیں۔ اور ہم نے (یہ نعمت) اس سے اور بعد کے آنے والوں تک باقی رکھی۔ الیاس پر سلام ہو! ہم اچھا کام کرنے والوں کو اسی طرح انعام دیا کرتے ہیں، کیوں کہ وہ ہمارے ایمان دار بندوں میں سے تھا۔" پھر سورہ انعام (آیت ۸۵) میں اور پیغمبروں کے ساتھ ساتھ ان کا بھی نام لیا ہے: "اور زکریا اور یحییٰ اور عیسیٰ اور الیاس ان میں سے ہر ایک اچھے اور سچے لوگوں میں سے تھا۔" ان مقامات کے علاوہ اور کہیں ذکر نہیں ہے، اور ظاہر ہے کہ ان آیتوں میں کہیں سے یہ بات نہیں پیدا ہوتی کہ حضرت الیاس عم ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہیں گے اور خشکی میں انسانوں کی راہ نمائی کا فرض انجام دیا کریں گے۔ مگر "اہلِ تحقیق" کے ارشادات ہیں:

حضرت الیاس عم (جیسا کہ اوپر خضر کے بیان میں ہم کہہ آئے ہیں) حضرت خضر کے چچا تھے۔ یہ بھی خیال ہے کہ حضرت الیسع عم کے چچیرے بھائی تھے، "اور حضرت یوشع بن نون کے نواسے تھے (اور نواسوں کا درجہ ہمیں معلوم ہی ہے کہ کتنا زبردست ہوتا ہے!) اور حضرت ہارون عم کی اولاد میں سے تھے۔ ان کا نام الیاس اور الیاسین دونوں طرح بیان کیا جاتا ہے، چنانچہ قرآن مجید میں (صافات ۱۳۰) بھی الیاسین مذکور ہے۔ یہ بھی خیال ہے کہ صحیح نام الیاس ہے اور ان کے والد ماجد کا نام یاسین تھا، گویا باپ اور بیٹے دونوں کے ناموں کی ترکیب سے الیاسین ہو گیا۔ آپ شہر بعلبک کے لئے مبعوث ہوئے تھے، جہاں بعل دیوتا کی پوجا ہوتی تھی۔ اُس وقت وہاں اخی اب بادشاہ تھا، جس نے بعل کا ایک زبردست بت بنایا تھا، اور بقولِ مصنفِ تورات (۱ سلاطین، باب ۱۶، آیت ۳۰ بعد) اُس نے "خداوند کے حضور زیادہ بدکاریاں کیں۔" — اور بادشاہ اتبعل کی بیٹی ایزبل سے بیاہ کیا اور جا کے بعل کو پوجا اور اس کے آگے سجدہ کیا..... اور

بعل کے لئے ایک مذبح تیار کیا.... اور اخی اب نے خداوند اسرائیل کے خدا کو ان سب اسرائیلی بادشاہوں سے جو اس سے آگے تھے غصّہ دلانے میں زیادہ کام کیا۔" اخی آب نے اُن پر بڑے بڑے ظلم توڑے، اور آخر وہ تنگ آ کر پہاڑوں میں جا چھپے۔ بادشاہ نے ہر چند بلایا، مگر آں حضرت اس کے مکر و فریب کے دغدغہ سے بے فکر نہ تھے اس لئے اس کے سامنے تشریف نہیں لائے۔ اپنی گردش میں ایک روز آپ ایک بڑھیا کے گھر پہنچے جس کا لڑکا سخت بیمار تھا۔ آپ کی دعا سے اسے صحت ہو گئی، اور وہ لڑکا آپ کا ایسا گرویدہ ہوا کہ آپ کے ہمراہ ہو لیا اور برابر ساتھ ہی رہتا تھا۔ یہ لڑکا بعد میں آپ کا خلیفہ اور پیغمبر ہوا --- یہی حضرت الیسع علیہ السلام تھے! یہ دونوں حضرات ایک شدید قحط کے دوران میں، جس نے تین برس سے ملک کو تباہ کر رکھا تھا، بادشاہ اخی آب کے دربار میں پہنچے۔ حضرت الیاس نے اس مردود سے کہا کہ "اگر تیرا خدا اب تجھے اور تیری رعایا کو بھوک سے نجات دے سکتا ہے تو خیر، ورنہ میں اب پھر تجھے بنو اسرائیل کے خداوند کی طرف بلاتا ہوں، اس پر ایمان لا، اور میں اس سے دعا کروں گا کہ وہ تجھے اس قحط کے عذاب سے نجات دے۔" اخی اب نے یہ تجویز منظور کی اور بعل کے بت کو توڑ کر شہر کے باہر پھینکوا دیا۔ خداوند نے حضرت الیاس کی دعا قبول کی اور بارش بھیجی جس سے ملک سیراب اور شاداب ہو گیا۔ مگر حضرت الیاس زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔ یہودیوں کا عقیدہ ہے کہ ایلیاہ[1] ہر وقت چلتے پھرتے رہتے ہیں، ہمہ وقت کسی نہ کسی کام میں مصروف رہتے ہیں، اور نہایت سخی مزاج ہیں۔ وہ ہر جگہ امن اور سلامتی کا پیغام لے جاتے ہیں، کم ہمتوں کو ہمت دلاتے ہیں، جاہلوں کو علم سکھاتے ہیں، حاجت مندوں کی حاجت روائی کرتے ہیں، اور ---- سب سے بڑی بات یہ کہ ایک دن آئے گا جب وہ بنو اسرائیل کی نجات کا ذریعہ ہوں گے۔ اُن کو موت نہیں آئے گی، وہ ہمہ جا حاضر ہیں!!

یہ خیال شاید زیادہ بے جا نہیں ہے کہ مسلمانوں کے عوام نے یہودیوں کے اس جہان گشت پیغمبر کو خضر قرار دے دیا، ایک کو دو شخص میں تقسیم کر دیا ہے۔ مگر اس ضمن میں غالباً سب سے زیادہ افسوسناک امر یہ ہے کہ مسلمان ان اسرائیلی روایات اور واہیات کو بلا تامل اس مخبر صادق ؐ رحمۃ للعالمین ؐ سے منسوب کر دیتے ہیں "جس نے کبھی اپنی من مانی بات مُنہ سے نہیں نکالی!" (قرآن مجید، سورہ النجم، ۳) وائے گر درپس امروز بود فردائی!!

تلمیح کے اس شعبۂ رجال کو ختم کرتے ہوئے پوری جماعت پر بھی ایک نظر ڈال لینا چاہئے جسے حسرت نے قرآن عظیم کی زبان میں "حزب اولیاء" کہا ہے۔

حزبِ اولیاء

لائق حزبِ اولیاء نہ ہوا
وہ جو بے خوف ما سوا نہ ہوا (ص ۵۶)

حق یہ ہے کہ حسرت کا یہ پورا مطلع قرآنی آیات کی طرف تلمیح ہے۔ جیسا کہ ابھی معلوم ہوگا، ہمارے باکمال شاعر نے قرآن کریم کی دو اصطلاحوں کو اپنے مرکب "حزب اولیاء" میں بڑی خوبی سے جمع کر دیا ہے: حزب اللہ اور اولیاء اللہ کلام اللہ میں حزب اللہ کی تعریف اور اس کا بیان یوں ہے: حضرت رسول کریم صلعم سے خطاب ہوتا ہے کہ "جو لوگ اللہ اور آخری وقت پر ایمان رکھتے ہیں، تو انہیں نہ دیکھے گا کہ وہ ایسوں سے دوستی رکھتے ہیں جو اللہ اور اُس کے رسول ؐ کے برخلاف ہیں اگر وہ ان کے باپ بیٹے یا بھائی یا کنبے کے ہی کیوں نہ ہوں۔ ان لوگوں کے دلوں میں اللہ نے ایمان کو مضبوطی سے جما دیا ہے اور اُن کو اپنے فیض سے قوت دی ہے، اور وہ (اللہ) ان کو ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں چلتی ہوں گی، اور جن میں وہ رہیں گے۔ اللہ ان سے خوش ہوگا اور وہ اللہ سے خوش ہوں گے۔ یہی لوگ ہیں اللہ کا گروہ (حزب اللہ)! اور خوب سمجھ لو کہ اللہ ہی کا گروہ زندگی میں کامیابی پانے والا ہے!!" (مجادلہ، ۲۲)

مگر اس "حزب اللہ" کی صفت آپ پر پوری طرح واضح نہ ہوگی جب تک آپ اس کی ضد یعنی "حزب الشیطان" کی تعریف

---

[1] تورات میں یہی نام ہے۔ اہل رائے کا قول ہے کہ اسی (اصلی) نام کا یونانی تلفظ الیاس ہے۔

بھی سُن لیں۔ اسی سورت (کی آیات ۱۴ - ۱۹) میں حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) سے خطاب ہوا ہے: "کیا تو نے ان لوگوں پر نظر نہیں کی جو ایسے لوگوں سے دوستی رکھتے ہیں جن پر اللہ نے غضب کیا ہے۔ یہ لوگ (منافق) نہ تو پوری طرح تم میں ہیں اور نہ اُن ہی میں ہیں، اور جھوٹی بات پر قسمیں کھاتے ہیں ـــ اور اس بات کو وہ خود بھی جانتے ہیں! اللہ نے اُن کے لئے سخت عذاب تیار کر رکھا ہے، کیوں کہ اس میں شک ہی نہیں کہ وہ بُرے بُرے کام کیا کرتے تھے۔ انھوں نے اپنی قسموں کو اپنے بچاؤ کا ذریعہ بنا رکھا ہے پھر اللہ کی راہ سے (لوگوں کو) روکتے رہتے ہیں۔ اس لئے اُن کے واسطے ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔ اُن کے مال اور اُن کی اولاد اُن کو اللہ کے عذاب سے ذرا بھی نہ بچا سکیں گے۔ یہی لوگ آگ میں رہنے والے ہیں اور ... میں رہیں ... جس دن اللہ ان سب کو پھر زندہ کرے گا تو یہ لوگ ... کے سامنے بھی ایسی ہی (جھوٹی) قسمیں کھا جائیں گے جس طرح تمہارے سامنے قسمیں کھا جاتے ہیں اور سمجھیں گے کہ بڑی اچھی طرح ہیں۔ خوب سُن لو کہ یہ لوگ بڑے ہی جھوٹے ہیں، ان پر شیطان نے پورا قبضہ جما لیا ہے اور ان کو اللہ کی یاد بھلا دی ہے۔ یہی لوگ شیطان کا گروہ (حزب الشیطان) ہیں! اور خوب سُن لو کہ شیطان کا گروہ برباد ہونے والا ہے!!"

یہ تو حزب اللہ کی تعریف ہے۔ "اولیاء اللہ" کا ذکر بھی وحی کی زبان نے یوں کیا ہے: صرف تین آیتیں ہیں (سورہ یونس ۶۲ ـــ ۶۴) "خوب سمجھ لو کہ اللہ کے دوستوں (اولیاء اللہ) کے لئے نہ کوئی ڈر ہے اور نہ وہ غمگین ہونگے! یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور ہمیشہ بُرائی سے بچتے رہے۔ اُن کے لئے یہی خوش خبری ہے، اِس وقت کی زندگی میں بھی اور اس کے بعد کے لئے بھی اللہ کی باتوں (وعدوں) میں کوئی فرق نہیں ہوا کرتا، اور یہی (خوش خبری) بڑی کامیابی ہے!"

اللہ کا حزب ایسا ہے، اور اللہ کے اولیاء ایسے ہوتے ہیں کہ ان کو کبھی کسی سے کوئی خوف نہیں ہوتا۔ اب اِس شعر کا پڑھ کے مزہ لیجئے ؎

لائق حزب اولیاء نہ ہوا
وہ جو بے خوف ماسوا نہ ہوا

اِس سلسلے کی صرف ایک چیز ـــ اور وہ بھی "حزب اولیاء" کی تعریف میں ـــ رہی جاتی ہے جس کی طرف حسرت نے بڑے جوش سے تلمیح کی ہے، اور وہ یہ ہے۔

اَعلَون

اَعلَون کی تصدیق اِس پُشت ہی حسرت
مُسلم ہیں تو دب کر نہ رہیں گے بخدا ہم (ص ۲۷۶)

پہلے مصرعے کو "اعلون" (سب سے اونچے درجے کے لوگ) سے شروع کیا تھا، تو کاش کہ ہمارے مولانا دوسرے مصرعے کو بھی بجائے "مسلم" کے قرآنی لفظ "مومن" سے شروع کرتے! مگر میرا کیا مُنہ ہے کہ صلاح دوں، توبہ توبہ! امور شاعری خوش شاعران اند۔

یہ لفظ مبارک قرآن مجید میں دو جگہ وارد ہوا ہے (۱) "اور تم ہمت نہ ہارو، اور رنج مت کرو، اور اگر تم پورے مومن رہے، تو تم ہی سب سے اونچے رہوگے (آل عمران، ۱۳۸)

(۲) "تو تم ہمت نہ ہارو، اور ان (کافروں) کو صلح کی طرف مت بلاؤ۔ اور تم ہی سب سے اونچے رہوگے۔ اور اللہ تمہارے ساتھ ہے، اور تمہارے (اچھے) اعمال کو کم نہیں کرے گا! (محمد، ۳۵)۔

معلوم ہوا کہ "اعلون" ہونے کے لئے "مومن" ہونا شرط ہے۔ رہا یہ کہ مومن قرآن کے محاورے میں کسے کہتے ہیں، سو اس کا بیان کتاب پاک میں جگہ جگہ موجود ہے۔ اس کے علم کے لئے سورۂ مومنون (نمبر ۲۳) کی پہلی چند آیتیں ہی پڑھ لینا کافی ہوگا۔

ان پہلے پہلے "مومنوں" ہی کا ذکر ہے جہاں بہ الفاظ حسرت "دست یزداں" کا ذکر ہوا ہے۔

دستِ یزداں

ملتزم کو جانیے گرنی المثل آغوش حق
سنگِ اسود کو بہ شانِ دستِ یزداں دیکھئے (ص ۳۰۹)

اب یہ دستِ یزداں (اللہ کا ہاتھ) دیکھئے: حضرت داعی الی اللہ صلعم سے خطاب ہے کہ (۱) "بے شک یہ جو لوگ

آپ سے بیعت کر رہے ہیں وہ (اصل میں) اللہ سے بیعت کر رہے ہیں۔ اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں کے اوپر ہے۔ پھر جو کوئی یہ عہد توڑنے کے بعد اسے توڑے گا اس کا وبال اسی پر پڑے گا' اور جو کوئی اپنے اس عہد کو پورا کرے گا' اللہ اسے جلد ہی بڑا اجر دے گا (فتح ۱۰) (۲) ".... کہہ دیجئے تمام ہر طرح کا فضل اللہ کے ہاتھ (قبضے) ہی میں ہے۔ وہ اسے جس کو چاہتا ہے دیتا ہے اور اللہ بڑی وسعت والا اور بہت جاننے والا ہے' اور اپنی رحمت جس کے لئے چاہتا ہے خاص کر دیتا ہے" (آل عمران' ۷۳) (۳) "...... بے شک سب طرح کا فضل اللہ کے ہاتھ میں ہے' وہ اسے جس کو چاہتا ہے دیتا ہے' اور وہ بڑے فضل والا ہے" (حدید' ۲۹)۔ یہودی لوگ اللہ کو طعنے دیا کرتے تھے: (۴) "یہودی لوگ کہتے ہیں کہ اللہ کا ہاتھ بند ہے۔ انہیں کے ہاتھ بند ہیں' اور ایسا کہنے کے کارن وہ رحمت سے راندے گئے ـــــ بلکہ اللہ کے ہاتھ تو دونوں کھلے ہوئے ہیں' وہ جس طرح چاہتا ہے خرچ کرتا ہے" (مائدہ' ۶۷)

اور یہ ہاتھ اس کا ہے جو "نور ارض و سما" بلکہ "نور بالائے نور" ہے:

نور ارض و سما

نور ارض و سما کو ناز یہ ہے
کہ تری شکل میں ظہور کیا (ص ۱۴۹) اور

نور بالائے نور' علیٰ نور

پھر نہ کیوں وصل حسن و عشق سے ہو
نور بالائے نور جلوہ نما (ص ۱۶۰)

کھنچ گئی نور علیٰ نور کی تصویر جمیل
بعد کعبے کے جو آنکھوں نے مدینا دیکھا (ص ۲۷۰)

ان دونوں نوروں کو قرآن مجید کی ایک ہی آیت (سورہ نور' ۳۵) میں دیکھئے: "اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ اس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے ایک طاق ہے' اور اس میں ایک چراغ ہے' اور وہ چراغ ایک شیشے کی قندیل میں ہے' اور وہ شیشہ ایسا (صاف شفاف) ہے جیسے ایک چمکتا ہوا ستارہ ہو' اور وہ (چراغ) ایک بڑے مفید درخت (کے تیل) سے روشن کیا جاتا ہے ـــــ زیتون سے ـــــ جو نہ مشرق کی طرف ہے اور نہ مغرب کی طرف ہے' اور اس کا تیل ایسا ہے کہ اگر اسے آگ بھی نہ چھوئے تب بھی معلوم ہوتا ہے کہ خود بخود روشن ہو جائے گا (اور روشن ہو گیا تو پھر) روشنی کے اوپر روشنی (نور علیٰ نور) ہی روشنی ہے۔ اللہ اپنے نور تک جس کو چاہتا ہے راہ دکھاتا ہے۔ اور اللہ لوگوں (کی ہدایت) کے لئے یہ مثالیں بیان کرتا ہے' اور اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے!"

کچھ ایسا ہی "جلوۂ حق" تھا بقول حسرت:

جلوۂ حق سے بے خبر زاہد
محو تسنیم و سلسبیل ہیں سب (ص ۶۴) جو "جلوۂ طور" اور "تجلی طور" بنکر حضرت موسیٰ کو نظر آیا تھا۔

جلوۂ طور

نظر آتا ہے پیش رُوی حضور
اہل بینش کو نور جلوۂ طور (ص ۲۶۴) اور

تجلی طور

تجلی طور پر جس نور کی دیکھی تھی موسیٰ نے
ہمیں بھی اک جھلک اُس کی دکھا دو یا رسول اللہ (ص ۲۲۰)

اس کا حال پہلے توراۃ کے مصنف سے سُنیئے: "اور موسیٰ اپنے سسر یترو کے' جو مدیان کا کاہن تھا' گلّے کی نگہبانی کرتا تھا۔ تب اُس نے گلّے کو بیابان کی ایک طرف ہانک دیا' اور خدا کے پہاڑ حورب کے نزدیک آیا۔ اس وقت خداوند کا فرشتہ ایک بوٹے میں سے آگ کے شعلے میں اس پر ظاہر ہوا۔ اُس نے نگاہ کی تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک بوٹا آگ میں روشن ہے اور وہ جل نہیں جاتا۔ تب موسیٰ نے کہا کہ میں اب نزدیک جاؤں اور اس بڑے منظر کو دیکھوں کہ یہ بوٹا کیوں نہیں جل جاتا۔ جب خداوند نے دیکھا کہ وہ دیکھنے کو نزدیک آیا' تو خدا نے اسے بوٹے کے اندر سے پکارا اور کہا کہ "اے موسیٰ اے موسیٰ! وہ بولا: میں یہاں ہوں' تب اس نے کہا: یہاں سے نزدیک مت آ۔ اپنے پاؤں سے جوتا اُتار' کیونکہ

یہ جگہ جہاں تو کھڑا ہے مقدس زمین ہے۔ پھر اس نے کہا کہ میں تیرے باپ کا خدا اور ابرہام کا خدا اور اضحاق کا خدا اور یعقوب کا خدا ہوں۔ موسیٰ نے اپنا منہ چھپایا، کیوں کہ وہ خدا پر نظر کرنے سے ڈرتا تھا۔" (خروج : ۳ ''۱ — ۶)

قرآنِ مبین کا بیان ہے: (۱) حضرت محمد صادق صلعم سے خطاب ہے: کیا آپ کو موسیٰ کی خبر پہنچی ہے، جب کہ اس نے ایک آگ دیکھی اور اپنے گھر والوں سے کہا: تم لوگ ٹھیرے رہو، میں نے آگ دیکھی ہے، شاید اس میں سے تمہارے پاس کوئی انگارا لا سکوں یا آگ کے پاس رستے کا پتا مجھے مل جائے۔ سو جب وہ اس (آگ) کے پاس پہنچا، تو اُسے پکارا گیا: اے موسیٰ! میں تیرا رب ہوں، پس تو اپنے جوتے اُتار ڈال، کیوں کہ تو طویٰ کی پاک وادی میں ہے۔ اور میں نے تجھے چُن لیا ہے، تو اب جو کچھ تجھے وحی کی جاتی ہے اُسے سُن: بے شک میں ہی اللہ ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں ہے، تو تو میری ہی عبادت کر اور میری ہی یاد کے لئے صلوٰۃ قائم کر۔" (طٰہٰ ۹ — ۱۴) (۲) "یاد ہے جب موسیٰ نے اپنے گھر والوں سے کہا کہ میں نے آگ دیکھی ہے، میں ابھی جا کر وہاں سے یا تو (راستے کی) کوئی خبر لاتا ہوں یا تمہارے پاس انگارے کا شعلہ لاؤں گا کہ تم سینکو۔ تو جب وہ اس (آگ) کے پاس پہنچا تو اُسے پکارا گیا کہ برکت ہو اس پر جو اس آگ کے اندر ہے اور اُس پر جو اس کے پاس ہے، اور رب العالمین پاک ہے۔ اے موسیٰ! بات یہ ہے کہ میں ہی اللہ ہوں، غالب اور حکمت والا...." (نمل، ۷ — ۹) (۳) "غرض کہ جب موسیٰ اس مدت کو پورا کر چکا اور اپنی بی بی کو لے کر چلا تو اس نے طور کی طرف سے آگ دیکھی۔ اُس نے اپنے گھر والوں سے کہا کہ تم لوگ ٹھیرے رہو، میں نے کچھ آگ دیکھی ہے، شاید میں وہاں سے تمہارے لئے (راستے کی) کچھ خبر لاؤں یا کوئی دہکتا ہوا انگارا لے آؤں تاکہ تم سینکو۔ تو جب وہ اُس (آگ) کے پاس پہنچا تو اُسے اس وادی کی داہنی طرف سے اس مبارک سرزمین میں ایک درخت میں سے آواز سُنائی دی کہ: اے موسیٰ! میں ہی تو اللہ رب العالمین ہوں...." (قصص، ۲۹، ۳۰) (۴) "اور جب موسیٰ ہمارے مقرر کئے ہوئے وقت پر آیا، اور اُس کے رب نے اُس سے باتیں کیں، تو اس نے کہا: اے میرے رب! تو مجھے دکھا دے کہ میں تجھے ایک نظر دیکھ لوں۔ اس نے کہا: تو مجھے ہرگز نہ دیکھ سکے گا۔ (لن ترانی) لیکن اس پہاڑ کی طرف دیکھ۔ تو اگر یہ اپنی جگہ پر قائم رہا تو (خیر) تو بھی دیکھ سکے گا۔ غرض کہ جب اس کے رب نے پہاڑ پر تجلی کی تو اس پہاڑ کے پرخچے اُڑا دیئے، اور موسیٰ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ پھر جب وہ ہوش میں آیا تو اُس نے کہا: تو پاک ہے! میں نے تیری طرف توبہ کی، اور میں سب سے پہلے یقین کرنے والوں میں سے ہوں۔ اس نے کہا: اے موسیٰ! میں نے سب لوگوں میں سے تجھے چُن لیا، اپنے پیغام اور کلام کے لئے۔ اب جو کچھ میں نے تجھے دیا وہ لے لے اور شکر کرنے والوں میں سے ہو۔" (اعراف ۱۴۳، ۱۴۴)

یہ تھی تجلی طور! مگر ہمارے واعظین[1] کرام نے جو سُرمہ طور کے پتھروں کا بنا کے بریلی کے بازاروں میں فروخت کر کے چشم خریدار پہ احسان فرمانے کا بندوبست کر رکھا ہے، اس سُرمے کا کہیں کسی روایت میں پتا نہیں چلتا۔ حضرات شعرائے عظام نے بھی برخوردارانہ سرِ تسلیم خم کر کے سرمۂ طور سے اپنے سخن کی بصارت افزائی کے لئے صدیوں سے استعمال کر رکھا ہے۔ مولانا حسرت بھی اس سنت کو سالک ہیں:

سرمۂ طور میں کہاں وہ اثر
دستِ شرب کے جو غبار میں تھا (ص ۴۵) اور
نہ ملے اگر ملا نہ سرمۂ طور
کیا تری خاک رہ گزر بھی نہیں (ص ۱۵۲)

رہی مولانا کی "کوہ طور کی بات":

میں دل کی آنکھ سے دیکھوں نہ چشمِ سر سے انہیں
کہ پھر نہ پیشِ نظر ہو وہ کوہ طور کی بات (ص ۱۳)

اُس کا حال آپ ابھی "تجلی" کے بیان میں سُن چکے، مزید تفصیل

---

[1] اصل میں یہی حضرات افسانچوں کے موجد ہیں۔ ترقی پسند ادیبوں نے ناحق ہی تولستائی اور چیخوف اور موپاساں (اور نہ معلوم کس کس کو) اپنا امام بنا رکھا ہے۔ (رجعت پسند ریا پرست) ادیب اگر حضرات واعظین کے افسانچوں کو قلمبند کر کے دہلی کے ساقی اعظم کی وساطت سے زیرِ اشاعت فرمادیں تو دورِ حاضر کے معرکہ میں ان کی فوزِ عظیم یقینی ہے!

گھٹنے وہی حوالے، ذیل میں ملاحظہ ہوں۔

اور اسی کے ضمن میں "لن ترانی" بھی آپ نے سُن لی، جیسے مولانا نے "دعوی" فرمایا ہے:

شوق قائل جو ہو تو دے نہ جواب
ان سے کے دعوائے لن ترانی کا (ص ۵۷)

اب ہم تلمیحات کی دوسری صنف، یعنی نباتات و حیوان کے ذکر میں آتے ہیں۔ اس صنف میں حسرت نے صرف من و سلوی کا ذکر کیا ہے۔

مَنّ و سَلویٰ

من و سلوی سے بھی ہے بہتر گراں ہے
یا رسول اللہ ترے در پہ ہمیں نانِ جویں (ص ۳۹)

توریت کی کتاب خروج میں ہے کہ "خداوند نے موسیٰ سے کہا: میں نے بنی اسرائیل کا جھنجھلانا نہیں سُنا۔ انہیں کہہ کہ تم درمیان زوال او غروب کے گوشت کھاؤ گے اور صبح کو روٹی سے سیر ہوگے، اور تم جانوگے کہ میں خداوند تمہارا خدا ہوں۔ اور یوں ہوا کہ شام کو بٹیریں اوپر آئیں اور پڑاؤ کو چھپا لیا، اور صبح کو لشکر کے آس پاس اوس پڑی، اور جب اوس پڑچکی تو کیا دیکھتے ہیں کہ بیابان میں ایک چھوٹی چھوٹی گول چیز، ایسی سفید جیسے برف کا چھوٹا ٹکڑا، زمین پر پڑی ہے۔ اور بنی اسرائیل نے دیکھ کے آپس میں کہا کہ مَنّ ہے کیونکہ اُنھوں نے نہ جانا کہ وہ کیا ہے۔ تب موسیٰ نے انہیں کہا کہ یہ روٹی ہے جو خداوند نے کھانے کو تمہیں دی ہے۔ یہ وہ بات ہے جو خداوند نے تمہیں فرمائی تھی، ہر ایک اس میں سے بقدر اپنے کھانے کے آدمی پیچھے ایک اُومر جمع کرے، ہر ایک اپنے لوگوں کا شمار کرکے اُن کے لئے جو اس کے خیمے میں ہیں لے۔ چنانچہ بنی اسرائیل نے یوں ہی کیا...." (باب ۱۶، آیات ۱۱-۱۷) اس کے بعد یہ حکم مذکور ہے کہ کوئی زیادہ نہ لیا کرے، اور یہ کہ سبت کے دن مَنّ نازل نہیں ہوتا تھا مگر اس سے ایک دن پہلے دو دن کا حصّہ نازل ہوا کرتا تھا۔ "اور بنی اسرائیل چالیس برس تک جب تک کہ وہ بستی میں آئے مَنّ کھاتے رہے۔ جب تک کہ وہ زمین کنعان کی نواحی میں آئے مَنّ کھاتے رہے۔" (آیت ۳۵) کتاب گنتی میں ہے کہ "اور بعضوں نے اجنبی قوموں سے جو ان میں ملے ہوئے تھے حرص سے خواہش کی، اور بنی اسرائیل بھی پھرے اور روئے اور بولے: کون ہے جو ہمیں گوشت کھانے کو دے گا؟ ہم کو وہ مچھلی یاد آتی ہے جو ہم مفت مصر میں کھاتے تھے اور وہ کھیرے اور وہ خربوزے اور وہ گندنا اور وہ پیاز اور وہ لہسن۔ پر اب تو ہماری جان خشک ہو چلی، یہاں تو ہماری آنکھوں کے سامنے کچھ بھی نہیں مگر یہ مَنّ۔ اور مَنّ سوکھے دھنیے کی مانند تھا اور اس کا رنگ موتی کے دانے کا سا تھا۔ لوگ اِدھر اُدھر جاکر اسے جمع کرتے تھے اور چکی میں پیستے تھے یا اوکھلی میں کوٹتے تھے اور توؤں پر پکاتے تھے اور پھلکیاں بناتے تھے۔ اس کا مزہ تازہ تیل کا سا تھا۔ اور رات کو جب خیموں پر اوس پڑتی تھی تو مَنّ بھی ان پر پڑتا تھا۔" (باب ۱۱، آیت ۴-۹) اس کے بعد کتاب استثنا (باب ۸، آیت ۳) اور کتاب نحمیاہ (باب ۹، آیت ۲۰) میں خدا کے اس فضل و کرم کا ذکر ہے کہ اس نے بنو اسرائیل کو مَنّ کی سی نعمت دی۔ پھر زبور کے باب ۷۸ میں بھی یہی کہا ہے کہ خدا نے بنو اسرائیل پر "مَنّ" برسایا کہ کھائیں اور اُن کو آسمانی غلّہ بخشا۔ ایک ایک نے امیروں کی غذا کھائی۔ اس نے انھیں خوراک بھیج کر آسودہ کیا ... اور اس نے ان پر خاک کی مانند گوشت اور دریا کی ریت کی مانند پردار مرغ برسائے۔ اور اس نے انہیں ان کے خیموں کے بیچ میں اور ان کے مسکنوں کے آس پاس گرایا۔ سو انھوں نے کھایا اور خوب سیر ہوئے۔" (آیات ۲۴-۲۹) انجیل میں بھی یوحنا (باب ۶، آیت ۳۱ اور ۴۹) میں مَنّ کا ذکر ہے۔

فرقانِ حمید میں، اس کے دستور کے مطابق، ان سب باتوں کی اتنی تفصیل نہیں ہے، مگر تین جگہ مَنّ اور سلویٰ (بٹیر) کا ذکر آیا ہے: (۱) یہودیوں کو یاد دلایا جاتا ہے کہ "ہم نے تمہارے اوپر بادلوں کا سایہ کیا، اور تمہارے لئے مَنّ اور بٹیریں بھیجیں۔ کھاؤ نفیس چیزوں سے جو ہم نے تم کو دی ہیں" (البقرہ، ۵۷) پھر اسی سورت میں یہودیوں کو ان کی یہ بے جا حرکت اور ضد یاد دلائی کہ "جب تم لوگوں نے کہا کہ اے موسیٰ! ہم (ہر روز اس) ایک

ہی قسم کے کھانے پر ہرگز نہ رہیں گے۔ تو ہمارے لئے اپنے رب سے دعا کر کہ وہ ہمارے لئے ایسی چیزیں پیدا کرے جو زمین سے اُگتی ہیں، جیسے ساگ اور ککڑی اور گیہوں اور مسور اور پیاز۔ موسیٰ نے کہا: کیا تم ایسی چیزوں کے عوض میں جو اچھی ہیں ادنیٰ درجے کی چیزیں لینا چاہتے ہو؟ اچھا، تو کسی شہر میں جا اُترو، وہاں تمہیں وہ چیزیں ملیں گی جو تم مانگتے ہو (آیت ۶۱)

(۲) یہودیوں کے ذکر میں فرمایا ہے کہ "...... اور ہم نے ان پر بادلوں کا سایہ کیا اور ان کے لئے منّ اور بٹیریں بھیجیں۔ کھاؤ ان نفیس چیزوں میں سے جو ہم نے تمہیں دی ہیں"۔ (اعراف، ۱۶۰) (۳) "اے بنو اسرائیل! ہم نے تمہیں تمہارے دشمنوں سے بچایا، اور تم سے طور کی داہنی طرف (آنے) کا وعدہ کیا، اور تمہارے لئے منّ اور سلویٰ بھیجے کھاؤ جو نفیس چیزیں ہم نے تم کو دی ہیں، اور اس کے کھانے میں حد سے باہر نہ نکلو، کہیں میرا غضب تم پر پڑے! اور دیکھو کہ جس پر میرا غضب ٹوٹا بس وہ گیا گذرا ہوا!" (طٰہٰ، ۸۰ - ۸۱)

یہ ہے منّ و سلویٰ کی حقیقت اور کیفیت جو توراۃ، زبور، انجیل اور قرآن کریم سے معلوم ہوتی ہے۔ توراۃ کی آیت سے اس کی ماہیت بھی معلوم ہو گئی۔ اہل علم نے منّ کے بارے میں یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ ترنجبین یا شیر خشت کی قسم کی کوئی چیز تھی، اور سلویٰ تو خیر بٹیر چڑیا کا نام ہے۔ منّ کے بارے میں یہودیوں کے یہاں اور بھی لطیف روایتیں ہیں، مگر اس مختصر میں اُن کے بیان کی سمائی کہاں!

اب وقت ہے کہ جناب حسرت کی ان تلمیحات کا مطالعہ کیا جائے جو مقامات، مکانات اور زمین کی طبعی اشکال سے متعلق ہیں۔ سب سے پہلے طور ہی کو لیجئے، کہ اس کے متعلقات کا ذکر ابھی ذہن میں تازہ ہی ہے۔

طور

دل بھی پابندِ تمنّا ہے اسی دیدار کا
طور پر جو نور چمکا تھا جمالِ یار کا (ص ۲۶۹)

اور اسی کے ساتھ وہ اشعار بھی ذہن میں رکھیئے جو اس سے قبل جلوۂ طور، تجلّی طور اور سرمۂ طور کے متعلق تھے)

عربی زبان اور محاورے میں لفظ طور کے معنی پہاڑ کے ہیں۔ یوں ایران اور ہند کے عجمیوں کا "کوہ طور" کہنا بالکل ویسا ہی ہے جیسے حیدر آباد دکن (صانہا اللہ عن الفتن) کے لوگ اپنے شہر کے نواح کی ایک پہاڑی کو "کوہ مولا علی کا پہاڑ" کہتے ہیں۔ اس معروف پہاڑ کا اصلی نام سَیناء (س کے زبر سے، آخر میں ہمزہ کے ساتھ) ہے، گو عرب لوگ سِیناء (س کے زیر سے) بھی بولتے ہیں۔ ہمارا ہندی تلفظ سِینا (س کے زیر سے اور بغیر ہمزہ کے) اصل میں اس عربی نام کا یونانی تلفظ ہے۔ عبرانی (لہذا توراتی) تلفظ سینیٰ ہے، جس سے دوسرا عربی تلفظ سِینِین بنا ہے۔ عرب کے ایک محاورے میں شام کے پورے ملک کو بھی طور کہتے ہیں۔

قرآن مجید میں لفظ طور دس جگہ وارد ہوا ہے[۱] جن میں سے ایک جگہ طور سیناء آیا ہے[۲] اور ایک جگہ طور سینین[۳] ہے۔

طور سیناء اُس چھوٹے سے جزیرہ نما کے تقریباً وسط میں واقع ہے جو بحر احمر کی دو شاخوں کے درمیان پھیلا ہوا ہے۔ اس میں سرخ اور بھولے رنگ کے پتھروں کے پہاڑ ہیں، اور یہ جزیرہ نما سطح بحر سے آٹھ اور نو ہزار فٹ تک کی بلندی لئے ہوئے ہے۔ اس کی عمومی شکل یہ ہے کہ اس کے پہاڑ باقاعدہ سلسلے اور چوٹیوں کی صورت میں نہیں ہیں، بلکہ وہ ایک سطح مرتفع ہے جس میں ان گنت وادیاں اور جگہ جگہ چوٹیاں ہیں۔ ان کو تین بڑے گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: (۱) شمال مغربی سمت کا حصّہ جس میں فیران کی وادی ہے اور جو سمندر کی سطح سے سوا چھ ہزار فٹ اونچا ہے۔ (۲) وسطی اور مشرقی حصّہ جس کا

---

[۱] بقرۃ ۶۳، ۹۳، نساء ۱۵۴، مریم ۵۲، طٰہٰ ۸۰، مومنون ۲۰، قصص ۲۹، ۴۶، طور ۱، تین ۲۔ آٹھ جگہ محض طور نہیں بلکہ الطور ہے یعنی وہ مخصوص پہاڑ۔ [۲] مومنون، ۲۰ میں [۳] التین، ۲ میں یہاں یہ بھی عرض کرنے کو جی چاہتا ہے کہ اس سورت کے شروع میں جو تین اور زیتون کا ذکر ہے اس سے انجیر اور زیتون (پھل) مراد نہیں ہیں بلکہ یہ دونوں پہاڑوں کے نام ہیں!

سب سے اونچا پہاڑ کاثرین سمندر سے آٹھ ہزار فٹ سے کچھ زیادہ بلندی پر ہے۔ اسی میں وہ پہاڑ ہے جسے جبل موسیٰ کہتے ہیں اور جو تقریباً سات ہزار فٹ (سطح بحر سے) بلند ہے۔ (۳) جنوب مشرقی حصہ جس کی سب سے اونچی آم شومر ہے۔ کاثرین موسیٰ اور ام شومر کو اگر ایک خط سے ملایا جائے تو یہ سب ۹ میل کے اندر اندر ہیں۔ اس خط کے عمود (تقریباً بیس میل تک) سے اس جزیرہ نما کا بلند ترین علاقہ بنتا ہے اور اسی کے شمال میں تیہ کا علاقہ ہے، جہاں موسائی قوم چالیس برس تک رہی۔ توریت میں طور سینا کا ذکر کئی جگہ ہے[1]:

(۱) "اور اس نے کہا کہ خداوند سینا سے آیا..." (استثنا) (۲) "پہاڑ خداوند کے آگے پگھلے، اور کوہ سینا بھی خداوند اسرائیل کے خدا کے آگے" (قاضیوں) (۳) "اور بنی اسرائیل زمین مصر میں سے باہر ہوکے تیسرے مہینے اسی دن سینا کے بیابان میں آئے" (خروج) (۴) مختلف قسم کی قربانیوں[2] کے نام گنوا کر فرمایا ہے کہ یہ وہی حکم ہے "جو کوہ سینا پر خداوند نے موسیٰ کو کیا تھا جس دن کہ بنی اسرائیل کو فرمایا کہ سینا کے بیابان میں خداوند کے لئے اپنی قربانیوں کو گذاریں" (احبار) (۵) "جب مصر کی زمین سے بنی اسرائیل نکلے تب دوسرے برس کے دوسرے مہینے کی پہلی تاریخ سینا کے بیابان کے بیچ جماعت کے خیمے میں خداوند نے موسیٰ کو خطاب کرکے فرمایا...." (گنتی) احبار کی کتاب کا بالکل آخری فقرہ (باب ۲۷: ۳۴) ہے کہ "وہ احکام جو خداوند نے بنی اسرائیل کے لئے کوہ سینا پر موسیٰ کو فرمائے یہ ہیں"

---

[1] (۱) کتاب استثنا، باب ۳۳: ۲ (۲) قاضیوں باب ۵: ۵ (۳) خروج باب ۱۹: ۱ (۴) احبار باب ۷: ۳۸ (۵) گنتی باب ۱: ۱۔ [2] کتاب احبار توریت کی کتابوں (صحیفوں) میں سے تیسری ہے۔ اس کے ۲۷ باب ہیں جن میں کھانے کی حلال و حرام چیزوں اور قربانیوں کا ذکر ہے۔ کئی طرح کی قربانیاں ہیں جن کا خلاصہ اس کتاب کے ساتویں باب کے آخر میں آتا ہے: سوختنی قربانی کا اور نذر کی قربانی کا اور خطا کی قربانی کا اور تقصیر کی قربانی کا اور ساحت کا اور سلامتی کے ذبیحے کا حکم یہی ہے جو کوہ سینا پر خداوند نے موسیٰ کو کیا تھا۔" مسلمان اسرائیلوں کے کیوں پیچھے رہتے، انھوں نے بھی حج بیت اللہ کو زمانے میں...

بیستون اور جُوئے شیر

شوق کی تاثیر سے گریاں جو ہر دہ سنگدل
جُوئے شیر اک طرفہ پیدا ہو میانِ بیستون (ص ۱۳۰)

بیستون، بغداد[1] سے ہمدان جانے والی سڑک پر قصبہ کرمان شاہ سے بیس میل کے فاصلے پر ایک پہاڑ ہے۔ قدیم عربی مصنف اسے بَغِستان (غ کے زبر سے اور زیر سے، دونوں طرح) لکھتے ہیں۔ بَغ کے معنی "خدا" کے ہیں، اس لئے بغستان خانۂ خدا ہوا۔ اسی بغستان سے بہستان، پھر بہستون اور آخر میں (آج کل) بیستون بن گیا ہے۔ چوٹی کے قریب ایک غار کے پاس دارائی اعظم کی ایک فتح کی یادگار اور دامن کے قریب گودرز کی یادگار اب بھی موجود نظر آتی ہے۔ اس پہاڑ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ شمال مغربی ایران کا سب سے زیادہ خوبصورت پہاڑ ہے۔

جُوئے شیر کے نام ہی سے عیاں ہے کہ اس کو شیریں سے کچھ نسبت ہے، جو ایران کے قدیم بادشاہ خسرو پرویز کی ملکہ تھی۔ خسرو، اپنے باپ کے سالار فوج بہرام چوبین کو (جس نے ملک دبا لیا تھا) شکست دے کر اور قتل کر کے ۵۹۱ء میں ایران کا بادشاہ ہوا تھا، اس کی ملکہ شیریں کے بارے میں یہ قیاس غالباً صحیح ہے کہ وہ موریس (شاہِ یونان) کی بیٹی تھی، اس کا اصلی نام ایرین تھا، جس کی ایرانی شکل شیریں ہو گئی تھی۔ خسرو نوشیرواں کے خاندان کی شان و شوکت خسرو پرویز ہی پر ختم ہو گئی، جب اس کا بیٹا شیرویہ اپنے ۱۸ بھائیوں اور باپ کو ۶۲۸ء میں قتل کرا کے خود تخت نشین ہوا، مگر خود بھی آٹھ مہینے سے زیادہ بادشاہی سے لطف اندوز نہ ہو سکا۔ یہی وہ خسرو ہے جس کے نام سرکار رحمۃ للعالمین صلعم نے عطوفت نامہ اور پیغام اسلام بھیجا تھا، اور یہی وہ بدنصیب ابدی تھا جس نے اس رحمت نامے کی توہین کی پاداش میں خود کو

---

[1] بغداد (بَغ داد) میں بھی یہی بَغ ہے۔ "مولوی صاحب" لوگ جو اس نام کو "باغِ داد" بتایا کرتے ہیں یہ خاص انہیں کے دماغ کا ثمر داغ دار ہے، اور بس۔

کتب خانہ جامعہ ملیہ اسلامیہ

نیست کیا، مگر اپنے ملک کو رحمۃ للعالمین عربوں کیلئے چھوڑ گیا۔

شیریں او خسرو، اور شیریں اور فرہاد کے معاشقے کے افسانوں سے فارسی، ترکی اور اردو شعراء کے دیوان بھرے پڑے ہیں۔ شیریں خسرو کی باہمی محبت تو جائے عجب نہیں ہے؛ البتہ شیریں اور فرہاد کے افسانۂ محبت میں کافی شیرینی ہے۔ قصہ صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ شاہی حکم سے کوئی نہر کھودی جا رہی تھی جو بہستان کی پہاڑیوں میں سے گذرتی تھی۔ کھدائی کے کام پر کوئی مزدور تھا جس کا نام فرہاد تھا۔ ایک روز بادشاہ اور ملکہ معائنہ کے لئے وہاں تشریف لے گئے۔ فرہاد ملکہ کو دیکھتے ہی "ہزار جان سے" عاشق اور متوالا ہو گیا۔ اتمام محبت یوں ہوا کہ کم بخت عاشق نے جان دی۔ بس اسے افسانہ کر دیا!

بیت الحزن

فرقت میں ان کی بوئے گل اے بادِ نوبہار
آئے بھی تو ہے مرے بیت الحزن سے دور (ص ۶۸) او۔

جلوۂ جاناں سے ہے دار السرور
خانۂ جاں اب نہیں بیت الحزن (ص ۱۷۱)

قرآنِ عظیم میں حضرت یوسف عم کے قصے میں ان کے والد کریم حضرت یعقوب عم کا اپنے عزیز فرزند کے فراق میں غم والم سے جو بُرا حال ہو رہا تھا اس کا نقشہ ان جامع الفاظ میں کھینچا گیا ہے: "...... اس نے کہا: ہائے رے یوسف! اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، اور وہ غم (حزن) سے گھٹنے لگا۔ (گھر والے) کہنے لگے: اللہ کی قسم، تو (یعقوب ع) ہمیشہ یوسف ہی کو یاد کرتا رہے گا۔ یہاں تک کہ تو کمزور یا ہلاک ہو جائے۔ (یعقوب ع نے) کہا: میں تو اپنے رنج و غم (حزن) کی صرف اللہ سے شکایت کرتا ہوں، اور اللہ کی باتوں کو جتنا میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔" (یوسف، ۸۴-۸۶) یوں حضرت یعقوب عم کا گھر جس میں رہتے ہوئے انھیں اس جاں کاہ غم (حزن) سے واسطہ پڑا تھا، بیت الحزن یعنی غم کا گھر کہلانے لگا، اور اللہ کے مومن بندوں کو ایک شاداب مضمون مل گیا۔

بیت الحرام

حاصل حسرت یہ سفر ہو مدام
بیت نبی سے سُوئے بیت الحرام (ص ۲۶۵)

صحیح عربی میں البیت الحرام ہے، نادان عجمیوں نے بیت الحرام کر دیا۔ اس کے معنی ہیں وہ گھر جسے اللہ نے قابل احترام بنایا ہے، اور یہ وہی ہے جسے عام طور پر بیت اللہ شریف اور خانہ کعبہ کہتے ہیں)۔ قرآنِ مجید میں صرف ایک جگہ اسے بیت الحرام کہا ہے، اور اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کعبے کا دوسرا نام ہے: "اللہ نے کعبے کو حرمت والا گھر بنایا اور لوگوں کے قائم رہنے کا سبب بنایا ." (مائدہ، ۱۰۰)، اسی کو ایک جگہ البیت الحرم فرمایا ہے، جہاں حضرت ابراہیم عم اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہیں اور فرماتے ہیں: "اے ہمارے رب! میں اپنی اولاد کو تیرے حرمت والے گھر کے قریب ایک میدان میں، جو کھیتی باڑی کے قابل نہیں ہے، آباد کرتا ہوں،...." (ابراہیم، ۳۷) یہ دُنیا میں سب سے پہلا گھر ہے[1] جو ساری دُنیا سے آنے والے لوگوں کے لئے بنایا گیا ہے (آل عمران ۹۶، اسی کا ایک اور نام البیت العتیق (یعنی قدیم گھر) بھی ہے جیسا کہ سورۂ حج کی آیات ۲۹، ۳۳ میں مذکور ہے اس کو محض البیت[2] (خاص گھر) بھی فرمایا ہے، اور بیتی[3] (میرا گھر) بھی۔

خیف، عرفات، مزدلفہ، منا

پھر مسجد خَیف میں پہنچ ؛ حظ کیف صلوٰۃ کا اٹھایا
مژدہ عرفات نے پھر اک بار ؛ غفران ذنوب کا سُنایا
مزدلفہ کی راہ سے منا تک
پھر شوق طواف کھینچ لایا (ص ۲۶۲)

(۱) خَیف ایسی جگہ کو کہتے ہیں جو پہاڑ کے دامن میں ڈھلوان

---

[1] اقبال لاہوری: "دُنیا کے بتکدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا"۔ [2] بقرہ، ۱۲۵، ۱۲۷، ۱۵۸، آل عمران، ۹۷، مائدہ ۳، حج ۶، قریش ۳۔ [3] بقرہ، ۱۲۵، حج ۲۶۔

[5] اس موقعہ پر عام اور متداول ترجمہ کیا جاتا ہے: "غم سے اس (یعقوب ع) کی آنکھیں سفید ہو گئیں"۔ شاعروں کو موقعہ ہاتھ آیا، خوب خوب افسانے بنا ڈالے۔ دلّی والے غالب نے زندانِ یوسف کیلئے دیدۂ یعقوب ہی سے سفیدی پھیرنے کا سامان کر دیا تھا! سچ ہے، فی کل وادٍ یہیمون!!

ہو اور پانی کے بہنے کی جگہ سے اونچی ہو۔ منیٰ کی مسجد کو مسجد الخیف کہتے ہیں۔ شہر مکّہ کے قریب جو نشیب کی زمین پہاڑ کے دامن میں ہے وہ خیف ہے۔ خیف بنی کنانہ ایک مقام ہے جہاں ایک مرتبہ حضور نبی کریم نے بھی نزول اور قیام فرمایا تھا۔ اسی طرح خیف سلّام (یا سَلام)، خیف الحمیرا، خیف الخیل، خیف ذی القبر، خیف النعم بھی مختلف مقاموں کے نام ہیں۔

(۲) عرفات، مکّہ سے بارہ میل پر ایک مقام ہے جہاں بیت اللہ کے حاجی عرفہ (یعنی ذوالحجہ کی نویں تاریخ) کو ٹھیرتے ہیں۔ عرفات کے نام کے لئے مختلف وجہیں بتائی جاتی ہیں، جو بہت دلچسپ ہیں: (الف) یہ وہ جگہ ہے جہاں حضرت جبریل عم نے حضرت ابراہیم عم کو حج کے قاعدے بتائے تھے، اور اس دوران میں جب وہ انھیں عرفہ پر لے کے پہنچے تو اُن سے پوچھا "تم نے یہ سب پہچان لی (عرفت)" انھوں نے کہا ہاں۔ اس لئے اس جگہ کا نام عرفہ (عرفات) ہوگیا۔ (ب) یہ وہ جگہ ہے جہاں آدم و حوا عم جنت سے نکل کر جدا ہونے کے بعد آپس میں ملے تھے اور ایک دوسرے کو پہچانا تھا (تعارفا) (ج) یہ وہ جگہ ہے جہاں لوگ اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں (د) وہاں تک پہنچنے میں لوگ صبر کرتے اور تکلیف اُٹھاتے ہیں، عُرف کے معنی صبر کے ہیں۔ اس لفظ (عُرف) کے بارے میں یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ عُرف عربی میں ہر اونچی اور اُٹھی ہوئی جگہ کو کہتے ہیں۔ اس کی جمع اَعراف ہے، اور یہی اَعراف قرآنِ مجید میں مذکور ہے[1]

(۳) مُزدَلِفہ[2] وہ جگہ ہے جہاں حاجی لوگ رات بسر کرتے ہیں اور عرفات سے نکل کر وہاں باجماعت نماز ہوتی ہے۔ یہ مقام "مشعر حرام" شمار ہوتا ہے۔ امام وہاں عشاء، مغرب اور فجر کی صلوٰۃ ادا کراتا ہے۔ اس مقام کی وجہ تسمیہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہیں: (الف) اِزدِلاف کے معنی ہیں اکٹھا ہونا۔ یہاں سب جمع ہوتے ہیں اس لئے مزدلفہ نام ہوا۔ (ب) ازدلاف کے دوسرے معنی قریب ہونا ہیں۔ یہاں انسان اللہ سے قریب ہوجاتا ہے۔ (ج) یہاں عشاء کی نماز میں سب اکٹھے ہوتے ہیں: زلف اللیل کے معنی رات کو اکٹھا ہونا ہیں (د) آدم اور حوا عم عرفات میں ایک دوسرے کو پہچاننے سے پہلے یہاں ملے تو تھے مگر اکٹھے نہیں ہوتے تھے ملے ضرور تھے! (ہ) یہاں سے حاجی لوگ سب ایک دم سے (زَلفۃً واحدۃً) اکٹھے ہوکر نکلتے ہیں۔ واللہ اعلم!

(۴) مِنیٰ — صحیح املا مِنیٰ — اس وادی میں ہے جہاں حاجی لوگ "رمی جمار" کرتے ہیں۔ اس کی وجوہ تسمیہ ملاحظہ ہوں: (الف) یہاں خون بہائے جاتے ہیں (یُمنیٰ بہ) (ب) حضرت آدم عم نے یہاں پہنچ کر جنّت کو واپس جانے کی تمنّا کی تھی۔ (ج) یہاں مینڈھے کو ذبح کیا جاتا ہے، (یُمنیٰ بہ)

حسرت کے کلام میں مکّہ اور مدینہ کے نام بھی آئے ہیں۔ مگر ہم ان سے اس خیال سے صرف نظر کرتے ہیں کہ یہ اس قدر معروف، مشہور اور واضح ہیں کہ خاص شرح و بیان کے محتاج نہیں ہیں۔ البتہ کربلا کا ذکر اہمیت اور تبرک سے خالی نہیں ہے۔

کربلا

جن کے روضے پہ رحمتِ حق کا
روز ہوتا ہے کربلا میں نزول (ص ۲۰۱)

عربی میں اس نام کے آخر میں ہمزہ بھی بولا جاتا ہے مگر بلا ہمزہ بھی مستعمل ہے۔ شہر کوفہ کے قریب دریائے فرات کے مغربی کنارے پر ایک مقام کا نام ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ میں کربلہ (دو پاؤں کے مابین کشادگی — یعنی یہ کہ وہاں کی زمین ڈھیلی ڈھالی سی ہے) — اور گیہوں صاف کرنا (یعنی وہاں کی زمین میں کنکریاں نہیں ہیں) سے مدد لی گئی ہے۔ پھر کربل ایک گھاس کا نام بھی ہے، جو شاید اس علاقے میں کثرت سے ہوتی ہے۔ روایت[1] ہے کہ جب

---

[1] یاقوت حموی: معجم البلدان، زیر عرف، [2] سرکار حسرت نے اپنے شعر میں اسکا تلفظ ل کے سکون سے کیا ہے، حالانکہ یہ ل مکسور ہے۔ مگر "شاعر" کو ان تصرفات سے کون روک سکتا ہے؟ فرمادیں گے "میں اسے جائز سمجھتا ہوں، مخدوش!" سلمنا۔

[1] یاقوت، المعجم، زیر کربلا،

سرکار امام حسین رضی اللہ عنہ یہاں پہنچے تو آپ نے کسی سے پوچھا کہ اس سرزمین کا کیا نام ہے؟ اس نے کہا، عَقر۔ آپ نے فرمایا: اللہ عُقر سے بچاتے رکھے۔ آپ نے پھر پوچھا کیا نام ہے؟ کہا گیا کربلا۔ آپ نے فرمایا: یہ کرب و بلا کی سرزمین ہے اور وہاں سے تشریف لے جانا چاہا، مگر آہ! کہ یوں مقدر نہ تھا۔ دسویں محرم (سنہ ۶۱ ہجری) نے وہ دردناک نظارہ دیکھا جو تاریخ انسانی میں اللہ نہ کرے کہ پھر دہرایا جائے نعوذ باللہ منہا۔

اِس زمین کی کاسہ سازی کے بعد آیئے اب ما آسمان پرواز بھی کریں، جہاں حسرت کا آسمان سا خیال پہنچا ہے پہلے باغ نعیم کی سیر کی جائے:

باغِ نعیم

میں بھی اُمیدوار ہوں باغ نعیم کا
آخر گناہگار ہوں کیسے کریم کا　　(ص ۲۸۲)

یہ قرآن مجید کی اصطلاح "جنۃ نعیم" کا فارسی ترجمہ ہے یعنی نعمت کا باغ۔ قرآن شریف میں یہ کئی طرح سے وارد ہے: (ا) جنّت نعیم: واقعہ ۸۹، معارج ۳۸۔ (ب) "جنۃ النعیم": شعراء ۸۵ (ج) جمع کے صیغے میں، جنات النعیم: مائدہ ۶۵، یونس ۹، لقمان ۸، صافات ۴۳، حج ۵۱، واقعہ ۱۲، نون ۳۴۔ (د) جنات ونعیم: طور ۱۷، (ہ) محض نعیم کا ذکر: توبہ ۲۱، تطفیف ۲۲، انفطار ۱۳، انسان ۲۰۔ عالم لوگوں نے قرآن کریم کو غور سے مطالعہ کرنے کے بعد اُن میں سے اُس جگہ کے، جسے قدیم ایرانی (زرتشتی) "بہشت" کہتے تھے، آٹھ نام نکالے ہیں، اور سب کو ملا کے "ہشت بہشت" (آٹھ بہشتیں) کہتے ہیں۔ ان ہی میں سے ایک "جنت نعیم" بھی ہے۔ ہشت بہشت کے نام یہ ہیں: خُلد، دارالسلام، دارالقرار، جنت عدن، جنت الماویٰ، جنت النعیم، فردوس، اور علیّون۔

"بہشت" میں تین چشمے ہیں:

تسنیم، سلسبیل، کوثر

جلوہ حق سے بے خبر زاہد
محوِ تسنیم و سلسبیل ہیں سب　　(ص ۶۴)

طالبِ کوثر و تسنیم جو ہوں حضرت شیخ
خواہشِ بادہ کی توہین گوارا نہ کریں　　(ص ۱۳۱)

کفیل تھا کرمِ حق جو مے گساروں کا
ہجوم ہے لبِ کوثر گناہ گاروں کا　　(ص ۱۵۰) اور

اس قدر تاکید کیوں ترکِ مے و ساغر میں ہے
محتسب خود بھی تو فکرِ جنت و کوثر میں ہے　　(ص ۴۲)

یہ تینوں نام قرآن مجید میں وارد ہوئے ہیں۔

(۱) تسنیم: قرآن شریف میں صرف ایک مقام پر مذکور ہے۔ سورہ تطفیف میں "جنت" کے ایک تمثیلی بیان میں "مُہر کی ہوئی خالص شراب" کے بارے میں فرمایا ہے کہ "اس کی ملونی تسنیم سے ہے: وہ ایک چشمہ ہے جس سے مقرب بندے پئیں گے۔" (آیت ۲۷-۲۹) علماء کا بیان ہے کہ اللہ کے خاص مقرب بندوں کو تو اس چشمے کا پانی خالص حالت میں پینے کو دیا جائے گا، مگر اور اہلِ جنت کے لئے ملونی کرکے دیا جائے گا۔ تسنیم ایک خاص قسم کی پینے کی چیز (شراب) ہوگی۔

(۲) سلسبیل: اس چشمے کا ذکر بھی صرف ایک جگہ وارد ہوا ہے۔ سورہ انسان میں جنّت کے انعامات کے بیان میں ہے کہ اہلِ جنّت کو "ایسا جام پلایا جائے گا جس میں سونٹھ (زنجبیل) ملی ہوئی ہوگی، ایسے چشمے سے جس کا نام سلسبیل ہوگا۔" (آیت ۱۷-۱۸) اس نام کی تشریح میں کہا جاتا ہے کہ اس چشمے کا پانی صفائی اور سلاست کے ساتھ جاری ہوگا، برابر لگاتار (سلسلہ وار) بہتا ہوگا، پینے والے جدھر چاہیں گے اسے پھیر دیں گے، پیتے ہوئے یہ پانی حلق میں سے آسانی (سلاست) کے ساتھ پیٹ میں جائے گا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ مرکّب لفظ ہے: سَلْ (پوچھ لے) اور سبیل (راستہ) سے مل کر بنا ہے، یعنی اے مومن تو اللہ تک پہنچنے کا راستہ دریافت کرلے! اب اللہ تک پہنچنے اور اس کی نعمتوں سے فائدہ اٹھانے

لہ یہ تاریخ سنہ ۶۸۰ء کی دسویں اکتوبر کے مطابق ہے۔ کربلا شریف کا عرض بلد تقریباً جموں (کشمیر) کا سا ہے۔ اس موسم میں اور پھر دریا کے کنارے، جو سردی کا عالم ہوگا اس کا تصور مشکل نہیں ہے۔ مگر جب تک ہمارے اردو شاعروں کو یہ خبر ملی ہے تب تک گرمی بلا کی پڑنے لگی تھی، مجبوراً انھوں نے لو اور بگولوں کا ذکر فرما کر ہزاروں صفحے سیاہ کر دیئے، جن میں روشنی طبع بھی کارگر نہیں ہوتی۔

کا وقت آ گیا ہے! واللہ اعلم۔

(۳) کوثر۔ اس کے لفظی معنی "بہت زیادتی" "کثرت" کے ہیں، یعنی ہر قسم کے مال اور خیر و برکت اور رحمت کی بہتات اور بہتات۔ اس کا ذکر صرف سورہ کوثر (پہلی آیت) میں ہے: "ہم نے تجھے کوثر دیا"۔ کہتے ہیں کہ جنت میں ایک حوض ہے جس کی صفات یہ ہیں کہ قیامت کے روز جب آدمی پل صراط کو پار کر کے ادھر پہنچیں گے اور انہیں پیاس لگے گی تو کوثر کا پانی پینے کو ملے گا۔ وہ اتنا بڑا حوض ہے کہ ایک مہینے چلنے کی راہ ہے۔ اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید، شہد سے زیادہ شیریں، مشک سے زیادہ خوشبودار ہوگا۔ اور جن آبخوروں میں وہ پیا جائے گا وہ ایسے ہوں گے جیسے آسمان کے تارے جو کوئی ایک دفعہ اس کا پانی پی لے گا پھر کبھی پیاسا نہ ہوگا، مگر وہ سوا مومنوں کے کسی کو نہ ملے گا!

یہ سب نعمتیں اور انعام اُن کے لئے ہیں جو راہِ صبر حق پر چلتے ہیں۔

راہِ صبر و حق

عبث ہے اور کہیں راہِ صبر و حق کی تلاش

تری مثال ہے جب رہنما سلام علیک (ص ۱۷۰)

اس میں قرآنِ کریم کی آیت شریفہ (عصر ۳) "اور ایک دوسرے کو حق پر قائم رہنے کی نصیحت کرتے رہو اور ایک دوسرے کو صبر (استقلال، جم کر کام کرنے اور لڑنے) کی نصیحت کرتے رہو"

اور جو لوگ ایسا نہیں کرتے، اور قوانینِ الہیہ کی خلاف ورزی کرتے ہیں، اُن کے لئے سقر ہے۔

سَقَر

نہ کچھ فکرِ جناں رکھی نہ کچھ خوفِ سقر رکھا

خیالِ یار نے دل کو یہاں تک بے خبر رکھا (ص ۵۱)

عالم لوگوں نے جس طرح قرآن مجید سے جنت کے آٹھ نام نکال لئے ہیں اسی طرح "دوزخ" کے بھی سات نام نکال کر "ہفت دوزخ" تیار کیا ہے۔ ان سات دوزخوں کے نام یہ ہیں: سقر، سعیر، لظیٰ، حطمہ، جحیم، جہنم، اور ہاویہ۔ سقر آگ کا نام ہے۔ دوزخ کے اس نام کے بارے میں دو روایتیں ہیں[۱]: (۱) سقر ایک عجمی نام ہے، جس کا اشتقاق معلوم نہیں ہے۔ (۲) سقر نام اس لئے رکھا گیا کہ اس کے معنی پگھلانے کے ہیں۔ قرآن مجید میں چار جگہ یہ "نام" وارد ہوا ہے: تین دفعہ سورہ مدثر میں (آیت ۲۶-۲۷، ۴۲) اور ایک جگہ سورہ قمر (آیت ۴۸) میں۔ مدثر (۲۷-۴۰) میں اس کا حال یہ بتایا گیا ہے کہ "نہ تو وہ باقی رہنے دیتی ہے نہ چھوڑتی ہے، اور جھلس کر جسمیت بگاڑ دیتی ہے اور اس پر انیس (فرشتے یعنی قوائے انسانی) مقرر ہیں"۔

مقام دوزخ سے گذر کر اب ہم زمان میں آتے ہیں:۔

زمانِ رحمتِ حق

اے زمانِ رحمتِ حق الفراق!

اے محبِ اہلِ عصیاں الوداع! (ص ۱۹)

شاعر نے اس سے رمضان کا مہینہ مراد لیا ہے۔ رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں، خود بقول قرآن مجید کے، قرآن نازل ہوا ہے (البقرہ، ۱۸۵) اور قرآن شفا، ہدایت اور رحمت ہے۔ لہٰذا رمضان کا زمانہ رحمتِ حق کا زمانہ ہے۔

شبِ اسرا، شبِ معراج

در پردہ چہ شد بہ شبِ اسرا

فاق الرسلا فضلاً و علا (ص ۲۰۰)

شبِ معراجِ مردانِ خدا ہے

بقولِ شیخ، روزِ نامرادی (ص ۱۷۷)

شبِ اسرا قرآن مجید میں سورہ بنو اسرائیل کی پہلی آیت (۱) میں یوں مذکور ہے: "پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے (محمد صلعم) کو شب کے وقت مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک جس کے گرداگرد ہم نے برکتیں کر رکھی ہیں، لے گیا، تاکہ ہم اسے اپنے کچھ عجائبات قدرت دکھا دیں۔ بے شک وہ (اللہ) بڑا سننے والا بڑا دیکھنے والا ہے"۔ اسی کو شبِ معراج بھی کہتے ہیں۔

روزِ جزا

حسرت غلام شافع روزِ شمار ہے کب اسکو فکر پرسشِ روزِ جزا ہو (ص ...)

---

[۱] یاقوت، المعجم، زیر سقر۔

روزِجزا قرآن کریم کے الفاظ یوم الدین کا فارسی ترجمہ ہے۔ یوم الدین قرآن مجید کی سب سے پہلی سورت (فاتحہ) کے شروع ہی میں مذکور ہے، جہاں اللہ کی صفت میں رب العالمین، الرحمٰن الرحیم اور یوم الدین کا مالک فرمایا گیا ہے۔ اس کے بعد شعراء ۲۸، صافات ۲۰، ذاریات ۱۲، واقعہ ۵۶، اور انفطار ۱۵، ۱۷-۱۸ میں آیا ہے۔ سورہ ذاریات میں ہے: "وہ (یعنی دروغ باف کافر لوگ) پوچھیں گے کہ روزِ جزا کب ہوگا؟ فوراً ہی اس کا جواب ہے (آیت ۱۳): اس دن جب ان لوگوں کو آگ پر ڈھا نچا جائے گا!" سورہ انفطار میں فرمایا ہے کہ "بدکار لوگ جہنم میں ہوں گے، جس میں وہ روزِ جزا کو جلیں گے، اور وہ اس سے باہر نہیں نکلیں گے! اور تم کیا سمجھے کہ روزِ جزا کیسا ہوگا؟ (اور ہم) پھر (پوچھتے ہیں) کہ تم کیا سمجھے کہ روزِ جزا کیسا ہوگا؟ وہ ایسا دن ہوگا کہ کسی کا کسی کے لئے کچھ بس نہ چلے گا، اور اُس روز حکومت اللہ ہی کی ہوگی!" (آیت ۱۴ - ۱۹)

صبر و صلوٰۃِ عشق

صبر و صلوٰۃِ عشق سے ہیں سب کے دل قوی

ثابت قدم ہیں سارے مُریدانِ اولیا (ص ۹۰)

یہ قرآن مجید کی اُن آیتوں کی طرف اشارہ ہے جن میں ارشاد ہوا ہے کہ "صبر و صلوٰۃ سے مدد لو" (بقرہ: ۴۵، ۱۵۳)۔

صبغۃ اللہ

ہر سو عیاں ہے صبغۃ اللہ کی بہار

رونق پہ ہے خزاں میں بھی بستانِ اولیا (ص ۹۰)

قرآن مجید کی ایک آیت میں ہے کہ ہمارے دین کا رنگ (صبغۃ) "اللہ کا رنگ ہے، اور اللہ کے رنگ سے بہتر کون؟ ہم اسی کی پوجا کرتے ہیں!" (بقرہ ۱۳۸)

اللہ کی خالص عبادت کرنے والوں کی شان یہ ہے

لاخوف علیہم ولاہم یحزنون۔

لاخوف علیہم یحزنون

دل ایماں رکھتے ہیں کامل بہ فتوائے جنوں

شانِ لاخوف علیہم شیوۂ لایحزنون (ص ۱۳۰)

قرآن شریف میں کئی جگہ مومنوں کی یہ شان بیان ہوئی ہے کہ "اُن کے لئے کوئی خوف نہیں، اور نہ وہ غم زدہ ہوتے ہیں۔" چنانچہ یہی فقرہ ان موقعوں میں دہرایا گیا ہے: بقرہ ۳۸، ۶۲، ۱۱۲، ۲۶۲، ۲۷۴، ۲۷۷، آل عمران ۱۷۰، انعام ۴۸، اعراف ۳۵، یونس ۶۲، احقاف ۱۳!

وعدۂ لیعطیک

ہر دم رضائے یار سے نزدیک ہم رہے

اُمیدوارِ وعدۂ لیعطیک ہم رہے (ص ۲۴۴)

وعدۂ لیعطیک (یہ وعدہ کہ وہ تجھے دے گا) میں قرآن مجید کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے جس میں اللہ نے حضرت رسول کریم صلعم سے یوں وعدہ فرمایا ہے کہ "عن قریب تیرا رب تجھے دے گا، اور تو خوش ہو جائے گا!" (ضحیٰ ۵)

عین الیقین، حق الیقین

حسنِ بتاں سے جن کو عرفانِ صفا ملا

حق الیقین تک آئے ہیں عین الیقین سے ہم (ص ۲۷۲)

(۱) قرآن شریف نے دُنیا کی دولت اور نعمتوں کو جمع کر کے رکھنے والوں اور ایک دوسرے سے مقابلہ کرنے اور ڈینگیں مارنے والوں کو مخاطب کر کے ایک جگہ فرمایا ہے کہ "تم لوگ ضرور ضرور دوزخ کی آگ کی جلن دیکھو گے! ہاں تم ضرور ضرور پورے یقین کے ساتھ اپنی آنکھ سے اسے دیکھو گے!" (تکاثر ۶-۷)

(۲) اسی طرح ایک مقام پر آگ کی جلن کے لئے فرمایا ہے: "بے شک یہ ضرور سچے یقین کی بات ہے!" (واقعہ ۹۵)

مگر گمراہ (ضالین) اور غضب زدہ (مغضوب) لوگ ان باتوں کو کیوں ماننے لگے۔!

ضالّین و مغضوب

ما گام زن صراطِ عشق مستقیم

دور از راہ ضالّین و مغضوب (ص ۲۴۰) اور

فتنہ جو رہ نہ کرنا مجھے یارب ان کا

جن کو گمراہ کیا تو نے نہ مغضوب کیا (ص ۱۲۳)

یہ اشارہ ہے سورۃ فاتحہ کے آخری جملے کی طرف جس کے

الفاظ غیر المغضوب علیہم ولا الضالین بہت معروف ہیں۔ دعا یہ ہے کہ اے اللہ تو ہمیں سیدھا راستہ (صراطِ مستقیم) دکھا، اُن لوگوں کا راستہ جن کو تو نے نعمتیں دی ہیں، اُن کا نہیں جن پر تو نے غضب کیا ہے اور جو گمراہ ہو گئے ہیں۔"

اب حسرت کی جنت [illegible] باقی رہ گئی ہو اور یہ مقالہ پایان کو پہنچ رہا ہے۔ حقیقت میں تو یہ کام کسی عیسیٰ نفس کے کرنے کا تھا جن کے دمِ قلم سے بیان میں جان پڑ جاتی۔ مجھ ظلوم و جہول سے جیسا کچھ بن پڑا وہی اپنے تمام قصور کے اعتراف کے ساتھ ان صفحوں میں پیش کرنے کی جرأت کر رہا ہوں۔ امید کہ ناظرینِ کرام میری لغزشوں اور کوتاہیوں سے غضِ بصر فرمائیں گے۔ مگر دعائے مضطر تو اللہ ہی سنا کرتا ہے، لہٰذا استغفر اللہ اس شفیق ناظمِ کائنات کی بخشش سے مایوس نہیں ہوں جس نے لا تقنطوا فرمایا ہے۔ سچ یہ ہے کہ اُسی کی توفیق شاملِ حال تھی ورنہ اتنا بھی کیوں کر ہوتا۔ وللہ الحمد!

عیسیٰ نفس

حسینانِ جہاں کو اُن کے ہوتے میں نہ چاہوں گا
کوئی عیسیٰ نفس کیوں ہو کوئی یوسف لقا کیوں ہو (ص ۴۹)

قرآنِ عظیم کی سورۃ مائدہ میں حضرت عیسیٰ ابن مریم کو جنابِ خالقِ کائنات جلّ جلالہٗ کی طرف سے یاد دلایا جا رہا ہے کہ ہم نے تجھے اور تیری ماں کو نعمتیں دیں، تجھے پاک نفس بنایا، مقرر اور خطیب بنایا، حکمت اور توریت و انجیل تجھے سکھائی اور یاد ہے جب تو گارے سے ایک پرندے کی سی شکل بناتا تھا میرے حکم سے، پھر تو اس میں پھونک مار دیتا تھا اور وہ شکل میرے حکم سے پرندہ بن جاتی تھی!........" (۱۱۳)

انجیل مقدس میں مریضوں کا چنگا کرنا اور مُردوں کو جلانا تو مذکور ہے، مگر محض دم سے ایسا کرنا مذکور نہیں ہے۔ یہ دمِ عیسیٰ قرآن ہی کی بخشی ہوئی کرامت ہے۔

ظلوم وجہول

نہ کیا بارِ غم کسی نے قبول
غیرِ انساں کہ تھا ظلوم وجہول (ص ۲۰۰)

ظلوم و جہول (بڑا ظالم یعنی غلط کار اور بڑا جاہل) قرآنِ مجید نے انسان کو قرار دیا ہے۔ سورہ احزاب کی آخری آیتوں میں فرمایا ہے کہ ہم نے امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کو پیش کیا۔ انھوں نے اس میں خیانت کرنے سے انکار کیا، اور وہ اس (خیانت) سے ڈر گئے۔ اور انسان نے اس (امانت) میں خیانت کی۔ بے شک وہ بڑا ہی ظالم بڑا ہی جاہل ہے..." (۷۲) اللہ نے جس بار کو امانت فرمایا ہے، ہمارے شاعر نے اسے غم بتایا ہے، صرف یہ فرق ہے۔

مسئلہ غضِ بصر

اب کہے کوئی کہ ہم اہلِ نظر جائیں کہاں
ہر طرف مسئلہ غضِ بصر ہی درپیش (ص ۱۰۳)

"نگاہ نیچی رکھنے کا مسئلہ" قرآن شریف کی سورہ نور میں وارد ہوا ہے عورتوں کے پردے کے مسئلے اور بحث میں یہ آیتیں ہمیشہ معرضِ گفتگو میں آتی ہیں۔ ارشاد ہوا ہے کہ "مومن مردوں سے کہہ دے کہ وہ اپنی آنکھیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں، یہ اُن کے لئے زیادہ پاکیزگی کی بات ہے۔ بے شک اللہ خوب جانتا ہے کہ لوگ کیا کرتے ہیں۔ اور مومنہ عورتوں سے کہہ دے کہ وہ اپنی آنکھیں نیچی رکھیں، اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور اپنا سنگھار ظاہر نہ کریں سوا ایسے حصّوں کے جو کھلے رہتے ہیں..." (۳۰-۳۱)

دعائے مضطر

فریادِ غم نہیں ہے میری دعائے مضطر
اب نام بھی نہ لوں کیا میں ناصبور تیرا؟ (ص ۵۸)

بے قرار آدمی کی پکار (دعا) قرآنِ مجید کی اس آیت سے ماخوذ ہے: "وہ جو بے قرار آدمی کی سنتا ہے جب کہ وہ اسے پکارتا ہے اور وہ اس کی مصیبت دور کرتا ہے، اور تم کو زمین میں جانشین کرتا ہے، کیا (اس) اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود ہے؟ مگر تم لوگ بہت ہی کم یاد رکھتے ہو!" (نمل، ۶۲)

استغفر اللہ

میں اور ولائے کفارِ گم راہ
استغفر اللہ استغفر اللہ! (ص ۸۰)

کلمہ استغفر اللہ (میں اللہ سے بخشش گناہ چاہتا ہوں) سے ہر مسلمان واقف ہے۔ اللہ سے خطاؤں اور لغزشوں کی بخشش مانگنے کا حکم قرآن شریف میں کئی جگہ آیا ہے "میں اپنے رب سے تمہارے لئے بخشش مانگوں گا" (یوسف ۹۸) ابراہیم نے کہا "تم پر سلام ہو، میں ابھی اپنے رب سے تیرے لئے بخشش مانگوں گا۔" (مریم ۴۷) داؤد نے "... اپنے رب سے بخشش مانگی اور سجدے میں گر گیا اور توبہ کی" (ص ۲۴) رسول کریم صلعم کو حکم ہوتا ہے "اور اللہ سے بخشش مانگ، وہ بڑا بخشنے والا اور بڑا رحم کرنے والا ہے۔" (نساء ۱۰۶) اور "اپنے رب کے حکم پر عمل کر اور اس سے بخشش مانگ" (نصر ۲) مومنوں کو حکم ہے کہ "اپنے رب سے بخشش مانگو اور توبہ کرو" (ہود ۶۱، ۹۰) اسی طرح استغفار کا ذکر قرآن کریم میں ستائیس جگہ پر موجود ہے۔ اسی سے استغفر اللہ (بصیغہ متکلم، مضارع) یہ کلمہ بن گیا ہے۔

لا تقنطوا

نہ بھولا کھر کے اعدا میں بھی حسرت
ترے فرمودۂ لا تقنطوا کو (ص ۱۳۳)

لا تقنطوا (تم مایوس مت ہو) قرآن مجید کے الفاظ ہیں۔ سورہ زمر (آیت ۵۳) میں ارشاد ہوا ہے "کہہ، اے میرے وہ بندو جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی، اللہ کی رحمت سے مایوس مت ہو، بے شک اللہ سب گناہوں کو معاف کر دیتا ہے، وہ تو بڑا بخشنے والا رحیم ہے!"

توفیق الٰہی پر ہمارے شاعر نے خوب فرمایا ہے کہ (رباعی)

ہو کر ہی رہا ہمیشہ میرا چاہا
جب جو مرے دل نے اس سے چاہا چاہا
توفیق اسے کہتے ہیں کہ چاہا بھی وہی
میں نے، جو کچھ اس نے مجھ کو دینا چاہا (ص ۲۳۵)

یہ رباعی قرآن کریم کی اس آیت کا لاجواب ترجمہ اور اس کی لاثانی تشریح ہے، جس میں ارشاد ہوا ہے: ماتشاؤن الا ان یشاء اللہ۔ یہ دو جگہ وارد ہے: (۱) سورۃ انسان میں، "اور تم نہیں چاہتے ہو، مگر یہ کہ اللہ چاہتا ہے۔ بے شک اللہ بڑا جاننے والا بڑی حکمت والا ہے۔" (آیت ۳۰) (۲) سورۃ تکویر میں "اور تم نہیں چاہتے ہو، مگر یہ کہ اللہ چاہتا ہے، جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔" (آیت ۲۹)

للہ الحمد

ہم ترنا یاد ہوئی موجب آرائش دل
للہ الحمد کہ آباد یہ ویرانہ ہوا (ص ۶۱)

لو[illegible] کلمہ الحمد للہ قرآن مجید میں کم و بیش اکیس جگہ پر وارد ہوا ہے، مگر کلمہ للہ الحمد سورۂ جاثیہ (آیت ۳۶) میں آیا ہے: "پس اللہ ہی کے لئے ہے حمد (اور سب تعریف) آسمانوں کے پروردگار اور زمین کے پروردگار اور تمام جہانوں کے پروردگار کے لئے ہے۔"

اس نظم میں ......

اس کتاب کی جدت اس کے نام سے ظاہر ہوتی ہے۔
میراجی اردو کی جدید شاعری کے سب سے ممتاز شاعر ہیں۔ انہوں نے اس کتاب میں ایک نقاد کی حیثیت سے بتایا ہے کہ جدید اردو شاعری کیا ہے۔ اس سوال کا جواب میراجی سے بہتر اور کوئی نہیں دے سکتا۔ انہوں نے اس موضوع پر برسوں غور کیا ہے اور [illegible] طرار شاعر ہیں اردو کی تفریح [illegible] میراجی نے ان پر اس طرح تبصرہ [illegible] سامنے آتا ہے تو ان کی ذہنی [illegible] ہو جاتی ہیں۔ آپ چاہے جدید اردو شاعری کے مخالف ہوں چاہے موافق، اس کتاب کے مطالعہ کے بغیر جدید شاعری کے محاسن یا معائب سے آپ کما حقہ واقف نہیں ہو سکتے۔
اس حد درجہ ضروری موضوع پر اب تک کوئی ایسی جامع کتاب نہیں لکھی گئی ہے۔
مجلد اور جلد پوش سے آراستہ۔
قیمت دو روپے آٹھ آنے (عہ) علاوہ محصول ڈاک
ملنے کا پتہ:-
ساقی بک ڈپو، دہلی۔

پریم پجاری

سچی کہانی

"نیا ادب زندہ باد"

(نوٹ:۔ بعض اشخاص اور مقامات وغیرہ کے نام فرضی ہیں)

پچھلے سال ایک ضرورت سے مجھے رانچی جانا پڑا۔ وہاں میرے ایک دوست ہیں مسٹر ریاض احمد رانچی کے ہردل عزیز وکیل۔ انہیں کے یہاں قیام کیا۔ خدا جانے کیا سبب ہے، ہمیشہ سے مجھے دیوانوں کے ساتھ ایک خاص دلچسپی ہے۔ اس بنا پر آپ کا جی چاہے تو مجھے بھی دیوانہ سمجھ لیجئے۔

ایک دن میں نے ریاض صاحب سے کہا کہ بھیا آسانی سے ممکن ہو تو یہاں کے گورنمنٹ Mental Hospital دماغی ہسپتال (یا بالفاظ دیگر پاگل خانہ) کی سیر کرا دیجئے۔ انہوں نے کہا اچھا پرسوں چلیں گے۔ ہمارا بھی ایک بدنصیب دوست وہاں ہے۔ تیسرے دن ہم لوگ وہاں گئے۔ ہسپتال کے سپرنٹنڈنٹ ڈاکٹر اسٹرلنگ سے ریاض صاحب کی خاص دوستی تھی۔ انہوں نے ہمیں خوب سیر کرائی۔ طرح طرح کے پاگل دیکھے۔ مرد بھی۔ عورتیں بھی۔ بوڑھے بھی، جوان بھی، کچھ کپڑے پہنے ہوئے۔ کچھ نیم برہنہ، کچھ بالکل ننگے۔ اُن کی طرح طرح کی باتیں بھی سنیں۔ اکثر بے سروپا، کچھ سنجیدہ، کچھ نہایت دانشمندانہ۔ ایک وارڈ کے سامنے سے جب ہم گذر رہے تھے تو ریاض صاحب نے کہا "چلئے اب آپ کو اپنے دوست رشید سے ملائیں"۔ رشید کا کمرہ قریب ہی تھا۔ ہم وہاں پہنچے۔ آہ کتنا خوبصورت جوان۔ خوبصورت بھی، خوش اندام بھی۔ آنکھیں بلا کی جاذب۔ مگر چہرہ حسرت و اندوہ کا مرقع۔ بکھرے ہوئے بال، بڑھا ہوا خط، پھٹے ہوئے کپڑے۔ بیٹھا ہوا کچھ لکھ رہا تھا۔ اپنے خیالات میں غرق، دُنیا و مافیہا سے بے خبر۔ ہم پاس جا کھڑے ہوئے اُس نے آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ ریاض صاحب نے نام لے کر پکارا تو چونکا۔ پھر کھڑا ہوگیا اور چلا کر کہا:۔

"وہ مارا! قسم خدا کی وہ مارا! ریاض بھائی میں کامیاب ہوگیا۔ واللہ کامیاب ہوگیا۔ آگئی مچھلی ہاں ارے بھیا بس پھنسی ہی سمجھو۔ اب کہاں جائے گی بچ کر۔ فرائڈ زندہ باد۔ نیا ادب زندہ باد۔ میں نے اُسے خط لکھا ہے۔ یہیں آئے گی دوڑتی ہوئی۔ دیکھ لینا تم"۔ پھر خط اُٹھا کر ریاض صاحب کو دکھایا۔ میں نے بھی دیکھا۔ چند بے ربط اور ٹوٹے پھوٹے جملے لکھے تھے۔ ریاض صاحب نے کہا ماشاءاللہ بہت خوب لکھا ہے۔ پھر خدا جانے اچانک کیا اُس کے جی میں آئی دوات اُٹھا کر دیوار سے دے ماری۔ خط ریاض صاحب کے ہاتھ سے چھین کر پرزے پرزے کر ڈالا۔ ریاض صاحب نے آہستہ سے کہا اس کا جنون تیز ہو رہا ہے۔ اب یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں ہم چلے آئے۔

راستے میں میں نے ریاض صاحب سے کہا "قدرت کی ستم ظریفی دیکھنا ہے تے ایسا خوب رو جوان اور اس طرح برباد"۔ ریاض صاحب نے اندوہناک لہجہ میں کہا "ہاں بھائی قدرت کے بھید کون جانے"۔ میں نے پوچھا آخر یہ دیوانہ ہوا کیونکر؟ اُنھوں نے کہا یہ بڑی دُکھ بھری کہانی ہے گھر چل کر اطمینان سے سناؤں گا۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد ہم لوگ ڈرائنگ روم میں آ بیٹھے۔ میں نے کہا ہاں ریاض صاحب وہ رشید کا قصہ تو سنایئے۔ رشید کا نام سن کر ریاض صاحب کا چہرہ افسردہ ہوگیا۔ وہ آرام کرسی پر لیٹے ہوئے تھے، اُٹھ کر بیٹھ گئے اور اس طرح کہنا شروع کیا:۔

"جس وقت ابا کی بدلی الہ آباد کی ہوئی انہوں نے ہم سب لوگوں کو بھی وہیں بلا لیا۔ اور مجھے اسکول میں داخل کرا دیا۔ وہیں رشید سے ملاقات ہوئی۔ میں اور وہ چھ برس ہم سبق رہے۔ دو برس اسکول میں، چار برس کالج اور یونیورسٹی میں۔ ساتھی تو ہمارے اور بھی بہت تھے مگر رشید جیسے ذہین، شوخ، طرار اور ہنس مکھ انسان میں نے کم ہی دیکھے ہیں۔ جیسی اچھی صورت، ویسی ہی اچھی سیرت۔ ہم دونوں

کے مذاق بالکل جداگانہ تھے۔ وہ شعر و سخن کا عاشق۔ ادبیات کا پرستار؛ اور میں سائنس کا طالب علم۔ پھر بھی خدا جانے کیوں ہم دونوں میں بے حد خلوص ہو گیا تھا۔

رشید بھی بچہ ہی تھا کہ اُس کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ دو لڑکیاں اور ایک لڑکا انہوں نے اپنی یادگار چھوڑے۔ بڑی بہن سعیدہ رشید سے عمر میں بہت بڑی تھیں۔ ماں کے مرنے کے بعد انہیں نے رشید کو پالا۔ مگر چند سال بعد لاہور کے ایک رئیس خان بہادر میاں عبدالحکیم سے اُن کی شادی ہو گئی اور وہ اپنے گھر چلی گئیں۔ خدا کی شان، برسوں اولاد کے لئے ترستی رہیں لیکن اُن کی گود نہ بھری۔ آخر بڑی منتوں مُرادوں کے بعد، شادی کے پانچویں سال خدا نے اُنہیں ایک بیٹی عنایت کی۔ مگر اس ننھی گڑیا نے ابھی مسکرانا بھی نہ سیکھا تھا کہ وہ خود چل بسیں۔ میاں صاحب کے لئے ننھی بچی کا سنبھالنا مصیبت ہو گیا۔ مرحومہ کی وفات کے دو مہینے بعد ہی اُنہوں نے رشید کی دوسری بہن راشدہ سے شادی کا پیغام دے دیا۔

میاں صاحب عمر میں راشدہ سے بہت بڑے تھے۔ راشدہ کی اس وقت مشکل سے اُنیس سال کی تھی اور میاں صاحب کا سن چالیس کے پار۔ اس بنا پر رشید کے والد اس رشتے پر راضی نہ ہوئے۔ میاں صاحب کو اپنی دولت اور پوزیشن پر بڑا ناز تھا۔ اِس انکار کو اپنی توہین سمجھے اور زندگی بھر کے لئے ان لوگوں سے تعلقات منقطع کر لئے۔

رشید کی ایک خالہ بھی تھیں جو لکھنؤ میں رہتی تھیں۔ وہ رشید کو بہت چاہتی تھیں۔ اُن کی خواہش تھی کہ رشید کی شادی اُن کی لڑکی ربیعہ سے ہو جائے۔ جس وقت میں اور رشید انٹرمیڈیٹ پاس کر کے یونیورسٹی میں داخل ہوئے رشید کی منگنی ربیعہ سے ہو گئی اور طے یہ پایا کہ شادی اُس وقت ہو جب رشید بی۔ اے پاس کر لے۔ ربیعہ اسی سال میٹرکولیشن کا امتحان دینے والی تھی۔ ربیعہ کو میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ اُس کی تصویر دیکھی تھی۔ خاصی قبول صورت لڑکی تھی۔ رشید نے اُسے بارہا دیکھا تھا۔ بارہا اُس سے ملا تھا۔ وہ شروع ہی سے اُسے پسند کرتا تھا اور اب اس خیال سے مسرور تھا کہ دو سال بعد ربیعہ اُس کی رفیقِ زندگی بن جائے گی۔

منگنی ہو جانے کے بعد خاندان کی رسم کے مطابق رشید سے ربیعہ کا پردہ ہو گیا۔ مگر نام کا پردہ تھا۔ دونوں برابر ملتے تھے، مگر چھپ چھپ کر خط و کتابت بھی ہوتی تھی۔ مگر خفیہ طور پر۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رشید کو ربیعہ سے والہانہ محبت ہو گئی۔ مگر یہ خیال اکثر اس کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا کہ ربیعہ اُسے اُتنا نہیں چاہتی تھی جتنا وہ ربیعہ کو پیار کرتا تھا۔ سال بھر گذر گیا۔ ربیعہ میٹرکولیشن کا امتحان پاس کر کے آئی۔ ٹی کالج لکھنؤ میں داخل ہو گئی۔ اب ہم دونوں بی۔ اے کے آخری سال میں تھے۔ اتفاق سے رشید بیمار ہو گیا اور کئی مہینے تک ربیعہ سے ملنے لکھنؤ نہ جا سکا۔ اس درمیان میں ربیعہ کے خط بھی بہت کم آئے۔ ہر وقت ایک مبہم سا خوف رشید پر چھایا رہنے لگا۔ اکثر مجھ سے کہتا۔ "ناصر بھائی، خدا خیر کرے آثار اچھے نہیں معلوم ہوتے۔ نہ جانے قدرت کو کیا منظور ہے"۔ میں اُسے تسلی دیتا کہ کچھ بھی نہیں، محض تمہارا واہمہ ہے۔ ربیعہ تمہاری ہے۔ اور شادی میں اب دن ہی کتنے باقی ہیں۔ چھ مہینے بھی تو نہیں۔

آخر وہ ایک دن لکھنؤ گیا۔ اُسی دن مجھے بھی ایک ضرورت سے وطن (پٹنہ) جانا پڑا۔ لکھنؤ سے اُس نے مجھے جو خط لکھا اسے پڑھ کر میرے ہوش اُڑ گئے۔

یہ کہہ کر ناصر صاحب اُٹھے۔ اندر گئے اور خطوں کا ایک پیکٹ ہاتھ میں لئے ہوئے واپس آئے۔ اس میں سے ایک خط نکالا اور پڑھنا شروع کیا۔

"ناصر بھائی میں لُٹ گیا۔ تباہ ہو گیا۔ قسمت نے میرے ساتھ دغا کی۔ ربیعہ نے میرے ساتھ دغا کی۔ اب وہ میری نہیں ہو سکتی۔ اُس نے مجھ سے ملنا بھی گوارا نہ کیا۔ کیوں؟ اس لئے کہ اب اس نے کچھ اور ہی جی میں ٹھانی ہے۔ یہاں مقامی کالج کا ایک پروفیسر ہے احمد کبیر، نئے ادب کا بڑا حامی ہے۔ فرضی نام سے افسانے لکھتا ہے اور بہت عُریاں لکھتا ہے۔ اس کی عُریاں نگاریوں نے جوان لڑکیوں کے جذبات میں آگ لگا دی ہے۔ ربیعہ بھی اسی جال میں پھنس گئی۔ پہلے نادیدہ پرستار ہوئی اور اب "وہ" دیوتا ہے اور یہ پجارن۔ شادی طے ہو چکی ہے۔ حالانکہ اماں سے بھی اُس نے کہہ دیا ہے کہ کوئی بھی میرے معاملے میں دخل انداز ہوا تو اچھا نہ ہوگا۔ میں ہر انجام کے لئے تیار ہوں۔

کسی کی غلام نہیں کہ اپنی مرضی کے خلاف جس کے دامن سے باندھ دی جاؤں اُس کے ساتھ ہو لوں۔ دُنیا کی کوئی طاقت اب اُسے اس کے ارادے سے باز نہیں رکھ سکتی [illegible] لکھوں جو اس کا شیرازہ بکھر گیا ہے۔ [illegible] ہو رہا ہے جیسے میری [illegible] انتقام کی ایک آگ بھڑک اٹھی ہے [illegible] اپنا طریقِ کار سوچ لیا ہے۔ میں بھی [illegible] کیا۔ جو ربیعہ نے کیا۔ شہوانی [illegible] برانگیختہ کرنے والے، عریاں افسانے لکھوں گا۔ [illegible] لڑکیوں کو اپنی ہوس کا شکار بنانے کے جال میں پھنساؤں گا۔ اور اپنے نفس کی تسکین کے بعد نہایت بے حسی اور اطمینان کے ساتھ انہیں رسوائی اور بربادی کے غار میں دھکیل دوں گا۔"

دو ہفتے کے بعد جب میں الہ آباد واپس آیا تو رشید سے ملاقات ہوئی۔ اب وہ پہلا سا رشید نہ تھا۔ اس کی شوخیاں افسردگی میں بدل ہو گئی تھیں۔ مزاج میں تلخی آگئی تھی۔ احباب سے ملنا جلنا تقریباً ترک کر دیا تھا۔ مجھ سے بھی ملاقات ہوتی تو زیادہ تر خاموش ہی بیٹھا رہتا جیسے کچھ سوچ رہا ہے۔ ایک دن میں نے کسی بات کے ضمن میں ربیعہ کا کچھ ذکر کیا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے بچھو نے اُس کے ڈنک مار دیا۔ تلملا اٹھا اور کہا "ریاض بھائی خدا کے لئے اُس زہریلی ناگن کا نام نہ لیجئے۔ آپ تھوڑا سا صبر کیجئے۔ دیکھئے تو کیا ہوتا ہے۔ میں نے جال بچھا دیا ہے۔ ربیعہ جیسی درجنوں چھوکریاں رشید کے التفات کی بھیک مانگیں گی۔"

رشید میں افسانہ نگاری کی بڑی صلاحیت تھی۔ شعر بھی خوب کہتا تھا تقریباً دو برس سے اس کے افسانے ملک کے ممتاز رسالوں میں شائع اور عام طور پر مقبول ہوئے تھے۔ مگر اس کے افسانے نہایت پاکیزہ جذبات کے حامل ہوتے تھے اور وہ ہمیشہ بلند اخلاق کرداروں کی تخلیق کرتا تھا۔ لیکن اب اُس نے اپنا رنگ بدل دیا تھا اب وہ "آفتاب" کے فرضی نام سے افسانے لکھتا تھا۔ اس قدر عریاں! اِس قدر جذبات کو مشتعل کرنے والے کہ خدا کی پناہ۔ اس کے قلم میں زور تھا۔ بیان پر قدرت تھی۔ اس رنگ میں بھی وہ جلد ہی نمایاں ہو گیا۔ کئی بار میں نے اُسے ٹوکا کہ رشید افسوس ہے تم پاکیزہ اخلاق کی رفعتوں سے پھسل کر معصیت کے تاریک غار میں جا گرے۔ کاش تم اس پر غور کرتے۔ اس نے کہا۔ "ریاض بھائی آپ دیکھتے جائیے پستیوں کے بعد پھر بلندیاں آئیں گی۔ تاریکیوں کے بعد پھر روشنیوں کا ظہور ہوگا۔"

لکھتا وہ پہلے بھی بہت تھا مگر اس انہماک اور اس کثرت سے نہیں۔ اب تو بیداری کے ۱۸ گھنٹوں میں سے تقریباً ۱۲ گھنٹے وہ افسانہ نگاری کی نذر کر دیتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ امتحان میں فیل ہو جائے گا۔ مگر قدرت نے اُسے بلا کا حافظہ عنایت کیا تھا۔ اس پر غیر معمولی ذہانت۔ پاس ہوا اور مجھ سے زیادہ نمبر لے کر پاس ہوا۔ بی۔ اے پاس کرنے کے بعد ابا جان کی صلاح ہوئی کہ میں قانون پڑھوں۔ لہذا میں نے لا کلاس میں داخلہ کرا لیا۔ رشید کا اب تمام وقت افسانہ نگاری میں صرف ہوتا تھا۔ ایک دن سرِ شام وہ میرے یہاں آیا۔ ربیعہ والے حادثے کے بعد میں نے اُسے اتنا شگفتہ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کئی خط اُس کے ہاتھ میں تھے۔ سامنا ہوتے ہی چلا کر کہا۔

"وہ مارا! قسم خدا کی وہ مارا! ریاض بھائی میں کامیاب ہو گیا۔ واللہ کامیاب ہو گیا۔ آ گئی مچھلی جال میں۔ بس پھنسی ہی سمجھو۔ اب کہاں جائے گی بچ کر۔ فرائڈ زندہ باد۔ نیا ادب زندہ باد۔"

میں نے کہا "کچھ پاگل تو نہیں ہو گئے۔ آخر کچھ بتاؤ تو سہی کیا ماجرا ہے کس بات میں کامیاب ہو گئے۔ کہیں ملازمت کی درخواست دی تھی؟ انٹرویو کے لئے بلائے گئے ہو؟ آخر......."

"لاحول ولا قوة" وہ میری بات کاٹ کر بولا۔ "ریاض بھائی آپ بھی کس قدر غیر شاعرانہ باتیں کرتے ہیں" یہ کہہ کر اُس نے چھوٹا سا نیلے رنگ کا ایک خوبصورت لفافہ میری طرف بڑھایا اور کہا اسے پڑھئے۔ میں نے کہا تم ہی سُنا دو میری عینک اندر ہے۔ اُس نے سُنانا شروع کیا:

ریاض صاحب نے پھر اُسی پیکٹ میں سے ایک اور خط نکالا اور پڑھنے لگے:

"مسٹر آفتاب! تسلیم! میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ آپ افسانہ نگار ہیں یا جادوگر۔ آپ مصوّر ہیں یا خالق؟ تصویروں میں رنگ بھرتے ہیں یا مجسموں میں جان ڈالتے ہیں؟

"شہاب" کے تازہ پرچے میں آپ کا افسانہ "بھولی بسری باتیں" پڑھا۔ خدا شاہد ہے۔ پڑھ کر جھوم جھوم گئی۔ کیسی کیسی زندہ تصویریں آپ نے اس میں کھینچی ہیں۔ کس قدر حسین ہے یہ ٹکڑا۔

"سُہانی شام تھی۔ اونچی نیچی پہاڑیاں اُن کے چاروں طرف دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ بلندی سے ایک نشیب کی طرف اُتر رہے تھے۔ اُن کے ساتھی پیچھے رہ گئے تھے۔ پگ ڈنڈی تنگ تھی۔ اور وہ دونوں آگے پیچھے چل رہے تھے۔ شہلا پیچھے پیچھے تھی۔ سہارا لینے کے لئے اُس نے اپنے دونوں ہاتھ عارف کے کاندھوں پر رکھ دیئے تھے۔ گردن کے بالکل متصل۔ وہ دونوں آہستہ آہستہ باتیں کرتے اور اس پُرکیف منظر سے لُطف اُٹھاتے آگے بڑھے چلے جا رہے تھے۔ اب وہ ایک پیچ دار راستے سے اُتر رہے تھے۔ احتیاط سے چلنا ضروری تھا۔ عارف ایک لمحہ کے لئے ٹھہرا۔ یکایک اُس نے شہلا کی گداز باہوں کی گرمی اپنی گردن کے گرد محسوس کی۔ وہ سُہانی شام، وہ نرم نرم ٹھنڈی ہوا، وہ خاموش پہاڑیاں، وہ پُرسکون فضا، وہ جھرنے کا دھیما دھیما راگ، وہ دل نواز منظر، وہ آزاد تنہائی۔ ایک بے خودی سی اس کے حواس پر چھا گئی۔ بے اختیار ہو کر اُس نے شہلا کو اپنے آغوش میں کھینچ لیا۔ اب اُن کے لب آبِ حیات پی رہے تھے۔ شہلا کی آنکھیں بند تھیں، عارف کے بازو پر اس کی گردن پیچھے کو ڈھلک گئی تھی۔ اس کا بند بند کانپ رہا تھا۔ پھر وہ سنبھلے۔ ایک چٹان پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بالکل خاموش بیٹھے رہے۔ شہلا نے ایک سنگریزہ اُٹھایا اور دوسرے سنگریزہ سے اُس پر عارف کا نام لکھ دیا۔ شہلا کو خبر نہیں لیکن محبت کی یہ یادگار آج بھی عارف کے پاس محفوظ ہے۔"

میں نے اپنی کئی سہیلیوں کو آپ کا یہ افسانہ سُنایا۔ سب نے یہی کہا۔ "قیامت کی ہے ظالم نے"۔ معاف کیجئے گا میں نے دوسروں کی ایک پرائیویٹ بات آپ سے کہہ دی۔ قیامت پر قیامت یہ ہوئی کہ اتفاق سے ہماری سہیلیوں میں سے ایک کا نام ہی شہلا۔ وہ ابھی پہاڑ سے آئی ہے۔ سب نے اُسے بنانا شروع کیا کہ سچ بتا شہلا! کون ہیں یہ عارف صاحب؟ کہاں ملاقات ہوئی تھی؟ اور شہلا تھی کہ کٹی جاتی تھی۔ معاف کیجئے گا میری اس بے سروپا تحریر کو۔ اس قدر لکھنے کا ارادہ نہ تھا۔ کہنا صرف یہ تھا کہ میں اپنے آپ کو اس قابل تو نہیں سمجھتی کہ آپ جیسے ایک سحر طراز ادیب کے ایک شاہکار کی داد دوں مگر جی نہ مانا اور بے اختیار یہ سطریں قلم سے نکل گئیں۔ رسید کا انتظار کروں گی۔ کیا آپ اپنی رنگین تحریر سے شادکام فرمائیں گے۔ اور ہاں اگر مضائقہ نہ ہو تو اپنا پتہ بھی عنایت کیجئے۔ رسالے کی معرفت خط بھیجنا کچھ اچھا نہیں لگتا۔

منتظرِ التفات
خاکسار شاہدہ
پارک ویو پیلیس۔ میرٹھ

خط پڑھنے کے بعد میں نے کہا رشید تم نہایت تیزی کے ساتھ تباہی کی طرف جا رہے ہو۔ اُس نے کہا اچھا نصیحت بعد میں کیجئے گا پہلے خط تو سُن لیجئے یہ کہہ کر اُس نے دوسرا لفافہ کھولا۔ اس میں خط کے ساتھ کسی رسالے کا کٹنگ بھی تھا۔

ریاض صاحب نے اپنے پیکٹ میں سے وہ خط اور کٹنگ نکالا اور خط پڑھنا شروع کیا:-

گل اِسٹان، بیڈن روڈ۔ لاہور۔
۷ ستمبر ۱۹۴۱ء

جناب آفتاب صاحب! معاف فرمائیے گا میں خواہ مخواہ دخل در معقولات کی مرتکب ہو رہی ہوں۔ کل میری ایک سہیلی نے اس مہینے کا رسالہ "آوازہ" مجھے دیا۔ اور بڑی تعریفوں کے ساتھ آپ کا افسانہ "تجربہ" پڑھنے کی سفارش کی۔ میں نے اُسے پڑھا اور میں بیان نہیں کر سکتی کہ اسے پڑھ کر مجھے کتنا رنج اور کتنا صدمہ ہوا۔ خدارا بتائیے کہ سوسائٹی نے آپ کا کیا گناہ کیا ہے جو آپ اس قسم کی زہریلی تحریروں سے اُس کی اخلاقی فضا کو مسموم کرنے پر تُلے ہوئے ہیں۔ آپ کو کچھ اندازہ ہے کہ اس قسم کی عریاں اور جذبات میں ہیجان پیدا کرنے والی تحریروں کو پڑھ کر نوجوان لڑکیوں اور لڑکوں پر کیا اثر ہوتا ہوگا۔ کاش آپ سمجھتے کہ اس قسم کے افسانے لکھ لکھ کر آپ کتنے معصوم دلوں کو معصیت کے غار میں دھکیل رہے ہیں۔ کتنے شریف گھروں میں رسوائی اور بدنامی کے بیج بو رہے ہیں۔ کتنی پُرسکون زندگیوں میں جذبات کا طوفان برپا کرکے اُنہیں تباہی کی طرف لے جا رہے ہیں۔ کاش قانون کا شکنجہ اتنا وسیع ہوتا کہ آپ اُس کی گرفت میں آسکتے اور قدرت نے آپ کو جو صلاحیتیں دی ہیں اُنہیں اس طرح برباد نہ کرتے۔

آپ کے افسانے کا ایک ٹکڑا "آوازہ" میں سے تراش کر بھیج رہی ہوں۔ خدارا ذرا آپ اسے سنجیدگی کے ساتھ پڑھیئے اور دیکھئے کہ آپ نے خود اپنے اوپر اور دوسروں پر کتنا بڑا ظلم کیا ہے۔ خدا حافظ۔

آپ کے عذاب کی سزاوار

صبیحہ

میں نے ریاض صاحب سے کہا۔ رسالے کا وہ کٹنگ بھی تو سنائیے، دیکھیں تو اس میں کیا لکھا ہے۔ ریاض صاحب نے کہا سُنیئے۔

"آہ، جاوید، میں تمہیں کیا بتاؤں کہ وہ ہونٹ کیسے تھے؟ میں نے گلابی ہونٹ بھی دیکھے ہیں اور سرخ بھی۔ میں نے ان کی تعریفیں بھی کی ہیں کبھی لعل و یاقوت سے تشبیہ دی کبھی مرجان سے کبھی گلاب کی پنکھڑی سے کبھی شراب سے، مگر سلمٰی کے ہونٹ! اُف کیا قیامت تھے سلمٰی کے ہونٹ۔ میری طرح سلمٰی بھی کبھی پان نہیں کھاتی۔ مگر اُس دن خود بھی کھایا اور مجھے بھی کھلایا۔ پان کی لالی نے قہر کیا۔ گلاب کی پنکھڑیوں کو دہکتے ہوئے انگارے بنا دیا۔ جاوید "ٹھنڈی آگ" تم نے سُنی ہوگی مگر کبھی دیکھی نہ ہوگی۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی اور اپنے لبوں سے محسوس کی۔ جاوید کن لفظوں میں بیان کروں اُن ہونٹوں پر پان کی سُرخی کا رنگ تمہیں یاد ہوگا، ایران میں ہم نے پہاڑی جکور دیکھا تھا۔ اُس کی سُرخ منقار بھولے تو نہ ہوگے۔ بس سلمٰی کے ہونٹ بھی کچھ ایسے ہی ہو گئے تھے۔ مگر اس سُرخی میں ایک عجیب قسم کی چمک تھی۔ جیسے ہیرے کی جوت۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُن میں رس بھرا ہوا ہے کہ چھوتے ہی ٹپک پڑے گا۔ بالکل پکی چیریوں Cherries کی طرح۔ وہی سُرخ رنگ، وہی میٹھا رس۔ مگر چیری کے رس میں وہ مستی کہاں جو سلمٰی کے ہونٹوں کے رس میں تھی۔ امرت کے یہ ساگر بے اختیار میرے لبوں کو اپنی طرف کھینچے لیتے تھے ضبط دشوار تھا، اور جلد ہی ناممکن ہوگیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ بیان کی حدوں سے خارج ہے تصور کے آئینہ میں تم اُس تصویر کا صرف ایک رُخ دیکھ سکتے ہو، یعنی ظاہری۔ وہ باطنی کیفیت جو اس وقت میرے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھی وہ نہ تم سمجھ سکتے ہو نہ میں سمجھا سکتا ہوں۔

تم کہہ سکتے ہو آخر وہ ایسی کونسی نئی کیفیت تھی جو دُنیا میں کبھی کسی نے محسوس نہیں کی؟ یہی نا کہ دو چاہنے والوں کے لب باہم پیوست ہوگئے تھے۔ پھر یہ تو کوئی ایسی نئی بات نہیں۔ ہر روز ایسا ہوتا ہے، ہر وقت ایسا ہوتا ہے۔ ہاں! تم سچ کہتے ہو جاوید! آرزومند لبوں کا آپس میں ملنا کوئی نئی بات نہیں۔ خود میرے لئے بھی یہ تجربہ نیا نہیں۔ منہ بند کلیاں بھی میں نے چوسی ہیں۔ تازہ کھلے ہوئے پھولوں کا رس بھی لیا ہے۔ میرے لبوں نے اُن پھولوں کے مخملیں لمس سے بھی تسکین پائی ہے جو ہنوز شاخ سے جُدا نہیں ہوئے۔ اور اُن پھولوں سے بھی جو ہار میں گوندھے جا چکے۔ جسم میں ایک سنسنی، ایک ارتعاش۔ رُوح میں ایک بے خودی، ایک اہتزاز یہ سب کیفیتیں میں نے محسوس کی ہیں مگر جاوید سلمٰی کے ہونٹوں نے مجھے جس عالم میں پہنچا دیا تھا وہ میرے لئے بالکل نیا تھا۔ وہ کیفیت ان تمام کیفیتوں سے بالکل جُدا تھی جو میں نے اپنی زندگی میں محسوس کی ہیں۔ اسی لئے میں نے کہا تھا کہ نہ تم اُسے سمجھ سکتے ہو نہ میں سمجھا سکتا ہوں۔

جس وقت سلمٰی کا سر میرے زانو پر اور اُس کا جسم میرے آغوش میں تھا۔ اس کے چہرے کی چمک دوبالا تھی جس وقت میں نے جُھک کر اپنا مُنہ سلمٰی کے مُنہ پر رکھ دیا۔ اسوقت مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ہزاروں بجلیاں میری رگوں میں دوڑ گئیں اور لاکھوں ستارے میری آنکھوں کے سامنے ناچ رہے تھے۔ ایک نیم بیہوشی کی سی کیفیت میرے حواس پر چھائی ہوئی تھی، سلمٰی کے ہونٹ تھرتھرا رہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں ایک خماری کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔ اس کی سانس تیز تیز چل رہی تھی اور اس کا خوبصورت سینہ موجوں کی طرح بار بار بلند ہوتا تھا میرے سینے سے مل جانے کیلئے۔"

رسالہ کا کٹنگ ختم کرنے کے بعد ریاض صاحب نے صبیحہ کا خط سُن کر رشید سے کہا: دیکھا تم نے کیسا طمانچہ لگایا اس شریف لڑکی نے تمہارے مُنہ پر۔ اور لکھو عریاں تجربے۔ رشید مُسکرا کر بولا۔ "ریاض بھائی آپ تھوڑا سا صبر کیجئے۔ یہی اخلاق کی معلمہ رشید کے انہیں بے پناہ تیروں سے گھائل ہوگی اور رشید کی ایک نگاہِ لُطف پر اپنا سب کچھ مٹا دینے کے لئے تیار ہوجائے گی۔ اب میں ساری توجہ اسی آہوئے وحشی کے رام کرنے میں صرف کروں گا۔" میں نے

کہا رشید، اس خطرناک کھیل میں شرمساری اور ندامت کے سوا اور کچھ بھی تمہارے ہاتھ نہ آئے گا۔ اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ چار مہینے گذر گئے اور اس اثنا میں اس ظالم نے خدا جانے کیا سحر کیا کہ صبیحہ نادیدہ اس پر جان دینے لگی۔ آپس میں تصویروں کا مبادلہ ہوا۔ اس نے طرفین کے شوق کی آگ کو اور بھی بھڑکا دیا۔ صبیحہ کی تصویر میں نے بھی دیکھی تھی۔ بڑی پیاری صورت تھی۔ بس تصویر تھی۔ صیّاد اپنے بچھائے ہوئے جال میں خود ہی پھنس گیا۔ یوں تو وہ صبیحہ کی تحریروں ہی پر لٹو تھا لیکن تصویر دیکھنے کے بعد تو وہ اُسے اپنے قلب و روح کی انتہائی گہرائیوں سے چاہنے لگا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو تحفے بھی بھیجے۔ صبیحہ نے رشید کو لاہور بلایا۔ لاہور جاتے وقت وہ بے انتہا مسرور تھا۔ میں نے کہا رشید، قدرت کو تمہاری نامرادی پر ترس آ گیا۔ اُس نے کہا ہاں ریاض بھائی آپ سچ کہتے ہیں۔ آج مجھے اپنی قسمت پر ناز ہے۔ میں کہتا تھا قسمت نے میرے ساتھ دغا کی مگر آج معلوم ہوا کہ یہ سب کچھ میری بہتری کے لئے تھا۔ ربیعہ کو نہ کھوتا تو صبیحہ کو کیونکر پاتا۔ قدرت نے ایک پھول چھین کر، میرا دامن پھولوں سے بھر دیا۔ ایک ستارہ لے کر مجھے کہکشاں کا مالک بنا دیا۔ وہ لاہور گیا۔ ایک ہوٹل میں ٹھہرا۔ دونوں ایک دوسرے سے مل کر اس درجہ خوش ہوئے گویا انہوں نے اپنے حاصل زندگی کو پالیا۔

صبیحہ اپنے باپ کی اکلوتی اور بہت ہی لاڈلی بیٹی تھی۔ دولت کی فراوانی تھی۔ عمر بھر ناز و نعمت کے گہواروں میں پلی تھی۔ اس نے اپنے باپ کو سب کچھ بتا دیا اور یہاں تک کہہ دیا کہ ابا میری زندگی اور زندگی کی کوئی مسرت اب "آفتاب" کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی"۔ باپ نے بیٹی کی خوشی کو ہر چیز پر مقدم سمجھا۔ آخر تینوں کی ملاقات کا وقت مقرر ہوا۔ گل افشاں میں "آفتاب" کی دعوت ہوئی۔ آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ اُس وقت فرطِ مسرت سے رشید کا کیا حال ہوا ہوگا۔ وہ تینوں ملے اور چند ہی منٹ کے بعد انہیں معلوم ہوگیا کہ سورج پچھم سے نکل سکتا ہے۔ پانی بلندی کی طرف بہ سکتا ہے۔ ہر ناممکن چیز ممکن ہوسکتی ہے۔ مگر صبیحہ اور رشید قیامت تک ایک دوسرے کے شریکِ زندگی نہیں بن سکتے۔

پوچھنے پر جس وقت رشید نے اپنا اصلی نام بتایا اور اپنے والد کا نام لیا تو صبیحہ کے والد پر ایک بجلی سی گری۔ معلوم ہوتا تھا انہوں نے کوئی سخت بھیانک خواب دیکھا ہے۔ اُن کے چہرے پر پسینے کے قطرے چھلکنے لگے۔ صبیحہ اور رشید اُن کی یہ حالت دیکھ کر گھبرا گئے۔ بس انہوں نے اِتنا کہا: "ہائے بدقسمت ماں کی بدقسمت بیٹی"۔ اور دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ پھر بے اختیار اُن کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ رشید اور صبیحہ دونوں سخت پریشان تھے۔ کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ کیا معمہ ہے۔ آخر انہوں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا: "رشید تم مجھے نہیں جانتے؟ خان بہادر میاں عبدالحکیم کا نام تم نے کبھی سُنا ہے؟" اتنا سُننا تھا کہ معلوم ہوا رشید کی روح کسی نے سلب کر لی۔ خدا جانے وہ کیوں یکایک کھڑا ہوگیا۔ ایک آہ کی اور تیورا کر گرا۔ سر ایک کُرسی سے ٹکرا کر شق ہوگیا۔ فرش پر خون ہی خون تھا۔ پھر جو ہوش آیا تو ہوش ہمیشہ کے لئے اُس سے رخصت ہوچکا تھا۔ بہت دوا دوش کی گئی بے سود۔ اب کتنے دنوں سے یہاں رانچی میں ہے مگر اُس کی حالت میں کوئی فرق نہیں۔ دن رات بیٹھا خط لکھا کرتا ہے۔ کبھی کبھی میں اُسے دیکھنے جاتا ہوں۔ اُس نے میری صورت دیکھی اور چلایا کہ "وہ مارا، قسم خدا کی وہ مارا، ریاض بھائی میں کامیاب ہوگیا، واللہ کامیاب ہوگیا۔ آ گئی مچھلی جال میں"۔ فراڈ زندہ باد نیا ادب زندہ باد"۔

کولتار
اس کتاب میں پندرہ انتہا سے زیادہ دلچسپ اور مزاحیہ افسانے ہیں اور یہ سب افسانے مل کر کتاب کو پورا پورا مزاحیہ ناول بنا دیتے ہیں۔ مزاحیہ نگاری اور افسانہ نویسی کا اگر کمال دیکھنا ہو تو یہ کتاب ضرور پڑھیئے، اپنی طرز کا پہلا ناول ہے۔ شاہدہ کی زبردستی شادی کے لطیفے نے قصہ میں چار چاند جڑ دیئے ہیں۔ جمّو دالی کی داستانِ محبت بھی دیکھنے کے لائق ہے۔ قصہ مختصر اس دلچسپ اور مزاحیہ ناول کو شروع کرنے کے بعد ختم کئے بغیر رکھنا مشکل ہے۔ قیمت دو روپے (عہ) علاوہ محصولڈاک۔
ملنے کا پتہ:- ساقی بک ڈپو، دہلی۔

فضل حق قریشی دہلوی

"زندگی میں دو دفعہ"

جمعہ کے روز شام کے وقت جب میرے دوست احباب اہتمامیہ۔ احتراماً کھانا کھانے کے لئے ایک ساتھ کسی غیب شپ کرتے اور پھر شام کا کھانا کھانے کے لئے ایک ساتھ کسی ہوٹل میں جانے لگتے ہیں، تو عموماً مجھے بھی شرکت کی دعوت دی جاتی ہے۔ ایک صاحب کہتے ہیں:

" بندہ خدا! آج ہمارے ساتھ چلو۔ آج جمعہ کے دن گھر میں کیا رکھا ہوگا۔ بدمزہ کھچڑی یا دال کے لئے تجویز کی جاتی ہے، پتلی دال جو لالہ بھائی ترس تا کھا جاتا ہے اور جس سے پٹھان بہت چڑتے ہیں یا پھر آخری صورت آلو میتھی کی بھجیا جیسے غریب لوگ ہیں کچھ ملنے کی صورت میں غنیمت سمجھ لیتے ہیں۔ بھلا ان میں سے کونسی چیز تمہیں مرغوب ہے جو گھر بیٹھے کھائی جاتی ہے اور تم کبھی ہمارا ساتھ دینے کے لئے تیار نہیں ہوتے ہو۔ خدا لو دیتے ہیں گوشت کے بعد پیٹ تو بھر جاتا ہے مگر طبیعت کی آسودگی ہرگز نصیب نہیں ہوسکتی۔ نہ جانے دہلی کے قصائیوں نے جمعہ کے دن کیلا نہ کرنے کی قسم کیوں کھا رکھی ہے۔ کوئی بھلا مانس ان سے جا کر کہتا بھی نہیں کہ تھوڑا بہت کفارہ ادا کرکے یہ قسم توڑ دو جمعہ کے دن گوشت مل جایا کرے تو ہم بھی ہوٹل کا جانا چھوڑ دیں۔"

دوسرے بزرگ اُس زالتوانجن کی طرح جو منہ پر زور لگانے کی غرض سے کالکا کی گاڑی میں کے اسٹیشن ہی سے جوت دیا جاتا ہے، مجھے اغوا کرنے کی کوشش کو ناکام جاتے ہوئے دیکھ کر کہتے:

" معلوم ہوتا ہے یہ اپنی بیگم جان سے بہت ڈرتے ہیں اسی لئے باہر کے کھانے سے ہمیشہ پرہیز رہتا ہے اور شام کو سویرے سے گھر بھاگ جانا بھی چلتے ہیں!"

جب یہ حملہ بھی بے اثر رہتا تو تیسرے کرم فرما زیادہ سخت طنزیہ پیرایہ اختیار کرتے ہوئے لب کشائی کرتے:

"اماں! کس کنجوس سے کہہ رہے ہو۔ ہم جانتے ہیں یہ پرلے درجے کا یہودی واقع ہوا ہے۔ ہوٹل کے خرچ کو اسراف بے جا سمجھتا ہے۔ بھلا پھر کس طرح تمہارے ساتھ شریک طعام ہو جائے۔"

یہ سُن کر چوتھے منفق میرے ذاتی جذبات کا لحاظ نہ رکھتے ہوئے باتی سمجھ کہنے ہیں:

" اگر یہ بات ہے تو انہیں مہمان بنا کر لے چلو۔ ان کے حصے کی رقم ہم سب مشترکہ طور پر ادا کر دیں گے۔"

اس آخری مشفقانہ رائے کو سُن کر میرے تن بدن میں آگ تو ضرور لگتی ہے مگر میں ہمیشہ غصے کو پی جاتا ہوں کیونکہ میں کسی قیمت پر بھی وہ راز ان پر ظاہر کرنا نہیں چاہتا جو مجھے ہوٹل میں جانے سے ہمیشہ مانع رکھتا ہے۔ لہذا میں ایسے نت نئے جیسے تراش کر جن کی بنیاد حقیقتاً کچھ بھی نہیں ہوتی، ان کے سامنے اپنی مجبوریاں پیش کرتا ہوں جن کو وہ تھوڑی بہت رد و قدح کے بعد تسلیم کر لیتے ہیں اور مجھے باسانی ان سے چھٹکارا نصیب ہو جاتا ہے۔

یہ بالکل حقیقت ہے کہ جمعہ کی شام کو میں بھی گھر کا کھانا بالکل بے دلی سے کھاتا ہوں۔ نیز میں نہ تو اپنی شریک حیات سے ڈرتا ہوں اور نہ وہ غریب کم سخن میرے گھر سے باہر رہنے پر معترض ہوتی ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ میں انہی دوستوں کے ساتھ اکثر سینما جانا اور کبھی کبھی تھیٹر میں ایسے کھیل دیکھ کر رات کی سیاہی کو دن کے اُجالے سے ملاتا ہوں جو اوّل شب سے شروع ہو کر نمودِ سحر تک کی خبر لاتے ہیں۔ پھر میرے بڑھے ہوئے اخراجات کی فردِ حساب آسانی سے اس الزام کی تردید کر سکتی ہے کہ میں کنجوس ہوں۔ میں بارہا اپنی آمدنی سے زیادہ خرچ کرکے مقروض ہو جاتا اور قالنو رقم کو قسط وار کئی ماہ میں ادا کرتا یا کسی اور ذریعہ آمدنی سے اس خلیج کو پُر کرنے کی صورت نکالتا ہوں۔

اصل بات یہ ہے کہ میں ہوٹل کے کھانے سے نہیں بلکہ ہوٹل کے نام سے، اس کی چہار دیواری سے اور اس کے مجرمانہ ماحول سے دُور رہنا چاہتا ہوں۔ مجھے اپنی زندگی میں دو دفعہ ایسے تلخ

تجربے اٹھانے پڑے ہیں کہ میں نے ہمیشہ کے لئے تہیہ کرلیا کہ کبھی بھول کر بھی ہوٹل کے اندر قدم نہیں رکھونگا۔ میں نے ان تلخ تجربات کی رُوداد اپنے کسی دوست کے سامنے بیان نہیں کی، محض اس لئے کہ وہ اُلٹا میرا ہی مذاق اُڑائینگے۔ وہ کہینگے کہ یار تم اچھے خاصے عقلمند ہوکر خوب اُلّو بنے۔

میں ان دونوں موقعوں کی تفصیل آپ کے سامنے اس لئے پیش کررہا ہوں کہ آپ نے ضرورت سے زیادہ اصرار کیا ہے اور آپ کے الفاظ کا احترام کرنا میرا فرض ہے۔ لیکن دیکھئے۔ شرط یہ ہے کہ آپ اس راز کو اپنے سینے میں اچھی طرح محفوظ رکھیں۔ میرے کسی دوست کے کانوں تک۔ اس کی بھنک بھی پہنچی تو نتیجہ بُرا رہے گا۔ وہ زبردست احتیاط جو اب تک برتی گئی ہے، آپ کی ذراسی لغزش سے خاک میں مل جائے گی۔

پہلی دفعہ۔ دو تین سال۔ پہلے کا ذکر ہے۔ گرمی کے دن تھے جب لُو کے تھپیڑے میدان کی فضا کو ناقابلِ برداشت بنا دیتے ہیں، میری شریکِ حیات شملہ پہاڑ پر اپنی بڑی بہن کے ہاں بطور مہمان مقیم تھی، ور میں دفتر سے چھٹی نہ مل سکنے کے باعث شریکِ سفر نہ ہوسکا تھا۔ اس لئے دونوں وقت کا کھانا حسبِ موقع کسی ہوٹل میں کھالیتا تھا۔ صرف ایک ہوٹل کو مخصوص کرنے کی ضرورت اس لئے لاحق نہیں ہوتی تھی کہ میری نگاہ میں وہ سب کے سب ہر لحاظ سے خصوصاً نقائص کے اعتبار سے یکساں تھے۔

ایک روز جمعہ کے دن میں "شاہ بڑے" کے قریب لگنے والا دنگل دیکھکر لوٹا تو پہلوانوں کے داؤں پیچ پر دل ہی دل میں تبصرہ کرتا ہوا "نشاط سینما" کے قریب تک پہنچ گیا۔ بھوک لگ رہی تھی۔ "شریف ہوٹل" سامنے تھا، اسلئے اسی میں چلا گیا۔

بڑے ہال کی سب میزیں پوری کرسیوں کے ساتھ رُکی ہوئی تھیں البتہ ایک کونے والی میز پر ایک بڑے میاں تنہا بیٹھے کھانا کھارہے تھے۔ ان کے سامنے کی کرسی خالی پڑی تھی۔ میں اُن کی طرف بڑھا اور میز کے قریب جاکر کہنے لگا:-

"اگر آپ کی اجازت ہو تو میں اس خالی کرسی پر بیٹھ جاؤں"

اُنھوں نے نظر اُٹھاکر میری طرف دیکھا، میری ظاہری حالت کا جائزہ لیا اور بڑی شرافت سے کہا۔

"ضرور ضرور۔ بھلا مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔ آپ تشریف رکھیں اور ماحضر تناول فرمائیں"

میں شکریہ ادا کرتے ہوئے بیٹھ گیا اور بوائے کا منتظر رہا کہ ان میں سے کوئی فارغ ہوکر میری طرف آئے تو کھانوں کی تفصیل دریافت کرکے اپنی فرمائش پیش کروں۔ لیکن حد سے زیادہ بڑھی ہوئی مصروفیت کے باعث ان میں سے کوئی بھی میری جانب متوجہ نہ ہوا حتیٰ کہ وہ بڑے میاں مُصر ہوئے کہ میں کچھ دیر کے لئے انہی کے ساتھ شریکِ طعام ہوجاؤں۔ دل تو نہیں چاہتا تھا مگر اُن کے اصرار نے مجبور کردیا۔ اور میں بڑے تکلف کے ساتھ آلو کی ایک ٹکیہ علیحدہ رکابی میں لے کر کھانے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد بوائے آیا تو میری لب کشائی سے قبل انہی نے میری جانب سے چند چیزوں کی فرمائش کردی۔

کھانے کے دوران میں ہم دونوں خوب گھل مل کر باتیں کرتے رہے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ بڑے میاں کافی دلچسپ انسان ہیں۔ پہلوانوں کے دنگل سے لے کر شاعروں کی محفل تک وہ ہر موضوع پر تبادلۂ خیال کرسکتے تھے۔ اگرچہ اُن کی بے پر کی باتوں میں کوئی وزن نہیں تھا بلکہ بہت سے خیالات بے سروپا تھے مگر میں ان سے اُکتا نہ سکا۔ میں اپنے اس میلان پر خود متعجب تھا کیونکہ بعض احباب سے یہ بھی سُن رکھا تھا کہ ایسے بوڑھے اور نحیف و کمزور لوگ مخنث اور خطرناک ہوتے ہیں وہ نوجوانوں کی تلاش میں اِدھر اُدھر مارے پھرتے ہیں اور اپنے دام میں پھنسا کر خوب اُلّو بناتے ہیں۔ لیکن اس خوف کے باوجود کسی قسم کا اجتناب کرنے کی بجائے ان کے ساتھ اس طرح بے تکلف ہوتا چلا گیا گویا ہم دونوں میں کوئی وقتی نہیں بلکہ دیرینہ واقفیت ہے۔

چونکہ میں بہت دیر بعد شامل ہوا تھا۔ اس لئے وہ بزرگ قدرتی طور پر مجھ سے پہلے اُٹھ گئے اور نل پر ہاتھ وغیرہ دھوکر منیجر کی میز کی طرف بڑھے۔ میں سمجھ گیا کہ وہ میرے کھانے کی قیمت بھی اپنی جیب سے ادا کرنی چاہتے ہیں۔ میں نے ارادی طور پر نگاہیں نیچی کرلیں اور جلدی جلدی آخری لقمے کھانے میں مصروف ہوگیا۔ ایک ہی لمحہ بعد وہ میرے قریب آئے، بڑی گرمجوشی سے مصافحہ کیا اور اپنی چھتری اُٹھاکر مجھے "شب بخیر" کہتے ہوئے چلے گئے۔

میں نے خواہ مخواہ اپنے دل میں فرض کر لیا کہ وہ ضرور میرے بل کی رقم بھی ادا کر گئے ہیں۔ اور اسی لئے خوش تھا کہ چلو آج مفت کی دعوت رہی۔ لیکن کچھ دیر کے بعد جب بوائے کھانے کا بل لایا تو میرے ہوش اُڑ گئے۔ بل میں [illegible] ساڑھے نو روپے درج تھے۔ میں نے گھبرا کر کھانوں کی تفصیل پر نظر ڈالی۔ بریانی، قورمہ، شاہی ٹکڑے، چٹنی، کباب، آلو کی ٹکیاں، بہاڑکھے، چپاتیاں، دال اور [illegible] لکھا ہوا تھا۔

ان میں سے آخر الذکر تین معمولی چیزیں یعنی آلو کی ٹکیہ کے ساتھ میں نے کھائی تھیں۔ باقی کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس لئے میں نے ذرا گھبرا کر بوائے سے کہا:

"نہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ یہ بل میرا نہیں ہے۔ بھلا اتنی چیزیں میں نے کب کھائی ہیں؟"

"بے شک!" بوائے نے ادب سے کہا۔ "آپ نے نہیں کھائیں لیکن آپ کے چچا جان تو سب کچھ کھا گئے ہیں!"

"میرے چچا جان!" میں نے انتہائی حیرت کے عالم میں دریافت کیا۔ "وہ کب؟"

"ابھی ابھی آپ کے ساتھ ہی تو کھا رہے تھے۔ جاتے وقت اُنہوں نے منیجر صاحب سے کہہ دیا تھا کہ میرا بھتیجا کھانے سے فارغ ہو کر بل کی ساری رقم ادا کر دیگا۔"

مجھے ایک دم ڈر ہوا کہ کہیں میرے دل کی حرکت بند نہ ہو جائے۔

اُس وقت تک میں نے جو کچھ کھایا تھا، مجھے زہر ہو کر لگنے لگا اور جو بچا کھچا میز پر باقی تھا، وہ زہر سے بھی زیادہ خطرناک نظر آنے لگا۔

میں نے خاموشی سے اُٹھ کر ہاتھ دھوئے اور با دلِ ناخواستہ بل کی رقم ادا کر کے باہر چلا گیا۔ منیجر سے بحث کرنی فضول تھی۔ قریب بیٹھنے والے سبھی لوگ مجھے مشکوک نظروں سے دیکھنے لگتے۔ کوئی بھی یہ باور کرنے کے لئے تیار نہ ہوتا کہ وہ شخص جس سے میں اس قدر ہنس ہنس کر بے تکلفی سے باتیں کر رہا تھا میرے لئے بالکل انجان تھا۔

میں تیزی سے باہر نکلا کہ شاید وہ بُوڑھا کھوسٹ کہیں نظر آجائے تو اُسکی خبر لوں۔ مگر یہ ممکن نہ ہو سکا۔

دوسری دفعہ:- دوسرا واقعہ بھی تقریباً انہی دنوں کا ہے۔ آفتاب کی تیزی کم نہیں ہوئی تھی۔ شریکِ حیات بدستور شملے کی خوشگوار فضا میں براجمان تھیں اور میں دہلی کی شہری گرمی میں جل بھُن رہا تھا۔

میں نے جاتے وقت انہیں کافی رقم نقد دیدی تھی تاکہ خرچ میں کسی قسم کی تنگی نہ ہو مگر ان کی فرمائشوں کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ اس لئے آئے دن مجھے کچھ نہ کچھ بذریعہ پارسل بھیجنا پڑتا تھا۔ کبھی بیلیں، فیتے اور ریشم۔ کبھی زردہ چھالیہ اور پان۔ اور کچھ نہیں تو عبدالحمید کی دُکان کا حبشی حلوہ سوہن جو ساری دُنیا میں اپنی نظیر آپ ہے۔ نتیجہ یہ کہ مہینے کے آخر تک بجٹ میں گنجائش نہ رہی۔ میری جیب تقریباً خالی ہو گئی۔ صرف دس روپے کا ایک نوٹ باقی تھا۔ اور تنخواہ ملنے تک ڈھائی دن، یا یوں کہو کہ ناشتے کے علاوہ پانچ وقت کا کھانا ہوٹل میں کھانا تھا۔ یہ رقم صرف کھانے کے لئے تو کافی ہو سکتی تھی مگر مجھے کئی ضروری چیزیں بھی خریدنی تھیں۔ اس لئے میں نے تہیہ کر لیا کہ ذرا کفایت شعاری سے کام لوں گا۔ اور اس کی عملی صورت یہی ہو سکتی تھی کہ چند دن کے لئے دوسرے درجے کے ہوٹلوں میں جانا شروع کر دوں۔

میری قیام گاہ سے کچھ دُور، پُل بنگش سے ذرا آگے بڑھ کر ایک معمولی ہوٹل ہے "نشاط ہوٹل" جس میں نام کے سوا کوئی خاص جاذبیت نہیں ہے۔ مگر میں نے ان ڈھائی دنوں کے لئے اس کو پسند کیا۔ اس کے سوا چارہ کار بھی کیا تھا۔

اُنتیس تاریخ کی صبح کو نو بجے کے قریب میں اس ہوٹل میں گیا تو وہاں تقریباً سوفتہ تھا۔ مشکل سے دو یا تین آدمی الگ الگ بیٹھے کچھ کھا پی رہے تھے۔ میں بھی ایک دور افتادہ میز پر جا کر بیٹھ گیا۔ اور ملازم کو بُلا کر بہت جلد کھانا لانے کے لئے کہا۔ کیونکہ دفتر پہنچنے میں دیر ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ میں نے قورمے کی نصف پلیٹ، چار چپاتیاں اور آلو کا تھوڑا سا سالن منگایا۔ لیکن یہ چیزیں ابھی آئی بھی نہیں تھیں کہ ایک اور صاحب تشریف لائے جو بُوڑھے تو نہیں بلکہ ادھیڑ عمر کے ضرور تھے۔ میرے سامنے کی کُرسی خالی پڑی تھی۔

میرے قریب آکر وہ آہستہ سے بولے:-

"اگر آپ کی اجازت ہو تو میں اس خالی کرسی پر بیٹھ جاؤں"۔

پچھلے واقعہ کی بہت سی باتیں میرے ذہن میں تازہ ہوگئیں۔ میرے دماغ کی فکری صلاحیتوں نے بڑی تیزی سے کام کرنا شروع کیا۔ میں نے سوچا کہ آج کیوں نہ اس نو وارد کو اسی طرح بے وقوف بناؤں جیسے اُس روز وہ بڑے میاں مجھے اُلو بنا کر چلتے بنے تھے۔ لہٰذا میں نے بالکل وہی رویہ اختیار کرتے ہوئے کہا:-

"ضرور ضرور۔ بھلا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ آپ تشریف رکھیں۔ میں نے کھانے کا آرڈر دیدیا ہے۔ آپ میرے ساتھ شریکِ طعام بھی ہو سکتے ہیں"۔

اس نے اپنی جیب سے اخبار نکالتے ہوئے میری "دعوت" کا شکریہ ادا کیا اور کہا:-

"میں صرف چائے پیونگا"۔

"تو پھر کیا مضائقہ ہے۔ میں چائے کی فرمائش بھی کر دیتا ہوں"۔

اُس نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا کہ آخر یہ نوازش کیوں ہو رہی ہے۔ اور پھر میرے مسلسل اصرار پر ہار مان لی۔ میں نے بآوازِ بلند ملازم سے کہا:-

"بھئی دیر نہ کرو۔ کھانا جلدی لاؤ۔ اور چائے کی ایک پیالی بھی ساتھ لانا"۔

نو وارد نے اخبار پڑھنا شروع کر دیا۔ دہلی کا مشہور اخبار "انجام" جو تازہ پھلوں کی طرح بازار میں آتے ہی ہاتھوں ہاتھ بک جاتا ہے۔

"کوئی تازہ خبر"۔ میں نے آغازِ گفتگو کے لئے ایک بہانہ ڈھونڈا۔

"ابھی مطالعہ نہیں کیا۔ خرید کر سیدھا چلا آ رہا ہوں"۔ اور پھر بیچ کا صفحہ نکال کر میرے سامنے میز پر پھیلاتے ہوئے کہا "لیجئے آپ خود شوق فرمائیں"۔

لیکن عین اُس وقت ملازم کھانا اور چائے لے آیا۔ اور میں نے اخبار کا صفحہ ایک طرف رکھ کر کھانا شروع کر دیا۔ تاہم باتوں کا سلسلہ جاری رکھا۔ تاکہ وہ اطمینان سے اخبار نہ پڑھ سکے اور میرے جانے کے وقت تک بیٹھا رہے۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ منیجر سے یہ کہکر چلے جانیکی کوشش کرونگا کہ بل کی رقم میرے "چچا جان" ادا کریں گے۔ میں دو تین بار پہلے بھی اس ہوٹل میں کھانا کھا چکا تھا اور منیجر مجھے پہچاننے لگا تھا۔ اس لئے یہ بات اسے باور کرا دینی کچھ مشکل نہیں تھی۔

دو چار لقمے لینے کے بعد ہی میں نے محسوس کیا کہ کھانے میں مرچیں غیر معمولی طور پر زیادہ ہیں۔ میں کم مرچ کا عادی ہوں۔ نتیجہ یہ کہ میری آنکھ ناک سے پانی بہنے لگا اور انہیں صاف کرنے کے لئے مجھے کئی بار اپنی جیب سے رومال نکالنا پڑا۔

میری یہ حالت دیکھ کر میرے "متبنّی چچا جان" نے مسکرا کر کہا:-

"معلوم ہوتا ہے کہ تم دہلی کے باشندے نہیں ہو۔ یہاں تو بہت زیادہ مرچیں کھائی جاتی ہیں اور اس سالن میں کچھ بھی زیادہ معلوم نہیں ہوتیں۔ منہ ٹھنڈا کرنے کے لئے کوئی میٹھی چیز منگا لو نا"۔

اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے خود ملازم کو آواز دیکر کہا۔

"بھئی۔ فیرنی کی ایک پلیٹ لے آؤ۔ آج تمہارے سالن میں مرچیں بہت ہیں"۔

"اور چائے کی ایک پیالی بھی"۔ میں نے فوراً ملازم سے کہا۔ کیونکہ ان کی پیالی میں چائے ختم ہو گئی اور مجھے اندیشہ تھا کہ وہ اُٹھ کر چلے نہ جائیں۔

میں اپنے دل میں خوش تھا کہ چلو ان کی زبان سے فیرنی کی فرمائش سُننے کے بعد منیجر کے لئے جلدی سے یہ تسلیم کر لینا آسان ہو جائے گا کہ ہم دونوں کے درمیان کوئی قریبی تعلق ضرور ہے۔

دوسری پیالی ختم کرنے کے بعد اُنہوں نے خود ہی ایک پیالی اور منگا لی اور میں نے فیرنی کی پلیٹ پر ہاتھ صاف کرنا شروع کیا۔ لیکن اس سے قبل کہ میں کھانا ختم کروں، میری نگاہ محض اتفاق سے میز کے نیچے گئی اور میں نے دیکھا کہ وہاں ایک نوٹ تہ کیا ہوا پڑا ہے۔

میرے سارے بدن میں بجلی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ میں نے سوچا کہ اس روز میرے ساڑھے نو روپے خرچ ہو گئے تھے آج یہ دس روپے آ رہے ہیں۔ گویا پچھلا نقصان سود سمیت پورا ہو جائے گا۔

اس موقعہ پر مجھے فوراً کسی کا یہ زرّیں قول یاد آ گیا کہ اگر تم کو میز کے نیچے یا سڑک پر گرا ہوا کوئی نوٹ یا سکہ نظر

تسمئے تو سب سے پہلے اپنا پاؤں اس پر رکھ دو تاکہ دوسروں کی نگاہ نہ پڑ سکے۔ چنانچہ میں نے فوراً دایاں پاؤں ذرا آگے بڑھا کر اس پر رکھ دیا۔ اور پھر یہ سوچنا شروع کیا کہ اسے اٹھایا کس طرح جائے۔ حقیقتاً یہ آسان کام نہیں تھا۔

میں نے فیصلہ کیا کہ اپنا پاؤں وہاں سے نہ ہٹاؤں گا تاوقتیکہ وہ شخص اپنی چائے ختم کر کے وہاں سے چلا نہ جائے جسے میں پہلے ہی اپنا حریف ظاہر کرنے کے منصوبے کا نتیجہ چکا تھا۔ ظاہر ہے کہ میں اس کے جانے کے بعد ہی نوٹ کو آسانی سے اٹھا سکتا تھا۔

میری حیرت کی انتہا نہ رہی اور ساتھ ہی غصہ بھی آیا جب اس نے چائے کی تیسری پیالی ختم کر کے ایک اور منگا لی۔ میں نے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے اس سے کہا:

"چائے کی زیادتی ہمیشہ نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم چائے پینے کے بہت شوقین ہو۔ اگر اس سے زیادہ پی تو چائے خشکی پیدا کرتی ہے۔ سردی کا موسم ہوتا تب بھی کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ آج کل گرمی ہے اور وہ بھی شدید قسم کی۔"

وہ یہ بات سن کر مسکرایا اور اپنی جیب سے سگرٹ نکال کر سگریٹ جلاتے ہوئے بولا:

"جی نہیں۔ میں بچپن سے اس چیز کا عادی ہوں اور گرمی جاڑے یکساں طور پر پی سکتا ہوں۔"

اب میرے لئے خاموش رہ جانے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ کھانا ختم کرنے کے بعد میں اپنے واسطے بھی چائے کی پیالی منگوانے کے لئے مجبور ہو گیا کیونکہ پھر ہوٹل میں بیٹھے رہنے کی صورت صرف اسی طرح ممکن ہو سکتی تھی۔ مگر میری پہلی پیالی کے ساتھ اس کی پانچویں پیالی بھی ختم ہو گئی۔

وہ مسلسل چائے پیتا، سگریٹ کے کش لگاتا اور اخبار پڑھتا رہا۔ میرے لئے بڑی مشکل تھی۔ ایک طرف دفتر جانے کو برابر دیر ہوتے جا رہی تھی اور دوسری طرف پاؤں ایک ہی جگہ جمے جمے سُن ہو چلا تھا۔

میں نے خواہ مخواہ اپنی جیب سے پنسل نکالی اور کاغذ کے ایک ٹکڑے پر کچھ ہندسے اس طرح لکھنے شروع کئے گویا اپنے پچھلے اخراجات کی تفصیل یادداشت کے لئے درج کر رہا ہوں۔ حالانکہ ایک لحاظ سے میں یہ حساب لگا رہا تھا کہ ان مفت کے دس روپوں کو کس طرح خرچ کیا جائے۔ میں نے سب سے پہلے تین روپے رکھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ایک سیر حبشی حلوا سوہن شملے جانے والے کسی واقف کار شخص کے ہاتھ شریک حیات کو بھیج دوں گا۔ تاکہ مال غنیمت میں کم سے کم تیس فیصدی کی شریک وہ بھی ہو جائے۔

میں نے سوچا کہ آج ہی شام کسی دوست کو مدعو کر کے سینما بھی دیکھوں گا۔ اور جب وقفہ ہوگا تو اسے بتاؤں گا کہ یہ دنیا مفتی کبوتر کی جا رہی ہے۔ وہ یقیناً میری خوش قسمتی کو تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ میری عقل و دانش کی تعریف کرے گا۔

مجھے ریشمی ٹائی، موزہ کی جوڑی، جیبی رومال، گھڑی کا تسمہ اور ایسی ہی دو چار چیزیں بھی خریدنی تھیں۔ غرض یہ کہ اس لوٹ کو جلد سے جلد ختم کر دینے کے لئے فرد حساب تیار کر لی گئی۔ مگر بڈھا جانے کا نام نہیں لیتا تھا۔

میری چائے ختم ہوتے ہی اس نے ساتویں پیالی اپنے واسطے منگا لی کیونکہ وہ بہت دیر پہلے ہی چھٹی پیالی ختم کر چکا تھا۔ اس نے تیسرا سگریٹ جلاتے ہوئے پیکٹ میری طرف بڑھایا اور میں نے بھی اس کو نقصان پہنچانے اور کچھ دیر بیٹھنے کی غرض سے قبول کر لیا حالانکہ میں سگریٹ پینے کا عادی نہیں ہوں۔

اس نے چائے پینے اور سگریٹ کے کش لگانے کے ساتھ ساتھ اخبار کا مطالعہ جاری رکھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ پہلے اور دوسرے صفحات کی اہم خبریں ختم کر لینے کے بعد اس کی نظریں امراض جنسی کی دواؤں کے اشتہارات پر جم گئی ہیں جو سینما کے اعلانات کے ساتھ تیسرے صفحے پر شائع ہوتے تھے۔

"آج الفنسٹن سینما میں کون سا فلم چل رہا ہے؟" میں نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنے کے لئے پوچھا۔

"زمبو کا نواسہ داماد۔" اس نے نظر اٹھائے بغیر جواب دیا۔

"آپ یہ فلم دیکھ چکے ہیں؟" میں نے دریافت کیا۔

"جی نہیں۔ آج جانے کا ارادہ ہے۔" اس نے بدستور جواب دیا۔

"میرا بھی خیال ہے۔" میں نے اس فرد حساب پر نظر ڈالتے

ہوئے کہا جو دس روپے خرچ کرنے کے سلسلے میں تیار کی گئی تھی۔
"پھر کیوں نہ اکٹھے چلیں۔ فلم اگر تنہا دیکھا جائے تو پورا لطف حاصل نہیں ہوتا۔"

"میں خوشی سے آپ کی دعوت قبول کرتا ہوں۔" اس نے ایک لمحے کے لئے اخبار سے نظریں ہٹائیں۔ "بتائیے ہم لوگ شام کو کس جگہ ملیں۔ میں دفتر سے عموماً ساڑھے چار بجے واپس آجاتا ہوں اور شام کو بھی اسی ہوٹل میں چائے پیتا ہوں۔"

"آپ دفتر سے ساڑھے چار بجے واپس آتے ہیں لیکن جاتے کب ہیں؟" میں نے گھنٹے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "دس بجنے میں دو منٹ باقی رہ گئے ہیں۔ اور پہنچتے پہنچتے آپ کو کافی دیر ہو جائے گی۔"

"جی۔ کوئی پروا نہیں۔" اس نے "ضرورت شادی" کے اشتہارات دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں عموماً دیر سے جاتا ہوں کیونکہ ہیڈ کلرک میرے بہنوئی ہیں اور ویسے بھی وہ آجکل چھٹی پر ہیں اگر سارے دن نہ جاؤں تو کوئی جواب طلب نہیں کر سکتا۔"

میری طبیعت تو پہلے ہی اکتا گئی تھی، یہ جواب سن کر غصہ بھی آنے لگا۔ ظاہر ہے کہ میں صاف لفظوں میں اس سے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ تم یہاں سے چلے جاؤ۔ آخر ایک ترکیب سمجھ میں آگئی۔ میں نے ارادتاً اپنی پنسل نیچے گرا دی۔ تاکہ اسے اٹھانے کے لئے جب جھکوں تو نوٹ پر بھی قبضہ کر لوں۔ مگر عین اس وقت مجھ سے پہلے وہ جھکا اور پنسل اٹھا کر مجھے دیتے ہوئے بولا:۔

"غنیمت ہے۔ زیادہ نہیں ٹوٹی۔ آجکل پنسلیں بہت کچی آرہی ہیں۔ غالباً یہ لڑائی سے پہلے کی ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے چائے کی ایک پیالی اور منگوا لی مجبوراً مجھے بھی اس کا ساتھ دینا پڑا۔ تاہم میری بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ میں حیران تھا کہ یہ کم بخت جاتا کیوں نہیں میری ٹانگ میری طرح سُن ہو کر باقی جسم سے کہیں زیادہ وزنی ہو گئی اور اس لئے کپکپانے بھی لگی تھی۔

"آج دھوپ کی تیزی ابھی سے بڑھتی جا رہی ہے۔" میں نے کچھ دیر کے بعد نزاکت وقت کا احساس دلانا شروع کیا۔ "گرمیوں کی یہ جھلسا دینے والی دھوپ خدا جانے کب کم ہو گی۔ باہر نکل کر چند قدم چلنا دشوار ہو جاتا ہے اور آپ کے پاس چھتری بھی نہیں ہے۔ بھلا آپ دفتر تک کس طرح پہنچیں گے۔" میں نے اپنی چھتری پر نظر ڈالتے ہوئے بات ختم کی۔

"کوئی فکر نہیں۔" اس نے چائے کی اور پیالی منگاتے ہوئے کہا۔ "میرا گھر یہاں سے قریب ہے اور میں دفتر جانے سے پہلے گھر جا کر چھتری لے لونگا۔ لیکن آپ —— کیا آپ دفتر نہیں جاتے۔"

"جی نہیں۔" میں نے جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔ "میں نے آٹے کے راشن کی دکان کر رکھی ہے اور آپ جانتے ہیں کہ آج پیر ہے۔ آج کے دن عموماً سب دکانیں بند رہتی ہیں۔"

یہ سن کر وہ کسی قدر کسمسایا اور اخبار کو لپیٹنا شروع کر دیا۔ میں دل ہی دل میں خوش تھا کہ چلو یہ فقرہ کامیاب رہا۔ اب اس مشکل سے نجات حاصل ہو جائے گی۔ اخبار کو جیب میں رکھتے ہوئے وہ جھکا اور معنی خیز نظروں سے فرش کا جائزہ لینے لگا۔

میرے تمام جسم میں سوئیاں سی چبھنے لگیں۔
"کیا آپ کی کوئی چیز گم ہو گئی ہے؟" میں نے سادگی سے دریافت کیا۔

"جی نہیں۔" اس نے اپنی نظریں فرش سے اٹھائے بغیر کہا۔ "لیکن کچھ دیر پہلے یہاں دس روپے کا نوٹ پڑا تھا۔ وہ نہ جانے کہاں چلا گیا۔"

میں نے بھی اس کا ساتھ دینے کی غرض سے نیچے جھک کر دیکھنا شروع کیا۔ لیکن عین اس وقت، معلوم نہیں کیوں شاید دلی گھبراہٹ کی وجہ سے، میرا پاؤں ایک طرف کو کسی قدر کھسک گیا۔ اور نوٹ کا کنارا نظر آنے لگا۔ اب اسے چھپائے رکھنا غیر ممکن بلکہ نامناسب بھی تھا۔ لہٰذا میں نے جھک کر اسے اٹھا لیا اور میز پر رکھتے ہوئے کہا:۔

"کیا آپ کا مطلب اس سے ہے؟"

"جی ہاں۔" وہ بولا۔ "کافی دیر ہوئی میری نظر اس پر پڑی تھی۔ نہ جانے کس شخص کا گرا ہوگا۔"

"لیکن اب کیا کرنا چاہیئے؟" میں نے بڑے بھولے پن سے دریافت کیا۔

"میری تجویز یہ ہے۔" اس نے بھی سیدھے سبھاؤ کہا۔ "ہم دونوں

سے بلوں کا حساب چکتا ہونے کے بعد جو رقم بچے وہ دو برابر حصوں میں تقسیم کر لی جائے۔"

فیصلہ نہایت معقول تھا۔ اس سے بہتر ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ لہٰذا میں نے قبول کر لیا۔ اس نے فوراً ملازم کو بلا کر وہ نوٹ دے دیا۔

دونوں بلوں کی رقم پونے دو روپے ہوئی تھی۔ چونی ملازم کو دیدی۔ چار چار روپے ہم دونوں نے لے لئے۔ اس کے بعد اس نے گھنٹے پر نظر ڈالی اور مجھ سے پہلے اُٹھ کر چلا گیا۔ غالباً اسے پہلی بار ضرورت سے زیادہ دیر ہو جانے کا احساس ہوا تھا۔ ایک دو منٹ بعد میں بھی میز پر سے کھونٹی کا سہارا لیتا باہر نکل گیا۔ دو چار دفعہ حرکت دینے سے ٹانگ کی کیفیت ٹھیک ہو چکی تھی۔

باہر جا کر میں نے ایک ایک روپے کے چاروں نوٹ اپنی جیب میں رکھنے چاہے لیکن یہ معلوم کر کے مجھ پر بجلی سی گر پڑی کہ وہ دس روپے کا نوٹ جو ڈھائی دن کے اخراجات پورے کرنے کے لئے میرے بجٹ میں باقی رہ گیا تھا، جیب میں نہیں ہے۔ زیادہ سوچنے کی ضرورت نہیں تھی۔ معاملہ بالکل واضح تھا۔ یعنی جب سردی کی زیادتی کے باعث میری ناک سے پانی بہنے لگا اور میں نے دو تین بار رومال نکال نکال کر اسے صاف کیا تو کسی ایک دفعہ نوٹ بھی اس کے ساتھ اٹک کر نیچے گر پڑا۔ اور وہ نوٹ وہی تھا جس کے حصے بخرے ہو جانے کے بعد اب صرف چار روپے میرے پاس رہ گئے۔ بے شک یہ میری غلطی تھی کہ رومال اور نوٹ ایک ہی جیب میں رکھے رہتے لیکن ایسی غلطیوں کا احساس بھی تو وقت گزر جانے کے بعد ہی ہوا کرتا ہے۔

میں مغموم و پریشان تمام واقعات پر غور کرتا دفتر کی جانب چل پڑا۔ زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ دھوپ کی تپش نے ناک میں دم کر دیا اور دفعتاً مجھے اپنی چھتری کا خیال آیا۔ — چھتری! وہ تو ہوٹل ہی میں رہ گئی تھی۔

میں تیزی کے ساتھ واپس لوٹا لیکن وہ اس جگہ موجود نہیں تھی۔ منیجر سے دریافت کیا تو وہ کسی قدر ترش روئی سے بولا:

"واہ کیا خوب! وہ تو اسی وقت آپکے والد صاحب لے گئے۔"

"میرے والد صاحب!" میں آنکھیں نکال کر غضبناک لہجہ میں کہا اور اس وقت سے بیس سال پہلے اپنے والد کا مرنا یاد آ گیا۔

"بہر حال وہ جو کوئی بھی ہوں" منیجر نے کہا۔ "تھے تو آپ کے بزرگ۔ اب والد ہوں یا چچا۔ یا محض واقف کار۔ مجھے ان باتوں سے کوئی سروکار نہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ یہاں سے جاتے وقت چھتری انہی کے ہاتھ میں تھی۔"

ہوٹل کے ملازم نے اس بیان کی تائید کی۔

"لیکن چھتری تو میری تھی" میں نے کسی قدر بگڑ کر کہا۔ "میں اپنے ساتھ لایا تھا۔"

"مجھے کیا معلوم" منیجر نے کہا۔ "آپ ایک ساتھ مل کر اس طرح کھا پی رہے تھے کہ یہ شبہ بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ آپ کی کسی چیز کو اٹھا کر لے جائیں گے۔ اگر ان کا گھر معلوم ہو تو وہاں جا کر لے آئیے۔"

بھلا میں اسے کس طرح سمجھاتا کہ یہ اس مردود سے پہلی ملاقات تھی۔ مجبوراً مجھے خاموش ہو کر چلا جانا پڑا۔ تاہم میں نے ہمیشہ کے لئے قسم کھائی کہ اب کسی ہوٹل میں قدم بھی نہیں رکھوں گا۔

اختتامیہ: ان واقعات کو سن کر آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ میں جمعہ کے دن اپنے عزیز دوستوں کی بات ٹالتے ہوئے ان کے ساتھ ہوٹل جا کر شریک طعام نہ ہونے میں حق بجانب ہوں یا نہیں۔ پھر یہ راز میرے دوستوں کو معلوم ہو جائیں تو ظاہر ہے کہ وہ کسی نہ کسی معقول طریقے سے مجھے مجبور کریں گے کہ ہوٹل میں چلو، اپنی قسم توڑو اور اس کا کفارہ ادا کرتے ہوئے اپنی جیب خاص سے ہمیں پیٹ بھر کر کھانا کھلاؤ۔

اگر یہ صورت کبھی پیدا ہو گئی تو آپکو تسلیم کرنا پڑیگا کہ وہ میری زندگی کا تیسرا تلخ تجربہ ہوگا جسے میں کسی قیمت پر بھی حاصل کرنا نہیں چاہتا۔ اسی لئے آپ سے التجا ہے کہ آپ اس راز کو اپنے سینے میں اچھی طرح محفوظ رکھیں میرے کسی دوست کے کانوں تک اسکی بھنک بھی پہنچی تو نتیجہ بُرا رہیگا۔ وہ زبردست احتیاط جو اب تک برتی گئی ہے آپ کی ذرا سی لغزش سے خاک میں مل جائے گی۔

ابواللیث صدیقی

اردو شاعری میں اشاریت

استعارہ اور کنایہ شاعری کی جان ہے۔ اس کے نمونے اور مثالیں کم و بیش ہر دور اور دنیا کی ہر زبان میں ملتے ہیں، اردو بھی اس سے محروم نہیں۔ مرزا غالب نے ہمارے شعرا کے اس مسلک کو اس طرح واضح کیا ہے۔

مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر
ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں بادہ و ساغر کہے بغیر

اردو کے متقدمین شعرا کا دور خاص طور پر استعاروں اور کنایوں کا محتاج تھا۔ شخصی حکومت کا دور دورہ تھا، اور شعر و ادب کی ناقدردانی نے شعرا کو ایسا مجبور کر دیا تھا کہ سخن ہائے گفتنی بھی لب تک نہیں لا سکتے تھے، یوں غزل گو شعرا کا کلام خارجی واقعات اور معاملات سے بظاہر غیر متعلق نظر آتا ہے لیکن یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اپنے ماحول میں رہ کر اس سے متاثر نہ ہوں۔ شاعری کے لئے حساس طبیعت پہلی شرط ہے، شاعر کا دل ایسا نازک آئینہ ہوتا ہے کہ معمولی واقعات اور واردات بھی اس پر گہرے نقوش مرتسم کر دیتے ہیں پھر جس سیاسی خلفشار، ذہنی الجھن، معاشی بدحالی اور نفسا نفسی میں انہوں نے اپنے دن گزارے اس کا اثر کس طرح قبول نہ کیا ہوگا، لیکن اس وقت آج سے بہت زیادہ محفل میں زبان بندی کا دستور تھا یہی وجہ ہے کہ انہوں نے جو کچھ کہا سب اشاروں اور کنایوں میں کہا ہے۔

گل و بلبل، شمع و پروانہ، قیس و فرہاد، ساقی، بادۂ خمار، محتسب، اور اس قبیل کی دوسری علامات سے ہمارے شعرا کی کیا مراد تھی، اس کی تشریح کیلئے ایک شعر دیکھیے۔

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

اس میں غزال، مجنوں، دوانہ، ویرانہ سب خاص علامات ہیں۔ شاعر در اصل عرب کے تاریخی مجنوں اور اس کی وفات کا ذکر نہیں کر رہا ہے نہ اس کے مرنے سے ویرانے پر کچھ گزر سکتی ہے۔ نہ خود شاعر دیوانوں کی طرح غزال صحرائی سے ہم کلام ہے۔ ایک ہندوستانی شاعر نے سراج الدولہ کی بیکسی اور بے بسی کی موت کی خبر سن کر ایک مجمع میں اسے پڑھا تھا۔ سراج الدولہ کی وفات کے بعد بنگال پر جو کچھ گزری وہی عالم ہے جو مجنوں کے بعد ویرانہ پر گزرنا تصور میں آتا ہے۔ چند اشعار اور ملاحظہ ہوں، تاریخی واقعات کی طرف لوگوں نے توجہ نہیں کی ہے لیکن جذبات کی شدت اور ان کے عام ماحول کو پیش نظر رکھیں تو ان اشعار میں لفظوں کے ماوری کچھ اور ہی نقوش نظر آتے ہیں۔

ویراں ہوا ہے باغ خزاں سے یہاں تلک (حزیں)
چاہیں کہ جل مریں تو کہیں خار و خس نہیں

بربادیٔ بلبل اب نہیں گل شاخسار پر (میر حسن)
کیا اوس پڑ گئی ہے چمن میں بہار پر

اے باغباں نہیں ترے گلشن سے اب غرض (میر حسن)
ہم کو قسم جو توڑیں ترے برگ سبز کہیں

اتنا ہی چاہتے ہیں کہ ہم اور عندلیب (راقم)
آپس میں دردِ دل کہیں ٹک بیٹھ کر کہیں

پوچھے ہے پھول پھل کی خبر اب تو عندلیب (سودا)
ٹوٹے جھڑے خزاں ہوئی پھولے پھلے گئے

دل بستگی قفس سے یہاں تک ہوئی مجھے (ذوق)
گویا کبھی چمن میں مرا آشیاں نہ تھا

ہم اسیروں کو بھلا کیا جو بہار آئی نسیم (میر)
عمر گزری کہ وہ گلزار کا جانا ہی گیا

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات (میر)
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

گل کی جفا بھی دیکھی دیکھی وفائے بلبل (میر)
اک مشت پر پڑے ہیں گلشن میں جائے بلبل

بے بسی سے تو تری بزم میں ہم بہرے بنے (میر)
نیک و بد کوئی کہے ہم بیٹھے سُنا کرتے ہیں

اس کے کوچے میں نہ کر شور قیامت کا ذکر (میر)
ایسے ہنگامے تو یاں روز ہوا کرتے ہیں

ڈروں میں کس لئے رنجش سے پیار میں کیا تھا (ممتاز)
میں اب خزاں کو جو روؤں بہار میں کیا تھا

چھوٹے اگر قفس سے تو خاموش ہم صفیر (مجذوبا)
صیّاد سے بھی سُنا یہ ترانہ تو ہم رہے

یہ چند اشعار میں نے سرسری طور پر اپنے حافظ سے لکھ دئے ہیں۔ ان میں وہی پُرانے استعارے اور علامتیں ہیں جو اُردو شعرا دکھنی دور سے عہد جدید کے آغاز یعنی حالی کے زمانے تک استعمال کرتے رہے لیکن مذکورہ بالا اشعار میں شدت سے اس سیاسی اور ملکی ماحول کی طرف اشارے ملتے ہیں جس کی تفصیل تاریخوں میں مذکور ہے اور جس میں ان شعرا نے اپنے دن گزارے۔

منقدمین کو چھوڑ کر دورِ جدید میں آیئے، اکبر نے پنچ کے رنگ میں طنز و ظرافت سے اپنی شاعری کا آغاز کیا اور طنز و ظرافت میں شدت پیدا کرنے کے لئے خاص خاص علامات کا استعمال کیا۔ اونٹ۔ گائے، مولوی، بابو، ٹیٹو، کمسریٹ، بسکٹ، ہوٹل، کیپ، بدھو، جمن، تبقاتی، شیخ صاحب، لاٹ صاحب، گزٹ، ڈارون، کالج، ڈنر، اسپیچ، کونسل، پر یڈ، مینشن۔ یہ سب ایسے محور ہیں جن پر اکبر کا شاعرانہ تصور گردش کرتا رہتا ہے۔ ان میں سے ہر لفظ خصوصیات کا حامل اور ترجمان ہے۔ بڑی حد تک اکبر کی شاعرانہ فنکاری انہیں مکمل علامات کی بدولت کامیاب ہے۔

موجودہ دور میں اقبال نے اُردو شعرا میں غالباً سب سے زیادہ ان علامات شعری سے کام لیا ہے۔ اقبال کے متعلق انتہا پسندوں کی دو رائیں ہیں اور دونوں صحیح نہیں، بعض لوگ انہیں صرف شاعر یا بڑی حد تک شاعر سمجھتے ہیں اور بعض انھیں سرتا پا فلسفی یا پیغمبر مانتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ جس شخص نے میر کو شاعری کا پیغمبر نہیں بلکہ خدا بتایا ہے اُس نے اقبال کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ کیونکہ اقبال ہی شاعری اور پیام کے باعث اس خطاب کے مستحق ہیں۔ اُنہوں نے اُردو کو نہ صرف گہرے خیالات سے باوزن اور گراں بہا بنایا بلکہ شاعری کے پیکر کو بھی نیا ملبوس عطا کیا اور اس کی تیاری میں شاعرانہ علامتوں سے خاص کام لیا۔ بعض پُرانی علامتوں کو نئے معانی بخشے اور بعض نئے اشارات استعمال کئے، ان میں سے بعض علامات کی تکرار کلام میں جا بجا ملتی ہے اور دراصل یہی تکرار ان کے فلسفے کی تشریح اور تفصیل ہے۔ ان استعاروں اور علامتوں میں کس قدر وسعت اور معنوی گہرائی ہے اس کا اندازہ اس تشریح سے ہوتا ہے جو خود اقبال نے شاہین کے بیان میں فرمائی ہے۔ اپنے ایک خط (مطبوعہ علی گڑھ میگزین اقبال نمبر) میں لکھتے ہیں :۔

"شاہین محض شاعرانہ تشبیہ نہیں ہے۔ اس جانور میں اسلامی فقر کے تمام خصوصیات پائے جاتے ہیں۔ (۱) خود دار و غیرت مند ہے کہ اور کے ہاتھ کا مارا ہوا شکار نہیں کھاتا (۲) بے تعلق ہے کہ آشیانہ نہیں بناتا (۳) بلند پرواز ہے (۴) خلوت پسند ہے (۵) تیز نگاہ ہے"

شاہین کے علاوہ فرہاد و پرویز، قیس و لیلیٰ، جام و مینا، ساقی و بادہ کش، گل و بلبل، شمع و پروانہ بعض ایسے پُرانے استعارے ہیں جو نئے مفہوم ظاہر کرنے کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ شہباز و کبوتر، ممولہ، زاغ و زغن، فقر سلطانی، خضر و راہی، کلیم و ضرب کلیم، ابراہیم و نار نمرود نئے نئے مطالب ادا کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض علامتیں دریا کی اس خاموش سطح کی طرح ہیں جس پر بظاہر کچھ نظر نہ آتا ہو لیکن جس کی تہ میں ہزاروں طوفان موجیں مار رہے ہوں۔ اقبال کا یہ آرٹ ان کی پہلی کلیات بانگ درا کے تیسرے حصے سے ہی شروع ہوتا ہے اور بتدریج ترقی کر کے بال جبریل اور ضرب کلیم میں منتہائے کمال کو پہنچ جاتا ہے۔

اقبال کے بعد وہ دور شروع ہوتا ہے جسے جدید ادب اور ترقی پسند ادب کے عہد کہتے ہیں۔ میری مراد ۱۹۳۵ء کے بعد کی نظم سے ہے۔ حسب دستور اس جماعت کے شعرا اپنی ہر تحریک اور رجحان کا سلسلہ نسب براہ راست مغربی تحریکات اور میلانات سے ملاتے ہیں۔ ان کے بقول جدید شاعری میں اشاریت کا آغاز فرانس میں ہوا، جہاں انیسویں صدی کے

نصف آخر سے اس تحریک کے علمبرداروں نے اس میں نئے نئے تجربے کر کے آخرکار ایک نئے فن کی بنیاد ڈالی، اس جماعت کے پیشرو یا پہلے فنکار Verlaine, Baudelaire اور Mallarmé ہیں یہ لوگ صاف اور سادہ شعر کو حسن سے معرا سمجھتے تھے، ان کے نزدیک شعر کی خوبی یہ تھی کہ اسے پڑھکر سامع کا ذہن الفاظ کی تہ میں پوشیدہ معانی کی تلاش و جستجو میں مصروف ہو جائے، ان کے نزدیک سادہ بیانی اور صاف گوئی شعر سے کم ازکم تین چوتھائی حسن کو زائل کر دیتی ہے کیونکہ اس طرح تخیل کی جولانی کے لئے کوئی میدان باقی نہیں رہتا جس میں سامع لطف اندوز ہو سکے۔ اچھے شعر کے لئے یہ بالکل ناگزیر ہے کہ وہ عوام کی سطح سے بلند بلکہ معمہ اور چیستان رہے، تاکہ پڑھنے والے اپنی دماغی صلاحیتوں سے کام لے کر تخیل کی بدولت اشیاء کی تخلیق اس طرح کر سکیں جس طرح فنکار نے کی ہے۔ کیونکہ یہی ادب اور مطالعہ ادب کا مقصد ہے۔ اشاریت کی اس تحریک کا مغرب میں سب سے نامور علمبردار میترلنک ہے جس کی نظمیں عام طور پر بھول بھلیاں معلوم ہوتی ہیں۔ انہیں پڑھکر یہ بتانا کہ شاعر آخر کیا کہنا چاہتا ہے ناممکن ہے اشاریت اگر اس منزل پر پہنچ جائے تو ابہام کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ میرے خیال میں یہ اشاریت کی ایک انتہائی شکل ہونے کے باوجود صحیح اشاریت سے جدا اور آرٹ کی کامیابی میں حارج ہے۔

آرٹ کیا ہے؟ اور اس کا مقصد کیا ہے؟ آرٹ اظہار Expression ہے لیکن اس کا مقصد صرف اظہار ہی نہیں ترجمانی communication اور تصور زائی suggestion بھی ہے آرٹ میں تکمیل بڑی حد تک ترجمانی communication کے تناسب پر منحصر ہے۔ بعض آرٹسٹ ضرور ایسے بھی مل جائیں گے جو اپنی انفرادیت میں اس حد تک غرق ہوں کہ ان کو اپنے مخاطب کے وجود کا احساس اور اس کی صلاحیتوں کا اندازہ نہ رہے۔ وہ بیشک ان سب کی طرف سے آنکھ بند کر کے جو کچھ کہنا سنتا ہے اپنے ہی لئے کہا کرتا ہے۔ اور اس پر اصرار کرتا ہے۔ مرزا غالب ایک حد تک اپنے پہلے دور میں اسی جذبے کے ماتحت مشکل پسندی اختیار کرتے ہیں اور بار بار سہل گوئی کی فرمائش پر بالآخر کہہ اٹھتے ہیں:-

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

لیکن کتنے دن وہ اس روش پر قائم رہ سکتے آخرکار انہیں آرٹ کے اصلی مقصد (communication) ترجمانی کے سامنے جھکنا پڑا۔

قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوگا کہ آخر ان علامات میں الجھن اور پیچیدگی پیدا کیوں ہوتی ہے؟ جواب ظاہر ہے۔ علامات اور اشارات میں داخلی رنگ کی کثرت یا پھر تمثیلی رنگ کی فراوانی، مرزا غالب کے یہاں آخرالذکر سبب کارفرما ہے غالب نے ابتدائی دور میں جن فارسی گو شعرا کے کلام کو پیش نظر رکھا ان کا طرۂ امتیاز ہی تمثیل نگاری ہے۔ موجودہ دور میں تمثیل سے زیادہ داخلی رنگ کی زیادتی نے علامات کے استعمال کو چیستان بنا دیا ہے جس کا ایک نمونہ میراجی کے یہاں ملتا ہے ان کا کلام موضوعات کے اعتبار سے بھی خرافات کے تحت میں آتا ہے، اس پر داخلی اشاریت مستزاد ہے۔ ایک نظم کا عنوان "لب جوئبارے" کیوں؟ اس نظم میں ایک عورت کا ذکر ہے جو سڑک پر پیشاب کرنے بیٹھی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ عنوان سے مفہوم میراجی یا ان کے واقف کار ہی سمجھ سکتے ہیں۔ ایک اور نظم میں محبوبہ کی آنکھوں سے پھیل جانے والے کاجل کو "کالا کلوٹا کوا" کہا ہے، ایک اور نظم میں جس کا عنوان "تفاوت" ہے اس قسم کی کئی علامتیں استعمال ہوئی ہیں جنسی ہیجان کے اظہار اور اس کی تسکین کے وسائل میں میراجی نے خاص طور پر ان علامات اور اشارات سے کام لیا ہے۔

ن۔ م۔ راشد اور فیض کی شاعری شہاب ثاقب کی طرح گزر گئی۔ تاہم ان کے عمدہ کلام میں یہ اشاریت بڑی حد تک اشاریت ہی رہتی ہے۔ فیض نے راشد کی ایک نظم کا ذکر کیا ہے:-

جاگ اے شمع شبستان وصال
محفل خواب کے اس فرش طربناک سے جاگ
لذت شب سے ترا جسم ابھی چور سہی

آ مری جان مرے پاس دریچے کے قریب
دیکھ کس پیار سے انوارِ سحر چومتے ہیں
مسجدِ شہر کے میناروں کو
جن کی رفعت سے مجھے
اپنی برسوں کی تمنّا کا خیال آتا ہے

اس میں مسجد کے مینار کو عالی ہمتی اور بلند خیالی کی علامت قرار دیا ہے، ایک اور نظم جس کا عنوان "خودکشی" ہے ملاحظہ ہو:۔

کر چکا ہوں آج عزمِ آخریں
شام سے پہلے ہی کر دیتا تھا میں
چاٹ کر دیوار کو نوکِ زباں سے ناتواں
صبح ہونے تک وہ ہو جاتی تھی دوبارہ بلند
میرا عزمِ آخری یہ ہے کہ میں
کود جاؤں ساتویں منزل سے آج
آج میں نے پالیا ہے زندگی کو بے نقاب
جی میں آتی ہے لگا دوں ایک بیباکانہ جست
اس دریچے میں سے جو
جھانکتا ہے ساتویں منزل سے کوئے بام کو
شام سے پہلے ہی کر دیتا تھا میں
چاٹ کر دیوار کو نوکِ زباں سے ناتواں
آج تو آخر ہم آغوشِ زمیں ہو جائے گی۔

اس نظم کو میں ترقی پسند رجحانات کا آئینہ دار تو نہیں سمجھتا کیونکہ اس میں زندگی سے فرار کا شائبہ موجود ہے لیکن غلامی کی دیوار کو سدِ سکندری اور اپنی سیاسی جدوجہد کو یاجوج ماجوج کے عمل سے مشابہ بتایا ہے جو دن رات اس دیوار کو چاٹتے رہتے ہیں اور وہ اسی قدر بلند ہو جاتی ہے۔ اس صورت میں ذہن علامت کی طرف با آسانی منتقل ہو جاتا ہے اور یہ جدید اشاریت کا ایک صحت مند نمونہ ہے۔
ایک مثال خود فیض کے یہاں ملاحظہ ہو:۔

سالہا سال یہ بے آسرا جکڑے ہوئے ہاتھ
رات کے سخت و سیہ سینے میں پیوست رہے
جس طرح تنکا سمندر سے ہو سرگرم ستیز
جس طرح تیتری کہسار پہ یلغار کرے
اور اب رات کے سنگین و سیہ سینے میں
اتنے گھاؤ ہیں کہ جس سمت نظر جاتی ہے
جا بجا نور نے اک جال سا بن رکھا ہے
دور سے صبح کی دھڑکن کی صدا آتی ہے
تیرا سرمایہ۔ تری آس یہی ہاتھ تو ہیں
اور کچھ بھی ہے ترے پاس؟ یہی ہاتھ تو ہیں
تجھ کو منظور نہیں غلبۂ ظلمت لیکن
تجھ کو منظور ہے یہ ہاتھ قلم ہو جائیں
اور مشرق کی کمیں گہ میں دھڑکتا ہوا دل
رات کی آہنی میت کے تلے دب جائے۔

اس قسم کی مثالیں اس جماعت میں ڈاکٹر تاثیر، یوسف ظفر، احمد ندیم قاسمی، مختار صدیقی وغیرہ کے یہاں بھی ملتی ہیں۔ سلام مچھلی شہری کو میری رائے میں اس جماعت سے نکال کر میرا جی کے ساتھ شمار کرنا چاہیے۔

تصانیف مرزا عظیم بیگ چغتائی مرحوم

روحِ ظرافت:۔ چغتائی صاحب کے آٹھ دلکش افسانوں کا مجموعہ۔ مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب نے اس کتاب کا دیباچہ اس قدر پُر لطف لکھا ہے کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ پہلا افسانہ "انگوٹھی کی مصیبت" وہ مشہور و معروف افسانہ ہے جو چغتائی صاحب کی شہرت کا باعث ہوا۔ اسی طرح "یکہ"، "الشذری" اور "شاطر کی بیوی" وغیرہ بھی ہر نوعیت سے تفریحِ دماغ کا سامان بہم پہنچاتے ہیں۔ قیمت دو روپے، علاوہ محصول ڈاک۔

روحِ لطافت:۔ چغتائی صاحب کے آٹھ چیدہ چیدہ افسانوں کا مجموعہ۔ پہلا افسانہ "مہارانی کا خواب" ایک بہت ہی عجیب و غریب رومانی افسانہ ہے جس میں راجپوت مہارانیوں، انکی خواب جیسی زندگی، محلات کی جگمگاتی تصویریں، عشق و محبت کے دلدوز مناظر وغیرہ پڑھنے کی چیزیں ہیں۔ اس خونچکاں داستان نے پڑھنے والوں کو تڑپا کر رُلا دیا ہے۔ باقی سات افسانے اسقدر ہنسانے والے ہیں کہ ہنستے ہنستے آپ بےحال ہو جائیں گے۔ قیمت دو روپے، علاوہ محصول ڈاک۔

ملنے کا پتہ:۔ ساقی بک ڈپو، دہلی۔

غلام عباس

ناک کاٹنے والے[1]

تین شخص چُغے پہنے سر پر آڑی ترچھی پگڑیاں باندھے نتھی جان کے کمرے میں داخل ہوئے۔ اور چاندنی پر گاؤ تکیوں سے لگ کر بیٹھ گئے۔

"مزاج تو اچھے ہیں سرکار!" رنگ علی نے کہا۔

ان تینوں میں سے کسی نے اُس کی مزاج پُرسی کی رسید نہ دی۔

گلابی جاڑوں کے دن تھے باہر ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ رات خاصی جا چُکی تھی۔ ایک منٹ تک خاموشی چھائی رہی جس کے دوران میں تینوں آدمی تیز تیز نظروں سے کمرے کا جائزہ لیتے رہے۔ اِس کمرے سے ملا ہوا ایک چھوٹا کمرہ تھا۔ جو خواب گاہ کا کام دیتا تھا۔ انہوں نے اپنے کیچڑ بھرے چپل نہیں اُتارے تھے۔ جس کی وجہ سے اُجلی چاندنی پر دھبّے ہی دھبّے پڑ گئے تھے۔

"جبار خانا" اُن میں سے ایک نے دوسرے سے کہا۔ "پتوس ودکہ۔ پوچھو تمہارا رنڈی لوگ کدھر ہے"

"تمہارا رنڈی لوگ کدھر ہے؟" جبار خاں نے رنگ علی سے پوچھا۔

"باہر گیا ہے" رنگ علی نے کہا۔ جس وقت وہ آئے تو یہ پان بنا رہا تھا۔

"باہر کدھر؟" جبار خاں نے پوچھا۔

"سینما دیکھنے سینما۔ بائسکوپ" رنگ علی نے کہا۔

"کیا کہتا ہے؟" پہلے آدمی نے جبار خاں سے پوچھا۔

"کہتا ہے باہر گیا ہے بائسکوپ کا تماشہ دیکھنے"

"خو تماشہ دیکھنے جاتا ہے!" پہلے آدمی نے کہا۔

"بائی جی تو جاتی بھی نہیں تھیں" رنگ علی بولا "وہ تو چشتی صاحب زبردستی لے گئے"

"کیا کہتا ہے؟" پہلے آدمی نے جبار خاں سے پوچھا۔

"کہتا ہے چشتی صاحب زبردستی لے گیا"

"خو چشتی کے ساتھ جاتا ہے!" پہلے آدمی نے کہا۔ وہ ڈیل ڈول میں اپنے دونوں ساتھیوں سے کم تھا۔ مگر اُسکے خدوخال دونوں سے زیادہ درشت تھے۔ گلے میں سیاہ دھاریوں والے سُرخ گلوبند کے دو بل دے کر سرے چُغے کے اندر کر رکھے تھے۔ اُس کے دانت پیلے پیلے تھے۔ چوڑا دہانہ، بائیں رُخسار پر آنکھ سے ذرا نیچے ایک گہرے زخم کا نشان تھا۔

"خو رنڈی منڈی کوئی نہیں تو اتنا روشنی کس واسطے کیا؟" اُس نے رنگ علی سے پوچھا۔ جب وہ بات کرتا تو اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کو فقرے کے ادھ بیچ میں آدھا بند کر لیتا۔

رنگ علی نے کوئی جواب نہ دیا۔

"بولو!" جبار خاں نے کہا۔ "ہم تم سے کیا کہتا ہے؟" اس کا رنگ سانولا تھا۔ عمر میں وہ اپنے دونوں ساتھیوں سے کافی بڑا تھا۔ اُس کے اوپر کے ایک دانت پر پلٹینم کا خول چڑھا تھا۔ جو کافی گھس چُکا تھا۔ اور ہڈی نظر آنے لگی تھی۔

رنگ علی اب بھی خاموش رہا۔

"ہم اتنا سیڑھی کس واسطے چڑھ کے آیا؟" تیسرے آدمی نے پوچھا۔ اپنے دونوں ساتھیوں کی طرح اس نے بھی گلے میں گلوبند لپیٹ رکھا تھا۔ اس کی پیشانی تنگ تھی۔ اور ناک پر ایک بڑا سا مسّا۔ اُس کی آنکھوں میں سُرخی اس طرح نظر آتی تھی جیسے لہو کی چھینٹ پڑ گئی ہو۔ ان میں سے کسی کی ڈاڑھی بھی ہفتے بھر سے کم کی مُنڈی ہوئی نہیں تھی۔

رنگ علی بے وقوفوں کی طرح ایک ایک کا مُنہ تک رہا تھا۔ اُسکی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا جواب دے۔

"خو تمہارا مُنہ میں زبان نہیں ہے؟" تیسرے آدمی نے کہا۔ پھر وہ پہلے آدمی کی طرف متوجہ ہوا۔ "صحبت خاں اسکا مُنہ میں زبان نہیں ہے!"

---

[1] اِس افسانے میں امریکن افسانہ نگار ہیمنگ وے کی پیروی کرنے کی کوشش کی گئی ہے طرزِ انشا میں بھی اور انتخابِ موضوع میں بھی۔

"سرکار کیا عرض کروں۔" رنگ علی نے کہا۔ "بائی جی تو جاتی بھی نہیں تھیں وہ ۔۔۔"

"جبار خاں،" صحبت خاں نے کہا۔ "اس سے پوچھو کب آئے گا؟"

"تمہارا رنڈی لوگ کب آئے گا؟" جبار خاں نے رنگ علی سے پوچھا۔

"شو ساڑھے بارہ بجے ختم ہوتا ہے سرکار۔" رنگ علی نے دیوار پر لٹکے ہوئے کلاک کی طرف دیکھ کر کہا۔ "بس کوئی گھنٹے پاؤ گھنٹے تک آ جائے گا۔"

"کیا کہتا ہے؟" صحبت خاں نے جبار خاں سے پوچھا۔

"کہتا ہے تین پاؤ گھنٹے میں آ جائے گا۔"

"عشقی صاحب کی دلوں سے نہ ہوتے تھے" رنگ علی بولا۔ "بائی جی ہر بار نہیں ہیں کرتی رہیں۔ آج تو بہت ہی سر ہوتے کہنے لگے فلم ایک مر ہے۔ بڑی مشکلوں سے سیٹیں ریزرو کرائی ہیں تھیٹر دینے لگے ۔۔۔"

عین اس وقت سیڑھیوں میں کچھ آہٹ ہوئی۔ تینوں آدمی چوکنے ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

"جبار خاں،" صحبت خاں نے کہا۔ "اس بدسگ کو کہو چپ ہو جائے۔"

"چپ ہو جاؤ۔"

کچھ لمحے خاموشی میں گزرے۔ پھر حسین بخش دھیمے کی ٹھمری مارے بائیشوری کی دھن گنگناتا دہلیز پر نمودار ہوا۔ ان تینوں کو دیکھ کر وہ ٹھٹکا۔ پھر جوتی اتار کر کمرے میں داخل ہوا۔ اور ان سے ذرا ہٹ کر چاندنی کے ایک سرے پر جہاں سارنگی غلاف کی ہوئی رکھی تھی۔ بیٹھ گیا۔

"سلام سرکار،" حسین بخش نے کہا۔

"یہ کون ہے؟" صحبت خاں نے رنگ علی سے پوچھا۔

"یہ حسین بخش ہیں۔"

"کیا کرتا ہے؟"

"یہ سارنگیے ہیں۔"

"سارنگیے کیا؟"

"سارنگی بجاتے ہیں۔ سارنگی جو ساز ہے۔"

"تو تو سازندہ کیوں نہیں کہتا۔"

"ہاں ہاں وہی۔"

"اور تم خود کیا کرتا ہے؟" جبار خاں نے رنگ علی سے پوچھا۔

"میں طبلہ بجاتا ہوں۔" رنگ علی نے کہا۔

"تو تو تم بھی سازندہ ہے؟"

"جی ہاں۔"

"جبار خاں،" صحبت خاں نے جبار خاں سے کہا۔ "پوچھو، ادھر کون کون رہتا ہے!"

"بائی جی۔ ہم دو استاد اور ایک نوکر رحمن۔" رنگ علی نے جواب دیا۔

"نوکر کدھر ہے؟" صحبت خاں نے پوچھا۔

"بائی جی کے ساتھ گیا ہے۔" رنگ علی نے جواب دیا۔

"ہوں۔ ہوں۔"

باہر بوندیاں کسی قدر تیزی سے پڑنے لگی تھیں۔ نیچے سڑک پر سے تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد تانگے کے گھوڑے کی ٹاپ جس میں گھنٹیوں کے سُر بھی شامل ہوتے۔ سنائی دے جاتی۔ گیلی سڑک پر گھوڑے کا سُم پڑتا تو بڑی پاٹ دار آواز نکلتی۔

"تم نے بولا تھی جان تین پاؤ گھنٹے میں آئے گا؟" صحبت خاں نے رنگ علی سے پوچھا۔

حسین بخش بہرا رہا بیٹھا تھا۔ اس نے جواب دینا چاہا:

"کیا پتہ ۔۔۔"

"تم مت بکو۔" صحبت خاں نے درشتی سے کہا۔ پھر وہ رنگ علی کی طرف متوجہ ہوا۔ "تمہارا بائی تین پاؤ گھنٹے میں آ جائے گا؟"

"آ تو جانا چاہیئے۔" رنگ علی نے کہا۔

"چاہیئے نہیں جانتا۔" صحبت خاں نے کہا۔ "ہاں کہو یا نہ۔"

"دیکھئے سرکار،" رنگ علی نے کہا۔ "تماشہ ساڑھے بارہ بجے ختم ہوتا ہے اور اس وقت ہوئے ہیں گیارہ بج کر پچاس منٹ۔ اگر بائی جی سیدھی گھر کو آئیں ۔۔۔"

"اگر مگر نہیں جانتا۔" صحبت خاں نے کہا۔ "صاف بولو۔"

"آخر بات کیا ہے خان صاحب؟" حسین بخش سے چپ نہ رہا گیا۔ "کچھ ہمیں بھی تو پتہ چلے۔"

اس کے جواب میں تیسرے آدمی نے یکبارگی آگے بڑھ کر زور کا ایک مکا اس کے منہ پر مارا۔ اس ناگہانی ضرب پر حسین بخش کی آنکھوں کے آگے اندھیرا آ گیا۔ آنسو اس کی آنکھوں میں چھلکنے

لگے۔ اُس نے سر جھکا لیا۔ تھوڑی دیر تک گم سُم بیٹھا رہا۔ پھر اُٹھ کر دہلیز کی طرف جانے لگا۔ جہاں اُس کا جوتا پڑا تھا۔

"او خنزیر" جبار خاں نے کہا۔ "ٹھہرو۔ کدھر جاتا ہے؟"

حسین بخش نے ایک پاؤں جوتی میں ڈال لیا تھا۔ وہ ٹھہر گیا۔

"ادھر دیکھو" جبار خاں نے ڈپٹ کر کہا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک کمانی دار چاقو تھا جس کا پھل آٹھ انچ سے کم لمبا نہ تھا۔ بجلی کی روشنی میں اُس سے شعاعیں سی نکل رہی تھیں "اگر تم نیچے جانے کی کوشش کرے گا تو ہم تمہارا پیٹ چاک کر دے گا۔ سُن لیا۔ دروازے میں کنڈی لگا دو اور ادھر ہمارے پاس آ کر بیٹھو۔"

حسین بخش لمحہ بھر کھڑا رہا۔ پھر اُس نے جوتی سے پاؤں نکال لیا اور دروازے میں کنڈی لگا کے اپنی جگہ پر آ بیٹھا۔

"شاباش۔ شاباش" صحبت خاں نے کہا۔ پھر وہ تیسرے آدمی سے کہنے لگا۔ "گلباز خاں یار۔ تم نے تان سین کے بیٹے کو ناراض کر دیا۔ اب وہ ہم کو گانا نہیں سُنائے گا۔"

"ہم اس کو منائے گا" گلباز خاں نے کہا۔ "ہم اسکے گدگدی کرے گا۔ تان سین کا بیٹا ہنسے گا۔ تان سین کا بیٹا پھر قوالی سُنائے گا۔"

"جبار خاں" صحبت خاں نے کہا۔ "اس سے بولو ہم گانا سُننے نہیں آیا۔"

"پھر کیسے آنا ہوا سرکار؟" رنگ علی نے پوچھا۔

"کیا کہتا ہے؟" صحبت خاں نے جبار خاں سے پوچھا۔

"پوچھتا ہے ہم کیوں آیا؟" جبار خاں نے کہا۔

"خو پوچھتا ہے ہم کیوں آیا؟" صحبت خاں نے کہا۔ "اُس سے پوچھو ہم کیوں آیا۔"

"خو تم بتاؤ ہم کیوں آیا؟" جبار خاں نے رنگ علی سے پوچھا۔

رنگ علی مسکرانے کی کوشش کرنے لگا۔

"کیا کہتا ہے؟" صحبت خاں نے جبار خاں سے پوچھا۔

"کچھ نہیں کہتا" جبار خاں نے کہا۔

"کچھ نہیں کہتا؟"

"مُسکراتا ہے۔"

"مُسکراتا ہے؟" صحبت خاں نے رنگ علی سے کہا۔ "خو تم مُسکراتا ہے! مسخری کرتا ہے!"

"خان صاحب بھی کمال کرتے ہیں" رنگ علی نے کہا۔ "میری مجال ہے کہ میں آپ سے مسخری کروں!"

"خو تم اچھا آدمی ہے" صحبت خاں نے کہا۔

"تان سین کا بیٹا اچھا آدمی نہیں ہے" گلباز خاں نے کہا۔ "وہ روتا ہے۔ تان سین کا بیٹا روتا ہے۔"

کلاک میں گھر گھر ہوئی۔ اور اُس نے ٹن ٹن کر کے بارہ بجانا شروع کیا۔ حسین بخش کے سوا سب کی نظریں اُس کی طرف اُٹھ گئیں تھیں۔ کلاک سے ذرا ہٹ کر دیوار پر ایک بڑا سا رنگدار فوٹو تھا۔ جس میں چوتھائی صدی پہلے کی کوئی ادھیڑ عمر کی گانے والی گلے میں اشرفیوں کا ہار ڈالے طنبورا چھیڑ رہی تھی۔ ناک پر بڑی سی لونگ تھی۔ اور سیدھی مانگ نکال کر جوڑا باندھ رکھا تھا۔

"خو دیکھو" صحبت خاں نے رنگ علی سے کہا۔ "ادھر قلیان ملیان بھی ہے؟"

"قلیان تو نہیں حقہ ہے سرکار" رنگ علی نے کہا۔

"ہم حقہ نہیں پئے گا۔"

"پان پیش کروں؟"

"ہم پان نہیں کھاتا۔"

"سگریٹ؟"

"سگریٹ خیر چرس کا سگریٹ کا مضائقہ نہیں ہے۔"

"چرس تو یہاں کوئی بھی نہیں پیتا سرکار!" رنگ علی نے کہا۔

"رنڈی ونڈی نہیں۔ قلیان ملیان نہیں۔ چرس نہیں یہ تمہارا کیسا طوائف کا مکان ہے؟" گلباز خاں نے کہا۔

"اچھا روغن کدو ہے؟" صحبت خاں نے پوچھا۔

"روغن کدو تو نہیں" رنگ علی نے کہا "آنولے کا تیل ہے۔"

"خیر وہی لاؤ" صحبت خاں نے کہا

رنگ علی ایک الماری کے پاس گیا۔ جس کے دونوں پٹوں کے چوکھٹوں میں دو لمبے لمبے آئینے جڑے ہوئے تھے۔ اور الماری کھول کر تیل کی بوتل لے آیا۔

"دیکھو تم بہت اچھا آدمی ہے" صحبت خاں نے کہا۔ تھوڑا

تیں ہمارے ... کو بتانے کہ ہم کس واسطے آیا۔"
یہ کہہ کر اس نے اپنی پگڑی اتار دی۔ معلوم ہوتا تھا
پگڑی بہت دیر سے اس کے سر پر تھی۔ پگڑی اتارنے سے اس کی
پیشانی پر گہرا ... پڑ گیا تھا۔ سر کے بال صرف
کناروں کے ... جیسے
انگور آیا ہوا کیوڑا۔

رنگ علی اس کی پیٹھ کے پیچھے جا کر کھڑا ہو گیا۔ تھوڑا سا تیل ابھی پر ڈالا اور پھر ملنے لگا۔

"شاباش، شاباش" صحبت خاں نے کہا۔ "اب ہم تم کو بتاتے ہیں ہم کیوں آیا۔" وہ کہتے کہتے رک گیا اور گلباز خاں سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

"گلباز خاں، تم بتاؤ یار، ہم ... ہے"

"ہم بتائے گا" گلباز خاں نے کہا۔ "پہلے تان سین کا بیٹا ہمارا ٹانگ دبائے۔"

"تان سین کا بیٹا" صحبت خاں نے کہا۔ "گلباز خاں کا ٹانگ دبائے۔"

حسین بخش بدستور سر جھکائے بیٹھا رہا۔ وہ سخت کوشش کر رہا تھا کہ ان کی طرف نہ دیکھے۔

"تان سین کا بیٹا ہمارا ٹانگ نہیں دبایا" گلباز خاں نے جیسے فریاد کرتے ہوئے کہا۔

"اس کے ایک دھپ لگاؤ" صحبت خاں نے کہا۔

"ہم دھپ نہیں لگائے گا" گلباز خاں نے کہا۔ "ہم اس کا کان مروڑے گا۔ تان سین کا بیٹا اپنا کان ادھر کرو" اُس نے حسین بخش سے کہا۔

"حضور معاف کر دیجئے" رنگ علی نے لجاجت سے کہا۔ پھر وہ حسین بخش سے مخاطب ہوا۔ "بھائی حسین بخش ضد نہ کرو۔ اُٹھ بیٹھو اور خان صاحب کی ٹانگ دبا دو۔ اُٹھو اُٹھو بچے نہ بنو۔ موقع محل دیکھا کرو۔"

حسین بخش سخت لاچاری کے ساتھ اُٹھا اور گلباز خاں کے پاس بیٹھ کر اُس کی ٹانگ دبانے لگا۔ آنسو ابھی اس کی آنکھوں میں خشک نہیں ہونے پائے تھے۔

"ہاہا" گلباز خاں نے حسین بخش کی پیٹھ پر زور سے تھپکی دے کر کہا۔ "تان سین کا بیٹا اب اچھا ہو گیا۔ اب ہم بتائے گا ہم کیوں آیا۔"

حسین بخش ... دیکھتا رہا۔

"تمہارا ننھی جان ہے نا؟" گلباز خاں نے رنگ علی سے پوچھا

"ہاں سرکار" رنگ علی نے کہا۔

"اُس کا نام ننھی جان ہے نا؟" گلباز خاں نے رنگ علی سے پوچھا۔

"ہاں سرکار" رنگ علی نے کہا۔

"تو بس ہم اُس کا ناک کاٹنے آیا ہے" گلباز نے کہا۔

"اُس بیچاری کا قصور؟" رنگ علی نے پوچھا۔ مالش کرتے کرتے اس کے ہاتھ تھم گئے تھے۔ چہرہ زرد پڑ گیا تھا اور آواز گلے میں اٹک اٹک گئی تھی۔

"قصور وصور کچھ نہیں" صحبت خاں نے کہا۔ "تم اپنا کام کرو"

"پھر کیا بات ہے سرکار؟" رنگ علی نے گلباز خاں سے پوچھا۔

"ہم سُنا اُس کا ناک بہت لمبا ہے" گلباز خاں نے کہا "اچھا نہیں لگتا۔ چھوٹا ہو جانے سے خوش رو ہو جائے گا"

"خدا کے واسطے خان صاحب" رنگ علی نے گڑگڑا کر کہا "ایسا غضب نہ کیجئے گا۔ وہ بیچاری تو بہت شریف ہے"

"جبھی تو ہم اُس کو خوش رو بنائے گا" گلباز خاں نے کہا۔

"ہم ننھی کو خوش رو بنا چکا ہے" جبار خاں نے کہا۔

گھڑی میں بارہ بج کر ۲۵ منٹ ہوئے تھے۔ کہ سیڑھیوں میں کئی قدموں کی آہٹ سُنائی دی۔ تینوں آدمیوں نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

رنگ علی صحبت خاں کے قدموں میں گر پڑا۔

"رسول کے واسطے خان صاحب" اُس نے ٹسوے بہاتے ہوئے کہا۔ "ہم پر رحم کیجئے۔ ہم بہت ہی مسکین لوگ ہیں۔"

دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔ گلباز خاں نے رنگ علی کی کلائی مضبوطی سے پکڑ کر اسے اُٹھایا اور دروازے کے پاس لے گیا۔ پھر اُسے دروازے کے سامنے کھڑا کر کے خود اُس کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔

"پوچھو کون ہے؟" گلباز خاں نے رنگ علی کے کان میں کہا۔

"کون ہے؟" رنگ علی نے پوچھا۔

"دروازہ کھولو۔ دروازہ کھولو" کئی آوازیں سنائی دیں۔

"نام پوچھو" کلباز خاں نے رنگ علی کے کان میں کہا۔

"کون صاحب ہیں؟ نام بتائیے" رنگ علی نے کہا۔

"ارے بھئی میں ہوں سلیم اللہ" دروازے کے اُس طرف سے آواز آئی "جلدی کھولو دروازہ"۔

"پوچھو آپکے ساتھ کون ہے" کلباز خاں نے رنگ علی کے کان میں کہا۔

"اچھا شیخ صاحب ہیں!" رنگ علی نے کہا۔ "آپکے ساتھ اور کون لوگ ہیں شیخ صاحب؟"

"میرے دوست ہیں بھئی" دروازے کے اُس طرف سے آواز آئی "آخر تم دروازہ کیوں نہیں کھولتے؟"

رنگ علی نے پلٹ کر کلباز خاں کی طرف دیکھا جس نے سر ہلا کر نہیں کا اشارہ کیا۔

"شیخ صاحب معاف کیجئے گا" رنگ علی نے کہا "اس وقت دروازہ نہیں کھل سکتا۔ بائی جی مجرے گئی ہیں۔ صبح کو آئیں گی۔ اس وقت خان صاحب وزیر خاں کے ہاں سے کچھ ہوئیں آئی ہوئی ہیں۔ ان کی وجہ سے دروازہ نہیں کھل سکتا۔ آپ کو زحمت تو ہوئی مگر مجبوری ہے۔ آپ کل تشریف لائیے گا"۔

اس پر سیڑھیوں میں کچھ دیر کھسر پھسر ہوا کی۔ پھر اُترتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ جو دھیرے دھیرے دھیمی ہوتی ہوئی گم ہو گئیں۔

"شاباش" صحبت خاں نے گاؤ تکیے سے لگ کر بیٹھتے ہوئے کہا "تم بہت عقل مند آدمی ہے"۔

"عقل مند اس سے بنایا" کلباز خاں نے چاقو دکھاتے ہوئے کہا "اگر یہ پدر سگ ذرا بھی چوں کرتا تو ہم اس کا نوک اس کی پیٹھ میں اُتار دیتا"۔

ایک بج گیا مگر ننھی جان نہیں آئی۔ تینوں آدمیوں نے جمائیاں لینی شروع کر دیں۔ جبار خاں نے چغے کی جیب میں سے نسوار کی ڈبیا نکالی جس میں سے چٹکی چٹکی تینوں نے لی۔

سوا بجے صحبت خاں نے رنگ علی کو گلے سے پکڑ لیا۔

"او خنزیر بچہ سچ بتا" صحبت خاں نے پوچھا "وہ تماشے گیا ہے یا اور جگہ گیا ہے؟"

"قسم ہے پنجتن پاک کی خان صاحب" رنگ علی نے اپنا گلا چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "وہ تماشے ہی گیا ہے"۔

"پھر وہ آیا کیوں نہیں؟" صحبت خاں نے پوچھا۔

"اللہ جانے کیوں نہیں آیا" رنگ علی نے کہا۔ پھر وہ لمحہ بھر خاموش رہ کر بولا "میں جانوں چشتی صاحب اُس کو اپنی کوٹھی لے گئے ہوں گے۔ اب تو وہ صبح ہی کو آئے گا"۔

"تم جھوٹ کہتا ہے" کلباز خاں نے کہا۔

"نہیں میں سچ کہتا ہوں" رنگ علی نے کہا۔

"ہم نہیں مانتا" کلباز خاں نے کہا۔

"آپ یہیں رہیئے پھر جھوٹ سچ معلوم ہو جائے گا" رنگ علی نے کہا۔

"پہلے کبھی ایسا ہوا؟" صحبت خاں نے پوچھا۔

"کئی بار" رنگ علی نے کہا۔

ڈیڑھ بجے تینوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ جمائیاں لیتے لیتے اُن کے جبڑے تھک گئے تھے۔ اور آنکھ اور ناک سے پانی بہنے لگا تھا۔ باہر بوندیاں تھم گئی تھیں۔ تینوں میں آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ اشارے ہوئے پھر وہ اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

"اچھا ہم جاتا ہے" صحبت خاں نے کہا۔

جس وقت وہ دہلیز کے پاس پہنچے تو صحبت خاں نے رنگ علی سے کہا:

"بخدا تمہارا ننھی جان کا قسمت بہت اچھا ہے۔ اچھا سلام"۔

"تان سین کے بیٹے کو بھی سلام" کلباز خاں نے کہا۔ اور وہ سیڑھیوں سے اُتر گئے۔

چند لمحے خاموشی رہی۔

"یا خدا یہ کیا مصیبت ہے!" رنگ علی نے کہا۔

"ایسے کام کی ایسی تیسی" حسین بخش نے کہا۔ "لعنت ہے ایسی کمائی پر۔ میں تو کل ہی یہاں سے چل دوں گا۔ کسی فلم کمپنی یا ریڈیو میں نوکری کر لوں گا۔ اور جو نوکری نہ ملی تو ٹیوشن کر لونگا۔ بھیک مانگ لونگا۔ مگر اس کوچے کا نام نہیں لوں گا"۔

رنگ علی نے کوئی جواب نہ دیا۔

ٹھیک دو بجے مکان کے نیچے ایک موٹر آ کے رُکی۔ اور پھر موٹر کا دروازہ زور سے بند ہونے کی آواز آئی۔ ذرا سی دیر میں ننھی جان ٹھمک ٹھمک کرتی سیڑھیاں چڑھتی کمرے میں داخل

ہوئی۔ اُس کے پیچھے پیچھے جمن تھا۔ جس نے ایک بقچہ اُٹھا رکھا تھا۔

ننھی جان نے ساڑی کے اوپر لمبا کوٹ پہن رکھا تھا جس کا کالر اور کف لومڑی کی کھال کے تھے۔ سُرخ ساڑی کی مناسبت سے پاؤں میں سُرخ سینڈل تھے۔ آدھے سر اور کانوں کو ایک مہین باریک سلک کے مفلر سے ڈھک رکھا تھا جس میں سے صرف کانوں کی لوئیں نظر آتی تھیں۔ ان لوؤں میں روپہلی ٹوپس دو ننھے ننھے ستاروں کی طرح دمک رہے تھے۔ اُس کے رخساروں پر غازہ سُرخ دھول کی طرح معلوم ہوتا تھا۔ اُس کے جسم اور لباس سے خوشبوئیں پھوٹ رہی تھیں۔ اُس کی عمر بائیس تئیس برس رہی ہے۔ یاد رنگی [illegible] سے وہ ایک مختصر حسینہ معلوم ہوتی تھی۔ آنکھوں سے مسکرانے والی، ٹھہرے ٹھہرے سانس لینے والی۔

رنگ علی اور حسین بخش کی نظر سب سے پہلے بے ساختہ اُس کی ناک پر پڑی جس میں سُرخ نگینے والی ایک کیل چمک رہی تھی۔

"شکر ہے آپ خیریت سے گھر پہنچ گئیں" رنگ علی نے کہا۔

"سینما کے بعد کم بخت [illegible] زبردستی ہوٹل لے گیا" ننھی جان نے کہا۔

"بہت اچھا ہوا!" رنگ علی نے کہا۔

"تم لوگ اتنے پریشان کیوں ہو؟" ننھی جان نے پوچھا۔

"بائی جی" حسین بخش نے کہا "مجھے تو آپ چھٹی ہی دے دیجیے۔"

"آخر ہوا کیا؟"

"آپ گھر پر ہوتیں تو قیامت ہی آ جاتی" رنگ علی نے کہا۔

"کچھ کہو تو آخر ہوا کیا؟"

"آپکے پیچھے تین پٹھان آئے تھے" رنگ علی نے کہا "بڑے وحشی سے۔ اُنکے پاس لمبے لمبے چاقو تھے۔ ہمیں مارا پیٹا گالیاں دیں۔ بات بات پر چاقو نکالتے تھے۔ کہتے تھے ــــ"

"کیا کہتے تھے؟" ننھی جان نے پوچھا۔

"کہتے تھے اُن کے مُنہ میں خاک ہم ننھی جان کی ناک کاٹنے آیا ہے۔"

لمحہ بھر کے لئے ننھی جان کے چہرے کی رنگت کی ایسی کیفیت ہوئی۔ جیسے کوئی بلب فیوز ہوتے ہوتے دوبارہ روشن ہو جائے۔ پھر اُس نے نگاہیں اپنی انگلیوں کے سُرخ رنگے ہوئے ناخنوں پر گاڑ دیں۔

"میں نے کہا تھا" رنگ علی نے کہا۔ "بائی جی رات کو واپس نہیں آئیں گی پھر بھی ڈیڑھ بجے تک ہلنے کا نام نہیں لیا۔"

"میرے مُنہ پر اس زور کا تھپڑ مارا کہ دو دانت ہل گئے" حسین بخش نے لبسورتے ہوئے کہا۔

ننھی جان نے کچھ جواب نہ دیا۔

"آخر اب کیا ہوگا؟" رنگ علی نے پوچھا۔

"جانے کیا ہوگا!" ننھی جان نے کہا۔

"تھانہ میں رپٹ نہ لکھوا دیں؟"

"کچھ فائدہ نہیں۔ اُلٹی بدنامی ہوگی۔ پھر پولیس والوں کے ناز معشوقے۔"

"کہیں اور نہ چل دیں؟"

"کہاں؟"

"کسی اور شہر!"

"کچھ فائدہ نہیں۔ سب جگہ ایسا ہی حال ہے۔"

"آخر پھر کیا کریں؟"

"کیا ہو سکتا ہے؟"

"کچھ نہیں ہو سکتا؟"

"کچھ نہیں ہو سکتا!"

پل بھر خاموشی رہی۔ اس کے بعد ننھی جان نے انگڑائی لی۔ اُس کے ہونٹوں پر ایک تھکی تھکی سی اُداس مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"خلیفہ جی!" اُس نے رنگ علی سے کہا "اس وقت تو تم لوگ آرام کرو۔ صبح دیکھا جائے گا۔"

یہ کہہ کر وہ اپنی خواب گاہ میں چلی گئی۔ اور اندر سے دروازہ بند کر لیا۔

پانچ منٹ کے بعد سب کواڑ بند کر دئے گئے تھے۔ اور روشنی گل کر دی گئی تھی۔ دونوں اُستاد اور جمن فرش پر پاس پاس بستر بچھا کے لیٹ گئے تھے۔

"یہ پٹھان ضرور کسی کے بھیجے ہوئے تھے" رنگ علی نے حسین بخش سے کہا۔

"مگر کیس کے ؟" حسین بخش نے کہا۔

لمحہ بھر خاموشی رہی۔

"ہو نہ ہو یہ جھگڑے والے حاجی کی کارستانی ہے"۔ رنگ علی نے کہا۔ "وہ بڈھا نکاح کے لئے بائی جی کے پیچھے پڑا ہوا تھا"۔

"ہُوں"۔ حسین بخش نے نحیف آواز میں جواب دیا۔

پل بھر کو پھر خاموشی رہی۔

"یا شاید یہ نواب صاحب کی بدمعاشی ہے"۔ رنگ علی نے کہا۔ "اُس کو یہ چڑ تھی۔ کہ ظفر صاحب کیوں آتے ہیں"۔

"ہُوں"۔ حسین بخش نے پہلے سے بھی نحیف آواز میں جواب دیا۔

چند لمحے خاموشی رہی۔

"پھر خیال آتا ہے"۔ رنگ علی نے کہا۔ "کہیں یہ اُس فیض آباد کے کنگلے تعلقدار کی شرارت نہ ہو۔ جس کو بائی جی نے بے عزت کر کے مکان سے اُتار دیا تھا"۔

حسین بخش نے کوئی جواب نہ دیا۔ اُس نے مُنہ دُھسے کے اندر کر لیا تھا۔ اور لمبے لمبے سانس، جو ابھی خراٹے نہیں بنے تھے، لینے شروع کر دئے تھے۔ مگر رنگ علی کی آواز برابر سُنائی دے رہی تھی۔

"میں جانوں یہ راؤ صاحب کا کیا دھرا ہے۔ وہ کالا مارواڑی جو بائی جی کو بنارس لے جانا چاہتا تھا۔۔۔۔"

غزل

سرمایۂ بہارِ چمن و دمن ہوا
گویا لباسِ گل بھی مرا پیرہن ہوا

تنہائی خیال سے گھبرا گیا، کہ دل
ہر انجمن میں خلوتیِ انجمن ہوا

ساری نمودِ حسن جنوں پر ہی منحصر
گل سینہ چاک ہوکے بہارِ چمن ہوا

بے تابیوں کا حال نہ کچھ اُن پہ کھل سکا
ہر حرفِ مدعا مجھے زخمِ دہن ہوا

اِک شاخِ گل بھی مجھکو چمن میں نہیں نصیب
یہ اُس کا حال ہے جو بنائے چمن ہوا

ملتی نہیں ہے عشرتِ منزل لُٹے بغیر
رہبر ہی میرا کیوں نہ مرا راہزن ہوا

تابش بھلا یہ نازِ غمِ عشق کون اُٹھائے
دل آشنائے عشرتِ رنج و محن ہوا

تابش دہلوی

تصانیف مرزا عظیم بیگ چغتائی مرحوم

تمریر بیوی :- چغتائی صاحب کا سب سے پہلا اور سب سے مقبول مزاحیہ ناول۔ قیمت ایکروپیہ آٹھ آنے۔

کمزوری :- "اے عورت تیرا نام کمزوری ہے" اس مقولے پر ایک بڑی حیرت ناک داستان چغتائی صاحب نے لکھی ہے۔ قیمت ایکروپیہ آٹھ آنے۔

مُنہ کی کھلے :- کالج کے لڑکوں کی شرارتیں اور گیدیوں کی خانہ بدوش زندگی کی تصویر۔ یہ ناول ایک عبرتناک داستانِ محبت ہے جسکا جواب شہنشاہ ایڈورڈ ہشتم کی کہانی بھی نہیں دے سکتی۔ قیمت ایکروپیہ آٹھ آنے۔

ملنے کا پتہ:- ساقی بک ڈپو۔ دہلی۔

قیسی رامپوری

حرام

اُس کو برادری، شریعت اور رسم کی چادر میں لپیٹ کر سلیمان کے گھر بھیج دیا گیا اور سلیمان نے ایک سدھے ہوئے گھوڑے کی طرح بغیر کان ہلائے خاموشی سے اس کو قبول کر لیا۔ وہ ٹھیکیدار تھا۔ عمارتوں کے ٹھیکے لیا کرتا تھا۔ وہ تعمیر کے نہیں شکست و ریخت کے بھی۔ بعض عمارتیں اس کو وقت پر نو کر دینی پڑتیں تھیں۔ مسالہ کچا ہوتا، پانی ناقص ہوتا اور مزدوری ہی کم بخت ہوتی۔ عمارت کھڑی کرنی ہیں اور کچھ ایسی ہی عمارتوں پر صدیاں بیت جاتی ہیں۔ افلاس گوجر پڑھتا ہے اور آخر میں بالکل آخر میں لوم نوبت رنی کرتا ہے۔

یہ عمارتیں صدیوں تک قائم رہتی ہیں، گنبد افراسیاب کی حیثیت اختیار کر لینے کے بعد تک۔ قائم رہتی ہیں مگر رواں صدیوں کے تسلسل میں تمام عمارتیں ایک حال پر برقرار نہیں رہتیں۔ بعض تو ان میں سے پوری کی پوری مذاقِ وقت سے خارج ہو جاتی ہیں اور بعض کے چند حصوں کو سنبھال کفایت شعاری کبھی ضرورتاً اور کبھی پرستشِ قدامت کی خاطر رہنے دیا جاتا ہے جس کو یادگار سمجھئے یا آثارِ قدیمہ۔

مگر بہت سی پرانی عمارتوں کو ڈھا دینا پڑتا ہے۔ سلیمان ٹھیکیدار نے بھی ایسی بہت سی عمارتوں کو منہدم کیا تھا۔ وہ گریں، مسالہ اب بھی ان میں سے نکلا مگر نام بدل کر چونا سالخوردہ، اینٹیں باد و باراں دیدہ اب یہ ملبا تھیں۔ اور ان میں پانی اور مزدوری اس طرح خشک ہو چکی تھی جیسے یہ چیزیں کبھی عمارت میں صرف ہی نہیں کی گئی تھیں یہ قبروں کے خول، یہ شمشان بھومی کی خالی خالی چھتریاں۔۔۔ کیا واقعی ان میں کبھی دنیا کے ناموروں کے جسم دھرے گئے تھے؟ کس کو یاد۔

سلیمان کو جس طرح بعض عمارتیں وقتِ مقررہ پر بنوانی پڑتی تھیں اُسی طرح ایک معین عرصے میں اس کو بعض مسمار بھی کرانی پڑتی تھیں۔ یہ وقت کا ٹھیکہ تھا اور جب وقت ٹھیکہ لیتا ہے تو تمام ماحول اُس کا مطیع ہو جاتا ہے۔

لاکھ وقت کو ٹھہرا دو نہیں مستقبل کا ہر لمحہ حال کی چکنی سطح پر چشم زدن میں ڈگمگاتا ہے اور ماضی کی گہرائیوں میں جا گرتا ہے پھر اسکو نہ زمانہ آواز دے سکتا ہے نہ وقت۔ یہ ماضی ہی میں قدرت ہے کہ وہ اگرچہ قدرت کی شریکِ ابدیت تو نہیں مگر شریکِ ازلیت ضرور ہے۔ کتنی گہرائی ہے ماضی کی اور کس قدر وسعت ہم ــــ ہم کیا ہماری تہذیب، ہمارا تمدن، ہمارا مذہب، ہماری سیاست، ہمارے مرنے کے طریقے خواہ عشق کے سلسلے میں خواہ موت کی غلطی سے، ہمارے جینے کی دھن یہ نہ حال ہیں نہ مستقبل بلکہ تمام تر ماضی۔ دور دھندلکا نظر آتا ہے، اندھیرے میں چھپے نقوش کچھ دکھائی نہیں دیتے لیکن جب بھی ہم نقشِ ثانی بنانے کھڑے ہوتے ہیں تو اعتقادِ باری کی طرح اپنے کو ماضی یا قدامت سے وابستہ پاتے ہیں۔

مگر یہ ناممکن ہے قطعی ناممکن کہ ہم پوری کی پوری ماضی سے چمٹے رہیں، تمام کی تمام پرانی عمارت میں نئے مذاق اور جدید جسموں کے ساتھ آسودگی محسوس کرتے رہیں اور ساری کی ساری زندگی کو زندگی سمجھتے رہیں۔ زندگی کا وہی مقام تو زندگی ہے جہاں احساسِ حیات یا کربِ زندگی محسوس ہو۔ جب وہ برادری، شریعت اور مراسم کی چادر میں لپیٹ کر سلیمان کے گھر بھیجی گئی تو اسکو (سلیمان کو) اُس کے آتے ہی احساسِ حیات ہوا۔ مگر یہ احساس ٹھیکے سے ماورا تھا، وہ کوشش کرتا تب بھی اس احساس کا ٹھیکہ نہیں لے سکتا تھا۔ یہ تو بڑا کنٹریکٹ تھا۔ ہاں اس نے ٹھیکیداری کی لمبی اور طوفانی زندگی میں برادری، شریعت اور مراسم کی چادر میں لپٹی ہوئی آنے والی کے آتے ہی اپنی مبہم زندگی کے ایک سرے پر نشان لگا دیا تھا۔ جیسے وہ ایک سنسان سڑک پر چلا جا رہا ہو جس کے گرد و پیش کوئی چونکا دینے والا منظر نہ ہو لیکن دفعتاً کسی درخت کے نیچے اس کو کوئی برات نظر آ گئی ہو یا کسی انسان کو قتل کر دیا گیا ہو اور اس نظارے نے سنسان سڑک کے اُس

مقام سے اس کو آگاہی بخشدی ہو۔

وہ اس کی بیوی تھی حلال بیوی کیونکہ برادری، شریعت اور مراسم نے اس کو بھیجا تھا۔ اس نے سات سال میں چار بچے دئے جو سب حلالی تھے۔ وہ حلال بھیجی گئی تھی اس لئے حلال رہی اور سبکو حلال کرتی رہی۔ سلیمان کو سلیمان کے گھر کو، اس کے دل و دماغ کو اس کی روح کو اور تمام ماحول کو۔

"آج اتنی دیر میں کیوں آئے ؟" اُس نے گرج کر سلیمان سے دریافت کیا۔

"مزدوروں کو تنخواہ بانٹنی تھی" سلیمان نے تکان سے پلنگ پر گرتے ہوئے کہا۔

"یا جوان مزدورنیوں کے دل بہلا رہے تھے" اس نے سلیمان کے منہ پر تکیہ پھینکتے ہوئے پوچھا۔

"اسکا تمکو اچھی طرح علم ہے کہ میں ـــــ"

"کہ تم نہایت پاکباز ہو۔ یہی کہنا چاہتے تھے نا ؟"

"بڑی بی میز پر کھانا چُن دو" سلیمان نے تکان و حقارت سے اس کی طرف سے مُنہ پھیرتے ہوئے ماما سے کہا۔

"کھانا اس وقت ملے گا جب میری بات کا جواب دوگے"۔

"تمہاری بات ایسی ہے جسکا کوئی جواب نہیں ہو سکتا۔"

"خدا مجھے موت کیوں نہیں دیتا" اُس نے چھوٹے بچے کو زور سے جھولے میں پٹ۔ کر کہا۔

"کیونکہ موت اچھے لوگوں کو جلد آتی ہے"

"تمہارے گھر میں میں نے ایک گھڑی سُکھ کی نہیں گزاری ہمیشہ قسمت ہی کو روتے میری زندگی کٹی ہے یہاں"

سلیمان نے کراہت سے مُنہ بنایا اور کراہتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ حلال بیوی تھی اس لئے اس نے سلیمان کے گھر میں ایک حلال جہنم بنا رکھی تھی۔ اس سات سال کی مدت میں شاید ہی کوئی گھڑی ایسی گزری ہو کہ اس نے سلیمان کو زندگی سے بیزار نہ کر دیا ہو۔ سات سال سے اب اس ویران سڑک پر برابر قتل ہو رہے تھے اس لئے سلیمان اس سڑک کے ایک ایک ذرہ سے آگاہ ہو چکا تھا۔ اب اس راستے پر کسی نشاندہی کی ضرورت نہ رہی تھی۔

ایک کالی اور ادھیڑ سی مزدور عورت اکثر اوقات فرصت میں اس کو پانی پلاتی تھی اور کبھی کبھی پیر بھی دبا دیتی تھی عمارتوں کے ٹھیکوں کے ساتھ وہ بھی منتقل ہوتی رہتی تھی۔ پھر اُس کی عمر و صورت سلیمان کے لیے اور حلال ٹھیکے کو توڑ ڈالنے کے ہر امکانی خطرے سے معرّا تھی اس لئے سلیمان اگر اس کو اپنے چور چور جسم کے مسالہ کے لئے منتخب کر رہا تھا تو اُس کو ذوقِ تعمیرِ نو سے کوئی دور کا واسطہ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

"رحمتن کہو میں ایمان لاتی ہوں خدا پر، ملائکہ پر، کتاب پر اور رسولؐ پر" سلیمان نے ایک روز اس کی جھونپڑی میں جاکر کہا۔

"میاں میرا تو پہلے ہی سے ان پر ایمان ہے" رحمتن نے اپنے منتشر بالوں کو جوڑے میں لپیٹتے ہوئے حیرت سے کہا۔

"پھر دہراؤ ان الفاظ کو۔ میں بھی تمہارے ساتھ ہی دہراتا ہوں اتنے اضافہ کے ساتھ کہ میں عمر بھر تمہارا رہوں گا اور تم کو بھی میرا ہو کر رہنا ہے" سلیمان نے کہا۔

"یہ سلیمان جیسے سمجھدار آدمی کو کیا ہو گیا ہے" پندرہ روز بعد مستری نے دوسرے کاریگر سے کہا۔

"کیوں کیا ہوا ؟"

"اُس نے رحمتن کو ناجائز طریقہ سے گھر میں ڈال لیا ہے" مستری نے حقارت سے کہا۔

"اچھا! اب کیا ہوگا ؟" کاریگر نے اظہارِ حیرت کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہوگا کیا حرام" مستری نے اُسی اندازِ تحقیر سے جواب دیا۔

تصانیف مرزا عظیم بیگ چغتائی مرحوم

جنت کا بھوت:- اِس دلکش قصے کے تین باب ہیں۔ نہایت ہی پُر مذاق پلاٹ ہے۔ اور قصہ اس قدر ہنسانے والا دلچسپ اور دلآویز ہے کہ شروع کرکے ختم کئے بغیر ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔ قیمت آٹھ آنے۔

مرزا جنگی:- یہ ایک نہایت ہی مضحکہ خیز اور حد سے زیادہ دلچسپ اور ہنسنے ہنسانیوالا مزاحیہ ڈرامہ ہے۔ پلاٹ اس قدر عجیب غریب، تمسخر آمیز اور مذاق میں ڈوبا ہوا کہ ہر سین دو مرتبہ پڑھنا پڑے گا۔ قدیم لکھنؤ کی مضحکہ خیز تہذیب کا عبرتناک مرقع۔

ملنے کا پتہ:- ساقی بک ڈپو، دہلی۔ قیمت ۸/

قتیل شفائی

ماضی کے کھنڈر

وہ مکاں جس کے دریچے مدتوں سے بند ہیں
کچھ دنوں سے چھا رہا ہے میرے احساسات پر

زندگی کی دھڑکنیں، لو وہ تاثیر ہیں
وقت کے ماتھے پہ اک تازہ چمک پیدا ہوئی
تیرہ و تاریک راہوں میں ستارے بجھ گئے
ان اُجالوں میں اندھیرے لاکھ تعزیر ہیں

آہ وہ رنگیں سحر میری محبت کی رقیب
اُف وہ غرّاتی ہوئی موٹر کا بل کھاتا دھواں
آخری آہوں میں وہ ڈوبا ہوا لمبا سفر
ایک نادیدہ وطن میں کھو گیا میرا حبیب

زندگی نے دو قدم پیچھے کو پلٹا کھا لیا
پھر وہی پیماں، وہی سہمی ہوئی سرگوشیاں
سُن رہی ہوں اب بھی ماضی کے نغمے
ٹمٹماتا ہے ابھی تک میری کٹیا کا دیا

دیکھ کر کٹیا میں مجھکو کروٹیں لیتے ہوئے
غرق ہو جاتے ہیں احساسات گہری سوچ میں
رینگتی ہے دل کے اک تاریک گوشے میں امید
آ رہے ہوں جیسے وہ مجھکو صدا دیتے ہوئے

وہ گٹھیلا سا بدن ابریشمی ملبوس میں
آتے جاتے آنکھوں آنکھوں میں سندیسے پیار کے
بھول سکتے ہیں مجھے؟ اُنکو بھلا سکتی ہوں میں
اُف وہ آنکھیں دو دیے جلتے ہوئے فانوس میں

جن کے پس منظر میں میری جنتیں آباد تھیں
مسکراتے ہیں ابھی تک اُن دریچوں کے کواڑ
جیسے میری زندگانی مضحکہ انگیز ہے
جیسے میرے جھونپڑے کا کوئی مستقبل نہیں

میں نے دیکھی تھی انہیں آنکھوں میں تاروں کی چمک
اک مسلسل کیف، اک پیہم مسرت کی نمود
والہانہ عشق کی اک غیر فانی یادگار!
ہلکی ہلکی سی خلش، اک میٹھی میٹھی سی کسک

میرا ننھا ہے کہ فردوسِ بریں کا پھول ہے
رات کی تنہائیوں میں دے کے اُسکو لوریاں
"لو وہ ابا آ گئے" کہتی ہوں جانے کس لئے
وہ نہ آئینگے، نہ آئینگے یہ میری بھول ہے

وہ مکاں جس کے دریچے مدتوں سے بند ہیں
کچھ دنوں سے چھا رہا ہے میرے احساسات پر

مرزا فہیم بیگ فہیم چغتائی

چکری کا میلہ

دُنیا کا کون سا خطہ ہوگا، جہاں لوگوں نے اپنے جذبات تمدن معاشرت، اور عقائد کے مطابق میل ملاپ، سیر و تفریح، نمائش کمالات خرید و فروخت، اظہارِ عقیدت یا حصول ثواب کی غرض سے تیج تہوار میلے تماشوں، عُرس یا تیرتھ وغیرہ کا دستور نہ باندھ رکھا ہو۔

بالکل صاحب ہیں جنہوں نے اس قسم کے عجیب و غریب نظارے دیکھے ہوں جنہیں طرح طرح کے اثرات سے خالی کہا جا سکے۔ خاص کر بعض طبائع تو ایسے ہنگاموں کی بیحد دلدادہ پائی جاتی ہیں بلکہ اکثر اس مزاج کے لوگ بھی دیکھنے میں آتے ہیں، جنہیں ان ہنگاموں کے تفصیلی حالات معلوم کرنے کا بڑا شوق اور دلی لگاؤ ہے۔

اس بنا پر آج میں ایک ایسے میلے کا ذکر کرتا ہوں جس کی مثال سوائے گوالیار کے کہیں نہیں ملتی۔

. . . .

اُس وقت جبکہ دو مہینے کی بارش سے کچھ صحرا کی گرمی بہت کچھ اعتدال پر آجاتی ہے گوالیار کے پہاڑی قلعہ پر کھڑے ہوکر نگاہ دوڑائیں تو چاروں طرف لہلہاتے کھیت، ہرے بھرے سبزہ زار، جھیل تالاب اور ندی نالے نظارہ نوازی کرنے لگتے ہیں تو سلونو کی شام کو حضرت محمد غوث صاحبؒ کے حظیرے کی شمالی جانب والے میدان میں ایک میلہ بھرتا ہے، جسے "چکری کا میلہ" کہتے ہیں۔

جب ہوش سنبھالا میں نے تو اسی مقام پر یہ میلہ دیکھی البتہ گوالیار کے پُرانے خاندانوں کی روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ پہلے اس طرف ایک پُر رونق محلہ آباد تھا، اور میرے بچپن میں کتنے ہی بزرگ یہاں کوئی عظیم الشان کاٹھ کا محل بھی بتلاتے تھے، اب وہ سب کچھ ملیا میٹ ہوکر ایک بڑا میدان نکل آیا ہے صرف وہ مسجد جس کی خود حضرت محمد غوث صاحبؒ نے اپنے دستِ مبارک سے بنیاد رکھی تھی، نیز اس مسجد اور حظیرے کے درمیان اکبری دربار کے مشہور گویئے میاں تان سین کا مزار اور اسی قطعہ میں خوشنما جالیاں کٹے ہوئے نہ جانے کن کن بزرگوں کے قبے باقی رہ گئے ہیں۔

اس نہر خموشاں کے بائیں یعنی جانب جنوب ایک کچا تالاب ہے جسے غونی تلیا، غونی تلیا کہتے ہیں۔ اس تلیا میں اگلے وقتوں میں سلونو کے دن عورتیں جھنجریاں سرانے آیا کرتی تھیں، اور موجودہ اسٹیشن جانے والی سڑک کے دوسرے رُخ برانی ماتا کے مندر کی طرف مرد چکریاں پھرایا کرتے تھے۔

مرہٹی راج قائم ہونے کے بعد ایک بار سرگ باشی عالیجاہ بہادر مہاراجہ دولت راؤ صاحب سیندھیا نے جو اس میلہ میں شرکت کی تو چکریوں کے کرتب سے بہت محظوظ ہوئے انعام و اکرام سے کھلاڑیوں کو شاد کام فرمایا، اور کیونکہ اس وقت حظیرے کی اس سمت جس کا ذکر کر چکا ہوں، کافی میدان نکل آیا تھا۔ یعنی گوالیار سے مُرار جانے والی سڑک اور حظیرے کے درمیان کوئی عمارت حائل نہ رہی تھی، لہذا زنانہ انبوہ سے بچ کر چکری پھرانے والوں کا جماؤ ادھر ہونے لگا۔ جس نے بہت جلد اس درجہ میلے کی صورت اختیار کر لی کہ اسلامی تہواروں عید اور بقرعید وغیرہ کی طرح مذکورہ بالا تقریب کے موقع پر مکتبوں کے مُلا مولوی صاحبان اپنے طالب علموں کو عیدی دیا کرتے تھے، چنانچہ چکری کے میلے کی ایک مُلا شاہی عیدی میاں جی خیر الحق صاحب مرحوم سے مجھے بھی پہنچی تھی، ملاحظہ فرمایئے ۔

سلونو ساون و خوش نو بہار است نہ کہ میلہ چکریاں در پہلے پار است
نہیں طاقت کہ گنبد تک پھرائیں نہ کہ گنبد در بلندی بے شمار است

٭ ٭ ٭

. . . .

کسی زمانے میں منّو پاٹھک ایک کلال جس کا نام معلوم نہ ہو سکا، جینی لال ایک مسلمان، دو تیلی لچھمن اور بلدیو نامی چکری کے بڑے اُستاد مانے گئے تھے۔ ان کے بعد گلا بڑھئی شکر دلال، شیام لال کایستھ گوالیاری، دُلارے لال برہمن اور ڈھاکن بنسیا۔

اوّل الذکر منّو پاٹھک کے والد گوپال پاٹھک بھی خوب چکری

پھراتے تھے، اس وجہ سے مہارانی بھیا بائی سرکے باشی نے علاوہ سالانہ انعام کے چار آنہ یومیہ ان کا روزینہ باندھ دیا تھا، مہارانی صاحبہ کا انتقال ہونے کے بعد سرکے باشی عالیجاہ بہادر جیواجی مہاراج نے دو آنے روزانہ تخفیف کر دیئے دو آنے میں گذارا نہ دیکھ کر متو پاٹھک جے پور چلے گئے اور سنہ ۱۹۱۵ء سے سنہ ۱۹۲۴ء تک وہیں اپنے کمال کا مظاہرہ کرتے رہے۔

یہ صاحب یعنی متو پاٹھک پچاس ہاتھ ڈور کی چکری کے ڈیڑھ ڈیڑھ سو ہاتھ نکالتے تھے، اس عجیب استادی پر سرکے باشی مہاراجہ رام سنگھ جی صاحب والئی جے پور نے ان کو ایک روپیہ روزانہ جیو کا لگا دی۔

چند سال بعد نہ جانے کیوں پاٹھک جی موصوف نے اپنے بھائی سانگ رام کے فرزند بالارام کو اس جگہ مقرر کر دیا، لیکن یہ تقرر ایک روپیہ کے بجائے بارہ آنہ یومیہ پر ہوا، جب بالارام نہ رہے تو ان کے بچے مدن گوپال کے نام آسامی کر دی گئی، مگر چونکہ ابھی وہ نابالغ ہے اس کا فرض انجام دیتے ہیں بلدیو سنگھ دُندیریا، انہیں ساون میں کجریا تیج اور جیت شدی کو جے پور حاضر ہو کر گنگوری بازار کے میدان میں چکری پھرانے جانا پڑتا ہے۔

یہ حالات ابھی تک کسی نے قلم بند نہیں کئے، بڑی جستجو کے بعد خاص خاص ذرائع سے مجھے معلوم ہو سکے ہیں، لاکھ کوشش کی اس سے زیادہ کچھ نہ ملا، اب ذرا میں اپنے چشم دید حالات عرض کرتا ہوں!

میرا بچپن ریاست کے دیگر اضلاع میں گذرا، سنہ ۱۸۹۹ء میں جبکہ میری عمر تقریباً گیارہ سال ہوگی والد ماجد کے تبادلہ پر خاص شہر گوالیار آیا، اس وقت سے لے کر سنہ ۱۹۱۵ء تک اس میلے کی شرکت کا موقعہ ملتا رہا، اور کچھ عجیب عجیب تماشے دیکھنے میں آئے۔

سنتا ہوں کہ دولت راؤ مہاراج کے بعد موجودہ مہاراج صاحب دام اقبالہ کے جد معظم سرکے باشی مہاراجہ جیواجی راؤ صاحب بھی ہر سال پیکی پو کے راستے چکری کا میلہ دیکھنے تشریف لاتے اور کھلاڑیوں کو انعام و اکرام سے نہال کرتے رہے، میرے ہوش سنبھالنے سے پہلے ان کا انتقال ہو چکا تھا، سرکے باشی عالیجاہ بہادر سرمادھو راؤ صاحب نہ تو اس وقت سن بلوغ کو نہ پہنچنے کی وجہ سے با اختیار تھے، اور نہ اٹھارہ بیس سال اس میلے میں رونق افروز ہوئے، تاہم یہ میلہ خوب دھوم دھام سے برابر جاری رہا، ہر سال لوگوں کو چکریاں پھرائی گئیں۔

یہ چکریاں بارہ بارہ چودہ چودہ انگل قطر کی ہوتی ہیں، اور ان کی ڈور پچیس تیس ہاتھ سے لے کر پچاس ہاتھ تک، اس ڈور کے سرے پر ایک گھتی سی ہوتی ہے جسے کھلاڑی سیدھے ہاتھ کی بیچ کی گھائی میں اٹکا کر الٹے ہاتھ سے چکری نیچے گرا کے آسمان کی طرف پھینکتا ہے، ڈور ختم ہونے پر جھٹکا لگنے سے وہ چکری ڈور میں لپٹتی ہوئی نیچے آتی ہے، جوں ہی ہاتھ ڈیڑھ ہاتھ ڈور رہی کہ دوسرا ہاتھ لگائے بغیر کھلاڑی نے ذرا ترچھے ہو کر زور سے اچھالی، آخر میں جھٹکا لگا، چکری ڈور میں لپٹی ہوئی نیچے آئی، پھر اسی طرح اچھالی گئی، بس جب تک ڈور جانے نیچے آنے میں چکری ٹیڑھی نہ ہو یا کھلاڑی تھک نہ جائے متواتر چکر لگتے رہتے ہیں، جس کی ڈور لمبی ہو اور شمار میں چکر بھی زیادہ دے سکے وہ ہی کھلاڑی میر رہتا ہے، اس کرتب میں قوت جسمانی کے علاوہ دھیان قائم رکھنے اور بدن سادھنے کی مشق سخت ضروری ہے، جہاں نظر چوکی یا اونچا نیچا پیر پڑ کر کھلاڑی کا توازن تاؤ بھاؤ ہوا کہ بندھا بندھایا طلسم ٹوٹا۔

چکریاں پھراتے وقت خوب میدان دیکھ کر بڑی نگرانی رکھی جاتی ہے کہ کہیں حاضرین کی قطار ٹیڑھی نہ ہو جائے کیونکہ اگر کوئی شخص ادھر ادھر ہو تو بڑی گڑبڑ پھیلتی ہے۔

چنانچہ میرے لڑکپن کا واقعہ ہے، میں اس وقت اگلی صف میں موجود تھا، ایک کشیدہ قامت تنومند جوان نے نہایت انہماک سے چکری پھرانی شروع کی، سامنے کے آدمیوں میں سے مرار کے کوئی لمبے تڑنگے سے بابوجی کھڑے تھے، یکایک نہ جانے ان کے جی میں کیا آئی کہ آپ وہاں سے اچک کر دوسری جگہ جانے لگے، ادھر جھر جھر جھر جھراتی ہوئی چکری جو ایک زنائے میں اٹھی تڑ کھٹ سے بابوجی کی ٹھوڑی سے جا ٹکرائی، ہڈی تک نوبت نہ پہنچی، بابوجی صاحب تھے کہ لڑکھڑا کر گھٹنوں ہتھیلیوں کے بل زمین پر گرے، خون کا فوارہ چھوٹنے لگا، فوراً لوگوں نے انہیں سنبھالا، آناً فاناً ایک ہلڑ مچ گیا، لیکن کیونکہ چکری کی

دھن میں ہونے کے سبب کھلاڑی بے قصور تھا۔ اس سے کسی نے آدھی بات بھی نہ کہی، اور وہ بھی جلد جلد ڈور سمیٹتا افسوس کرتا بابوجی صاحب کی سنبھال کرنیوالوں میں شامل ہوگیا۔

. . . .

جب ہمارے مرگ باشی مہاراجہ سرمادھوراؤ صاحب سیندھیا با اختیار ہوئے اور چکری کے میلے میں سواری آئی کھلاڑیوں کے دل شیر ہوگئے میلے کا رنگ ہی کچھ اور نظر آنے لگا۔

اس سے پہلے شہر کی پولیس ہی اپنے طور پر انتظام کر لیتی تھی، اور آپس کے صلاح مشورے سے کھلاڑی چکریاں پھرا پھرا کر چلے جایا کرتے تھے، اب جو شہریار کی تشریف آوری ہوئی تو جناب عالی! باقاعدہ کھلاڑیوں کی فہرست تیار ہوئی اور سب ایک قطار میں کھڑے کر دئے گئے۔

صبح کی موسلا دھار بارش سے زمین تر بتر، خطیرے کے میدان میں ہری بھری دُوب کا سبز قالین سا بچھا ہوا، درمیان میں مہاراجہ عالیجاہ بہادر جلوہ افروز دائیں بائیں سرداروں اور اراکین ریاست کی کرسیاں قرینہ قرینہ سے نقیب چوبدار مضمور کے جھنڈ دار وغیرہ استادہ کچھ ایسا دلکش سماں تھا کہ کیا کہوں۔ مغربی سمت رنگ برنگے بادل ہوا کے فراٹوں میں اُڑے جاتے تھے، قلعہ کے کنگوروں سے لب بام آفتاب کی گہربار کرنیں بکھر بکھر کر اس منظر کو بے پناہ بنا رہی تھیں، مہاراجہ کے حکم سے چکریاں پھرنی شروع ہوئیں، اور باری باری ہر ایک کو ارمان نکالنے کا موقعہ دیا جانے لگا، چند کھلاڑیوں نے خوب خوب ہاتھ دکھلائے، اتنے میں آواز پڑی:۔

بھوجا حلوائی ...... بھوجا حلوائی گوالیار والا ۔۔

اب حضور معلّیٰ عالیجاہ بہادر اور صغار و کبار نے دیکھا کہ ایک سوکھا ساکھا سا بڈھا دھندلی دھندلی آنکھوں میں بہت بہت سا کاجل لگائے، اونچی چولی کا انگرکھا پہنے، بسنتی پگڑی ڈاٹے، اُلٹے ہاتھ میں باناتی تھیلی لٹکائے گھٹنے سے گھٹنا لڑاتا، کبڑی ٹیکتا، کھلاڑیوں کے گروہ سے برآمد ہوا، ایکدم تالیوں اور مخلوق کے شور و غل سے خطیرہ گونج گیا کہ واہ بڈھے یہ تیرے ٹھاٹھ آج تو خوب دھجا بنائی۔

ادھر بھوجا جو اُلٹے سیدھے پیر ڈالتا میدان میں پہنچا تو کبڑی تھیلی پھینک کر تن گیا، مہاراج کی جانب رُخ کرکے آداب کورنش بجالایا، زمین چھو چھو کر اپنے کان ملے، خاک چاٹی، تھیلی میں سے چار پانچ چکریاں نکالیں، اُن میں سے ایک چھانٹ کر دو تین بار آزمائی اور جناب عالی! پھر جو بڈھا پینترہ بدل کر شروع ہوا ہے تو کچھ نہ پوچھئے وہ بنت کے ہاتھ نکالے کھلاڑیوں کے چھکّے چھڑا دئے اور دیکھنے والوں کو دنگ کر دیا۔

بھوجا حلوائی دودھ دہی بیچتا تھا۔ لوہا منڈی گوالیار میں پولیس چوکی کے پاس اُس کی دکان تھی، یہ تُچا تُچایا سا بڈھا اگڑوں بیٹھتا تو اس کے گھٹنے کانوں سے کچھ اوپر نکل جاتے تھے، آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئیں، پچکے ہوئے گال، کوئی پون پون اینچ کے دو دانت باہر نکلے ہوئے، ایک ایک پسلی الگ، بڑے بڑے ناخنوں والے شتر مرغ کے سے پنجے اور اسکے پاؤں، گدّی کے چھدرے چھدرے بال چھوڑ کر چندیا کا تامڑہ صاف، کنپٹیوں میں کوئی دو دو پور گہرے گڑھے بغیر گوشت والے جسم پر تانت سی رگیں ابھری ہوئیں مارے دمے کے بیچارے کا بُرا حال کھانس کھانس کر ہانپا کرے ہم سب لڑکے اُسے مرگھٹ مرگھٹ کہتے تھے، مگر صاحب وہ مرگیا اور ہمیں مرنا ہے، اس شرارت پر ہم نے بھوجا کو مسکرانے کے سوائے کبھی خفا ہوتے نہیں دیکھا۔

غرض یہ کہ جب بڈھے کو سٹریل مریل جان کر لوگوں نے تالیاں بجائیں اور قہقہے اُڑائے تھے، اس نے اپنے کمال سے وہ عقلیں چرخ کیں کہ بڑے بڑوں کے ہوش بھلا دئے اُسکے بعد کسی کی ہوا نہ بندھی، بعض عاقبت اندیش کھلاڑی بلا مقابلہ ریٹائر ہوئے، دو ایک نے ہمت کی بھی تو اپنے زور میں آپ مارے گئے۔

کھیل ختم ہونے پر عالیجاہ بہادر نے کھلاڑیوں کو فخر باریابی بخشا، اور بدست مبارک سے انعامات مرحمت فرمانے لگے، معلوم ہوا ہمارا گوالیار والا بھوجا حلوائی میر رہا، اس کو پہلا انعام ملا ہے، واہ کیا سیر رہی جب خود بدولت مہاراجہ صاحب نے اس سوکٹ بڈھے کی پیٹھ ٹھونکی، شاباش دی، اور سب نے خوش ہو ہو کر تالیاں بجائیں۔

. . . .

حسب دستور چراغ جلے تک یہ ہنگامہ ختم ہوگیا، اور میں بھوجا کی عظمت کا گہرا اثر لے کر پلٹا، اب اُس محترم کو جس نے آج

شہر کی ناک رکھ لی" "مرگھٹا" کہنا تو درکنار۔ یہ خیال رہ رہ کر تکلیف دے رہا تھا کہ میں نے اس کو ایک نحیف و ناتواں بڈھا سمجھ کر دوسرے لوگوں کی طرح ایسی بیہودگیاں کی۔

دوسرے دن ادھر سے گذرتے وقت جو بھوجا کا آمنا سامنا ہوا، تو میں نے اسے ادب سے سلام کیا اور کہا:۔

واہ بھئی سیٹھ! کل تو تم نے کمال ہی کر دیا، تو بھلا ہمیں کیا خبر تھی، کیوں سیٹھ یہ مشق کہاں کی؟

سیٹھ جی نے اکڑ کر جواب دیا۔ ارے میاں کیا پوچھتے ہو، اب کیا ہے لنگر لنگوٹے کھولے مدت ہوئی، جوانی میں دیکھتے تو معلوم ہوتا، ہم نے بڑے بڑے بال ہستان چرے ہیں، سیر دو سیر دودھ کھڑے کھڑے چڑھا جاتے تھے، جس کی نظر پڑتی تھی کہتا تھا واہ کیا ملا در جوان جا رہا ہے۔

۱۹۱۵ء تک بھوجا جوں کا توں رہا، تل گھٹا نہ رائی بڑھا، البتہ انعام حاصل کرنے والے چکری کے میلے کے بعد میں نے اُسے وہاں کبھی نہ دیکھا،

۱۹۱۶ء کے شروع میں مجھے گوالیار چھوڑنے کا اتفاق ہوا، مختلف شہروں میں گھومتا سیر سپاٹے کرتا ۱۹۱۸ء میں گوالیار پلٹا جب بھی بھوجا کو اسی دکان پر کھانستے لٹکتا دیکھ پایا۔

چند مہینے گذرنے پر ایک لمبا بھوگ پڑا اور ۱۹۳۷ء میں وطن کی پھیری ہوئی، اب یہاں کی دُنیا بدل چکی تھی، کتنے ہی محلّے ایسے اُجڑے جن کی نسبت ایک اجنبی کو سمجھانا مشکل ہے کہ یہاں کیسے مکانات تھے اور ان کے مکینوں کی کیا کیفیات تھیں، علیٰ ہذا القیاس بیسیوں عمارتیں ایسی نظر آئیں جو میرے لئے نئی تھیں، یہ سب کچھ ہوا مگر بھوجا حلوائی تو کیا اُس کی دُکان اور لوہا منڈی کی پولیس چوکی کا نام و نشان نہ ملا۔

اتنا ردوبدل ہونے کے باوجود چکری کا میلہ اپنے وقت پر ہوا، البتہ ہمارے جواں سال خوش اقبال مہاراجہ صاحب کیونکہ اس وقت تک با اختیار نہ تھے خود بدولت نے شرکت نہ فرمائی، اراکینِ ریاست نے کھلاڑیوں کو انعامات تقسیم کیے۔

میرا بیان کتنی ہی جگہ سے تشنہ رہ گیا، اور کیسا ہی مفصل عرض کروں پھر بھی "شنیدہ کے بود مانند دیدہ" جن صاحبان کو پورا پورا لطف اٹھانا ہو ساون سدی پورن ماشی یعنی سلونو کے دن گوالیار میں موجود ہوں، اور بچشم خود ملاحظہ فرما کر پورا پورا لطف اٹھائیں۔

یہ میلہ ہمیشہ جاری رہے گا، سرگ باشی مہاراجہ سر مادھو راؤ صاحب سیندھیا اپنی پالیسی میں جو اٹھارہ ضخیم جلدوں میں ہے تحریر فرما گئے ہیں کہ "چکری کا میلہ کبھی بند نہ کیا جائے۔"

مطبوعاتِ ساقی بک ڈپو

خانم۔	قیمت للعہ	ستارہ یا کھیل	قیمت عا	سائے۔	قیمت عہ
روح ظرافت۔	،، عا	ناسور۔	،، عا	جلے۔	،، عہ
شریر بیوی۔	،، عہ	قفس۔	،، عہ	جزیرے۔	،، عا
کولتار۔	،، عا	گذرگاہِ خیال۔	،، عا	میرا بہترین افسانہ۔	،، عا
کمزوری۔	،، عہ	دریچے۔	،، عا	گرداب۔	،، عہ
مسکراہٹ۔	،، عہ	تعلیم زدہ بیوی۔	،، ۸ر	مضراب۔	،، عہ
آدم خور۔	،، عہ	فرعون۔	،، عہ	آئینۂ حیرت۔	،، عا
جنت کا بھوت۔	،، ۸ر	ریڈیو ڈرامے۔	،، عہ	نغمۂ نور	،، عہ
مرزا جنگی۔	،، ۸ر	لیڈر۔	،، ۶ر	کیف و سرور۔	،، عہ
سوانہ کی روحیں۔	،، ۸ر	چار چاند۔	،، ۸ر	چراغِ طور۔	،، عہ
جینی کی انگوٹھی	،، ۸ر	لال قلعہ کی جھلک	،، عہ	موجِ طہور۔	،، عہ
ملفوظاتِ ٹامی۔	،، ۱۲ر	بد قدرت۔	،، ۶ر	موجِ نور۔	،، عہ
مضامین چغتائی	،، عہ	پروینِ ثریا۔	،، عہ	بیانِ حضور	،، عہ
قران اور پردہ	،، عہ	چندرا موہنی۔	،، عا	گھونگھٹ میں گوری جلے	،، عہ
حدیث اور پردہ۔	،، عا	وحشی۔	،، عہ	بلقیس۔	،، عا
سلامبو۔	،، للعہ	میراجی کی نظمیں۔	،، عا	شمعِ انجمن۔	،، عا
نجم السحر۔	،، ستے	گیت ہی گیت۔	،، عا	سفینے۔	،، ستے
ناگنیں۔	،، عا	شکست۔	،، ستے	شاہد رعنا۔	،، ستے
ہر دو پاس۔	،، عہ	نئے فسانے۔	،، للعہ	پھانسی۔	،، عا
انطونی کلابطرہ۔	،، عہ	محبت و نفرت۔	،، عا	نو شاب۔	،، عہ
نرگس۔	،، عا	اتاترک۔	،، عا	قمر جہاں۔	،، عہ
کلیاں۔	،، ستے	دھنک۔	،، عا	دوشیزۂ صحرا۔	،، عا
ضدی۔	،، عہ	کہکشاں۔	،، ستے	شمعِ فروزاں۔	،، عا

مہندر ناتھ

بہلاوے

سورج سمندر میں ڈوب گیا تھا۔ دُور مغرب کی جانب آسمان کی دوشیزہ کے رخساروں کی طرح سرخ تھا، اُجالا آہستہ آہستہ ہچکیاں لے رہا تھا، اور اندھیرا اپنا دامن پھیلاتے آگے بڑھ رہا تھا۔ اونیش نے تازہ، ٹھنڈی ہوا کو اپنے پھیپھڑوں میں داخل کیا اور سڑک پر آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ سڑک پر موٹریں بھاگی جا رہی تھیں۔ امریکن سپاہی اپنی معشوقاؤں کو ساتھ لئے، سڑکوں پر ٹہل رہے تھے۔ لڑکیوں کے غول کے غول، سمندر کی جانب بڑھ رہے تھے۔ اسکے قریب سے ایک جوڑا گزرا۔ ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے، کندھے سے کندھا لگائے، قدم سے قدم ملاتے، کسی طرف نہ دیکھتے ہوئے آگے بڑھ گیا، اور وہ دیر تک اس خوبصورت جوڑے کو دیکھتا رہا، حتیٰ کہ شفق آکاش سے غائب ہو گئی، اور پھیلا ہوا سمندر اندھیرے میں غرق ہو گیا۔ لیکن لڑکی کی جسمانی دلکشی اس کے ذہن پر مرتسم ہو گئی۔ اس شہر میں اس نے بہت کم خوبصورت عورتیں دیکھی تھیں۔ پہلی لڑکی تھی، جس کے خوبصورت جسم کو وہ ایک عرصہ تک نہ بھلا سکا۔ لڑکی آنکھوں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ لیکن اس کے خوبصورت جسم کی مہک اونیش کی روح میں تحلیل ہو گئی، اور وہ اسی حالت میں چلتا گیا۔ کبھی آہستہ آہستہ اور کبھی تیز۔ اب وہ کچھ کھانا چاہتا تھا۔ یونہی کوئی لذیذ سی چیز، جس سے یہ مہک کم ہو جائے، اور وہ قریب ہی ایک ریستوران میں داخل ہو گیا۔

ریستوران میں بیٹھ کر سامنے والی لڑکی کی طرف دیکھنے لگا۔ لڑکی کے ننگے بازو، اس کے عارض پر لٹکتی ہوئی لٹ، اور اُس کے ہونٹوں کی سُرخی اُسے دعوتِ نظارہ دے رہی تھی، یونہی اُس کا جی چاہتا تھا کہ وہ اس لڑکی سے لپٹ جائے، اپنا سر اس کے گول اور گداز بازوؤں میں رکھ دے، اور کہے "آہ جانِ من، میری محبوب، میں کتنے دنوں سے بھوکا ہوں"۔

لیکن محبوب نے اس کی طرف نہ دیکھا۔ محبوب امریکن کے ساتھ مسکرا مسکرا کر باتیں کرنے لگی۔ محبوب کا ہاتھ امریکن کے ہاتھوں میں تھا۔ اور وہ آہستہ آہستہ دبا رہا تھا۔ وہ اس دباؤ محسوس کر رہا تھا۔ جیسے وہ محبوب کے ہاتھوں کو دبا رہا ہو، اور محبوب کے ریشمی ہاتھوں کے لمس سے محظوظ ہو رہا ہو، لیکن محبوب امریکن کیلئے تھی، اور وہ میز پر اکیلا تھا۔ محبوب اپنے خوشنما ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگی۔ زبان پھیرنے سے ہونٹوں کی سرخی اور چمک گئی۔ لیکن جوش کی بھوک کم نہ ہوئی۔ بلکہ اور بڑھتی گئی۔

وہ چلایا، "آملیٹ اور کچھ توس"۔

بیرے نے سر ہلایا اور آگے بڑھ گیا۔ جو میز اس کے سامنے تھی۔ وہ آسمان کی طرح نیلی اور شفاف تھی۔ ریستوران میں ہر چیز قرینے سے رکھی ہوئی تھی صفائی کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا تھا۔ اور ہر منٹ کے بعد بیرہ آتا، اور جیسے ہی وہ خالی میز دیکھتا، اسی پر کپڑا پھیر کر چلا جاتا۔ شیشے کی بڑی بڑی بوتلوں میں چاکلیٹ جھانک رہے تھے۔ کچھ بوتلوں میں رنگین گولیاں رکھی ہوئی تھیں، سُرخ پیازی، نیلی نیلی، پیلی پیلی گولیاں، ——— یہ گولیاں کچھ اس طرح رکھی ہوئی تھیں، کچھ اس طرح بیٹھی ہوئی، اس کی طرف جھانک رہی تھی، جیسے کسی محفل میں عورتیں حسین کپڑوں میں ملبوس دعوتِ نظارہ دے رہی ہوں۔

کہنیوں کو میز پر رکھ کر وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

اس رنگین گولی اور اُس لڑکی میں کوئی فرق نہ تھا۔ اُس نے سوچا۔

گولی بوتل میں بند تھی۔

اور لڑکی کے ساتھ ایک امریکن تھا۔

گولی کا رنگ سُرخ تھا۔

اور لڑکی کے رخسار، شفق کی طرح سرخ اور تابناک۔

گولی مسکرا مسکرا کر اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔

لڑکی امریکن کی طرف مسکرا مسکرا کر دیکھ رہی تھی۔

وہ گولی کو فوراً خرید سکتا تھا۔

لیکن اس لڑکی کو؟۔

امریکن!

ہندوستانی!!

یہ سوچ کر وہ آملیٹ پر جھک گیا، جو چیز ہاتھ میں ہو اُسے چھوڑنا نہ چاہیئے، بڑوں کا یہی قول ہے۔ اور ایک عرصے سے وہ اس قول پر کاربند تھا، جُوں جُوں وہ کھاتا جاتا، اُس کی بھوک بڑھتی جاتی، جن کپڑوں میں وہ ملبوس تھا اُن میں آرام کم اور تکلف زیادہ محسوس ہوتی تھی۔ اکڑا ہوا ایش شرٹ اور صبح کی ورزش نے اُسے سیدھا بیٹھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اگر ذرا بھی وہ جھکتا تو ایش شرٹ کی کریز خراب ہو جاتی۔ اس خیال کے آتے ہی وہ اور اکڑ کر کرسی پر بیٹھ گیا اور آملیٹ کھانے لگا۔

"بیرہ ایک اور آملیٹ!"

آج وہ جی بھر کے کھائے گا، صرف آملیٹ ہی نہیں، بلکہ مچھلی، ٹماٹر،

مکھن، توس، پیسٹری، اور بے رنگین گولیاں، کافی، بسکٹ، فروٹ کریم، کٹلیس، اس کے ذہن میں ہر ذائقہ ابھر رہا تھا، جسے جسم کا ہر ذرہ کہہ رہا ہو آج جی بھر کر کھاؤ تاکہ پھر کوئی حسرت نہ رہے۔ وہ اس خیال کی کھوج میں مستغرق ہوگیا۔ وہ کھا رہا تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ ایک مبہم سی اداسی اس کے رگ و ریشہ پر طاری تھی، یہ خوبصورت ریستوران جس کی دیواروں پر ننگی عورتوں کی تصویریں تھیں، اور میزوں پر بیٹھی جاگتی لڑکیاں اپنے دوستوں کے ساتھ کیسا نکھر رہی تھیں، اور اس کی بھوک کو جلا رہی تھیں، اس کے ذہن میں سرک رہی تھیں۔ اور طرح طرح کی کھانے کی چیزیں جن سے اس کی بھوک اور تیز ہوگئی تھی، پانچ سال کی فوجی مدت میں اس نے ان چیزوں کا دل دادہ بنا دیا تھا، یہ چیزیں اس کی زندگی کا ایک مستقل جزو نہیں، اس کے خون میں رچ گئی تھیں، وہ کبھی صورت میں ان چیزوں کو نظر انداز نہیں چھوڑ سکتا۔ جیسے ان چیزوں کی تلاش میں اس کی روح ادھر سے سرگرداں تھی :—

سرکش وہ خوبصورت ریستوران،
جھلکتی ہوئی کانچ کی الماریں،
چمکتے چھلکتے ہوئے بسکٹ
ملائی کی تیز مہک،
پلیٹ میں رکھے ہوئے سرخ ٹماٹر،
نیلی سی پلیٹ میں پیسٹری کے ٹکڑے،
مکھن،
توس،
مچھلی،
مرغ کی ٹانگیں،
اور پھر روحِ کا Orange Squash

اور پھر چاروں طرف گھماگھمی، اگر روح میں اداسی تکمیل ہو جائے تو یہاں آکر ضرور کم ہو جاتی ہے ان چیزوں کو کھا کر، ان لڑکیوں کو دیکھ کر دماغ کو سکون ضرور ملتا ہے، وہ یہی باتیں سوچ رہا تھا کہ ایک بنگالی لڑکی اپنے دوست کے ساتھ قریب والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ لڑکی کی موٹی موٹی آنکھوں میں شباب جھانک رہا تھا، اور جوڑے میں گیندے کے پھولوں کا ہار تھا، موٹے موٹے لبوں پر ایک دلنواز تبسم اور دانت موتیوں کی طرح چمک رہے تھے، لب کچھ کچھ انجان، اور کچھ بے بس۔
یہ ہونٹ ابھی تک چومے نہیں گئے۔
ان پر کسی نے اپنے جلتے ہوئے ہونٹ نہیں رکھے۔
بجلی کے قمقمے اسی طرح روشن تھے۔ لوگ ریستوران میں آ رہے تھے، کچھ لوگ کونسٹر پر بل ادا کر رہے تھے۔

بسنے والوں میں خوبصورت کرسچین لڑکیاں بھی تھیں۔
لیکن بہت سی بدصورت بھی تھیں، جن کا شباب قبل از وقت ضائع ہو چکا تھا، انہوں نے ملٹری ڈریس پہن رکھا تھا، چہروں پر زردی اور لبوں پر اداسی کی جھلک نمایاں تھی۔
اور کالی کرسچین لڑکیاں، جن کی پنڈلیاں کالی اور سیاہ تھیں، لیکن ساتھ ساتھ گول اور گداز بھی۔
اور پھر پارسی لڑکیاں، سفید، ننھی منی، نازک اندام، چلتے چلتے جھک جاتیں جیسے کوئی نازک ڈالی بوجھ سے لچک جائے۔
اور پھر انگریز اور امریکن لڑکیاں، اینگلو انڈین لڑکیاں، خوبصورت، توانا، صحت مند، اکڑ کر چلتی ہوئی غلاموں کی طرف نفرت کی نگاہوں سے دیکھتی ہوئیں اپنے حسن سے نگاہوں کو خیرہ کرتی ہوئیں آگے بڑھ رہی تھیں۔
اور پھر اپنے دیس کی لڑکیاں، جن کے بالوں میں موسم بہار کی خوشبو تھی، جن کی آنکھوں میں جوانی کی چمک تھی، جن کے جسموں میں ہرن کے نافے کی مہک تھی۔

. . . .

تین سال رہا۔
وہ ایک گاؤں میں رہتا تھا۔ اپنی ماں اور بہن کے ساتھ اسے گاؤں کی زندگی سے نفرت ہوگئی تھی، اسے گاؤں سے نفرت نہ تھی، بلکہ اس زندگی سے جس کا اسے اس گاؤں میں سامنا کرنا پڑتا تھا۔ گاؤں کا خیال آتے ہی اس کے ذہن میں گاؤں کا ماحول ابھرنے لگا۔
ٹوٹی پھوٹی جھونپڑیاں،
کچے گھر،
گندگی کے انبار،
لوگوں کے چہرے زرد اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے۔
کسان پھٹے ہوئے کپڑوں میں، ادھر ادھر پھرتے رہتے تھے۔
رہٹ کی اوں اوں،
بیل گاڑیوں کا شور،
کچی سڑکوں پر اڑتا ہوا غبار،
لڑکیاں، گندی، کمسن، کمزور، ملیریا سے جسم نحیف و نزار۔
بوڑھی عورتیں میلی، گندی، موت کے دروازے پر دم توڑتی ہوئیں
چرخے کی گھوں گھوں۔
کھاد کی سڑاند۔
اور جگہ جگہ میں اپلوں کی بھرمار۔ ہر طرف اپلے، یا اپلوں کا دھواں۔ گھر

میں بازاروں میں بہار دل طرف، ادھر اُدھر اُطیوں کی تجارت،

صبح و شام پوجا پاٹ۔

مندر کی گھنٹی۔

مسجد کی اذان۔

یہ سب کچھ تھا، اور اس ماحول میں روشیش نے عشق بھی کیا لڑکی کے گھر کے ارد گرد چکر لگائے۔

کھیتوں میں انتظار کیا، کنوئیں پر جاکر آہیں بھریں، رات بھر جاگا،

جب کبھی وہ ملی، روشیش اُسے دیکھ کر مسکرایا۔

وہ بل کھاتی ہوئی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ کیونکہ گاؤں کے کھاگ دال جھنگر دلال نے انہیں ایک دوسرے سے آنکھیں لڑاتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

پھر ملی۔

اس کا دل دھڑکنے لگا۔

اور وہ مُسکرائی۔

اس بار بی بی فاطمہ نے دیکھ لیا۔

اور اسی دوڑ دھوپ میں دنیا کی دوسری عظیم الشان جنگ چھڑ گئی۔

اور وہ بھرتی ہوگیا۔

شروع میں روشیش کو کئی تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑا۔ صبح کی پریڈ اور شام کی چاند ماری، گو اس کے لئے نئی چیزیں تھیں۔ لیکن جو کچھ ان کے عوض ملتا تھا وہ بھی تو اس کے لئے نیا تھا۔ اُس نے یہ چیزیں کب کھائیں تھیں، اُس نے ایسے کپڑے کب پہنے تھے، اس نے ایسی زندگی کب دیکھی تھی۔ گھر میں مچھروں کیڑوں مکوڑوں کی وجہ سے جان عذاب میں آجاتی تھی، لیکن یہاں مچھردانی ملی ہوئی تھی، مچھروں کو دور رکھنے کے لئے مچھر مار تیل، مچھر مار کریم، مچھر مار پوڈر۔ اگر بیمار ہوجاؤ تو ڈاکٹر حاضر۔ صبح چائے، دوپہر کو کھانا، شام کو چائے، رات کو کھانا اور پھر ہر بیماری کے لئے ٹیکے۔ نئے نئے شہروں کی سیر کی، طوائفوں کے بازاروں میں چکر لگائے۔ کسی طوائف کو زبردستی چھیڑا، کسی لڑکی کو آنکھ ماری۔ اور اسی طرح کئی باتوں سے اُسے اس دوران میں دوچار ہونا پڑا۔ تین سال کے عرصے میں وہ ایک بار بھی بیمار نہ ہوا۔ دن بدن اس کی صحت اچھی ہوتی گئی اسکے جسم پر گوشت کا غلاف چڑھتا گیا اور وہ خوبصورت ہوتا گیا۔

صرف یہی نہیں، بلکہ اس دوران میں وہ روپے گھر بھیجتا رہا۔ گھر والوں کی حالت بہتر ہوگئی۔ اس کی ماں جسے ایک سال سے بخار آرہا تھا متواتر علاج سے اچھی ہوگئی۔ اس کی بہن جو سوکھ کر کانٹا ہوگئی تھی۔ اچھی غذا کھانے سے اُس کی صحت میں بھی فرق پڑ گیا گھر والوں نے مچھر دانیوں کا استعمال شروع کر دیا تھا اور زندگی آرام اور آسائش سے گزر رہی تھی۔

بیرہ۔ فروٹ کریم لاؤ۔

فروٹ کریم آگئی۔ اور وہ کھانے لگا۔ فروٹ کریم عجیب چیز ہے۔ خود بخود حلق سے نیچے اُتر جاتی ہے، اور زبان پر ایک عجیب ذائقہ چھوڑ جاتی ہے۔ اس نے سوچا۔

روشیش چاہتا تھا کہ وہ گھر والوں کو بلائے، اور اس بڑے شہر کی سیر کرائے۔ یہ فلک بوس عمارتیں، یہ پھیلا ہوا سمندر۔

یہ کاریں،

یہ بجلی سے چلتی ہوئی ریلیں۔

سنگل جائے

اور سمندر میں تیرتی ہوئی لڑکیاں

ناریل کے لانبے لانبے درخت، آسمان سے باتیں کرتے ہوئے۔

اور دور سمندر سے اُبھرتا ہوا چاند

یہ دہکتے ہوئے عارض،

یہ لہراتی ہوئی چوٹیاں، سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی چوٹیاں۔

توس!

مکھن!

پیسٹری!!

اور مے ناب!

وہ چاہتا تھا کہ گاؤں کا ہر شخص یہاں آئے، تاکہ وہ سب اس زندگی کو دیکھ سکیں۔ یہ ایک نئی زندگی تھی۔

یہ لوہے اور سیمنٹ کی زندگی، یہ صاف نکھری ہوئی زندگی، یہ خوشی اور مسرت کی زندگی یہ ناچ اور رنگ کی زندگی یہ سینما اور تھیٹر کی زندگی، یہ نیلے پیلے پردوں کی زندگی، یہ کیف و سرور زندگی، یہ شراب اور بیئر کی زندگی، ریشم و کمخواب کی زندگی یہ ردیوں کی زندگی۔ کھنکتے ہوئے سکوں کی زندگی!! لیکن یہ لمحے بیت گئے۔ جب آنکھ کھلی، تو جنگ ختم ہوچکی تھی، اور فتح کا پرچم لہرا رہا تھا۔

بیرہ۔ کچھ اور لاؤ۔

کیا لاؤں سرکار۔

پھل۔ کیلے، شریفے، سنگترے، سیب، سب کچھ لاؤ۔

اور بیرہ چلا گیا۔ روشیش کی اُداسی بڑھتی گئی۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے یہ چیزیں اس سے چھین جائیں گی۔

یہ زندگی اس سے چھین جائے گی۔ جنگ ختم ہوچکی تھی، اور ایک مہینہ کے بعد اُسے اس نوکری سے جواب مل جائے گا۔ اور پھر اُسے واپس جانا ہوگا

اپنے گاؤں ۔ ۔ جہاں بھوک اپنے خوفناک جبڑے کھولے ہوئے اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔ جہاں گندگی بہت پہلے سے سانس لے رہی تھی، تاکہ گاؤں کے ہر شخص کو دق ہو جائے، چہرے کی سرخی زردی میں تحلیل ہو جائے، بھرا ہوا سوکھ کر کانٹا ہو جائے۔

اس خیال کے آتے ہی اس کے سامنے جسم بے ارتعاش سا ہیبت ناک ہوا۔ اب اس کی ماں اور بہن کا کیا ہوگا۔ وہ نہیں کہاں سے کھانے کو دو۔ وہ خود کہاں سے کھائے گا یہ جنگ کیوں بند ہوئی۔ یہ جنگ ہمیشہ کیوں نہ ہوئی تھی۔ کیا یہ جنگ ابد تک جاری نہیں رہ سکتی، یا کم از کم جب تک وہ زندہ رہے یہ جنگ جاری رہے۔

اس جنگ کو جاری کرنے والے کون تھے؟

فتح کا پرچم لہرانے والے کون ہیں؟

یہ کیسی فتح ہے۔ یہ کس کی فتح ہے۔ اب ملک کے ہر کونے میں بھوک بڑھ جائیگی بیکاری بڑھ جائیگی۔ کارخانے بند ہو جائیں گے۔ دفتر بند کر دئے جائیں گے، لاکھوں آدمی بیکار ہو جائیں گے۔ ماں بخار آ لے لگے گا۔ بہن سوکھ کر کانٹا ہو جائے گی۔ نہ کھانا ملے گا نہ کپڑے۔ نہ آنکھوں میں چمک ہوگی نہ چہرے پر سرخی۔ اور روشنش سوچنے لگا کہ وہ کس سے پوچھے کہ اس فتح کا مقصد کیا ہے، وہ موت سے نہیں ڈرتا، وہ میدان جنگ میں مرنے سے نہیں ڈرتا لیکن وہ بھوک اور افلاس کو برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ گندگی اور گاؤں کی متعفن فضا کو سہار نہیں سکتا۔

کیا یہ جنگ دوبارہ نہیں چھڑ سکتی۔

ایک جنگ!

دوسری جنگ!!

تیسری جنگ!!!

اس خیال کے آتے ہی اسکے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ یاس کے سمندر میں آس کی لہر ابھرنے لگی، اور وہ سوچ رہا تھا کہ وہ کس سے پوچھے۔

رستوراں میں ایک خوش باش جوڑا آیا۔ اور سب کی نگاہیں اس جوڑے پر مرکوز ہوگئیں۔

لڑکی کی آنکھوں میں فتح اور کامرانی کی چمک تھی، اسے اپنی خوبصورتی کا احساس تھا۔ اس کا جسم نیم عریاں تھا۔

روشنش اس لڑکی سے پوچھنا چاہتا تھا، لیکن وہ جھجک گیا۔ اسے ان دونوں کو دیکھ کر یہ محسوس ہوا، جیسے فتح کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوا جنگ سے پہلے بھی خوش تھے اور جنگ کے بعد بھی۔

ایک اور جوڑا داخل ہوا۔ ایک مارواڑی سیٹھ اور اسکی کبڑی عورت۔ عورت بوڑھی ہو چکی تھی، اور سیٹھ موٹاپے سے عاجز تھا۔ دونوں ساتھ والی فیملی روم میں چلے گئے۔ دراصل اس وقت روشنش اپنے سوال کا حل چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کوئی اسکے کان میں آکر کہہ دے، چپکے سے کہہ دے کہ یہ جنگ پھر چھڑ جائے گی، یا کوئی کہہ دے کہ جب تک تم زندہ رہوگے، تمہیں اس نوکری سے کوئی برطرف نہیں کر سکتا۔

- - - - - - - -

دو عورتیں اور تین مرد رستوراں میں داخل ہوئے اور میز کے قریب ہی بیٹھ گئے۔ وہ عورتوں کے دمکتے ہوئے چہروں کو جی بھر کے دیکھنا چاہتا تھا۔ ان خوبصورت بالوں کو آخری بار دیکھنا چاہتا تھا۔ جی بھر کے۔ وہ ان ننگی باہوں کو چھونا چاہتا تھا۔ لیکن اسکی بے بسی کا شاید ان کو علم نہ تھا۔

کیوں ڈارلنگ۔ یہ جنگ تو ایک عذاب تھی، ایک عورت بولی

کوئی سن لیگا، تو جیل میں ٹھونس دیگا۔ کھاؤ، پیو، اور مزے سے بال روم میں ناچو، چھوڑو، اس جنگ کے قصے کو۔

کیوں ڈارلنگ کیا ہوگے۔ ڈارلنگ ڈیر کی طرف دیکھنے لگا۔ ڈیر کے بالوں کی جانب، ڈیر کے رخساروں کی طرف۔ جن پر سرخی زیادہ تھی اور خون کم

اب ہزاروں لوگ بیکار ہو جائیں گے۔

روشنش ذرا غور سے سننے لگا۔

دوسرا مرد چپ تھا۔

تیسرے مرد نے کھدر کی قمیص اور کھدر کا پاجامہ پہنا ہوا تھا۔ ہاتھ میں چمڑے کا بیگ تھا۔

کیوں کامریڈ، تمہارا کیا خیال ہے؟ دوسرے مرد نے پوچھا۔

کامریڈ اب تک چپ تھا۔ وہ مزے سے چائے پی رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی تھی، چہرہ زرد تھا۔ آنکھیں اندر دھنسی ہوئی تھیں مگر پیشانی پر عزم اور استقلال کی لکیریں تھیں۔ وہ جب کبھی بات کرتا تو نہایت پرسکون لہجہ میں۔ اسکی آواز میں ایک ٹھہراؤ تھا۔

"کامریڈ، اس جنگ میں جنتا کو کچھ فائدہ ہوا؟" دوسرے مرد نے لفظ جنتا پر زور دیا، جیسے وہ کامریڈ کا مذاق اڑا رہا ہو۔

کامریڈ چپ نہ رہ سکا۔ اسکے لبوں کے گوشے کانپنے لگے، اسکی آنکھوں میں بجلی کی چمک عود کر آئی، اسکے ہاتھوں میں جنبش ہوئی، اور وہ کہنے لگا "حالات بدل چکے ہیں، اب ایک اور جنگ ہوگی جس میں اس بات کا فیصلہ ہوگا کہ اس کرۂ ارض پر انسانوں کا راج رہیگا یا حیوانوں کا۔ یہ جنگ انسانوں کی آخری جنگ ہوگی۔ اور اگر جنتا جیتی، تو کوئی وجہ نہیں کہ بھوک اور بیکاری اس دنیا سے ہمیشہ کیلئے مٹ جائے"

"اور اگر سرمایہ دار جیتے۔ تو؟"

"تو انسانیت ہمیشہ کے لئے نیست و نابود ہو جائیگی، لیکن میرا اٹل دشوار

(بقیہ بر صفحہ ۲۴۲)

اختر اورینوی

سورداس اور تلسی داس پر اُردو کا حق

تاریخ ادب کے بے لاگ مطالعہ سے اکثر ایسی صداقتیں ظاہر ہوتی ہیں کہ کئی تجزیئے مگر باطل مسلمات کی بنیادیں ہل جاتی ہیں اور کئی اکھاڑ پھینکے جاتے ہیں۔ میں نے جب بھی اُردو اور ہندی ادب کا غیر جانبدارانہ مطالعہ کیا ہے میں اس اطمینان بخش اور عبرت انگیز نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ فورٹ ولیم کالج کلکتہ کی ریشہ دوانیوں سے پہلے اُردو اور ہندی میں کوئی فرق نہ تھا۔ اُردو ہی کے ابتدائی نام ہندی اور ریختہ تھے اور بس۔ سارے ملک کی معیاری ادبی زبان ایک تھی، چاہے اُسے آپ جو کچھ کہہ لیجئے۔ اُس وقت اُسے ہندو مسلمان اُردو ہی کہنے لگے تھے۔ اس معیاری ہندوستان گیر ادبی زبان کے علاوہ صوبے صوبے کی اپنی مقامی بولیاں تھیں۔ ان مقامی دیس دیس کی بولیوں کے تجزیہ اور لب و لہجے کے جائزہ سے صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ بھی صوبائی خود مختاری کا رنگ لئے ہوئے اُردو ہی کی مختلف شکلیں تھیں۔ سامراجی بس کی گانٹھیں جب سمندر پار سے ہندوستان میں درآمد کی گئیں تو اُن کا ایک شوشہ ہندوستانی ادب کو بھی دیا گیا۔ جس طرح سامراجی زہر سے ہماری قومی زندگی کے اور شعبے تباہ و برباد ہو گئے۔ بالکل اسی طرح ملکی ادب کو بھی موت کے گھاٹ اُتارا اور فرنگستانی ڈائنامیٹ لگا کر متحدہ زبان کے مضبوط ریختے کو توڑا گیا۔ ملک کی فضا خراب ہوئی اور اب تک خراب ہے۔ بہت دھواں اُٹھا، بہت گرد و غبار اُڑا، بہت شور و شر ہوا۔ اہل وطن کی آنکھیں چندھیا گئیں، سچائیوں پر پردے پڑ گئے۔ فورٹ ولیم کالج میں اُردو ہندی کی خدمت نہیں ہوئی، وہ ائمنڈ ہاربر کے قریب ہمارے ادب و زبان کو ہیرے کی کنی کھلائی گئی۔

میں نے جہاں تک غور و فکر کیا ہے میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ اس زہر کا تریاق اُردو ہندی کے ادب کی تاریخ کا متحدہ مطالعہ و چیکش ہے۔ اور دراصل دونوں کی تاریخ کی جڑیں ایک ہی ہیں۔ وسطی اتنا بھی مشترک ہے اور اُن گنت شاخیں بھی ایک ہی ہیں۔ اغیار کی ستم آرائیاں تو خیر، اپنوں کی بے اعتنائیوں نے غضب کیا ہے۔ دوسروں کی ابلہ فریبیاں مسلم مگر اپنی نظر کو کیا ہوا تھا۔ اُردو اور ہندی کی تاریخ ادب لکھنے والوں کی نگاہ خطرناک طور پر چوکی ہے۔ حد تو یہ ہے کہ ملکی ادب کے ارتقائی سفر کے نمایاں اور اہم سنگ میل بھی انہیں نہ سجھائی دے۔

دو قوموں کے اتحاد سے نئی متحدہ زبان ہندوستان میں کس طرح پیدا ہوئی اس کے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ تاریخ ادب سے ابتدائی واقفیت رکھنے والا شخص بھی یہ باتیں جانتا ہے۔ میں صرف اس حقیقت کے چند اہم پہلو پیش کر کے کچھ نتائج اخذ کروں گا۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد پہلے پہل فاتح کی حیثیت سے نہیں ہوئی بلکہ تاجر اور مبلغ اسلام کی حیثیت میں ہوئی۔ سواحل سندھ، گجرات، کونکان، مالابار وغیرہ پر عرب چھا لے آئے اور اُن علاقوں کو مرکز بنا کر اندرون ملک میں بھی پھیل گئے۔ اس طرح عربی زبان کا ہندکی مختلف بھاشاؤں سے میل ہونا شروع ہوا۔ فارسی بولنے والے تاجر بھی ہندوستان آیا کرتے تھے۔ غرض ملک میں وہ فضا جس نے متحدہ اُردو زبان تدریجاً پیدا کی، مسلمانوں کے سیاسی عروج سے پہلے موجود تھی۔ سندھ اور پھر پنجاب اور دوسرے خطوں کی فتح کے بعد کو وہ بالا فضا اس سے ملک پر کم و بیش چھا گئی۔ لیکن یہ ایک مغالطہ ہو کہ مسلمانوں کے سیاسی عروج نے اُردو زبان کی تخلیق میں سب سے زیادہ حصہ لیا۔ تاریخ شاہد ہے کہ سیاست نے اکثر ترویج اسلام اور تخلیق اُردو میں دانستہ و نادانستہ رکاوٹیں پیدا کی ہیں۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ حکومت کی وجہ سے بالواسطہ متحدہ ماحول پیدا ہونے میں مدد ملی۔ اس ماحول میں اُردو زبان کی انکھوریاں نکلیں، پنکھڑیاں بڑھیں، کونپلیں پھوٹیں، ڈنٹھیں ہری ہوئیں اور رفتہ رفتہ یہ پریم اور پیار کا پودا پروان چڑھ کر سرسبز و شاداب درخت بن گیا۔ اس میں نت نئی شاخیں نکلیں، پھول پھل آئے جو دیس والوں کو اپنی خوبصورتی اور مٹھاس سے لبھاتے رجھاتے رہے۔ اُردو زبان کا بیج تو بہت قبل مبلغوں اور تاجروں نے ان کے علاقے میں لگا رہا تھا۔ پھر ارتقائے اُردو کے لئے سازگار متحدہ ماحول پیدا کرنے میں بھی ان مبلغین اسلام و صوفیائے کرام نے سلاطین اور حکام سے کہیں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ان پاک نفس مبلغین کرام اور صوفیائے عظام کی برکت سے جو اثرات پڑے وہ ہندوستان گیر، دیرپا اور پائندہ تھے۔ سارے ہندوستان میں نومسلموں اور ہندو معتقدین کے مستقل دائرے بن گئے جن میں اچھا شاعر اور فاضل ہی مرتا کے میل جول سے متحدہ زبان بڑی چاہ اور

نسبت [illegible] پیدا ہوتی رہی۔ یہ دائرے اُردو زبان کی ریڑھ کی ہڈی [illegible] اور مسوخ ملک گیری کی وجہ سے نہیں دلبری [illegible] سبب [illegible] تھا۔

[illegible] ابتدائی اُردو کی نشوونما [illegible] صدیوں [illegible] کم و بیش ہر خطے میں [illegible] بھاشاؤں کے ساتھ عربی اور فارسی الفاظ [illegible] ہے اور اس امتزاج [illegible] معیاری طور پر اس آمیزش کی ایک ہی صورت [illegible] اور اتحاد کو میں "آمیزش" [illegible] زبان [illegible] نیا معیار ریختہ اور آمیزش [illegible] کے لیے ارتقائی طور پر دو ترکیب "آیا یعنی ریختہ [illegible] کھانے والے [illegible] فارسی کے امتزاج [illegible] ملک شہ [illegible] کا جذب [illegible] ملکی اور غیر ملکی [illegible] مل کے گھل مل کر ایک ہو گئے تھے صورت [illegible] جیسے [illegible] مراٹھی، پنجابی، سرسینی، برج، اودھی [illegible] بھاشاؤں کے ساتھ عربی و فارسی نے ترکیب [illegible] ریختہ [illegible] مرکب تیار کر دیا تھا متحدہ زبان بن [illegible] اس کا ایک معیار قائم کر دیا جائے۔ تاکہ نئی [illegible] ہندوستان [illegible] لسانی [illegible] تعصب ہو جائے۔ اس [illegible] وقت دلی [illegible] تمدن، عمران و ثقافت کا مرکز [illegible] کلچر کے نمونے کے [illegible] دلی [illegible] پہننے اور اوڑھنے [illegible] تعمیر میں امرا و شرفا [illegible] سلاطین [illegible] نظر [illegible] بولی [illegible] قرب و جوار میں [illegible] کھڑی بولی [illegible] عربی و فارسی کے میل سے جو سانچہ ریختہ کا بنا وہ دلی کی خلقت کی زبان پر روزمرہ کے روپ میں ظاہر ہوا۔ اسی روزمرہ [illegible] چلے [illegible] ٹکسال کی ساکھ قائم ہو گئی۔ یہ سانچہ اور دوسرے [illegible] مشابہ [illegible] تھا۔ اس کے علاوہ اس کی ساخت اور [illegible] متوازن، متوسط اور معتدل تھی۔ ایک طرف پنجابی لب و لہجہ [illegible] اور دوسری طرف بنگالی لب و لہجہ کی نرمی لجلجاہٹ اور [illegible] خواب گینی۔ کھڑی بولی ان دونوں انتہاؤں کے درمیان تھی۔ نہ تو [illegible] ڈنڈے چلاتی تھی اور نہ سبزۂ بنگال پر لیٹی ہوئی تھی۔ بلکہ [illegible] بیدار [illegible] تھی۔ آج بھی موجودہ الفاظ کا جائزہ لیجیے تو یہ بات ظاہر

ہو جائے گی۔ مثلاً ملاحظہ ہو۔

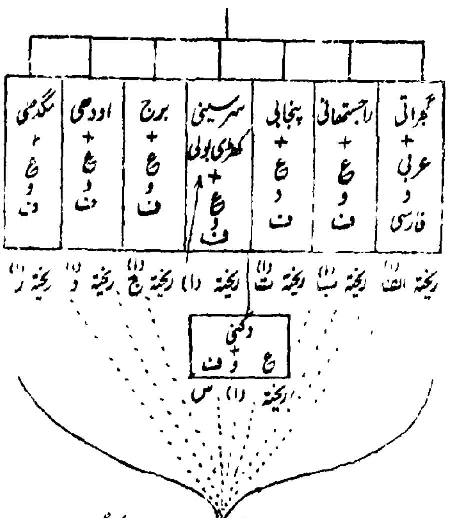
(۱) تہاڈا ← تمہارا ← تہار ← تمار

پنجابی ← کھڑی ← پوربی ← بنگالی

غرض مرکزیت، مشابہت اور اعتدال کے سبب کھڑی بولی والے سانچے کو معیاری حیثیت حاصل ہو گئی اور مقامی ریختے اپنی جگہ پر رہے۔ جب معیار قائم ہو گیا تو تخلیق ادب کے لئے آسانیاں پیدا ہو گئیں۔ یہ معیاری سانچہ ادب کی پیشکش کے لئے سب سے زیادہ موزوں تھا۔ ہر چند کہ ادب اُردو کی تخلیق کے پہلے دور میں مقامی سانچوں کا رنگ بھی جاری رہا تاہم رفتہ رفتہ معیاری سانچے نے ادب پر اپنا اثر پیدا کر لیا خصوصاً جب فارسیت کے مقابل دلی میں بھی اُردو ادب کا چرچا عام طور پر شروع ہوا۔ عہد مغلیہ کی ابتدا اور وسطی حصہ میں دہلی پر ادبی لحاظ سے فارسیت کا زور رہا اور دوسرے دیار و امصار میں نئی متحدہ زبان ریختہ میں ادب پیدا ہونا شروع ہو گیا تھا۔ مثلاً گجرات، دکن، بہار اور پنجاب میں۔

غرض ریختہ یعنی ابتدائی اُردو کے کئی سانچے بنے۔ مگر لب و لہجہ اور الفاظ کی ساخت و تراش میں کھڑی بولی کے سانچے کو لسانی اور پھر ادبی اعتبار سے معیاری حیثیت حاصل ہوئی۔ ملاحظہ ہو نقشہ:-

بھاشا



ہندی (ہندوستانی)۔ **ریختہ** (ابتدائی) اُردو

(۱) کھڑی بولی + عربی + فارسی = معیاری ریختہ = اُردو کے معلے۔ ریختہ (۱) الف۔ ریختہ (۱) ب۔ ریختہ (۱) ت۔ ریختہ (۱) ج۔ ریختہ (۱) د۔ ریختہ (۱) ر۔ ریختہ (۱) س، اور ریختہ (۱)؛ یہ سب ریختے ہی تھے مگر ریختہ (۱) کو مرکزی اور معیاری

اہمیت حاصل ہوئی۔

یہ ضرور ہوا کہ بعض دیار میں ملکی اور غیر ملکی زبانوں کے امتزاج کا عمل آمیزش کی حالت سے ترقی کر کے ترکیب کی حالت تک نہ پہونچا۔ لہٰذا ان علاقوں کے ریختوں میں پختگی نہیں آئی۔ مثلاً بنگالی اور میتھلی بھاشاؤں میں عربی اور فارسی الفاظ بہ کثرت ملے۔ مگر جو بات کھڑی، برج، اودھی، مگدھی اور دکنی کے خطوں میں ہوئی وہ بنگال اور میتھلی اور پنجاب میں نہ ہو سکی۔ اسکے علاوہ یہ بھی ہوا کہ ہندوستان کے وسطی حصوں نے کھڑی بولی والے ریختہ کو لسانی اور ادبی معیار کی حیثیت سے جلد قبول کیا۔ یوں تو ادبی حیثیت سے کھڑی بولی کے ریختہ نے سارے ہندوستان پر رفتہ رفتہ اپنا سکہ جما لیا اور مقامی بولیوں والے ریختے بھی قائم رہے۔ ان میں سے بعض نے ادبی بلندی تک سفر بھی کیا۔ مثلاً موجودہ بنگالی، گجراتی، مرہٹی وغیرہ۔

ان حقائق کے مطالعہ سے میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ ابتدائی مرحلہ میں اردو زبان سارے ہندوستان میں پیدا ہوئی۔ ابتدائی اردو ادب بھی ہر خطے میں تخلیق پاتا رہا خصوصاً ہندوستان کے وسطی میں (دہلی، صوبہ متحدہ، آگرہ و اودھ، بہار اور دکن) اور جب زبان و ادب عہد طفولیت سے پہونچکر بلوغت کی سرحد میں قدم رکھنے لگے تو انتخاب معیار کی ضرورت پیش آئی۔ یہ معیار انہیں [illegible] کی کھڑی بولی کے [illegible] میں ملا۔ اس معیار کو اردو کے سرمرکز نے برتا اور تخلیق ادب اردو کے جاری شدہ عمل کو یکسا [illegible] اور مزید ترقیاں عطا کیں۔

میں جب [illegible] نقطۂ نگاہ سے اردو ہندی ادب کی تاریخ دیکھتا ہوں تو مجھے ایک جانفزا تسلسل نظر آتا ہے۔ متحدہ زبان تو پیدا ہو چکی تھی اور اپنی ارتقائی منزلیں ملک بھر میں طے کر رہی تھی۔ اب تک [illegible] کی تحقیق [illegible] کی روشنی [illegible] متحدہ ادب ہند کی باضابطہ تاریخ خسرو سے شروع ہوتی ہے۔ خسرو اور مظہر جانجاناں کے درمیان کا عہد [illegible] سب کی موجودہ تاریخی کتابوں کے مطابق شمالی ہند میں ادبی لحاظ سے [illegible] خاموش و بے اثر سا دکھایا گیا ہے۔ [illegible] لکھنے والے عہد [illegible] دو میں دکن کا ادبی سرمایہ پیش کرتے ہیں مگر شمالی کو ساکت بتاتے ہیں۔ اسی طرح ہندی ادب جدید کے تاریخ نویس تلسی داس، سورداس، عبدالرحیم خانخاناں، جائسی، کبیر، نانک اور دیا [illegible] کا تذکرہ تو چھیڑتے ہیں مگر اسکے بعد خاموش ہو جاتے ہیں۔ یہ چپ پھر جا کر [illegible] اور بھارتیندو ہریشچندر پر ٹوٹتی ہے۔ درمیان میں غیر مسلسل طور پر بھوشن اور بہاری کا تذکرہ ہو جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں دو باتیں اور عجیب معلوم ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ دکنی شعرا اور ادبا کے ادب پاروں پر دکنی بولی کا اثر ہے اور دوسرے یہ کہ تلسی، سور، کبیر اور میرا وغیرہ کھڑی بولی کے نوی نہیں۔ پھر بھی اول الذکر گروہ کو اردو کا علمبردار سمجھا جاتا ہے اور ثانی الذکر کے تذکرے ہندی ادب کے سلسلے میں بڑی دھوم دھام سے ہوتے ہیں۔ حالانکہ علم السنہ کے ماہروں اور اردو ہندی دونوں کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ اردو ہندی ادب اور زبان کی معیاری شکل کھڑی بولی ہے۔ تو پھر ان نظر میں تضاد کیوں ہے؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ اردو کی تاریخ ادب میں شمالی ہند کے اعتبار سے خسرو اور مظہر جانجاناں کے درمیان [illegible] کیوں [illegible] دور متحدہ ہند کا بہترین ہے۔ اس عہد میں متحدہ امتزاجی [illegible] ارتقائی اعلیٰ منزلیں طے کیں۔ فن تعمیر، فن موسیقی، فن مصوری [illegible] بہترین نمونے پیدا ہوئے اور اسی شمالی ہند میں پیدا ہوئے۔ مغل آرٹ کی دنیا [illegible] تاج محل کلچر کے امتزاج کی ابدی یادگار ہے۔ تان سین نے نغموں کی گونج زمان و مکان کو فتح کر کے آج بھی [illegible] لہروں سے دلوں کو متاثر کر رہی ہے۔ [illegible] سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سورداس، تلسی داس اور للوجی لال دکھائے [illegible] ہریشچندر کے درمیانی عہد کا ادبی خلا ہندی جدید کی تاریخ میں کس طرح پُر کیا جاتا ہے۔

ان تین سوالوں کا ایک جواب ہے۔ اس سے نقطۂ نظر کا [illegible] ہو جاتا ہے اور اردو ہندی تاریخ ادب کے خلا بھی پُر ہو جاتے ہیں [illegible] سنیئے اور غور فرمائیے۔ میرے خیال میں خسرو سے [illegible] تک کا وسیع عہد اردو ہندی کی غیر منقطع مسلسل ادبی تاریخ [illegible] کھڑی بولی کی معیاری اہمیت تسلیم کرتے ہوئے یہ ماننا پڑیگا کہ دو [illegible] کو بھی اردو ہندی کا پہلا روپ ہی قرار دینا چاہیئے [illegible] ریختہ ہو چکی تھی۔ سلطان، پھرمان وغیرہ الفاظ داخل ہو گئے [illegible] سورداس اور تلسی داس کی زبان [illegible] عربی فارسی کے الفاظ [illegible] تفصیل ایک علیحدہ مضمون کی طلبگار ہے۔ مختصر یہ کہ خسرو سے [illegible] ادبا و شعرا نے دکن، شمال میں کبیر، سورداس اور تلسی داس [illegible] صوفیائے بہار اور دیا بائی، ورمغرب میں میرا بائی اور نانک [illegible] لئے دلیپ ہی اہم ہیں جیسے ہندی جدید کے لئے للوجی لال سے پہلے [illegible] کھڑی بولی کے ادبا و شعرا [illegible] دکنی، میر، درد [illegible] نظیر [illegible] مومن، غالب، نذیر احمد، میر امن، سرسید وغیرہ [illegible] کے رجحانات سے قطع نظر کیجئے۔ حالانکہ عہد [illegible] ہیں اور سنگم کی شکل بھی نکلتی رہی ہے۔

جب تلسی داس اور سورداس [illegible] کھڑی بولی کے شاعر [illegible] ادب ہندی میں شمار کئے جاتے ہیں [illegible] خسرو، دکنی [illegible] ہے کہ کھڑی بولی کے شاعر ہوتے ہوئے بھی [illegible] دکنی بولی میں لکھنے والے قدیم شعرا و ادبا تاریخ [illegible] اردو [illegible] لئے جاتے ہیں تو پھر برج بولی میں لکھنے والا سورداس اور [illegible] والا تلسی داس کیوں [illegible] کا مستحق ٹھہرے۔ دراصل اردو [illegible] قدیم [illegible]

قدیم کی تاریخ وسیع ارضیہ [illegible] میں پھیلی [illegible] نے خسرو، نانک، کبیر، سور، تلسی، عبدالرحیم خانخاناں، ملک محمد جائسی، تحفی، ابن نشاطی، عماد، بہاری وغیرہم کی یکساں اہمیت ہے اور اُردوئے وسطی و [illegible] وسطی کی سمجھ بوجھ کے لئے میر، مومن، غالب، انیس [illegible] اور [illegible] کا مطالعہ بے حد ضروری ہے۔ بغیر اس نقطۂ نگاہ کے اُردو اور ہندی زبان و ادب کی مربوط، مسلسل، منطقی اور معقول تاریخ لکھنی ناممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں سور داس اور تلسی داس پر اُردو کے [illegible] کا حق سمجھتا ہوں [illegible] آج کی ہندی [illegible] ہیں، عہد مغلیہ کے متحدہ کلچر کی [illegible] دونوں شعرائے عظیم [illegible] یادگار ہیں۔

خسرو کی زبان ملاحظہ ہو۔

اُوپر سے ایک تریا [illegible]
پی کا نام [illegible]

[illegible]

کبیر کہتا ہے۔

[illegible]
اب [illegible]

کبیر [illegible] استعمال کرتا ہے۔ اور حضرت نانک علیہ الرحمتہ کے وہاں تو اسلامی اصطلاحیں [illegible] اور بیانات صوفیانہ کے سلسلہ میں بے شمار عربی فارسی الفاظ برتے گئے ہیں۔ نماز، حج، زکوٰۃ، اسلام۔ [illegible] (۱۳۸۸ء) کی زبان [illegible] ہو۔

[illegible] ہے [illegible] نہیں اور
[illegible] (میتھلی)

سورداس (۱۴۸۳ء تا ۱۵۶۳ء)۔ یہ شاعر برج بھاشا میں شاعری کرتا تھا۔ اور کرشن بھگتی سے اپنا القائے شاعری حاصل کرتا۔ کہتا ہے۔

جسودا ہری پالنے جھولاوے
ہلراوے دُلرائی ملہاوے   (برج)
جوئی سوئی کچھ گاوے   جسودا ہری پالنے جھولاوے
میرے لال کو آوے نندریا
کاہے نا آنی سوآوے
توں کاہے نا بیگی سی آوے   (بیگی۔ جلدی)
تو تکو کانھ بولاوے   جسودا ہری پالنے جھولاوے

برج بھاشا اور کھڑی بولی میں تو بہت ہی زیادہ قربت پائی جاتی ہے۔ محمد حسین آزاد نے تو برج بھاشا ہی کو سرچشمۂ اُردو قرار دیا ہے۔

میرا بائی کی بھگتی ملاحظہ ہو۔

بسو میرو نینن میں نندلال
سانولی صورت موہنی مورت   (برج راجستھانی)
نینا بنے بسال ـــ بسو میرو نینن میں نندلال

میرا بائی تلسی داس کی ہمعصر جودھپور کی راجکماری تھیں۔

تلسی داس (۱۵۳۲ء تا ۱۶۲۳ء) اپنی نظم رام راجیہ میں کہتا ہے۔ یہ اودھی بھاشا کا شاعر ہے۔

نہیں دردر کوئی دُکھی نہ دینا
نہیں کوئی ابدھ نہ لچھن ہینا
سب گیانی گن آگینان پنڈت
سب کرتگیہ نہیں کپٹ سیانی

خسرو، سورداس، تلسی داس، عبدالرحیم خانخاناں، نانک، کبیر، ملک محمد جائسی، ودیاپتی، وغیرہم کی شاعری ہمارے ادب کا بے بہا خزانہ ہے اور ہم اس کے صحیح حقدار ہیں۔ اُردو ادب کی تاریخ بغیر ان شاہوار دُر دانوں اور آبدار جواہر پاروں کے مکمل نہیں کہی جاسکتی۔ یہ ہمارا فرض ہے کہ اپنا کھویا ہوا حق حاصل کریں۔

یاد رکھیئے؟

(۱) اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیئے ورنہ نہ جواب دیا جائے گا اور نہ پرچہ بھیجا جائے گا۔

(۲) ساقی میں شائع ہونے کیلئے جو مضامین بھیجے جاتے ہیں اُنہیں حتی الوسع محفوظ رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے تاہم اُن کی واپسی کی ذمہ داری ادارۂ ساقی نہیں لے سکتا اس لئے آپ اپنے مضمون کی نقل اپنے پاس رکھ لیا کیجئے۔

(۳) جواب طلب امور اور واپسی مضامین کیلئے محصول ٹکٹ بھیجا کیجئے۔ (۴) ساقی کے نہ پہونچنے کی شکایت ہر مہینے کے دوسرے ہفتے میں کرنی چاہیئے۔ اسکے بعد پرچہ قیمتاً بھیجنا بھی مشکل ہے۔ نمبر خریداری لکھنا نہ بھولئے ورنہ پرچہ نہیں بھیجا جائے گا۔

(۵) سالانہ چندہ چھ روپے بذریعہ منی آرڈر بھیجا کیجئے وی پی طلب کرنے میں آپکو چار آنے زیادہ دینے پڑیں گے۔

نمونے کا پرچہ نو آنے ٹکٹ بھیجکر طلب کیجئے۔ اور اپنا پتہ خوشخط تحریر فرمائیے۔

مینجر ساقی۔ دہلی

سرلا دیوی۔

تاریکی بڑھتی جارہی ہے

اب سگائی کرلو۔ بڑا اچھا گھر ہے۔ ماں باپ کی اکلوتی لڑکی ہے۔ چار بھائی ہیں اور سب کے سب افسر۔ دیکھئے کیا! ــــ وہ اکلوتی بیٹی ہے۔ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ سگائی میں چار ہزار خرچ کریں گے۔ شادی میں لڑکی کی ماں اپنا تمام زیور اور نقد دس ہزار روپیہ دیں گے۔ اور چاہتے کیا ہو۔ لڑکی دیکھ لینا چاہیئے؟ ــــ تو کیا سگائی کرلوں گی اپنے لال کی اور بنا دیکھے ہوئے۔ واہ جی۔ کیا کہا۔ پربھاکر پڑھی ہوئی ہے لڑکی۔ اور میٹرک بھی۔ صرف؟ کیا مطلب ہے تمہارا۔ تم بھی نرے بدھو ہی نکلے۔ ارے ہندی کا بی۔ اے اور انگریزی کا انٹرینس۔ ہنس کیوں رہے ہو؟ کیا کہا ڈھونگ رچ رکھا ہے۔ پربھاکر کرنے کے تین سال بعد انگریزی کا بی۔ اے کرسکتے ہو۔ یعنی چار سال میں بی۔ اے کتنا آسان اور بیوقوفانہ طریقہ ہے۔ آخر میں پوچھوں تم کہاں تک پڑھو۔ صرف دسویں پاس کی تھی چنگی میں ملازم ہوگئے۔ ہاں لکشمی کی کرپا تھی آج سب کچھ بن گئے۔ یہ کیا ایم۔ اے پاس لڑکی لوگے؟ زیادہ منہ مت کھولو۔ میں کہتی ہوں تم آگے چل کر پچھتاؤ گے۔ تو میں تو چلی ــــ نہ بس اماں تو چلی۔ جب کوئی میری سنتا نہیں تو۔۔۔۔۔!

"جی دو سو روپے کماتا ہوں۔ سرکاری کوارٹر ملا ہے۔ بیچ میں پنکھے لگے ہیں۔"

"اجی یہاں میں کیا نہیں دیکھ رہی ہوں میری لڑکی تو آرام سے سوئیگی۔ باقی لڑکی بھی تو بالکل گائے ہے۔ ڈنڈے پیٹنا ہے مجال کیا جو زبان ہلا جائے۔ گھر کے کام کاج میں ایسی کہ مجھے خبر ہی نہیں گھر میں ہوتا کیا ہے۔ تمام کام اس کے ہاتھوں گذرتا ہے۔ بھائی بہنوں کو نہلاتی دھلاتی ہے، کپڑے سیتی ہے، اسکول پڑھنے جاتی ہے۔ بھجن تو ایسے نکالتی ہے کہ بس ــ اور یہ چادر جو آپ کے بستر پر بچھی ہے، یہ تو وہ بائیں ہاتھ سے نکال لیتی ہے۔ میٹرک ابھی سال پاس کرلیا، پڑھنے کا اُسے بڑا ہی شوق ہے۔ پر جوان ہو گئی، اب اس کے پتاجی اسکول نہیں جانے دیتے۔ تو آپ کی کیا صلاح ہے۔ آپ تو بڑے ہونہار ہیں۔ آپ کی ماں نے تو ہیرا پایا ہے۔"

"مگر میری نوکری عارضی ہے اور۔۔۔۔۔"

"نہیں بیٹا۔ ہوا کیا۔ بھگوان جب منہ دیتا ہے تو نوالہ بھی ساتھ دیتا ہے۔ پھر میری بیٹی تو لکشمی ہے۔ جب پیدا ہوئی تھی تو اس کے باپ کو ایک ہزار روپیہ رشوت میں ملا تھا۔ ہمارے تو جب سے پیدا ہوتی دیا سا جلتا گیا۔ ہر آدمی اپنی قسمت بھی تو ساتھ لاتا ہے اور پھر ہم بھی تو ہر قسم کی امداد کو تیار ہیں۔ لاج رکھ لو میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ آپ آخر چپ کیوں ہو گئے؟"

"چپ۔ گم صم۔ ہر وقت مریض کی طرح پڑے رہنا۔ دیکھو ذرا آج تو نئی دھوتی پہن لے۔ اُن سے ذرا سلیقے سے پیش آنا تمہیں دیکھنے کو آرہے ہیں نا۔ ارے سہم کیوں گئی۔ چہرا ہلدی سا کیوں ہوگیا۔ نہ بیٹی مغموم نہ ہو۔ ورنہ سارا کیا دھرا دھرا رہ جائے گا۔ چہرے پر ذرا مسکراہٹ لا۔ منہ اوپر اٹھا کر ہنس۔ میری چندا۔ اگر تجھے انہوں نے پسند کرلیا تو تیری ماں کی چھاتی کا بوجھ ہٹ جائے گا۔ دیکھ اپنی آنکھوں میں آنسو مت لا۔ ماں کے اشاروں کو سمجھ لے۔ یہی دستور ہے اچھی لڑکی کا۔ کیا کہا تجھے میری باتیں پسند نہیں! ارے تو میری ماں ہے یا میں تیری۔ شرم نہیں آتی یہ باتیں کرتے ہوئے۔ تیری پسند اور ناپسند کو یہاں پوچھتا ہی کون ہے۔"

"تو یہ ہے آپ کی لڑکی ــــ ہوں۔ ذرا چلا کر دکھائیے تو۔۔۔ ارے یہ ان کا چہرہ کیوں مرجھا گیا۔ ماتھے پر ننھی ننھی پسینے کی بوندیں کیوں چھلک آئیں۔ کیا کچھ بیماری ہے۔۔۔۔ دق وغیرہ تو نہیں ہے۔ ہاں بھئی مجھے تو خوب ٹھوک بجا کر اپنے لال کا رشتہ لینا ہے۔ اوہ گھبرا گئی ہیں۔ تو آپ نے پربھاکر کب پاس کیا۔ سنہ ۱۹۴۲ء میں۔ اور میٹرک سنہ ۱۹۴۳ء میں۔ اندر پرستھ کالج سے۔ ہوں۔ یہ میز پوش، یہ چادر، غلاف، رومال سب تمہارے ہاتھ سے نکالے ہوئے ہیں۔ ہوں۔"

"کچھ کھائیے نا۔ لیجئے نا چائے۔ یہ رکھے انگور، انار، کیلے، گلاب جامن۔ جا بیٹی ذرا تو اندر جاکر دیکھ آ، تیرا بھائی کیا کررہا ہے ــــ تو آپ کو میری لڑکی پسند آئی؟ ــــ کیا کہا دُبلی ہے۔ جی، مگر آپ کے گھر جائے گی تو موٹی ہو جائے گی۔ بیٹی کی ذات ہی دوسرے گھر پھولتی پھلتی ہے۔ جوان ہوگئی ہے دوسری لڑکیوں کی طرح تیتری سی اڑتی نہیں پھرتی۔ آپ کے گھر کیسے کمائی تو۔۔۔۔ آپ چلنے لگیں۔ بیٹھئے تو سہی۔ آپ نے تو کچھ کھایا پیا بھی نہیں۔ ایک دفعہ پھر دیکھ لیجئے۔ چلا پھرا کر، الٹ پلٹ کر، اتنی دُبلی تو نہیں ہے کہ۔۔۔۔۔۔۔!"

"جی نہیں۔ آخر لڑکی کی تندرستی بھی تو کوئی چیز ہے۔ میرا خیال ہے کہ گھر کے کام کاج میں اس لڑکی کی تمام عمر گزر جائے گی۔ دن رات کھاٹ پر پڑی رہے گی۔ اور [illegible] جلتی ہے [illegible] نہیں۔ صرف سفید [illegible] بلکہ ہم [illegible]
[illegible] لڑکی کو دوبارہ [illegible] ہوں۔ اور [illegible]

ہاں ان کے گھر گئی تھی۔ [illegible] ہوتا۔ اب انکی صلاح معلوم [illegible] ہوتی [illegible] ڈالی۔ تم تو گویا کھاٹ توڑ [illegible] نہیں معلوم شادی کیوں نہیں ہو پاتی۔ [illegible] غم کھائے جاتا ہے۔ دو سال پہلے [illegible] معلوم ہوتی تھی۔ کپڑے پہنتی تھی [illegible] آنکھوں میں [illegible] شادی کو پھر اچھا پہننا تو [illegible] کیا [illegible] دو سال [illegible] اسے گھر [illegible] کر رکھا ہے [illegible] سے اٹھا کر اس کی کونپل سی [illegible] کو روک [illegible] دیں [illegible] ہمارے [illegible] میں قید کی [illegible] ساتھ جاتی ہوں۔ میں تم سے پوچھتی ہوں [illegible] ناچتی پھرتی ہیں۔ کیا کہا [illegible] ہیں۔ سیر کرنے کے لئے جاتی ہیں [illegible] وقت [illegible] اپنی پسند کا کپڑا خرید کر لاتی ہیں۔ ارے باپ [illegible] ایسی باتیں کرتے شرم نہیں [illegible] عزت کی ہے۔ [illegible] لوگ [illegible] سنا بھی تم نے [illegible] کا کارنامہ [illegible] وہ [illegible] شادی کرے گی۔ کیونکہ [illegible] وقت [illegible] کتنے منہ کھل گئے ہیں۔ میری لڑکی ہوتی تو گلا گھونٹ دیتی۔ [illegible] ان لڑکیوں نے اس [illegible] پسند کا [illegible] رچا رکھا ہے ———
ارے تم باپ ہو یا کون۔ مجھ سے پوچھتے ہو [illegible] پسند [illegible] سمجھتی تھی تو کیوں اپنی لڑکی کو ان [illegible] کے سامنے پسند کرانے کے لئے لے گئی تھیں؟ وہاں بھی تو [illegible] ناپسندگی تھی۔ اگر لڑکی نے [illegible] دوسرے کو منتخب کر لیا تو کیا غضب ہو گیا — تم جیسے باپ ہی [illegible] کرواتے ہیں۔ میں صاف کہے دیتی ہوں کہ گھر میں آکر ایسی باتیں نہ کیا کرو۔ ہائے میں کیا کروں! اس ڈائن نے تو میری جان کھا رکھی ہے۔ مر جائے تو مکتی ملے۔"

بھاگ گئی! — ارے کون بھاگ گئی۔ اور کس کے ساتھ؟ — اوہ بھاگ گیا۔ لڑکا۔ جگدیش کا چھوٹا بھائی۔ وہ جس کی عمر کوئی بارہ سال کے قریب تھی۔ ٹھیک ہوا۔ اگر بھاگ نہ جاتا تو اور کیا کرتا۔ سوتیلی ماں کے خوف سے بھاگ کر وہ اپنے بھائی کے پاس آیا تھا کہ آج کے چند ٹکڑوں کے ساتھ اسکو کچھ شفقت اور محبت کی [illegible] کا بھی احساس ہو۔ اس کی غلطیوں کی پردہ داری کرتے ہوئے کوئی ذرا ذرا سی بات پر جاڑوں میں اس کے ٹھٹھرے ہوئے کانوں کو کس کی طرح نہ [illegible] چھوٹی [illegible] تھا اس کے باپ نے کر کے کوئی رات کا کھانا بند نہ کروائے۔ اسکول کے واسطے صاف کپڑے اور وقت پر [illegible] تیار کر دے۔ مگر بھائی کے پاس آکر — بھائی نے نئی نئی شادی کی تھی۔ ایک حسین بیوی اسے اپنی بدصورتی کے عوض میں مل گئی تھی [illegible] اور تعلیم کی کمی بھی کچھ اسی طرح پوری ہو گئی تھی [illegible] بدصورتی کا شکوہ نہ تھا۔ والدین سے تعلیم نہ دلانے کا گلہ نہ تھا۔ اور [illegible] بیوقوف اور غلامانہ ذہنیت سے بیزار کی نہ تھی۔ دن رات اپنے [illegible] کو لئے بازاروں [illegible] گلیوں کی خاک چھانتا پھرتا تھا۔ وہ دونوں [illegible] کو [illegible] باہر بٹھا دیتے۔ اس پلے کی طرح جس کو تالے کے ساتھ ایک زنجیر سے باندھ [illegible] کرنے کیلئے چھوڑ دیا جاتا۔ اور وہ دن کے گھنٹے اور رات کی گھڑیاں [illegible] گنوا دیتا۔ ایک [illegible] طرح [illegible] ڈلوا کر [illegible] والے [illegible] یہ بیچارے [illegible] معتبر آدمی [illegible] اور خود خدا نے اس لڑکے کو [illegible] تھا۔ اس کا بڑا بھائی بھی تو کچھ [illegible] زیادہ محتاج [illegible] کے ساتھ ایک ضمیمہ تو تھا۔ خوبصورت، عقلمند [illegible] اور چالاک۔ وہ عورت تو جانتی تھی کہ گوشت کی "رشوت" کہاں [illegible] [illegible] توڑ کر اس کی طرف پھر ایسے ہی دیکھ کر کہتی [illegible] تو [illegible] پسند ہے۔ تو فوراً وہ کہتا۔ بالکل [illegible] ڈاکٹر کی [illegible] ...... ارات [illegible] اٹھ کھڑا ہوتی [illegible] سنو تو جو [illegible] بستر تو تمہیں [illegible] کھنڈ لگی [illegible] ہے [illegible] مگر وہ اور [illegible] پہننے [illegible] کچھ دیر سینے [illegible] بار بار [illegible] ہی [illegible] میرا جی آؤ سیر کرنے کو چاہ رہا ہے تو وہ فوراً [illegible] کی [illegible] دم [illegible] ہو جاتا۔

کیا شاعرانہ تخیل ہے تمہارا۔ لیکن اگر اسی وقت وہ کہہ دیتی "دیکھو اندھیرا گہرا ہے۔ اور سڑکوں پر رات کو گھومنا شریفوں کا کام نہیں" تو جناب فوراً بول

اٹھتے۔ سچ میری جان تم کتنی عقلمند ہو میں بھی یہی کہنے والا تھا۔ ناشتہ پر صبح کو وہ دونوں خود مکھن اور توس چپڑ چپڑ کھاتے رہتے اور وہ پیتل کے گلاس میں خالی چائے کے گھونٹ بے جا ظلم کی طرح پیتا رہتا۔ کیا بیہودہ سوال مجھ سے پوچھتے ہو کہ وہ ایسا برتاؤ لڑکے کے ساتھ کیوں کرتے تھے۔ آخر وہ اُنکا بھائی تھا۔ اسکا خون تھا.... آہا۔ ہا۔ کیا احمقانہ سوال کرتے ہو۔ کل پوچھنے لگو گے کہ لوگ موالفوں کے دام میں گرفتار کیوں ہوتے ہیں۔ اور ہوتے بھی ہیں تو اپنے خاندان کو جہنم میں جھونک کر ساری دولت کیوں لٹا دیتے ہیں۔ بنگال میں مارواڑیوں اور مہاجنوں کی دکانوں کے آگے لاکھوں مرد۔ عورت اور بچے کیوں مر گئے۔ اور مرے بھی تو ان کے گوداموں سے چاولوں کی بوریاں باہر کیوں نہ نکلیں۔ ہندوستانی غلام کیوں ہیں اور اگر غلام بھی ہیں تو سرکاری خطاب کیوں قبول کرتے ہیں۔ خطاب قبول کرتے ہیں تو سان فرانسسکو میں جا کر خود اپنے ملک کی تذلیل کیوں کرتے ہیں؟ کتنی ناتجربہ کاری کا ثبوت دیتے ہو۔

جی ہاں میں ایک ترقی پسند ادیب ہوں۔ اور شاعر بھی۔ آپ نے کیا دریافت کیا۔ ذرا زور سے بولئے۔ آپ کی آواز جھرنوں کی طرح مدھم ہے۔ اوہ آپ نہیں جانتیں ترقی پسند کسے کہتے ہیں۔ تعجب ہے کہ آپ ابھی تک اس لفظ سے ناواقف ہیں۔ ترقی پسندی.... ترقی پسندی۔ جی آپ نہیں سمجھ سکیں گی۔ یہ ایک تحریک ہے۔ ردعمل ہے، بغاوت ہے۔ رجعت پسندوں کے لئے ایک کارگر تازیانہ ہے۔ ...بس یوں سمجھئے کہ بھوکی اور مظلوم انسانیت کے لئے تیر بہدف ہے۔ اور آپ محض ہندی جانتی ہیں۔ دراصل ہندی بڑی شیریں زبان ہے۔ اور آپ کی آواز سے اسکے اندر ایک ایسا لوچ پیدا ہو جاتا ہے جیسے جھرنے کے شور میں مدھم مدھم سرود سا بج رہا ہو۔ دراصل، مجھے ہمیشہ عورتوں کے لہجہ میں ایک انوکھی شیرینی اور نغمگی کا احساس ہوتا ہے جو میری لوح پر جمالیاتی خط کی اندر دہنش بنکر چھا جاتا ہے۔ ہاں تو ترقی پسندی کا مطلب بس رام بائیر سمجھ لیجئے۔ جی رام بائیر حورن کا اشتہار آپ نے بار بار دیکھا ہوگا۔ ہم سب لوگ یعنی ترقی پسند ادیب زندگی کے ہر شعبہ میں ترقی کے حامی ہیں اور خصوصاً عورتوں کی ترقی کے۔ دیکھئے آپ خود ہی کو لیجئے، کتنی گھٹی گھٹی شخصیت ہے آپ کی۔ آپ کو آزادی حاصل نہیں ہوتی۔ اخلاقی قیود نے آپ کے زندہ جذبات کو جکڑ کر مُردہ کر دیا۔ آپ مردوں سے گھبراتی ہیں۔ آپ سیر کرنے نہیں جا سکتیں۔ ہم ایک ایسے نظام کے متلاشی ہیں جہاں مرد اور عورت بآسانی اپنے فطری جذبات اور خیالات کی تسکین و تکمیل حاصل کر سکیں۔ میرے سارے افسانے عورت پر ہی لکھے گئے، میں نے اپنے تمام افسانوں میں سماج کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا ہے۔ میرے افسانوں میں عورتوں کے غیر تسکین شدہ جذبات کی سسکیاں ہیں۔ مردوں کی زیادتیوں کے خلاف جہاد ہے۔ میں عورتوں کے ساتھ انصاف کا حامی ہوں۔ آپ اتنی دور کیوں بیٹھی ہیں میں نے خود اپنے ایک افسانے میں عورتوں کے اس طرح دور بیٹھے رہنے کے خلاف بھی آواز بلند کی ہے۔

جی ہاں میں نے تین شادیاں کی ہیں۔ ایک عورت مر گئی۔ دوسری... دوسری کو میں نے چھوڑ دیا صرف دو مہینے شادی کے بعد۔۔۔ جی نہیں۔ آپ غلط سمجھیں کہ عورت دو ماہ کیا صرف ایک دن بعد مرد کے لئے کچھ نہیں رہتی۔ وہ بیکار۔ باسی اور بے لذت ہو کر رہ جاتی ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ مجھے وہ عورت پسند نہ تھی شادی کیوں کی تھی؟۔۔۔ جی ماں باپ سے مجبور ہو گیا تھا۔ آپ میرے افسانے پڑھئے۔ آج تک میرے افسانوں میں سوائے شادی بیاہ کی پیچیدگیوں کے کہ کس طرح ماں روئی، بیٹے نے بغاوت کی، پنڈت آئے۔ ویدک رچائی گئی، منتر پڑھے گئے اور "گربہ کشتن" والی رات آئی اور بہت ہی کم چیزیں ہیں جو مرہم کھیچ کا کام دیتی ہیں۔ ماں سے مجبور ہو کر اگر شادی کر لی تھی تو پھر میں نے اس کو کس لئے چھوا تھا۔ دو ماہ تک کیوں اس کی عصمت کو لوٹتا رہا تھا اور گھر سے نکالتے وقت اُسے ایک بچہ کیوں مرحمت فرما دیا۔ آپ یہ نہیں سمجھ سکیں گی، آپ کو کچھ غصہ آگیا ہے۔ دراصل میں شاعر ہوں۔ حساس ہوں، مجھے ایک دوسری لڑکی سے عشق تھا۔ میں اس سے شادی نہ کر سکا تھا۔ مگر وہ عقلمند تھی، ہوشیار تھی۔ شادی کے بعد بھی وہ مجھے نہ بھلا سکی۔ میں دو ماہ تک اپنی بیوی کو تعلیم دینے کی ناکام کوشش کرتا رہا۔۔۔۔ جی یہ آپ نے ٹھیک فرمایا کہ وہ ایف۔ اے تھی، اور کافی حسین تھی۔ مگر وہ بیوقوف تھی۔ یہ ہندوستان کی یونیورسٹیاں۔۔۔۔ ریڈیو پر آپ میرا ایک ڈرامہ سنئے بالکل اسی موضوع پر۔ ہاں تو یہ ہندوستان کی یونیورسٹیاں یونہی ڈگریاں دے دیتی ہیں۔ وہ حسین ضرور تھی مگر ایک ادیب محض سفید کھال ہی نہیں چاہتا۔ وہ کچھ اور چاہتا ہے۔ اور.... اور پھٹتی ہوئی پو کی روشنی کی طرح انوکھی .... ڈوبتے ہوئے سورج کی شراب آپ کے رخساروں میں گھل رہی ہے... گلابی... گلابی.. دراصل میں ارغوانی رنگ کے سلسلہ میں بہت حساس ہوں۔ میری روح میں اس رنگ کو دیکھ کر ایک تشنگی سی بھڑک اٹھتی ہے۔ میرے ہونٹ چومنے کے لئے بیوہ عورت کے جذبہ کی طرح تڑپنے لگتے ہیں۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ مجھے اس لڑکی سے نفرت تھی۔ میں نے اُسے چھوڑ دیا۔ میں سماج کی پروا نہ کرتا تھا۔ پرانی روایات کو توڑنا میرے نزدیک ایک مقدس فرض ہے۔ میں نے دنیا کی پروا نہ کی۔ میں نے اس سے شادی کر لی۔ اور پھر آپ خود جانتی ہیں کہ ادیب کو ہر چیز جائز ہوتی ہے۔ وہ اوتار ہوتا ہے۔ پیغمبر کا رتبہ رکھتا ہے۔ آپ نے خود میری بیوی کے افسانے پڑھے ہوں گے۔ جی۔ وہ بھی افسانے لکھنے لگی ہے۔ اس کے افسانے بڑے منجھے ہوئے ہوتے ہیں۔ لوگوں کو ان افسانوں پر میرے لکھے ہوئے ہونے کا شبہ

ہوتا ہے۔ رنگ گو کہ میرا ہی ہے۔ مگر . . . لوگ حسد کرتے ہیں نہ!۔

دنگا ہو گیا!۔۔۔ ہاں ہندو مسلمان دنگا۔ چونک اُٹھے تم۔ تاریخ نہیں پڑھی۔ دنگے فساد ۱۸۵۷ء کے بعد خصوصاً شروع ہوتے ہیں۔ ارے تم کو نہیں معلوم ۱۸۵۷ء میں کیا ہوا تھا۔ ٹھیک کہتے ہو کہ اسکولوں میں پڑھائی جانے والی تواریخ مسخ ہے۔ اس میں سچ کم ہے۔ وہ ایک [illegible] مگر خون کے دھبے مٹائے جا سکتے ہیں۔ ان کے "احساس" کو نہیں مٹایا جا سکتا۔ ہاں تو ۱۸۵۷ء میں غدر ہوا تھا جب ہندو مسلمان ایک ہو کر ہندوستان کی آزادی کے لئے شعلوں کی طرح اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ مگر سکھوں اور گورکھوں نے ساتھ نہ دیا اور ہندوستان غلام ہو گیا۔ اس دن کے بعد سے دنگے فساد شروع ہو گئے۔ کیا کہا۔ ۱۸۵۷ء کے اتحاد کے بعد اب یہ دونوں قومیں کیوں لڑتی ہیں اور جنگ کرتی ہیں۔ میں کیا بتا سکتا ہوں۔ ہاں غلام دونوں ہیں۔۔۔ کیا کہا کوئی تیسری طاقت ان فسادوں کے پس پردہ برسرِ عمل ہے؟۔۔۔ کیوں سفید جھوٹ بولتے ہو۔ سرمایہ داروں کے اخبار ہندوستان ٹائمس کو پڑھنے لگے ہو کیا!۔۔۔ سر فیروز خاں نون کے بیان کو بھول گئے جو انہوں نے سان فرانسسکو میں اخباری نمائندوں کو دیا تھا۔ تم نے نہیں پڑھا!۔۔۔ سرمایہ داروں کا اخبار پڑھتے ہو نہ۔ انہوں نے صاف کہا تھا کہ ہندوستان کی آزادی کے راستہ میں کوئی تیسری طاقت حائل نہیں۔ یہ محض مہاسبھائی کانگریس پریس کا بے بنیاد پروپیگنڈا ہے۔ اچھا چھوڑو اس بات کو۔ دنگے میں کسی کو چوٹ تو نہیں آئی۔ نہیں تو زیادہ جانی نقصان نہیں ہوا۔ صرف ایک ہندو نے دوسرے ہندو کو مسلمان سمجھ کر مار ڈالا۔ ہندوؤں نے ایک مسلمان کو ٹھکانے لگانے کے اعزاز میں اس مجاہد کا جلوس نکالا۔ شام کو معلوم ہوا اُس نے ایک ہندو ہی کو جان سے مار ڈالا۔ سُنا ہے وہ مندر میں دو رات سے بھگوان کے سامنے پڑا اپنے "گناہ" کی تلافی کر رہا ہے۔ بار بار وہ چلا کر کہتا ہے "مجھے معاف کر دو بھگوان۔ میں نے اپنے ہی بھائی کا خون کر ڈالا۔" دو دن پہلے وہ اس مندر میں ایک مسلمان کا خون کرنے کی خوشی میں گھنٹیاں بجانے آیا تھا۔

تم کو کیا۔ یہ آدمی اس اسٹیشن پر اُداس مغموم، اس بنچ پر ایک مدت سے کیوں بیٹھا رہتا ہے۔ اس کے پاؤں ننگے ہیں۔ پیروں پر گرد جم کر کھال کے رنگ میں مل کر بھوری ہو گئی ہے۔ اس کا چہرہ نیم کے سوکھے پتوں کی طرح زرد اور مرجھا گیا ہے۔ ہونٹوں کے ہوتے ہوئے یہ موم کے پتلے کی طرح کیوں خاموش رہتا ہے۔ اس کی مغموم، اداس اور پژمردہ نگاہ ہر آنے جانے والے کے چہرے پر پڑ کر کیوں خود پشیمان ہو کر جھک جاتی ہے۔ تم کو آخر ان تمام چیزوں سے کیا مطلب!

آؤ ڈارلنگ آگے چلو۔ دیکھو یہ پگڈنڈی تمہاری مانگ کی طرح سیدھی کھیرس کے ان جھنڈوں کے اور جاتی ہے۔ آؤ۔ آگے چلو۔ ارے تمہارے قدم کیوں رک گئے۔ تم کیوں سر کھپاتی ہو۔ یہ کہاں رہتا ہے۔ کہاں کھاتا ہے۔ ارے پگلی، خدا کی دی ہوئی اتنی زمین ہے۔ اوپر اتنا وسیع آسمان ہے۔ دھوتوں سے پھینکے جانے والے جھوٹے ٹکڑوں کا بھی کوئی کال ہے۔ دیکھو کھجور کے درخت ہم کو جھوم جھوم کر بلا رہے ہیں۔ جھیل کی نیلی لہریں تمہاری ساری کی لہروں میں گھل رہی ہیں۔ خدا کی دی ہوئی زندگی ہی کتنی ہے۔ آؤ۔ دیکھو سورج ڈھل رہا ہے۔

اور سورج ڈھل گیا۔ تاریکی کھجوروں سے برس پڑی۔ گھپ اندھیرا چھا گیا۔

تاریکی بڑھتی جا رہی ہے۔ کتنا بھیانک خول ہمارے گرد چڑھ گیا ہے۔ تم مجھے محض اپنی کمر میں ہاتھ ڈال لینے دو۔"

تصانیف مرزا عظیم بیگ چغتائی مرحوم

سِواَنہ کی رُوحیں:- سرزمین مارواڑ کے پُراسرار حالات۔ راٹھوروں کا جنگی بانکپن، راجپوت کماریوں کی جرأت کے کارنامے۔ اُن کے حُسن و جمال کی رعنائیاں اور فسونِ محبت کی دلکش سحر کاریاں، رزم و بزم کی ہوشربا داستان، جگر پاش اور جاں گسل واقعات۔ قیمت آٹھ آنے!

ملفوظاتِ ٹامی:- ایک کتے کی خود نوشت سوانح عمری ایسے مزاحیہ رنگ میں لکھی گئی ہے کہ کتوں اور دوسرے جانوروں کی ذہنیت کے اس پہلو پر روشنی پڑتی ہے جو اُن کے ہنسانے والے اور تمسخر آمیز افعال سے متعلق ہے۔ ہر فعل اس خوبی سے بیان کیا گیا ہے کہ گویا افسانہ ہے اور ہر افسانے کا پلاٹ اس قدر ہنسانے والا اور تفریح سے پُر ہے کہ بہترین افسانوں کا لطف آئے گا۔ قیمت صرف بارہ آنے!

چینی کی انگوٹھی:- یہ ایک نوجوان اور خوبصورت بیوہ کی انتہا سے زیادہ دلچسپ اور خوبصورت داستان ہے پھر ایک لوٹے نے اس قصہ میں کس دلچسپی کے ساتھ حصہ لیا ہے۔ قیمت ۸ر

مضامینِ چغتائی:- مرزا عظیم بیگ چغتائی کے مضامین اور افسانوں کا مجموعہ۔ اس میں ۳۲ مضمون اور افسانے شامل ہیں۔ قیمت ایک روپیہ!

ملنے کا پتہ:- **ساقی بک ڈپو۔ دہلی!**

ریڈیو کے دس سال

آغا محمد اشرف

پورے دس برس ہوتے کہ یکم جنوری ۱۹۳۶ء کو شام کے پانچ بجے دہلی ریڈیو اسٹیشن سے پہلا باقاعدہ پروگرام ہندوستان میں سنا گیا تھا۔ اگرچہ آزمائشی پروگراموں کا سلسلہ اکتوبر ۱۹۳۵ء سے جاری تھا اور ڈھائی مہینے سے تمام ہندوستان میں ہر روز رات کو چند گھنٹے کے لئے لوگ دہلی ریڈیو کی آواز سنا کرتے تھے۔

ماضی ہندوستان کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ ہندوستان کے پایۂ تخت دہلی میں اس قدر طاقتور ریڈیو اسٹیشن قائم ہوا کہ جس کی آواز ہندوستان کے علاوہ افغانستان، برما، ایران، اور مقابلۃً دور دراز علاقوں تک پہونچ سکتی تھی۔ بمبئی اور کلکتہ میں چھوٹے چھوٹے ریڈیو اسٹیشن ۱۹۲۷ء میں قائم کئے گئے تھے لیکن ان کی آوازیں اتنی نحیف اور کمزور تھیں کہ چند میل کے احاطے کے سوا اُسے کسی اور جگہ کے لوگ مشکل سے سُن سکتے تھے۔ یہ دونوں ریڈیو اسٹیشن ایک تجارتی کمپنی نے قائم کئے تھے اور سرمایہ کی کمی کی وجہ سے ان کے پروگرام کبھی اس قابل نہیں ہوئے کہ انہیں بمبئی اور کلکتہ جیسے شہروں کے شایان شان کہا جا سکتا۔ بعد میں گورنمنٹ نے بھی ان ریڈیو اسٹیشنوں کی مالی مدد کی لیکن ان کمپنیوں کا تجربہ کامیاب ثابت نہیں ہوا۔ حالانکہ انگلستان میں بی۔ بی۔ سی ۱۹۲۲ء میں ایک تجارتی کمپنی کی حیثیت سے قائم ہو چکی تھی۔ مگر ہندوستان میں یہ تلخ حقیقت سب کو ماننی پڑی کہ جب تک گورنمنٹ آف انڈیا ریڈیو کا محکما اپنے ہاتھ میں نہیں لیتی اور مرکزی حکومت کے خزانے سے گراں بہا امداد اس محکمہ کو نہیں ملتی اس وقت تک ہندوستان کی سرزمین پر ریڈیو کا پودا پروان نہیں چڑھ سکتا۔ چنانچہ ۱۹۳۰ء میں انڈین اسٹیٹ براڈکاسٹنگ سروس کے نام سے گورنمنٹ آف انڈیا کے انڈسٹریز اور لیبر کے محکمے نے ریڈیو کی سرپرستی قبول کی۔ اور پانچ سال بعد اس ادارے کی ساخت و پرداخت کے لئے ۱۹۳۵ء میں بی۔ بی۔ سی کے ایما پر مسٹر لائنل فیلڈن کو اس کا کنٹرولر مقرر کیا گیا۔

اسی دوران میں گورنمنٹ آف انڈیا نے دہلی میں پچیس کلو واٹ کی طاقت کا ایک ریڈیو اسٹیشن قائم کرنے کی اسکیم منظور کی جو بمبئی اور کلکتہ کے موجودہ اسٹیشنوں سے کئی گنا طاقتور تھا۔ اگرچہ دہلی ریڈیو اسٹیشن میڈیم ویو پر پروگرام براڈکاسٹ کرنے کے لئے قائم کیا گیا تھا، مگر اُمید یہ تھی کہ جب سردی کے موسم میں جب فضائی حالات معتدل اور سازگار رہیں گے تو اس وقت دہلی کی آواز ہندوستان اور آس پاس کے علاقوں میں بھی سُنی جا سکے گی، اور یہی ہوا بھی۔ اکتوبر ۱۹۳۵ء میں جب دہلی ریڈیو نے آزمائشی پروگراموں کا سلسلہ شروع کیا تو سننے والوں نے اس کی آواز کشمیر سے لے کر راس کماری تک اور قلات سے لے کر برما تک سُنی۔ اور کچھ سننے والوں کے خط ملایا اور مشرقی افریقہ تک سے آئے۔

ریڈیو کے پروگرام اگرچہ ہندوستان کے لئے کوئی نئی چیز نہیں تھی کیونکہ جن لوگوں کے پاس ریڈیو سیٹ تھے وہ لندن۔ برلن۔ پیرس۔ ہالینڈ اور ماسکو کے پروگرام اکثر سنا کرتے تھے۔ مگر عام لوگوں کے لئے یہ نئی بات تھی کہ دہلی ریڈیو سے ہندوستانی گانے، ہندوستانی میں خبریں اور تقریریں براڈکاسٹ ہوتی تھیں اور اسی انوکھی بات کی وجہ سے چند مہینے کے اندر دہلی ریڈیو کی شہرت تمام ملک میں پھیل گئی۔ سننے والوں کے ہر ہفتے سینکڑوں خط آنے لگے۔ اخباروں نے ریڈیو کے متعلق خبریں نہایت فراخدلی سے چھاپیں اور دور دور سے لوگ دہلی ریڈیو اسٹیشن پر صرف اس غرض سے آنے لگے کہ ان لوگوں کو اپنی آنکھ سے دیکھ لیں جن کی آواز ہر روز یہ ریڈیو پر سنا کرتے ہیں۔

جنوری ۱۹۳۶ء میں شاہ جارج پنجم کی بیماری کی خبر نے تمام ہندوستان میں بے چینی سی پھیلا دی اور ہر روز بادشاہ کی صحت کا حال سننے کے لئے ہزاروں لوگ ریڈیو کے گرد جمع ہونے لگے۔ شاہ جارج پنجم کی موت، ان کے جنازے کا لندن میں جلوس۔ شاہ ایڈورڈ ہشتم کی تخت نشینی کا اعلان اور نئے بادشاہ کی پہلی تقریر۔ یہ ایسے تاریخی واقعات تھے کہ جنہوں نے عوام کی ریڈیو میں دلچسپی بہت زیادہ بڑھا دی۔ اپریل ۱۹۳۶ء میں لارڈ ولنگڈن نے حکومت ہند کی باگ ڈور لارڈ لنلتھگو کو سونپی اور ہندوستان کی تاریخ میں پہلی دفعہ دہلی ریڈیو نے وائسرائے کو نئی دہلی کے ریلوے اسٹیشن سے رخصت کیا اور نئے وائسرائے کی آمد کا حال، وائسریگل لاج سے تمام ہندوستان میں سننے والوں کو گھر بیٹھے سُنایا۔ آج کل ریڈیو پر اہم واقعات کا آنکھوں دیکھا حال سننا ایک معمولی سی بات ہے لیکن اپریل ۱۹۳۶ء میں اس بات کے لئے دہلی ریڈیو کو جن دقتوں کا سامنا کرنا پڑا تھا اُن کے خیال سے بھی وحشت ہوتی ہے۔ کئی دن رات تک ریڈیو انجینیر وائسریگل لاج کی چھت پر بجلی اور ٹیلیفون کے تاروں کا

تانا بانا بنتے رہے گی۔ یہ ترانو ٹے ہوئے کئی بار انجینیروں نے انہیں نئے سرے سے جوڑا۔ آخر جب وائسرائے کا جلوس دا میموریل ٹریج میں داخل ہوا تو سب سننے والوں نے اس کی آمد کا حال انگریزی اور اردو میں سن لیا۔ انگریزی میں یہ حال انگلستان کے مشہور مصنف [illegible] (Yeats Brown) بیان کر رہے تھے اور اردو میں [illegible] سننے والوں کے دلوں پر اس پروگرام کا گہرا اثر ہوا [illegible] بجلی اور کھمبوں [illegible] سے آنکھوں دیکھا حال [illegible] سنانے [illegible] ریڈیو کی زندگی میں یہ ایک بڑا واقعہ تھا۔

حساب

جون ۱۹۳۶ء میں [illegible] کا نام آل انڈیا ریڈیو رکھا گیا [illegible] کا اختصار اے۔ آئی۔ آر کے نام سے آج تمام ہندوستان میں مشہور ہے۔ دہلی ریڈیو کا تجربہ کامیاب ثابت ہوا اور اس کی [illegible] کہ چند مہینے کے اندر ریڈیو لائسنسوں کی تعداد [illegible] ہزار [illegible] ہو گئی اور گورنمنٹ نے ہندوستان کے دوسرے شہروں میں ریڈیو اسٹیشن کھولنے کی اسکیم پر غور کیا۔ ۱۹۳۶ء اور ۱۹۳۸ء کو آل انڈیا ریڈیو کی زندگی میں شباب کا زمانہ کہنا چاہیئے کیونکہ اسی عرصہ میں پشاور، لاہور، لکھنؤ، مدراس اور ترچناپلی اور ڈھاکہ میں نئے اسٹیشن کھولے گئے۔ بمبئی اور کلکتے کے پرانے اسٹیشنوں کی طاقت بڑھائی گئی۔ دہلی، مدراس، بمبئی اور کلکتے میں میڈیم ویو کے ساتھ شارٹ ویو کے اسٹیشن بھی قائم ہوئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ریڈیو اسٹیشنوں کا جال تمام ہندوستان پر چھا جائے گا اور ہندوستان کے ہر حصے میں اپنا ریڈیو مرکز نظر آئے گا۔ ہندوستان جیسے بڑے ملک کے لئے اس قسم کے مرکز ضروری بھی تھے کیونکہ جس ملک میں چالیس کروڑ باشندے (تمام دنیا کی آبادی کا پانچواں حصہ) بستے ہوں، جس ملک کا رقبہ روس کو چھوڑ کر تمام براعظم یورپ کے برابر ہو اور جہاں جغرافیائی لحاظ سے باشندوں کی لسانی اور سماجی ضروریات ایک دوسرے سے بہت بڑی حد تک مختلف ہوں وہاں ایک مرکز یا صرف چند ریڈیو اسٹیشنوں سے کام نہیں چل سکتا۔[1]

شمالی ہندوستان کے گانے جنوبی ہندوستان والوں کیلئے عذاب جان ہیں اور جنوبی ہندوستان کی موسیقی مشرقی ہندوستان کے لئے ایک بے معنی شور و شغب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ دہلی ریڈیو کی اردو میں خبریں مدراس کے لوگ نہیں سمجھ سکتے اور کلکتہ سے اگر تجارتی خبریں بنگالی میں سنائی جائیں تو بمبئی کے تاجر اور سوداگران سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ ایسی صورت میں یہی ممکن تھا کہ ملک کے ہر حصے کے لئے ایک علیحدہ ریڈیو اسٹیشن بنایا جائے۔ اگرچہ ایک صورت یہ بھی ہو سکتی تھی کہ دہلی میں ایک یا چند شارٹ ویو اسٹیشن قائم کر دیئے جاتے۔ (کیونکہ میڈیم ویو کا پروگرام زیادہ دور کے علاقے نہیں سن سکتے) اور ان شارٹ ویو اسٹیشنوں پر تمام ملک کے لئے گانے خبریں اور تقریریں صوبجاتی ضرورتوں کے لحاظ سے براڈکاسٹ ہوتیں۔ لیکن سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ شارٹ ویو کا پروگرام سننے کے لئے ریڈیو سیٹ بہت قیمتی چاہئیں جو ہندوستان جیسے غریب ملک کے لئے مشکل بات ہے۔ دوسرے اگر ایک ہی ریڈیو اسٹیشن سے تمام ہندوستان کے لئے پروگرام براڈکاسٹ کئے جائیں تو اس کی حیثیت مینار بابل کی سی بن جاتی ہے کہ جہاں بھانت بھانت کی بولیاں بولی جاتی ہیں مگر انہیں سمجھتا کوئی نہیں۔ ایسی حالت میں بہترین حل یہی تھا کہ صوبجاتی ضرورتوں کے لحاظ سے جگہ جگہ ریڈیو اسٹیشن کھول دئے گئے۔ اگرچہ بہار، سندھ، سی پی۔ اور آسام کے صوبوں کو مرکزی حکومت سے شکایت ہے کہ ریڈیو اسٹیشن قائم کرتے وقت ان صوبوں کی ضرورتوں کو دہلی نے نظر انداز کیا۔

جنگ اور ریڈیو

ابھی آل انڈیا ریڈیو کی ترقی کا پروگرام پوری طرح سے سنورنے بھی نہ پایا تھا کہ ستمبر ۱۹۳۹ء میں جرمنی نے پولینڈ پر حملہ کر دیا اور تین ستمبر کو برطانیہ کے وزیر اعظم مسٹر چیمبرلین نے برطانوی حکومت، نوآبادیوں اور ہندوستان کی طرف سے جرمنی کے خلاف جنگ کا اعلان لندن ریڈیو کے ذریعے تمام دنیا کو سنا دیا۔ اس تاریخ سے آل انڈیا ریڈیو کی مختصر زندگی میں ایک نیا باب شروع ہوتا ہے۔ کیونکہ جنگ کے اعلان نے تمام ملک میں ایک آگ سی لگا دی۔ اور جنگ کی خبروں کے اشتیاق نے لوگوں کو اخباروں اور ریڈیو کا محتاج بنا دیا۔ "جنگ کی تازہ خبر کیا ہے؟" یہ لفظ ہر شخص کی زبان پر تھے اور اس سوال کا جواب دن میں کئی بار صرف ریڈیو ہی دے سکتا تھا۔

اسی دوران میں جرمنی، اٹلی اور جاپان نے ہندوستانی زبانوں میں خبریں سنانے کا بندوبست کیا اور بی بی سی لندن سے گیارہ مئی ۱۹۴۰ء سے ہر روز اردو میں خبریں براڈکاسٹ ہونے لگیں۔ دوران جنگ میں ریڈیو کو جو مقبولیت ہندوستان میں حاصل ہوئی ہے اس میں غیر ملکی ریڈیو اسٹیشنوں کا بہت بڑا حصہ ہے۔ کیونکہ جنگ کے زمانے میں لوگ جن اسٹیشنوں سے برلن، روم، ٹوکیو، سائیگون، سنگاپور (شونان) انقرہ، ماسکو،

---

[1] اس وقت تمام ہندوستان میں تیرہ ریڈیو اسٹیشن کام کر رہے ہیں۔ اس کے مقابلے میں روس کے ریڈیو اسٹیشنوں کی تعداد [illegible] ہے۔ حالانکہ تمام روس کی آبادی ہندوستان سے آدھی ہے۔

اور لندن کی خبریں سنتے تھے وہ آل انڈیا ریڈیو کے حصے میں بہت کم آتا تھا۔[1]

جنوری ۱۹۴۰ء سے آل انڈیا ریڈیو دہلی کی خبریں انگریزی اور اُردو میں دوسرے اسٹیشنوں سے بھی ریلے کی جاتی تھیں مگر جنگ کی وجہ سے اب ساری زبانوں میں خبروں کا مرکز دہلی کا دفتر بن گیا۔ چنانچہ انگریزی اور اُردو کے علاوہ بنگالی۔ مرہٹی۔ گجراتی۔ پشتو۔ تامل۔ ملیالم۔ اور تلگو میں بھی خبریں دہلی سے براڈکاسٹ ہونے لگیں۔ کچھ عرصے کے بعد جب جنگ کے شعلے شمالی افریقہ مصر اور مشرق قریب تک آن پہونچے تو عربی اور فارسی زبانیں بھی اس فہرست میں شامل ہوگئیں۔ دسمبر ۱۹۴۱ء میں جاپان نے پرل ہاربر پر حملہ کیا اور چند مہینے کے اندر ملایا اور برما پر جاپانی فوجوں کا قبضہ ہوگیا۔ تو برطانی حکومت کے فار ایسٹرن بیوریو نے آل انڈیا ریڈیو کے سائے میں پناہ لی۔ اور فیصلہ یہ ہوا کہ برٹش منسٹری آف انفرمیشن کی نگرانی میں دہلی سے جاپانی ملایائی۔ برمی چینی۔ سیامی۔ فرانسیسی اور اطالی زبانوں میں بھی خبریں براڈکاسٹ کی جائیں۔ گویا جنگ کے طوفان نے آل انڈیا ریڈیو کو ایک بین الاقوامی درجہ دیدیا اور اس کے باقاعدہ سننے والے صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ مشرق قریب اور مشرق بعید تک کے علاقوں میں پھیل گئے۔ ہندوستانی فوجیں لڑائی کے مشرقی اور مغربی مورچوں پر پہونچیں تو ہندوستانی سپاہیوں کے لئے دہلی سے خاص پروگرام براڈکاسٹ ہونے لگے۔ ادھر ضرورت کے لحاظ سے نئے اور طاقتور ٹرانسمٹر دہلی میں برابر جمع ہوتے رہے۔ اور شارٹ ویو پر دہلی کی آواز مغرب میں لندن اور مشرق میں ٹوکیو تک جا پہونچی۔ ان میں سے کچھ ٹرانسمٹر برطانوی گورنمنٹ نے اپنے محکمہ کے لئے بھیجے تھے اور باقی کے ٹرانسمٹر آل انڈیا ریڈیو کی ملکیت تھے ان میں سے دو کی طاقت ایک ایک سو کلو واٹ ہے کہ جنھیں ایشیا میں سب سے زیادہ طاقتور مانا جاتا ہے۔ غرض اس وقت خاص دہلی میں ایک میڈیم ویو اور نو شارٹ ویو ٹرانسمٹر کام کر رہے ہیں اور اس لحاظ سے دہلی کا شمار دُنیا کے بہت بڑے ریڈیو مرکزوں میں ہونا چاہیئے۔

یکم جنوری ۱۹۳۶ء کو شام کے پانچ بجے دہلی ریڈیو نے ایک نحیف اور کمزور آواز میں نوزائیدہ بچے کی طرح اپنی آمد کا ڈرتے ڈرتے اعلان کیا تھا۔ وہی بچہ آج دس سال بعد طاقت کے اعتبار سے ایک تندرست و توانا نوجوان بن چکا ہے جس کی آواز مشرق اور مغرب کی فضاؤں پر حاوی ہے اور ترقی کا بہت بڑا میدان اور اس کی وسعتیں اس کے سامنے کھلی پڑی ہیں۔

یہاں تک میں نے آل انڈیا ریڈیو کی تاریخ مختصر لفظوں میں آپ کے سامنے پیش کی ہے۔ اس کے پروگراموں یا اس کی خدمات کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔ ہندوستان میں ریڈیو کو اس تیزی سے ترقی ہوئی ہے کہ ہر نیا قدم اُٹھاتے وقت اُسے سوچنے کا بھی موقع نہیں ملا۔ بلکہ ریڈیو ایک سیلاب کی طرح ہندوستان میں آیا اور اس کی رو میں تناور درخت خس و خاشاک عمدہ اور خوبصورت مکانات اور تاریخی بستیاں سبھی بہہ گئیں۔ کسی کو اتنا موقع نہیں ملا کہ اس زبردست سیلاب کو بند باندھ کر روکا جاتا۔ اس کی طاقت سے بجلی بنتی۔ اس سیلاب کا زور توڑنے کے لئے نہریں کاٹی جاتیں تو بنجر و بیابان علاقوں کو شاداب اور زرخیز بناتیں۔ اس کی ہروں پر خوبصورت کشتیاں چلتیں تجارت کا سامان لانے کے لئے جہاز رانی ہوتی اور خلقت حیرت سے یہ دیکھ کر خوش ہوتی کہ ہندوستان میں اس سیلاب نے کیسا خوشگوار انقلاب پیدا کر دیا۔ مگر اس سیلاب کی ترکتازی اور شدت کو روکنے کا کہیں موقع ہی نہ ملا۔ خلقت اب بھی حیرت سے اس کا تماشہ دیکھتی ہے مگر ایسی حیرت سے جو زبردست طوفان اور سخت آندھی کے بعد لوگوں پر طاری ہوتی ہے۔ یا ایسے تعجب اور سہم جو بادو باراں کی سخت گرج اور کڑک کے بعد لوگوں کے ذہن پر چھا جاتا ہے۔ ہندوستان میں ریڈیو نے ایکا ایکی آکر ایک ایسا زبردست نقارہ بجایا کہ اس کی آواز سے سننے والوں اور سُنانے والوں کے کان گنگ ہوگئے۔

چند اعتراض آل انڈیا ریڈیو پچھلے دس سال سے اعتراضوں اور نکتہ چینیوں کا نشانہ بنا رہا ہے۔ یہ اعتراض کس حد تک صحیح ہیں اور کہاں تک ان میں ذاتیات کو دخل ہے، اس امر سے مجھے اس وقت بحث نہیں۔ لیکن اس بات سے اتنا پتہ ضرور چلتا ہے کہ ملک میں لوگوں کو ریڈیو سے دلچسپی ہے اور سب ہی چاہتے ہیں کہ ریڈیو کی طاقت سے مفید کام لیا جائے۔

آل انڈیا ریڈیو پر سب سے زیادہ اعتراض اس کی زبان کے بارے میں کئے جاتے ہیں۔ شمالی ہندوستان کے ریڈیو اسٹیشنوں سے جو زبان ہندوستانی کے نام سے منسوب کی جاتی ہے اُسے باری باری سے اُردو اور ہندی دونوں کیمپوں نے اپنے اپنے معیار کی کسوٹی پر کسا ہے اور دونوں طرف سے اس پر اعتراض ہوئے ہیں۔ ریڈیو کی زبان دُنیا کے ہر ملک میں تنقید کا نشانہ بنی ہے۔ حد یہ ہے انگریزی زبان کہ جس کی قدیم روایات اور تاریخی اسناد کا سب کو اعتراف ہے جب شروع شروع میں ریڈیو کے لئے استعمال ہوئی تو اس پر بھی سب نے اعتراض کئے مگر بیس پچیس سال

[1] جنگ کے زمانہ میں ریڈیو کی مقبولیت کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۳۵ء میں ریڈیو لائسنسوں کی تعداد ہندوستان میں ۹۲۷۸۲ تھی اور فروری ۱۹۴۲ء میں یہ تعداد ایک لاکھ نوے ہزار تک جا پہونچی۔ بمقابلہ میں نومبر ۱۹۴۲ء میں چھیانوے لاکھ لائسنس لئے جا چکے تھے۔

کی محنت سے بعد بی بی سی کی زبان کو اب بجائے خود سند کا درجہ مل چکا ہے اور بی بی سی کا انگریزی تلفظ معیاری مانا جاتا ہے۔ ہندوستانی زبان عمر کے لحاظ سے انگریزی کے مقابلہ بالکل بچہ ہے۔ اس کی روایات اور تاریخی اسناد ابھی پوری طرح سے قائم نہیں ہوئیں۔ نئے خیالات اور نئے حالات کے لئے ہمارے پاس لفظوں کا کافی ذخیرہ نہیں ہے اس لئے ہماری زبان کا انگریزی، فرانسیسی، جرمن، عربی یا اسی قسم کی دوسری بلند پایہ اور قدیم زبانوں سے مقابلہ بے سود ہے۔ البتہ یہ ماننا پڑے گا کہ ریڈیو اور سینما نے ہماری زبان کو عام رواج دینے میں بہت مدد دی ہے اور اعتراض کرنے والوں کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ ریڈیو کی زبان بولنے کی زبان (spoken language) ہے۔ یہ زبان علمی اور ادبی نہیں۔ اس میں انہیں لفظوں اور ترکیبوں کی کھپت ہو سکتی ہے کہ جن کا چلن عام ہے۔ غیر مانوس اور ثقیل لفظوں کو ہوا کی لہروں پر چاہے کتنی بار دہرایا جائے عوام انہیں ہرگز قبول نہیں کریں گے اور علم زبان کا یہ پہلا اصول ہے کہ جب لفظ پر قبولیت عام کی مہر نہ لگے وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ نئے خیالات اور نئے حالات کو ادا کرنے کے لئے ہم قدیم زبانوں کے مُردہ لفظوں کو زندہ کرنے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اور اس میدان میں ایران و عرب سے مانگی ہوئی غیر مانوس ترکیبیں ہمارے کام آ سکتی ہیں۔ سائنس کی نئی ایجادیں اپنے نام اپنے ساتھ لائیں گی۔ جنگ کے نئے ہتھیار جن ملکوں نے ایجاد کئے ہیں ان کے نام بھی ہمیں ان ہی ملکوں سے مانگنے پڑیں گے۔ ہندوستان کی سڑکوں پر جب ٹینک چلیں گے تو مجبوراً ہمیں انہیں ٹینک ہی کہنا پڑے گا۔ اور جو شخص ایٹم بم کا ترجمہ کرنے کی کوشش کریگا اس کی محنت کا جوہر بیکار جائے گا۔ ریڈیو سیٹ کے لئے آلہ نشر، نشر الصوت۔ لاؤڈ اسپیکر کے لئے آلہ مکبر الصوت اور اناؤنسر کے لئے معلن کے لفظ اگرچہ ہم اپنے ہمسایہ ملکوں سے ادھار لے سکتے ہیں مگر سوال یہ ہے کہ جب ہمیں ایک نیا لفظ اپنی زبان میں شامل کرنا ہے تو ایسا لفظ کیوں نہ لیں کہ جسے زیادہ سے زیادہ لوگ سمجھ سکیں اور جس کا تلفظ ہمارے کانوں پر گراں نہ گزرے۔

ہمیں ریڈیو کا شکر گزار ہونا چاہیئے کہ اس کی بدولت ہماری زبان کے سرمایہ میں اس قدر لفظوں کا اضافہ ہو گیا اور اسی بہانہ سے ڈبکنی کشتی، ہوا مار توپ، کٹ پتلی گورنمنٹ، دور پورب اور ناطرفدار جیسی ترکیبیں ہماری زبان میں شامل ہو گئیں۔ بی۔ بی۔ سی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے انگلستان والوں کے لئے ایک معیاری زبان قائم کی ہے۔ چنانچہ ویلز یا یارک شائر کے رہنے والے گھر میں اپنی اپنی بولی (mother tongue) بولتے ہیں۔ لیکن جب اپنے گھر سے باہر دوسرے علاقے کے رہنے والے سے بات چیت کرتے ہیں تو انکی زبان بی بی سی کی تقلید کرتی ہے۔ کاش ایسا وقت ہمارے ملک میں بھی آ جائے کہ آل انڈیا ریڈیو کی زبان تقلید کے قابل معیار کا درجہ حاصل کر لے۔[1]

ریڈیو کے وقت کا زیادہ حصہ موسیقی کی مد میں صرف ہوتا ہے چنانچہ سنہ ۱۹۴۳ء کی رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ سال بھر میں دلی ریڈیو نے چھ ہزار پانسو اڑتالیس گھنٹے کا پروگرام براڈکاسٹ کیا اور اس میں دو ہزار چھ سو پندرہ گھنٹے ہندوستانی موسیقی کے تھے۔ ہندوستانی گانا سننے والے بھی دو گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں اور کچے اور پکے گانوں کا جھگڑا کسی طرح بھی اُردو اور ہندی کے قضیئے سے کم نہیں۔ مگر اس کا کیا علاج کہ عوام کا رجحان سینما کی بدولت پکے گانوں کی طرف کم ہے اور اسی لئے ہر ریڈیو اسٹیشن اس جنس کو زیادہ پیش کرتا ہے کہ جس کی پبلک میں مانگ زیادہ ہے۔

ایک اور اعتراض ریڈیو کے پروگراموں پر یہ ہے کہ آل انڈیا ریڈیو کے سب اسٹیشن ایک ہی وقت میں ایک ہی قسم کا پروگرام براڈکاسٹ کرتے ہیں اور دہلی۔ لکھنؤ۔ لاہور اور پشاور کے پروگراموں میں مشکل سے کوئی فرق ملتا ہے۔ یہ ایک بہت بڑی کمزوری ہے اور پروگرام بنانے والوں کو اس کھائی سے نکلنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اس کی صورت یہی ہے کہ ہر اسٹیشن اپنی مقامی خصوصیات قائم کرنے اور پروگراموں کی ترتیب اس ڈھنگ پر قائم کی جائے کہ کم از کم شمالی ہندوستان کے سننے والے اگر چاہیں تو مختلف قسم کے پروگرام سن سکیں۔ اس بات کے لئے موسیقی سے ہٹ کر دوسری تفریحی اور اصلاحی مدوں کو وسعت دینی پڑے گی۔ اس سلسلہ میں بی۔ بی۔ سی اور امریکی ریڈیو اسٹیشنوں نے بہت سی بار آور کوششیں کی ہیں اور ہم بہت کچھ ان سے سیکھ سکتے ہیں۔ پروگرام میں تنوع پیدا کرنے کے لئے تقریروں۔ ڈراموں۔ دیہاتی پروگراموں اور تعلیمی پروگراموں کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ ڈرامے کے میدان میں آل انڈیا ریڈیو نے بہت نمایاں ترقی کی ہے مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ دوسری مدوں میں ابھی ہم مغربی ملکوں کے مقابلے میں

---

[1] ۲۴ فروری ۱۹۴۶ء کو گورنمنٹ آف انڈیا نے سلطان احمد کمیٹی کی رپورٹ آل انڈیا ریڈیو کی ہندوستانی زبان کے بارے میں ... ہندوستانی زبان کو معیاری درجہ حاصل کرانے کیلئے اس کمیٹی کی تجویزیں قابل داد ہیں۔

پیش نہیں کر سکتے۔ ان میں ترقی کی گنجائش ہے اور یہ میدان ریڈیو کے لئے ابھی نیا ہے۔

ریڈیو کے پروگراموں میں یک رنگی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ آل انڈیا ریڈیو کے تمام اسٹیشن ایک مرکزی نظام کے ماتحت ہیں اور اسٹاف کو اس بیدردی سے ادلا بدلا جاتا ہے کہ کسی ایک اسٹیشن کا کوئی خاص مقامی رنگ قائم نہیں ہونے پاتا اور قسم قسم کے رنگ مل کر ایک عجیب قسم کی بدرنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر ہر صوبہ کے ریڈیو اسٹیشن کا نظام صوبجاتی گورنمنٹ کے ہاتھ میں ہو اور اس پر کام کرنے والے اپنے صوبے کی مخصوص روایتوں کو قائم رکھنے کے ذمہ دار ٹھہرائے جائیں تو یقین ہے کہ ہر اسٹیشن مقامی رنگ قائم رکھ سکے گا۔ فی الحال تو اکثر صوبجاتی مرکزوں پر ایسے افسروں کا تعین ہے کہ انہیں اس صوبہ کی روایات سے کوئی ہمدردی نہیں ہو سکتی۔ مثلاً اگر کلکتہ میں پنجاب کے رہنے والے اسٹیشن ڈائرکٹر ہیں تو بمبئی میں پشاور کے ایک بزرگ، اور دہلی میں بمبئی کی ایک خاتون۔ کچھ عرصہ ہوا کہ مدراس میں صوبہ سرحد کے ایک باشندے کو اسسٹنٹ اسٹیشن ڈائرکٹر کے طور پر تعینات کیا گیا تھا۔ حالانکہ انہیں وہاں کی زبان یا صوبجاتی ضرورتوں سے دور کا واسطہ بھی نہیں ہو سکتا۔

اس مرکزیت کا اثر خبروں پر بھی پڑتا ہے اور مقامی خبریں اکثر نظر انداز کر دی جاتی ہیں۔

مستقبل اگر صوبجاتی ریڈیو مرکزوں کا نظم و نسق صوبجاتی حکومتوں کے ہاتھ میں آگیا تو جن صوبوں کو اب تک مرکزی حکومت سے بے رخی کی شکایت رہی ہے، یہ بھی جاتی رہے گی۔ ہندوستان جیسے بڑے ملک کے لئے ریڈیو کے محکمے کا مرکزی رہنا سخت غلطی ہے۔ کیونکہ چالیس کروڑ باشندوں کی ضرورتوں اور ہر صوبے کی لسانی اور سماجی گتھیوں کا ایک حل ناممکن ہے۔ ریڈیو اب اس منزل سے گزر چکا ہے کہ جب اسے صرف تفریح اور دلبستگی کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ آئندہ ہماری قومی ترقی کے لئے ریڈیو ایک زبردست ہتھیار کے طور پر استعمال ہوگا۔ ہر صوبے کی گورنمنٹ اپنی ترقی کا علیحدہ اصلاحی پروگرام بنائیگی۔ اور اس پروگرام کی اشاعت کے لئے اُسے اپنے ریڈیو پر اور اُس کی پالیسی پر پورا اختیار ہونا چاہیئے۔ دوسرے صوبجاتی ریڈیو مرکز سننے والوں کے لئے بہترین پروگرام اسی صورت میں پیش کر سکتے ہیں کہ ان میں آپس میں مقابلہ ہو اور یہ مقابلہ موجودہ مرکزیت کے دور میں صرف تنخواہوں اور عہدوں کی ترقی کی دوڑ بن گیا ہے۔

صوبجاتی خود مختاری کے باوجود دہلی ریڈیو کی مرکزی حیثیت ایک حد تک قائم رہ سکتی ہے۔ اس وقت ہزاروں ہندوستانی مشرقی افریقہ، جنوبی افریقہ، برما اور ملایا کے علاقوں میں آباد ہیں۔ دہلی ریڈیو ان سمندر پار کے ہندوستانیوں کے لئے باقاعدہ پروگرام براڈکاسٹ کر سکتا ہے۔ یہ ہندوستانی بھائی غیر ملکوں میں رہنے کے باوجود ہندوستان سے رشتہ قائم رکھنا چاہتے ہیں لہٰذا اس رشتے کو قائم رکھنے کے لئے ریڈیو بہترین ذریعہ ہے۔

ہندوستان کے تمام ریڈیو مرکز آل انڈیا براڈکاسٹنگ فیڈریشن کی شکل میں جمع ہو کر آپس کے مسئلوں کو حل کر سکتے ہیں۔ اور اس ادارے میں ہندوستانی ریاستیں بھی شامل ہو سکتی ہیں۔ ہندوستان جیسے غریب ملک کے لئے ریڈیو لائسنس کی فیس دس روپے سالانہ بیحد زیادہ ہے۔ فیڈریشن میں اس سوال کو بھی طے کیا جا سکتا ہے۔ سستے اور عمدہ ریڈیو سیٹوں کی ملک میں مانگ ہے اور فیڈریشن کے پروگرام میں ریڈیو کی صنعت کو ترقی دینا بھی شامل ہونا چاہیئے۔

بہرحال ہندوستان کے سیاسی دستور میں آئندہ تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ آل انڈیا ریڈیو کی موجودہ حیثیت پر ضرور اثر پڑے گا۔[1] اور ہمیں امید رکھنی چاہیئے کہ ہندوستان میں قومی حکومت قائم ہونے کے بعد اس زبردست طاقت کا صحیح طور پر استعمال کیا جائے گا۔ پچھلے دس سال کے اندر ریڈیو ترقی کی بہت سی منزلیں طے کر چکا ہے، اب وقت آگیا ہے کہ ہم ماضی کا جائزہ لیں اور مستقبل کے لئے ایسا راستہ بنائیں کہ جو دیرپا اور مفید ہو۔ جنگ نے ریڈیو کی ہنگامی ترقی میں بہت مدد دی ہے مگر یہ ترقی دیرپا بنیادوں پر قائم نہیں ہوئی۔ اب ریڈیو کے سیلاب کا زور اتر چکا ہے مگر اس سیلاب نے جن میدانوں میں راستے بنا کے ہیں ان پر ہم مستقل عمارتیں قائم کر سکتے ہیں۔ یکم جنوری ۱۹۳۶ء کی نحیف اور کمزور آواز آج ہاتھی کی چنگھاڑ بن چکی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس ہاتھی کے دانت صرف دکھانے کے ہیں یا نہیں کھانے کے لئے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے؟

---

[1] پاکستان میں براڈکاسٹنگ کے سوال پر میں نے ایک اور مضمون میں بحث کی ہے جو انگریزی اخبار "ڈان" کی اشاعت بابت ۲۰ ر اکتوبر ۱۹۴۶ء میں شائع ہو چکا ہے۔

پرتھوی ناتھ شرما

رات کی رانی

...اور اب وہ پھر رات کی رانی کے جھنڈ کے پاس بار بار کی بیہودگی سے چڑ گئی ہوئی کھاٹ پر آکر بیٹھ گیا تھا۔ اور وہ مست خوشبو اس کے نتھنوں میں ٹھونس ٹھونس کر تروتازگی بھر رہی تھی۔

سرد اور گھٹے گھٹے کمرے میں اضطراب انگیز سینے پر جیسے کوئی ہتھوڑے کی ضرب سی لگا رہا تھا۔ اور اس کی ماں چولھے کے پاس آگ سینکتے سینکتے اونگھ رہی تھی۔ سفید راکھ میں چند سرخ انگارے چمک رہے تھے اور باقی بجھ چکے تھے۔ پاس والے مکان میں پنڈت جی نے پرماتما کی تعریف میں گا کر لمبا چوڑا بھجن ختم کر دیا تھا۔ اور کتے کی کرخت تنقید بھی سرد پڑ چکی تھی۔ سڑک پر سفید کپڑوں میں فقیروں کی زندہ لاشیں بیمار درد کا سبق دہرا کر نیند کے حول میں گھس گئی تھیں۔ شہر کا دل آہستہ آہستہ سرد پڑتا جا رہا تھا۔ اور رات کی رانی کا دل مگن ہو کر کھل رہا تھا۔ اس کی مہک خاموشی کے ساتھ اندھیرے میں سوچنے والے انسانوں کو امید دلا رہی تھی۔ ہر کالے بادل میں ایک سفید بجلی بھی ہوتی ہے۔ اور ہر شہر کی ہر کسی گلی میں رات کی رانی کا ایک جھنڈ ہے۔ یہ حقیقت در حقیقت کا لازوال جز ہے...

دنیا رات کی رانی کی مہک سے بے نیاز اپنے سالوں پرانے بستر میں میلے لحافوں کو اوڑھے سو رہی تھی۔ شیل کی ماں خود چولھے کے پاس بیٹھی بیٹھی اونگھ رہی تھی۔ لیکن شیل کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ اور روز کی مانند رات کی رانی کی خوشبو اس کے نتھنوں سے آکر ٹکرا رہی تھی۔ اور اس کی شعور کی سطح پر ننھے ننھے سفید دھبے زیادہ شدت کے ساتھ چمک رہے تھے۔ ان کی روشنی فزوں سے فزوں تر ہوتی جا رہی تھی۔ سفید دھبے پھیلتے جا رہے تھے اور سیاہ دھبے تنگ پڑتے جا رہے تھے۔ یہ روشنی اور سائے کا کھیل نہیں تھا۔ بلکہ موکا۔ وہ بہت خوش تھا۔ اس کی خونی رات کی رانی کے موافق مہک رہی تھی۔ اور وہ نتھنے پھیلا پھیلا کر مہک کو زیادہ سے زیادہ مقدار میں خیالات کی تعفن بھری کوٹھری میں گھسنے کی دعوت دے رہا تھا۔

ماں کو چولھے کے پاس آگ سینکتے سینکتے اور شیل کو لحاف کے اندر رات کی رانی کی خوشبو سونگھتے سونگھتے گھنٹہ بھر سے زیادہ ہو چلا تھا۔ اس کی ماں نہ جانے گھنٹہ بھر پہلے بکواس کر کے خاموش کیوں ہو گئی تھی۔ یہ اسے معلوم نہیں تھا۔ لیکن اس گھنٹہ بھر پہلے کی بکواس نے اس کا دماغ خراب کر دیا تھا۔ اس نے ارادہ تک کر لیا تھا کہ وہ ایک بھاری گرز کے ساتھ قدرت، خدا اور انسان کے مابین کھڑی ہوئی دیوار کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے توڑ ڈالے گا اور خود خدا سے سوال کرے گا کہ آخر اس کی ماں کا دماغ اتنا خراب کیوں ہے۔ وہ خدا کی بچی کیوں نہیں صحیح طریقہ سے سوچتی ہے

دن بھر بڑبڑاتے رہنا، ریکارڈ ہے کہ سوئی چڑھنے کے بعد بولنے سے نہیں رکتا۔ کوئی بات بھی ہو۔ آج پھر گلی میں باجہ بجا تھا۔ پی پی پی۔ پوں پوں... اور اس کی ماں کا دماغ یکلخت گرم ہو گیا تھا۔ اس عورت کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئی تھیں۔ اور پھر ریکارڈ شروع ہو گیا تھا۔

"آج پھر باجہ بج رہا ہے شیل ــــ قسمت والوں کے ہاں بجا ہے باجہ"

"ہاں ماں۔ تاکہ بدقسمت لوگوں کے کان کے پردے پھٹ جائیں۔ اس باجے کو سنتے سنتے میرے کان پک چلے۔ کہیں میں بہرہ نہ ہو جاؤں۔ مرنے میں بھی باجہ اور خوشی میں بھی باجہ۔ سماج نے لوگوں کو بہرہ بنانے کا ٹھیکہ لے لیا ہے" شیل نے لحاف سے منہ نکالتے ہوئے کہا۔

"کلچھنے۔ شادی کے ساتھ موت کا کیا ذکر۔ جب دیکھو الجھن بھری بات کرتا ہے۔ کبھی عقل بھی آئے گی تجھے۔ جب میں نرک لوک میں پیاسی ماری ماری پھروں گی تو مجھے پانی کون دیگا"

"نہیں ماں۔ اور میرے بعد۔ اور میرے بعد..."

"تیرے بعد ــــ تیرے جیتے تو پانچ پانچ بچوں کے باپ ہو گئے۔ اور تو میرے کلیجے کو کھائے جا رہا ہے۔ تجھے پرماتما نے کیسا بنایا ہے۔ ماں پر دیا نہیں آتی ــــ"

اور شیل نے تھوڑی دیر سوچا۔ آخر اس نے ماں پر ایسا کونسا ظلم کیا ہے۔ بس یہی کہ وہ اسے سخت محنت اور مشقت کے بعد ریشمی ساڑی نہیں پہنا سکا۔ اس کٹے گھٹے گھر کو چھوڑ کر ہوادار مکان میں نہیں لے جا سکا۔ اور وہ اپنی ماں کو روز دودھ نہیں پلا سکا اور... سونے کے زیور نہیں گھڑا سکا۔ اور... بس یہی ظلم ہے جو اس نے اپنی ماں سے روا رکھا ہے۔ لیکن وہ کرے بھی کیا۔ اس نے اپنی ماں کے ساتھ کوئی ظلم نہیں کیا ہے۔ اس نے اپنے ساتھ بیشک ناانصافی کی ہے۔ اس نے دونوں کے ساتھ ناانصافی نہیں کی ہے۔ لہذا اس نے اپنی ماں کا کلیجہ نہیں کھایا ہے۔ اس سطح کو ہرگز ہرگز خیالات کی تلواروں سے نہیں نوچا ہے۔ جس سے ذرا اوپر چڑھ کر اس نے دودھ پیا ہے، اور زندگی کا پہلا سبق سیکھا ہے "یہ کیا کہتی ہو ماں میں نے تمہارا کلیجہ نہیں کھایا۔ سچ مچ تم کو غلط فہمی ہو گئی ہے۔ میرا فرض ہے کہ جہاں تک ہو سکے تمہاری خدمت کرتا رہوں"

"خدمت۔ رام کرے میں اٹھ جاؤں۔ یہ باجے والے کمبخت جان جان کر بجاتے ہیں۔ میرا بس چلے تو ان کے باجوں کو توڑ ڈالوں۔ پچیس سال سے اس گھڑی

کے لئے ترس رہی ہوں"

"اس گھڑی کے لئے جب باجہ بجے۔ یہ کون سی بات ہے؟ میں بھی ایک دن دو تین آدمیوں کو بلالاؤں گا اور کہوں گا خوب باجہ بجاؤ۔ میری ماں اپنے دروازے پر باجہ بجتا ہوا سننا چاہتی ہے۔ اس کی طبیعت باغ باغ ہو جائیگی۔ زور سے بجاؤ یارو اور زور سے ..... آؤ باجے والو تم کو میری ماں کی خوشی منظور نہیں ہے۔ لے یارو ...."

"چپ گدھے۔ اس طرح کام چلتا ہے۔ برات چڑھے، سمدھنیں آرتا کریں۔ دلہن دروازے کی طرف ہار لیکر بڑھے۔ ڈیوڑھی پر باجہ بجے۔ اڑوس پڑوس والے دیکھیں، گلی چلتے راہگیر رک جائیں۔ پھلجڑی چھوٹے۔ اور دعوت ہو۔ اور ....." اور کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ گاڑی یکایک رک گئی۔ نچلے نہ بیٹھنے والے مسافر کو کھلی ہوئے جنگل کی ہوا کھانے کا موقع ملا۔

"اور پھر بچے ہوں۔ ان بچے کے بچے ہوں۔ اور ان بچوں کے بھی بچے۔ پتروں کو پانی ملے، اور ساری دنیا میں شانتی کا راج ہو جائے۔ بھگوان تیری مایا اپار ہے۔ تو ہی سب دکھوں کا نشٹ کرنے والا ہے۔ دیالو پرمیشور تیری مایا اپرمپار ہے۔ چلتا رہے سرشٹی کا چکر ....."

"بے شرم۔ کیوں اپنی زبان کو زیادہ کھول رہا ہے۔ انہیں لچھنوں کی خاطر تو تیری اب تک شادی نہیں ہوئی۔ پہلے لوگ ہاں لڑکی کے باپ والوں کے سامنے کاجل ڈال کر منہ ہاتھ دھو کر۔ نئے کپڑے پہن کر سلیقے سے بیٹھتے تھے چپ چاپ۔ اور تو ہر دفعہ سیدھے سادے کپڑے پہن کر بیٹھ گیا۔ اور اول فول بکنے لگا۔ اب موج کر و بیٹا۔ لڑکیاں کوئی شہین میں تو بنتی نہیں ہیں۔"

"ہاں موج تو کروں گا ماں۔ تو بتلا میں کب غلط طریقہ سے لڑکی کے باپ کے سامنے جا کر بیٹھا۔ میں نے ہر ایک کو ٹھیک آدمی سمجھ کر بات کی۔ میں ہر وقت یہی سمجھتا رہا کہ وہ میرے کپڑے اور اجلے لباسوں کو دیکھنے نہیں آئے ہیں۔ بلکہ میری لیاقت اور سیرت کا مطالعہ کرنے کے لئے تشریف لائے ہیں۔ لیکن تھے تمام کے تمام بیوقوف۔ انہوں نے بیرونیات 'میرا مطلب' باہر والی باتوں کو دیکھا۔ اس میں میرا قصور ـــ کیا کیا خوبصورت باتیں کرتے ہیں لوگ ... کیوں جی تمہارا گھر کا مکان ہے آپ نیکٹائی اور سوٹ پہنتے ہیں۔ میری لڑکی کو سینما کا شوق ہے آپ کو ہے؟ میری لڑکی نے میٹرک پاس کیا ہے۔ وہ فرفر انگریزی بولتی ہے۔ میری لڑکی میز پر کھانا کھاتی ہے۔ میری لڑکی بچے خود نہیں کھلائے گی۔ میری لڑکی یہ ہے اور میری لڑکی افلاطون ہے اور ارسطو ہے۔ سمجھے جناب، لیکن میری لڑکی ہرگز ایک صحیح قسم کی بہو بننے کے قابل نہیں ہے۔ میری لڑکی کھانا پکانا نہیں جانتی۔ میری لڑکی ساس کی خدمت سے گریز کریگی۔ میری لڑکی خاوند کو جاتو لیجانے کے لئے مجبور کر نا نہیں سکتی ہے۔ میری لڑکی اتنی ہمت والی نہیں کہ برے دنوں کو صبر سے کاٹ سکے۔

..... بس تم ہی بتاؤ ماں جب ان باتوں میں کسی ایک کی لڑکی بھی ... ٹھیک بیٹھ کی اہل نہیں تھی تو میں شادی کر کے کرتا ہی کیا۔ وہ تو تمام مشروط مطلب یہ کہ شرط باندھ کر گرہست میں داخل ہونا چاہتی تھیں۔ گرہست میں کوئی شرط ہوتی ہے۔ کوئی نہیں سوائے اس کے کہ سکھ اور دکھ میں جیون کسی نہ کسی طرح ہمت کے ساتھ بیت جائے، اور بس ...."

بے صبر ماں نے بیچ میں ہی دیا کھیان میں دخل در معقولات کی۔ "انوپ کمار کو بھول گیا بیٹا۔ اس نے کیا کہا تھا معلوم ہے بھلا؟"

"انوپ کمار تیسویں آدمی تھا ماں۔ اس نے جو کچھ کہا تھا ٹھیک ہی کہا تھا۔ لیکن ....."

"تو نے انکار کر دیا۔ اب وہ لڑکی بھی بیاہی گئی۔ تو نے انکار کی رٹ لگا دی، نہیں، نہیں!! نہیں!! بس ہر ایک کو انکار کر دیا۔ انوپ کمار کی لڑکی سب طرح سے چوکس تھی۔ تو نے نہیں دیکھا اس کو۔ تو ہی بتلا۔ کیا کمی تھی اس میں۔ سوہنی سندر، روپ وتی سوشیل، بھولی اور سمجھدار۔ آج میرا گھر اس سے چمک جاتا۔ لچھمی کو لات مارنا اچھا نہیں۔ تو نے کتنی بار لکشمی کو لات ماری ہے۔ جبھی تو اس گھر میں دلدر کا پہرہ ہے۔ لڑکی، سونے کا ڈلا ....."

"ہاں تھا تو سونے کا ڈلا لیکن تجوری چاہیئے تھی رکھنے کے لئے۔ میں نے شروع شروع میں سوچا بھی کہ چلو شادی کر لوں، ماں بہت دنوں سے آس لگائے بیٹھی ہے، اس کا تمام دکھ دور ہو جائیگا۔ گو میں نہیں سمجھتا کہ دکھ تم کو تھا یا مجھے۔ پھر بھی میں نے ایک بار سوچا کہ میں شادی کر لوں۔ لیکن نہ معلوم کیوں پھر ٹھیک راستے پر پڑ گیا۔ شادی کر لینا تو آسان تھا لیکن شادی کے بعد اس ہرے بھرے پھولوں کی طرح شگفتہ جسم والی لڑکی کو کیا میں سکھ پہونچا سکتا تھا۔ ہرگز نہیں۔ اس کا کنول سا چہرہ مرجھا جاتا۔ گھر کا کام کاج کرتے کرتے وہ تھک کر چور ہو جاتی۔ اس کی مسکراہٹ مرجاتی اور گیت فنا ہو جاتے۔ یہ سب بات مجھے اچھی نہیں لگتی۔ میں کسی پھول کو مرجھاتا ہوا دیکھنا نہیں چاہتا۔ اور اب اس لڑکی کا بیاہ ایک اچھی جگہ ہو گیا ہے تو میں بہت خوش ہوں۔ کم از کم وہاں اسے اچھا کھانا نصیب ہوگا۔ اچھے کپڑے پہنتی ہوگی۔ اس کی باہوں میں سرخ خون جھلکتا ہوگا۔ چہرہ میں دمک ہوگی۔ فیروزی رنگ کی ساری پہن کر اس کا بدن کتنا کھلتا ہوگا۔ ایسا!......؟

"چل پرے ـــ بکواس کرنے کے سوائے اور کچھ سیکھا بھی ہے۔ تو خود ساری لا کر پہناتا تو کیا وہ جچتی نہیں۔ پرماتما نے دو ہاتھ دو پاؤں دئے ہیں۔ ہاتھوں سے کماتا اور پاؤں سے چل کر ساری خرید کر لاتا۔ چالیس پچاس روپلی پر ہی صبر کئے بیٹھا ہے۔ دنیا میں لوٹ کھسوٹ مچ رہی ہے اور تو اپنی ایمانداری کا ہی پر صبر کئے بیٹھا ہے۔ ساری عمر ایماندار بنا رہیو۔ نہ شادی ہو نہ بیاہ۔ جگہ جگہ

حوصلہ کیا مجھکو جو تم ... سے ہر روز پوچھتی ہیں۔ شیلو کی کہیں منگنی ہوئی۔ اے لڑکا اتنا بڑا ہو گیا۔ کچھ تو خیال کرو اس کا۔ ان نیولی کو ٹھے والیوں کے پاس جانے لگا تو گھر کا ستیاناس کر ڈالے گا۔ مجھے تو فکر لگ گیا ہیں۔ تیری نہیں نہیں نے میرا کلیجہ چاٹ لیا۔ اب میں کہاں جاؤں۔ ہائے ... میں تو مر گئی رے۔ مجھے اٹھالے پرمیشر۔ اب میں کیا کروں" ماں نے چھاتی کوٹنی شروع کر دی۔

"چھاتی نہ کوٹ ماں۔ آئندہ جو کوئی آئے گا اس سے ہاں کہہ دونگا"

"تیرا کیا بھروسہ..." ماں نے اپنے مگرمچھی آنسوؤں کو رد کرتے ہوئے کہا "اچھا۔ پرماتما کرے تیرے منہ سے ہاں نکلے..."

اور پھر وہ خاموش ہو گئی۔ اس کے ذہن سے ایک بھاری بوجھ ہٹ گیا۔ ناچتے ناچتے وہ اونگھنے لگی۔ لیکن شیلی کا دماغ زہر آلود ہوتا گیا۔ آخر سماج کو کیا حق تھا کہ وہ اس کی چالیس پچاس روپے کی نوکری کی طرف کھچ کر لڑکیوں کے باپ کے روپ میں چلتی ہی چلی آئے۔ اگر ماں پرانے خداؤں کو پوجتی ہے تو اسے کیا ضرورت ... اگر اس کی قسمت میں تنہائی کا راگ لکھا ہے تو اس میں ماں چھوڑ ساری سماج دخل در معقولات نہیں کر سکتی۔ لوگ باگ اپنی لڑکیوں کو غریب آدمیوں کے ساتھ شادی کے دھاگے میں باندھ کر بعد میں روتے رہتے ہیں۔ کہ ان کی لڑکی کو سکھ نہیں ملتا۔ انہوں نے فلاں آدمی سے اپنی لخت جگر نور چشمی کی شادی کر کے سخت نالائقی کی ہے۔ رام کی بیٹی خاوند کے ساتھ موٹر میں سیر کرتی پھرتی ہے، اور شیام کی بیٹی چولھا جھونکتی ہے۔ ساس کو گالیاں دیتی ہے اور خاوند سے پٹتی ہے۔ رام کی لڑکی کی گود میں بچہ نہیں ہے۔ اور شیام کی لونڈیا چار چار دبلے مرگلے بچوں کی ماں ہے..... اور اجتماعی طور پر سب مطمئن نظر نہیں آتے۔ یہ بہت دکھ کی بات ہے۔ ذرا سوچو اگر وہ کالج سے بی۔ اے پاس کرتے ہی تحصیلدار کی سانولی اور موٹی قسم کی لڑکی کا رشتہ اس شرط پر منظور کر لیتا کہ اسے ایک رشوت سے بھرپور ملازمت کو قبول کرنا پڑے گا تو اس کی زندگی میں سکھ نصیب ہوتا۔ کبھی نہیں۔ تحصیلدار کی سانولی موٹی قسم کی لڑکی ہر وقت اپنے باپ کے احسان کا گیت گاتی رہتی۔ اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، سوتے جاگتے۔ ہاں بابا یہ تمہارے باپ کی ہی بدولت ہے۔ ان داتا، مائی باپ، حضور بندہ پرور تمہارے سنگ مرمر ایسے ہاتھوں کی قسم آج میں تمہاری بدولت ہی زندہ ہوں۔ میری بری دنوں کی ساتھی ——— جی، اسی طرح ان داتا کی خوشامد کرتے کرتے اس کے دن پست ذہنیت کے شکار ہو کر نہایت ذلیل طریقہ سے گذر جاتے۔ سانولی موٹی سی لڑکی اس کے بکھرے خیالات کو سیاہی میں ڈبو ڈالتی اور بینک کے دبلے پتلے کلرک کی دبلی پتلی سینک سی لرزہ براندام لڑکی باپ کو اس کے پاس ہرگز نہیں آنے دیتی۔

"بینک کی نوکری پسند ہے؟"

"جی نہیں۔ سنا ہے آدمی کو نامرد بنا دیتی ہے۔ دن بھر خوب رگڑائی ہوتی ہے، اور رات کو تھکن کے مارے سونے کے سوائے اور کچھ نہیں سوجھتا"

"بہرحال کچھ تو کریں گے آپ"

"ہاں خالی بیٹھے کبوتروں کی ٹولیاں تو لڑانی نہیں ہے۔ کچھ نہ کچھ تو کروں گا ہی"

"اچھا نمستے!"

"نمستے!"

سینک ایسی پتلی لڑکی بھی لاشعور میں ڈوب گئی۔ اور آہستہ آہستہ یکے بعد دیگرے کتنی ہی اور لڑکیاں سطح سے ابھرنے لگیں۔ ہر ایک رنگ جدا تھا۔ ہر بات جدا اور ہر رنگ جدا۔ اگر کوئی بھجن کیرتن کی شوقین تھی تو اسے پرماتما کی خاموشگی میں دلچسپی تھا۔ اگر کسی کو ہارمونیم آتا تھا تو اسے گانے کی ایک لائن بھی یاد نہیں تھی۔ ایک صاحب بانگ دہل فرمانے لگے، کہ میری لڑکی نے دنیا کا سارا لٹریچر پڑھا ہے۔ اس کا یقین ہے کہ دنیا میں دو طرح کے منش ہیں ایک تو وہ جو عیش کرتا ہے اور دوسرا وہ جو عیش کرنے والوں کو عیش و عشرت کا سامان مہیا کرنے کے لئے خود فاقہ کرتا ہے اور دوسروں کو آرام پہونچاتا ہے۔ ٹھیک۔ اور اس کے بعد ایک صاحب چھاتا بغل میں دبائے ٹھیک دوپہر میں تشریف لائے۔ بدن سے پسینوں کے ساتھ ساتھ باتیں بھی خارج ہونے لگیں۔

"میں نے پہلی لڑکی کی شادی میں پینتالیس تولے سونا دیا تھا"

"بہت خوب"

"اجی ذرا رنگ پکا ہے۔ لڑکی ویسے ہوشیار ہے، تندرست، صحت مند، اور..."

"اور اب آپ کا کتنے تولے سونا دینے کا ارادہ ہے؟"

"کیا بتاؤں تین سو روپے کا لونڈا تھا نوکر، پینتالیس تولے سونا نہیں دیتا تو ناک کٹ جاتی۔ اب تو میرا ارادہ بیس تولے سونا دینے کا ہے"

"جی غلط۔ پینتالیس کو چھ سے تقسیم کیجئے۔ پچاس اور تین سو سمجھے۔ اگر کوئی لونڈا اتفاق سے چھ سو روپے ماہوار کماتا ہوگا تو آپ کو نوے تولے سونا دینا پڑیگا"

"جی ہاں، مجھے تو معلوم ہوا تھا آپ کی تنخواہ ڈیڑھ سو روپے ماہوار ہے۔ میں تو..."

"غلط خبر دی ہے کسی نے آپ کو"

سماج کا حساب کتاب چلتا رہا۔ اس کی پچاس روپلی کی نوکری کے لئے دہیز میں سونے کی اینٹ کے بجائے چاندی کی گھڑی تھی اور ریڈیو

کے بجائے سکینڈ ہینڈ گراموفون۔ اس کے لئے نگینے کی انگوٹھی کے بھی گھاٹے تھے۔ بغیر شیشے کے جڑا ہوا پلنگ۔ معمولی سا سوٹ۔ نقلی ریشم کی قمیص۔ ملمع ہوئے سونے کے بٹن ـــ براتیوں کے لئے میز کرسی کا انتظام ندارد.... بھئی مجھے تو لڑکی کے ہاتھ رنگنے ہیں۔ جیسا لڑکا مل جائے ٹھیک ہے۔ اُف۔ تو وہ چھٹا ہوا مال تھا۔ جب آدمی ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک جاتا ہے۔ تو اُسے مجبوراً ناقص قسم کا مال خریدنا پڑتا ہے۔ جب سماج میں شادی کے قابل امیر لڑکوں کی تعداد میں کمی پڑ جاتی ہے تب جا کر غریب لڑکوں کی باری آتی ہے۔ جی ہاں! انسان اس ذلت کو برداشت کرنے کے لئے بھی پیدا ہوا ہے کہ وہ چھٹا ہوا مال بنے۔ درجنوں امیر گھرانوں میں ٹکر کھانے کے بعد لوگ چار و ناچار احسان توڑنے کے لئے اس کے پاس آئیں۔ سراسر گراوٹ ہو اور کیا ہے۔ نہیں! شیل نے نہیں کا لفظ سیکھ لیا۔ وہ کتنا ہی کمتر انسان ہے لیکن وہ نہیں تو کہہ سکتا تھا۔ اس کا باپ معمولی آدمی نہیں تھا۔ وہ ستی مجسٹریٹ تھا۔ لیکن ساری دولت جوئے، شراب، عورت میں لُٹا گیا تھا۔ تب ہی اس کے خون میں برتری کی جھلک ہے۔ وہ اس طرح گر کر شادی نہیں کریگا۔ اور وہ ایک عظیم باہمت نہیں کے سہارے اپنی کمتری کے احساس کو دباتا رہا۔ آخر ایک روز ایک عاجز انسان اس کے دل کے دروازے کھٹکھٹاتے۔

"میں تمہارے دادا کو جانتا تھا۔ شریف آدمی تھے!"

"شکریہ"

"میرا نام انوپ کمار ہے، میں آپ کی خدمت میں اس واسطے حاضر ہوا ہوں ... "

"فرمائیے"

"میری ایک لڑکی ہے۔ سیدھی سادی غریب۔ اگر آپ اُسے منظور کریں تو تمہاری ماں سے آگے بات چلے"

"آپ کٹھ پتلیوں والے محلہ میں رہتے ہیں۔ میں نے آپ کا گھر دیکھا ہے۔ میں اکثر دفتر جاتے اُس راستے سے گذرتا ہوں۔ گلی کی طرف چھجا سا ہے۔ اونچی ڈیوڑھی۔ باہر کی طرف کھلنے والی بیٹھک میں اکثر ایک لڑکی اور ایک تین سال کا بچہ بیٹھے رہتے ہیں۔ وہ لڑکی مجھے نہایت نیک اور معصوم معلوم ہوتی ہے۔ آپ کی کسی رشتہ دار کی لڑکی ہے کیا ـــ ؟"

"نہیں تو میری ہی بچی ہے، شکنتلا"

"اوہ۔ اچھا آپ پان سے شوق فرماتے ہیں۔ میں اکیلا آدمی ہوں نوکر رکھنے کی ہمت نہیں۔ ابھی تھوڑی دیر میں گلی کے پنواڑی سے لے آتا ہوں ـــ"

"رہنے دو مسٹر شیل۔ تکلیف نہ کرو۔ تمہاری ماتا جی کہاں ہیں؟"

ماتا جی اوٹ میں بیٹھی سُن رہی تھیں۔ محبت کے جوش کے مارے انوپ کمار کے سامنے آگئیں۔ اور نمستے کا جیتے رہو جواب دیکر کم کر فرش پر بیٹھ گئیں۔

"میں نے تمہاری لڑکی دیکھی ہے جی۔ دیوی سمان روپ، ہمارے بھاگ..."

"اجی آپ شرمندہ کرتی ہیں"

انوپ کمار اور شیل کی ماں بات کرتے رہے۔ شیل کمرے سے اُٹھ کر تنگ صحن میں چہل قدمی کرتے کرتے اُن کی باتوں کو سنتا رہا۔ انوپ اور ماں کی باتیں بیٹھک میں بیٹھنے والی خوبصورت معصوم لڑکی سے مدغم ہوتی گئیں۔ جیوں جیوں انوپ اور ماں کی تعریف ایک مرکز کی طرف بڑھی تیوں تیوں شیل کے ذہنی اُفق پر لڑکی نکھر نکھر کر نمودار ہونے لگی۔ ایک صحیح قسم کی ہیوی۔ نیلی آنکھوں اور سنہری بالوں کا جاذب امتزاج نظر میں کھب جانیوالی شے، جسکی موجودگی سے جنت کی سرد ہواؤں اور کوثر و تسنیم کے فرحت بخش بہاؤ کا احساس ہو۔ ایک ایسا بُت جو خدا ایک دفعہ بنا کر رک گیا ہو تاکہ تکمیل کو شرمندہ نہ ہونا پڑے۔ آن! وہ سُرخ دھاریوں والے مرمریں ہاتھ۔ اہرام ابتدائی منازل کو طے کرتے ہوئے۔ ناک کے دونوں جانب کھلنے والے پھول ـــ ایک پھول، ایک احساس، ایک نغمہ، ایک بھینی خوشبو میں بسا ہوا خیال۔ اور یہ سب کچھ اُسے بنا کوشش کئے ہوئے مل رہا ہے۔ وہ اسی خوبصورت شے میں جذب ہو کر خود خوبصورت بن جائیگا۔ خوبصورت اور غیر مرئی اور آسمان کے دیوتا پھولوں کی بارش کرتے کرتے تھک جائیں گے۔ ماں کو زیادہ باتیں بنانے کی ضرورت نہیں۔ جھٹ منگنی پٹ بیاہ۔ دیر لگانا فضول ہے۔ بے سود اور بے مطلب۔ بس پھولوں کے مانند نازک دلہن کو آہستہ سے پلنگ پر لا کر رکھ دینا چاہیئے۔ اور اس کے بعد ـــ اس کے بعد ـــ اس کے بعد آسمان سے تارے توڑ کر بندوں کی طرح آویزاں کر دینے چاہئیں۔ سونے سے سنہری رنگ مانگ کر زلفوں کو رنگنا چاہیئے۔ ہاتھوں میں ہیرے کی انگوٹھیاں پاؤں میں پازیب، کان میں کرن پھول اور چوٹی میں گندھے ہوئے گلاب ناک کی نوک تک آیا ہوا سرخ گھونگٹ، گھونگٹ میں دلہن کو دیکھے جاؤ۔ بُری نگاہ پھول کی نزاکت کو مار دیتی ہے۔ چھوا اور مرجھایا۔ اس کا علاج یہ ہے کہ پھول چھوا ہی نہ جائے۔ اس کی شگفتگی مر جائے گی، اس کی خوشبو فنا ہو جائے گی۔ اور یہ مرجھا جائے گا۔ اہرام کے وقت کے حملوں کو سہتے سہتے تنزل پذیر ہو جائیگا۔ بہار کے بعد ویرانی کا عالم، ہو کا سناٹا، رات کے پچھلے پہر کتوں کے بھونکنے کی آواز اور چوکیدار کی جاگنے والوں کو جاگنے کی ہدایت ـــ ایک شے صرف

ہم تو یوں عزیز ہے کہ ہم اسے برباد کر ڈالیں۔ ہم پھول یوں پسند کرتے ہیں کہ انکو اپنے ہاتھوں کی ہتھیلیوں میں مسل ڈالیں۔ انسان ذلت کی چکی کے دو پاٹوں کے درمیان ایک بار نہیں ... ہزار بار فنا ہوتا ہے۔ عورت کوکھ بار بار مرتی ہے، مر کر جیتی ہے اور جی کر مرتی ہے۔ جتنی شے زیادہ خوبصورت ہوتی ہے اتنی ہی کروڑوں کھٹی زمانہ کی گردشیں اس کو پیس ڈالنے کا ارادہ کرتی رہتی ہیں۔ اور زمانے نے پہلے بھی اپنے عظیم کانوں کو آسمان کے نیچے کھنچے ... ہیں تاکہ ظلم کے خلاف احتجاج کی آواز سنائی نہ دے سکے۔

نہیں وہ یہ ظلم برداشت نہیں کر سکتی۔ قدرت بیوقوف ہے۔ آخر وہ اپنے آفریدہ کو کیوں اتنی کڑی اذیت اٹھانے کی سزا دیتی ہے۔ دھرتی کا سینہ بار بار گھلتا ہے دھرتی کے سینے کو بار بار کھنے سے دھرتی کی اذیت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ دھرتی کے سینہ پر ظالم انسان عتاب کے کلہاڑے چلاتا رہتا ہے۔ دھرتی ہانپتی ہے۔ دھرتی روتی ہے، دھرتی بےبس ہے۔ دھرتی کے سینے پر خیالات کے نیلگے کھڑے ہیں۔ انسان کی عیش و عشرت کے محلات قائم ہیں۔ دھرتی کو ... چاہیئے ہیں!

"تو پھر معاملہ طے سمجھو" ... نے کہا۔

"شیل سے پوچھو" ... نے جواب دیا۔

"جی نہیں میں مجبور ہوں" شیل نے جواب دیا۔ "شاید میں اس ذمہ داری کا اہل نہیں۔ میں اتنا بڑا بوجھ سنبھال نہ سکوں گا آپ کو بہت تکلیف ہوگی"۔

"نہیں تو" ... بولا۔

اور معاملہ ختم ہو گیا۔ شیل کی ماں عظیم با ہمت بہن کے سامنے خاموش ہو گئی۔ سمندر کی لہریں اوپر اٹھیں اور پھر سطح سے چمٹ کر رہ گئیں۔ سمروں کا راج ہو گیا۔ وقت حسب معمول تیزی سے گزرنے لگا۔ تیسویں آدمی کے بعد جو بیسواں آدمی نہیں آیا۔ ماں اپنے دکھ کو خاموشی کے ساتھ سہتی رہی۔ اس نے بیٹا میں کب تک چولہا پھونکوں گی، کب تک برتن مانجھوں گی۔ کب تک گھر کی جھاڑو دوں گی! شدت کے ساتھ سوچا کر بھی شیل سے نہ کہا۔ بلکہ وہ اندر ہی اندر جل کر راکھ ہو جانے کا سپنا دیکھتی رہی۔ نرک کے دیوتا اسے جلتی ہوئی بھٹیوں میں کھینچ کر ڈالنے لگے۔ وہ غیر مرئی بن کر جگہ جگہ پیاس کے مارے تڑپنے لگی۔ اس کا حلق جلنے لگا۔ اس کے دماغ کے باریک ریشے آپس میں ٹکرا ٹکرا کر گرم ہونے لگے۔ لیکن تب بھی وہ چپ رہی۔ تب بھی وہ کڑھتی رہتی۔ لیکن گلی میں کمبخت شادی کا باجہ بجا۔ پرانی بات نئی ہو گئی۔ بات پر بات اٹھی۔ شیل کا دماغ گرم ہوتا گیا۔ خیال سوجھ گیا۔ اور بغاوت کا جذبہ برانگیختہ ہو ... لگا۔ اگر اس کا بس چلے تو وہ خدا اور انسان کے درمیان کھڑی دیوار کو چکنا چور کر دے اور خدا سے جا کر کہے کہ ماں کا دکھ بیکار ہے، اگر وہ کسی خوبصورت شے کے ساتھ ظلم روا رکھنا نہیں چاہتا تو سماج ایسا کیوں چاہتی ہے۔ کیا دنیا کا سارا نظام ظلم کی بنیادوں پر رکھا گیا ہے۔ کیا ظلم محرک ہے۔ رحم ایک اضافی شے ہے اور بزدلی کا منبع ۔۔۔ کاش اس کے اس رحم کے باوقار جذبہ کو کوئی سمجھے، کوئی جانے۔ اسے اپنے قدم چھوانے کی تمنا نہیں۔ اسے صرف اپنا کیس دنیا کے سامنے رکھنا ہے۔ رحم اور انصاف کے دیوتاؤں کے سامنے پیش کرنا ہے۔ آگ کے پاس بیٹھی ہو گھلتی ہوئی ماں کو بچانے کے لئے سارے نظام قدرت، نظام شمسی کے سامنے رکھنا ہے۔ خدا نام ہے محبت اور رحم کا۔ ایک محبت، ایک خدا......!

ہاں! دم گھٹنے لگا۔ میز پر جھکی لڑکی سخت قسم کا حیوان بنتی گئی۔ مصر کے اہرام وقت کے حملوں کے باوجود قائم ہیں۔ تو پھر کمزور ہے اور دھرتی ... ایک ننھے سے ایٹم کو لاکھوں کروڑوں پارس پاور سے دو ٹکڑوں میں جدا کیا جاتا ہے جب جا کر انسان کو فنا کرنے کی شکتی پیدا ہوتی ہے۔ لیکن دھرتی وقت وقت کے حملے سہتے سہتے بھی زندہ ہے۔ اس میں پودے پھوٹتے رہتے ہیں۔ مرتے ہیں اور پھوٹتے رہتے ہیں۔ سرشٹی کا چکر چلتا رہا ہے۔ سرشٹی کا چکر چلتا رہے گا۔ سیاہ بادلوں میں سفید بجلی اکثر چمکا کرتی ہے۔ امید اور قناعت کی بجلی۔ تخریب تعمیر کا دوسرا نام ہے۔ ایک پھول کو فنا کر دو دوسرا اگتا ہے، پیدا ہوتا ہے اور آسمان کی مطمئن مسکراہٹ ازل سے ابد تک قائم رہتی ہے۔

دماغ کا جلنا بند ہو گیا۔ رات کی رانی کے پھولوں کی مہک نتھنوں اور جسم کے مساموں تک گھسنے لگی۔ ہزار خوبصورت لڑکیاں رات کی رانی کی خوشبو کے احساس کو فنا نہیں کر سکتیں۔ پھولوں کی مہک ظلم کو فرو کر سکتی ہے۔ ایک پچاس روپیہ ماہوار کے عرت والے انسان کو ظلم سے روک سکتی ہے۔ اسے پھولوں کی مہک کے نزدیک چلا جانا چاہیئے۔

پھول مہکتے رہے، کتے بھونکتے رہے۔ اور ہر ترک کے سہارے مہک کو سونگھتے سونگھتے اسے یقین ہو گیا کہ وہ اب کسی کو ایذا نہیں پہنچا سکتا۔

بہلاوے:

(بسلسلہ صفحہ ۲۲۴)

ہے۔ کہ اب کے جیت جنتا کی ہوگی عوام کی جیت ہوگی"۔ رومیش یہ سنکر خوش ہوا کہ ایک اور جنگ ہوگی۔ وہ اس جنگ میں شامل ہوگا۔ اور فتح بھی عوام کی ہوگی۔ کیا وہ عوام میں شامل ہے۔ لیکن وہ فتح جس میں بھوک اور بیکاری ہمیشہ کے لئے نیست و نابود کر دی جائے گی۔ یقیناً ہر انسان کی فتح ہوگی۔ وہ دوبارہ گھر روپے بھیج سکیگا۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ اور کونٹر پر پیسے دیکر باہر کھلی فضا میں آ گیا۔ چاروں طرف قمقموں کی روشنی تھی، اور ہوا میں نمی تھی، قریب ہی ایک گورا ایک لڑکی کو سینہ سے لگائے، اسے بار بار چوم رہا تھا!

بلونت گارگی

گدھ

افراد:

فضلو ——————— ایک مرد جس کے سر کے بال کچے ہیں
رحیمہ ——————— ایک مرد جس کا چہرہ پتلا دبلا ہے
نوری ——————— 〃 〃 〃

منظر: بنگال کا ایک ویران گاؤں۔ **زمانہ:** دسمبر ۴۳ء کی ایک شام

پردہ اٹھتا ہے، اسٹیج پر تاریکی ہے۔

ایک بے چھپر کا جھونپڑہ۔ بائیں طرف والی پیرال کی دیوار گر گئی ہے۔ مٹی کا فرش خستہ اور ناہموار ہے۔ جگہ جگہ پر گڑھے ہیں جیسے چیچک زدہ چہرہ اچھل کر سکڑ جائے۔

فضلو زمین پر گھٹنا ٹیکے بیٹھا ہے۔ اس کا دوسرا گھٹنا ٹیڑھی ترچھی شکل بنا رہا ہے۔ وہ ایک دبلا پتلا آدمی ہے۔ کنپٹی کی رگیں پھولی ہوئی ہیں۔ آنکھیں بے دھیان اور اندر دھنسی ہیں۔ اس کے جسم پر قمیص نہیں۔ صرف ایک دھوتی ہے، وہی اس کی ہڈی پسلی ڈھانپ رہی ہے۔ لکڑی کے چھلن سے وہ مٹی کے ایک برتن کو اندر سے کھرچ رہا ہے۔

رحیمہ، اس کی بیوی، آلتی پالتی مارے اس کے پاس بیٹھی ہے۔ اس کی چمڑی سیاہ ہے لیکن چہرے کی کلونس پر اب زردی کھنڈ گئی ہے۔ اس کے دونوں بازو ننگے، بھونڈے اور سکڑے ہوئے ہیں۔ اس کی آنکھوں میں نہ جانے کون دنوں کی بھوک ہے۔

ایک کونے میں کسی چیز کا ڈھیر لگا ہے۔

ایک گھڑا جس کا منہ ٹوٹا ہوا ہے، اوندھا پڑا ہے۔ آس پاس سوکھے اور کچلے ہوئے پتے بکھرے ہیں۔

فضلو مٹی کے برتن کو الٹ پلٹ کر دیکھتا ہے۔ اس کے کونے کچالوں میں ہاتھ مارتا ہے۔ اسے ہلاتا ہے۔ پھر اوندھے منہ نیچے رکھ دیتا ہے) اس میں تو کچھ بھی نہیں، چاول کا ایک دانہ بھی نہیں۔

رحیمہ: پچھلے سال تو فصل خوب ہوئی تھی۔

فضلو: ہاں! بھرپور دن تھے۔ لیکن ویسے دن اب کہاں، شاید کبھی نہ آئیں۔

رحیمہ: آخ۔ ہوا میں کیسی بو ہے۔ چاروں طرف تعفن پھیل رہا ہے۔ قبروں سے مردوں کی سڑاند آتی ہے۔ (کھانستی ہے) آخ...

فضلو: (ادھر ادھر دیکھتا ہے) سوکھے کھیتوں پر اندھیرا چھا گیا ہے۔ زمین بنجر اور اجاڑ پڑی ہے۔ اب وہاں گدھوں کا راج ہے۔ وہ زور زور سے چلاتے ہیں اور بڑے بڑے پر پھڑپھڑاتے، بھدی چال میں پھدکتے پھرتے ہیں۔ نچی ہوئی ہڈیاں اندھیرے میں چمک رہی ہیں۔

رحیمہ: ہر چیز کیسی سنسان ہے، کیسی ڈراؤنی! (کھانستی ہے)

فضلو: گاؤں کے لوگ ایک ایک کر کے چلے گئے۔ اب تو وہی لوگ رہ گئے ہیں جنہوں نے اناج ڈھیر کر رکھا ہے۔ منافع باز۔ ہماری محنت کا پھل کھانے والے ــــ رت چوس ــــ

رحیمہ: چلو ہم بھی اٹھ چلیں یہاں سے چلے جائیں۔ آخر ہم ہی مصیبت کیوں اٹھائیں!

فضلو: وہ لوگ جو یہاں سے شہر میں چلے گئے، وہاں سے نکال دئے جائیں گے۔ پولیس سڑکوں پر راستہ روکے کھڑی ہے اور بھوکوں پر لاٹھیاں برساتی ہے۔ گھروں کے دروازے ان پر بند ہیں۔ اور وہ لوگ کلکتہ کے گلی کوچوں میں تڑپ تڑپ کر مر رہے ہیں۔ میں ویسی موت نہیں چاہتا۔ میں یہیں رہوں گا، اپنے جھونپڑے میں، اپنے کھیت میں جسے میں نے بویا۔ یہاں کی موت اس موت سے آسان ہے۔ میں نے برسوں دھرتی کی سیوا کی ہے۔ تو کیا ایک چپہ زمین مجھے نہ ملے گی؟

رحیمہ: ایسا نہ کہو، تم ہمیشہ موت کی باتیں کرتے ہو۔ (ایک ہاتھ سے چھاتی کو دبا کر، دکھ بھری آواز میں) موت ـــ ہمیشہ موت ـــ

فضلو: کیا تم بہت کمزور ہو گئی ہو؟

رحیمہ: ہاں!

فضلو۔ تو کراہ رہی ہو۔

رحیمہ۔ ہاں اجب بچہ مرنے لگا، تو اس نے میری چھاتی میں کاٹ کھایا۔ ایک قطرہ دودھ کے لئے وہ تڑپ تڑپ کر مر گیا۔ لیکن دودھ کہاں ۔۔۔ اب تو جسم میں بالکل طاقت نہیں، شاید یہ زخم کبھی اچھا نہ ہوگا۔

فضلو۔ آہ! تمہاری کیا حالت ہو گئی ۔۔۔ میں کتنا مجبور ہوں!

(باہر سے آواز آتی ہے)

آواز۔ اندر کون ہے؟ میں پوچھتا ہوں اندر کون ہے؟

(دو آدمی اندر داخل ہوتے ہیں۔ ایک کی ۔۔۔ بڑی بڑی سرخ مونچھوں پر تاؤ چڑھا ہے۔ چہرے پر رعونت اور سختی ہے۔ اس کا لباس ۔۔۔ رنگ کا کھلا کوٹ۔ ہاتھ میں ایک نوکیلی چھڑی ہے جس میں پیتل کی میخیں لگی ہیں۔

دوسرا آدمی پتلا دبلا اور رنگ چڑھا ہے۔ بات کرتے وقت اوپر کے دانت باہر نکل آتے ہیں۔ دونوں شور کرتے اندر داخل ہوتے ہیں)

سرخ مونچھوں والا۔ اٹھو۔ (چھڑی گھماتے ہوئے) جلدی کرو۔ اٹھو۔

رحیمہ۔ (حیرانی سے) ابھی اٹھے سرکار!

سرخ مونچھوں والا۔ (فضلو کے جسم میں چھڑی کی نوک چبھوتے ہوئے) دیکھو تو۔ کیسے آرام سے بیٹھے ہیں مشٹنڈے۔

رحیمہ۔ (مسکین صورت بنا کر) سرکار اس طرح بے رحمی سے چھڑی نہ چبھوئیے۔ بے چارہ کمزور اور بیمار ہے۔ آٹھ دن کا بھوکا ہے۔ چاول کا ایک تنکا بھی پیٹ میں نہیں گیا۔

ترش رو آدمی۔ بک بک بند کرو۔ کیا تم نہیں جانتے کہ زمیندار کا لڑکا پلیگ میں مر گیا ہے۔ اٹھو ۔۔۔ چلو میرے ساتھ ۔۔۔ جانور کہیں کے۔

فضلو۔ سرکار میں تو چل پھر نہیں سکتا۔ میرے گھٹنے کام نہیں کرتے۔

سرخ مونچھوں والا۔ سب بدمعاش اسی طرح باتیں بناتے ہیں۔ میں انہیں خوب سمجھتا ہوں۔ چلو، اٹھو، ہمارے زمیندار آج سوگ منا رہے ہیں، ان کے بیٹے کی لاش قبرستان تک پہونچائی ہے۔ اٹھو جا کر قبر کھود دو۔ سب گورکن بھاگ گئے ہیں، شہدے کہیں کے۔

رحیمہ۔ (منت سماجت کے ساتھ) سرکار انہیں چھوڑ دیجئے، میں ہاتھ جوڑتی ہوں، ہم آپ کے پاؤں کی دھول ہیں۔

ترش رو آدمی۔ (دانت نکالتے ہوئے) بھونکتی کیوں ہو۔ چپ رہ!

فضلو۔ سرکار ہمارے ہاتھ پاؤں میں طاقت کہاں۔ اب تو ہڈیوں کا ڈھانچ رہ گیا ہے۔

سرخ مونچھوں والا۔ بڑے منہ پھٹ ہو، کترنی کی طرح زبان چلتی ہے۔ (گرج کر) چلو اٹھ کر قبر کھود دو۔ (چھڑی سے ٹھوکا دیتا ہے) چلو۔

فضلو۔ میرے ہاتھوں میں پھاوڑا پکڑنے کی طاقت نہیں۔

ترش رو۔ (اوپر کا ہونٹ مٹکاتے ہوئے) میں تمہارے فریب خوب سمجھتا ہوں۔ تم لوگ لالچی اور حریص ہو۔ ابھی تمہارا پیٹ بھرو، ابھی پھر خالی ہو جاتا ہے۔

رحیمہ۔ (دکھ بھری آواز سے) میرا بچہ بھوک سے مر گیا اور اس کی ہڈیاں کتے گھسیٹ کر لے گئے۔ اب تو اس کا نام و نشان بھی نہیں رہا۔ کتے اس کا گوشت کھا گئے اور ہڈیوں کو چوس چوس کر ختم کر دیا۔ میں دکھیا ہوں۔ میرے خاوند کو رہنے دیجئے۔ یہ مر جائے گا۔ اسے رہنے دیجئے۔

سرخ م۔ والا۔ (دونوں میاں بیوی کی طرف ٹکٹکی باندھ کر) تمہارا کنبہ کیا ہوا۔ گھر کے اور لوگ کہاں گئے؟

رحیمہ۔ کچھ مر گئے۔ رہے سہے شہر بھاگ گئے۔

سرخ م۔ والا۔ (غصے سے تمتا کر) تو وہ لوگ بھاگ گئے، ذلیل، کمینے، زمین پر رینگنے والے جانور! کہتے ہیں طاقت نہیں۔ طاقت نہ تھی تو شہر تک کیوں کر چلے گئے۔ بے شرم۔ بے شکرے۔

رحیمہ۔ میرے خاوند کو چھوڑ دیجئے، میں ہاتھ جوڑتی ہوں، پاؤں چھوتی ہوں۔

ترش رو۔ سبھی بھکاری اسی طرح مانگتے ہیں، اسی طرح ناک رگڑتے ہیں ۔۔۔ (دانت نکالتے ہوئے) حرامی اولاد۔

رحیمہ۔ سرکار آپ گاؤں کے کرتا دھرتا اور پنچ ہیں۔ آپ کی بات کوئی نہیں موڑیگا۔ بھلا آپ کا حکم کون ٹال سکتا ہے۔ آپ جسے کہیں وہ کرے گا۔ گاؤں میں اور بھی لوگ ہیں۔ سرکار آج کے روز ان سے کام لیں۔

سرخ م۔ والا۔ نہ جانے وہ گدھے کہاں مر گئے۔ عمر بھر آقا کی روٹیاں کھا کر پڑے پڑے اینڈتے رہے۔ لیکن وقت پڑا تو سب بھاگ گئے۔ ایک بھی دکھائی نہیں دیتا۔ پاجی۔ مردود۔ (نفرت سے زمین پر تھوکتا ہے) چلو، اٹھو۔

فضلو۔ میں نہیں اٹھ سکتا۔ (جھوٹ پنے سے) میں میں نہیں اٹھونگا ۔۔۔

ترش رو۔ (فضلو کی جھکی ہوئی گردن پر ٹھوکر لگا کر) بکو نہیں۔

فضلو۔ (سخت لہجہ میں) ایک بار کہہ چکا، میں نہیں جاؤنگا۔

ترش رو۔ (فضلو کی جھکی ہوئی گردن پر ایک اور ٹھوکر لگاتا ہے) کام چور ۔۔۔ مرے ۔۔۔!

فضلو۔ (گردن اٹھاتے ہوئے) مجھے پیٹنے والے تم کون؟ ۔۔۔ تم ۔۔۔ تمہاری اوقات کیا ہے؟ کمینے! آقا کی جھوٹن کھانے والے ۔۔۔

رحیمہ۔ (ڈر سے) خدا کے لئے ایسی باتیں نہ کہو۔ وہ گاؤں کا مالک ہے ۔۔۔ خلاف کچھ نہ کہو۔ اس کا غصہ برا ہے۔

سرخ مم والا: (ہونٹ چباتے ہوئے) جی چاہتا ہے اس پاجی کو مزا چکھاؤں ۔
(چھڑی اٹھا کر فضلو کو مارتا ہے۔ فضلو زمین پر گر پڑتا ہے۔) اب یہاں چپ رہے
گی موت مر۔

(دونوں باہر چلے جاتے ہیں)

فضلو: (اپنی زخمی گردن اٹھا کر) چلے گئے بدمعاش ؟۔
رحیمہ: آہ! لاؤ میں تمہارا خون پونچھ دوں ۔۔ ادھر لاؤ۔
فضلو: (خون سے لتھڑا ہوا چہرہ اٹھاتا ہے) خدا کا عذاب نازل ہو ان پر۔
اور ان کی توندوں پر انصاف کا بل چلے۔ بدمعاش!
رحیمہ: پانی لاؤں ؟ پیو گے ؟۔
فضلو: ہاں تھوڑا سا لے آؤ۔
رحیمہ: [illegible]
فضلو: (پانی کا ایک گھونٹ پی کر) میں جانتا ہوں، میں جانتا ہوں، ان کے
[illegible]ناہ اور ظلم بہت بڑھ گئے ہیں، ان کی زندگی اب اتنا بوجھ نہیں اٹھا سکتی۔
[illegible] کھا کر پھٹ جائیں گے۔
رحیمہ: (دھیرے دھیرے اس کی گردن سہلاتی ہے۔ زخم پر پٹی باندھتی ہے)
[illegible]شانت ہو جاؤ ۔۔ وہ تو چلے گئے۔
[illegible] سے بھڑک کر) تم جانتی ہو وہ کہاں گئے ؟ کہیں اور لوٹ کھسوٹ
[illegible] ہم نے زمین جوتی، گھٹنوں پانی میں کھڑے ہو کر چانول کے کھیتوں
[illegible] سورج کی گرمی سے ہمارا پنڈا جھلس گیا۔ اس کے باوجود ہمارے
[illegible] کا ایک دانہ بھی نہیں۔ ہم بھوکوں مر رہے ہیں۔ لیکن وہ ہیں کہ امن
[illegible] کی رٹ لگا رہے ہیں۔ ہونہہ۔ قانون، میں کہتا ہوں قانون کیا ہے ؟۔
رحیمہ: قانون کی طاقت سے ٹکر نہ لو۔ قانون بہت ڈراؤنا ہے۔ وہ لوگ تمہیں
[illegible] بھوک تمہارے جسم کو چر گئی اور تمہارا ذہن کھوکھلا ہو گیا۔ اس
[illegible] میں نہ پڑو ۔۔ مجھے قانون سے ڈر آتا ہے۔ اور ان کی لاٹھیوں سے جیسے
[illegible] کے سم چڑھتے ہیں۔
[illegible] میرا ڈر خوف جاتا رہا۔ اب میں ہر ایک سے ٹکر لوں گا۔
[illegible] کہوں گا۔
[illegible] فائدہ ؟ میں کہتی ہوں اس سے فائدہ ؟ وہ لوگ تمہیں پیٹیں گے
[illegible] زخمی گردن اور پھٹے ہوئے ہونٹوں پر ٹھوکریں لگائیں گے۔
[illegible] کے سوا کچھ نہیں۔
[illegible] سے فائدہ ہے۔ اس سے فائدہ ہوگا۔ تمہاری نظر کبھی
[illegible] سے باہر نہیں جاتی۔ مجھے وہ دیس نہیں بھولا، جہاں
[illegible] کر ہلاک کر دیا جاتا تھا۔ پھر وہ مزدور اٹھے، بند توڑ دیئے

خون کی ندیاں بہا دیں۔ ساری دھرتی ان کے خون سے سرخ ہو گئی۔ اب ان کے
ہاتھوں میں درانتیاں ہیں، اور دیس کی لہلہاتی کھیتیاں ان کا دھن۔
رحیمہ: بھوک سے تمہاری سوچ کو پر لگ گئے۔ کیسے عجیب خواب دیکھتے ہو؟
بھلا کہیں ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ امیروں کے ہوتے سلتے یہ کیسے ممکن ہے ؟۔
فضلو: اب وہاں کوئی امیر نہیں، کوئی غریب نہیں، سب ایک ایسے ہیں۔
رحیمہ: ایسی باتیں نہ کہو۔ وہ تمہیں مار ڈالیں گے۔
فضلو: مجھے مار نے دو۔ میں ان سے ڈرتا نہیں۔ میں موت سے نہیں ڈرتا۔
رحیمہ: [illegible] یہ تمہیں کھادی پوش [illegible] نے پڑھائی ہے۔ اس
دن وہ ہمارے گاؤں میں آیا تھا۔ ہماری گلیوں [illegible] سے گزرا اور انہیں اور
[illegible] اجاڑ کر گیا۔ لیکن آخر پولیس نے پکڑ لیا اور اس کے جبڑوں پر ایسا تنا ہوا
مکا مارا کہ خون بہنے لگا۔
فضلو: (انگلیاں بھینچ کر) دیکھتی ہو یہ تنا ہوا [illegible] ان لاکھوں کا انتقام
لے گا۔ جو بھوک سے مر رہے ہیں۔
رحیمہ: تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔ میں تو ایک ہی بات جانتی
ہوں۔ غریب بھوک سے مر رہے ہیں۔ لیکن امیر موج اڑا رہے ہیں۔ ان سے
اتنا بھی نہیں ہوتا کہ اپنے کتوں کا بچا کھچا ایک ٹکڑا روٹی غریبوں کو پھینک دیں۔
تم بھوکے ہو، نوری بھوکی ہے، میں بھوکی ہوں۔
فضلو: نوری کہاں ہے ؟
رحیمہ: یہیں کسی کونے کھدرے میں سو رہی ہوگی۔
فضلو: آہ میری بچی! کیا وہ ابھی تک سو رہی ہے ؟۔
رحیمہ: یہیں نہ کہیں دبکی ہوگی۔ بے چاری کے پاس تن ڈھانپنے کو کپڑا
بھی نہیں۔ بے چھت کے جھونپڑے میں گزر بڑی مشکل ہے۔ رات کو اوس
پڑتی ہے اور ٹھنڈی ہوا بے روک ٹوک آتی جاتی ہے۔
فضلو: (پکارتا ہے) نوری! میری بچی! یہاں آؤ۔

(اندھیرے کونے میں کپڑے کے نیچے دبکا ہوا ایک گیدڑ چیختا
چلاتا باہر بھاگ جاتا ہے)

فضلو: نوری کہاں ہے ؟
رحیمہ: شام کو یہاں لیٹی تھی، اس وقت نہ جانے کہاں ہے ؟
فضلو: نوری! ۔۔ وہ یہاں تو نہیں۔

(باہر سے گیدڑ کی چیخ سنائی دیتی ہے)

رحیمہ: اس کے جسم پر کپڑے کی صرف ایک لیر تھی۔
فضلو: کیا تم نے اسے برا بھلا کہا تھا ؟۔
رحیمہ: نہیں تو ۔۔ میں درد سے کراہ رہی تھی۔ وہ بار بار چانول مانگتی

تھی۔ میں نے صرف اتنا کہا، شرم کرو۔ اٹھارہ برس کی ہو گئی۔ دودھ پیتا بچہ نہیں۔ ہاتھ پیر ہلاؤ اور زمیندار کی دکان سے مانگ تانگ کر لاؤ۔ وہ بڑبڑائی۔ 'میرے جسم پر کپڑا نہیں، چھاتیاں ننگی ہیں۔ لوگ میرا مذاق اڑاتے ہیں'۔ میں خاموش رہی۔ لیکن وہ بڑبڑاتی رہی۔ اتنے میں اندھیرا ہو گیا اور کچھ پھر پھبتیاں کسیں گے!

فضلو: تو کیا وہ بھیک مانگنے چلی گئی؟ (او وہ بھیک مانگنے گئی ہے)

رحیمہ: نہ جانے وہ کہاں چلی گئی!

فضلو: بھلا وہ کس سے بھیک مانگے گی؟ (گدھوں نے جوہا کی آخری بوٹی بھی نوچ کر لے گئے ہیں۔ زندگی سے محروم کر گئے۔ کیا وہ کہیں ... گے۔ اور وہ کیسے مانگے گی؟

رحیمہ: معلوم نہیں وہ کہاں گئی ۔۔۔ اب کیا وقت ہو گا؟

فضلو: سامنے کا سیارہ ہمارے دیوار کی اوٹ میں چھپ گیا ہے۔ کیا وہ ابھی نہیں آئی؟

رحیمہ: نہیں تو۔

فضلو: نہ جانے وہ کہاں ہے۔

(دروازے کے راستے نوری داخل ہوتی ہے۔ اس کی قمیص سامنے اور پیچھے سے پھٹی ہوئی ہے۔ گالوں پر سوکھے آنسوؤں کے نشان ہیں۔ شلوار ... پھٹی ہوئی ہے۔ وہ کمر جھکائے چلتی ہے۔ اس کے ہاتھوں میں پیالہ اور مٹھائی ہے۔ کھڑی کھڑی بے کسی و حیرانی سے دیکھتی ہے۔)

فضلو: آ میری بچی۔

رحیمہ: بہت دیر میں آئی؟

نوری: (کمزور آواز میں) ہاں!

رحیمہ: اتنی دیر کہاں رہی؟

فضلو: یہاں آ میری بچی، تو کہاں تھی؟

رحیمہ: اور اتنی رات گئے تک!

نوری: میں بھیک مانگنے گئی تھی۔ دکاندار نے کہا کھڑی رہو ابھی دیتا ہوں اور میں انتظار کرتی رہی، یہاں تک کہ مجھے غش آ گیا۔ (سسکیاں لیکر) پھر دکاندار مجھے اندھیرے میں گھسیٹ کر لے گیا۔ اور۔۔۔۔

فضلو: (پیچ و تاب کھا کر) آہ، گدھ! میری ہڈیاں ٹھونگتا ہے!!

نوری: اس کا موٹا تازہ کتا بھونکتا رہا اور وہ مجھے گھسیٹ کر لے گیا۔

فضلو: (غصے میں) میں اس گدھ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا۔ اور اس کی آنکھیں نکال لونگا۔

نوری: پھر وہ ہنستا رہا۔ اور اس نے میرے گال بھینچ بھینچ کر سرخ کر دیے۔

قمیص پھاڑ دی۔ اور میری چھاتیاں مسلنے لگا۔۔۔۔۔

(ہاتھوں میں پکڑی ہوئی خوراک زمین پر گر پڑتی ہے۔)

فضلو: (لڑکھڑاتے ہوئے) میں اس کی چونچ میں سوراخ کر دوں گا ۔۔۔ میں اسے زندہ نہ چھوڑوں گا ۔۔۔ میں اس سے انتقام لونگا۔

(باہر نکل جاتا ہے)

رحیمہ: کہاں گیا۔ بھوک سے اس کا دماغ چل گیا ہے۔ (چاول اور مٹھائی کو بھوکی نظروں سے دیکھتی ہے) یہ مٹھی بھر دودھیا مٹھائی اور چاول کے سفید دانے۔ آہا ہا۔ تو انہیں کیوں گرا لائی۔ کہو کیوں گرا لائی؟؟

نوری: آہ! یہ مٹھی بھر مٹھائی اور چاول کے دانے ۔۔۔ مجھے کچھ بھی معلوم نہیں ۔۔۔ مجھے غش آ رہا تھا۔ میرے گھٹنے جواب دے گئے ۔۔۔ اور میں نیچے گر پڑی۔ پھر ۔۔۔ پھر اس کا گرم گرم سانس میرے پیٹ سے چھونے لگا۔

(رحیمہ بے صبری سے مٹھائی کو منہ میں ڈالتی ہے)

(ہاہو ہو ہو کی آواز ۔۔۔ اور بے شمار پر پھڑپھڑاتے ہیں)

نوری: (خوف سے) آہ! وہ ویرانے میں گیا ہے۔ جہاں گدھ مُردوں کا گوشت کھاتے ہیں۔ باہر اندھیرا ہے۔ اور وہ ویرانے میں چلا گیا ۔۔۔ ماں ۔۔۔ ماں ۔۔۔!

رحیمہ: (آنکھیں پھاڑ کر دیکھتی ہے) اندھیرے میں ۔۔۔ اس وقت ۔۔۔

نوری: میں اس کے پیچھے جاتی ہوں۔ وہاں ۔۔۔ قبرستان میں جہاں مُردوں کے ڈھیر لگے ہیں اور گیدڑ لاشیں گھسیٹتے ہیں۔ وہ وہیں لڑکھڑا رہا ہے۔ میں اس کے پیچھے جاتی ہوں۔

(باہر جاتی ہے)

رحیمہ: تو کہاں چلی ۔۔۔ تو کہاں چلی؟ (اپنے منہ کی بچی کچی مٹھائی پھینک دیتی ہے اور نفرت سے تھوکتی ہے) آخ! اس مٹھائی میں مردار کی بو ہے!!

(ماتھے پر ہاتھ مار کر رونے لگتی ہے)

پردہ گرتا ہے۔

دوسرا سین

پردہ اٹھتا ہے۔

اجاڑ اور بنجر زمین ۔۔۔ جگہ جگہ قبریں بنی ہیں۔ دور ایک دو جھاڑیاں پرچھائیں کی طرح کھڑی ہیں ۔۔۔ فضلو داخل ہوتا ہے۔ اس کے بازو پھیلے ہوئے ہیں۔ پیٹ ہڈیوں کے ساتھ لگا ہے۔ اور گردن جھکی ہوئی ہے۔ اس کے منہ سے خون نکل نکل کر گردن پر بہہ رہا ہے۔

فضلو۔ اُڑ گئے! آہ! سارے گدھ اُڑ گئے۔ اُن کے پر ہوا میں پھڑ پھڑا رہے ہیں ۔ میں اُن کے پیچھے بھاگوں گا۔ آہ! ہو ہو ہو ۔ میں اس گدھ کو کچل دونگا ۔ اس گدھ کو ۔ لاشوں کا کیڑا ۔

(پروں کی پھڑ پھڑاہٹ)

دفع ہو ۔ سڑی ہوئی لاشوں سے پیٹ بھرنے والے تو دفع ہو!

(لڑکھڑا کر نیچے گر پڑتا ہے)

نوری آتی ہے)

نوری ۔ بابا!

فضلو: ہاں ۔ ایک گدھ! زمین پر سے ایک پر اُٹھا کر) میں نے اُس کے پر نوچ لئے۔ ہا ہا ہا!!

نوری بابا! رات کتنی بھیانک ہے اور سرد۔ گیدڑ چیخ رہے ہیں۔

فضلو: یہ لو ۔ اس پر کو پکڑو ۔ یہ پر میں نے نوچا ہے۔ گیدڑ سے نہ ڈرو ۔ اسے چیخنے دو، اس کا کام ہی یہی ہے ۔ چیخنا چیخنا ....

(اس کی آواز ایکا ایکی مدھم پڑ جاتی ہے اور وہ ہانپنے لگتا ہے)

نوری ۔ بابا تمہاری آنکھیں سُرخ ہیں۔ تمہیں بخار ہے۔

فضلو ۔ ہوا کرے، ہونے دو، وہ دیکھو سامنے کا تارا سُرخ ہو گیا ہے۔ اُس طرف دیکھو۔ سُرخ تارے کی طرف جہاں آسمان کا پورب اور پچھم ملتا ہے۔

نوری: بابا! ہمیں واپس چلنا چاہیئے۔

(اُسے سہارا دیکر اٹھاتی ہے۔ وہ بہت جتن کرکے اُٹھتا ہے۔ پہلے زمین پر ہاتھ رکھتا ہے۔ پھر گھٹنوں پر بوجھ ڈالتا ہے لیکن اپنا آپ سنبھال نہیں سکتا اور گر پڑتا ہے)

فضلو ۔ رات کی تاریکی میرے ذہن میں انوکھے خواب بُن رہی ہے اور دیکھو سامنے ہماری ٹوٹی پھوٹی دیوار کے اوپر ۔ ہلکا سبز تارا اب سُرخ جھلکیاں دے رہا ہے

(نوری اس کے ہاتھ سے گدھ کا پر لے لیتی ہے اور اپنے بازو سے اس کی گردن تھامتی ہے)

فضلو ۔ میرے ہاتھ سے گدھ کی گردن نہ چھڑا! آخر میں نے پکڑ ہی لی ۔ گدھ کی گردن ۔!

نوری: بابا تمہارا چہرہ پیلا ہو گیا ہے۔ تم کانپ رہے ہو۔ لاؤ میں تمہیں سہارا دوں ۔ (سسکیاں لیتی ہے)

فضلو: (مٹھی بھینچ کر) دیکھو، میں نے اسکی گردن مروڑ دی اور اسکے خون سے میری انگلیاں تر ہو گئیں ۔ گرم اور سرخ جیسے وہ تارا ۔ وہ دُور گدھ کے خون میں ڈوبا ہوا تارا ۔ (وہ کھانستا ہے اور زمین پر ڈھیر ہو جاتا ہے۔ اسکا چہرہ

[illegible]

غزل

چاندنی رات سوگ وار نہیں
کیا کسی کا اب انتظار نہیں

اپنی ہی آرزو میں مرتا ہوں
اے خوشا، اُن کا انتظار نہیں

اب جنوں ہے مرا تمام ہوش
اب گریباں تار تار نہیں

پرسشِ غم کا شکریہ لیکن
اب کسی حال میں قرار نہیں

ہائے بے چارگی محبّت کی
ضبطِ گریہ پہ اختیار نہیں

دامنِ ناز کی دُہائی ہے
میرے دامن میں کوئی تار نہیں

دل کی بے کیفیوں کو کیا کہیے
فصلِ گل ہے مگر بہار نہیں

عشق وہ نشہ ہے کہ جس میں رازؔ
کیف و مستی تو ہے خمار نہیں

راز مرادآبادی

لہ حافظ نے لکھا ہے اس لئے صحیح ہے!

پریم پجاری

میرے اشعار اور انکی شانِ نزول

نوٹ:۔ "پریم پجاری کے افسانوں کی طرح پریم پجاری کے اشعار بھی کہانیاں ہیں۔ یا یوں کہیئے کہ ایک ہی داستان کے مختلف اجزا ہیں۔ جنہیں تشریحی نوٹوں سے باہم مربوط کر کے افسانہ کی شکل دے دی گئی ہے۔ یہ اشعار کیسے ہیں اس کے متعلق ہمیں کسی اظہار رائے کی ضرورت نہیں۔ پڑھنے والے خود ہی ان کی قدر و قیمت کا اندازہ کر لیں گے۔ ہمیں صرف اس قدر کہنا ہے کہ نثر کے ٹکڑوں نے ان آب دار نگینوں اور نشتروں کو سان پر رکھ کر زہر میں بجھا دیا ہے۔ پریم پجاری نے اپنے پورے کلام کو اسی طرح مرتب کیا ہے جو بہت جلد کتابی صورت میں شائع ہوگا اور یہ "داستانِ رنگیں" ساقی میں بھی بالاقساط شائع ہوتی رہے گی۔ غالباً دنیا کی کسی زبان میں عاشقانہ شاعری کی ایسی کوئی مثال موجود نہیں کہ شاعر نے جو کچھ کہا ہو کسی نہ کسی آنی جذبہ یا واقعہ سے متاثر ہو کر حقیقت نگاری کی ہو۔ اس اعتبار سے "میرے اشعار اور اُن کی شانِ نزول" ادب میں ایک بالکل نئے باب کا اضافہ ہے۔"

سننے والا کہے گا، اللہ ری خودستائی! آپ کے اشعار گویا کسی آسمانی صحیفے کے آیات ہیں جن کی "شانِ نزول" بیان کرنا ضروری ہے۔ اپنے مُنہ سے اپنی تعریف اور پھر اتنی۔ خدا کی پناہ!

میں اس کا جواب کیا دوں۔ کاش معترض کے پاس احساس کی آنکھیں ہوتیں۔

زندگی ایک کتاب ہے۔ کچھ لکھی جا چکی کچھ باقی ہے۔ جتنی لکھی جا چکی وہ ماضی ہے۔ جو باقی ہے وہ مستقبل — حال تو ایک آنی کیفیت ہے۔ اس کا ذکر کیا۔ دن اور راتیں اس کتاب کے اوراق ہیں۔ کچھ روشن۔ کچھ تاریک۔ اور اچھے بُرے۔ چھوٹے بڑے دلچسپ غیر دلچسپ۔ اہم اور غیر اہم واقعات اس کے ابواب ہیں۔

انسان کی زندگی کے دو ہی سہارے ہیں۔ ایک آئندہ کامیابیوں کی اُمید دوسرے گذشتہ کامرانیوں کی یاد۔ لیکن حالات نے جس نامراد کے مستقبل پر مایوسیوں کے سیاہ پردے ڈال دئے ہوں، اور اُمید کی ایک مضمحل سی کرن بھی اسے کہیں نظر نہ آتی ہو، وہ، عارضی طور پر زندگی کی تلخیوں کو بھول جانے کے لئے اگر ماضی کے دامن میں پناہ نہ لے تو کیا کرے۔

دل جب بہت اُداس اور جی نراس ہوتا ہے تو میں ماضی کی اس کتاب کے ورق اُلٹنا شروع کر دیتا ہوں۔ اس میں کیا کیا کچھ آنکھوں کے سامنے آتا ہے۔ کہیں چاندنی راتیں۔ کہیں تاروں کی چھاؤں۔ کہیں شفق۔ کہیں دھنک۔ کہیں صحنِ چمن۔ کہیں دامنِ کوہسار۔ کہیں دوستوں کے جمگھٹے۔ کہیں فقط ہم اور وہ اکیلے۔ ہائے کیا کیا تصویریں ہیں اس مرقع میں۔ جہاں نظر پڑ گئی وہیں اٹک کر رہ گئی۔ حال اور مستقبل دونوں ماضی میں گم۔ گذرا ہوا زمانہ پھر لوٹ آیا۔ نامرادیاں کامرانیوں میں تبدیل ہو گئیں۔ جاگ رہے ہیں مگر خواب کا سا عالم ہے۔ دُنیا و مافیہا سے بے خبر۔ برسوں کے بعد بچھڑے ہوئے پھر ایک بار مل گئے۔ اور کس آزادی و بیباکی کے ساتھ۔ کوئی درمیان میں حائل نہیں۔ آنکھیں بھی آزاد۔ ہونٹ بھی آزاد۔ جسم بھی آزاد۔ رُوح بھی آزاد۔ مگر آہ! یہ خود فراموشی پائدار نہیں۔ ابھی سب کچھ تھا۔ ابھی کچھ نہیں۔ پھر دل میں خلش ہے۔ پھر کوئی کلیجہ مسل رہا ہے۔ پھر جی بھرا آتا ہے۔ پھر آنکھیں چھلکنا چاہتی ہیں۔ اسی عالم میں خود بخود شعر موزوں ہونے لگتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان اشعار کے لئے دماغ نے مضامین پیدا نہیں کئے۔ ان میں کچھ گذرے ہوئے واقعات کا بیان ہے اور کچھ محسوس کی ہوئی کیفیات کا۔ "شانِ نزول" کا مطلب صرف یہ بتانا ہے کہ کونسا شعر کس واقعے سے متاثر ہو کر کہا گیا ہے۔ تاکہ ان چھوٹی چھوٹی سچی کہانیوں کا سننے والا پورے طور پر لطف اندوز ہو سکے۔ خودستائی کو اس سے کیا علاقہ اور خود فروشی کو اس سے کیا سروکار۔ پڑھنے والا خود ہی اندازہ کر لیگا کہ لکھنے والے کی غرض کیا ہے۔

میری زندگی کا سب سے زیادہ قیمتی سرمایہ دو چیزیں ہیں۔ چند تصویریں اور چند سو خطوط۔ زندگی کی تلخیوں سے جب اور کہیں پناہ نہیں ملتی تو میں ان تصویروں اور ان خطوں کے دامن میں پناہ لیتا ہوں۔ یہ تصویریں اور یہ خط مجھے ایک دوسری دُنیا میں لے جاتے ہیں۔ آہ کیسی دُنیا!

پھولوں کی دنیا۔ نغموں کی دنیا   تاروں کی دنیا۔ ٹھنڈی سہانی
اک روح پرور خوابوں کی دُنیا   جس کی بہاریں ہیں جاودانی

کئی برس گذرے بہار کا موسم تھا۔ چاندنی رات اور خاموش تنہائی۔ دھیمی دھیمی ہوا کے جذبات انگیز جھونکے دیوانہ بنائے دیتے تھے۔ دل بہت بیقرار تھا۔ میں نے اپنا صندوقچہ کھولا۔ ایک تصویر نکالی۔ دیر تک اُسے دیکھتا رہا۔ معلوم ہوتا تھا کسی نے حسرت و اندوہ کا ایک حسین پیکر تراشا ہے۔ پھر قیامت یہ کہ اس اُداسی نے جو دُوری و مہجوری کا لازمی نتیجہ تھی، اس موہنی صورت کو اور بھی جاذب نظر بنا دیا تھا۔ بے اختیار

دل اُس طرف کھنچا جاتا تھا۔ اُسی عالم میں یہ شعر موزوں ہوا۔

جاگ اُٹھیں تاثیر پھر اس سے بہاریں حُسن کی

اللہ اللہ، جلوۂ رنگین تری تصویر کا

میں نے اُسے سینے سے لگالیا۔ پھر خوب پیار کیا۔ دل میں ایک عجیب کیف وسرور کا عالم پیدا ہوگیا۔ سرخوشی بلکہ ایک بے خودی سی حواس پر چھاگئی۔ کچھ دیر کے بعد میں نے ایک خط نکالا۔ اُسے پڑھنا شروع کیا۔ میں اپنے گردو پیش سے بالکل بے خبر، اس فضا میں سانس لے رہا تھا جہاں اس وقت سے کئی برس پہلے اُس پھولوں کی ڈالی کو جھومتے دیکھا تھا۔ جب اس مقام پر پہونچا۔

"آج کل چاندنی راتوں میں اگر کوئی مجھے گھنٹوں چاند کی طرف ٹکٹکی لگا کر تکتے ہوئے دیکھے تو یقیناً دیوالی خیال کرنے لگے۔ میں لگاتار چاند کی طرف دیکھتی رہتی ہوں۔ کیسی اچھی ہوتی ہے یہ خنک چاندنی۔ آدھی رات کا سناٹا چاند سے زیادہ سفید و شفاف چاندنی پر چاند نگاہوں کے سامنے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی نہایت لطیف اور کیف آور شے چاند کی کرنوں سے نکل کر مجھ میں سرایت کر رہی ہے۔ یہ خواب آور شے مجھے کچھ دیر کے لئے کسی اور ہی عالم میں لے جاتی ہے۔ اور نہ جانے کب تک اس بے خودی کی حالت میں پڑی رہتی ہوں۔ وہ لطیف شے کیا ہوتی ہے؟ صرف یہ احساس کہ یہ جرم نورانی۔ یہ خوش نما چاند، ہم دونوں کی نگاہوں کا مرکز ہے۔ ایک دور افتادہ اور ناکام تمنا کے لئے یہ احساس کس قدر دل خوش کن ہے کہ جس چیز کو وہ دیکھے، اُسی شے کی طرف عین اُسی وقت، اُس کی محبوب نرین ... کی مسحور کن نگاہیں تک رہی ہوں۔ آہ۔ پریتم۔ نگاہوں کا یہ اتصال گو ہزاروں میل دور ہی سہی! لیکن تھوڑی دیر کے لئے تسکین دہ تصور میں کھو دیتا ہے۔"

تو میری نظریں بے اختیار چاند کی طرف اُٹھ گئیں اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے دو میری ... ستاروں کی طرح چاند کی کشتی میں بیٹھی بڑی حسرت بھری نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی ہے۔ آہ۔ نشتر سے کلیجے میں پیوست ہو رہے تھے۔ میں نے خط کو تہ کر کے لفافہ میں بند کیا اور صندوقچے میں رکھ دیا۔ دل و دماغ میں ایک ... ہیجان برپا تھا۔ دفعتہً یہ شعر زبان پر جاری ہوگیا۔

اس نقطے پہ مل جاتی ہیں مہجور نگاہیں

میں چاند نہیں اس کی نظر دیکھ رہا ہوں

کچھ بہت دیر تک ٹکٹکی باندھے چاند کو دیکھتا رہا۔ اس مرتبہ ایسا معلوم ہوا جیسے چاند کی اوٹ سے کوئی مجھے جھانک رہا ہے۔ اس طرح کہ ابر شمیں دراز پلکوں پر آنسو کا ایک قطرہ صبح کے ستارے کی طرح جھلملا رہا ہے۔ اس منظر کو دیکھ کر میرا کلیجہ ٹکڑے ہوا جاتا تھا۔ آخر یہ "حال" بھی منظوم ہوگیا۔

للہ مجھے چاند کے پردے سے نہ یوں جھانک بر مژگاں یہ ترے انجمِ سحر دیکھ رہا ہوں

بہت دیر تک طبیعت پر ایک خاص کیفیت طاری رہی۔ کبھی پہلا شعر ... کبھی دوسرا شعر فضا میں گونجتا ہوا سنائی دیتا تھا۔ رات آدھی سے زیادہ ... گئی۔ چاند ڈھلک گیا۔ ستارے چلتے چلتے کہیں سے کہیں پہونچ گئے۔ ... دنیا ... راحت میں مصروف تھی۔ مگر ایک نامراد ہجر ... رہ رہ کے دل کے اندر نشتر سے ٹوٹتے تھے۔ خدا جانے موزوں طبع اُس وقت کیوں اپنے عروج پر تھی ... کوشش کے بغیر شعر موزوں ہو رہے تھے۔ جیسے قلم ... تصویریں کھینچتا چلا جاتا۔ چنانچہ ... تصویر بھی کھنچ گئی۔

جو خواب میں سرشار جہاں ... رہا ہے

اب تک میں ستاروں کا سفر دیکھ رہا ہوں

پھر چاند میں کسی سے نگاہیں مل گئیں۔ پھر کسی کی آنکھوں نے آنکھوں میں ... کہہ دیا۔ پھر ایک شعر موزوں ہوا۔

ہاں میرے لئے چاند پیامی ہے کسی کا

کرنوں میں کوئی تار نظر ... دیکھ رہا ہوں

پھر تصور کی دنیا آباد ہوگئی۔ پھر دل قرب کی لذتوں میں ڈوب گیا۔ پھر وہ آثار سحر نمودار ہوئے۔ پھر وہ جدائی کا منظر آنکھوں میں پھر گیا۔ پھر دل دھک دھک کرنے لگا۔ آہ۔

آمادۂ رخصت ہے ... شمع ... ستاں

سہما ہوا آثار سحر دیکھ رہا ہوں

تو صبح ہوگئی۔ وہ خیالی محفل درہم برہم ہوگئی۔ ... خاص ... پر چھوڑ گئی۔ بار بار دروازے کی ... لگا ہوا ہے۔ جیسے ... جیسے کوئی آنے والا ہے۔ اب آیا۔ اور اب آیا۔ کون آئے گا؟ کوئی نہیں ... چاند آسمان سے اتر کر زمین پر آگیا ہے ... شوق کی ... ہیں۔

... دیوانگی شوق کا عالم

وعدہ نہیں اور جانب در دیکھ رہا ہوں

آخر یہ طلسم بھی ٹوٹ گیا۔ ... کر خشک ہوگئیں اور جلنے لگیں۔ چنگاریاں سی ... تصویر بھی کھنچ گئی۔

آنسو جو ہوئے خشک تو جلنے لگیں آنکھیں

گہوارۂ شبنم میں شرر دیکھ رہا ہوں

رات بھی تمام ہوگئی۔ غزل بھی تمام ہوگئی۔ ... ہیں۔ اور اب جب کبھی میں انہیں پڑھتا ہوں تو ... کی دنیا ... کھنچ رہے جاتے ہیں۔

مدتیں گذر گیں۔ طویل مدتیں۔ جب کی یہ باتیں ہیں۔ آرزو کا پھول کبھی کھلا تھا۔ نامرادی کی آندھیوں نے اُسے توڑ کر بکھیر دیا۔ پتی پتی منتشر کر دی۔ مگر اس کی نکہتیں۔ اس کی رنگینیاں اس کی لطافتیں آج بھی دل و دماغ پر چھائی ہوتی ہیں۔ آہ۔ زندگی کی وہ یادگار ساعتیں۔

حالات نے کچھ ایسا پلٹا کھایا کہ سلسلہ جنبانی کے تمام راستے مسدود ہو گئے۔ چکور کے لئے چاند کی تمنا جرم ٹھہری۔ برس گذر گئے ملنا کیسا ملنے کا تصور تک محال ہو گیا۔ نامہ و پیام کی کوئی صورت نہ رہی۔ اسی زمانہ میں ایک نظم کہی تھی۔ اپنی بے بسی کی تصویر کھینچی تھی۔ وہ نظم بھی کہیں گم ہو گئی۔ صرف پہلا بند یاد رہ گیا ہے۔

اے میری نظر سے دور
نغمہ ہائے [illegible] سے دور
[illegible] کار گر [illegible] دور
حلہ نامہ بر سے دور
دور۔ ہر اثر سے دور
کچھ تجھے خبر بھی ہے ہم پہ کیا گذرتی ہے

کاش سوچتے ان کے دل میں خدا جانے کیا کیا خیال آتے ہوں گے ——

"بے مروت ہے وفا۔ کبھی پلٹ کر خبر بھی نہ لی۔ ہے کون کسی کو یاد رکھتا ہے۔ اور کہیں دل لگا لیا ہو گا۔ کسی اور کسی سے جی بہلا لیا ہو گا ـــــ ایسی یاد جس میں دکھ بھرا ہو کیوں اور کب تک کوئی اپنے سینے سے لگائے رکھے" یہ سب کچھ سوچ کر ان کے دل کو کتنا رنج ہوتا ہو گا۔ میری نہ ٹوٹنے والی خاموشی طرح طرح کی بدگمانیاں پیدا کر کے انہیں کتنا آزار دیتی ہوگی؟ آہ میری مجبوریاں۔ "سعی طلب" کا تو ذکر ہی کیا۔ زبان سے ان کا نام لینا بھی جرم تھا۔ ادھر اپنی بے بسی۔ ادھر ان کی بدگمانی اور ننگ کا اندیشہ۔ دل خون ہوا جاتا تھا۔ اسی عالم میں ایک غزل کہی تھی۔ مطلع یہ تھا۔

کیا کروں میں جو ورقِ سعیِ طلب باز نہ ہو
ڈر ہے کچھ اور گماں دل شکن ناز نہ ہو

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ بہت کچھ امید کا سہارا استوار رہتا ہے تمنائیں پھولتی پھلتی رہتی ہیں۔ مگر جہاں یاس کی گھنگھور گھٹائیں چھائیں اور نامرادی کی بدلیاں چھلنی شروع ہوئیں آرزو کا چراغ جھلملا کر بجھ گیا اور "چاہت" کی آگ ٹھنڈی ہو گئی۔ یہیں سے "ہوس" اور "محبت" کا فرق معلوم ہوتا ہے۔ جہاں نامرادیوں نے [illegible] لیا اور مایوسیوں نے گھیرا ہوس کے پاؤں اکھڑے۔ پھر نہ وہ جوش۔ نہ وہ دیدے۔ نہ وہ بے تابیاں۔ مگر ناکامی "محبت" [illegible] کو اپنے دامن سے ہوا دیتی ہے۔ ایوسیاں [illegible] اور وہ اور بھی زیادہ بھڑک اٹھتی ہے

اور اس وقت تک نہیں بجھتی جب تک محبت کرنے والا خود جل کر راکھ کا ڈھیر نہ ہو جائے۔ انہوں نے سمجھا کہ شاید میری محبت بھی دنیا کی رسمی اور نام نہاد محبت کی طرح آنی اور فانی تھی۔ مایوسیوں نے اُسے مٹا دیا ہو گا۔ مگر درحقیقت یہ اُن کی بھول تھی۔ وہ تمنا کی کلی جس دن پہلی بار مجھے دیکھ کر مسکرائی تھی۔ اُس دن سے آج تک

ایک شعلہ ہے کہ سینے میں لپکتا ہے مدام

نامرادیوں سے دل کا خون ہوتے دو برس گذرے، چار برس گذرے، دس برس گذرے۔ مگر احساس کی شدت میں کوئی کمی نہ ہوئی۔ اس معصوم محبت کا حال آگ کا سا ہے کہ وہ شمع کو جلاتی بھی ہے اور اُسے روشن بھی رکھتی ہے۔ اسی طرح محبت کا وہ شعلہ جو ہر وقت سینے میں تھرتھراتا رہتا ہے۔ دل کے لئے آگ بھی ہے اور زندگی بھی۔ یہ نہ ہو تو دل پر ایک بے حسی چھا جاتی ہے۔ بظاہر وہ زندہ ہے مگر درحقیقت مر جاتے۔ موت میں اور بے حسی کی زندگی میں ایسا فرق ہی کیا ہے؛

زندگی کیا، جب نہ ہو دل میں خلش
موت بھی اک بے حسی کا نام ہے

تو میں کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ میری طویل خاموشی کی بنا پر جو درحقیقت میری مجبوری اور بے بسی کا نتیجہ تھی انہیں میری محبت سے بدگمانیاں ہونے لگیں۔ اُن کے شکوک دور کرنے کے لئے ایک شعر کہا تھا۔ اور چونکہ اس شعر کو اُن تک پہونچانے کا کوئی امکان نہ تھا۔ اس لئے عالم خیال میں انہیں مخاطب کر کے آپ ہی آپ اکثر اسکی تکرار کیا کرتا تھا۔ یہ ہے وہ شعر۔

کیا محبت کو مری، تم نے ہوس سمجھا ہے
کہ ہوئی یاس تو سرگرمی آغاز نہ [illegible]

زمانہ گذرتا گیا۔ حالات بدلتے گئے۔ مگر دنیائے محبت کی مجبوریاں اللہ اللہ۔

۵ کہنے کو یوں دور رہے یہ آزادی کا، مختاری کا
چاہت کی دنیا میں جو مجبوری کل تھی آج بھی ہے

اپنے متعلق تو میں مطمئن تھا کہ میرے کسی انداز سے بھی کسی کو ہلکے سے "راز" کا پتا نہیں چل سکتا۔ دل کے زخموں کو میں نے تبسم کے پردوں میں چھپا لیا تھا۔ مگر ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کہیں خود اُنکی آنکھیں ان کی غمازی نہ کر دیں۔ ان کنول کے پھولوں میں کسی نے شبنم چھلکتے دیکھ لی تو قیامت ہی ہو جائیگی۔ مجھ سے زیادہ انہیں افشائے راز کا خوف تھا۔ لکھا تھا "خدا کی کوئی ایسی بات نہ کرنا کہ کوئی کچھ سمجھ جائے۔ دشمن گھات میں لگے ہوئے ہیں۔ بہت ہی احتیاط کی ضرورت ہے۔ ذرا سی بھنک بھی ان بیدردوں کے کان میں پڑ گئی تو میری موت یقینی ہے۔" جواب میں ان کی تسلی کیلئے یہ شعر لکھا تھا۔ مگر یہ بھی ان تک نہ پہونچ سکا۔

میں تو مر جاؤں، مگر رازِ محبت نہ کھلے
کاش تیری خلشِ دل، تری غماز نہ ہو (باقی [illegible])

قاضی نذر الاسلام کی پانچ نظمیں

بیداری

(حافظ شیرازی کی مشہور نظم "یوسف گم گشتہ باز آید بہ کنعاں غم مخور" کا ایک عکس)

ہمدم! مسرت و شادمانی کے گم ہو جانے کا کیا غم؟
پھر وہ خوشیاں تمہارے قدم چومیں گی!
پھر ایک دن کچلی ہوئی تمنائیں اور دبی ہوئی آرزوئیں گلستاں بن کر لہلہا اٹھیں گی!
اپنی آنکھوں کے آنسو بند کر دو ــــ کیونکہ
ہمارے صد چاک دلوں میں پھر آہنی ارادے ابھر آئیں گے!
ہمدم! جب یہ بہار چمن کی گود میں طاؤس ناچ سکتا ہے ــــ
کیا تمہارے گرد آلود تاج میں نشاط و انبساط کی تابش نہ جگمگا نہیں سکتی

ہمدم! یہ ناامیدی کیسی؟
مستقبل کا پردہ اٹھنے دو ــــ اس کے پیچھے شیرینیاں پوشیدہ ہیں!
خودکشی اور تشدد کیوں؟
یہ تو ہمارے مذہب میں حرام ہے!
ڈرپوک نہ ہو ــــ خدا کی یہ حسین دنیا وسیع ہے!
ہمدم! مسرت و شادمانی کے گم ہو جانے کا کیا غم ...؟
پھر وہ خوشیاں تمہارے قدم چومیں گی!

ہمدم! اگر تمہاری تمام خواہشیں پوری نہیں ہو سکتیں
... کے اندر یہ تکلیفیں دور ہو جائیں گی ــــ
... بہت قریب ہے جب ظالم کی استبدادیت کا خاتمہ ہو جائیگا!
... مقامات کی زیارت کو جاتے ہیں
... ہے ــــ کیونکہ راستے کی دشواریاں جو پیش آتی ہیں!
... شادمانی کے گم ہو جانے کا کیا غم!
... تمہارے قدم چومیں گی!

اگر سیلاب کی تباہ کاریاں بھی ہماری راہوں میں حائل ہو جائیں،
ہمیں کیا ڈر ــــ ہم تو دریائے حقیقت کے تیراک ہیں! عادی ہو جائیں گے
ان مشکلات پر!
ہماری راہوں میں ہزدلوں کا ہجوم ہو تو کیا ہو
اور بھی کتنی جانی پہچانی راہیں کھلی ہوئی ہیں ہم آگے بڑھتے ہی جائیں گے!
ہمدم! مسرت و شادمانی کے گم ہو جانے کا کیا غم!
پھر وہ خوشیاں تمہارے قدم چومیں گی!

خودکشی اور تشدد کیوں؟
یہ تو ہمارے مذہب میں حرام ہے!
ڈرپوک نہ ہو ــــ خدا کی یہ حسین دنیا بہت وسیع ہے!
خوف کیسا ہمدم!
اگر مفلسی و غریبی ہی ہماری تاریکیوں کا ریگستان ہیں
تو یہی سہی ــــ یہیں ہم اپنی حقیقی اور آزاد روحوں کی پرستش کرینگے!
ہمدم! مسرت و شادمانی کے گم ہو جانے کا کیا غم؟
پھر وہ خوشیاں تمہارے قدم چومیں گی!

شاعر کا سلام

ہمدم! آج شب و روز یہ کیا سن رہا ہوں ــــ
آزادی کی چیخ پکار، زنجیر غلامی کے ٹوٹنے کی آواز ہے!
قیدخانہ کی آہنی سلاخوں کے اندر
آزادی کے شیریں قہقہے ...!
کیا کمزور دلوں کے اندر خوف کی زنجیریں چور ہو رہی ہیں؟

دیکھو سیاہ مقدر میں خون کا چاند جھلک رہا ہے
جس کے سینے میں سنگریزے ہیں، ہاتھوں میں ہتھکڑی ہے
جس کی آنکھوں سے حقیقت کی شعاعیں نکل رہی ہیں
اور جو آزادی کا پُرجوش نغمہ سنا رہا ہے

ابھی [illegible] سے ہلتے دھمے کے کروڑوں دل تڑپ رہے ہیں۔

دیکھو ریت کے ذروں نے موتی [illegible]
غلامی کی زنجیریں توڑتے ہوئے جا رہے ہیں
[illegible] آزادی نے [illegible] پیچھا شروع کیا
[illegible] نے بھی فتح [illegible] کا انتظار کیا
[illegible] پانی سے سب بڑھتا جا رہا ہے
[illegible] آنکھیں بھالا [illegible]

آج یارو [illegible] آزادی [illegible]
[illegible] نے بندھنوں کو توڑ کر رکھ دیا
[illegible] شاعر مقتدی [illegible]
[illegible] اور بربادی [illegible]
[illegible] چیخ [illegible] رہا ہو!

دیکھو آج چاروں [illegible] شادیانے بجائے جا رہے ہیں۔
[illegible] کا [illegible] غرق ہے!
[illegible]
ہمارا [illegible]
اور [illegible] پھولوں کا ہار پہن کر
بڑھنے لگے!

غلام [illegible] وہ قید خانہ [illegible] تو
بجلی کی وحشتناک [illegible]
جے ہو۔ زنجیریں ٹوٹ گئیں، موت بھاگ گئی، خوف مٹ گیا!!!
جے ہو۔ آزادی کی، دائمی حریت کی!
جے ہو۔ جے ہو۔ اے ہو۔ اے ہو!

ہم انہیں کا گیت گاتے ہیں

جس نے شمشیر حریت سے غلامی کی زنجیریں توڑ ڈالی ہیں
ہمدم ہم چالیس کروڑ انسان اُسی کا گیت گاتے ہیں!
[illegible] کی دھاریں ہماری سرد رگوں میں دوڑنے لگی ہیں
[illegible] حقیقی فتح کا باجا بجا رہے ہیں!

جس کی مساوات میں آہیں اور سسکیاں نہیں ہیں
ہم [illegible] شاعر، کو خیرباد کہہ کر اُسی کی راہ پر چل رہے ہیں
جس نے شمشیر حریت سے غلامی کی زنجیریں توڑ ڈالی ہیں
ہمدم ہم چالیس کروڑ انسان اُسی کا گیت گاتے ہیں!

بتاؤ آزادی کا غلام کون ہے؟
ہم سب آزاد ہیں ہمدم — ہم سب آزادی کے پرستار ہیں!
ہم قید خانے کی آہنی سلاخوں سے غلامی کی زنجیریں توڑنے نکلے ہیں
دیکھو ہمارے ضمیر کا خدا جاگ اُٹھا ہے
کون ہے جو اس خدا کے گلے میں اب طوقِ غلامی پہنا سکے؟
جس نے شمشیر حریت سے غلامی کی زنجیریں توڑ ڈالی ہیں
ہمدم ہم چالیس کروڑ انسان اسی کا گیت گاتے ہیں

جاؤ ہمدم جاؤ قید خانے کو [illegible] کرو!
اب ہماری آنکھیں اشکبار نہیں ہونگی
ہم بھی چالیس کروڑ انسان اس عہدِ برق میں پیش قدمی کرتے چلے جائینگے
جس نے آزادی کی خاطر اپنی جانوں کی بھینٹ چڑھا دی ہے
ہم ہندو مسلمان اسی کی فتح کا گیت گاتے ہوئے جا رہے ہیں!
جس نے شمشیر حریت سے غلامی کی زنجیریں توڑ ڈالی ہیں
ہمدم ہم چالیس کروڑ انسان اسی کا گیت گاتے ہیں!

بیڑیاں

یہ بیڑیاں جو ہمارے پاؤں میں پہنا دی گئی ہیں
دھوکا ہیں فریب ہیں!!
یہی بیڑیاں [illegible] تمہاری بیڑیوں کے لئے قیامت ثابت ہونگی!
سن لو تمہارے قید خانے اور ستم رانیاں بھی ہم سے پناہ مانگتی ہیں!
ہم تمہارے بندھنوں سے نہیں ڈرتے — انہی بندھنوں میں فتح پوشیدہ ہے
احمق ہمارے پاؤں میں تم نے بیڑیاں پہنا دی ہیں لیکن یہ نہ سوچا کہ
یہ پاؤں مشین ہیں جو بیڑیوں کو چور چور کر دیں گے۔

تم ہمیں اپنی سلاخوں میں بند کر کے ہنس رہے ہو۔
اور خوش ہو رہے ہو کہ ڈرا دھمکا کر ہماری شہ زوریاں چھین لوگے

یاد رکھو ہم شیطان سے بھی نہیں ڈرتے اُسے بھی کچل ڈالیں گے

ہوشیار! ہوشیار!!

بزدلی بھاگ رہی ہے ــــ اور بلند عزائم جاگ رہے ہیں!

درحقیقت تم ہمیں دھمکا کر حکومت کر رہے ہو ــــ یہ سچ کی حکومت کیسی!

سُن لو اس خوف کی شہ رگ پکڑ کر اسے برباد کر دیں گے:

ہاں ہم آپس میں مل کر ہی دائمی سکون حاصل کریں گے

تم ہمیں پھانسی پر لٹکاؤ تو کیا ہوگا

اس وقت بھی موت کی فتح کا تبسم ہمارے لبوں پر لہرائیگا!

بیوقوف یہ غلامی کی آہ و زاریاں نہیں ہیں

یہ تو زنجیروں کے جھن جھنے ہیں جو ہر طرف بج رہے ہیں!

دیکھو تمہاری دنیا سے آزادی جھانک رہی ہے!

اور ہماری ذلّت و خواری نے بھی سر اُٹھا لیا ہے ــــ

اب ہم اپنی ہڈیوں کے روغن ہی سے دلیس کی مشعلیں روشن کریں گے!

پاگل راہی

یہ کون پاگل راہی ہے ــــ؟

یہ ہے وہ چالیس کروڑ ... موت کا راگ الاپتے ہوئے قیدی ماں کے

... ... جا رہے ہیں:

یہ ... کون ہے؟

... کے سامنے ... کو توڑنے آ رہا ہے!

... آزادی کا صور پھونکے رہا

... ہے!

... آج مردہ ماں کی لاش کو دفنانے

آ رہے ہیں!

... کھا رہے ہیں کر

اور چھوڑ کے غیر کے ... کیونکہ

... تو اپنے دلوں کے اندر جلوہ ... بھکاریوں کی التجاؤں

میں کہاں؟

حق ہے اُسی کو بقا ہے ــــ اسی کی دنیا میں طبلِ آزادی بجتا ہے!

اور باطل تو اپنے ہی نیش سے فنا ہو جاتا ہے!

آؤ حسد و بغض سے کنارہ کش ہو جاؤ ــــ انسان بنو، انسان!

وقت کا کارواں منزلیں طے کرتا جا رہا ہے!

اے موت سے ڈرنے والے مرنے کی طرح مرو ــــ ایسی موت کتنے مرتے

ہیں ــــ؟

سنو صور اسرافیل طوفان اور بجلی کے ساتھ بجنا شروع ہو گیا ہے

تم بھی قیامت کا راگ چھیڑو ــــ حق کیا جیتے جی ... کے راگ سے وطن آزاد

ہو سکتا ہے؟

آؤ خوبصورتی اور حسن کو یاد ... ہوئے بڑھتے آؤ!

یہ ... آج تو خواب سے بیداری کا دن ہے ــــ

آؤ ... آزادی کو راگ گاتے ہوئے بڑھتے چلیں۔

مترجمہ محمد یونس احمد:

تصانیف مرزا عظیم بیگ چغتائی مرحوم

آدم خور: کیا آج کل بھی آدم خوری ہوتی ہے۔ اور آدمی کو آدمی مار کر کھاتا ہے؟ اس کا جواب کہاں اور کیسے؟ کس طرح آدمی آدمی کا شکار کرتا ہے۔ لاش کو کس شوق سے تقسیم کرتے ہیں۔ کس طرح گوشت تقسیم کر کے کھاتے ہیں۔ کس طرح عورت اپنے پیارے بچے کو بھون کر کھا جاتی ہے اور اس کے گوشت کا حصہ اپنی بہنوں اور ملنے والیوں میں تقسیم کرتی ہے۔ عجیب و غریب خوفناک رسمیں اور رواج۔ کس طرح دولھا رسائی گوشت اور کلیجی کے ثابت ٹکڑے نگلتا ہے اور مُنہ سے ٹکڑا اگر نہیں کہ خود دولھا ذبح ہو کر باراتیوں کی خوراک بن جاتا ہے۔ ایک شوہر بیوی کو بطور سزا یا تفریحاً بھون کر کھا سکتا ہے۔ کس طرح انسان کا انسان کھانے سے پہلے خون چوس رہی جاتا ہے۔ والدین اپنی چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کو مار کر خود اپنے ہاتھوں سے انگاروں پر اوندھا لٹا دیتے ہیں، اور جب چربی پگھل پگھل کر نکلتی ہے تو کم زور لڑکے کے بدن پر اس کی مالش کرتے ہیں۔ اور پھر بہن کا گوشت بھائی کو کھلاتے ہیں۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔ علاوہ محصولڈاک۔

ملنے کا پتہ:

ساقی بک ڈپو، دہلی

یشپال

طوفان کا دیو

جس مقام پر پہونچ کر انسان کا دماغ اور نگاہیں جواب دے جاتے ہیں، وہیں سے بھگوان اور دیوتاؤں کا راج شروع ہو جاتا ہے۔ ہمالیہ پہاڑ کی اُنچی اونچائی تعظیم و تکریم کی جاتی ہے کیونکہ وہاں آدمی کا گزر آسانی سے نہیں ہوتا۔ ہمالیہ دیوتاؤں کی بستی ہے۔ ہمالیہ کے دشوار گزار راستوں اور تنگ دروں سے آگے جو چوٹیاں ہیں وہ بھی مثل فردوس، دیوتاؤں کے قابل۔ وہاں کی ایک داستان سنیے!

گھنے بادلوں کی وجہ سے ٹھیک معلوم نہیں ہوتا تھا کہ آفتاب غروب ہو چکا ہے یا نہیں۔ شام ہو چکی تھی۔ شام ہو چکی تھی۔ لوگ کھیتوں سے لوٹ آئے تھے۔ سارے گاؤں میں خبر پھیل گئی کہ سمہ ملا کر بھوسی کو روند روند کر کھا رہے تھے۔ آنے جانے والے مسافر سرائے میں پتھر کے چولھوں میں آگ جلا چکے تھے۔

بے موسم کی دھیمی دھیمی جھڑی لگی تھی۔ گھروں میں لوگ کمبل کے کپڑے پہنے آگ کے چاروں طرف بیٹھے چلم سے دم کھینچ کھینچ کر کھانس رہے تھے۔ آگ پر رکھے ہوئے سماوار، جن پر کالک کی کئی تہیں جمی ہوئی تھیں، اپنا سر ہلا ہلا کر گنگنا رہے تھے۔ ان میں اُبلتی ہوئی چائے کی تیز بھاپ کے بادل پھیل پھیل کر چاروں طرف بیٹھے ہوئے مضمحل انسانوں کو دلاسا دے رہے تھے۔

سونی، تنگ، اور ہاتھ ہاتھ بھر چوڑی گلیوں میں لکڑی اور پتھر کی نیچی ڈھالو چھتوں سے لگاتار گرتی ہوئی پانی کی بوندیں اور گلیوں میں بہتے ہوئے برساتی پانی کے پتلے دھارے گھروں کے دروازے پر لگے کوڑا کرکٹ اور ملبے کے ڈھیروں کو کم کر رہے تھے۔

رجھاماموچی، میں ایک دم سناٹا تھا۔ سلیٹ اور تختوں کی چھتوں پر بارش کی بوندوں کے گرنے کے علاوہ اور کوئی آواز کہیں سنائی نہیں دیتی تھی۔ چمنیوں کی غیر موجودگی میں چھتوں کے کناروں سے پھوٹتے ہوئے دھوئیں کے بادل کی ایک کشادہ تہ چھا گئی تھی۔ اُس سے گاؤں کی خموشی دوبالا ہو گئی تھی۔ پہاڑ کی ڈھلوان پر کھڑے ہوئے؛ اپنی باہیں پھیلا کر بارش سے گاؤں کو بچانے کی کوشش کرنے والے درخت بھی چپ چاپ تھے۔ صرف ایک آواز سنائی دے رہی تھی۔ گاؤں کے کنارے بنے ہوئے اکائی کی تہ پر تہ جمتے رہنے سے سبز پڑ جانے والے تتھاگت بدھ کے مندر سے یہ آواز آ رہی تھی۔ پدم آسن باندھے بدھ کی مورت کے سامنے مندر کے پجاری ڈمرو سنجیدہ دھیمی آواز میں ایک خاص منتر کی گنجار کر رہا تھا۔

ٹھنڈی اور تیز ہوا کا ایک جھونکا آیا۔ اُس نے آندھی کی شکل اختیار کر لی۔ اور پھر طوفان! آسمان سے پتھر برسنے لگے۔ ہوا کی تیزی کے باعث وہ اُڑتے تیروں کی طرح چوٹ کر رہے تھے۔ گویا مہابھارت کے میدان کی کوروں اور پانڈوں کی بے شمار فوجیں رجھاماموچی، گاؤں پر تیروں کی بارش کر رہی ہوں۔ پتھروں کی مار سے رجھاماموچی تڑپ اُٹھا۔

فصل میں دانا پڑ چکا تھا۔ بھیڑیں بیاہ چکی تھیں... فصل کا کیا ہوگا؟... نئی بیاہی بھیڑوں اور ان کے میمنوں کا کیا ہوگا!.....

گاؤں میں کہرام مچ گیا۔ ہوہو کرتی ہوئی تیز ہوا چھتوں میں گھسنے لگی۔ بچے رونے لگے، کتے بھونکنے لگے۔ ماؤں نے بچوں کو کمبلوں میں لپیٹ دیا۔ وہ باہر نکل کر چھت کو ہوا میں اُڑ جانے سے بچانے کے لئے اس پر پتھر رکھ دینا چاہتی تھیں، مگر بچے رو رو کر اُن سے لپٹ جاتے تھے۔ ہر سو شور تھا۔ یا! طوفان کا دیو!!

چیختے چلاتے لوگ گلیوں میں نکل پڑے۔ "ہنگپو! ہنگپو!" چلاتے ہوئے وہ لوگ تتھاگت کے مندر کی طرف دوڑے۔ سب لوگوں نے چلا چلا کر مندر کے پجاری کو طوفان کے دیو کا سامنا کرنے کیلئے پکارا۔

مندر کے پجاریوں کا کام طوفان اور دوسرے خوفناک دیووں سے گاؤں کی حفاظت کرنا ہے۔ یہی اُن کی غایت ہے۔ گھنٹوں طوفان کے دیو سے لڑ کر یہ لوگ گاؤں کی حفاظت کرتے ہیں۔ تین سال قبل، جب پوس میں برف کا طوفان آیا تھا، ہی ہنگپو تلوار اور نیزہ لیکر رات بھر طوفان سے لڑتا رہا، مگر پار نہ پا سکا۔ آخر جب نیزے سے بھی تیز برف کے ٹکڑوں سے اسکا چہرہ لہولہان ہو گیا اور اس کے کمبل کے کپڑے تر ہو کر ٹپکنے لگے؛ وہ بیہوش ہو کر گر پڑا، مگر دیو کا زور کم نہ ہوا۔ اس روز انسان کی طاقت طوفان کے دیو کو زیر نہ کر سکی۔ ہنگپو ہار مان کر ٹیلے سے نیچے اتر آیا۔ سب فصل خاک میں مل گئی۔ سینکڑوں بھیڑیں اور بیسیوں چنور گائے مر گئیں، اور مکانوں کی چھتیں اُڑ گئیں۔ ہفتوں کوئی مندر میں نہیں گیا۔ کسی نے پجاری کو "سیدھا" نہیں دیا۔ گاؤں والے پجاری کو غصہ اور حقارت بھری ترچھی نظروں سے دیکھ کر منہ پھیر لیتے۔

جب پجاری طوفان کے دیو سے لڑ کر گاؤں کی حفاظت نہیں کر سکتا تو

---

[1] بیل کے باندھنے کے چھپر!

لئے ٹھلا ٹھلا کر موٹا کرنے سے فائدہ ؟ مہینوں میں گاؤں والوں کا غصہ اُترا۔

آج پھر پنگپو کے امتحان کا دن تھا۔ ڈر کے مارے اس کا بدن کانپ رہا تھا۔ ایک ہاتھ میں لمبی تلوار اور دوسرے میں نیزہ لیکر طوفان سے لڑنے کے لئے وہ ٹیلے پر چڑھنے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ دوسری بار دیوتا سے ہار کر لوٹنے کا مطلب ہوگا دیوتا پنگپو سے خفا ہیں جس کی وجہ سے گاؤں کو دیوتا نے بد دعا دیدی ہے۔ یہ اس کیلئے موت کے مُنہ میں جانا ہوگا۔

یکایک آواز میں زور سے 'ہل ہل' چلاتا اور نیزہ گھماتا وہ چوٹی کی طرف دوڑ پڑا۔ جھاما موچی کے لوگ خوف سے کانپتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو لوٹ کر پنگپو اور طوفان کے دیو کی جنگ کے نتیجہ کا انتظار کرنے لگے۔

طوفان کی ڈراؤنی 'ہو ہو' کے بیچ کبھی کبھی پنگپو کی پتلی آواز بھی سُنائی پڑ جاتی تھی۔ وہ للکار للکار کر طوفان پر نیزے اور تلوار سے وار کر رہا تھا۔

کچھ ہی دیر میں پتھر گرنے کی آواز اچانک بند ہو گئی۔ صرف ہوا کا زور باقی رہ گیا۔ تھوڑی دیر میں وہ بھی ختم ہو گیا۔ دروازوں اور چھتوں کی درزوں سے چاند کی سفید کرنیں اندر آنے لگیں۔ طوفان سے نجات پاکر سب لوگ مکانوں سے باہر نکل آئے۔

چاروں طرف دُھنی ہوئی روئی سی صاف شفاف برف کے سوا اور کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ سفید چاندنی میں آنکھیں چُندھیا رہی تھیں۔ ریہے سہے بادل آسمان میں اُڑے چلے جا رہے تھے وہ بھی صاف شفاف روئی کے ڈھیر کی طرح معلوم ہوتے تھے۔

گاؤں والے مندر کے صحن میں جمع ہونے لگے۔ انہوں نے دیکھا پنگپو تلوار کندھے پر رکھے اور نیزے کی لکڑی کو پتھروں پر ٹیکتا ہوا ٹیلے سے اُتر رہا ہے۔ اس کے بھرے چہرے، چوڑی پیشانی اور چپٹی ناک پر پسینہ کی لکیریں چاندنی میں چمک رہی تھیں۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں فتح اور خود اعتمادی چمک رہی تھی۔ صحن میں جمع ہونے والے عوام نے جسم کو کمر تک جھکا کر اس کا استقبال کیا اور اپنی اپنی نذر اسکے سامنے رکھ دی۔ گاؤں والے خوش تھے۔

کتنی جلدی پنگپو نے طوفان کے دیو کے دانت کھٹے کر دئے۔ پنگپو یقیناً بھگوان کا نمائندہ ہے، وہ ہمارے گاؤں کی حفاظت کرتا ہے۔ دیو نے نقصان بہت پہونچایا مگر پنگپو نے ہماری حفاظت کی ورنہ دیو ہم سب کو برباد کر دیتا۔

پنگپو نے نیزہ اٹھا کر کہا۔ "آج طوفان کے دیو کو شکست دیکر میں نے کہہ دیا ہے کہ اس کی پوجا کا حصّہ۔ لال جوار کا آٹا، چیر کے کا مکھن، بھیڑ کا گوشت، اور نمک اُسے ہر اماوس[1] اور پونو[2] کو بھینٹ کر دیا جایگا۔

اب اُسے گاؤں میں آنے کی ضرورت نہیں"

گاؤں والوں نے عقیدت سے سر جھکا کر پابندی وقت کے ساتھ نذر پہونچانے کا وعدہ کیا۔

* * * * *

"کیا تمہیں اب بھی پنگپو کی روحانی طاقت میں شک ہے؟"

---

[1] ہندی مہینہ کی پندرھویں تاریخ [2] ہندی مہینہ کی تیسویں تاریخ۔

مترجمہ: گوکل چند رستوگی

نئی مطبوعات

تلخ و شیریں:- صلاح الدین قریشی کے بہترین افسانوں کا مجموعہ زندگی کتنی تلخ ہے اور ساتھ ہی کتنی شیریں اس کا ثبوت آپ کو ان افسانوں میں ملے گا۔ قیمت دو روپے۔

نور و ظلمت:- صلاح الدین قریشی کی تازہ ترین کتاب زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں۔ اُردو میں اپنی قسم کی نرالی اور اچھوتی چیز ہے۔ قیمت ایکروپیہ چار آنے۔

باغی:- بہترین انقلابی نظموں کا مجموعہ، ابھی کچھ دن ہوئے ان نظموں نے دُنیائے ادب میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ قیمت ایکروپیہ چار آنے۔

دُلہن کی سیج:- جبران خلیل جبران کے افسانوں کا تازہ مجموعہ۔ ہر افسانہ سوسائٹی کے اہم نقائص کے خلاف ایک ضرب کاری ہے۔ مترجمہ حبیب اشعر دہلوی۔ قیمت دو روپے۔

ٹوٹے ہوئے پر:- خلیل جبران کا ایک المیہ ناول، مترجمہ حبیب اشعر دہلوی۔ قیمت ایکروپیہ آٹھ آنے۔

راز و نیاز:- حبیب اشعر دہلوی کی غزلوں کا مجموعہ۔ قیمت چھ آنے۔

یہ اور دوسری مشہور کتابوں کے ملنے کا پتہ:-

ایوانِ ادب، چوڑی والان، دہلی ۶

ڈاکٹر نصیر الدین

اپنی ڈائری سے

ایک دن علی الصباح چائے پی کر اپنے مطب کے احاطہ میں چہل قدمی کر رہا تھا۔ پاس ہی ایک آم کا درخت بور سے لدا ہوا کھڑا تھا۔ [illegible] ابھی کوک رہی تھی۔ نسیم سحری کہیں سے بھینی بھینی خوشبو چرا کر لاتی [illegible] سے مٹھیاں بھر بھر کر نثار رہی تھی۔ جی آپ ہی آپ کنوں کی کلی کی طرح کھلا جا رہا تھا۔ میں بار بار رہا تھا۔ دل کسی لامعلوم جذبہ سے مرعوب ہو کر دھڑکنے لگا تھا۔ جیسے کسی بلبلا رہی کی آمد کے مژدے سنا رہا تھا۔ دل کہہ رہا تھا آج میری [illegible] کا آغاز ہوگا۔ میں اسی وقت احاطہ کا پھاٹک کھلا اور ایک دبلا پتلا اپنے عالی دمی قدرے لنگڑا کر اندر داخل ہوا۔ وہ مجھے دیکھ کر ٹھٹکا اور جہاں تھا وہیں رک کر میری طرف اُمید بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔ میرا دل خوشی سے اچھل اچھل کرنے لگا۔ مریض واقعی مریض، از سر تا پا مریض، میرا معمر زیہاں، میری زندگی کو شاندار بنانے والا پہلا مختار۔ میں لپک کر آگے بڑھا اور بڑے تپاک سے اس کا خیر مقدم کرتے ہوئے بولا۔ ”آئیے، آئیے، تشریف لائیے، ہاں آپ چل کر اندر بیٹھئے۔ آپ بیمار اور کمزور دکھائی دیتے ہیں۔ گھبرائیے نہیں، سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔“

نووارد مجھے یوں تپاک سے اپنا خیر مقدم کرتے دیکھ کر جھجکا، گھبرایا، گھبرایا، نظریں نیچی کر لیں اور معذرت خواہ ہو کر بولا ”جی [illegible] میں کمزور ہوں بیمار ہوں مگر اس قابل نہیں ... “ ابھی وہ اپنا جملہ پوری طرح تمام کرنے پایا تھا کہ میں اس کا بازو تھام کر اسے اپنے بنگلہ کی طرف لے چلا۔ وہ چلنے میں لنگڑا رہا تھا اور اس کی چال دیکھ کر میں نے دل میں کہا یہ Gout یا Rheumatism کا مریض ہے۔ کچھ آگے بڑھا تو اس کی زرد بے رونق اور پھیکی پھیکی آنکھوں اور چہرہ پر نظر پڑی۔ دل نے خوشی سے بلبلا کر فوراً یہ تشخیص پیش کی کہ یہ Anaemia, Jaundice یا Hepatitis کا مریض [illegible] انیمیا، یرقان یا ورم جگر کا مریض ہے۔ کچھ آگے بڑھا تو اس کے بازو کی حدت معمول سے زیادہ محسوس ہوئی۔ خیال نے فوراً ایک اور تشخیص پیش کی کہ یہ Rheumatic malaria, Typhoid [illegible] روماٹک بخار، ملیریا یا موتی جھرہ کا مریض ہے۔ الغرض اپنے احاطہ سے گزرنے کی مدت میں میں نے اس اجنبی کے لامعلوم مرض کی سینکڑوں تشخیصیں کر ڈالیں، اور جب تک وہ برآمدہ تک پہونچا میں نے اس کے لئے نسخہ، غذا، پرہیز وغیرہ کی تجویز بھی مکمل کر لی۔ میں نے اسے ایک آرام دہ کرسی پر اس کی

مرضی کے خلاف بٹھایا۔ اور ہمدردانہ لہجہ میں پوچھا ”کہیے آپ کو کیا تکلیف ہے؟ گھبرائیے نہیں، میں آپ کو جلد اچھا کر دونگا، پہلے آپ مجھے اپنا پورا حال سنائیے۔“

وہ پہلے بہت ہچکچایا کر جھجکا مگر میرے ہمت دلانے سے اپنا حال یوں بیان کرنے لگا۔ ”ڈاکٹر صاحب، میں اپنا حال کیا سناؤں۔ آہ! جس کے لئے میں نے اپنی ملازمت چھوڑی۔ اپنے کھرے گھر کو خاک میں ملایا، اور آج دانہ دانہ کا محتاج ہوں۔ افسوس! وہ نیک بی بی آج نہ رہیں۔ آپ کے آنے سے چند دن پیشتر وہ اس دنیا سے چل بسیں اور مجھے اور ننھے بچوں کو یوں در در کی ٹھوکریں کھانے کو چھوڑ گئیں۔ ڈاکٹر صاحب! اپنی کس کس مصیبت کو بیان کروں۔ میری اس ٹانگ کو دیکھئے، ایک ماہ ہوتا ہے کہ مرحومہ کے لئے ڈاکٹر بوس کے ہاں سے دوا لانے کے لئے جا رہا تھا پھسل کر گرا اور گھٹنا اتر گیا۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر گھوش کو پانسو روپے دئے، مرحومہ کے علاج کے لئے ڈاکٹر ہمن داس کو چار سو، حکیم گیلانی کو سو سوا سو، برہمچاری سوامی کو ڈھائی سو روپے دئے اور دوا دارو اور گنڈے تعویذ میں تقریباً پانسو روپے صرف ہوئے۔ الغرض ڈاکٹر صاحب کیا بتاؤں کہ میں کیا پریشانیاں [illegible] ساری پونجی حتیٰ کہ آبائی مکان تک فروخت کر ڈالا۔ مگر قسمت کا لکھا [illegible] تھا۔ آج میں اپنے بچوں کے ساتھ ایک درخت کے سایہ میں پڑا ہوں اور رزق [illegible] کسی کے منہ میں کھیل [illegible] نہیں گئی ہے۔“ وہ اتنا کہہ کر رونے لگا۔ اس کی دکھ بھری کہانی سن کر میرے ہوش اڑ گئے۔ کہاں تخیلات کی دنیا میں مریض دوسرا نام تھا زرد جواہر کا، اور کہاں دنیائے حقیقت میں ایک مفلوک الحال فاقہ مست مریض سے سابقہ پڑ رہا تھا۔ میرا سر چکرانے لگا اور پاؤں سے [illegible] چھوٹنے لگے۔ وہ ابھی کچھ اور کہنا چاہتا تھا [illegible] یوں اٹھا ”بھائی، آپ اپنے مرض کا حال سنائیے، مجھے آپ سے پوری ہمدردی ہے۔“

وہ میری بات سن کر بولا ”ڈاکٹر صاحب، میرا مرض تو انہیں اسباب کی بنا پر [illegible] دن سے مجھے لوٹ لیا، برباد کر دیا۔ یہ انہیں کی بدولت آج فاقہ مستی میں مبتلا ہوں، میری یہ نقاہت، یہ بخار، یہ کمزوری تو اسی لئے ہے کہ میں اور میرے بچے ہفتوں سے برائے نام غذا پر جی رہے ہیں۔ میں آپ کے پاس اپنے علاج کی غرض سے نہیں آیا ہوں ....“

اس کی صورت سوال بن کر رہ گئی۔ میں سر جھکائے اٹھا اور اس کی ہتھیلی پر پانچ روپے رکھ کر بولا ”یہ حقیر سا نسخہ آپ کے مرض کے لئے ہے اسے قبول کیجئے۔“

دو اکھڑ کر چلنے لگا۔ وہ جس وقت لنگڑا کر میری سیڑھیوں سے نیچے اُتر کر جانے لگا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میرے خواب کے تمام سُنہرے نقوش زرد ہو کر پیلے پڑ گئے ہیں اور اپنے خوبصورت چوکھٹوں سے لنگڑاتے ہوئے نکل نکل کر باہر چلے جا رہے ہیں!

آج میرے کمانے والی سٹار زندگی کا پہلا معمار آیا مگر وہ اکھڑا تھا، بھوکا تھا اور مجھ سے زیادہ محتاج تھا۔ کالج میں حاصل کئے ہوئے غلط قسم کے سُنہرے خیالات کا طلسم آنکھوں کے سامنے ٹوٹ رہا تھا۔ مجھے پہلی بار محسوس ہوا کہ ڈاکٹر سے رجوع کرنے والے زیادہ تر ایسے مفلوک الحال اور پریشان انسان ہوتے ہیں جو فاقے کے سبب سے متعدد امراض میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ وہ امراض، افلاس اور غربت کے تباہ کن دائرہ میں گھرے ہوتے ہیں۔ ان کی ملازمتیں اور ذرائع آمدنی مسدود ہو کر مفقود ہو جاتے ہیں اور ان کا صبر و قرار مستقل پریشانی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اُن کے گھر دوزخ کے نمونے بن جاتے ہیں جہاں ہر وقت دلوں میں آگ لگی رہتی ہے اور سسکیوں کا دھواں بلند ہوتا رہتا ہے۔ ایسے مفلوک الحال اور افلاس زدہ بدقسمت انسان کو اپنا ذریعہ آمدنی بنانا انسانیت سے خارج بات ہے اور ان بیماروں کے پیسوں سے اپنے لئے عالیشان محل بنوانا اور موٹریں خریدنا نہایت شرمناک شیطانی حرکت ہے۔ میرا دل اس انسان کی بدقسمتی اور زندگی کے درد کو دیکھ کر رونے لگا۔ کچھ دیر پہلے سیٹی بجانے کو جی چاہتا تھا اور اب آنکھوں سے خود بخود آنسو اُمڈے چلے آ رہے تھے۔ انسانی زندگی کے مد و جزر کا یہ پہلا سبق تھا جسے تجربہ کے خرانٹ مولوی نے اپنا ڈنڈا مار کر میرے ذہن نشین کرایا تھا۔

اس طرح زندگی کے کھردرے دن لیل و نہار کی کھرل میں خوب باریک طرح سے کھرل ہو کر پستے رہے۔ ہر لمحہ ایک نئی صورت پیش کرتا رہا اور ہر ساعت کتاب زندگی کے سفید ورق پر تجربہ کی ایک موٹی لکیر کھینچتی رہی۔ میں نے وہ تمام چیزیں اپنی آنکھوں سے دیکھیں جن کو دل صرف کبھی کبھی محسوس کرتا تھا اور ان واقعات سے بھی دوچار ہوا جس کا وجود وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ ڈاکٹر کی زندگی صبح سے شام تک مزیدار تجربوں کی لیبارٹری ہے جس میں طرح طرح کے تجربے خود بخود حاصل ہوتے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر انسانی فطرت کو اس کی برہنہ حالت میں دیکھتا ہے اس کے سامنے ڈاکٹر جیکل مسٹر ہائڈ بن کر آتے ہیں۔ وہ اپنے گھر میں بیٹھا بگلا بھگت، بزرگ رئیس صفت، گرگ باراں دیدہ اور حویلی کی بیٹیوں کے گھناؤنے کرتوت دیکھتا ہے اور اپنے دل میں عش عش کرتا ہے۔ کہ اس صفحۂ ہستی پر ایک نہیں، دو نہیں، ہزاروں کنگ کانگ اور فرانکن سٹائن بستے ہیں مگر ان کے قصے نہ تو لکھے جاتے ہیں اور نہ پردہ سیمیں پر پیش ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر کا دل ساری دُنیا کے رازوں سے بھرا ہوتا ہے۔ انواع و اقسام کے فرزندانِ آدم اس کے پاس آتے ہیں، اس کی سمع خراشی کرتے ہیں اور آخر میں اپنے گناہوں کی پوٹلی باندھ کر اس کے صندوق میں رکھ جاتے ہیں۔ سوسائٹی کا سب سے زیادہ مفید ممبر ڈاکٹر ہے مگر پھر بھی سوسائٹی جتنی پھبتیاں اُس پر کستی ہے کسی اور پر نہیں کستی! یہ کیوں؟

یہ انسانی فطرت کا ایک راز سربستہ ہے۔ آپ اپنے دل سے پوچھئے کیا آپ کسی ڈاکٹر کے زیر بار احسان نہیں ہیں مگر ساتھ ہی کیا آپ کو کسی ڈاکٹر سے شدید شکایت نہیں ہے! یہ کیوں؟

ڈاکٹر کے پاس دو طرح کے مریض آتے ہیں، ایک جو واقعی بیمار ہوتے ہیں اور ڈاکٹر کی صحیح ہمدردی اور توجہ کے مستحق ہوتے ہیں۔ یہ بیچارے خاموشی سے آتے ہیں جی لگا کر علاج کرنے میں ڈاکٹر کے کہنے پر عمل کرتے ہیں اور آخر میں اچھے ہو کر چپ چاپ چلے جاتے ہیں یا مر کر خاموشی سے قبرستان پہنچ جاتے ہیں۔ مریضوں کی دوسری قسم حسب ذیل گروہوں میں بانٹی جا سکتی ہے۔

(۱) خیالی مریض　جو صرف اپنے خیال میں بیمار ہوتا ہے۔
(۲) جنسی مریض　جس کے مرض کا سبب جنسی تعلقات ہیں۔
(۳) مالی مریض　〃　〃　〃　مالی نقصان یا منفعت ہو۔
(۴) سیاسی مریض　〃　〃　کوئی سیاسی چال ہو۔

دسمبر کا مہینہ تھا اور اندھیری رات کا وقت، موسلا دھار بارش ہو کر رکی تھی کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹا کر آواز دی "ڈاکٹر صاحب، جلد باہر تشریف لائیے" میں جھنجھلا کے لباس پہن باہر نکلا، دیکھا خان بہادر ــــــ کا ملازم موٹر لئے کھڑا ہے۔ خان بہادر کے خیال سے ہی گھبرایا، مگر جب ملازم نے مریض کی نازک حالت بتائی اور یہ کہ مریض کوئی دم کے مہمان ہیں تو بادل نخواستہ جانا ہی پڑا۔ کڑاکے کی سردی میں پانچ میل کی مسافت کھلی موٹر میں طے کرنا پڑی۔ واللہ ہاتھوں کی انگلیاں مفلوج ہو کر جم گئیں۔ آنکھوں سے گرم گرم آنسو رواں ہو گئے اور ناک تو ایسی ٹھٹھری کہ گویا چہرہ پر سے بالکل غائب ہو گئی۔ خان بہادر کی عظیم الشان حویلی میں پہنچ کر اُن کے کمرے میں داخل ہوا۔ دیکھا کمرے کے تمام دروازے کھڑکیاں بند ہیں۔ آتشدان میں آگ بھڑک رہی ہے۔ خان بہادر کے عالیشان چھپر کھٹ کے دونوں طرف دو دہکتی ہوئی انگیٹھیاں رکھی ہیں اور خان بہادر موٹی رضائی، کمبل اور دُھسّے کے پہاڑ جیسے ڈھیر کے نیچے دبے پڑے ہیں۔ ان کے سر پر ایک اونی ٹوپی چڑھی ہے، ہاتھ پاؤں میں اونی دستانے اور موزے لگے ہیں اور دو دو موٹے اونی سوئٹر پہنے ہیں۔ چار ملازم چھپر کھٹ کے چاروں طرف کھڑے ہو کر ان کے بدن، سر اور بدن کا کچومر نکال رہے ہیں۔ میں جب باہر کی شدید سردی کے بعد اُن کے کمرے میں داخل ہوا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں دہکتے ہوئے دوزخی کمرے میں آ گھسا ہوں جہاں یہ جہنمی فرشتے کسی گنہگار کی تکا بوٹی کر رہے ہیں!

میں نے خان بہادر کے پلنگ پر بیٹھ کر اُن کی مزاج پرسی کی۔ وہ بہت دیر کے بعد بڑی نحیف اور کراہتی ہوئی آواز میں گویا ہوئے: "اوہ اوہ، برا حال ہے، دم گھٹ رہا ہے، خدا کے لئے میری جان بچائیے، میں مر رہا ہوں، آہ! آہ!"

میں نے ان کی نبض دیکھی، دل اور صدر کی آوازیں سُنیں۔ ماشاء اللہ خوب

سب حسب معمول پڑے دعا... دعک کر رہے تھے اور اپنی صحت اور طاقت کا ڈنکے کی چوٹ اعلان کر رہے تھے۔ میں دل ہی دل میں مسکرایا۔ میں ان کے مزاج اور مرض سے واقف تھا۔ جانتا تھا کہ جب تک ان کے نفسیاتی مرض کا شاندار طریقے سے علاج نہ کیا جائے گا یہ اچھے نہ ہو سکیں گے۔ چنانچہ میں نے ڈرامہ شروع کیا۔ ان کی نبض دیکھ کر ان کے پلنگ سے اچک کر کھڑا ہو گیا اور اپنی ہر حرکت سے یہ ظاہر کرنے لگا کہ ان کی حالت واقعی بہت نازک ہے۔ نوکروں کو گھبرا کر جلد گرم پانی، ٹھنڈا پانی، برف، سوڈا صابن، تولیہ، سلفچی وغیرہ وغیرہ بھاگ کر لانے کو کہا اور خود اپنا کوٹ اتار کر دور پھینکا اور بیستی سے اپنی قمیص کی آستینیں کہنیوں تک چڑھا لیں۔ جیسے مجھے جلد اور بہت بڑا آپریشن کرنا تھا۔ اسی درمیان میں میں نے ... ہی بھاگ بھاگ کر کمرے کے دروازے اور کھڑکیاں کھول دیں۔ انگیٹھیوں کو باہر لے جانے کا حکم دیا اور خان بہادر کے پلنگ پر محض ایک دبیز سا لحاف چھوڑ کر باقی تمام کمبل وغیرہ دور ہٹا دئیے اور ان کی اونی ٹوپی، مفلر، دستانے اور موزے بھی اتروا ڈالے۔ اس کے بعد میں نے ایک میز پر کسی جادوگر کی طرح اپنے بیگ کا تمام الم غلم سامان نکال کر سجا دیا مگر اس طرح کہ ان پر خان بہادر کی نظر پڑے اور وہ دیکھیں کہ ان کے علاج کے لئے بہت سی دواؤں اور آلوں کی ضرورت پڑ رہی ہے۔ نوکر جب میری منگوائی ہوئی چیزیں لا چکے تو میں نے جلد جلد صابن سے ہاتھ دھوئے۔ سوئی کی پچکاری میں دوا چڑھائی اور دوڑ کر خان بہادر کے بازو میں سوئی لگا دی۔ پھر بھاگتا ہوا آیا اور سوڈا واٹر رکھا ہوا پانی میں چند دواؤں کو ملا کر ان کو پلا دیا۔ یہ کام کرنے کے بعد میں نے ذرا اطمینان سے خان بہادر کی نبض دیکھی جو بدستور تندرست ستار کی طرح بج رہی تھی، اور بڑے ڈرامائی یقین کے ساتھ پوچھا "کہیئے خان بہادر صاحب اب طبیعت ٹھیک ہوئی؟"

خان بہادر صاحب ہنستے ہوئے پلنگ پر بیٹھ گئے اور مشکرانہ نگاہ سے میری طرف دیکھ کر بولے "بھائی، تم نے کمال کیا، واللہ فوری علاج میں مسیحا ہو مسیحا، اس بدقسمت شہر میں ڈاکٹر نہیں کرا سکتے رہتے ہیں موذی مجھے دیکھ کر کہتے ہیں کہ مجھے کوئی مرض نہیں۔ بھائی جس کی جان پر بنتی ہے وہی جانتا ہے، یہ گھسیارے کسی کے مرض کو کیا سمجھیں"

میں جب ان کو دوبارہ یقین دلا کر جانے لگا تو وہ اٹھے اور میری جیب میں کچھ ڈال کر مجھے تکلیف دینے کی معافی چاہنے لگے اور بولے کہ بڑا ناوقت ہو گیا ہے۔ میں جب اپنے ہاں لوٹ کر آیا تو رات کے تین بج چکے تھے، میں نے جیب سے "کچھ" نکال کر دیکھا، دس دس روپے کے دس نوٹ تھے۔ میں نے پلنگ پر لیٹ کر جب جا ہی لی تو ضمیر نے لعنت بھیج کر کہا "پانی کی سوئی کے سو روپے! یہ تو کھلی بے ایمانی ہے!" مصلحت بولی "چپ کرو، اب جاؤ، راستی فتنہ خیز سے دروغ مصلحت آمیز بہتر ہے"

برسات کی ایک کاجل جیسی کالی رات میں جبکہ ہر طرف کالے کالے بادلوں کی یورش ہو رہی تھی اور کوئی دم میں چھاجوں پانی برسنے والا تھا ایک صاحب لیٹن سے آراستہ اور نک سک سے درست گھبرائے ہوئے تشریف لائے، رات کے بارہ بج چکے تھے اور میں اپنا مطالعہ ختم کر کے اٹھنے ہی والا تھا۔ وہ آئے اور اس طرح چپ ہو کر بیٹھ گئے کہ ہزاروں سوال کا ایک جواب دیتے اور وہ بھی دور دور سے اور ادھورا۔ آخر جب میں تنگ آ گیا تو بہت جھینپ کر بولے "اب کیا عرض کروں شرم سے پانی پانی ہوا جا رہا ہوں، آج چوک کے ایک کوٹھے پر ایسی غلطی سرزد ہو گئی ہے کہ کہیں میرے گناہ کا خمیازہ میری نئی نویلی دلہن کو بھگتنا نہ پڑے جسے میں گذشتہ ماہ بیاہ کر لایا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب اب میری دلہن کی عزت آپ کے ہاتھوں میں ہے، کچھ کیجئے ورنہ میں تو کہیں کا نہ رہونگا"

یہ سن کر میرا جی چاہا کہ کسی مولوی کی طرح اس بدخلق سے نفرت کر دوں اور اسے نار جہنم کے التہاب میں چھوڑ کر خود جنت کی حوروں کے ساتھ گھومنے نکل جانے کو چلدوں مگر یاد آیا کہ میں ڈاکٹر ہوں جس کا کام کسی کی تکلیف کو مٹانا ہے نہ کہ گرتے ہوئے کو اور گرانا ہے۔ مجھے اس نوجوان کی نئی نویلی دلہن کا گھونگھٹ میں چھپا ہوا چہرہ دکھائی دینے لگا جو عنقریب اپنے شوہر کی نفس پرستی کی قربانگاہ پر مدت العمر کے لئے بھینٹ چڑھنے والی تھی۔ مجھے اس معصوم ہستی اور اس ناتجربہ کار نوجوان پر شدید رحم آیا اور میں نے کوئی دو گھنٹہ میں وہ تمام محافظ تدبیریں کر ڈالیں جن کے بعد امراض کے ہونے کا کوئی خدشہ باقی نہیں رہتا۔ آخر میں میں نے اس سے کہا "میاں پھر ایسی کبھی کوئی غلطی نہ کرنا۔ آج تو آپ محض اپنی دانشمندی کی وجہ سے بچ گئے۔ یاد رکھئے آپ کی لغزش سے نہ صرف آپ کی بیوی کی صحت برباد ہوگی بلکہ آپ کے ہونیوالے بچے بھی بیمار ہونگے"

ایک دن سہ پہر کے وقت میں ٹینس کھیلنے کی تیاری کر رہا تھا کہ رائے بہادر ... کے آنے کی اطلاع ملی۔ رائے بہادر صاحب ساٹھ سالہ دبلے پتلے جسم کے معدے کے دائمی مریض تھے اور مجھ سے عرصہ سے علاج کرانے کے سبب سے کافی بے تکلف ہو چکے تھے۔ مجھے آتا دیکھ کر لپکے، میرے شانہ پر ہاتھ رکھ کر برآمدہ سے کمرہ میں لے آئے اور ایک کرسی پر مجھے بٹھا کر خود دوسری پر بیٹھ گئے اور رازدارانہ لہجہ میں پوچھنے لگے "آج آپ نے میری کہارن کو دیکھا ہے، کہئے اسکے مرض کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟"

یہ کہہ کر رائے صاحب نے مجھے اس شاطر کی نگاہ سے دیکھا جو عنقریب اپنے مخالف کو بیدل کی مات دینے والا ہے، میں گھبرایا، پہلو بدل کر نظریں نیچی کر لیں اور مشکوک ہو کر دل میں کہا کہ دال میں کچھ کالا کالا ہے مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا ہے۔ ٹالنے کے لئے میں نے جواب دیا "کچھ خاص مرض تو ہے نہیں، البتہ قے اور متلی کی شکایت ہے جو غالباً بدہضمی کی وجہ سے ہے، یہ بھی دوا ایک دن میں جاتی رہے گی"

میرا یہ جواب سن کر رائے بہادر صاحب خوب ہنسے۔ ان کے معنی خیز ہنسی

کا سنت قہقہہ کے تلاطم میں ناؤ کی طرح ڈگمگانے لگا۔ وہ جوانوں کی طرح آنکھیں میچ کر اور میرے زانو پر دھول رسید کرکے بولے "واللہ، اجی ڈاکٹر صاحب، رہے آپ بھی کالج کے کچے شلغم، کچھ نہیں سمجھے، اجی حضرت اس لونڈیا کے تو پاؤں بھاری ہیں، پاؤں۔ کوئی چند دن سے تو یہ قے کرتی رہتی ہے۔ متلی سے اس کا بُرا حال ہے۔ اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے الگ پڑ گئے ہیں، کیا تصدیق کیلئے مزید علامتوں کی ضرورت ہے؟"

میں نے اظہار حیرت کرتے ہوئے کہا "مگر رائے صاحب وہ تو ابھی کنواری ہے!"

میرا یہ جواب سنکر رائے بہادر صاحب خوب ہنسے، اپنی خضاب والی لمبی مونچھیں کھول کر دیر تک فاتحانہ انداز سے ہنستے رہے۔ پھر بولے "میں نہ کہتا تھا کہ ابھی تم کو دنیا کا تجربہ نہیں ہوا ہے۔ کیا تمہاری کسی کتاب میں لکھا ہوا ہے کہ کنواری حاملہ نہیں ہو سکتی؟ اگر لکھا ہے تو اس کتاب کو پھاڑ کر پھینک دو۔ تمہاری آنکھوں کے سامنے اس لونڈیا کی زندہ مثال موجود ہے۔ چلو بھائی، یہ بھی اچھا ہوا، خدا کی اسی میں مصلحت تھی کہ وہ مجھے اس عمر میں ایک ننھے بچے کا باپ بنائے۔ ڈاکٹر تمہارے ان انجکشنوں نے واللہ جادو کا کام کیا، اچھا دیکھو، کل سے تمہاری ڈیوٹی ہو گئی کہ لونڈیا کو روزانہ جا کر دیکھو اور ہر احتیاطی تدبیر کو کام میں لاؤ تاکہ بچہ اور زچہ دونوں خیریت سے رہیں۔"

رائے بہادر یہ کہہ کر ہنستے ہوئے اُٹھے، میری میز پر جھک کر دس روپے رکھ دیئے اور اپنی رولس میں بیٹھ کر چلے گئے۔ میں اُن کو حیرت اور خوف سے حدِ نظر تک دیکھتا رہا۔ میں تقریباً ایک سال سے ان کے ضعف پیری کا علاج کر رہا تھا اور ان کو اچھی طرح سے جانچ کر اس نتیجہ پر پہونچ چکا تھا کہ ان میں اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت کبھی بھی نہیں آ سکتی۔ ایک ماہ بعد جب مجھے کامل یقین ہو گیا کہ اس کمہارن کی چھوکری کو واقعی حمل ہے تو میں اُس کی عیاری کا قائل ہو گیا۔ اللہ اللہ ایک سولہ سالہ جاہل مطلق کنواری لڑکی میں بھی ایک ہوس پرست بڈھے کھوسٹ کو بیوقوف بنانے کی اتنی صلاحیت ہوتی ہے۔

شام ہونے والی تھی اور میں سنیما جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ میں جب موٹر میں بیٹھ چکا تو میرے ایک دیرینہ ملاقاتی مُنہ پر رومال رکھے بھاگتے ہوئے آئے اور بولے "بس ایک منٹ۔ ایک دانت میں کل رات سے سخت درد ہے، کوئی دوا فوراً تجویز کر دو۔"

میں جب نسخہ لکھنے لگا تو میرا قلم پکڑ کر بولے "یہ دوا نہیں، کوکین کا نسخہ لکھ دو، اس سے پہلے بھی فوری سکون مل چکا ہے۔"

میں نے نسخہ لکھ کر اُن کے حوالے کیا اور جھا تپور تصویر دیکھنے کے لئے چلا گیا۔ دوسرے دن شہر کا ایک کیمسٹ جس کے ہاں میرے نسخے بننے کے لئے جایا کرتے تھے آیا اور رازدارانہ لہجہ میں بولا "کل آپ نے فلاں صاحب کیلئے کوکین کا نسخہ لکھ دیا تھا۔ یہ حضرت تو پُرانے کوکین خوروں میں سے ہیں اور شہر کے تمام محکمہ آبکاری والے ان کی کرتوت سے واقف ہیں، جو ڈاکٹر اُن کے لئے کوکین کا نسخہ لکھتا ہے وہ بھی اُن کے ساتھ بدنام ہو جاتا ہے۔ آپ اس شہر میں نو وارد ہیں، ذرا احتیاط سے کام لیجئے۔"

کیمسٹ کی اس تنبیہ سے مجھے بڑا ندامت ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ دانت کے درد کے ساٹھ فی صدی، درد کمر کے تیس فی صدی مریض حقیقت میں کوکین خور تھے جو [illegible] کے نسخے لکھوانے آتے تھے۔

[illegible] کا ایک خاندان آباد تھا۔ جن کی آبائی دولت اُن بدن کم ہو [illegible] فاقہ مستی کی نوبت آ گئی تھی۔ اسی خاندان کے ایک بزرگ [illegible] سے ذرا مختلف تھے اور اپنے حق کی جائداد پر سانپ کی طرح بیٹھے ہوئے تھے اپنی اولاد کے حملوں سے بچا رہے تھے۔ یہ مجھ سے اکثر ملتے تھے اور میں بھی ان کی کفایت شعاری اور سوجھ بوجھ کا قائل تھا۔ ایک رات ان کا فون پہونچا اور وہ خود گھر آکر مجھے بلا کر لے گئے۔ ان کے بنگلہ نما محل کی پشت پر کچھ ٹوٹے پھوٹے مکانات تھے اور انہیں مکانات میں ایک کوٹھری تھی جس میں مجھے لے جایا گیا۔ لالٹینوں کی مدھم روشنی میں دیکھا کہ ایک چودہ سالہ لڑکی خون میں لت پت پڑی ہے اور درد سے کراہ رہی ہے۔ نبض دیکھی تو ساقط ہونا چاہتی تھی، خون کثرت سے نکل چکا تھا۔ میں نے اشارہ سے کچھ کہنا چاہا [illegible] جھک کر میرے گھٹنے پکڑ لئے اور بولے "ڈاکٹر صاحب [illegible] کچھ نہ کہیئے۔ شیطان کے بہکانے میں آ گیا، غلطی ہو گئی ہے، نادم ہوں۔ خدا کیلئے اسے بچا لیجئے ورنہ میں تو کہیں کا نہ رہونگا۔"

اُن کی بزرگ صورت اور مونچھوں پر ندامت والے آنسو دیکھکر رحم آ گیا۔ جس طرح بھی بن پڑا بہتے ہوئے خون کو روکا، گرم گرم سیلائن (Saline) ورید میں چڑھایا، سوئیاں دیں آخر تندہی کرکے صبح کے چھ بجے۔ اور مجھے اطمینان ہوا کہ یہ ننھی سی جان اب بچ جائیگی۔ میں منہ اندھیرے جب کوٹھری سے باہر نکلا تو دیکھا کہ نواب صاحب [illegible] باہر مصلیٰ بچھائے سجدے میں پڑے ہیں۔ رو رہے رو رہے گھگی بندھ گئی ہے اور اللہ میاں کو خوش [illegible] گریہ وزاری کی شدت سے مرعوب کر رہے تھے۔ انسان کی جنسی کمزوری اس کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ میری نظروں کے سامنے اس وقت کچھ عجیب قسم کا اجتماع ضدین تھا۔ کوٹھری کے اندر گناہ کبیرہ کا ارتکاب اور کوٹھری کے باہر اظہار تقدس و ندامت۔ کیا ہر انسان کی زندگی کے دو رُخ نہیں ہیں؟

میں ایک دن صبح کے وقت مریضوں کے ہجوم میں گھرا ہوا تھا کہ ایک مکھی دوڑاتی ہوئی احاطہ کے اندر گھس آئی۔ میں نے ملازم سے کہا کہ اس مکھی کو باہر

کر دے، یہ حیا الان غریب تھی ... گی مگر اس کی بات کی کسی نے پروا نہ کی۔ بجلی کے اندر سے کسی زمانہ آور نے اُسے ڈانٹ کر بھگا دیا۔ مجھے اتنی مہلت نہ تھی کہ اس دخل در معقولات کو روکتا۔ میں نے جب مریضہ کو دیکھنے کے لئے بلوایا تو وہ ٹال اور جتلا بھیجا کہ جب سب لوگ چلے جائیں گے تو وہ آئے گی، کیونکہ وہ تنہائی ہوں تو آئی، اس کی بوڑھی ملازمہ باہر بیٹھ گئی اور وہ خود اندر آ گئی۔ اس کی کوئی اٹھارہ سال کی عمر ہوگی، چہرہ خوبصورت اور آنکھیں چمکدار اور دلکش تھیں، کپڑے بھی صاف ستھرے اور نہایت موزوں پہن رکھے تھے۔ وہ ایک شاہانہ استغنا سے آئی اور بغیر میری اجازت کے میرے سامنے بیٹھ کر مسکرانے لگی، اور اپنی آنکھوں میں لگاوٹ کی چمک پیدا کر کے بولی "ڈاکٹر صاحب آپ تو مجھے دیکھ کر حیران ہوں گے کہ یہ کون بلا ہے، میرا نام ——— ہے اور میں گوہر رہتی ہوں یہاں خاص آپ سے ملنے آئی ہوں۔ سنا ہے آپ بڑا اچھا علاج کرتے ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ چپ ہو گئی اور مجھے غور سے دیکھنے لگی کہ ... کیا اثر پڑا۔ میں نے اس کا دل خوش کرنے کے لئے ذرا ہنس کر کہا "آپ کی مہربانی ہے جو آپ نے میرے متعلق اس قدر اچھی رائے قائم کر لی ہے ورنہ ہم جیسے ڈاکٹر تو آپ کے اپنے شہر میں بہتیرے ہیں۔ ہاں تو بیان کیجئے کہ آپ کو کیا تکلیف ہے؟"

وہ یہ سُن کر ناز سے بولی "اجی آپ ڈاکٹر کاہے کے ہیں، صورت دیکھ کر بھی نہ تاڑ گئے کہ مجھے کیا مرض ہے؟ پہچانتے بھی ہیں؟ نہیں پہچانتے ہیں تو لیجئے میں آپ سے روٹھی جاتی ہوں۔" یہ کہہ کر اُس نے اپنا منہ پھلا لیا اور اپنے چہرہ پر گھونگٹ نکال کر مجھ سے ذرا کج ہو کر بیٹھ گئی۔ میں ہنس پڑا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ مریض کی جگہ ایک زبردستی کی معشوقہ نے لے لی تھی۔ میں حیران تھا کہ خدایا یہ کیا تماشہ ہے اور یہ کس طرح کی مریضہ ہے۔ چھریرا گدرایا ہوا جسم، مدبھری شراب پینے پلانے والی آنکھیں، سانولا سلونا رنگ، صراحی دار گردن، رس میں ڈوبے ہوئے سُرخ سُرخ ہونٹ، تھرکتی اور ڈولتی ہوئی چال۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کہ کیا کہوں اور کس طرح لال بجھکڑ بن کر ایک تندرست انسان کو بیمار بنا دوں۔ مجھے خاموش دیکھ کر وہ آپ ہی گھونگٹ کے اندر سے بولی "بس ختم ہو گئی آپ کی ڈاکٹری، ذرا میری نبض تو دیکھیے، دل ہے کہ نگوڑا آپ ہی آپ بیٹھا جاتا ہے، نہ دن کو چین ہے اور نہ رات کو قرار۔"

میں نے نبض دیکھی۔ اس کی تشفی کے لئے اس کے دل، صدر، جگر، طحال کا معائنہ کیا۔ سب ٹھیک، سب اپنی اپنی جگہ پر گھڑی کے پرزوں کی طرح چک چک چل رہے تھے۔ میری عقل نے کام کرنا چھوڑ دیا۔ میں حیران و پریشان ہو کر ایک بار پھر خاموش ہو گیا۔ آخر ٹالنے کے لئے اسے ایک نسخہ دے کر کسی طرح اپنی جان چھڑائی۔

اس کے بعد اُس نے روز آنا شروع کیا، وہی شوخی و طنازی، وہی ناز و عشوہ۔ وہ ہر روز اپنے ترکش میں سینکڑوں نئے نئے زہر میں بجھے ہوئے تیر لیکر آتی اور ان کو یکے بعد دیگرے مجھ پر چلا کر جھنجھلاتی، غصہ کرتی اور آخر میں میری تشخیص میں سینکڑوں عیب نکال کر چلی جاتی۔ میں نے ایک دن اس سے کہا "آپ زیادہ تکلیف نہ کریں، آپ کا مرض لاعلاج ہو چکا ہے۔"

میرے اس فیصلہ کو وہ سُن کر ہنسی اور اس کا شوخ چہرہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ اس کی بڑی بڑی کاجل لگی آنکھوں میں آنسو کے قطرے موتی کی طرح جھلملانے لگے۔ وہ بولی "آہ، آپ نے میرے مرض کو نہ پہچانا۔ میرا دل کسی کی یاد میں ہر گھڑی روتا رہتا ہے۔ جب سے سنا ہے کہ ..... صاحب آپ کے معتقد اور اکثر آپ کے زیر علاج رہتے ہیں میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ ان کے سامنے اپنے لئے آپ سے سفارش کراؤں گی۔ آہ ڈاکٹر صاحب، ان کے بغیر میری زندگی نامکمل ہے، کسی کمینے نے ان کے کان میری طرف سے بھر دئے ہیں اور انہوں نے تین ماہ سے میرے ہاں آنا جانا چھوڑ دیا ہے۔ خدا کے لئے آپ میری مدد کیجئے، سُنا ہے وہ آپ کی بات بہت مانتے ہیں۔"

میں یہ سُنکر حیرت زدہ ہو گیا۔ میرے پاس ایسی فرمائش کا کوئی اور جواب نہ تھا۔ ٹالنے کے لئے میں نے ہاں کر دیا اور اُسے یقین دلا کر گیا واپس کر دیا کہ میں ہفتہ عشرہ میں ان صاحب کو راضی کر کے اسکے ہاں ضرور بھیج دوں گا۔

اُوپر کے چند نمونوں سے ناظرین کو ایک ڈاکٹر کی پریشانیوں کا کچھ حال معلوم ہو جائے گا۔ غریب ڈاکٹر کی ایک جان ہے مگر اس کے گاہک سینکڑوں ہیں — یہ گاہک بھی عجیب عجیب قسم کی اُمیدیں لیکر ڈاکٹر کے پاس آتے ہیں۔ اگر بیچارہ بوکھلایا ہوا ڈاکٹر اپنے مہربان کو خوش نہیں کر سکتا تو اس میں کسی کو ناراض نہ ہونا چاہئیے۔ ایک شریف طبیب، ہمدرد اور ایماندار ڈاکٹر ابن آدم کا تنہا مخلص اور دوست ہوتا ہے۔ اس نے انسان کے دکھ درد اور تکلیف کو رفع کرنے کا بیڑا اُٹھایا ہے اور اس کے اس مبارک ارادہ میں ہر شخص کا یہ فرض ہے کہ اس سے ہمدردی کرے، اس کی مشکلوں کو سمجھے اور پیٹھ پیچھے ہمیشہ اُسے کلمۂ خیر سے یاد کرے۔

نوٹ:- اس مضمون کا ہر نام فرضی ہے۔ کوئی صاحب کسی ایک واقعہ کو بھی اپنی طرف منسوب نہ کریں، ایسا کرنے میں انہیں کا نقصان ہوگا۔

نرگس

یہ ایک ناول ہے جس میں ایک طوائف کی دردناک و عبرت انگیز زندگی کے حالات پیش کئے گئے ہیں۔ نہایت غمناک کہانی ہے جسکے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی گناہ آلود زندگی گذارنے والی کے پہلو میں ایک حساس اور محبت کرنے والا دل دھڑکتا رہتا ہے۔ اور جب ایسا ہوتا ہے تو اُس کی تباہی و بربادی کس طرح ہوتی ہے۔ یہ سب کچھ آپ کو نرگس کے مطالعہ سے معلوم ہوگا۔ قیمت دو روپے! علاوہ محصولڈاک!

ملنے کا پتہ:- ساقی بُک ڈپو، دہلی!

ساحلی

ایک تھے راجہ

جاڑے کا زمانہ تھا۔ راجہ صاحب دُبلے پتلے سانولے، دھوپ میں ننگ دھڑنگ لیٹے ہوئے تھے۔ ایک چھوٹی سی دھوتی پہنے ہوئے، حجام تیل کی مالش کر رہا تھا۔

"حضور۔ بڑے راجہ صاحب کے زمانہ میں رنگ ڈھنگ دوسرے تھے۔ جلسے جتے تھے۔ ناچ گانا۔ دعوتیں۔ ملنے والے خوب حاضر رہا کرتے تھے۔ مگر آپ تو سادھو ہیں، سادھو۔ ایشور کا دیا سب کچھ ہے۔ دھن دولت، اتنا بڑا علاقہ۔ ایک سے ایک مال حاضر ہو سکتا ہے حضور کے حکم کی دیر ہے۔"

راجہ صاحب مسکرائے۔ سانولی رنگت پر سرخی تو کیا، اکتاہٹ دوڑ گئی۔ لیکن حکم نہ ہوا۔

"بابو جانکی پرشاد حضور کے ایک تمولی اہلکار ہیں۔ لیکن سُنا ہے شہر میں بڑی کوٹھی بنوا رہے ہیں۔ اور عیاشی میں تو راجاؤں مہاراجوں سے نمبر لے جاتے ہیں۔ کلکتہ بمبئی سے بڑی بڑی نامی رنڈیاں بلائی جاتی ہیں۔ صاحب لوگوں کے ساتھ شراب پیتے ہیں۔۔۔۔"

"ہوں، تو جانکی پرشاد نے بہت پر نکالے ہیں۔"

"حضور کے حکم کی دیر ہے۔ جانکی پرشاد جیسے کتنے نپٹ چکا ہوں۔ بڑی رانی کا ڈر نہ ہوتا تو کب کا خاتمہ کر چکا ہوتا۔۔۔۔"

"خاموش رہو۔"

بڑی رانی اور بابو جانکی پرشاد کے تعلقات کا تذکرہ سارے قصبہ میں ہو رہا تھا۔ راجہ صاحب اپنی ماں سے بہت ڈرتے تھے۔ اس لئے دخل نہ دے سکتے تھے لیکن اب یہ سُنا جاتا تھا کہ بزرگوں کی جمع کی ہوئی دولت بھی جانکی پرشاد کی عیاشیوں کے حوالے ہو رہی ہے۔ اس لئے راجہ صاحب کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا۔

"کل شام کو بابو جانکی پرشاد علاقہ پر سے تحصیل وصول کر کے واپس آ رہے ہیں۔ راستہ خطرناک ہے، اور ڈاکہ پڑ جانا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ ـــ آج سورج ڈوبنے کے بعد ٹھاکر گربخش سنگھ کو میرے پاس لے آنا۔ باغیچہ میں ملوں گا۔"

آفتاب غروب ہونے کے بعد راجہ صاحب چہل قدمی کے حیلہ سے باغیچہ میں چلے گئے۔ اور تھوڑی دیر بعد ان کے مشیر کار بھی ایک ایک کر کے پہونچ گئے۔ جانکی پرشاد کے قتل کی پوری سازش ہو گئی۔ ڈاکہ میں جو رقم ہاتھ لگنے کی اُمید تھی اُس کے علاوہ گربخش سنگھ نے کچھ روپیہ اور طلب لیا۔

جس کا راجہ صاحب نے وعدہ کر لیا۔ پولیس سے بندوبست کر لینے کا بھی ذمہ لیا۔ حجام نے اپنی کارپردازی کا صلہ پہلے ہی وصول کر لیا تھا۔

راجہ صاحب کھنکھار رہے تھے کہ بڑی رانی آئیں لوگوں کو کمرہ سے باہر کر دیا۔

"نریندر۔ تم نرے پاگل ہی ہو۔ اپنے بھائی کے قتل کا انتظام کر رہے ہو؟"

راجہ صاحب متعجب ضرور ہوئے لیکن کچھ نہ سمجھے۔

"میں نے سوچ رکھا تھا کہ مرتے دم تک تم کو نہیں بتاؤں گی، لیکن تم نے مجھ کو ایسا مجبور کر دیا ہے کہ اب کوئی بات چھپانے کا وقت نہیں۔ تم بیوقوف سمجھتے ہو کہ جانکی پرشاد سے مجھ سے ناجائز تعلقات ہیں میں اب بڈھی ہوئی۔ اور ان سب باتوں کا موسم گیا۔ جانکی پرشاد میرے بیٹے کی طرح ہے۔ کیونکہ وہ راجہ صاحب یعنی تمہارے پتا جی کا بیٹا ہے۔ راجوں مہاراجوں کے یہاں یہ کوئی انوکھی بات نہیں۔ جانکی کی ماں بڑی سُندر تھی۔ شاید اب تم سمجھ گئے ہو کیوں میں تمہاری نابالغی کے زمانہ سے اس کو بہت کچھ دولت دیتی رہی ہوں۔ ایشور کے یہاں جتنا تمہارا حق ہے، اس سے نہیں زیادہ اُس کا ہے کیونکہ تم راجہ کے بیٹے نہیں ہو۔ یہ بھی سُن لو۔ میں بھی انسان تھی۔ جب راجہ صاحب مدتوں میری طرف توجہ نہیں کرتے تھے تو میں نے بھی دوسری جگہ دل لگا لیا۔ اور ایشور کا کرنا یہ کہ میرا بیٹا راجہ بن گیا۔ اور راجہ کا بیٹا اُس کا ایک ادنیٰ اور نمک حرام اہلکار ہے۔"

"ماں جی۔ تم تو بڑا پاپ ہوا۔ یہ تو گنگا نہانے سے بھی نہ دھلے گا۔"

"اگر تو راجہ کا بیٹا ہوتا تو یہ بات نہ کہتا۔ مگر تو ایک سادھو کا بیٹا ہے۔ خیر میں تو اب تیرتھ کو چلی جاؤں گی اور واپس آنا بھی مشکل ہے۔"

راجہ صاحب دھوپ میں ننگ دھڑنگ دُبلے پتلے سانولے لیٹے ہوئے تھے۔ حجام تیل کی مالش کر رہا تھا۔ اور آج اُس کا چہرہ بہت ہشاش بشاش تھا کیونکہ راجہ صاحب اور بڑی رانی دونوں کے پاس سے رقم وصول کر کے بیٹھا تھا۔

"حضور۔ آپ تو سادھو ہیں۔ سادھو۔"

چھتیس ۳۶ افسانوں کا مجموعہ:- ساقی کا "افسانہ نمبر ۱۹۴۵ء" نثر اور نظم کے بیش بہا افسانے!
قیمت ایک روپیہ چار آنے: ساقی بکڈپو دہلی سے طلب فرمائیے!

صلاح الدین قریشی

یہ بھی ایک جنون ہے

لطفی یک حسبِ معمول [illegible] کے مشہور قہوہ خانے میں پہنچا۔ مطلع صاف تھا اور ہوا [illegible] رہی تھی [illegible] ایک کرسی پر بیٹھ گیا [illegible] بوائے سے برف کا پانی لانے کو کہا۔ اس نے جیب سے [illegible] نکالی [illegible] دیکھی لگا:

—— ساڑھے چار بجے [illegible] میں آئے یہ کیا معاملہ ہے؟

ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ سامنے سے اس کا دوست عفت [illegible] نظر آیا [illegible] دیکھ کر [illegible] اور رسمی سلام دعا کے بعد وہ [illegible] لطفی [illegible] بوائے [illegible] کچھ پینے کے لئے لانے کو کہا [illegible] کے بعد [illegible] صحت کے متعلق گفتگو ہوتی رہی اور [illegible] کا ذکر چھڑ گیا۔ اس کے بعد عفت نے اپنی جائداد [illegible] مقدمے کی تفصیل بیان کرنی شروع کر دی اور اس [illegible] گھنٹہ صرف ہو گیا۔ آخر جب [illegible] موضوع ختم ہو گئے تو دونوں نے اخبارات خریدے اور [illegible] بیچ میں وہ خالص سیاسی معاملات پر گفتگو کرتے [illegible] جاری تھا۔

اسی دوران میں ایک [illegible] ان کے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے پر زرد [illegible] داڑھی ہوئی تھی اور بالکل [illegible] تھا۔ سر پر ایک لمبی سی ترکی ٹوپی تھی اور پاؤں میں عورتوں کی قسم کی اونچی ایڑی کی جوتی پہنے ہوئے تھا۔ وہ سیدھا لطفی کی طرف بڑھا اور ہاتھ بڑھا کر کہنے لگا:

—— ہیلو! مسٹر لطفی! کیا حال ہے؟

لطفی اچانک اچھل پڑا [illegible] بیرونی ممالک کے تار [illegible] انہماک سے پڑھ رہا تھا۔ اس نے سر اٹھایا تو سامنے نصری کو کھڑا پایا۔ پہلے تو وہ اسے دیکھ کر کچھ ناراض سا ہوا لیکن پھر بناوٹی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہنے لگا:

—— "آیئے آیئے!! مزاج تو اچھے ہیں؟ بڑی خوشی کی بات ہے تشریف رکھیئے۔"

اس نے پھر بوائے کو آواز دی۔ نصری کرسی پر اطمینان سے پاؤں پر پاؤں رکھ کر بیٹھ گیا اور بوائے سے خود ہی پیسٹری، مکھن، توس اور چائے وغیرہ لانے کو کہا۔

لطفی دم بخود بیٹھا تھا اور دل ہی دل میں سوچ رہا تھا:

—— ارے کمبخت [illegible] مطلب یہ ہے کہ آج شام کے کھانے کی قیمت تیری طرف سے میں ادا کر دوں۔

لیکن پھر بھی اس نے بے پروائی کا اظہار کرتے ہوئے سیٹی بجانی شروع کی۔ وہ ذرا دھیمی آواز میں اپنی پسندیدہ دھن الاپ رہا تھا۔ نصری تک اس کی آواز پہنچ سکی تو اس نے ذرا اونچی آواز میں سیٹی بجانی شروع کی۔ اس پر نصری نے لطفی کو سیٹی بجانے سے روکا۔ لطفی چپ ہو گیا اور زبردستی مسکراتے ہوئے اس نے اپنے دوست عفت کی طرف اشارہ کیا، پھر پوچھنے لگا:

—— کیوں! کیا تمہارا ان سے کوئی تعارف نہیں ہے؟ نصری نے ذرا شائستہ لہجہ میں جواب دیا:

—— میں تو بیرسٹر صاحب کو خوب اچھی طرح جانتا ہوں لیکن شاید وہ مجھے نہیں جانتے، کیوں بیرسٹر صاحب؟

عفت نے نصری کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا:

—— واقعی! بدقسمتی سے مجھے کبھی آپ سے ملنے کا موقع نہیں ملا۔

—— لیکن جناب مجھے کئی بار آپ کو دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ میں نے ایک دفعہ یونیورسٹی کی سوسائٹی میں آپ کی تقریر بھی سنی تھی۔

عفت نے بات کاٹتے ہوئے ذرا تعجب آمیز لہجے میں پوچھا:

—— جی ہاں! آج سے کوئی دس سال پہلے؟

—— جی، جی، آپ کی تقریر کا عنوان تھا "مصر میں جرائم کی حقیقت"

—— اوہو! یہ تو بہت پرانی باتیں ہیں۔

—— اس کے بعد میں نے بارہا آپ کو عدالت میں دیکھا۔ پھر ایک دن آپ اوپیرا ہاؤس میں نظر آئے جہاں مصر جدید کا ایک ڈرامہ کھیلا جانے والا تھا۔ دو سال ہوئے جب آپ اپنے کسی عزیز کو جو ڈاکٹری کی تعلیم کیلئے انگلستان جا رہے تھے رخصت کرنے سعید

پر رخصت کرنے آئے تھے وہاں میں نے آپ کو دیکھا۔ کچھ دنوں بعد میں نے "اعظم" میں آپ کا ایک مضمون پڑھا اور پھر......

یہاں لطفی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا :

—— تو یوں کہیئے آپ تو بیرسٹر صاحب کی سوانح حیات سے تفصیلی طور پر واقف ہیں۔

اس کے بعد ہی وہ اپنے دوست عفت کی طرف متوجہ ہوا اور کہنے لگا :

—— بیرسٹر صاحب! میں آپ سے اپنے دوست مسٹر نصری کا تعارف کراتا ہوں۔ یہ موسیقی کے دلدادہ اور شیدائی ہیں۔ پوسٹ آفس میں ملازم ہیں علاوہ ازیں انہیں چلتا پھرتا اخبار سمجھئے اور ملک کے تمام بڑے لوگوں کے حالاتِ زندگی تو گویا انہیں ازبر ہیں۔

عفت نے نصری کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا :

—— آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ میری خوش قسمتی ہے کہ آپ سے ملاقات کا موقع ملا۔

لطفی اپنے دل ہی دل میں کہنے لگا :

—— بلکہ یوں کہیئے کہ بڑی بدقسمتی ہے جو آپ کی منحوس صورت دیکھنی پڑی۔

بوائے ہاتھ میں پیسٹری وغیرہ کی ٹرے لئے آپہنچا۔ نصری اپنی جگہ سنبھل کر بیٹھ گیا اور کھانے کا سامان اپنے سامنے چنتے ہوئے کہنے لگا :

—— میں چاہتا ہوں کہ آج رات کا کھانا نہ کھاؤں کیونکہ میں آج ایک محفل میں مدعو ہوں۔

لطفی نے ذرا طنز آمیز لہجہ میں کہا :

—— اور وہاں آپ یقیناً گائیں گے بھی۔ اسی لئے شاید آپ باقاعدہ کھانا نہیں کھانا چاہتے۔

نصری نے جلدی جلدی بڑے بڑے لقمے حلق سے اتارتے ہوئے کہا :

—— اگر مجھ سے اصرار کیا گیا تو گانا ہی پڑے گا۔

لطفی کو معلوم تھا کہ نصری کی آواز نہایت بُری ہے اور کوئی گانے کے لئے اس سے اصرار نہیں کر سکتا۔

اچانک نصری نے عفت کی طرف رخ کیا اور کہنے لگا :

—— میں آج آپ کو اپنا ایک نیا گیت سناؤں گا ابھی کھانا کھا کر۔ میں نے یہ گیت شروع سے آخر تک بالکل تیار کر لیا ہے جس نے بھی میرا یہ گیت سنا اسے شیخ سلامہ مرحوم کا گانا ذرا نہیں جچا۔ لوگوں کو میری بنائی ہوئی طرز اور خوبصورت دھنوں پر بڑا تعجب ہوتا ہے... مسٹر لطفی کیا آپ نے میرے نئے گیت نہیں سنے جو ابھی حال میں میں نے تیار کئے ہیں۔

اس کے ساتھ وہ پیسٹری کا ایک بڑا سا ٹکڑا نگلتے ہوئے اپنا نیا گیت سنانے کے لئے گنگنانے لگا۔ جب وہ گیت ختم کرنے لگا تو لطفی کو جھوٹا خوشی کا اظہار کرنا پڑا۔ وہ کہنے لگا :

—— بھئی واہ کیا تیاری ہے؟ کمالِ فن کا کتنا عمدہ نمونہ ہے۔

عفت کے لبوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اس نے بھی اپنے نئے دوست کی آواز کی تعریف کرتے ہوئے کہا :

—— واقعی آپ تو بلاشک شیخ سلامہ مرحوم کے صحیح جانشین ہیں۔

—— شکریہ، شکریہ! بیرسٹر صاحب۔ آپ میرا بالکل تازہ گیت سنئے جو میں آپ کو خاص طور پر سنانا چاہتا ہوں۔ آپ کو بالکل یہی معلوم ہوگا کہ شیخ سلامہ خود آپ کے سامنے گا رہے ہیں۔

اس کے بعد اس نے اپنی بھونڈی آواز میں ایک دوسرا گیت شروع کر دیا۔ اتفاق سے عفت کی کرسی نصری کے بالکل قریب تھی۔ ہر دفعہ سم پر وہ اس بیچارے کو گھور گھور کر دیکھتا تھا تاکہ اس کے کمالِ فن کی داد مل سکے اور عفت بیچارہ ہر دفعہ زبردستی جھوم جھوم کر بلند آواز سے داد دینے پر مجبور تھا۔ وہ بار بار کہہ رہا تھا :

—— سبحان اللہ! سبحان اللہ! گلے میں کتنی مٹھاس ہے! گانے میں کتنا رس ہے!!

خوش قسمتی سے گاتے گاتے نصری کو ہچکیاں آنے لگیں اور دونوں کی جان چھوٹی۔ وہ گاتے گاتے خاموش ہو گیا۔

لطفی نے موقع کو غنیمت سمجھا۔ جلدی سے بل ادا کیا۔ دیر سے وہ دل ہی دل میں گھٹ رہا تھا۔ نصری ابھی تک کھانا کھا رہا تھا۔ آخر اس نے کہا :

—— اچھا! مسٹر نصری خدا حافظ۔ ہم لوگوں کو چونکہ بہت ضروری کام ہے اس لئے اجازت چاہتے ہیں انشاء اللہ پھر ملاقات ہوگی

اس کے بعد ہی عفت بھی اٹھا اور کہنے لگا :

— جناب بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ اُمید ہے پھر آپ سے ملاقات ہوگی اور کچھ سُننے کا موقع ملے گا۔

قہوہ خانے سے نکلتے ہی عفت نے نصری کو ستانا شروع کیا۔

— واہ حضرت یہ کس مصیبت میں پھنسا دیا آج آپ نے مجھکو! اُف یہ زہریلا راگ۔ ایسی بری آواز میں گانے لگا وہ لعنتی۔

نصری نے حسب عادت ہنسی ہنستے ہوئے معذرت کرنی چاہی۔

— بھئی یہ بیچارہ گانے کے جنون میں بری طرح مبتلا ہے بدقسمتی سے گانا وانا کچھ آتا نہیں ہے اور آواز بالکل بھونڈی ہے۔ شہر کے اکثر رہنے والوں کو جانتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ان کی زندگی کے تمام حالات بالتفصیل اسے معلوم ہیں۔ اور مزہ تو یہ ہے کہ باوجود ایک ایک کوڑی کو محتاج ہونے کے انتہا درجے کا فضول خرچ ہے۔

اب نصری اس کے خاندانی حالات کے متعلق جو کچھ معلوم تھا بیان کرنے لگا۔

— یہ بیچارہ بہت اچھے خاندان سے ہے اس کے والد محکمہ عدالت میں بڑے اچھے عہدے پر ملازم تھے۔ جب اُن کا انتقال ہوا ہے تو کافی سرمایہ موجود تھا لیکن ان حضرت نے والد کے مرتے ہی ایک دو سال میں سارا مال و متاع لٹا دیا۔ شادی بھی بڑے اچھے خاندان کی لڑکی سے ہوئی تھی آخر میں اس کی جائداد وغیرہ بھی رہن ہو گئی اور وہ بیچاری ادھ مری رہ گئی۔ چار چھوٹے چھوٹے بچے ہیں اور ایک معمولی سے مکان کے نچلے حصے میں یہ سارا خاندان رہتا ہے۔ اب جو رہی سہی سو پچاس روپے ماہوار کی آمدنی ہے وہ مہینے کے شروع میں ہی یار دوستوں میں خرچ ہو جاتی ہے اور پھر سارا مہینہ کچھ سے کچھ بھیک مانگتے گزرتا ہے۔ ذرا سوچنے کی بات ہے دوست! ایک لڑکی جس نے دولتمند گھرانے میں آنکھ کھولی آج اُس کی قسمت پھوٹ گئی جو اس منحوس کے ساتھ مصیبت بھری زندگی کے دن پورے کرنے پڑ رہے ہیں اب وہ بیچاری اپنی محنت کی روٹی کھاتی ہے اور سلائی کے کپڑے سی سی کر سب کا پیٹ پال رہی ہے۔

نصری کھا پی کر قہوہ خانے سے نکلا۔ اس کے چہرے پر مایوسی چھائی ہوئی تھی اور دل ہی دل میں سوچ رہا تھا:

— آج کچھ موقع ہی نہیں ملا کہ نصری سے کم از کم گھر کے کرائے کے لئے ہی کچھ قرض مانگ لیتا۔ مکاندار میری جان کھا رہا ہے اور میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا اب میں کیا کروں گھر پر بیوی بچے بھوکے مر رہے ہیں۔

وہ ارکیتہ پارک کے جنگلے کے ساتھ ساتھ بڑھا چلا جا رہا تھا۔ قریب سے ایک خوبصورت سی لڑکی گزری۔ نصری کی رفتار تیز ہو گئی اور ساتھ ہی اُس نے بے سُری آواز میں حسب عادت آہستہ آہستہ گانا شروع کر دیا۔ گاتے گاتے وہ اچانک خاموش ہو گیا۔ جیب سے رومال نکالا اور پسینہ پونچھتے ہوئے چیخ اُٹھا:

— کرائے ورائے کا کیا غم ہے۔ کسی بار کی طرف چلنا چاہیئے ممکن ہے کوئی دوست ہی مل جائے آج رات اس کے ساتھ ہی کچھ پی لونگا۔ اچھا ہے اس طرح رات تو ذرا آرام سے گزر جائے گی۔

یہ سوچ کر وہ شہر کے مشہور شراب خانوں کی طرف چلا لیکن وہاں کوئی نظر نہ آیا۔ آخر مایوس ہو کر اس نے دوسری تفریح گاہوں کا رخ کیا۔ ایک جگہ وہ کچھ دیر کے لئے چند خوش باش نوجوانوں کی محفل میں زبردستی شامل ہو گیا اور بڑی محنت سے اپنے بے تکے گیت سُناتا رہا۔ بڑی مشکل سے ان بیچاروں نے اپنی جان چھڑائی۔ یہاں سے ناامید ہو کر وہ ایک اور پارک میں پہنچا اور وہاں لوگوں کو اپنے گانوں سے لطف اندوز ہونے کا موقع دینا چاہا لیکن وہ بھی بھاگ نکلے۔ اب دنیا اس کے لئے تنگ تھی۔ وہ دیر تک یونہی آوارہ پھرتا رہا اور آخر کار مجبوراً اپنے گھر کی طرف مُڑ گیا۔

اسی حالت میں وہ گھر پر پہنچا اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ کسی نے دروازہ نہ کھولا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی بیوی آئی اور کواڑوں کے پیچھے سے کہنے لگی کہ مکاندار نے باہر سے قفل لگا دیا ہے اور کنجی اُسی کے پاس ہے۔ وہ آج قسم کھا کر گیا ہے کہ جب تک کرایہ نہیں ملے گا وہ ہرگز قفل نہیں کھولیگا۔ یہ سن کر نصری غصے سے کانپنے لگا۔ اُس نے کواڑوں کو ہلا ڈالا اور غصہ میں دھڑا دھڑ پیٹنے لگا۔ آخر مایوس ہو کر وہ چیخنے لگا اور مکاندار کو گالیاں دے کر بھڑاس نکالتا رہا۔ پھر شکست خوردہ آواز میں بولا:

— آج پھر کہاں رات گزاروں میں؟ کیا سڑک پر جا پڑوں؟

(بقیہ بر صفحہ [illegible])

ظفر قریشی

"جے ہند"

جُمعہ کی رات

(یہی مہینہ، یہی سال)

ابنِ آدم کو دور افتادہ بنتِ حوّا کی طرف" سے پرستش امتثال کا مژدہ پہنچے۔ دیکھو آج مجھے تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں اس لئے تھک جانے کا بہانہ نہ کرنا۔ ورنہ میں ناراض ہو جاتی ہوں۔

آج صبح جب بیدار ہوئی تو بہت تھکی ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ساری رات رنگ برنگی تیلیوں کا تماشہ دیکھتی رہی ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ میں اپنے نکمّے پن کی وجہ سے جلد تھک جاتی ہوں۔ یہاں اس غدّار شہر میں میرے جاننے والے بہت کم ہیں۔ اور بغیر کسی "کامریڈ" کے میری زندگی کیسی اداس اور بدمزہ سی رہتی ہے۔ اس کا تمہیں اندازہ ہوگا۔

مگر اس سب سے بڑھ کر وہ میرے چچا ہیں جو اس شہر میں میرے نگراں سمجھے جاتے ہیں: سخت گیر، آہنی شکنجے پر یقین رکھنے والے اور اس کے مقابلہ میں ان کی جدید بھتیجی بے پروا۔ انقلابی، بیہودہ اور رسم و راہ سے بیگانہ ہر دم بغاوت پر آمادہ!

پہنچنے کے بعد صبح کو ناشتہ پر چچا جان سے دوبدو ملاقات ہوئی۔ پہلے ہلکے سُروں میں جھپٹ ہوتی رہی۔ پھر "دوگن" ہونے لگی! غرض چند ہی منٹ بعد مجھے یہ معلوم ہوگیا کہ ہم دونوں دو الگ الگ دائروں میں گھوم رہے ہیں۔ اور اگر ایک دوسرے کے کبھی قریب نہیں آسکتے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔

یکایک وہ برس پڑے "اگر تمہیں میرا حکم ماننا ہے تو یہاں رہو ورنہ میرے گھر میں تمہارا کوئی کام نہیں ہے۔"

"بہت بہتر، لیجئے میں یہ چلی۔ آپ کا جی چاہے تو روک لیجئے گا۔" میں نے جھپٹ کر کہا اور جھنجھنا کر اٹھ بیٹھی۔ سمجھتی تھی کہ شاید وہ روکیں گے مگر چُپ چاپ بیٹھے رہے۔ میں بھی پیر پٹختی ہوئی اپنے کمرے میں گھس گئی۔ فوراً اپنا ٹرنک کھینچا۔ کپڑے وپڑے جلدی جلدی ٹھونسنے شروع کئے۔

ابھی ٹرنک آدھا بھی نہیں بھرا گیا تھا۔ کہ یکایک میرا ہاتھ رُک گیا۔ دراصل دماغ رکا تھا۔ سوچ رہی تھی کہ آخر میں یہ کیا کر رہی ہوں۔ کیا واقعی میں گھر سے نکل جاؤں گی۔ کیا آدمی واقعی گھر سے نکل سکتا ہے۔ میں جب کبھی اس قسم کی نقل و حرکت میں کرتی ہوں یا کرنا چاہتی ہوں کوئی اندرونی طاقت میرا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچتی ہے — شاید یہ میری مرحوم ماں کی روح ہو۔ اور جھلّا کر کہتی ہے "احمق تو نہیں ہوگئی ہے؟"

چنانچہ کچھ حیلہ کر کے باہر آئی اور مختصر یہ کہ قدیم اور جدید میں عارضی صلح ہوگئی۔ ناشتہ کا بقیہ حصہ ختم کیا۔

اب میں سوچ رہی تھی کہ اگر آج میرا انتقال ہو جائے تو میری لاش کیسی خوبصورت معلوم ہوگی۔ کیونکہ آج ہی میں نہا کر سوئی ہوں۔

کاش ابنِ آدم تم اس وقت ہوا کی اس ٹی کے پاس ہوتے جو تمہیں بُلا رہی ہے۔ ہزار میل ادھر۔

پیر کا دن، رات کے ساڑھے نو بجے

آج صبح تمہارے تین خط اور حلوے کی ایک پلیٹ پُر تمکنت خاموشی کے ساتھ میرے سامنے رکھا دی گئی۔ چچا کن انکھیوں سے میرا ردّعمل دیکھ رہے تھے۔ میں نے تمہارے تین خط ایک طرف اٹھا کر رکھ دیئے۔ پہلے حلوے کی پلیٹ پر ہاتھ مارا۔ کیونکہ دونوں کی طرف بیک وقت توجہ ہو کر میں تمہاری ہتک کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اور چونکہ بھوک غالب تھی اس لئے اوّل طعام کے مصداق پہلے حلوے سے رجوع کیا۔ یہ چیز میرے چچا کے لئے ذرا عجیب تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ کسی کے خط میں پہلے ہڑپ کر دوں گی اور بعد میں ناشتہ کروں گی۔ مگر چچا کو کیا معلوم ہے ہم "ترقی پسند" کس قدر افادیت پرست ہوتے ہیں۔

پھر میں اٹھ کر اپنے کمرے میں آگئی۔ کمرہ چاروں طرف سے بند کر لیا اور تم سے باتیں کرنے لگی۔

[illegible] آدم [illegible] ایک [illegible] ہوگیا مجھے یہاں آئے ہوئے [illegible] آج بری طرح [illegible] یاد [illegible] بہت یاد آئی۔ سواد رومتہ الکبریٰ میں [illegible] بہت یاد آئی تھی۔

در [illegible] مردم [illegible] دیکھو لیڑے گیلے۔ [illegible] لوگوں [illegible] سے متوحش۔ جو ہے اپنی دُھن میں چلا جاتا ہے۔ [illegible] مجبور [illegible] پیدا کرنے کے سوا اُسے دُنیا میں [illegible] پہلی بار [illegible] میں تنہا [illegible] نکلی [illegible] عجیب [illegible] محسوس [illegible] لاکھوں انسانوں کے سمندر میں [illegible] قطرہ [illegible] کا ان میں ایک بہت ہی چھوٹی [illegible]

اب میں [illegible] فلم کمپنیوں کے پتے معلوم تھے ہی۔ [illegible] آزمائی کیلئے گئی۔ قسمت آزمائی کیلئے پھر کبھی جاؤں گی۔

[illegible] پروڈیوسر صاحب کے کمرے کے سامنے ایک اور کمرہ تھا جس میں کلرک بیٹھے تھے۔ مجھے بڑے تپاک سے بٹھایا گیا۔ ان کلرکوں کے چہرے کہہ رہے تھے کہ تم اکیلی کیسی ہو۔ ایک کلرک کا چہرہ کہہ رہا تھا "کسی کام کی نہیں ہے"

میرے خیال میں اس کا خیال زیادہ درست تھا۔ ایک اور [illegible] وقت [illegible] پروڈیوسر صاحب سے ملنا نہیں ہو [illegible] ایک [illegible] ہوئی تھی۔ مرد بھی اور عورتیں [illegible] کے بہت سے مصنوعات حسن کے نچیر تھے۔ مرد [illegible] جوانیاں [illegible] میرے نزدیک ان میں سے [illegible] معقول [illegible] لائق نہ تھا۔ کسی کو "آرٹ" [illegible] سے دلچسپی نہ تھی۔ ہر ایک یہ بات کہہ رہا تھا کہ ایک دفعہ [illegible] داخل ہونے کا موقع مل جائے خواہ کیسا ہی پارٹ دیا جائے۔

میں ایک ایک کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ کاش کوئی مجھ سے پوچھتا کہ میں یہاں [illegible] میں آئی ہوں۔ مگر کسی نے نہیں پوچھا۔

"خود پسندی خدا نہ بن جائے ـــ" (اتنے تالیاں)

ایک کلرک آیا۔ اور اس نے ایک ایک "ہونے والے" ستار" کو اندر داخل کرنا شروع کر دیا۔ ایک صاحب باہر نکلے تو سرخ انگارہ تھے۔ ایک صاحبزادی اندر سے حد سے زیادہ ہنستی ہوئی نکلیں۔ ایک دو کے علاوہ جس قدر بھی آدمی اندر سے باہر دھکیلے گئے کسی کے چہرے پر کوئی جذبہ یا تاثر نہ تھا۔ جیسے کورے گئے تھے ویسے ہی باہر آگئے۔

جب میں نے دیکھا کہ اب میری باری آنے ہی والی ہے میں جھٹ کرسی سے اٹھی اور کلرک سے "رومال کہیں گم کر دینے" کا بہانہ کر کے باہر جھپٹی اور سر پر پیر رکھ کر بھاگی۔ سڑک پر آکر دم لیا۔ میں اس وقت ایسی بھاگی جیسے شیر پھاڑ کھانے کیلئے میرے پیچھے دوڑ رہا ہے "بہادر لڑکی"!

ارے کبھی آدم زاد! بات یہ ہے کہ میں اس ذلت کو برداشت ہی نہیں کر سکتی تھی۔ خیر کوئی بات نہیں ہے۔ میں اپنے خیالی سٹوڈیو میں تمھیں لے چلتی ہوں۔ سردی ہوا سے بچنے کیلئے میں نے کمرہ بند کر رکھا ہے۔ تم ایک کمرے میں دبکے بیٹھے ہو۔ میں تمھیں کوئی غمگین افسانہ سنا رہی ہوں۔ کبھی کبھی پیروں کو گرم کرنے کیلئے تمہاری کمبل میں اپنے پیر گھسا دیتی ہوں۔ اور تم مجھ سے کہتے ہو وہ عرب کے اونٹ کی کہانی یاد ہے جس نے میزبانی کے جذبہ سے متاثر ہو کر اونٹ کو اپنی گردن خیمہ میں داخل کرنے کی اجازت دے دی تھی ـــ اور اس کہانی کا انجام بھی معلوم ہے۔ تم یہ سُن کر کھلکھلا کر ہنس پڑتے ہو۔ اتنے میں رات کے گیارہ بجتے ہیں۔ تم کہتے ہو چلو۔ اب چل کر سوئیں ہندستان کی اداکاری اور فلمی افسانہ نگاری کو بالائے طاق رکھ کر ہم سو جاتے ہیں۔

(بنت حوا)

۵ [illegible] مجھے تمھیں لکھے تھے کہ تم [illegible] اچھا تھا [illegible]

پہاڑ گنج [illegible] پیدا [illegible] تھے۔ اور میری [illegible] [illegible] ہم دونوں اس فضولیت پسندیوں [illegible] کبھی کیا ہم خیالی [illegible] بات یہ ہے کہ ہم ہی جیسے دماغ [illegible] ایجاد کر سکتے ہیں۔ بقراط کتنی جلدی مر گیا [illegible] تو [illegible] دماغوں سے کچھ فائدہ ہی اٹھا لینا۔

اصل میں بات یہ ہے کہ تم جیسا ہی [illegible] کے کھانے کے بعد یہ خط لکھ رہی ہوں تاکہ گھر کی خاموشی [illegible] کے سالن سے پیدا ہونے والی "طمانیت قلب" میں [illegible] پیدا کر سکے۔

کل میں نے اپنا پرانا کام شروع کر دیا۔ یعنی اپنے [illegible]

بہت زیادہ امیر آدمیوں کی نفسیات کا مطالعہ ۔ چنانچہ کل میں ایک خاندان سے ملنے گئی تھی جنہیں اس شہر میں اونچا درجہ حاصل ہے۔ (فرض) کرلو ان کا نام جمیلی تھا ۔ بیگم جمیلی اور ان کی دونوں لڑکیاں بڑی مہربانی سے پیش آئیں ۔ بالخصوص یہ جان کر کہ ہم لوگ ان کی سنت [illegible] قریب ہیں ۔

اس گھر میں دو لڑکیاں ہیں ۔ عشرت اور فرحت ان کے نام [illegible] ۔ دونوں اچھی لڑکیاں ہیں ۔ اعلیٰ پوشاک ، اعلیٰ تعلیم ، خاص [illegible] قول [illegible] بہت ، بہت عمدہ پیانو بجا سکتی ہیں ۔ بولنے کا بھی سلیقہ [illegible] بڑی لڑکی کی شادی ہو چکی ہے ۔ ایک بہت ہی امیر آدمی سے شادی کی ہے ۔ چاندی ـــ (یاد رہے چاندی نکل نہیں!) [illegible] کیلئے محتاج خانے جاری کرنے کی ایک اسکیم کا خاکہ انھیں ازبر یاد ہے ۔ ان کے پانچ بچے ہیں ۔ پانچ ! سُنا تم نے ـــ ابھی [illegible] ہونے کا آخری انعام قدرت یوں دیدیتی ہے ۔ ایک ہم ہیں ۔ ایک وہ ہیں جنھیں تصویریں ہی تصویریں نا آتی ہیں ۔ ایک چھوڑ پانچ چھپے "آدم کی کتاب" سے ہو بہو نقل مطابق اصل !

بعض دفعہ میں سوچتی ہوں گھریلو زندگی میں آخر حرج ہی [illegible] ہے مگر گھریلو زندگی کے سُکھ کیلئے عورت جو قیمت دیتی ہے کیا [illegible] کا سودا ہے ؟

کیا یہ عشرت کبھی سوچتی ہے کہ میں نے کیا پایا اور کیا کھویا ۔ [illegible] آدمی کو [illegible] بننا چاہیئے ۔ ہمیشہ ہی اچھا لڑکا یا اچھی لڑکی بنے [illegible] ابھی نہیں آتا ۔ مگر میں بھی عجیب لڑکی ہوں ـــ [illegible] جا رہی ہوں کبھی ادھر ۔ ایک بہ نئی دنیا میں ہے [illegible] قدر سرخوشی ہے ۔

[illegible] رہی تھی ۔

[illegible] ملنے گئی تھی ۔ بڑی گرمجوشی سے ملے ۔ [illegible] تمام سے یوں کیا گیا تھا کہ ایک [illegible] والا تھا ۔ ورنہ سب اس کی [illegible] کی [illegible] میں تھا [illegible] سے وہ سالسلہ [illegible]

[illegible] ہوں گی ۔ ابن آدم [illegible] اپنے بالوں کو بجلی کی جدید [illegible] صورت ساڑھی [illegible] تھی ۔ بتایا

جاتا ہے کہ مس فرحت مجھے بہت پسند آئی ہیں ۔ مجھے یہ معلوم کرکے بڑی خوشی ہوئی ۔ ہونی ہی چاہیئے تھی ۔ مجھے مزید عزت بخشنے کے لئے انھوں نے اپنی دستخطوں والی کتاب نکالی جس پر سونے کے حروف سے ان کا نام کندہ ہے ۔

دستخطوں کی بیماری بھی بڑی پرانی ہے ۔ اس کتاب میں بڑے بڑے آدمیوں کے دستخط [illegible] ان کے لکھے ہوئے فقرے یا اشعار وغیرہ تھے ۔ مجھ سے کہنے لگیں "آپ بھی اس میں کچھ لکھ دیجئے" [illegible] دماغ اس وقت نہ جانے کس طرح [illegible] میں کلکاریاں بھرتا پھر [illegible] ہو گیا ۔ کوئی شعر یاد نہ آیا ۔ مگر شعر ویسے ہی کیا یاد آتا ۔

آخر کار حالی نے مدد کی ۔ یہ شعر لکھ دیا ؎

"[illegible] ماؤں ، بہنوں ، بیٹیوں
[illegible] کی عزت تمہی سے ہے"

دو [illegible] صفحے پلٹ کر دیکھے تو معلوم ہوا کہ [illegible] اور دستخطی [illegible] نے بھی اسی قسم کے اشعار قلم بند کئے ہیں ۔ [illegible] اپنے مقلدوں [illegible] بندوں کی اسی طرح مدد کرتا ہے ۔ [illegible] جیسے تونے اس وقت میری مدد کی ہمیشہ [illegible] روح سکون سے رہے ۔

[illegible] وہ آگیا ۔ میرا مطلب ہے وہ مرد آگیا ۔ ایک اور "ابن آدم" ۔ [illegible] دیکھ کر [illegible] ہوئی ۔ میں سمجھی تھی کوئی تنومند تندرست کھلا ہوا انسان ہوگا ۔ مگر یہ تو [illegible] سے کا ساگ جیسا آدمی نکلا ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا [illegible] ۔ میں سمجھ گئی کہ اس قسم کے شوہروں کی ان کی [illegible] کی [illegible] مانگ ہے ۔ چونکہ انھیں احمق بنانا آسان رہتا ہے ۔

میں نے اس شخص کی [illegible] سے یوں [illegible] کیا ہے کہ آتے [illegible] نے ایک [illegible] کی [illegible] مس فرحت کی طرف مائل [illegible] کے [illegible] ڈھلک گیا ۔ [illegible] مسز جمیلی [illegible] جو [illegible] قدر اُلّو بنایا کہ عرصہ [illegible] تم [illegible] چلتے کیوں [illegible] سے حل مرد [illegible] آتا بھی [illegible] کی خدا نے [illegible] ساری ہے ۔

جب [illegible] مریخ اور ہیبگی بیل [illegible] نے [illegible] کسی نے کوئی

بات کرتا اس کو جواب دے دیا۔ ورنہ خاموشی بہترین پالیسی ہے
اس نے تم کے نئے سوالوں کا جواب جلد ہی جلدی دیا۔

ہاں ۔۔ اس سے پہلے کوئی لمبا سفر نہیں کیا تھا
میں کبھی فلم ایکٹروں سے نہیں ملی ۔ مجھے کبھی کسی
نے نہیں چھیڑا ! (؟)

اگلے ہفتے ہم میرے چچا وغیرہ سب ۔۔ سمندر کے کنارے
کسی پُرفضا مقام پر جائیں گے ۔ چند دن وہاں گذاریں گے ۔

میں چاہتی ہوں کہ ۔۔۔
میرا خیال ہے کہ ۔۔۔

(بنتِ حوّا)

جمعرات (دوپہر)

سمندر کے کنارے رکھے گئے بڑی مشکل سے جان چھڑا کر بھاگی ہوں ۔ تنہائی کا لطف ہی نہیں پیڑی رنگ کی تیج ہے ؟ معلوم نہیں لوگ سچ کو سفید کیوں کہتے ہیں ۔ میرا مطلب یہ ہے کہ آج ابھی صبح ہوئی ہے کہ کسی افسانہ کی ہیروئن کی طرح سے نکل کر معطر و معنبر فضا میں سانس لینے کیلئے سمندر کے ریت پر مستِ خرام " ہو سکتی تھی ۔ مگر افسوس یہ ہے کہ نہ میں کسی افسانہ کی ہیروئن ہوں نہ یہاں کی فضا معطر و معنبر ۔ البتہ ایک سیدھی سادی سمندری فضا ہے ۔ اور خدا نے سمندر کو جیسا بنا دیا ہے اپنے ظرف کے مطابق دُنیا کو دُکھ پہنچانے کی سعی کرتا رہتا ہے ۔

ابن آدم جانتے ہو میرا اس وقت کیا جی چاہ رہا ہے ۔ میں یہ چاہتی ہوں کہ تم بھی یہاں ہوتے ۔ سمندر تم نے آج تک نہیں دیکھا ۔۔۔ پہاڑ اور صحرا بھی تو تم نے نہیں دیکھے ۔۔ خیر ۔ سمندر تو دیکھ لیتے ۔ اور جب کوئی فلمی کہانی پندرہ ہزار کی بک جاتی تو تم پہاڑ پر بھی چلے جاتے ۔۔ کاش تم یہاں ہوتے ، پھر ہم دونوں سمندر میں نہاتے ۔

تم کیا سمندر میں نہا سکتے ہو ۔ آج تک دیکھا تک نہیں ، خیر یہ دل چاہ رہا ہے اور جی چاہتا ہے میں منطق بیچ میں بولنے والی فقط کون ہوتی ہے ۔۔۔ خیر کاش تم یہاں ہوتے ۔ ہم سمندر میں نہاتے میں باہر نکل کر بال خشک کرتی ۔ تم گھونگے جمع کرتے ۔ تھک کر چور ہو جاتے اور دوپہر کو کھانے کے وقت جب سمندر کی تلی ہوئی مچھلی کھانے کو ملتی تو خدا کا شکر ادا کرتے اور ملحدانہ خیالات ترک کرنے کیلئے خدا کی قسم کھاتے ۔ کیا تعریف کی جائے ۔ اس خدا کی جس نے تلی ہوئی مچھلی کا ذائقہ آدم کو سکھایا ۔ اب بھی تم اس کے وجود سے انکار کئے جاؤ تو جاؤ سمندر میں ۔

تو پھر ایک دفعہ ایسی پکنک رہے ۔ اصلی سمندر کے کنارے ۔ یہ نہیں کہ بس میں بیٹھ کر اوکھلے ہو آئے اور سمجھ گئے کہ پانی کا کنارہ ایسا ہی ہوتا ہے ۔

اچھا اب دن کے دھندوں میں پھنسنے کا وقت قریب آ رہا ہے ۔ اس لئے خدا حافظ !

خوابوں کے جزیرے میں رہنے والے آدم زاد ،

خدا حافظ !

(بنتِ حوّا)

مکرّر جس جگہ میں بیٹھی ہوں وہاں ایک ٹوٹی ہوئی کشتی پڑی ہے میں نے اُسے قریب سے جا کر دیکھا ۔ پہلے اس پر " روزی " لکھا ہوا تھا ۔ پھر روغن کر کے اس کو " جاسمین " کا خطاب دے دیا گیا گلاب ہو یا چنبیلی ۔ لوگ سونگھ کر دونوں کو پھینک دیتے ہیں ۔ مرد کی وفا کا یہ نمونہ بھی قابلِ داد تھا ۔ جب تک " روزی " دماغ پر حاوی رہی کشتی بھی اس سے منسوب رہی ۔ جب اس سے کنارہ کشی " اختیار کر لی تو " جاسمین " کا لقب دیا گیا ۔۔ اور پھر یہ زمانے کے سمندر کی لہروں کے آگے بول گئی ۔ اب ٹوٹی پڑی ہے خدا کرے " روزی " اب اچھی حالت میں ہو اور " جاسمین " کو بھی کوئی اچھا ملاح مل گیا ہو ۔

میں اس قدر جذباتی کیوں ہوئی جا رہی ہوں ۔۔ اچھا ہاں ٹھیک ہے ۔ اب میری زبان بند ہو جانی چاہئے ۔ بہت بکتی رہتی ہوں ۔ تو تمہیں تو نیند آ گئی ۔۔ !

(بنتِ حوّا)

ہفتہ کی رات آج کی رات تم یہاں کیوں نہیں ہو؟ اختر الایمان کہتا ہے " آج کی رات ذکرِ غم مت کر " مگر ایسا نہیں ہو سکتا ۔ میرے کمرے میں اس وقت بیس ہزار باغیوں سے بھی زیادہ باغیوں نے دھاوا بول رکھا ہے ۔ نیند نہیں آتی ۔ رات بھر نہیں آتی ۔ اور یوں نہیں آتی کہ دُنیا میں مچھر زیادہ اور " تم " کم ہو ۔

سُنا ہے کسی جنگل میں ایک شہزادی جوگن بنی ہوئی رہتی تھی ۔ ایک جوگی آیا اس نے اسے ہمیشہ کیلئے نیند کا ماتا بنا دیا ۔

مگر ایک روز "پری کنڈل" قائم ہوا۔ تیرہ پریاں اس منڈل میں آکر ناچنے لگیں۔ تیرھویں پری کی نظر اس جوگن شہزادی پر پڑی۔ اور وہ جادو کے زور سے آنکھیں کھولنے پر مجبور ہوگئی۔ اور آج تک اس کی آنکھ نہیں جھپکی ہے۔ ہردم ٹکٹکی باندھے اپنے شہزادے کے آنے کا انتظار کرتی رہتی ہے۔ کاش مجھے بھی کوئی جوگی ایسی ہی نیند سلادے یا تیرھویں پری مجھے خواب بیداری سے جگادے۔

ہوا بہت تیز چل رہی ہے۔ نیچے کی منزل میں کوئی شخص رباب بجا رہا ہے۔ ورایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ رباب کے تار پر اپنا دل رکھ کر دو ٹکڑے کر دے گا۔

— تم یہاں کیوں نہیں ہو۔ خواہ مستقبل کچھ بھی ہو درخشاں یا تاریک، تمہیں میرے پاس ہونا ہی چاہیئے۔

کہیں ایسا نہ ہو جائے کہیں ویسا نہ ہو جائے قسم کی مثالیں بہت گذار چکے ہیں۔ اب کچھ کام کی باتیں کرنی چاہئیں۔ مصمم ارادہ کرلو اور یہاں آجاؤ۔ مگر اپنی کشتیاں جلا کر آنا۔

تمہارا خط میرے پاس رکھا ہے اس میں تم لکھتے ہو۔ "مجھے تم سے محبت ہے" لیکن آخر اس جملہ کا مطلب کیا ہے۔ احمق کہیں کے۔ میں تو سمجھتی ہوں سفید کاغذ پر روشنائی کے نشانوں کے سوا اس فقرے کا اور کوئی مطلب نہیں ہے۔

آج کی رات تم یہاں کیوں نہیں ہو؟

اگر میں تمہاری طرح مرد ہوتی تو اس ہی وقت کوٹ بوٹ پہن کر باہر نکلتی۔ ہر چیز کو بھول کر۔ ہر بات سے بے پروا ہوکر اور خوب لطف حاصل کرتی۔ شہر کی نیم روشن سڑکوں پر بلا وجہ گھومتی پھرتی۔ کسی بڑی عمارت میں داخل ہوکر پوچھتی۔ یہ ہوٹل تو نہیں ہے وہاں سے نکالی جاتی۔ اور کسی ہوٹل میں پہنچکر پوچھتی۔ یہاں مالوی جی تو ٹھہرے ہوئے نہیں ہیں۔ غرض عجب عجب قسم کے پاگل پن کرتی پھرتی — خوب پھرتی، خوب ہنستی — تھوڑی سی پی بھی لیتی — مرد کہتے ہیں پینے سے دل کا بوجھ ہلکا ہوتا ہے۔ مگر میں مرد کہاں ہوں — ایک عورت ہوں — محض عورت اور وہ بھی اب ہی شروع ہوئی ہوں۔ ابھی پوری طرح ہونے نہیں پائی ہوں — اور آج کی رات میں بہت اچھی معلوم ہو رہی ہوں — مگر کوئی بھی تو دیکھنے والا نہیں ہے۔

کمرہ گرم ہے، بہت گرم۔ شاید یہ سارے وسواس الخناس جو اس وقت میرے دل میں آرہے ہیں سب بند اور گرم کمرے کا نتیجہ ہیں۔ شاید ایک آدھ مچھر بھی میری بے محل بیباکی کو بڑھانے والا ہو۔

ابن آدم، میں اس وقت اپنے آپ سے ڈر رہی ہوں — مجھے اپنے نزدیک اور نزدیک کھینچ لو۔ کیونکہ اس ساری تاریک دنیا میں تمہارے سوا اور کوئی نہیں ہے جو مجھے سمجھ سکے — مگر تم یہاں نہیں ہو۔

شب بخیر!

(بنت حوّا)

(یہ خط بنت حوّا نے نہیں بھیجا۔ وہ جو ایک چیز ہے
انجان میں تھی اور ایسے موقعوں پر کہدیا کرتی تھی
"احمق مت بنو" شاید اس نے کہا ہوگا۔ یہ خط بھیجے
کا نہیں ہے اس لئے نہیں بھیجا گیا۔)

اتوار ابن آدم میں نے تمہیں کل رات ایک بہت وحشیانہ خط لکھا تھا۔ مگر ڈاک میں نہیں ڈالا۔

کیوں۔ تمہیں رنج ہوا؟

میرا خیال ہے تم اسے پڑھ کر مزا لیتے۔ میں کہتی ہوں۔ خیر— میں کچھ کہنا نہیں چاہتی کہ کیا کہنا چاہتی تھی۔ جب تک دنیا میں ملکہ وکٹوریہ مرحومہ کے اسٹیچو نصب ہیں نیکی برباد نہیں ہوسکتی۔

لو پھر زمین ہلی۔ زلزلہ آیا۔ نہیں کوئی ملٹری وھیکل گذری ہے۔ میری آنکھیں بند ہوئی جارہی ہیں۔ رات کا بڑا حصہ جاگتے میں گذرا اس لئے نیند آرہی ہے۔

اوہ۔ ہاں خوب یاد آیا تم یہاں کب آرہے ہو؟

(بنت حوّا)

پیر ابن آدم پتہ نہیں، تمہیں بتاؤ میری زندگی کا حاصل کیا ہے۔ میں فلم یا اسٹیج کے مطلب کی نہیں ہوں۔ یہاں دنیا اور ہے یہاں تو وہ آدمی جی سکتا ہے جو شیکسپیئر کے *As you like it* کے عنوان سے جینا پسند کرے۔ اس میں شک نہیں کہ مجھے بوہمین طرز زندگی پسند ہے۔ تم ایکٹر ہو۔ میں ایکٹریس ہوں۔ تم کہانی لکھو میں اسے منتخب کردوں۔ مگر یہ سب باتیں کھیل کی حد تک تو ٹھیک ہیں۔ میں تو زندگی سے بھاگنا چاہتی ہوں۔ آگے بہت گڑھے ہیں۔ بہت سی جینٹس ہیں جو انجر پنجر ڈھیلے کر دینگے۔ میں بزدل ہوں اور حقیقت کی شکل دیکھتے ہی دُم دبا کر بھاگنے پر تُلی رہتی ہوں۔

کاش مجھ میں وہ شئے ہوتی جسے "نابغہ کی قوت ادراک"

کچھ ہیں۔ مگر مجھ میں وہ چیز ہی نہیں ہے۔ خواہ مخواہ (Intellectual) بنی پھرتی ہوں۔

مسز جمیلی اور ان کی ساتھیاں بہت عمدہ سماجی بہنا ہیں۔ جس پر دو چار بازیاں دل کھول کر کھیلی جاسکتی ہیں۔ مگر وہ لوگ اس قدر اونچا اڑتے ہیں کہ یہاں طاقت پرواز نہیں۔ اور وہ اس قدر اونچے اٹھ چکے ہیں کہ سب اُن کے سامنے پست ہیں۔ میرے شوہر بھی دوسروں ہی سے ملتے جلتے ہیں۔ اور وہ بہت سے ایک فضول کا شغل سمجھ کر ہی اگر ہوتا تو میں بھی ان کی محفلوں کا ستارہ بن سکتی تھی۔ یہاں اپنے کالج کی بہت سی لڑکیوں سے ملیں مگر کسی نے ڈھنگ سے بات نہیں کی۔ لڑکی کو کسی نہ کسی "سوشل" میں جانا ہوتا ہے کوئی نہ کوئی نئی تحریک ملک میں پیدا ہوتی رہتی ہے۔ ان سب کو چلانے کا بار ان تعلیم یافتہ امیر گھرانے کی لڑکیوں کے سر ہے۔ ورنہ غریب ہندوستان کہیں کا نہ رہتا۔ ایک ملی رہنما کا لڑکا مجھے بھی مل جائے تو میں بھی باہر کھدر پہن کر سب سے آگے "جے ہند" پکارتی پھروں۔

اور پھر ستم یہ ہے کہ تم دور ہو!

تم کو کیا لکھنا چاہتی ہوں۔ میرا خیال ہے۔ میرے سارے خط اسی قسم کے جملوں سے بھرے پڑے ہوں گے۔ دراصل میرا مطلب یہ ہے کہ میں کچھ کرنا چاہتی ہوں۔ خود کرنا چاہتی ہوں میں تمہارے میرے بس کی بات نہیں۔ میرا احساس خود کچھ دیکھ بھال کرنا چاہتا ہے۔ مگر دنیا دو الگ الگ حصوں میں بٹی ہوئی ہے۔ میں اس مشین کا پرزہ بننا چاہتی ہوں جسے کارگاہ کہتے ہیں۔ میں اس مشین کے ہر چکر کے ساتھ نبض کی طرح دھڑکنا چاہتی ہوں۔ میں ادب اور آرٹ کی دنیا میں کچھ بننا چاہتی ہوں۔ بڑے بڑے دماغوں سے کشتی لڑنے کی فکر میں ہوں۔ بڑے۔ ہیبت ناک انقلابی تصورات کو سہنا چاہتی ہوں۔ چاہتی ہوں کہ میرے گرد مصنفوں، شاعروں، سائنس دانوں، آرٹسٹوں، مصوروں، نوجوان ترقی پرست ذہنوں کا ہجوم ہو۔

ایسے لوگ جو زندگی سے گتھ جانے کیلئے بھرے پڑتے ہوں جو چند ہزار روپے کی تنخواہ پانے کے باوجود انسان اور دوست رہنے میں تکلف نہ کرتے ہوں!

ہاں تم نے یہ خوب لکھی کہ ہم دونوں کے درمیان ایک بند دروازہ حائل ہے۔ ہاں ہے۔ مگر دونوں جھریوں میں سے جھانک کر ایک دوسرے کو دیکھ تو رہے ہیں۔ کبھی کبھی روشنی ہوتی ہے تو ایک دوسرے کے خد و خال اچھی طرح دکھائی دیتے ہیں۔ مگر زیادہ تر "جے ہند" کا دھواں چھایا رہتا ہے۔ ذرا یہ دھند چھٹ جائے تو زندگی کو اس کے صحیح نقش و نگار میں دیکھنے کا لطف آئے۔ خیر فکر نہ کرو۔ ایک روز یہ دروازہ خود بخود کھل جائیگا۔

"آجکل کی لڑکی" یہ ہے میرا عنوان۔

عجیب شے ہے۔ آج کی لڑکی۔ زمین آسمان کے قلابے ملانے میں طاق۔ منطق پر حاوی۔ فلسفہ سے آشنا۔ آرٹ کی گود میں کھلائی ہوئی۔ سیاست کی روش پر کبھی کبھی چل نکلنے والی۔ دنیا جہان کے راز معلوم کرنے۔ سوچ بچار۔ پڑھنے لکھنے۔ نظر لڑانے سے تنم کتھا کرنے کے بعد جب وہ میدان کارزار میں آتی ہے۔ میرا مطلب (والنٹیر بن جانے یا پربھات پھیریوں میں شامل ہو جانے سے نہیں ہے) بلکہ اس سے ہے کہ جب فی الحقیقت اصلی لب گرم شعلہ ریز لب جب اس کے قریب آتے ہیں۔ زندگی جب اس سے "منہ زبانی امتحان" لینا چاہتی ہے۔ تلخ و شیریں حقیقت حیات جب ایک دفعہ ہی سامنے آ کھڑی ہوتی ہے اس وقت میں اور میری تائی کی سب لڑکیاں ہی بدحواس ہو جاتی ہیں۔ ہم پھر شرمانے لجانے والی کنواری لڑکی بن جاتے ہیں۔ ہر چیز سے معصوم اجنبی ہم پر طاری ہونے لگتی ہے۔ میرا مطلب ہے کہ ہم پھر وہ ہو جاتے ہیں جسے طنزاً "Early Victorian" کہا گیا۔

جدید ابن آدم اس تمام طلسم کو سمجھنے سے واقعی قاصر رہتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہم جس قدر دوزخی زندگی بسر کرتے ہیں، لڑکے ایسا نہیں کرتے۔ کاش ہم ستی ساوتری ہو جاتے یا ایک طرف کو فلم اسٹار بن کر ہی کونے میں پڑ جاتے۔ مگر ایک قدم اسٹوڈیو میں ایک قدم "جے ہند" کے مظاہرہ میں، دھڑ گھر میں۔ دماغ محبت میں۔ یہ نہیں سمجھ میں آتا۔ جب آدمی واقعی جذباتی ہو جائے "نعروں میں یقین" رکھنے لگے تو روح بوجھل رہنے لگتی ہے۔ اصل میں بات یہ ہے کہ ہم تہذیب کے عبوری دور میں سے گذر رہے ہیں۔ یہ وقت ہے جو سینۂ آدم پر گراں ہے۔ اور اس بھول بھلیاں میں سے نکلنے کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے آرٹ، ادب یا سیاست کا غیر جذباتی مطالعہ "جے ہند"، یا ساڑھے تین روپے ماہوار مشاہرہ دونوں آدمی کو جذباتی بنا سکتے ہیں۔ مگر تمہارے سوالنامے نے بھی حد کر دی ہے۔

میرے طویل خط نے تمہارے لئے لوری کا کام کیا ہے۔
لو دیکھو اسٹیج پر یہ کون لالہ پوش آیا۔ یہ قرمزی شگوفے کیا کہتے ہیں؟
یہ سب ہمارے خواب ہیں!
کاش میں آج کوئی خواب دیکھوں۔

(بنتِ حوّا)

میرا خیال ہے تم یہاں نہیں آؤ گے۔ میرا یقین ہے کہ تم پیدا ہی نہیں ہوئے۔ اچھا تو میں خود دلی آتی ہوں۔ امید ہے اس وقت تک "ہما۔ انزلہ" "جے ہند" کا بجا۔ اور کاغذ کا کنٹرول ہلکا ہو جائے گا مگر ہم دنیا میں کر بھی کیا سکتے ہیں۔ تم سست، میں بزدل! آؤ پھر ان سے ہی لگائیں ...! فلم میں نوکری مل جائے تو اچھا ورنہ "جے ہند" تو ہے ہی!

ساقی بکڈپو کی مطبوعات

محبت اور نفرت مصنفہ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری بی اے (علیگ)، ساہتیہ النکار۔ ڈی لٹ انسانی فطرت کے دو زبردست رُخ محبت اور نفرت۔ سولہ افسانوں کا مجموعہ ۔یمت دو روپے۔

نئے فسانے یہ مجموعہ مسٹر کرشن چندر ایم۔ اے نے مرتب کیا ہے۔ یہ کتاب ہندستان کے جدید افسانوی ادب کی تصویر ہے ... د، ہندی، مرہٹی، گجراتی، تامل، تلگو، بنگالی، ... ری وغیرہ افسانہ نگاروں سے تیس بہترین نقوش اس میں شامل ... جان ... کہتا ہے "انگریزی افسانہ زوال کی انتہائی پستیوں کی ... ف جا رہا ہے" برعکس اس کے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہندستانی افسانے پر اب بہار آ رہی ہے۔ یہ کتاب دو سال کی کاوش کے بعد مرتب ہوئی ہے۔ ضخامت ۴۲۵ صفحے۔ مجلد قیمت چار روپے۔

گیت ہی گیت میراجی کے گیت دلآویزی میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ ایسے مدھر گیت آپ نے کبھی نہیں پڑھے ہوں گے۔ اس میں ہر قسم کے گیت ہیں۔ قیمت دو روپے ۸

ساقی بکڈپو دہلی سے طلب فرمائیے

غزل

شعیب حزیں

جستجو محرومیوں سے معتبر ہوتی گئی
میری منزل خود چراغِ رہگذر ہوتی گئی

جس قدر بڑھتی گئیں قلب و نظر کی جرأتیں
زندگی مجبور تر محدود تر ہوتی گئی

شوق کو خود حیرتِ نظارہ بن جانا پڑا
بے سہارا ہر تمنائے نظر ہوتی گئی

پرورش پاتا رہا ترکِ تمنا کا خیال
ہر تمنا اک سعیِ معتبر ہوتی گئی

دل کچھ اس انداز سے دیتا رہا نظروں کا ساتھ
زندگی خود معنیِ ذوقِ نظر ہوتی گئی

ہر نظر بنتی گئی شرحِ شکستِ آرزو
یہ کہانی رفتہ رفتہ مختصر ہوتی گئی

وہ کرم کرتے رہے اور میں حزیں بنتا گیا
شوق کے ایذا پسندی معتبر ہوتی گئی

سعادت حسن منٹو

بی زمانی بیگم

زمین شق ہو رہی ہے۔ آسمان کا سر [illegible] ہے۔ ہر طرف دھواں ہی دھواں ہے۔ آگ کے شعلے [illegible] دنیا جل رہی ہے۔ زلزلے پر زلزلے [illegible] ہے ہیں۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟

«[illegible]»

«نہیں [illegible]»

«لو سنو — دنیا بھر کو معلوم ہے۔»

«کیا؟»

«وہی زمانی بیگم — [illegible]»

«ہاں ہاں [illegible] کیا ہوا اُسے؟»

«وہی ہوتا آیا ہے۔ لیکن اس عمر میں شرم نہیں آتی بدبخت کو۔»

«یہ بدبخت زمانی بیگم ہے کون؟»

«ہائیں۔ وہی اسکندر کی ہوتی سوتی۔ موئی کٹھیائی۔ چنگیز کے پاس رہی۔ ہلاکو کی داشتہ بنی۔ کچھ دن اس لنگڑے تیمور کے ساتھ منہ کالا کرتی رہی۔ وہاں سے نکلی تو نپولین کی بغل میں جا گھسی۔ اب یہ موا ہٹلر باقی رہ گیا تھا۔»

«تو کیا اب ہٹلر کے گھر ہے؟»

«ہوا گھر گھاٹ [illegible] — بھلا ہو سکتا ہے کبھی ایسی عورت کا۔»

«طلاق ہو گئی کیا؟»

«تم کیسی باتیں کرتی ہو بوا — طلاق تو وہاں ہو جو سہرے جلووں کی بیاہی ہو۔ اور پھر ایسے مردوں کا بھی کیا اعتبار رہے۔ دو دن مزے کئے اور چلو چھٹی۔»

«تو اب ہو کیا رہا ہے — یہ فضیحتہ کس بات کا؟»

«فضیحتہ کیا ہے۔ پورے دنوں سے ہے۔ بچہ پیدا ہونے والا ہے۔»

«تو ہو کیوں نہیں چکتا؟»

«ہاں سچ تو ہے کوئی بلو کھٹی کا تو ہے نہیں۔»

«ڈاکٹر آ رہے ہیں۔ دیکھو آج نہ کل ہو جائیگا۔»

ڈاکٹر آتے رہے لیکن بی زمانی کے بچہ پیدا نہ ہوا۔ درد کرب کی لہروں میں اضافہ ہو گیا۔ زلزلے اور زیادہ زور سے آنے لگے۔ شعلوں کی زبانیں اور زیادہ تیز ہو گئیں۔

ڈاکٹروں نے کانفرنس کی۔ حکمت کی ساری کتابیں چھانی گئیں۔ طے ہوا کہ حاملہ کو طہران لیجائیں۔ وہاں روس کے ماہر ڈاکٹر کو بلایا جائے اور اس سے مشورہ کیا جائے۔

طہران میں خاص طور پر جلدی جلدی ایک میٹرنٹی ہوم تیار کیا گیا۔ بی زمانی بیگم درد سے تڑپتی رہی اور دنیا کے تین بڑے ڈاکٹر مشورہ کرتے رہے۔

ایک بولا "صاحبان۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہونے والا بچہ ہمارا نہیں لیکن انسانیت کے نام پر ہمیں مریضہ کو اس مشکل سے نجات دلانا ہی پڑے گی۔"

دوسرا بولا "ہم تین بڑے ڈاکٹر تین قسم کے طریقۂ علاج کے ماہر ہیں۔ سب سے پہلے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ایک طریقۂ علاج پر متفق ہوں — اگر ایسا ہو گیا تو بی زمانی بیگم کے بچہ پیدا ہونا کوئی مشکل نہیں۔"

تیسرا بولا "بالکل درست ہے۔ آئیے ہم فوراً یہ نیک کام شروع کر دیں۔"

تینوں طریقے ملا کر ایک اور طریقہ بنایا گیا جس پر تینوں ڈاکٹر متفق ہو گئے۔ دنیا کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا۔ مگر بی زمانی بیگم کے بچہ پیدا نہ ہوا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے — بچہ پیدا کیوں نہیں ہوا ابھی تک۔"

"بچہ تو پیدا ہو رہا تھا مگر اُسے روک دیا گیا ہے۔"

"کیوں؟"

"ڈاکٹر سوچ رہے ہیں کہ اسے گود کون لے گا۔"

"ہوں!"

"تو فیصلہ کیا ہوا؟"

"تم کیسی باتیں کرتی ہو بُوا۔ ایسے معاملوں کا اتنی جلدی فیصلہ کیسے ہو سکتا ہے۔ خیر چھوڑو اس قصّے کو۔ کچھ نہ کچھ ہو ہی جائیگا۔ جس کے ہاں اولاد نہیں وہ غریب گود لے لیگا۔"

اولاد ہر ایک کے تھی۔ کسی کے ہاں چار بچے تھے کسی کے ہاں پانچ اور کسی کے ہاں سات۔ اب فیصلہ کیسے ہو۔

ایک اور کانفرنس ہوئی۔ ڈمبارٹن اوکس میں ایک اور میٹرنٹی ہوم افراتفری میں بنایا گیا۔ تینوں بڑے ڈاکٹر وہاں جمع ہوئے۔ ہر ایک نے سوچا۔ ہر ایک نے معاملہ کی اہمیت سمجھنے کی کوشش کی۔

اور بی زمانی بیگم بستر پر پڑی درد سے کراہتی رہی۔

ایک بولا "صاحبان۔ ہم صاحبِ اولاد ہیں۔ اس بچے کی حوروں کے ہم ذمہ دار نہیں۔ لیکن انسانیت کا تقاضا ہے کہ ہم اس کی پیدائش میں ہر ممکن طریقے سے مدد کریں۔ آخر اس پیدا ہونے والے بچے کا کیا قصور ہے۔"

دوسرا بولا "ہم ڈاکٹر ہیں۔ ہمارا مذہب دوا ہے۔ ہم پیدا ہونے والے ناخلف بچے کو جس سے ہمارا کوئی رشتہ نہیں۔ ایک فرمانبردار۔ اطاعت گذار۔ آزادی پسند اور انسانیت دوست نوجوان بنا سکتے ہیں۔"

تیسرا بولا "بالکل درست ہے۔ اس بچے کی پیدائش سے ایک بہت بڑا بوجھ دور ہو جائے گا۔ ہم ڈاکٹر ہیں۔ اپنے فرض سے غافل نہیں ہونا چاہیئے۔"

طے ہو گیا۔ ایک دستاویز پر انگوٹھے لگا دیئے گئے کہ ہونے والے بچے کو یہ تینوں ڈاکٹر گود لیں گے۔ تینوں مل کر اسکی [illegible] دیں گے۔ لیکن بی زمانی بیگم کی تکلیف پھر بھی رفع نہ ہوئی۔ وہ پڑی درد سے کراہتی رہی۔

"آخر یہ مصیبت کیا ہے؟"

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

"مسئلہ یہ ہے کہ بچے کو گود لینے کا تو فیصلہ ہو گیا ہے لیکن نام کا بھی تو کچھ بندوبست ہونا چاہیئے۔"

"کہتی ہوں۔ سات جھاڑو اور حقّہ کا پانی۔"

"نہیں بوا۔ وہ سوچ رہے ہیں کہ یہ کم بخت کہیں پھر..."

"اوہ..."

ایک اور کانفرنس ہوئی۔ تینوں بڑے ڈاکٹر جزیرہ مالٹا میں جمع ہوئے۔ جلدی جلدی ایک میٹرنٹی ہوم تیار کیا گیا۔ بی زمانی بیگم درد سے پیچ و تاب کھاتی رہی اور ادھر کانفرنس ہوتی رہی۔

"ایک بولا "صاحبان! دنیا کی فلاح اور بہبودی کے لئے آج اس بات کا قطعی طور پر فیصلہ ہو جانا چاہیئے کہ بی زمانی کے ہاں جو بچہ ہو وہ اس کا آخری بچہ ہو۔"

دوسرا بولا "دنیا کے حقوق اس عورت کے بچوں کو دودھ پلا پلا کر سوکھ گئے ہیں۔ اب ہمیں اس کا خاتمہ کرنا ہی پڑے گا۔"

تیسرا بولا "بالکل درست ہے۔ ہونیوالے بچے کی تندرستی کا خیال رکھتے ہوئے بھی ہمیں ایسا کرنا ہی چاہیئے۔"

طے ہو گیا کہ بچہ فوراً پیدا کیا جائے اور بی زمانی بیگم کو ہمیشہ کے لئے بانجھ کر دیا جائے۔

عمل جراحی شروع ہوا۔ میٹرنٹی ہوم کے باہر دنیا کی ساری قومیں جمع ہو گئیں۔ بہت دیر تک سناٹا چھایا رہا۔ اس کے بعد میٹرنٹی ہوم کا دروازہ کھٹ سے کھلا۔ ایک سفید پوش نرس باہر نکلی اور اس نے اپنی باریک آواز میں اعلان کیا "مبارک ہو۔ بی زمانی بیگم کے بچہ پیدا ہو گیا ہے۔ زچہ اور بچہ دونو بیہوش ہیں۔"

دنیا کی ساری قومیں فکر و تردد میں غرق ہو گئیں۔ ایک بوڑھا لنگوٹی پہنے۔ کھانستا، کھنکارتا نرس کی طرف بڑھا۔ نرس نے پوچھا "تم کون ہو؟"۔ بوڑھے نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور لرزاں آواز میں کہا "میرا نام ہندوستان ہے۔"

"اوہ۔ کیا چاہتے ہو تم۔"

"میں صرف یہ پوچھنے آیا ہوں کہ لڑکا ہوا ہے یا لڑکی؟"

دنیا کی ساری قومیں بے اختیار کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

(اے۔ آئی۔ آر۔ بمبئی سے منشور)

جنازے
جب موت نے دنیا کے بڑے بڑے فاتحین کو دبوچا تو ان پر کیا گزری۔ منٹو نے دس مرقعے پیش کئے ہیں۔
قیمت عہر۔ ساقی بکڈپو دہلی سے طلب فرمائیے۔

از سیف الدین سیفؔ

مثنوی

مُسافر لوٹ جاتے ہیں جہاں میں!

بہار آئی لئے نغموں کی رنگینی
کہیں اس خلد جنت نشاں میں
تمنائے سیاحت دل میں لے کر
وہ اک فطرت کے نظاروں کا شیدا
اُسے تھا صرف شوقِ نغمہ خوانی
وہ اک دن صبح کو گاتا گنگناتا
کسی چشمے کی جانب جا رہا تھا
یکایک اس نے دیکھا سر اٹھا کر
خراماں تھی کوئی مستِ جوانی
تھرکتی جھولتی لہرا رہی تھی
دمادم کاکلیں بکھرا رہی تھی
رُکی، وادی نے دیکھا مست ہو کر
وہ اتری حیرتِ نظارہ بن کر
ہوا کی چھیڑ سے دامن بچاتی
شرابی لالہ زاروں سے گزرتی
مثالِ ابر بل کھاتی ہوئی سی
چلی جب ناز سے گاگر اٹھا کر
کچھ ایسی بیخودی سے گیت گائے
چھلک کر جب گرا گاگر سے پانی
چپک کر رہ گئی ساری بدن سے
مُسافر نے کہا اے رُوحِ کشمیر
کہاں سے آ گئی تو اس دمن میں
ترے رُخ پر بہاروں کے نشاں ہیں
پئے تسکینِ دل اتنا بتا دے
وہ دوشیزہ یہ سن کر مسکرائی
نہیں پردیسیوں سے کام اپنا

چھلک اٹھا ترنم ارضِ کشمیر
ہجومِ رنگ و بوئے گلستاں میں
وہاں پہنچا کوئی تنہا مُسافر
گلوں کا اور کہساروں کا شیدا
سراپا نکہت تھی اس کی جوانی
زمیں و آسماں کے نغمے سناتا
[illegible] چھایا ہوا تھا
[illegible] دامن پہ [illegible] پربت کے اوپر
سیہ زلفیں دوپٹہ سر پہ ڈھالی
شفق کی سرخیاں دمکا رہی تھی
چھناچھن پائلیں کھنکا رہی تھی
جھکی، پانی بھرا گاگر ڈبو کر
وہ اتری نکہتِ آوارہ بن کر
نظر سے آسمانوں کو جھکاتی
نگاہوں میں مستیاں تقسیم کرتی
وقارِ کوہ ٹھکراتی ہوئی سی
پہاڑی ندیوں نے دف بجا کر
صنوبر کے قدم بھی لڑکھڑائے
بدن سے پھوٹ کر نکلی جوانی
حیا سی آ گئی اس بانکپن سے
مرے خلد آشنا خوابوں کی تعبیر
کلی بن کر کھلی ہے کیا چمن میں
شفق کی سُرخیاں لب پر عیاں ہیں
فقط نام و نشاں اپنا بتا دے
کہا ہنس کر بطرزِ دلربائی
بھلا ہم کیوں بتائیں نام اپنا

یہ شوخی سے کہا اور مسکرا کر
مگر ناکام پردیسی مُسافر
وہیں شفاف چشمہ کے کنارے
پھر اپنی بانسری منہ سے لگائی
لپک تھی آگ کی نالوں میں جیسے
دبائے کاوشِ زخمِ جگر کو
مگر آئی نہ اس کو نیند شب بھر
ہوئے جب صبح کے آثار پیدا
زمیں شاداب تھی سبزہ ہرا تھا
گلوں نے عنبریں آنچل اٹھا کر
مگر حیراں تھا اس کا دیدۂ تر
قریبِ شام چشمے کو سدھارا
وہی ابریشمی لب ہل رہے تھے
سنبھلتی، جھولتی، لہرا رہی تھی
دمادم کاکلیں بکھرا رہی تھی
دہن پر حلم کھل رہا تھا
مثالِ بوئے گُل چشمے پہ آئی
اُفق کی تیرگی میں کھو گئی وہ
غم و اندوہ کو دل میں دبائے
وہ روزانہ یونہی چشمے پہ جاتا
مگر پہلی سی اب حالت کہاں تھی
سسکتی بانسری کی لے میں کھو کر
یونہی اک رات وہ بیتاب ہو کر
فروزاں چاندنی میں ساحرانہ
سرور و نور کا مسکن تھی وادی
مگر وہ بانسری مُنہ سے لگائے

وہ رخصت ہو گئی گاگر اٹھا کر
غمِ الفت کی گہری چوٹ کھا کر
کھڑا تھا نرم شاخوں کے سہارے
عجب اک بیخودی میں دُھن جمائی
لگی ہو آگ ارمانوں میں جیسے
بوقتِ شام لوٹ آیا وہ گھر کو
بڑی مشکل سے کاٹی شب تڑپ کر
مُسافر سر جھکائے گھر سے نکلا
سُہانا دشت پھولوں سے بھرا تھا
بہارِ صبح دیکھی مسکرا کر
نہ دیکھا حسنِ فطرت آنکھ اٹھا کر
نگاہوں نے وہی دیکھا نظارا
کہ دو مبہوت غنچے کھل رہے تھے
شفق کی سُرخیاں دمکا رہی تھی
چھناچھن پائلیں کھنکا رہی تھی
ترنم میں تبسم گھل رہا تھا
ہنسی پانی لیا گاگر اٹھائی
شفق کے ساتھ رخصت ہو گئی وہ
مُسافر لوٹ آیا سر جھکائے
زمیں کو عرش کے نغمے سناتا
تبسم کی جگہ لب پر فغاں تھی
ترانے رہ گئے فریاد ہو کر
اُٹھا اور آ گیا پربت کے اوپر
سنایا سوزِ الفت کا ترانہ
حریفِ وادیٔ ایمن تھی وادی
کمالِ بیخودی میں سر جھکائے

تمناؤں کا ماتم کر رہا تھا
نظامِ دہر برہم کر رہا تھا

شکستِ شوق آتش زیر پا تھا
جنوں لے نوازی چاہتا تھا

خنک آہوں پہ انگارے اچھالے
تڑپ کر سینہ نے پھونک ڈالے

فغاں کو آہ میں تبدیل کر دے
فضا میں سسکیاں تحلیل کر دے

اٹھیں جب بجود و مخمور تانیں
محبت بن گئیں سنگیں چٹانیں

رخِ گل سے شرارے پھوٹتے تھے
ستارے آسماں پر لوٹتے تھے

ہوائیں رک گئیں مدہوش ہو کر
فضائیں رہ گئیں خاموش ہو کر

یکایک جاگ اٹھا وادی کا منظر
تبسم چھا گیا تابانیوں پر

ترنم بس گیا اک ایک شے میں
ہوا گانے لگی مدہوش لے میں

ہوا نے مرمریں عنبر اڑایا
مسافر نے سنبھل کر سر اٹھایا

خوشا اے جذبۂ سوزِ نہانی
خوشا اے زخمۂ سازِ نہانی

جلو میں نکہتِ گل کی روانی
خراماں تھی وہی مستِ جوانی

سنبھل کر روکتی پائل کی چھن چھن
چلی آتی تھی وہ مسحور ناگن

پریشاں گیسوؤں میں برہمی تھی
سیہ آنکھوں میں ہلکی سی نمی تھی

قریب آ کر رکی وہ ہو کے بولے
ہنسی ہنس کر لبِ اعجاز کھولے

کہا اے بجلیاں برسانے والے
سکوتِ نیم شب میں گانے والے

بہت شعلے اچھالے بانسری سے
خدارا لب ہٹا لے بانسری سے

تمہاری حدتِ سوزِ فغاں سے
شرارے اڑ رہے ہیں قلب و جاں سے

مسافر نے کہا یہ خواب ہے کیا
مری آغوش میں مہتاب ہے کیا

نگاہوں کو یقیں آتا نہیں ہے
حقیقت ہے کہ خوابِ دلنشیں ہے

کوئی اتنا پریشاں ہے کہ تم ہو
فریبِ چشمِ حیراں ہے کہ تم ہو

کہا دوشیزۂ بربط نوا نے
ہٹاؤ رنج و کلفت کے فسانے

چلو اگلی فضائیں بھول جاؤ
کوئی راحت فزا نغمہ سناؤ

ہواؤں نے شرابی گیت گائے
پہاڑی ندیوں نے دف بجائے

غزلخواں ہو گیا فطرت کا ہر ساز
بلندی سے گری جھرنے کی آواز

اگر فردوس بر روئے زمین است
ہمین است و ہمین است و ہمین است

زمیں [illegible] وفا سے رفتہ رفتہ
ہوا رنگین امیدوں کا نقشہ

وہ باہم چاندنی راتوں میں مل کر
بنا تے خلوتوں کو خلد منظر

کبھی وادیوں میں جھومتے وہ
خیاباں در خیاباں گھومتے وہ

ابھرتے یوں چٹانوں پر وہ تنہا
فضا میں جیسے جوڑا سارسوں کا

کبھی خاموشیوں کا ساز سنتے
شرابی خلوتوں میں خواب بنتے

جواں سینوں میں شعلے سے بھڑکتے
خموشی میں فقط دو دل دھڑکتے

چمکتے چاندنی میں دشت و کہسار
دمکتے لالہ رخ کلیوں کے رخسار

جوانی کے لبوں سے ہوک اٹھتی
گھنے پیڑوں میں کوئل کوک اٹھتی

کوئی طائر پروں کو پھڑپھڑاتا
طلسمِ خامشی کو توڑ جاتا

کبھی وہ بانسری منہ سے لگاتا
رسیلی مدھ بھری تانیں اڑاتا

ادھر وہ ساحرہ پربت کی رانی
برنگِ پیکرِ نغمہ برِ مانی

کچھ اس انداز سے نغمے سناتی
دھڑکتی پتھروں کی سرد چھاتی

وفاؤں کے علم لہرائے جاتے
جوانی کے ترانے گائے جاتے

حریمِ شوق میں آباد تھے وہ
غم و اندوہ سے آزاد تھے وہ

وہ رت ساری ملاقاتوں میں گذری
فروزاں چاندنی راتوں میں گذری

مگر دن آ گئے پھر سردیوں کے
چلے ٹھنڈی ہوا کے سرد جھونکے

گلستاں، گھاٹیاں، گلزار، گلبن
بکھر کر بن گئے ماضی کے مدفن

تھے غاروں سی ویرانی کے سائے
ہوا میں خشک پتے سرسرائے

برہنہ سرد اور سنسان کہسار
کسی اجڑی ہوئی بستی کے آثار

چلیں پیہم سے برفانی ہوائیں
ہوئیں پربت پہ یخ بستہ گھٹائیں

مسافر نے اسے خلوت میں اک روز
کہا اے نازنینِ حسنِ دل افروز

میں اب واپس وطن کو جا رہا ہوں
نہ ہونا غم مرے جانے سے محزوں

نہ ٹھہروں گا وہاں بے مدعا میں
بہار آتے ہی ساتھ آ جاؤں گا میں

تڑپ کر رہ گئی سن کر وہ مہرو
بھر آئے سرمگیں آنکھوں میں آنسو

کہا رو کر کہ اے امیدِ راحت
یہی ہوتا ہے انجامِ محبت

نہ آیا مقام سے وہم و گماں میں
مسافر لوٹ جاتے ہیں خزاں میں

نہ رو کے رک سکا لیکن مسافر
امیدوں کے حسیں سپنے دکھا کر

تڑپتا چھوڑ کر اس سیم تن کو
وہ آخر چل دیا اپنے وطن کو

اجڑ کر رہ گیا من کا سہانا
اسیرِ دامِ غم تھی وہ غزالہ

سحر ویران شب ویران تر تھی
شبیہ یاس تا حدِ نظر تھی

تلاشِ حسنِ ماضی میں کئی بار
وہ جا کر دیکھ آتی دشت و کہسار

ترائی میں بیانِ حیرت ساز
کسی پر سوختہ بلبل کی آواز

دلِ معصوم پر نشتر چلاتی
سلگ اٹھتی فضا کی سرد چھاتی

کبھی چشمے پہ اکثر آنے جاتے
اسے گذرے ہوئے دن یاد آتے

کبھی خلوت میں وہ آنسو بہاتی
کبھی وادی میں آ کر گنگناتی

"مرے محبوب جس دن سے گئے ہو
بہاریں ساتھ اپنے لے گئے ہو

ستاروں میں چمک باقی نہیں ہے
گلوں میں وہ مہک باقی نہیں ہے

قرارِ زندگی بن جاؤ، آ جاؤ
بہارِ زندگی بن جاؤ، آ جاؤ"

امیدوں نے دیا لیکن سہارا
خیالِ عیشِ ماضی نے ابھارا

خزاں ہے [illegible] آخر کار
زمیں پھر ڈھک گئی ہریالیوں سے
ہوا میں زمزمے شادابیوں کے
تنی شاخوں سے [illegible]
حسیں وادی میں غنچے مسکرائے
مگر عشق نے عجب نقشہ دکھایا
[illegible] جب [illegible]
[illegible] کشمکش میں گذرا
مگر جب پھیل جاتا تھا اندھیرا
محبت [illegible] ہوتی
غرض آئی بہار [illegible]
[illegible] رستے کی تیا
[illegible] ہوا [illegible]
[illegible]
[illegible] میں
[illegible]
[illegible] سو رہی تھی
[illegible] پہلی ملاقات
تخیل [illegible] اُٹھے
[illegible] دیکھا کچھ ایسا
کہ ظلمت [illegible] میں
[illegible] برفانی ہوا کے
صدائیں جاگ اٹھیں تنہائیوں کی
گریں سبزہ پہ شبنم کی پھواریں
ستاروں کے دریچے کھل رہے تھے
بڑھا حد سے طلسم ذوقِ دیدار
مثالِ ماہ رنگیں بادلوں میں

خوشی جب لہلہاتے زعفران زار
شگوفے پھوٹ نکلے ڈالیوں سے
فضا میں قافلے مرغابیوں کے
اُبھارے سُرخ پھولوں کے کٹورے
سیاحت کو ہزاروں لوگ آئے
وہ جس کی منتظر تھی وہ نہ آیا
امید دل کی نئی بستی بسائی
نگاہوں میں [illegible] لٹتا ابھرتا
تو امیدوں کا رشتہ ٹوٹ جاتا
اکیلی بیٹھ کر [illegible]
[illegible]
نہ آیا [illegible] کنھیا
غبار راہ میں بکھرا [illegible] پھول
وہاں تک [illegible] امید رہتی
گئی پیچھے کی جانب بیخودی میں
سکوتِ تارکی شامِ زمستاں
خموشی گھاٹیوں میں سو رہی تھی
شباب و شعر میں ڈوبی ہوئی رات
تصور میں [illegible] اٹھے
نظر نے دل کو بہکایا کچھ ایسا
[illegible]
یکایک بن نئے جھونکے صبا کے
کہ جیسے گونج ہو شہنائیوں کی
اٹھیں انگڑائیاں لیکر بہاریں
شگوفے چاندنی میں ڈھل رہے تھے
گلستاں بن گیا دامانِ کہسار
تصور کے سنہری آنچلوں میں

میانِ کہکشاں تانیں اُڑاتا
اٹھیں شوقِ ہم آغوشی کو باہیں
خیالوں میں کچھ ایسی کھو گئی وہ
سحر کے وقت کچھ لوگوں نے دیکھا
وہی شفاف چشمے کے کنارے
ہوئے مشہور بستی میں فسانے
زمیں پہ معصوم کی تربت بنائی
خزاں گذری بہار آئی پھر اک بار
[illegible] مشقت نے اٹھایا
[illegible] جانب وہ سرِ شام
وہاں اک تازہ تربت کا نشاں تھا
لیے بھیڑوں کا گلہ اک گڈریا
مسافر نے کہا آہستگی سے
کہو تو یہ نئی تربت ہے کیسی
اٹھے پہلو سے آہوں کے بگولے
بہت حسرت زدہ صورت بنا کر
نظر میں برق بن کر یاس کوندی
خلا میں کھو گئیں بے بس نگاہیں
سلگتی بانسری پر بین کرتا
گھنیری ظلمتوں میں کھو گیا وہ

مسافر آرہا تھا مسکراتا
مگر پتھرا گئیں بے بس نگاہیں
فضا کی نیند آخر سو گئی وہ
سراپا یخ ہوا تھا جسم اس کا
پڑا تھا زرد شاخوں کے سہارے
بہت رو دھو کے اسکے اقربا نے
کہ اس کی آخری خواہش یہی تھی
شہابی ہو گئے کلیوں کے رخسار
مسافر بھی وطن سے لوٹ آیا
نظر میں چھا گیا اک خوفِ گمنام
سکوتِ شام [illegible] نوحہ خواں تھا
چلا جاتا تھا پگڈنڈی پہ تنہا سا
ٹھہر جا او ذرا اے جانیوالے
یہاں کچھ سال پہلے تو نہیں تھی
گڈریا رک گیا بھیڑوں کو روکے
سُنایا واقعہ نزدیک آ کر
قضا نے بے طرح امید روندی
سسک کر رہ گئیں سینہ میں آہیں
نشیبوں اور چٹانوں سے گذرتا
حسیں وادی سے رخصت ہو گیا وہ

زمانہ ہو چکا اس داستاں کو
مگر گاتے ہے گڈریوں کی زبانی
کہ اب بھی چاندنی راتوں میں اکثر
برنگِ سایۂ گل جھومتے ہیں

کھُلا بیٹھے ہیں لو اس نوجوان کو
سنی جاتی ہے یہ بھولی کہانی
گھنے جنگل سے دو سائے اُبھر کر
سنہری وادیوں میں گھومتے ہیں

چھلک کر نیم شب کی خامشی سے
بکھر جاتے ہیں نغمے بانسری کے

میراجی کی نظمیں

اُردو کے سب سے مشہور شاعر میراجی نے اب تک ہزاروں نظمیں لکھی ہیں۔ یہ ساٹھ نظمیں ان کا نچوڑ ہیں۔ یہ بالکل جدید طرز کی نظمیں ہیں۔ اس شاعر کی جو جدید شاعری کا امام سمجھا جاتا ہے۔ مجلد قیمت دو روپے آٹھ آنے۔

ملنے کا پتہ:۔ ساقی بک ڈپو، دہلی۔

اندیشے

ناہید عالم

اور مجھے یقین تھا کہ آپ عید پر ضرور آئیں گے۔ اس لئے میں نے بہترین لباس کا انتخاب کیا، وہ ہلکے آسمانی رنگ کا سوٹ جس پر بڑے بڑے پیازی اور ہلکے زرد رنگ کے پھول۔ آسمان پر کھلی ہوئی قوس قزح سے بھی زیادہ دلفریب دکھائی دیتے تھے۔ آپ کے استقبال کیلئے میں نے چُنا۔ وہی — جسے پہنے دیکھ کر پہلی مرتبہ آپ کی نگاہیں بے باکی سے مجھے دیکھنے کی بجائے جھکنے پر مجبور ہوگئی تھیں۔ اور آپکی جھکی جھکی آنکھیں کسی خوبصورت لگتی ہیں۔ لانبی لانبی کانپتی ہوئی سیاہ پلکیں۔ ایک دوسرے سے مل جانے کے لئے، جیسے ہر وقت بیقرار رہتی ہوں۔ اور رات کے راس شفاف آنکھوں کے نیچے، ہلکے ہلکے بادامی سے حلقے — بخیر آپ کے سرخ و سفید رنگ نے اور بھی واضح کر دیا ہے مجھے بیخود بنا دینے کے لئے کافی ہیں۔ اور بعض اوقات تو میں ان حلقوں میں کچھ اس بری طرح پھنس جاتی ہوں کہ نکلنے کا راستہ ہی نہیں ملتا۔ ملتا بھی ہے تو میں دانستہ اسے نظر انداز کر دیتی ہوں۔ پھر اس بھٹکنے میں کتنا مزہ ہے۔ کتنا کیف۔ جی چاہتا ہے کہ سب کچھ بھول کر ان انجان رستوں میں بھٹکتی پھروں آپکی آنکھوں میں کیا نہیں ہے۔ میں نے زندگی بھر اتنی خوبصورت، اتنی معصوم، اتنی گہری اور اتنی پُرگو آنکھیں نہیں دیکھیں۔ میں اکثر سوچا کرتی ہوں کہ یہ آنکھیں نگاہوں کا بار اُٹھانے کے لئے ملبوس نہیں کی گئیں۔ انھیں جھکا ہی رہنا چاہئے۔ مبادا کسی کی زہریلی نگاہیں انھیں بھی وہی زہر بھر دیں جو تقریباً تمام مردوں کی آنکھوں میں اس بری طرح گھلا ہوتا ہے کہ عورتیں ہزار بھاگنے کے باوجود بھی اس کے جان لیوا اثر سے محفوظ نہیں رہ سکتیں۔

قیوم کی آنکھیں دیکھی ہیں آپ نے؟ وہ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں جن میں کھنچے ہوئے سُرخ سُرخ ڈورے، کسی مست شرابی کی بہکی ہوئی مستانی آنکھوں کی طرح تیرتے رہتے ہیں — بے حد دلکش ہیں۔ مگر ان میں کتنا زہر بھرا ہے۔ یہ ذکیہ سے پوچھئے۔ وہ اس کی خالہ زاد بہن ہے۔ اور کالج میں بھی وہ اکٹھے پڑھتے ہیں۔ اپنی خوبصورتی کی وجہ سے ذکیہ کالج میں "کلو پطرہ" کے نام سے پکاری جاتی تھی۔ اور قیوم — لیکن قیوم سے بھی خوبصورت لڑکے کالج میں موجود تھے۔ بلند و بالا، گٹھیلے، دلکش — مگر قیوم کی آنکھوں میں نہ جانے کیا تھا کہ ذکیہ بے بس ہوگئی — اس کا تمام غرور ٹوٹ گیا۔ اور کالج میں بڑی رعونت سے اپنے لمبے بالوں کو جنبش دے دیکر چلنے کی بجائے اس کی گردن جھک گئی — بے حد عقیدتمندانہ انداز میں — قیوم کی آنکھیں — ایک دن اس نے مجھ سے کہا "کتنا زہر ہے ان میں، سچ بتانا عذرا، تم نے کبھی دیکھی ہیں ایسی آنکھیں؟" وہ مست سی خلاء میں تکنے لگی۔ "نہیں تو —" میں نے کہا، اور وہ بتاتی کہہ رہی تھی — "ارے، اس سے کہیں زیادہ فسوں ساز نگاہیں خود مجھ پہ اٹھتی رہیں۔ چوری چوری، چپکے چپکے —" اور وہ گنگنانے لگی — "میں کیا جانوں، کیا جادو ہے، ان دو متوالے نینوں میں"

پھر ایک روز بالکل غیر متوقع طور پر وہ مجھے لارنس گارڈن میں مل گئی۔ لاپرواہی سے شانوں پر پڑے ہوئے، سفید فر کے کوٹ کے درمیان اس کا چہرہ بے حد حزیں دکھائی دے رہا تھا۔ یا شاید میں نے ہی ایسا محسوس کیا۔ کیونکہ اس وقت میں آپکو اسٹیشن پہ رخصت کر کے واپس ہو رہی تھی۔ "کہو — اچھی تو ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں — آں — اور تم؟" وہ لمحہ بھر کیلئے خاموش ہوگئی۔ پھر میری ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں میں گھورتے ہوئے بولی "میری آنکھوں میں، آجائیں تمہارے آنسو"

"حفظِ ماتقدم!" میں نے پوچھا "اور ہاں یہاں تم کیا کر رہی ہو۔ کسی کا انتظار؟"

"نہیں کسی کا ماتم —!" اس نے بڑا سا منہ بنا کر کہا۔

"خیر تو ہے — آج کچھ خفا سی دکھائی دے رہی

ہو۔ کیوں۔ کیا تمہاری آنکھوں میں اب وہ رس نہیں رہا ؟"

"بس ــــ میں کہتی ہوں اتنی بسر، پھر بھی آنکھیں میں نے کم دیکھی ہیں۔" [illegible] اس سے بھی کچھ اس لئے میں نے سوچا [illegible] سے [illegible] ۔ وہ لوگ اب یہیں ریسٹ ہاؤس [illegible] آ [illegible] کوٹھی سے لوٹ تو ریسٹ ہاؤس روڈ کافی دور ہے ــــ [illegible] میں سے [illegible] ہوتے ہوئے [illegible] پڑتی ہے [illegible] اسی رستے پہ چل پڑی۔ لیکن ابھی میں نہیں کیا بتا دوں کہ [illegible] میں سامنے کے موڑ پہ مڑے [illegible] تو وحید [illegible] سے [illegible] اس پہ نرگس کو بیٹھے دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا گویا [illegible] کسی نے چپکے سے تیز [illegible] مار دیا [illegible] اس کے قدموں میں بیٹھا ہو، تیوری اپنی متوالی آنکھوں سے اُسے [illegible] مفتونیت اور وارفتگی سے دیکھ رہا تھا۔ وہ [illegible] ــــ [illegible] کہہ کر وہ ایک طرف کو جلدی [illegible] میں اپنی [illegible] اُسے [illegible] سے نہ روک سکی۔ اور جب یہ [illegible] ٹوٹی تو دور ــــ [illegible] دروازے سے [illegible] آنچل لہرا رہا تھا۔ یہ لہراتے ہوئے آنچل بھی بعض اوقات مردوں کی راہ میں سنہرے جالوں کی طرح یوں بچھ جاتے ہیں کہ پھر بچ کر [illegible] مشکل ہو جاتا ہے۔ [illegible] کے پی۔ اے لو تو آپ جانتے ہوں گے نا۔ وحید، جب وہ پہلے پہل ہمارے ہاں آیا تو میں وہیں اباجان کے پاس [illegible] پڑھتی تھی۔ ہمارا امتحان نزدیک آیا تھا۔ [illegible] میری ایک سہیلی اسکول کے بعد میرے پاس آ جاتی [illegible] دونوں مل کے امتحان کیلئے تیاری کیا کرتے۔ وہ ایک تدک کی لڑکی تھی سانولی سی، بیٹھے بیٹھے نقوش والی۔ تاہم [illegible] وسیع تھا۔ شام کو چھ بجے کے قریب جب میں اُسے چھوڑنے پھاٹک تک جاتی۔ تو واپسی پہ وحید کو Rest House کے برامدے میں کھڑا پاتی۔ اس کی نظریں کبھی انوری کے زرد، کبھی سبز اور کبھی گلابی لہراتے ہوئے آنچل پر [illegible] ــــ

پھر امتحان سے پندرہ روز پہلے میں یہ خبر سُن کر حیران رہ گئی کہ وہ انوری کو بیاہ لایا ہے۔ لیکن شادی سے اگلے روز جب میں نے اُسے دیکھا تو وہ مرجھایا ہوا سا تھا۔ دیوار سے ٹیک لگائے عجز اور [illegible] انگلی سے دیوار پہ کچھ لکھ رہا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا "بڑا دھوکا ہوا" وہ بار بار یہی لکھے جا رہا تھا۔

میں پاس ہو گئی۔ اور کالج میں داخل ہونے کے لئے امی کے ساتھ لاہور آ رہی تھی۔ انوری کا خیال میرے ذہن سے رفتہ رفتہ بالکل اُتر چکا تھا۔ تاہم بڑے دن پر جب ہم لوگ اباجان کے پاس آئے تو اسی شام میں انوری سے ملنے گئی۔ بے چاری بالکل زرد پڑ گئی تھی۔ جیسے اس کی زندگی کا تمام رس نچوڑ لیا گیا ہو ــــ اس نے مجھے بتایا کہ وحید اس کے ساتھ بہت بُرا سلوک کرتا ہے اور اس کے زیور [illegible] بیچ کر گلچھرے اُڑا رہا ہے۔ مجھے بڑا افسوس ہوا۔ غریب لڑکی!

ان دنوں مجھے گلاب کے پھولوں سے عشق تھا۔ اگر کوئی پودے پر سے ایک پھول بھی توڑ دیتا تو میں اس کی جان کو آ جاتی حتیٰ کہ اس سلسلے میں میں بھیا سے بھی کئی بار لڑ چکی تھی ــــ اور پھر اس مرتبہ تو میں نے بڑے ارمانوں سے، بے حد سُرخ پھولوں والے پودے کاشت کرائے تھے۔ جن پہ کھلے ہوئے پھول دیکھنے کے شوق میں، میں سویرے ہی بستر سے نکل پڑتی۔ ایک دن میں نے دیکھا کہ وحید اس سالان میں بیٹھا گلاب کے ایک نوشگفتہ پھول کی پتیاں مسل رہا ہے ــــ مجھے دیکھ کر گھبرا گیا۔ اور معافی مانگنے لگا۔

"او" ــــ میں نے مسکراتے ہوئے کہا "پُرانی بات ہے یہ تو تمہاری ــــ کوئی نئی بات کرو"

وہ اور بھی گھبرا گیا "بخدا میں نے تو آج تک ایک پھول کو بھی شاخ سے جُدا نہیں کیا ــــ مجھے تو خود پھول بے حد پسند ہیں!"

"ضرور! ــــ" میں نے طنزیہ کہا ــــ "لیکن تم یہ نہیں جانتے کہ عورت کا دل پھول سے کہیں زیادہ دلفریب اور نازک ہوتا ہے ــــ!"

"جی ہاں! جی ہاں ــــ" وہ سمجھتے ہوئے اور ــــ اور بھی گھبرا گیا "مگر سچ بتائیے کہ جسے دور سے دیکھ لینے پر آپ گلاب کا پھول سمجھ لیں ــــ پاس آنے پہ وہی "کنیر" کا بے بو سا پھول نکلے تو کیا آپ کا جی اُسے مسل کر پھینک دینے کو نہ چاہے گا"

"لعنت ہے تم پہ ــــ" میں چڑ گئی "تم لوگ اپنی آنکھوں میں دھول جھونک کر "کنیر" کے پھول کو گلاب سمجھ کے اس سے اپنی امیدیں، آسودگی اور تمنائیں کیوں وابستہ کر لیتے ہو۔ کیوں کھنچے لگتے ہو اس کی طرف؟ گلاب کو "کنیر" سمجھ کے

اس سے کتراتے کیوں نہیں۔ پھول کا کیا قصور؟"

"بگڑ گئیں آپ تو" وہ ہنس دیا۔ ایک عجیب بھدا سا ہنسی "وہ آپکی سہیلی ہے نا؟" اور میں اس کے اس بھونڈے مذاق پر اٹھتی وہاں سے چلی آئی۔

. . . . . "وحید نے میری حسرت اور چوڑیاں بھی بیچ دی ہیں" انوری نے بڑی حسرت سے کہا۔ اُسے یہ چوڑیاں بے حد عزیز تھیں۔ اور چوڑیاں کسے عزیز نہیں ہوتیں۔ انہی کی وجہ سے تو عورتوں کا سہاگ قائم ہے۔ اور بعض اوقات تو چوڑیوں کے مترنم جھنکے، کنواریوں کی مانگیں بھی سہاگ کی جھلملاتی ہوئی افشاں سے بھر دیتے ہیں۔ آپ نے اکثر میرے ساتھ ایک لمبی سی گوری گوری لڑکی کو دیکھا ہوگا۔ اس کا نام سعیدہ ہے۔ یہ اُن دنوں کا ذکر ہے جب وہ بی۔ اے کی تیاری کر رہی تھی جس کوٹھی میں وہ رہتی تھی اس کے دوسرے حصہ میں راشد چچا کے لڑکے منصور اور مسعود رہتے تھے۔ منصور اور سعیدہ کے کمروں کے درمیان ایک دروازہ تھا۔ جسے مالک مکان نے لوہے کی پتریوں سے ہمیشہ کیلئے بند کر دیا تھا۔

رات کو دیر تک پڑھنے کے بعد جب سعیدہ تکان دور کرنے کیلئے انگڑائیاں لیتی تو اس کی چوڑیاں بجتی رہ جاتیں۔ اور منصور پڑھائی وڑھائی چھوڑ ان جھناکوں میں مست ہو جاتا۔

"منصور بھائی کی طبیعت بڑی خراب ہے" ایک دن مسعود گھبرایا ہوا سا آیا "مجھے تو پریشان کر دیا ہے۔ آپکو فرصت ہو تو چلئے میرے ساتھ"

اور جب امی سے اجازت لیکر میں ان کے ہاں آئی تو وہ مجھے منصور کے کمرے میں چھوڑ کر خود پڑھائی میں مشغول ہو گیا اور حسب عادت منصور لگا مجھ سے بھڑنے — "جی — کوئی مر بھی جائے تو آپکی بلا سے۔ آج بھی نہ جانے کہاں سے رستہ بھول پڑیں — وہ تو کہئے کہ ہم ہی ڈھیٹ ہیں جو —" معاً ساتھ کے کمرے میں کسی نے چوڑیوں کی گت پہ فردوسی ترانے چھیڑ دیئے" اور منصور مست ہو گیا۔ بالکل کھو گیا۔

"کتنی دلفریب ہے یہ چوڑیوں کی جھنکار!" میں نے اُسے چھیڑنے کی غرض سے کہا، وہ چونک پڑا "ہاں — لیکن میری امیدوں سے کم" وہ جیسے خواب میں بڑبڑایا۔

اس کے چھ سات مہینے بعد میں نے اسے سعیدہ کے مہندی رچے ہاتھوں میں جھنجھناتی ہوئی لال لال چوڑیوں سے کھیلتے دیکھا۔

"کسی کی چوڑیوں سے کھیلنا بھی کتنا مست کن فعل ہے۔ کتنا رومان انگیز" وہ مسکرایا۔

"ہاں — مگر میری امیدوں سے کم" میں نے کہا۔ اور وہ سمجھا کہ میں اُسے چھیڑ رہی ہوں۔ لیکن میں ٹھیک کہہ رہی تھی۔ میرے تصورات کے دھندلکوں میں سرگرداں ایک پیاری سی صورت لرزتی رہتی ہے جس کی میں نہ جانے کب سے پرستش کر رہی ہوں۔ نہ جانے میرے دل میں کتنی عقیدت ہے اپنے دیوتا کیلئے۔ نہ جانے کتنا احترام۔ میں نے آجتک مہندی نہیں لگائی۔ کیوں لگاؤں۔ جب تک کہ میرا دیوتا ان دھندلکوں سے نکل آئے میں سُرخ چوڑیاں بھی نہ پہنونگی۔ پھر بھی کبھی کبھی مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے گویا کوئی میرے مہندی رچے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں دبائے میری سُرخ سُرخ زرنگار چوڑیوں سے کھیل رہا ہے — لیکن میں نے آجتک اسے نہیں دیکھا۔ مجھے اس کا انتظار ہے۔ رات کی تنہائیوں میں دوپہر کے سناٹوں میں۔ گھور اندھیروں میں، بکھرے نور میں، میں اسے پوجتی رہی ہوں — اُس دلفریب نقش کو — اور مجھے یقین ہے کہ وہ عنقریب ہی اُن دھندلے پردوں کو چیر کر باہر نکل آئے گا۔ میں نے سوچا تھا۔

. . . . لیکن آپ عید پر بھی نہ آئے۔ میں نے آپکے استقبال کیلئے بہترین لباس کا انتخاب کیا۔ اور جب میں اسی رنگ کی چوڑیاں پہننے لگی تو جانے کس طرح رنگ برنگی چوڑیوں کا وہ حسین گچھا میرے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پہ جا گرا۔ گیلی گیلی آنکھوں میں کاجل پھیلنے لگا۔ دریچوں سے ایک خاص زاویہ پر مُڑے ہوئے بال بل کھا کر پشت پہ جا پڑے۔ میں نے دروازے کے ادھ کھلے پٹ میں ٹنگی ہوئی چک میں نظریں الجھا دیں۔ لیکن یوں تو مجھے اور بھی وحشت ہونے لگی۔ جیسے ان پتلی پتلی درزوں میں سے بے شمار تمسخر آمیز انداز میں ہنستے ہوئے چہرے مجھے گھور رہے ہیں اور پرے — اُف میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوا گویا آپ اپنے محبوب انار کے درخت کے نیچے بیٹھے نفرت سے گردن موڑے مجھے دیکھ رہے ہوں۔ گویا آپکی آنکھیں کہہ رہی ہوں۔ "تم کتنی پست ہو، کتنی ذلیل —" میں نے اُلجھن میں اپنے ریشمی دوپٹے پہ ٹنکے ہوئے لچکے کو اُدھیڑ کر رکھ دیا۔

خالی خالی کلائیاں۔ مجھ جیسی چوڑیاں اٹھا لینے پر اُکسا رہی تھیں۔
"پچھلی پہر بڑا شگون ہے ۔۔۔ ان کا تحفہ ۔"

اوہ! مگر یہ تحفہ نہ تھا یہ تو فرمائش تھی۔ میرے دماغ میں جیسے کوئی تیز تیز ہتھوڑیوں سے ضربیں لگانے لگا۔ جی ہاں یہ وہی چوڑیوں کا جوڑا تھا جو پچھلی بار آپ میرے لئے علی گڑھ کی نمائش میں سے لائے تھے۔ نہیں بلکہ جس کی میں نے خود فرمائش کی تھی ۔۔۔ وہ بھی اس وقت جب جانے سے پہلے آپ اپنی گاڑی میں نہ جانے کتنے جادو بھرے، بظاہر فرمائش سے ۔۔۔ لیکن دراصل مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ ابکی نمائش میں سے آپ ان کے لئے کیا لائیں۔ میں اس وقت رونے کو ہو رہی تھی لیکن سب کے سامنے آنسو بہانا مجھے منظور نہ تھا۔ اس لئے میں نے الفاظ کی آڑ لے لی۔ سچ، میرا مطلب آپ کی کسی کمزوری سے فائدہ اٹھانا نہ تھا۔ آپ ہی بتائیے ۔۔۔ میری غیرت مجھے اس کی اجازت کب دیتی کہ میں اپنی محبت کو یوں سستے داموں بیچ دوں۔ ان سستی بازاری عورتوں کی طرح جو محبت کم کرتی ہیں اور فرمائشیں زیادہ ۔۔۔ وہ گری ہوئی عورتیں! لیکن ہمیں میں بھی تو آپ کی نظروں سے نہیں گر گئی۔ کہیں آپ مجھ سے بدگمان تو نہیں ہو گئے۔ میری محبت کو بھی آپ نے انتہائی سطحی اور کھوکھلا تو نہیں سمجھ لیا۔ بتائیے؟ ۔۔۔ اگر نہیں، تو پھر آپ عید پر کیوں نہیں آئے کیوں ۔۔۔؟

امین حزیں

ممکناتِ اسیری

اسیری میں یہ ناممکن نہیں ہے
لگے شبنم پتیاں گھاس چرنے

وہ رہتا ہیں تسمہ بر پا ہیں یقیناً
چلے چیلوں کی جو تقلید کرنے

(۲)

اسیری میں یہ ناممکن نہیں ہے
کہ طوطی گفتہ صیّاد گائے

بھی ہے دشمنِ غیرت بھی ہے
شکم کی مار سے اللہ بچائے

(۳)

اسیری میں یہ ناممکن نہیں ہے
کہ شرمائیں نہ دن کو رات کہتے

جمی دیکھی ہیں آقا کی جبیں پر
تجسس کی نگاہیں بات کہتے

(۴)

اسیری میں یہ ناممکن نہیں ہے
کہ دانہ دانہ کی خاطر ہو سر خم

قفس میں چھپے بلبل کے کیا ہیں
امینؔ خوشنودیٔ صیّاد کا غم

گرداب

اختر الایمان کی نظموں کا مجموعہ۔ اختر الایمان جدید شعراء میں ایک ممتاز درجہ رکھتا ہے اُردو کے مشہور نقادانِ فن نے اختر کی نظموں کو دورِ حاضر کا بہترین کلام قرار دیا ہے۔ قیمت عہ

مینیجر ساقی بک ڈپو دہلی سے طلب فرمائیے

اُفق

احمد ندیم قاسمی

چلتے رہو، میرے تھکے ماندے ساتھیو! تمہیں ستاروں کا ساتھ دینا ہے، اندھیرے کی شکایت نہ کرو، راتیں اکثر اندھیری ہی ہوتی ہیں، مگر اگر تم اُبھرے ہوئے پتھروں سے ٹھوکریں کھاتے ہو، تو اپنی بدبختیوں کی داستانیں نہ بیٹھتے ہو، میرے مضمحل رفیقو، ٹھوکر ہی مدارِ حیات ہے، میں نے کتابوں میں یہی پڑھا ہے، بڑے بوڑھوں سے یہی سنا ہے، کہ ؎

اگر خواہی حیات اندر خطر زی

آس پاس پھیلے ہوئے کھیتوں پر بنسار وں کا ہجوم سہی، درختوں کی جھکی ہوئی شاخوں کے پتے تک چُپ چاپ سہی، لیکن میرے عاقبت نااندیش ہم نصیبو، ہوا چلتی ہے تو کھیت سرسراتے ہیں اور پتے بجتے ہیں، چاند نکلتا ہے تو اندھیرے کو غاروں اور گپھاؤں کے سوا اور کہیں جائے پناہ نہیں ملتی، سو چلتے رہو میرے تھکے ماندے مسافرو، اور سفر کی درازی کی باتیں نہ کرو، چیت اور بیساکھ کی ان چاندنی راتوں کی کہانیاں سناؤ، جب تمہاری جوانیوں نے بساطِ حیات پر حیات ہی کی بازی لگا دی تھی، اور نارنجی ہونٹوں کے لمس اور کالی بھونرا آنکھوں کی جھپک میں تم نے کائنات اور غلامی کی ذہنی بھول بھلیاں کا مداوا ڈھونڈ نکالا تھا!

بھئی خالد، تم نے اپنی بانسری کہاں چھپالی؟ اوور کوٹ کے کالر اٹھاؤ، ٹوپی کو ماتھے پر سرکاؤ، اور آنکھوں کو نیم وا کر کے لکڑی کے اس موسیقی زار کو دھنوں سے سیراب کرو، تم موڈ میں نہیں ہو؟ ارے بھئی ہم مسافروں کے لئے موڈ کی مجبوریاں بے معنی ہیں، موڈ بنانے کے لئے فرصت چاہئے اور مسافر سے زیادہ کوئی انسان عدیم الفرصت نہیں ہو سکتا، خلاؤں کی سرمئی بیکرانیاں بانسری کی نقرئی لہروں کے انتظار میں ہیں، ہاں، مجھے تمہاری یہی ایک عادت پسند ہے کہ تم ضدی نہیں ہو، تم اپنے احساس کو ایمان کا درجہ نہیں دیتے، احساس میں انقلاب کی گنجائش رکھنا ضروری ہے، اور ایمان ـــ سنا ہے ـــ کسی غیر منقلب جذبے کا نام ہے!

سنو سنو، بانسری کیا کہہ رہی ہے مسعود کھانسو نہیں، تم میرے بہت بیہودہ دوست ہو، تمہاری زندگی مجسم کھانسی ہے جھٹکے اور دھماکے اور متعفن مواد کے دھبے، تمہارے پھیپھڑے خراب تھے تو تم نے اس طویل سفر پر آمادگی کیوں ظاہر کی؟ اور اب کہ تم ہمارے ہمراہ اتنی دور دراز بستیوں تک آ چکے ہو پھیپھڑوں کی خرابی کا گلہ بے معنی ہے خالد ـــ خالد، تمہاری بانسری کے سُر خوابوں سے مملو ہیں، اور ہم مسافر خوابوں کے دشمن ہیں، ان سُروں کو بلند کرو، تاکہ فضا گونج اٹھے، اور مسعود کی کھانسی ان سُروں کی لہروں تلے دب کر رہ جائے ـــ سنو مسعود بانسری کیا کہہ رہی ہے، کیا! بانسری نے کہا ہے کہ اگر کائنات کی تخلیق کا کوئی مقصد ہے تو اس مقصد کی تخلیق کا کوئی مقصد ہے، میں نے پہلے بھی تم سے یہی کہا تھا، کہ تمہاری زندگی مجسم کھانسی ہے، بانسری نے مُردوں پر مقاصدِ تخلیق کا پتھر پھینکا ہے، میرے منطقی دوست، مجھے مقصد سے کوئی دلچسپی نہیں، میں وجدان کا قائل ہوں، اور وجدان مقصد کی غلاظت سے منزہ ہے۔

خالد، تم نے بانسری کیوں بند کر دی؟ تم چٹیلے موضوعات پر اتر آتے ہیں اس لئے! ـ تم بہت حساس ہو میرے بھائی، آبگینے کب تک ٹھاٹے پھرو گے، آبگینے ہمیشہ ٹوٹنے کے لئے بنتے ہیں، اس لئے انحصار کٹا ہونا چاہئے۔

اوہ، اندھیرے میں کھنکی ہوئی سنہری بالی بالی کی رٹ لگاتی گھوم رہی ہو، پر جوڑ کر نیچے اُترا محترمہ، اور اختر کی پلکوں کی جڑوں میں اٹکی ہوئی تبسم سے پیاس بجھانے، اختر، آخر یہ کیا بات ہے کہ تمہاری ہنسی میں بھی آنسوؤں کی سیلن ہوتی ہے، تم اس وقت وجدان کے جس تقاضے کے لئے اندھیروں کو چیرتے چلے جا رہے ہو، وہ کتنا مبارک، اور مقدس ہے۔ مگر اس وقت بھی میں تمہاری پلکوں کی جڑوں میں ستاروں کی لَو سے ایک عجیب مبہم سی چمکیلی دھاری دیکھ رہا ہوں، کیا تم نے اب تک اقبال کا مطالعہ نہیں کیا؟ ـــ یہ تو میں جانتا ہوں کہ تم ٹیگور پر شیدا ہو، میں خود بھی ٹیگور کو انسانی فطرت کے نباضوں میں شمار کرتا ہوں ـ مجھے بھی اُس کی خوشبودار نظموں اور منوّر کہانیوں سے محبت ہے، میں بھی جانتا ہوں کہ اُس نے قدیم ہندوستانیت کو جدید رنگوں میں نہایت فنکارانہ انداز سے سمو کر بنگالی اور پھر ہندوستانی ادب پر احسان کیا ہے، مگر میرے بھائی، زندگی صرف خوشبو یا صرف آنسو بھی تو نہیں، تم زندگی کی جھپٹ اور کڑک اور لپک کو کیوں محسوس نہیں کرتے؟ تم یہ کیوں نہیں دیکھتے، کہ جب جنگ میں ایک سپاہی مرتا ہے، تو ساری قوم مر جاتی ہے، جب بنگال میں ایک بھوکا دم توڑتا ہے تو ہمارے کائنات انسانیت دم توڑ دیتی ہے، جب ایک زمیندار اپنے مزارعہ کی کنواری بیٹی کی عصمت دری کرتا ہے، تو ساری کائنات کے چہرے پر سے نیکیوں کا نور نچڑ جاتا ہے، اور پھر یہ سپاہی کیوں مرے؟ یہ بنگالی کیوں دم توڑے؟ یہ کنواری کیوں لٹ جائے؟ کیا سپاہی کو جنگ سے، بنگالی کو موت سے اور کنواری کو لٹ جانے سے روکا نہیں جا سکتا؟ تمہاری خاموشی سے یہی معلوم ہو رہا ہے کہ تم پر ... رہے ہو،

تم مایوس ہو، تم جھینگروں، مینڈکوں اور بداصل الوقیوں کو نہیں روک سکتے۔ میں رونے سے نفرت نہیں کرتا، رونا آنکھوں کی عبادت ہے، مگر [illegible] ہر وقت رونا، ہر بات پر رونا ــــ مسعود کیا تمہارا فلسفہ بھی [illegible] آنسوؤں کو خشک نہیں کر سکتا؟ خیالہ کیا تمہاری بانسری بھی اس زہر کا تریاق نہیں بن سکتی؟ ــــ نہیں؟ ــــ تو پھر یہ سفر کیسے کٹے گا؟

[illegible] دیکھو آسمان پر ایک [illegible] ٹوٹا [illegible] اور اب اس کی روشن لکیر [illegible] مگر دوست ستاروں کو تو دیکھو، کیا ان کے [illegible] میں کوئی الجھاؤ پیدا ہوا؟ [illegible] پتہ [illegible] کی جنبش [illegible] بہرکیف تم رہتی [illegible] اختر نے جو کچھ [illegible] میں جانتا ہوں مسعود [illegible] جو چپ [illegible] مجھے علم ہے [illegible] رفتگی [illegible] سے [illegible] مانند نہ تھو تمہاری [illegible] ستاروں کو [illegible] دوست [illegible] کو کیا پڑی ہے کہ [illegible] ہوئے ساقی کا [illegible] [illegible] ایسا ہوں [illegible] سائے [illegible] ایک ساتھ زمین اور آسمان کے [illegible] معلوم ہو کہ [illegible] اس کی [illegible] ایسا [illegible] درخت کے [illegible] پتے [illegible] اور درخت کو معلوم ہو کہ پتوں کے [illegible] میں ایک [illegible]

[illegible] ہو [illegible] آہوں کی [illegible] میں [illegible] اندھیری راتوں کی وسعتوں [illegible] کی ایک گرم سانس [illegible] کیا تھا ــــ ــــــــــــــــــ اُس [illegible] کا رس [illegible] حد نہایت لطیف ہے، لیکن کیا تم اب ایک سے مَس سے دوچار نہیں ہو رہے ہو؟ یہ وسیع اندھیرا! یہ اَن جانی راہیں! یہ سرگوشیاں کرتے ہوئے کھیت! یہ بڑبڑاتے ہوئے کنگر! یہ ہوا کی مشتبہ انگڑائیاں! دور اندھیرے کی ایک گہری توس کا غماز پھیلاؤ! اور اس پھیلاؤ کے اوپر ایک الاؤ کی چمک کا نیم دائرہ، جو بڑھ رہا ہے، پھیل رہا ہے اور ہمارے لئے اپنا آغوش [illegible] کئے جا رہا ہے، اس مَس کا رس مجھ ایسا غبی بھی محسوس کر رہا ہے، اور مسعود، تم خاموش ہو ــــ؟

تم کہتے ہو مسعود کہ محبت کی ناکامی نے تمہیں فلسفہ کی تعلیم دی، میں نہیں کہہ سکتا کہ تمہارا یہ مفروضہ کہاں تک درست ہے، لیکن اتنا تو میں بھی جانتا ہوں کہ دل و دماغ کی خلا کو پُر کرنے کے لئے اگر تم فلسفہ کی تعلیم حاصل کرنے کے بجائے لکڑیوں کا ٹال کھول لیتے، تو بھی تمہاری گذر ہو جاتی، محبت بھی عجیب جذبہ ہے، یعنی اگر تم کو محبت کرنی ہے، تو دُنیا کے دوسرے تمام کام چھوڑ کر صرف محبت کرو، اور محبت ہے کیا؟ یہی آنسو اور آہیں اور آوارگی اور مردنی اور وہ خاص اخلاقی صفت فروتنی ــــ پھبتیاں سہو، مذاق برداشت کرو، بے مقصد مُنہ اُٹھائے پھرو، مشیت کے، وقت کے اور مواقع کے محتاج رہو، اور جب بُری طرح تھک جاؤ، تو فلسفہ پڑھنے لگو، یا بیمہ کمپنی میں نوکری

کرو ــــ

مسعود، شاید تم وہ رات نہیں بھولے ہو گے جب ستلج کا رتیلا کنارا چاندنی میں چمک رہا تھا، میں نے تمہیں مشورہ دیا تھا کہ مسعود، وہ نہیں آئے گی، شہر سے تین میل دُور، کچی سڑک، ہولناک ویرانہ، اور پھر رات کو ــــ دیکھو، ڈھیلی ڈھالی لہروں پر ستاروں کے عکس کچھ کہہ رہے ہیں، پڑھو، پڑھو، اس آسمانی تحریر کو پڑھنے کے لئے صرف بصیرت کی ضرورت ہے ــــ اور تم نے، میرے فلسفی دوست، بصیرت کا مذاق اُڑایا تو! کچی سڑک کے بعید ترین نقطے کے قریب اُگی ہوئی ایک ببول کو تم دیر تک [illegible] ہم بیٹھے رہے، تم نے کشتی میں ایک ننھا سا خوبصورت غالیچہ بچھا رکھا تھا، اس پر تمہارے ابا نماز پڑھا کرتے تھے، اور پھر جب ببول نے اپنی جگہ سے حرکت نہ کی، کیونکہ ببولیں بالکل ہوتی ہیں، تو تم نے غالیچہ اُٹھا کر ریت پر دے مارا، کشتی کو کنارے سے باندھے بغیر پانی کے حوالے کر گئے، اور میرے تعاقب کرنے پر تم نے پکار پکار کر کہا، چلے جاؤ، خدا کے لئے میرا پیچھا نہ کرو، میں اس بیابان میں بھٹک جانا چاہتا ہوں۔

میرے خیال میں تمہاری تمنا پوری ہوئی، اور تم زندگی کے میدان میں سچ مچ بھٹک گئے، اور محبت چھوڑ کر فلسفہ پڑھنے لگے، مگر کیا تمہیں سکونِ قلب میسر آیا؟ ذرہ میں جہاں دیکھنے والے دوست، تم نے اپنے فہم و ادراک کے لئے کتنے خیالی [illegible] تم پیدا کر لئے ہیں، کیا ہمارے لئے صرف اسی حقیقت کا احساس کافی نہیں، کہ سورج نکلتا ہے تو دن شروع ہوتا ہے، اور غروب ہوتا ہے تو رات کی ابتدا ہوتی ہے، مگر تم نے دن کیوں اور رات کیسے اور یہ سب کچھ کیونکر کی رٹ لگا رکھی ہے، حالانکہ سورج کو تمہاری اس رٹ کی کوئی پروا نہیں، وہ قیامت تک اسی طرح اُبھرتا اور ڈوبتا رہیگا، اور تمہاری کیوں اور کیسے اور کیونکر ہزاروں نسلیں گذر جانے کے بعد بھی [illegible] کے گھٹُپ اندھیرے میں پھڑپھڑاتی رہیگی۔

کوئی گیت سناؤ خالد، دیکھو تو الاؤ کی توس پھیل رہی ہے، اور ستاروں کے چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی ہیں، ہوا کروٹیں بدل رہی ہے اور فضا چونک اُٹھی ہے، کوئی ایسا گیت سُناؤ کہ اختر کی آنکھیں ہنسنے لگیں اور مسعود کا جمود چیخ جائے۔

تم نہیں گاؤ گے؟ تم اختر کو نہیں بہلاؤ گے؟ ہمارے اس نڈھال اور مضمحل دوست کو، جس نے ابھی چند روز ہوئے اپنی جیتی جاگتی آرزو کو پتھروں میں چُن دیا، اور اس دردناک تعمیر میں ایسا مصالح استعمال کیا کہ اب اُس کے تیزابی آنسوؤں کی سیلن بھی پتھروں کے جُڑے ہوئے رشتوں کو ڈھیلا نہیں کر سکتی، اختر، آخر تمہیں کس نے مشورہ دیا تھا کہ اپنے کسی رشتہ کی لڑکی سے محبت کرو۔ کہتے ہیں، مشرق کا معیارِ اخلاق مغرب سے بہت بلند اور پاکیزہ ہے، اس لئے اے نوجوان شاعر، بھول جاؤ کہ عورت کے گالوں میں گلاب ہیں، اس کے ہونٹوں میں شفق ہے، اس کی ہنسی میں چاندنی ہے ــــ لیکن یہ پُرانے زمانہ کے عرب شعرا جنہوں نے "بنتِ عم" کی ایسی

گردان چھیڑی کہ اب تک مشرقی شاعری سینکڑوں "بنات نعش" کے ناموں کے علاوہ اُن کے گالوں، ہونٹوں، آنکھوں اور سینوں کے مرمر اور جسموں کی گدراہٹ سے لبریز ہے۔ ــــ تم نے اختر بنت عم سے محبت کر کے کوئی اخلاقی جرم نہیں کیا تھا، مگر میرے بھولے رفیق ــــ یہ تو سوچا ہوتا کہ تم مفلس ہو، اور تمہارا باپ مر چکا ہے، اور تمہاری ماں اُبلوں کا دھواں پیتے پیتے دمے کی شکار ہونے والی ہے، تم ڈسٹرکٹ بورڈ کے دفتر میں کلرک ہو، اور تمہیں دفتر کا سکریٹری اکثر گدھا کہا کرتا ہے، طرفین کی رضامندی مشرق کے علم الاخلاق میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی، یہاں صرف دو جہتیں نہیں ہیں یہاں شاعر سے لیکر پٹواری تک سب شش جہات کے قائل ہیں، تمہارے علاوہ تمہارے والدین ہیں، تمہارا ماحول ہے، تمہاری سماج ہے، تمہارا مذہب ہے، اُنکی رضامندی بھی تو ضروری تھی، ورانکی رضامندی ضروری نہ ہوتی تو آج مشرق کی نئی نسلیں بھی جو شیریں فرہاد اور ہیر رانجھے کی داستانوں سے محروم رہتی، ارے بھائی ہمارے مشرق میں تو محبت ریاضی کا ایک سوال ہے، مجھے یقین ہے کہ یہاں کا کیوپڈ بجز اسکے عاطفہ کیونکا کوئی آزاد کردہ غلام ہے جس کے پاس صرف ایک تیر ہے، اور وہ اپنے آقا کی سنت پوری کرنے کے لئے تیر چلاتا ہے، تو ساتھ ہی تیر کا تعاقب بھی کرتا ہے۔ اور اس تیر کو ہدف کے کلیجے میں سے نہایت بے رحمی سے کھینچ کر دوسرے ہدف کی تلاش میں نکل جاتا ہے، یہ کسک جو تم اپنے دل میں محسوس کر رہے ہو در اصل محبت کی کسک نہیں، یہ کلیجے میں سے تازہ تازہ کھینچے ہوئے تیر کی سوزش ہے جو جلد مٹ جائے گی اور تم ڈسٹرکٹ بورڈ کے محکمہ میں ترقی کرنے لگوگے۔

مجھ سے کوئی بات کرو ہمدمو، دیکھو، الاؤ کا دائرہ لرز رہا ہے، اور ستارے ڈوب رہے ہیں، رات کا نظام زوال پذیر ہے، اب اس تخریب سے ایک نئے اور روشن نظام کی تعمیر ہوگی، اسی تعمیر میں ہم اپنا خون کھپانے جا رہے ہیں، ہم ایسے دنوں سے تھک چکے ہیں جو صرف بلندیوں کی مستعار شعاعوں سے روشن رہ سکتے ہیں، ہمیں ایک ابدی دن چاہیئے، جس کی روشنی ہمہ گیر اور جس کی وسعت کائنات پیما ہو!۔

کون جانے منزل کتنی دور ہے یا کتنی قریب ہے، تم بھی نہیں جانتے، میں بھی نہیں جانتا، کوئی بھی نہیں جانتا، لیکن اس حقیقت سے تمہیں بھی انکار نہیں مجھے بھی انکار نہیں، کسی کو بھی انکار نہیں کہ منزل ہے ضرور، اور یہ اُسی منزل کی قوس ہے جو آسمان کو نگلے جا رہی ہے، مسعود، تم کراہ رہے ہو، تم بار بار رک کر ایڑیوں کو دباتے ہو، اور پنڈلیوں کو سہلاتے ہو، تمہارا رنگ زرد ہو رہا ہے، تمہارے لبوں کی پپڑیاں اُچٹ کر آپس میں پھسل رہی ہیں، تمہاری آنکھوں میں مایوسی کی خلا ہے، اور اب تم بیٹھ گئے ــــ ہمت نہ ہارو مسعود، اُٹھو، ارے اُٹھو بھی، دیکھو تو ہم سب کے رک جانے سے الاؤ کی اُبھرتی ہوئی قوس ابھی دبکتی نظر آتی ہے، اور پھر ہم سب نے اکٹھے سفر کرنے کا تہیہ کیا تھا، تم نے نبٹنے کی قسم کھائی تھی ــــ تم بے بس ہو؟ تو آؤ خالد اور اختر، ہم اپنے دوست کو اس اندھیرے کے حوالے کر کے آگے بڑھیں، مسعود، یہ اندھیرا تمہارا نگہبان رہیگا۔ اور جب تمہیں الاؤ کا پہلا شعلہ نظر آئے گا، اور تمہاری اندھیرے کی پناہ گاہ لُٹ جائے گی، تو اس وقت ہمارے لئے دعا کرنا، اور اعتراف کرنا کہ الاؤ کی اس چکاچوند میں تمہارے تین دوستوں کی آنکھوں کی روشنی اور چہرے کی گلابیاں بھی گھل ہوئی تھیں۔

اختر تم بار بار مڑ کر پیچھے کیوں دیکھتے ہو؟ مسعود کو تو اندھیرے نے نگل لیا اور اب اگر تم اُس کی تلاش میں پلٹو گے تو خود بھی بھٹک جاؤگے، خالد سے بانسری سنو، یا کوئی گیت یا کوئی دوہن۔ خالد ہنستے ہو؟ اس وقت ہمارے دوست کو روحانی تھپکیوں کی ضرورت ہے، اور تم خاموش ہو، بجاؤ یا گاؤ، آخر کچھ تو کرو کہ تمہارے ساتھیوں کا بوجھ اتر جائے، کیا اب تم اپنی محبوبہ کو کالج میں چھوڑ کر آ رہے ہو، اس وعدے پر کہ تم بہت بلند پنہوگے، وہ تیسرے ماہیر بزرگ ایک نیم روشن گوشے میں جا کر بتاؤ کہ الف لیلیٰ کے اُن شہزادوں کی کہانیاں بالکل سچی ہیں، جنہوں نے بڑے بڑے جنوں کا مقابلہ کر کے سانپوں کے منہ سے لعل اگلوائے، اور شہزادیوں کی شرطیں پوری کر کے اُن سے شادیاں رچائیں۔

خالد تمہاری محبوبہ کتنی ستم گر اور پھر کتنی پیکار ہے، کئی بار اسے یہ بھی علم نہیں ہوتا کہ ماہِ رواں جنوری ہے یا فروری، اور کئی مرتبہ وہ تمہارے کوٹ کی اندرونی جیب میں ایک چھوٹی سی ڈبیا میں پڑی ہوئی انگشتری کا حلیہ تک بیان کر دیتی ہے، وہ مغربی موسیقی کی دلدادہ ہے، اور تم بنگالی سنگیت کو اصلی سمجھتے ہو، اس لئے وہ تمہیں بنگالی طرز کے گیت سناتی ہے، اور میں نے تمہیں کبھی انگریزی موسیقی کے بعید ترین سروں کی مشق کرتے سنا ہے، تم نیلے سوٹ کے ساتھ سفید براؤن ٹائی لگاتے ہو، صرف اس لئے کہ اُس کی نیلی ساڑی میں سفید پھول ہیں، اور پھر ایک روز وہ اپنی محبوب ساڑی کے تمام سفید پھولوں پر صرف اس لئے نیلے نیلے گول نشان لگا لائی کہ تمہارے رومال کے کونے پر سیاہی کا ایک دھبہ گر پڑا تھا۔

اختر، تمہارے قدم بے ترتیبی سے کیوں اُٹھ رہے ہیں؟ تیری تم سے پھر آنسوؤں کی بھیک مانگنے آئی ہے؟ الاؤ کا گھیرا تیزی سے اُبھر رہا ہے، بساطِ چرخ پر بے شمار ستارے مٹ چکے ہیں اور جو باقی ہیں وہ بھی تھوڑی دیر میں روشنی کے محیطِ بے کنار میں ڈبکیاں لے کر غرق ہو جائیں گے، اور پھر ہماری منزل اپنے خطوط کی پوری وضاحت سے اُفق کے نیلے پس منظر پر اُبھرے گی، اور تمہارے قدم خود بخود ایک ہی ترتیب سے اُٹھنے لگیں گے۔

تم کہتے ہو، اب تم میں ایک بھی قدم اُٹھانے کی سکت نہیں، تو کیا مسعود کی طرح تم بھی ہم سے کٹ جاؤگے؟ نہیں، تم ایسا نہیں کروگے، اگرچہ تم اداس ہو، اور تمہارے دُکھ اَن گنت اور تازہ ہیں، مگر اختر، تم نے مسعود کی طرح فلسفہ نہیں پڑھا، تم وجدان سے دست کش نہیں ہوئے، ابھی تم اُس نامعلوم قوت کے قائل ہو جو ستارے کی چمک اور کلی کی چٹک میں آہنگ پیدا کرتی ہے،

تمہاری روحانی ماندگی یکسر خیالی ہے، ہمت کرو میرا دوست خالد کا ساتھ دو، وہ نقرئی قوس ہماری منتظر ہے۔ وہ بدکا کا اور بھی دھندلکا ہمارا منتظر ہے، سرمئی دھند لکے کے پیچھے اُفق ہمارا منتظر ہے!

تم تو تھک کر بیٹھ گئے، تمہاری ٹھوڑی تمہارے سینے کو اور کندھے کانوں کو چھو رہے ہیں۔ جتنا اچھا تم نے رہو ہم۔۔۔ ور تلف کرو اس لمحے کا جب تمہاری ماندگی ایک نئے عزم کی صورت اختیار کرے گی، ہمیں اور مسعود کو ہمارے پاس سے آئے گی، چلو خالد، ان بکھرے ہوئے قہقہوں کے خیال سے ذہن کو خالی کر دو۔

یہ روشنی کی لکیر کہاں سے پھوٹ نکلی، اس منارے کی جگہ کہاں گئے، اندھیرے سے کہاں، شاہ ڈھونڈی! اب پگڈنڈی کھلے بالوں کی مانگ کی طرح صاف اور چمکیلی ہے، اور پیڑوں کی کونپلوں سے چمٹے ہوئے پھولوں پر مسکراہٹیں برس رہی ہیں، پگڈنڈی کے آس پاس گھاس پر جگنوؤں کی سکھیاں اڑ رہی ہیں اور فضا میں ہر طرف ایک رواں بزم نغمہ رقصاں ہے، یہی وہ وقت ہے جب شاعر کو شعر، مصور کو نقش اور خالد کو بانسری کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے۔

مگر ٹھہرنا، یہ پگڈنڈی کے اس طرف کھیت کے کنارے کون کھڑا ہے! ہوائیں کیوں رک گئی ہیں! فضا کیوں دم بخود ہے! اور مشرق کی طرف سے پھوٹتی ہوئی روشنی کی ہر لہر ایک ہی نقطے پر کیوں مرکوز ہوتی جا رہی ہے!

تو ہم کو حیرت سے تک رہی ہے دہقانی لڑکی اور ہم تجھے حیرت سے دیکھ رہے ہیں، تو ہمارے گرد سے اٹے ہوئے پاؤں اور بے خوابی سے سوجی ہوئی آنکھوں کو تک رہی ہے، اور ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ تیرے ہاتھ میں اگر درانتی کے بجائے پارکر پنسلم ہوتا تو کیسا اچھا رہتا، خالد، میں تمہاری بات نہیں کر رہا، میں جانتا ہوں کہ ان دنوں تمہارے جذبہ و احساس کا کوئی دوسرا وجود حصہ دار نہیں بن سکتا۔ یہ میری ذاتی رائے ہے کہ اگر اس دھجیاں لگی اوڑھنی اور سیاہ کھدر کے ڈھیلے ڈھالے چولے اور پنڈلیوں کے نصف تک اٹھے ہوئے تہمد کی بجائے یہ لڑکی ساڑی اور بلاؤز پہنتی، اور آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگاتی، اور بالوں کو شانوں پر کھلا چھوڑ دیتی تو اس کا حسن دوبالا ہو جاتا، اب یہ کھیت کی مینڈ پر اس لباس میں کھڑی کیسی اکیلی اکیلی لگتی ہے بیچاری! خالد، ویسے تمہارا کیا خیال ہے؟

مجھے تمہاری یہ عادت تو قطعی پسند نہیں کہ تم نے جہاں کہیں کوئی اجنبی لڑکی دیکھی، جھٹ ٹھوڑی پر انگلی رکھ کر "اللہ جمیلٌ و یحب الجمال" کا ورد کرنے لگے، خدا کے لئے حسن کا کوئی معیار مقرر کرو، یہ بھی آخر کیا انداز نظر ہے کہ تمہارے نزدیک پتلے ہونٹوں میں نزاکت ہے اور موٹے ہونٹوں میں دعوت، سفید رنگت میں مرمر ہے اور سانولی میں سلونا پن، گول چہرے میں "مہتابیت" ہے اور بیضوی میں نسوانیت، اور اب یہ لڑکی جس کے ایک ہاتھ میں درانتی ہے اور دوسرے میں کسی نامعلوم بوٹی کے ننھے ننھے بے ترتیب پھول، بستر سے اٹھ کر شاید اس نے منہ ہاتھ بھی نہیں دھوئے، ابھی اس کی آنکھوں میں نیند اور بیداری کی جنگ جاری ہے، اسکے گالوں پر جوانی کا گلاب بجائے چٹکنے کے چپک کر رہ گیا ہے، اور پھر اسکی باہوں اور ٹانگوں میں تم پالی وڈ کا تناسب کہاں سے لاؤ گے؟

خالد، خالد، پگڈنڈی سیدھی ادھر جا رہی ہے، اور تمہارے قدم غلط سمت کو اٹھ رہے ہیں، سنبھلو، سنبھلو میرے دوست، کہ منزل قریب ہے اور پگڈنڈی سامنے ہے، پلٹ کر دیکھو کہ وہاں کالج کی ہمہ زاد ستوں میں تمہاری محبت کے مندر کا کلس چراغ کی زبان بن کر چمک رہا ہے۔ شاعروں کا یہ مقولہ بھول جاؤ کہ حسن کہیں بھی ہو قابل پرستش ہے اور عشق زمان و مکان کا پابند نہیں، تم اپنی محبوبہ سے بھی وعدہ خلافی کر رہے ہو، اور مجھ سے بھی، اور اپنے شباب سے بھی، اور ماحول کے ان تقاضوں سے بھی جو تمہیں کالے کوسوں دور میرے ہمراہ لے آئے۔

اب میں اکیلا ہوں، اور فضا لامحدود ہے، اور پگڈنڈی سانپ کے سے بل کھانے لگی ہے، اور الاؤ بھڑک اٹھا ہے، آسمان بھڑک اٹھا ہے، سارا اُفق بھڑک اٹھا ہے، کہاں ہیں میرے رفیق، کہ اکیلا شخص روتے بھی بھدا لگتا ہے، پگڈنڈی الاؤ کے سینے میں گھستی نظر آتی ہے، اس الاؤ کو عبور کر کے مجھے اپنے ذہنی تقاضوں کا اُفق ملیگا، اور اسی اُفق کی دھار پر میری صدیوں کی پرانی منزل اپنے ننھے ننھے کنگوروں اور گول مول برجیوں سمیت اپنے محرابی دروازے وا کئے میرے انتظار میں ہو گی!

میری تھکن بے معنی ہے، اور میری ماندگی قطعی بے بنیاد، گلے کی رگوں کا تناؤ اور آنکھوں کے سامنے تیرتے ہوئے بادلوں کے سائے، اور پگڈنڈی کی کروٹوں پر کروٹیں۔ کیا یہ راستہ ہمیشہ ایک ننھی سی دھاری ہی رہے گا، کیا یہ پگڈنڈی ایک کھلی اور سیدھی سڑک میں کہیں نہیں بدلے گی، جس پر مجھے کوئی نیا ہمسفر مل جائے، یا جہاں سے کوئی کار گذرے اور میں اپنی منزل کو توقع سے پہلے پا لوں!

نیڑی پھر اپنی پیاس بجھانے آئی ہے، اختر پیچھے رہ گیا ہے محترمہ، اور میرے پاس آنسو نہیں، میری آنکھوں میں الاؤ کے شعلے ہیں، اب الاؤ ابھر کر فضا میں معلق ہو گیا ہے، کھیت لہلہا رہے ہیں، درختوں کی شاخیں رقصاں ہیں جھاڑیوں پر چڑیاں اور ممولے پھدک رہے ہیں، پگڈنڈی کے ساتھ ساتھ ایک ننھی سی ندی بہہ رہی ہے، اور پگڈنڈی پھیل رہی ہے، اس پر ان گنت قدموں کے نشان ہیں، یہ کون تھے جو مجھ سے پہلے منزل پر پہونچے، آواز دو مجھے، میرے اجنبی دوستو، مجھے پکارو، کہ اگرچہ پگڈنڈی ایک صاف اور سیدھی سڑک میں بدل چکی ہے مگر میری پنڈلیوں کے پٹھے کٹ رہے ہیں۔

تم بھول جاؤ کہ ایک شب تمہارے ذہن میں ایک نئی زندگی کا الاؤ بھڑکا تھا اب تمہارا گھٹ گھٹ کر رینگنا بے معنی ہے، پڑے رہو یہیں جہاں لاکھوں انسانی ڈھانچے بکھرے پڑے ہیں، مکڑیوں نے انکی پسلیوں میں جالے بن لئے ہیں، اور کھوپڑیوں میں گھاس اُگ رہی ہے، اس سڑک پر کوئی کار نہیں آسکتی، کاریں صرف پکی سڑکوں پر چلتی ہیں اور یہاں گرد و غبار ہے، دلدلیں ہیں، کھڈ ہیں اور الاؤ کے بہت اوپر اٹھ جانے کے باوجود منزل لاپتہ ہے، بصارت اور بصیرت دونوں کی کوتاہ تنگی

طاہرہ دیوی شیرازی

تارے کے کھمبے

ریاست خیر البشر کی نواب زادی سلیمہ زمانی صاحبہ کے متعلق عام طور پر مشہور تھا کہ وہ نہایت ہمدرد اور وسیع القلب ہیں اور ساتھ ہی ساتھ حد درجہ مخیر بھی ہیں کبھی کوئی حاجت مند اپنی مراد پوری کئے بغیر ان کے دروازے سے نہیں لوٹتا۔ وہ غریبوں اور محتاجوں کی مالی مدد کے لئے ہر وقت تیار رہتی ہیں۔ بیسیوں بیواؤں کے وظیفے اُن کی جیب خاص سے مقرر ہیں۔ سینکڑوں یتیم ان کے ٹکڑوں پر پلتے ہیں۔ ہر قومی کام کا سوال اُٹھتے ہی چندے کی رقم ان کی طرف سے پہنچ جاتی ہے مگر کبھی کسی پر اپنا نام ظاہر ہونے نہیں دیتیں۔ وہ ہمیشہ اس اصول پر کاربند رہتی ہیں کہ تم اللہ کی راہ میں ہر چیز اس طرح پوشیدہ طور پر دو کہ دیتے وقت دائیں ہاتھ کی خبر بائیں ہاتھ کو ہونے نہ پائے۔

کچھ انہی باتوں کا لحاظ رکھتے ہوئے "دار الفلاح" نامی یتیم خانہ کے مہتمم خاص نے انہیں دعوت دی کہ کسی روز ازراہِ کرم قدم رنجہ فرما کر یتیم خانے کا معائنہ کریں اور اپنے قیمتی مشورے سے ہمیں مستفید فرمائیں کہ قومی خدمات کے سلسلہ میں ہمارا طریقۂ کار کس حد تک درست ہے اور اگر کوئی خامی یا کمی باقی رہ گئی ہو تو اُسے کس طرح پورا کیا جائے۔

نواب زادی صاحبہ نے اپنی بڑھتی ہوئی مصروفیات کے باوجود اس دعوت کو منظور کر لیا اور معائنے کی تاریخ بھی مقرر کر دی تاکہ مناسب انتظامات پہلے سے عمل میں آجائیں۔

علامہ قادری صاحب کئی سال سے یتیم خانے کے مہتمم خاص تھے۔ اُنہوں نے کسی معاوضہ کے بغیر اپنی تمام زندگی قومی خدمات کے لئے وقف کر رکھی تھی۔ سب جانتے تھے کہ موروثی جائداد سے جو تھوڑی بہت آمدنی ہو جاتی تھی، بس اسی پر اکتفا کرتے تھے، اپنے ذاتی خرچ کے لئے نہ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلاتے اور نہ یتیموں کے نام پر جمع کی ہوئی امدادی رقم پر لالچ کی نظر ڈالتے۔ وہ اپنے آپ کو ان سفلی چیزوں سے بلند رکھتے ہوئے لاوارث بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے اس درجہ مصروف رہتے کہ کبھی کبھی شریکِ حیات سے بدمزگی بھی ہو جاتی۔ اس نیک بخت کو شکایت تھی کہ مولانا یتیم خانے کے ایسے گرویدہ ہوئے ہیں کہ گھر بار کی مطلق فکر نہیں رہی ہے۔ دن تو دن اکثر راتوں کو بھی اپنے مکان پر آنے کی پروا نہیں کرتے۔ میں خواہ مخواہ انتظار ہی انتظار میں دہلیز پر ٹکٹکی لگائے جاگتی رہتی ہوں حالانکہ وہ رات کی تعلیم و تربیت ختم کر کے وہیں یتیم خانہ کی کسی کوٹھری میں پڑ رہتے ہیں۔

یہ غنیمت ہے کہ ان کے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی ورنہ ایسی صورت میں اپنے بچوں کی پرورش اور بھی دوبھر ہو جاتی۔

علامہ قادری صاحب نے جب سنا کہ نواب زادی صاحبہ تشریف لا رہی ہیں تو اُنہوں نے پہلے سے تمام انتظامات شروع کر دئے۔ یتیم بچوں کو حکم دیا کہ اپنی خاکی وردیاں جو محض سستی اور سب خورد ہونے کی وجہ سے سلوانی تھیں، ایک دن میں دھو کر سکھا لیں تاکہ اُن کے سامنے سب صاف ستھری حالت میں نظر آئیں۔ البتہ گھر پر موجود ہونے کے باوجود خود اُنہوں نے کوئی نئی پوشاک اس روز نہیں پہنی بلکہ دھوبی کے گھر کے دُھلے ہوئے معمولی کپڑے پہن لینے کافی سمجھے۔ رنگ برنگ کی کاغذی جھنڈیوں سے عمارت کے صحن کو سجا دیا گیا۔ پھولوں کے دس بارہ گملے ادھر اُدھر سے منگوا کر قرینے سے رکھ دئے تاکہ رونق بڑھ جائے۔ اور کونے کونے چپے چپے کی جھاڑ دے ڈالی جس سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ مکڑی کے جالے، مچھر اور پر لگے جھینگر کم ہو گئے۔

علامہ صاحب نے سب بچوں کو اجتماعی اور انفرادی حیثیت کے مناسب ہدایات دیں کہ نواب زادی صاحبہ کے آنے پر رسمِ خیر مقدم ادا کرنے کے علاوہ یہ کس طرح ظاہر کیا جائے کہ یتیم خانہ میں تعلیم و تربیت کا انتظام نہایت عمدہ اور معیاری ہے۔ اگر کوئی کمی ہے تو محض اس لئے کہ فنڈ میں روپیہ ناکافی ہونے کے باعث بہت سی ضرورتیں پوری نہیں کی جا سکتیں۔

ان یتیم بچوں نے حالی کی دو تین قومی نظموں اور اقبال کے ترانوں کے علاوہ ایک ایسا قصیدہ بھی زبانی یاد کر لیا جو نواب زادی صاحبہ کی شان میں تھا اور اسی محلے کے ایک شاعر نے علامہ صاحب کی پیش کی ہوئی چائے کی دعوت قبول کر کے اُن کی خاطر نظم کر دیا تھا۔ اس قصیدے کی ضرورت اس لئے محسوس کی گئی کہ نواب زادی صاحبہ پر خاطر خواہ اثر ہو اور رقم یتیم خانہ کے امدادی فنڈ میں کچھ رقم داخل کر جائیں۔

نواب زادی صاحبہ اپنی ایک سہیلی اور دو کنیزوں کے ہمراہ نقاب پوش حالت میں تشریف لائیں۔ سب انتظامات چونکہ مکمل ہو چکے تھے، اس لئے رسمی جلسہ کی کارروائی تلاوتِ قرآن مجید سے شروع ہوئی۔ نظمیں پڑھی گئیں، ترانے ایک سنگت میں گائے گئے اور جب ایک بڑی عمر کے لڑکے نے جو نسبتاً زیادہ سمجھدار تھا خاص خاص الفاظ پر زور دیتے ہوئے قصیدہ سنانا شروع کیا تو نواب زادی صاحبہ ضرورت سے زیادہ داد دینے لگیں اور جب مقطع سُن کر انہیں معلوم ہوا کہ یہ قصیدہ خود علامہ صاحب کی طبع رسا اور دماغی کاوش کا نتیجہ ہے تو اُنہوں نے تعریف کرنے کے

ساتھ ساتھ شکریہ بھی ادا کیا۔

اس مختصر سے جلسے کے بعد یتیم خانے کے مختلف حصوں کا معائنہ شروع ہوا اور نواب زادی صاحبہ نے جلد ہی تسلیم کر لیا کہ واقعی بہت سی ضروری چیزوں کی کمی ہے۔

سب کمروں اور کوٹھڑیوں کو دیکھتی بھالتی جب وہ کتب خانہ میں پہنچیں تو وہاں تین چار بچے آپس میں لڑ رہے تھے۔ یہ بات انہیں کسی قدر بری معلوم ہوئی۔ چنانچہ اصلیت معلوم کرنے کی غرض سے انہوں نے پوچھا،

"کیوں بچو! تم کیوں لڑ رہے ہو؟ یہ بات اچھی نہیں ہے"

ان میں سے ایک لڑکا بسور کر بولا،

"میں علی بابا کا قصہ پڑھ رہا تھا اس شمیم نے کتاب میرے ہاتھ سے چھین لی اور اب واپس نہیں دیتا"

اس پر شمیم جو بے خاموش سا رہ گیا وہ بھی بول پڑا،

"کل یہ قصہ میں نے شروع کیا تھا۔ میں نے کہا کہ پہلے میں ختم کر لوں۔ تم بعد میں پڑھ لینا"

اس پر نواب زادی صاحبہ نے پہلے لڑکے سے کہا،

"بیشک! یہ ٹھیک ہے تمہیں تو وہ قصہ پہلے ختم کر لینا چاہیئے جو شروع کیا جا چکا ہو۔ آج تم کوئی اور کتاب کیوں نہیں پڑھ لیتے"

پہلے لڑکے نے اسی انداز سے دوبارہ بسور کر کہا،

"اور کیا پڑھوں؟ کتب خانے میں صرف پانچ چھ کتابیں ہیں۔ وہ کئی کئی دفعہ پڑھ لیں۔ اب ان میں جی نہیں لگتا۔ علی بابا کا قصہ ایک دفعہ پڑھا تھا اس لئے دوبارہ پڑھنا چاہتا تھا"

علامہ صاحب نے نواب زادی صاحبہ کو بتایا کہ یہ بچے قصے کہانیاں بہت دلچسپی سے پڑھتے ہیں لیکن ان کا شوق پورا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ہمارے پاس کچھ زیادہ کتابیں نہیں ہیں۔ نہ فنڈ میں اتنی رقم ہے کہ ہر مہینے چند کتابیں نئی نہ سہی پرانی ہی، خرید لیا کریں۔

نواب زادی صاحبہ نے اظہار افسوس کرتے ہوئے یقین دلایا کہ مالی امداد کے سلسلہ میں ہر ممکن صورت پیدا کر دی جائے گی۔

اور پھر وہ علامہ صاحب کا شکریہ ادا کر کے تشریف لے گئیں۔

دس پندرہ دن کے بعد نواب زادی صاحبہ کو ایک زنانہ جلسہ کی صدارت اور کھیلوں کے انعامات تقسیم کرنے کا فخر حاصل ہوا۔ اپنی مختصر صدارتی تقریر میں انہوں نے اس امر پر زور دیا کہ "نوجوان لڑکیوں کے لئے کھیل کود بہت ضروری ہے۔ کیونکہ تفریح طبع حاصل ہونے کے علاوہ اس سے حسن و رعنائی اور صحت میں اضافہ بھی ہوتا ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ کھیل کود پر تعلیم کو قربان کر دیا جائے۔ مدرسے کی پڑھائی پہلی چیز ہے۔ البتہ فالتو وقت میں قصے کہانیوں کی دلچسپ کتابوں کا مطالعہ بھی ہونا چاہیئے"

اور عین اس موقع پر انہیں یتیم خانے کے بچے یاد آ گئے۔ چنانچہ ضمنی تذکرہ انہوں نے بتایا کہ ان یتیموں کو مالی امداد کی سخت ضرورت ہے۔ اس لئے جن بہنوں سے ممکن ہو حسب توفیق کچھ نہ کچھ بھیجیں۔ اگر نقد رقم ممکن نہ ہو سکے تو قصے کہانیوں کی وہ کتابیں ہی غنیمت ہیں جو کئی کئی بار پڑھنے کے بعد اب دل سے اتر گئی ہوں۔

ہر خاتون نے اپنی اپنی گردن کو اس طرح نرمی سے جنبش دی گویا وہ نواب زادی صاحبہ کی ہم خیال ہے اور بہت جلد ان کے مشورے کو عملی جامہ پہنائے گی۔

جلسے کے دوسرے دن سے لڑکیوں میں کھیل کود کا شوق بڑھنے لگا۔ قصے کہانیوں کی طرف بہت کم نے توجہ کی۔ اور ان میں سے صرف ایک کو یتیم خانے کے بچوں کی ضرورت یاد رہی۔

اس نے ایک روز موقع پا کر اپنے بھائی سے جو ایک قومی اخبار کے دفتر میں بطور مدیر معاون کام کرتا تھا کہا "بھیا! "دار الفلاح" نامی یتیم خانے کے بچوں کے لئے قصے کہانیوں کی کچھ کتابیں شوقیہ مطالعہ کے واسطے درکار ہیں۔ اگر ہو سکے تو اپنے اخبار میں ایک اعلان چھاپ دو کہ جن بھائیوں اور بہنوں کے پاس دلچسپ و مفید کتابیں فالتو ہوں وہ یتیم خانے کے مہتمم خاص کے پاس پہنچا دیں تاکہ بچے انہیں پڑھکر اپنا شوق پورا کر سکیں"

ان بھائی صاحب نے صاف لفظوں میں وعدہ تو نہیں کیا کیونکہ مدیر معاون ہونے کی وجہ سے خود انہیں کوئی اختیار حاصل نہیں تھا اور اخبار میں تمام اعلانات اجرت پر شائع ہوتے تھے، تاہم انہوں نے وعدہ کیا کہ میں مدیر اعلیٰ سے جو اخبار کے مالک بھی ہیں ذکر کر کے زور دونگا کہ ضرورت قومی کا لحاظ رکھتے ہوئے اس اعلان کو بلا معاوضہ شائع کر دیا جائے تو اچھا ہے۔

تین چار دن تک وہ بھائی صاحب اپنے کام کاج میں اس طرح پھنسے رہے کہ اس اعلان کے متعلق گفتگو کرنے کا خیال ہی نہیں آیا۔ تاہم ایک روز جب ان کے مدیر اعلیٰ مخمور حالت میں چند اصلاحی نظمیں اپنے اخبار کے واسطے لکھنے میں مشغول تھے اور قومی خدمت کا احساس ان کے دل و دماغ پر حاوی تھا، انہوں نے اس وقت کو غنیمت جان کر ذکر چھیڑ دیا۔

مدیر اعلیٰ نے پہلے تو اجرت نہ ملنے کے خیال سے ناک بھوں چڑھا کر انکار کر دینا چاہا مگر پھر راضی ہو گئے اور فوراً قلم اٹھا کر خود ہی اس اعلان کا مسودہ کیفیت سکر سے پیدا ہو جانے والی صلاحیت کے ماتحت مناسب الفاظ میں تیار کرنے لگے۔ انہوں

نے لکھنا شروع کیا۔

قوم کے چند یتیم ولاوارث بچے
جن کا آپ کے سوا کوئی نہیں
وہ اپنے ذوقِ مطالعہ کو تسکین دینے کے لئے آپ کی نظرِ عنایت
کے محتاج ہیں۔ آپ کی نگاہِ لطف وکرم ان کے مایوس دلوں کو
شادمانی بخش سکتی ہے۔ آپ کی دریادلی ان کی تشنہ کامی کا
واحد علاج ہے۔ ذرا وسیع القلبی سے کام لیجئے۔ چند دلچسپ
اور مفید کتابیں جو آپ کے لئے بیکار ہوں، ان کے واسطے
نعمتِ غیر مترقبہ ثابت ہو سکتی ہیں۔ یا اپنی آمدنی کا ایک مختصر
حصّہ ان کی فلاح وبہبود کے لئے وقف کر دیجئے تاکہ وہ خود
خرید لیں "دارالفلاح" نامی یتیم خانہ کے مہتمم خاص دستی یا
ڈاک کے ذریعے بھیجا ہوا آپ کا ہر تحفہ بصد شکریہ قبول کرنیکے
لئے ہر وقت تیار ہیں"۔

اس اعلان کی اجازت کے ساتھ ساتھ مسودہ مل جانے کے بعد نائب مدیر نے مناسب سمجھا کہ صفحہ اوّل پر مناسب جگہ اس کے اندراج کیلئے مخصوص کر دی جائے۔

کاتب صاحب نے اسے نسبتاً ذرا جلی حروف میں اس طرح لکھ کر کہ اخبار پڑھنے والوں کی توجہ فوراً جذب ہو جائے، اپنا فرض پورا کیا۔ اور اس طرح وہ بھی ثوابِ دارین حاصل کرنے میں برابر کے شریک ہو گئے۔

اخبار فروشوں نے، جو پہلے صفحے کی موٹی موٹی سرخیاں بآوازِ بلند بیان کرکرکے سڑکوں پر اخبارات بیچنے کے عادی ہوتے ہیں، چین کی خانہ جنگی اور جاوا کی لڑائی کا حال سنانے کے ساتھ یہ بھی کہا کہ قوم کے چند یتیم ولاوارث بچوں کا آپ کے سوا کوئی نہیں ہے۔ انکی ہر طرح مدد کیجئے۔

معلوم نہیں کس طرح شام کے وقت یہ خبر ریڈیو سے بھی نشر ہو گئی کہ دارالفلاح کے یتیم بچے قصے کہانیوں کے بہت شوقین ہیں۔ اپنی فالتو کتابیں انہیں بھیجکر ثواب حاصل کیجئے۔

چند دن کے بعد ایک مفلوک الحال بوڑھا ایک فاقہ زدہ لڑکے کو ساتھ لئے "دارالفلاح" نامی یتیم خانے کے دروازے تک پہونچا اور مہتمم خاص سے مل کر کہنے لگا:۔

"میرے اس بچے کو قصے کہانیوں کا بہت شوق ہے۔ اس کے لئے میں نے یہ کتابیں پچھلے سال خریدی تھیں۔ یہ کئی بار ان کا مطالعہ کر چکا ہے۔ یہ سب کی سب دلچسپ اور مفید ہیں۔ اس نے اخبار میں اعلان دیکھتے ہی مجھ سے کہا کہ یہ کتابیں یتیم خانے کو دیدی جائیں۔ ازراہ کرم آپ ان کو قبول کریں۔ اگرچہ یہ کسی لائق نہیں ہیں مگر میرے بچے کی دلی خواہش ہے"۔

علامہ قادری صاحب نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کتابیں قبول کر لیں اور بوڑھے سے اس کا نام پوچھنا چاہا۔

"بھلا اس کی کیا ضرورت ہے؟ رہنے بھی دیجئے"۔ بوڑھے نے ٹالتے ہوئے کہا۔

"کیوں نہیں۔ ہمیں اپنے رجسٹروں میں اندراج کرنا ہوگا"۔

"صرف کتابیں درج کر لیجئے۔ دینے والے کے نام سے کیا فائدہ"؟

بوڑھے نے یہ الفاظ کہے اور اپنے بچے کو ساتھ لیکر چلا گیا۔

"دارالفلاح" نامی یتیم خانہ وہ خاص مرکز تھا جہاں سے ایک پیغام بھیجا گیا اور مفلوک الحال بوڑھے کے فاقہ زدہ بچے کا دل وہ مقام تھا جہاں اس پیغام کی آواز بامعنی ہو کر سنائی دی۔ باقی تمام درمیانی لوگ تار کے کھمبے تھے جو پیغام رسانی کے سلسلہ میں صرف ممد ومعاون ثابت ہوئے اور یوں ہی اپنی جگہ بالکل جامد وساکت اور بےحس رہے:

ساقی بُک ڈپو کی مطبوعات

گذرگاہِ خیال:۔ ظفر قریشی دہلوی کے پندرہ افسانوں کا مجموعہ۔ ظفر قریشی نے پندرہ سال کے عرصے میں سینکڑوں افسانے لکھے ہیں اور یہ افسانے اُن سب کا نچوڑ ہیں۔ ان کی کہانیوں کے پلاٹ دلچسپ اور طرزِ بیان دلکش ہوتا ہے۔ قیمت عہ

دریچے:۔ ظفر قریشی دہلوی بی۔ اے کے بارہ نئے افسانوں کا مجموعہ۔ ظفر قریشی نے افسانہ نگاری میں ایک نیا اسلوب ایجاد کیا ہے۔ جو مؤثر اور نہایت دلکش ہے۔ کتاب مجلّد اور نظر فریب سرورق سے آراستہ ہے۔ قیمت دو روپے!

چندرا موہنی:۔ حسن وعشق کی داستان۔ غمناک انجام۔ سچی محبت میں چندرا موہنی نے کیسی کیسی مصیبتیں اُٹھائیں۔ یہاں تک کہ موت کی آغوش میں جا سوئی اس کتاب کے مطالعہ سے آپکی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑیں گے قیمت ایک روپیہ (عہ) علاوہ محصولڈاک!

ملنے کا پتہ:۔ ساقی بُک ڈپو۔ دہلی

حبیب اشعر

شیطان

سمعان پادری روحانیات کی باریکیوں کا عالم تھا اور لاہوتی مسائل کا نبض شناس، صغیرہ و کبیرہ گناہوں کا مرشد، اور دوزخ، اعراف اور بہشت کے رازوں کا امین۔

وہ شمالی لبنان کے ایک ایک گاؤں میں جاتا، وعظ کہتا اور لوگوں کو شیطانی پھندوں سے نکال کر ان کی مذہبی بیماریوں کا علاج کرتا۔ اس کی ان کوششوں نے شیطان کو اس کا دشمن بنا دیا اور وہ شب و روز اس سے برسر پیکار رہنے لگا۔

دیہاتی سمعان پادری کی بے انتہا عزت کرتے اور سونے چاندی کے عوض اس کی نصیحتیں اور دعائیں حاصل کر کے خوش ہوتے۔ ان میں سے ہر ایک سبقت کرتا کہ اپنے درختوں کے بہتر سے بہتر پھل اور اپنے کھیتوں کی بہتر سے بہتر پیداوار اسکی خدمت میں پیش کرے۔

موسم خزاں کا ذکر ہے: ایک دن سمعان پادری اپنے گاؤں کی طرف جاتے ہوئے، جو ان پہاڑوں اور وادیوں میں تنہا واقع تھا، کسی ویران مقام سے گزر رہا تھا کہ سڑک کی طرف سے ایک دردناک آواز اس کے کانوں میں آئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا: ایک برہنہ شخص پتھروں پر پڑا تھا، اس کے سر اور سینہ کے گہرے زخموں سے جیتا جیتا خون نکل رہا تھا اور وہ التجا آمیز لہجہ میں پکار رہا تھا: "مجھے بچاؤ! میری مدد کرو! میں مر رہا ہوں، مجھ پر رحم کھاؤ!!"

سمعان پادری اس منظر سے حیرت زدہ ہو کر ٹھہر گیا اور اس درد سے بے چین شخص کی طرف دیکھا۔ پھر اپنے دل میں کہنے لگا: "یہ کوئی سنگدل ڈاکو ہے! معلوم ہوتا ہے کہ اس نے کسی راہ چلتے کو لوٹنا چاہا لیکن وہ اس پر غالب آگیا.... یہ اس وقت نزع کی حالت میں ہے، اگر میری موجودگی میں مر گیا، تو میں ناکردہ گناہ خواہ مخواہ اس جرم میں پکڑا جاؤنگا!"

وہ آگے بڑھنا ہی چاہتا تھا کہ مجروح نے یہ کہہ کر اسے روک لیا: "مجھے تنہا نہ چھوڑ! تو مجھے جانتا ہے اور میں تجھے جانتا ہوں، اگر تو مجھے چھوڑ کر چلا گیا تو میں یقیناً مر جاؤنگا!!"

پادری کی رنگت پیلی پڑ گئی اور ہونٹ کانپنے لگے۔ اس نے خود سے کہا، "میرا خیال ہے کہ یہ ان دیوانوں میں کا ایک دیوانہ ہے، جو جنگل جنگل بھٹکتے پھرتے ہیں!"

اس نے اپنے خیالات کا رخ بدلا اور پھر اپنے دل سے کہنے لگا: "اسکے زخموں کا منظر مجھے خوف زدہ کر رہا ہے۔ لیکن میں اس کے ساتھ کیا سلوک کروں؟ .... روحانی طبیب جسمانی بیماریوں کا علاج نہیں کر سکتا!"

پادری نے جانے کے ارادے سے دو چار قدم اٹھائے اور مجروح پتھر کو پگھلا دینے والی آواز میں چلایا، "میرے قریب آ! ہم دونوں عرصہ دراز سے ایک دوسرے کے دوست ہیں، تو سمعان پادری ہے ـــــ پاکباز اسقف اعظم! اور میں ـــــ میں نہ چور ہوں، نہ دیوانہ! میرے پاس آ! اور مجھے اس ویران جنگل میں تنہا مرنے کے لئے نہ چھوڑ! میرے نزدیک آ، تاکہ میں تجھے بتاؤں: میں کون ہوں؟"

سمعان پادری مجروح کے پاس گیا اور جھک کر اسے نہایت غور سے دیکھا، اس کے خد و خال عجیب و غریب تھے، جن سے ذہانت کے ساتھ عیاری، دلکشی کے ساتھ کراہت اور نرمی کے ساتھ خباثت نمایاں تھی۔ پادری جھجک کر پیچھے ہٹا اور چلایا، "تو کون ہے؟"

مجروح نے دھیمی آواز میں کہا، "مقدس باپ! خوف نہ کھا! ہم دونوں بہت پرانے دوست ہیں۔ مجھے اٹھا اور کسی قریبی نہر پر لے جا کر اپنے رومال سے میرے زخم دھو دے!"

پادری نے بلند آواز میں کہا: "مجھے بتا کہ تو کون ہے؟ میں تجھے نہیں جانتا کیونکہ مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے اپنی زندگی میں کبھی تجھے دیکھا ہے!"

مجروح نے جواب دیا، اس طرح کہ موت کی خرخراہٹ اسکی آواز میں شامل تھی: "تو جانتا ہے کہ میں کون ہوں؟ تو مجھ سے ہزاروں دفعہ ملا ہے اور ہر جگہ تو نے میری صورت دیکھی ہے۔ میں مخلوقات میں سب سے زیادہ تجھ سے قریب ہوں بلکہ میں تجھے تیری زندگی سے زیادہ عزیز ہوں!"

پادری نے چلاتے ہوئے کہا، "تو جھوٹا اور فریبی ہے حالانکہ مرنے والے کو سچ بولنا چاہیئے! میں نے اپنی زندگی میں کبھی تیری صورت نہیں دیکھی ـــــ بتا تو کون ہے؟ ورنہ میں تجھے چھوڑ کر چلا جاؤں گا اور تو خون بہتے بہتے مر جائیگا!"

مجروح نے قدرے حرکت کی اور پادری کی آنکھوں کو نہایت غور سے دیکھنے لگا۔ اسکے لبوں پر معنی خیز تبسم نمودار ہوا، اور اس نے نرم، شیریں اور گہری آواز میں کہا، "میں شیطان ہوں!"

پادری نے ایک ہولناک چیخ ماری، جس سے وادی کا ذرہ ذرہ لرز اٹھا۔ پھر اسنے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ اس فیصلہ کی روشنی میں جو گاؤں کے

کلیسا کی دیواروں میں لٹکا ہوا تھا، اُس نے دیکھا کہ مجروح کا جسم اپنی ترکیب اور آثار کی بنا پر اُسی ہیئت پر منطبق ہوتا ہے۔ وہ کانپتے ہوئے چلّایا: "اللہ نے مجھے تیری جہنمی صورت اس لئے دکھائی ہے کہ میرے دل میں تیری طرف سے کراہت اور بڑھ جائے! تجھے ابدالآباد تک مردود و ملعون ہی رہنا چاہیئے!"

شیطان نے کہا: "مقدس باپ! جلدبازی سے کام نہ لے اور بیہودہ گفتگو میں وقت ضائع نہ کر! میرے قریب آ، اور اس سے پہلے کہ میری زندگی، خون کی شکل میں میرے جسم سے بہہ جائے، میرے زخموں پر مرہم رکھ!"

پادری نے جواب دیا: "وہ ہاتھ جو روزانہ خداوندی قربانیوں کے لئے اُٹھتا ہے، تیرے جہنمی غبارے سے بنے ہوئے جسم کو نہیں چھو سکتا۔ تو زمانہ کا دشمن اور انسانیت کی بربادی کے درپے ہے اس لئے تجھے مرنا ہی چاہیئے اس حالت میں کہ دنیا کی زبانیں تجھ پر لعنت بھیجیں اور زمانہ کے ہونٹ تجھے ملامت کریں!"

بے چین ہو کر شیطان نے کہا: "تو نہیں جانتا کہ کیا کہہ رہا ہے؟ اور تجھے نہیں معلوم کہ تو کس گناہ کا مرتکب ہو رہا ہے؟ سُن! میں تجھے اپنی کہانی سناتا ہوں: آج شام میں ان وادیوں میں تنہا چلا جا رہا تھا جب یہاں پہونچا تو کم ظرف فرشتوں کی ایک جماعت سے دوچار ہوا۔ وہ سب کے سب مجھ پر ٹوٹ پڑے اور مجھے بُری طرح زخمی کر دیا۔ اگر ان میں سے ایک فرشتہ کے پاس دودھاری تلوار نہ ہوتی تو میں یقیناً ان سب کو مار گراتا لیکن اسلحہ بند کے مقابلہ میں نہتا کیا کر سکتا ہے؟"

شیطان تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گیا اور اُس نے اپنا ہاتھ پہلو کے گہرے زخم پر رکھ لیا۔ دوبارہ اُس نے کہنا شروع کیا: "لیکن وہ مسلح فرشتہ، جس کے متعلق میرا خیال ہے کہ میکائیل تھا، بڑا پھرتیلا اور تلوار چلانے میں کمال رکھتا تھا۔ یہ واقعہ ہے کہ اگر میں زمین پر نہ گر پڑتا اور میری حالت مُردوں کی سی نہ ہو جاتی تو میرا ایک ایک عضو علیحدہ نظر آتا!"

فتحمندانہ لہجہ میں پادری نے کہا: "خدا میکائیل کا مرتبہ بلند کرے کہ اس نے انسانیت کو اسکے بدترین دشمن سے نجات دلادی!"

شیطان نے جواب دیا: "انسانیت سے میری دشمنی اس قدر اندھی نہیں ہے جس قدر تیری دشمنی خود اپنی ذات سے ہے۔ تو میکائیل کو مبارکباد دے رہا ہے، حالانکہ اس نے تیرے ساتھ ذرہ برابر سلوک نہیں کیا اور بیچارگی کے عالم میں میرے نام پر لعنت بھیج رہا ہے حالانکہ میں تیری راحت و کامیابی کا سبب تھا اور ہوں! کیا تو میری مہربانیوں اور احسانوں سے انکار کر رہا ہے؟ ایسی حالت میں جبکہ تو میرے ہی سایہ میں پل رہا ہے! کیا یہ میرا وجود نہیں ہے، جس نے تیرے لئے ایک پیشہ وضع کیا؟ کیا یہ میرا نام نہیں ہے، جس نے تیرے اعمال کے لئے ایک ضابطہ بنایا؟ کیا میرے ماضی نے تجھے حال اور مستقبل سے بے نیاز کر دیا ہے؟ کیا تیری دولت و ثروت اس حد کو پہنچ گئی ہے جس میں اضافہ کی مطلق گنجائش نہیں؟ کیا تو نہیں جانتا کہ تیرے بیوی بچے اور عزیز اقارب مجھے کھو دینے سے اپنا رزق کھو دیں گے، بلکہ میرے مرنے سے بھوکوں مر جائینگے؟ تو کیا کرے گا، اگر مشیت مجھے فنا کر دے گی؟ کونسا پیشہ اختیار کرے گا، اگر زمانے کی ندیاں میرے نام کو مٹا ڈالیں گی؟ تو لوگوں کو میری پیدا کردہ مصیبتوں اور پھندوں سے بچانے کے لئے پچیس برس سے ان کوہستانی گاؤں میں گھومتا پھر رہا ہے؟ اور لوگ تیرے وعظوں کو دولت اور غلہ کے عوض خرید رہے ہیں۔ بتا! اگر کل انہیں معلوم ہو گیا کہ ان کا دشمن شیطان مر گیا ہے اور اب وہ اس کے پھندوں سے آزاد ہیں تو وہ تجھ سے کیا خریدیں گے! اگر تیرا یہ وظیفہ، جو شیطان سے مقابلہ کرنے کے سلسلہ میں تجھے ملتا ہے، اسکے مر جانے سے بند ہو گیا، تو لوگ تجھے کس بات کا وظیفہ دینگے؟ تو کہ لاہوتی مسائل کا رمز شناس ہے، کیا نہیں جانتا کہ شیطان کا وجود ہی اسکے دشمنوں ـــ پادریوں ـــ کی تخلیق کا سبب ہے؟ اور یہ پُرانی عداوت گویا ایک مخفی ہاتھ ہے، جو سونے چاندی کو ایمان پرستوں کی جیب سے واعظوں اور مرشدوں کی جیب میں منتقل کرتا ہے؟ تو کہ سمجھ بوجھ والا عالم ہے، کیا نہیں جانتا کہ سبب کے زوال سے مسبب خود بخود زائل ہو جاتا ہے؟ پھر تو میرے مرنے سے کیوں خوش ہے جبکہ میری موت تجھے اپنے مرتبہ سے گرا دے گی، تیرا رزق بند کر دے گی اور تیرے بیوی بچوں کے مُنہ سے روٹی کا ٹکڑا چھین لے گی؟"

شیطان ایک منٹ کے لئے خاموش ہو گیا، اس کے چہرے پر ہم بالی کی بجائے استقلال کے آثار نمایاں ہوئے اور اُس نے پھر کہنا شروع کیا:

"دیکھ! او مغرور جاہل! میں تجھے اس حقیقت کی تصویر دکھاتا ہوں، جس نے میری ہستی کو تیری ہستی میں ضم کر دیا ہے اور میرے وجود کو تیرے وجدان سے مربوط: آفرینش عالم کی ابتدائی ساعتوں میں، انسان سورج کے سامنے کھڑا ہوا اور اپنا ہاتھ اُٹھا کر پہلی مرتبہ بلند آواز سے کہا: "آسمانوں سے پرے خدائے جلیل ہے جو نیکی سے محبت کرتا ہے!" پھر اُس نے روشنی کی طرف پیٹھ کر لی اور زمین پر اپنا سایہ پڑتے دیکھ کر چلّایا: "اور زمین کی تہوں میں مردود شیطان ہے، جو بدی سے خوش ہوتا ہے!" اس کے بعد وہ اپنے غار کی طرف چلا، دل ہی دل میں کہتا ہوا: "میں دو ہولناک خداؤں کے درمیان ہوں، ایک خدا وہ ہے، جس سے میں منسوب ہوں اور دوسرا وہ، جو پہلے خدا سے برسرپیکار ہے!" زمانہ پر زمانہ گزرتا چلا گیا لیکن انسان دو آزاد قوتوں میں گھرا رہا، ایک وہ قوت، جو اسکی رُوح کو بلندیوں پر لے جا کر برکت دیتی ہے اور دوسری وہ قوت، جو اس کے جسم کو تاریکیوں میں گرا کر ملعون بناتی ہے۔ تاہم وہ برکت کے معنی سے واقف تھا، نہ لعنت کے مفہوم سے آشنا، بلکہ وہ ان دونوں قوتوں کے درمیان اس درخت کی مثال تھا جو گرمی اور جاڑے کے درمیان ہو ـــ گرمی، جو اُسے دھانی پوشاک پہناتی ہے اور جاڑا، جو اُسے ننگا بُچا کر دیتا ہے۔ آخرکار جب وہ صبح تمدن ـــ الفت بشری ـــ سے دوچار ہوا تو پہلے اُس نے خاندان کی بنیاد ڈالی پھر قبیلہ کی۔ اب اُس کے مشاغل، میلانات کے فرق کی بنا پر متفرق ہو گئے اور صنعتیں، مزاج و مذاق کے اختلاف کی بنا پر مختلف۔ چنانچہ اس قبیلہ کے بعض افراد نے کھیتی باڑی کا پیشہ اختیار کر لیا اور بعض نے معماری کا۔ بعض کپڑا بُننے لگے اور بعض تیر

کھونے لگے۔ اسی قدیم زمانہ میں کہانت نمودار ہوئی اور یہ پہلا پیشہ تھا جسے انسان نے بغیر کسی فطری ضرورت کے ایجاد کیا؟

شبطان ایک منٹ تک خاموش رہا، اس کے بعد اس نے ایک قہقہہ لگایا جس سے وادی کا گوشہ گوشہ گونج اٹھا۔ اس نے کراہتے ہوئے اپنے پہلو کو ہاتھ سے دبالیا، گویا قہقہہ نے اس کے زخموں کے منہ کھول دئے ہوں۔ اور معاً وہ بدی کو غور سے دیکھتے ہوئے کہنے لگا: "کہانت نے اس زمانہ میں جنم لیا، لیکن کس طرح؟ یہ میں ابھی بتاتا ہوں۔ دنیا کے ابتدائی قبیلہ میں ایک شخص لاؤتیس تھا ۔۔۔ میں نہیں سمجھ سکا، اس نے یہ عجیب و غریب نام اپنے لئے کیوں پسند کیا تھا! ۔ ۔ ۔ بہرحال وہ نہایت ذہین مگر نہایت چھوٹا اور سست آدمی تھا۔ جیسے زراعت، معماری، گلہ بانی، شکار غرض ہر اس کام سے نفرت تھی جس میں قوتِ بازو یا جسمانی حرکت کی ضرورت ہو اور چونکہ اس زمانہ میں بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے رزق ملنا دشوار ہی نہیں ناممکن تھا اس لئے اس کی اکثر راتیں بھوک کی شدت سے جاگتے کٹتی تھیں۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ خسوف کی رات تھی، اس قبیلہ کے افراد اپنے سردار کے مکان کے گرد بیٹھے اپنی اپنی زندگی کے واقعات دہرا رہے تھے اور اس انتظار میں تھے کہ نیند آجائے۔ اچانک ان میں سے ایک شخص کھڑا ہوا اور چاند کی طرف اشارہ کرکے خوفناک آواز میں چلانے لگا: "ذرا چاند دیوتا کو تو دیکھو! اس کا چہرہ کتنا ماند پڑ گیا ہے اور روشنی کس حد تک زائل ہو چکی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آسمانی گنبد میں ایک سیاہ پتھر لٹک رہا ہے۔" لوگوں نے چاند پر اپنی نگاہیں جمادیں اور یہ دیکھ کر کہ ان کی راتوں کا دیوتا رفتہ رفتہ ایک سیاہ کرہ کی شکل اختیار کرتا جارہا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ نہ صرف یہ کہ زمین کی رنگت بدل رہی ہے، بلکہ وادیاں اور ٹیلے بھی ایک سیاہ چادر میں چھپتے جارہے ہیں، خوف و دہشت سے کانپنے اور چلانے لگے۔ گویا دستِ ظلمت نے ان کے دلوں کو دبوچ لیا ہے۔

اس وقت لاؤتیس جو اس سے پہلے کئی بار کسوف و خسوف کے مناظر دیکھ چکا تھا، آگے بڑھا اور لوگوں کے وسط میں جاکر ہاتھ اوپر کی طرف اٹھادئے۔ اس نے بلند آواز میں کہا جس سے اس کی ذہانت، تصنع اور عیاری صاف نمایاں تھی: "لوگو، سجدہ کرو، سجدہ کرو اور آسمانی امداد کے لئے دعائیں مانگو!! اپنی پیشانیاں زمین پر رگڑو کہ بدی کا تاریک دیوتا، رات کے روشن دیوتا سے نبرد آزما ہے۔ اگر وہ غالب آگیا تو ہم مر جائیں گے اور اگر مغلوب ہوگیا تو زندہ بچ جائیں گے۔ سجدہ کرو، دعائیں مانگو!! اپنی پیشانیاں زمین پر رگڑو! بلکہ اپنی آنکھیں بند کرلو، اور سجدے سے سر نہ اٹھاؤ!! اس لئے کہ اگر تم میں سے کسی نے تاریکی کے دیوتا کو روشنی کے دیوتا سے لڑتے دیکھ لیا تو وہ اپنی بصارت و بصیرت کھو دے گا اور آخر عمر تک اندھا اور پاگل رہے گا۔ لوگو! سجدہ کرو اور اپنے دلوں کی قوت سے روشنی کے دیوتا کو اسکے دشمن کے خلاف مدد پہونچاؤ!!"

لاؤتیس اسی لہجہ میں بولتا رہا۔ وہ اپنے دماغ سے نئے نئے الفاظ تراش رہا تھا اور وہ تمام کلمات دہرا رہا تھا جو اس رات سے پہلے اس نے سنے تھے۔ یہاں تک کہ آدھا گھنٹہ گزر گیا اور چاند اپنی اصلی حالت پر آگیا۔ اب لاؤتیس کی آواز پہلے سے بلند ہوگئی اور اس نے مسرت و کامرانی کے لہجہ میں کہا:

"لوگو! اٹھو اور دیکھو! رات کا دیوتا اپنے شریر دشمن پر غالب آچکا اور اب ستاروں کی سیر میں مصروف ہے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ تم نے اپنی نمازوں اور دعاؤں سے رات کے دیوتا کو مدد پہونچا کر خوش کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس وقت تم اسے زیادہ روشن اور تابناک دیکھ رہے ہو!"

لوگوں نے سجدہ سے سر اٹھایا اور چاند کو نہایت غور سے دیکھنے لگے۔ اس کی روشن شعاعوں نے ان کے خوف و اضطراب کو مسرت و اطمینان سے بدل دیا اور وہ مارے خوشی کے اچھلنے کودنے اور ناچنے گانے لگے۔ وہ اپنی لکڑیوں سے تانبے اور لوہے کے گھنٹے بجارہے تھے اور وادی کی تمام فضا ان کی پرمسرت چیخ پکار سے گونج رہی تھی۔

اسی رات قبیلہ کے سردار نے لاؤتیس کو بلایا اور کہا: "آج کی رات تم نے وہ کام کیا ہے جو تم سے پہلے کوئی انسان نہ کرسکا۔ تم زندگی کے ان اسرار سے واقف ہو جو تمہارے سوا ہم میں سے کوئی نہیں جانتا۔ خوش ہوجاؤ! کہ آج سے میرے بعد اس قبیلہ کے سب سے بڑے آدمی تم ہو! میں لوگوں سے اگر اپنی بہادری اور قوت کی بنا پر ممتاز ہوں تو تم اپنی عقل اور حکمت کے لحاظ سے ہم سب پر فوقیت رکھتے ہو! یہی نہیں بلکہ تم میرے اور دیوتاؤں کے درمیان ایک ذریعہ ہو، تم مجھے ان کی مرضی سے باخبر کروگے، ان کے اعمال و اسرار مجھ پر ظاہر کروگے اور مجھے مشورہ دوگے کہ میں ان کی محبت و خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کیا کروں؟"

لاؤتیس نے جواب دیا: "دیوتا جو کچھ مجھے خواب میں بتائیں گے، میں بیداری میں حضور سے عرض کردوں گا، اور جو راز وہ مجھ پر منکشف کریں گے، میں آپ پر ظاہر کردوں گا۔ ہاں! میں آپ کے اور دیوتاؤں کے درمیان ایک واسطہ ہوں!"

سردار کی باچھیں کھل گئیں اور اس نے لاؤتیس کو دو نہایت شاندار گھوڑے، سات بچھڑے، ستر بھیڑیں اور ستر بکریاں عطا فرماکر کہا: "قبیلہ کے لوگ تمہارے لئے ایک ایسا ہی گھر تیار کردیں گے، جیسا میرا ہے اور ہر موسم کے خاتمہ پر اپنے باغوں کے پھل اور کھیتوں کی پیداوار تمہاری خدمت میں نذر کے طور پر پیش کریں گے۔ اس طرح تم سرداروں کی طرح نہایت عزت کی زندگی بسر کروگے!"

لاؤتیس جانے کے لئے اٹھا لیکن سردار نے اسے یہ کہہ کر ٹھہرالیا: "لیکن یہ دیوتا کون ہے، جسے تم بدی کا دیوتا کہتے ہو؟ کیا یہ وہی دیوتا ہے جس نے رات کے روشن دیوتا سے مقابلہ کی جرأت کی تھی؟ ہم نے اس کے متعلق کبھی کچھ نہیں سنا اور نہ ہمیں اس کے وجود کا علم ہے!"

لاؤتیس نے تھوڑی دیر سر کھجانے کے بعد جواب دیا: "پرانے زمانہ میں ۔۔۔ انسان کی پیدائش سے پہلے ۔۔۔ تمام دیوتا کہکشاں سے پرے ایک دور دراز مقام پر نہایت امن و خلوص کے ساتھ رہتے تھے۔ مہادیو، جو ان سب کا باپ تھا، علم و عمل میں

اللہ سب پر امتیاز رکھتا تھا اور اس نے اپنی ذات کے لئے بعض خداوندی اسرار محفوظ کر رکھے تھے، جو ناموس ازل کے پردے میں روپوش ہیں۔ چنانچہ بارھویں زمانہ کے ساتویں عہد میں بعطار نے، جو یہاوہ یو سے نفرت کرتا تھا، بغاوت کی اور اس کے مقابلہ پر آکر کہا:

"تو نے ہم سے ہستی، ناموس اور زمانہ کے اسرار پوشیدہ رکھ کر مخلوقات پر اپنا مطلق اقتدار کیوں قائم کر رکھا ہے؟ کیا ہم تیری اولاد نہیں ہیں؟ اور کیا تیری قوت اور دوام میں ہماری شرکت نہیں ہے؟"

یہاوہ یو غصہ سے کانپ اٹھا اور اس نے کہا: "میں تمام بنیادی اسرار، مطلق اقتدار اور ازلین قوت، ابدالآباد تک اپنے لئے محفوظ رکھوں گا، اس لئے کہ میں ہی آغاز ہوں اور میں ہی انجام۔"

بعطار نے کہا: "اگر تو اپنی قوت و جبروت تقسیم کرنے پر تیار نہیں تو میں اور میری اولاد تیرے خلاف علم بغاوت بلند کرتی ہے!"

شدت غضب سے یہاوہ یو اپنے تخت پر کھڑا ہو گیا۔ اس نے ایک ہاتھ سے کہکشاں کی تلوار کھینچی اور دوسرے ہاتھ میں آفتاب کی ڈھال لے لی۔ پھر نہایت خوفناک آواز میں، جس سے دنیا کا ذرہ ذرہ لرز اٹھا، چلایا: "اچھا! اگر یہ بات ہے تو، او شریر باغی! میں تجھے اس پست و ذلیل دنیا میں پھینکتا ہوں، جہاں تاریکی ہے اور بدبختی ہے اور جب تک سورج راکھ کا ڈھیر اور ستارے فضا کے منتشر ذروں میں تبدیل نہ ہو جائیں، تو یہاں اپنی جلاوطنی کے دن آوارگی و گم کردہ راہی میں گزار!"

اسی لمحہ بعطار دیوتاؤں کے مسکن سے اس پست عالم میں پھینک دیا گیا، جہاں خبیث روحیں رہتی ہیں۔ اور اس نے یہاوہ یو کے دوامی اسرار کی قسم کھا کر فیصلہ کیا کہ وہ ابدالآباد تک اپنے باپ اور بھائیوں کے خلاف آمادہ پیکار رہے گا اور ہر اس شخص کو گمراہ کرے گا جو اس کے باپ سے محبت کرتا ہے یا اس کے بھائیوں کا ارادت مند ہے۔"

سردار کا رنگ زرد پڑ گیا اور اس نے ماتھا سکیڑ کر کہا: "اچھا! تو بدی کے دیوتا کا نام "بعطار" ہے!"

لاؤتیس نے جواب دیا: "اس کا نام بعطار اس وقت تھا، جب وہ دیوتاؤں کے مسکن میں رہتا تھا، لیکن اس عالم میں پھینک دئیے جانے کے بعد اس نے اپنے بہت سے نام رکھ لئے ہیں۔ مثلاً بعلزبول، ابلیس، سطنائیل، بلیال، زمیال، اہرمن، مارہ، ابیدون اور شیطان ——— لیکن ان سب میں زیادہ مشہور نام شیطان ہی ہے!"

سردار نے شیطان کا لفظ کئی بار دُہرایا۔ اس کی آواز اس طرح کانپ رہی تھی، جیسے ہوا کے جھونکوں سے خشک پتوں میں سرسراہٹ پیدا ہو رہی ہو۔ اس نے پوچھا:

"لیکن شیطان تو دیوتاؤں کا مخالف ہے، پھر اُسے انسان سے نفرت کیوں ہے؟"

لاؤتیس نے جواباً کہا: "شیطان اس لئے انسان کی تباہی و بربادی کے درپے ہے کہ وہ اسکے بہن بھائیوں کی اولاد ہے!"

حیرت آمیز لہجہ میں سردار نے کہا: "اچھا! تو شیطان انسان کا چچا بھی ہے اور ماموں بھی!"

تشویش و اضطراب کے عالم میں لاؤتیس نے جواب دیا: "جی ہاں! لیکن وہ اس کا سب سے بڑا دشمن اور کینہ پرور نگراں ہے، جو اس کے دنوں کو بدبختی اور راتوں کو خوفناک خوابوں سے گراں بار کرتا رہتا ہے۔ وہ ایک قوت ہے، جو آندھیوں کے ذریعہ انسان کے گھروں کو بیخ و بنیاد سے اکھاڑ پھینکتی ہے، قحط سالی کے ذریعہ اسکے کھیتوں کو اجاڑ دیتی ہے، وباؤں کے ذریعہ اس کے مویشیوں کو مار ڈالتی ہے اور بیماریوں کے ذریعہ اس کے جسم کو ناکارہ کر دیتی ہے۔ وہ ایک طاقتور لیکن بے ایمان و دغاباز دیوتا ہے، جو ہماری مصیبتوں سے مسرور اور ہماری مسرتوں سے غمگین ہوتا ہے اس لئے ہم پر فرض ہے کہ اس کی فطرت کے ایک ایک گوشہ کو سمجھیں، اس کی ذہنیت کے ایک ایک راز سے واقف ہوں تاکہ اس کے شر اور حیلہ سازیوں سے محفوظ رہیں۔"

سردار نے لکڑی کا سہارا لیتے ہوئے، سرگوشی کے انداز میں کہا: "اس عجیب و غریب قوت کے مخفی راز آج میری سمجھ میں آئے، جو آندھیوں کی صورت میں ہمارے گھروں کو تباہ کرتی اور وباؤں کی شکل میں ہمارے مویشیوں کو موت کے گھاٹ اتارتی ہے۔ لاؤتیس! مجھے یقین ہے کہ جو راز آج تو نے مجھ پر منکشف کیا ہے کل تمام آدمیوں پر ظاہر ہو جائے گا اور وہ سب تیرے حضور ہدیۂ عقیدت پیش کریں گے کہ تو نے انہیں ان کے سب سے بڑے دشمن کے اسرار سے آگاہ کیا اور بتایا کہ اس کے پھندوں سے کس طرح بچا جا سکتا ہے۔"

لاؤتیس نے سردار سے اجازت چاہی اور اپنی عقل و ذہانت سے مخمور و شاداں اپنے گھر چلا گیا۔ لیکن سردار اور قبیلہ کے دوسرے افراد ساری رات پریشان خوابوں اور خوفناک تصوّرات کی بنا پر چونکتے اور جاگتے رہے۔"

مجروح شیطان تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔ سمعان پادری اسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا تھا، اس کی آنکھوں میں حیرت و استعجاب کا جمود تھا اور ہونٹوں پر موت کا تبسم۔

شیطان نے پھر اپنے سلسلۂ گفتگو کا آغاز کیا: "کہانت نے اس طرح دنیا میں جنم لیا اور اس طرح میری ہستی اس کے ظہور کا سبب ہوئی۔ لاؤتیس پہلا آدمی تھا جس نے میری دشمنی کو باقاعدہ ایک پیشہ بنایا۔ لاؤتیس کی موت کے بعد اس کی اولاد کے ذریعہ یہ پیشہ رواج پا گیا اور نشو و ارتقا کی مختلف منزلیں طے کر کے ایک نازک اور مقدس فن

بن گیا، جسے صرف وہی لوگ اختیار کر سکتے تھے جن کی عقل تیز، روح شریف، دل پاک اور خیال وسیع ہو، چنانچہ بابل میں لوگ اس پادری کو سات مرتبہ سجدہ کرتے تھے، جو پُر اسرار منتروں کے ذریعہ مجھ سے نبرد آزما ہوتا تھا۔ نینوا میں اس شخص کو، انسان اور دیوتاؤں کے درمیان ایک سنہری کڑی سمجھتے تھے، جو میرے اسرار و رموز سے واقفیت کا دعویٰ کرتا تھا۔ تبت میں ... جو مجھ سے برسرِ پیکار رہتا تھا۔ بلبس، افسس اور انطاکیہ میں اس کی رضامندی حاصل کرنے کے لئے اپنے بیٹے بیٹیوں کو بھینٹ چڑھا دیتے تھے، جو مجھ سے خصومت رکھتا تھا۔ یروشلم اور روم میں اپنی جانیں اس کے حوالے کر دیتے تھے، جو مجھ سے نفرت و دوری کے اظہار میں طرح طرح کے کمالات ظاہر کرتا تھا۔ غرض یہ کہ ہر شہر میں، جو اس زمین پر آباد ہوا، میرا ہی نام، مذہب، علم، فن اور فلسفہ کے دائروں کا مرکز رہا۔ چنانچہ عبادت گاہیں میرے زیرِ سایہ قائم ہوئیں، مدارس اور تعلیم گاہوں کی بنیاد میرے مظاہر پر رکھی گئی، محلوں اور برجیوں نے رفعت میرے مرتبہ کی بلندی سے حاصل کی، دوسرے الفاظ میں میں ایک قوت ہوں، جو انسان میں عزم و ارادہ پیدا کرتی ہے۔ ایک تصور ہوں، جو افکار کی جودت و ندرت کا ضامن ہے۔ ایک ہاتھ ہوں، جو انسان کے ہاتھوں کو حرکت دیتا ہے۔ میں ازلی اور ابدی شیطان ہوں! ہاں! میں شیطان، جو انسان سے اس لئے مقابلہ کرتا رہتا ہوں کہ وہ زندہ رہے ورنہ اگر وہ میرے مقابلہ سے بے نیاز ہو جائے تو بے شغلی اس کے افکار کو زنگ آلود کر دے گی، سستی اس کی روح کو گھن لگا دے گی اور راحت اس کے جسم کو فنا کر دے گی۔

میں ازلی اور ابدی شیطان ہوں، وہ پرجوش لیکن خاموش آندھی، جو مردوں کے دماغ اور عورتوں کے سینہ میں طوفان برپا کر کے ان کو ... بتکدوں اور خانقاہوں کی طرف اڑائے جاتی ہے تاکہ وہ ... سے خوف زدہ ہو کر میرے اقتدار کو مانیں یا پھر ہوسناکی و بدکاری کے اڈوں کو ... تاکہ وہ میری مرضی کے آگے سر جھکا کر مجھے مسرور و خوش کام کریں، چنانچہ وہ پادری، جو رات کی خاموشی میں دعائیں مانگتا ہے اس لئے کہ مجھے اپنے بستر سے دور رکھے، درحقیقت اس کسبی کی مثال ہے جو مجھے اپنے بستر پر بلانے کے لئے گڑگڑاتی ہے۔

میں ازلی اور ابدی شیطان ہوں، جس نے بتکدوں اور خانقاہوں کی بنیاد خوف و دہشت پر رکھی اور شراب خانوں اور چکلوں کو لذت و ہوس رانی کی اساس پر قائم کیا، اس لئے اگر میرا وجود فنا ہو گیا تو دنیا سے لذت و خوف بھی فنا ہو جائیں گے! جانتے ہو! لذت و خوف کے فنا ہو جانے سے کیا ہوگا! یہ ہوگا کہ انسان کے دل کی تمام امیدیں اور آرزوئیں فنا ہو جائیں گی اور زندگی ویران و بے کیف ہو کر رہ جائے گی، جیسے بوسیدہ سارنگی جس کا ایک تار سلامت نہ ہو!

میں ازلی اور ابدی شیطان ہوں! جھوٹ، غمازی، تہمت، دغا اور مسخرگی کا خالق! اور اگر یہ چیزیں دنیا میں باقی نہ رہیں تو انسانی جماعت اس اجاڑ باغ کی مثال ہو جائے گی جس میں فضیلت کے کانٹوں کے سوا کوئی چیز نہ اُگے۔

میں ازلی اور ابدی شیطان ہوں، گناہوں کا سرچشمہ! اور اگر گناہ مٹ گئے تو اس سے مقابلہ کرنے والے بھی مٹ جائیں گے اور ان کے ساتھ تو، تیری اولاد، تیرے مرید اور عقیدت مند بھی۔ ہاں! میں گناہوں کا سرچشمہ ہوں! تو کیا تو یہ چاہتا ہے کہ میرے مٹنے سے گناہ بھی مٹ جائے؟ کیا تو یہ چاہتا ہے کہ میرے دل کی دھڑکنوں کے ساتھ انسانی حرکت بھی رک جائے؟ کیا تو یہ چاہتا ہے کہ سبب کے ساتھ مسبب بھی زائل ہو جائے؟ کیا تو چاہتا ہے کہ میں، جو دنیا کی چہل پہل کا بنیادی سبب ہوں، اس ویران جنگل میں مر جاؤں؟ جواب دے! اے لاہوتی مسائل کے عالم بے ہمتا! کیا تو یہ چاہتا ہے کہ وہ اولین تعلق ختم ہو جائے جو میرے اور تیرے درمیان ہے؟"

شیطان نے اپنے بازو پھیلائے، اس کی گردن آگے کی طرف جھک گئی، اور وہ دیر تک کراہتا رہا۔ اپنے سبزی مائل مٹیلے رنگ میں وہ ایسا معلوم ہو رہا تھا، جیسے نیل کے کنارے مصری مجسمہ، جو زمانہ کی دستبرد سے بچ گیا ہو۔ اس نے سمعان پادری کو اپنی شعلہ فگن آنکھوں سے گھورا اور کہا: "گفتگو نے مجھے نڈھال کر دیا ہے! حالانکہ میرے زخموں کا تقاضہ یہ تھا کہ میں تجھ سے زیادہ باتیں نہ کروں، کس قدر تعجب کا مقام ہے کہ میں نے تیرے سامنے اس حقیقت کی توضیح کی ہے، جسے تو خود مجھ سے زیادہ جانتا ہے اور وہ باتیں بیان کی ہیں جو میری مصلحتوں کے مقابلہ میں تیری مصلحتوں سے زیادہ قریب ہیں۔ اب جو تیرا جی چاہے، کر! مجھے اپنی پیٹھ پر اٹھا کر، اپنے گھر لے جا اور میری مرہم پٹی کر! یا یہیں پڑا رہنے دے کہ میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاؤں!"

شیطان گفتگو کر رہا تھا اور سمعان پادری سر سے پاؤں تک کانپ رہا تھا۔ حیرت اور پریشانی کے لہجہ میں ہاتھ ملتے ہوئے اس نے کہا: "مجھے وہ راز معلوم ہو گیا، جو اب سے ایک گھنٹہ پہلے معلوم نہ تھا۔ میری نادانی کو معاف فرما! اب میری سمجھ میں آ گیا کہ تو دنیا میں آزمائش کے لئے بھیجا گیا ہے اور یہ آزمائش ایک کسوٹی ہے، جس کے ذریعہ اللہ انسان کی قدر و قیمت پہچانتا ہے، بلکہ ایک ترازو ہے جس میں خدائے بزرگ و برتر روح کو تول کر اس کے ہلکے یا بھاری ہونے کا اندازہ کرتا ہے۔ میں نے جان لیا کہ اگر تو مر گیا تو یہ آزمائش اور اس کے ساتھ وہ معنوی قوتیں ختم ہو جائیں گی، جو انسان کو پاکبازی کی تعلیم دیتی ہیں۔ بلکہ وہ سبب بھی زائل ہو جائے گا، جو انسان کو نماز، روزہ اور عبادت کی طرف لے جاتا ہے۔ تجھے زندہ رہنا چاہیئے اس لئے کہ اگر تو مر گیا اور لوگوں کو اس کا علم ہو گیا تو وہ دوزخ کے عذاب سے بے خوف ہو کر عبادت چھوڑ دیں گے اور گناہوں کی دلدل میں جا پھنسیں گے۔ تجھے زندہ رہنا چاہیئے اس لئے کہ تیری زندگی نوعِ انسان کو برائیوں سے بچاتی ہے۔ رہا میں، سو انسانی محبت کی قربان گاہ پر اس نفرت کو بھینٹ چڑھا دوں گا، جو مجھے تیری ذات سے ہے!"

شیطان نے ایک قہقہہ مارا، جو کوہ آتش فشاں کے پھٹنے سے مشابہ تھا اور کہا: "مقدس باپ! تو کتنا ذہین اور کس قدر لائق ہے! لاہوتی مسائل سے متعلق تیرا ...

(بقیہ صفحہ ...)

صدیقہ بیگم

اندر سبھا

"منیم کی عورت کیسے اچھے اچھے پولکے پہنتی ہے۔ کیوں ماں؟ — تو نے دیکھی ہے نا — ماں وہی منیم والی بائی۔ کیسی ساجری لگتی ہے؟" راجو بولے جارہی تھی اور اس کی ماں جیسے کانوں میں تیل ڈال کر بیٹھی ہو — وہ پھر بولی۔

"ماں اُس کے جوڑے کے پھول کیسے اچھے لگتے ہیں۔ وہ پھول لگا کر باہر موٹر کے پاس کیوں جاتی ہے — ماں تو بھی لگایا کر، بڑی اچھی لگے گی" اس کی ماں برابر چولی میں سے جوئیں پا رہی تھی۔

"اور وہ کچھ کام بھی تو نہیں کرتی۔ — بیڑی کیا بنانے گی پتے تک تو چُنتی نہیں —"

"پتے کیوں چُنے! — کوئی وہ ہماری نیچ ذات تھوڑی ہے۔ وہ گھرچی یہ منیم ہے" راجو کچھ مطمئن سی ہوگئی۔

"ماں — تو نے وہ گجراتن دیکھی ہے — کتنا لمبا گھونگٹ کاڑھتی ہے!"

"کون — گجراتن؟" ماں نے ایک لیکھ ناخون پر ٹہناتے ہوئے پوچھا۔

"وہی بٹنے والی — ماں اُس کا مرد تو بالکل ہی بڈھا ہے"

"لے اچھا میرا سر ٹٹول" اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر کھجلایا۔ راجو نہ جانے کس دھیان میں اُٹھ کر اس کا سر ٹٹولنے لگی۔ مگر اس کے ذہن میں گجراتن بسی ہوئی تھی۔

"ماں — گجراتن کا وہ ننھا سا بچہ کیسا گورا گورا ہے۔ بالکل ویسا ہی جیسا وہ 'سلیمن' اسکے گھر آتا ہے —"

"چُپ رنڈی — تجھے کیا پڑی ہے" راجو منہ بسور کر الگ جا بیٹھی۔

"چل اِدھر!" راجو اپنی جگہ سے نہ ہلی اور منہ لٹکا کر بیٹھ گئی۔ اس کی ماں آنکھیں گاڑ کر جوں مارنے لگی۔

"لے اس میں جوں دیکھ —"

"اُوں — اُوں — میں تو نا دیکھتی" راجو لوٹ گئی۔

"اچھا اُٹھ — سام کو منشی سے پیسے لیکر دوں گی"

راجو نے اُٹھ کر چولی تھام لی اور ماں اپنی اُٹھ گزی ساری کو نیچے سمیٹ کر ... پیرانہ ملنے کی وجہ سے ایک گز کم کر دی گئی تھی ورنہ ہمارا ستی رسم کے مطابق ... سوت کم کرنا بھی بڑی بُری بات ہے۔ ... اب میں پیچ گی دھوتی نہ پہنوں گی پوری نو گجی لونگی — اور

"بڑے تیرے کھسم کی کمائی ہے نا۔ — جو نو گجی دھوتی اور پھول لار چولی پہنے گی"

راجو نے منہ پھلا لیا۔

"دُلاری بھی تو پہنتی ہے — کتنی اچھی لگتی ہے"

"دلاری کی تجھے ریس ہے — وہ ہے بھی تو بارہ تیرہ برس کی۔ چار پیسے کماتی ہے"

راجو نے ماں کی چولی اُٹھا کر پرے کو ڈال دی — "خود تو ہر دیوالی پر نئی نئی سلواتی ہے" اُس نے غصہ سے ماں کی طرف دیکھا جو گھاس پر دھوپ میں پڑی اینڈ رہی تھی۔ پھر راجو ماں کے ننگے بدن کو تکنے لگی۔ پلپلا پلپلا پیٹ — کیسی موٹی ہے ماں — پھر اُس نے اپنے پیٹ کو دبا کر دیکھا — ذرا بھی تو نرم نہیں۔ اس کا جی چاہا کہ جا کر ماں کے نرم نرم پیٹ کو دبائے — پھر اس ڈر سے کہ ماں مارے گی اسکی ہمت نہ پڑی۔ وہ پھر اس کے ننگے بدن کو دیکھنے لگی۔ وہ گجراتن کیسی اچھی چولی پہنتی ہے۔ بڈھا گجراتی لاتا ہوگا — پر وہ تو بڑا غریب ہے — پھر اس کو ایسا معلوم ہوا جیسے وہ خود بھی ایک ننھی منی گجراتن ہے — پھولدار لہنگا، اور پولکا پہنے ہوئے — پولکے سے باہر تھل تھل کرتی ہوئی توند — جس میں چربی کی وجہ سے ناف کا نشان گہرے غار کی مانند دکھائی دے رہا تھا — اور یہ گجراتی — کھوسٹ — راجو گھبرا گئی — بڈھے گجراتی کی مار اس سے نہ دیکھی جاتی تھی۔ بڈھا تو ہے پر کیسا ڈر دکتا ہے — گالی دیتا ہوگا — پھر منشی اور ٹھیکیدار کی گالیاں ایک ایک کرکے اس کے ذہن پر چھانے لگیں۔ گالیاں تو اس کو سب یاد ہوگئی تھیں۔ وہ اکثر للتا اور دلاری کو دے بھی دیتی تھی۔ وہ کھیل کھیل میں منشی اور ٹھیکیدار بنتی اور اپنی ساتھ کی چھوکریوں کو خوب خوب گالیاں اُڑاتی — بڑی عجیب عجیب گالیاں، اُسے بعض وقت ان گالیوں پر ہنسی آتی۔ مگر اس کو کتنا بُرا لگتا جب وہی گالیاں اس کی ماں کو دی جاتیں — پر نہ جانے کیوں اُس کی ماں ذرا بھی تو بُرا نہ مانتی — چھوٹے بھیا تو اور بھی گندے ہیں، کیسی بُری بُری گالیاں دیتے ہیں اور اُس کی ماں بس ہنس دیتی، اس کا منہ لٹکتا اُٹھتا، وہ ہنستی ہی چلی جاتی۔ جبھی تو چھوٹے ٹھیکیدار نے ماں کا نام "پھلجھڑی" رکھا ہے۔ کل چھوٹے ٹھیکیدار نے ماں کو کتنی گالیاں دیں۔ پھر ذرا دیر بعد دیکھو تو خوب ہنس ہنس کر باتیں کر رہی ہے۔ اور شام کو تو ایسے خوش ہوئے کہ اپنا کمرہ بھی اس سے جھڑوایا۔ کتنی ہی دیر کواڑ بند کئے ایک ایک چیز ٹھیک کروائی۔ اور پھر وہ سوچنے لگی۔ آخر کمرہ جھڑواتے وقت چھوٹے ٹھیکیدار دروازہ کیوں بند کر لیتے ہیں — پھر جھاڑنے کی آواز بھی تو سُنائی نہیں دیتی اور نہ ماں کی ہنسی کی آواز آتی ہے۔ وہ سوچ میں پڑ گئی — ماں اتنی خاموشی سے

نہ جانے کیا کیا کرتی ہے؟ ان کواڑوں میں سوراخ بھی تو نہیں جو جھانک کر ہی دیکھتی ۔۔۔

راجو سوچتے سوچتے تھک گئی، اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا ۔۔۔ وہ یہ سب کیا دیکھتی ہے اور اس کے کیا معنی ۔۔۔ اور پھر مایوس ہو کر ماں کے پاس لوٹ لگانے لگی۔ آج نہ جانے کیوں اس کے دل میں عجیب طرح کی گدگدی اُٹھ رہی تھی ۔۔۔ سینے میں جیسے چیونٹیاں رینگ رہی ہوں۔ اور پھر وہ سرسراہٹ دھیرے دھیرے اُس کے سارے جسم میں سرایت کرنے لگی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں، جیسے کسی نے زہم زدہ گرم ہاتھ اس کے ہونٹوں پر رکھ دیئے ہوں۔ پر اس کو نیند نہ آئی۔ اس نے پھر آنکھوں کے پٹ کھولے، بند کیے، پھر کھولے اور بند کیے ۔۔۔ اس کی آنکھوں میں نیند نہ تھی ۔۔۔ اور پھر اُس نے سُنا ۔۔۔

"اری راجو ۔۔۔ اُٹھ تو ۔۔۔ دیکھ تیری ماں بھاگ گئی۔"

"ماں بھاگ گئی ۔۔۔ ؟"

"کہاں؟ ۔۔۔ ماں! ۔۔۔" اُس نے آنکھیں پھیلا پھیلا کر چاروں طرف دیکھا۔

"اری ۔۔۔ چھوٹے ٹھیکیدار بھگا لے گئے۔" پھر کیا تھا وہ تو پھاڑ سا منہ پھاڑ کر دہاڑنے لگی۔

"مت رو منحوسی ۔۔۔ چھوٹے ٹھیکیدار لے گئے ہیں۔ ابھی آجاویگی۔"

"چھوٹے ٹھیکیدار کیوں لے گئے ۔۔۔ وہ میری ماں کا کیا کریں گے؟"

"اری اُس نے نوراٹ[1] کر لیا ۔۔۔ جانے دے حرامجادی کو۔ تو ہمرے ساتھ چلیو ۔۔۔ مت رو۔"

اور پھر سب ہنس ہنس کر ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگیں۔

"او دو تریا ۔۔۔ بڑا حرامی ہے یہ منشی بھی ۔۔۔ دیکھو نا جھینا کو کیسا پھانس رکھا ہے۔ ویسے تو کھدر پہنتا ہے۔ بڑا سوراجی بنتا ہے ۔۔۔ اب تو جھینا ہی جھینا ہے، اُسی کا راج ہے۔ ہم کو تو کوئی منہ ہی نہیں لگاتا ۔۔۔ چھوٹے ٹھیکیدار بھی تو دیکھو ۔۔۔ جب بھی کوئی کام ہوگا تو جھینا ہی کو بلائیں گے۔"

"پھر کیا ۔۔۔" دوسری بولی "یہ کیسی نئی چولی پہن کر مٹک مٹک کر چلتی ہے۔"

کتنی دیر وہ یہی باتیں کرتی رہیں۔ مگر راجو ایک بات بھی نہ سمجھ سکی۔ اسکو تو ماں کی ریں ریں لگی ہوئی تھی۔

"کیوں ۔۔۔ مری جاتی ہے۔" راجو کی ماں نے ایک دھپ رسید کیا۔ اور اُس کی ریں ریں دھاڑوں میں بدل گئی ۔۔۔ "اتنی بڑی سنڈی کو روتے ہوئے لاج بھی تو نہیں لگتی۔" مگر راجو بجائے خاموش ہونے کے اور بھی فیل بھرنے لگی ۔۔۔

"لے پیسہ لے۔" اسکی ماں نے نیا نیا خولدار پیسہ اُس کی مٹھی میں ٹھونس دیا۔ وہ چُپ ہو گئی اور اُلٹ پلٹ کر پیسہ سے کھیلنے لگی۔

اسی ہماہمی میں راجو نے جنم لیا، اور اسی میں پل بڑھ کر تیرہ سال کی ہو گئی ۔۔۔ دھان کی سوئیاں پھوٹ رہی تھیں، جو ابھی چند دنوں بعد لہلہاتی ہوئی کھیتی میں تبدیل ہو جائے گی ۔۔۔ چاند اپنی چودھویں منزل پر پہونچ رہا تھا جس کے بعد ترقی کے منازل ختم ہو جاتے ہیں ۔۔۔ لیکن راجو وہ چاند تھی جو مکمل ہونے سے پہلے ہی گھٹنا شروع ہو جائے۔ تیرہ سال کی راجو بیس سال کی جوان عورت تھی جس کی جوانی، بھوک اور بیماریوں کے درمیان آتی ہی چلی گئی۔ اُس نے اپنے اردگرد کے ماحول کی بھی تو کچھ پروا نہ کی، مگر جوانی یہ کب دیکھتی ہے کہ کوئی اس کا استقبال کرنے کے لئے تیار بھی ہے یا نہیں۔ وہ تو بے دھڑک مدہوش چلی آتی ہے۔ لڑکھڑاتے ہوئے قدم، تھرتھراتے ہوئے جسم اور بوجھل آنکھیں اس کو خوش آمدید کہتی ہیں ۔۔۔ کس قدر نڈر ہوتی ہے یہ جوانی بھی، آندھی اور طوفان کے بیچ دندناتی چلی آتی ہے ۔۔۔ جیسے سمندر میں طوفان ۔۔۔ ہاں اسی طوفان میں راجو ایک ننھی مچھلی کی طرح تیر رہی تھی، دیکھتے دیکھتے وہ کیا سے کیا ہو گئی اب اس کو منشی اور ٹھیکیدار کی گالیوں میں لذت محسوس ہونے لگی ۔۔۔ وہ بگڑتا، ننگی ننگی گالیاں دیتا اور راجو اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہ جانے کیا ڈھونڈتی۔ اس کی اس دلیری پر دوسری چھوکریاں سہم سی جاتیں ۔۔۔

"کس قدر نڈر ہے یہ راجو، ڈرتی بھی تو نہیں۔ کہیں ٹھیکیدار مار بیٹھے۔ تو ۔۔۔" مگر راجو کے قہقہوں پر کوئی کنٹرول نہ تھا۔ رونا اور ہنسنا یہ تو اپنی مرضی ہے۔ اور راجو خوب جی بھر کر قہقہہ لگاتی۔

"بہت غصّہ آرہا ہے۔ کیوں ٹھیکیدار صاحب۔" اُس نے شرارت سے آنکھوں کی پتلیوں کو گردش دی، ٹھیکیدار مسکرا دیئے۔ اور چپکے سے اُس کے گال پر چٹکی لی "بڑی شریر ہے یہ راجو کی بچی ۔۔۔ چڑیل" ۔۔۔ مگر راجو جیسے قہقہوں میں بہی چلی جا رہی ہو۔

"کتنا ہنسے گی ۔۔۔" منشی یہ کہہ کر اُس کی چولی پر ہاتھ مارتا ہوا چلا۔

"دیکھ کے نہیں چلتے ۔۔۔ واہ یہ بھی کوئی بات ہے کہنیوں ہات مار دیتے ہو۔"

"چُپ حرامزادی۔" اور نہ جانے کتنی گالیاں اُس نے چلتے چلاتے سُنا دیں ۔۔۔

ہاں تو اَب راجو جان گئی تھی کہ ٹھیکیدار کی گالیوں پر ماں کیوں ہنستی تھی۔ اس کو بُرا کیوں نہ لگتا تھا۔ اور پھر ماں کا چہرہ کیوں تمتا اُٹھتا، اُسکے ہونٹ

---

[1] مرہٹی میں شوہر کو کہتے ہیں۔ صوبہ سی۔ پی میں عام طور سے یہ لفظ رائج ہے۔

کیوں کانپتے تھے۔ اور ایک عجیب سی ہنسی جو اُس نے بہت بچپن میں ماں کے ہونٹوں پر دیکھی تھی وہ آج اس کی آنکھوں میں رقص کر رہی تھی، ہم سب ایک ہی منزل پہ چلتے ہیں۔ سماج کے بنائے ہوئے راستے پر، صاف چکنا راستہ ــــ جسکے اِدھر اُدھر کانٹے بچھا دیتے ہیں کہ نئی راہیں تراشی نہ جاسکیں۔

راجو نے اپنی ماں پر نظر ڈالی جس کی آنکھوں میں نہ جانے کتنی مایوسیاں جذب ہو چکی تھیں۔ جیسے یہ ہونٹ مسکراہٹ کو ترس گئے ہوں۔ جیسے ان گالوں نے کبھی ہنس کر حلقے نہیں بنائے۔ جو سدا آج کی طرح بے رس رہے ہیں ــــ،

چھوٹے ٹھیکیدار نے راجو کی طرف دیکھا اور پھر اُس کی ماں کو ــ

”راجو کی ماں جا مشی کو بھیج دے“ ــــ اور وہ گردن جھکا کر چل دی۔ مگر پھر اس نے ایک نظر چھوٹے ٹھیکیدار پر ڈالی، جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ رہی ہو ــــ

”ہاں بھیا، اب ان نینوں کی مدرا میں کوئی نشہ نہیں رہا ــ اَب تو یہ مدرا راجو کی نینوں میں بھری ہوئی ہے“

”راجو کدھر گئی چل تو“

اور راجو مسکراتی، اٹھلاتی اس کے ساتھ ہولی ــ جیسے چڑھتا ہوا سورج ــ مگر شام ابھی بہت دُور ہے۔ بادل کے ٹکڑوں نے سورج کو تاک لیا اور دشمن کی طرح اس پر ٹوٹ پڑے۔ اندھیارا ــ بادلوں کی جیت ہوئی اور سورج ہار گیا ــــ بڑا مغرور بنتا تھا یہ سورج ــــ آج دیکھتے ہی دیکھتے اس کی جوانی لُٹ گئی ــــ آکاش کے تارے پردے کے پیچھے سے یہ منظر دیکھتے ہی رہ گئے۔

اندھیرے بھاگ میں پورے نو مہینے بعد راجو کی گود میں ایک ننھی مُنی راجو آگئی۔ اُس کی مانگ میں سیندور نہ تھا مگر اس کی گود بھری تھی، اور راجو کی آنکھیں جیسے مینہ برستے برستے تھما ہو ــــ انسانیت کا ایک چھوٹا پیغمبر جس کو پناہ دینے کے لئے کوئی تیار نہیں ــــ معصیت کا مجسمہ ــــ تہذیب تمدن کی بجھتی ہوئی شمع ــــ چھوٹی راجو چیخ رہی تھی ــــ سرمایہ اور تہذیب کے اُن دیکھے خداؤں کے حضور میں ــ

اُس کی ماں زمین پر بیٹھی سامنے پڑی ہوئی بچی کو گھور رہی تھی ننھا سا گوشت کا سُرخ سُرخ لوتھڑا ــــ اب سے چودہ سال پہلے کی راجو اُسکے سامنے تھی ــــ ایسے اندھیرے بھاگ میں چراغ کی تھرتھراتی ہوئی روشنی میں ننھی راجو نے جنم لیا تھا اور اب سے چودہ سال بعد یہ ننھی راجو بھی ــــ جیسے خیالات کے غبارے نکل نکل کر ہوا میں بہہ رہے ہوں۔ اندھیرے میں چراغ کی لو کانپ رہی تھی ــــ اُجیالے کی گود میں اندھیارے نے جنم لیا ــــ

اور اب دھرتی اور آکاش اندھیارے کے چرنوں پر سر جھکائے تھے ــــ نہ جانے کب تک سماج کے ان صاف راستوں پر اسی طرح کتنی ہی راجو ایسے ہی اندھیرے بھاگ میں جنم لیتی رہیں گی ــــ چاند چودھویں منزل پر پہونچ کر سدا ڈھلتا ہی رہے گا۔ آکاش پر کبھی اندھیارے کی حکومت ہوگی کبھی اُجیالے کی۔ پر چاند تو اپنی راہوں پر چلتا ہی رہے گا۔ ــــ کون جانے یہ وہی چاند ہے یا دوسرا ــــ چاند اور راجو کا یہ لامتناہی سلسلہ خدا جانے کب ختم ہوگا ــــ؟

شیطان

(بسلسلہ صفحہ ۲۹۲)

مطالعہ کس درجہ عمیق ہے! تو نے اپنی قوت ادراک سے میرے وجود کا وہ سبب ظاہر کیا ہے، جو میں اس سے پہلے نہیں جانتا تھا۔ اب کہ ہم میں سے ہر ایک ان فطری اور لاہوتی اسباب کی حقیقت کو پا گیا ہے، جو ہماری آفرینش اوّل کے بھی ضامن تھے اور اس نشاۃ ثانیہ کے بھی! ہمیں یہاں سے چلنا چاہیئے!! آ! بھائی میرے قریب آ، اور مجھے اُٹھ کر اپنے گھر لے چل! مجھ میں بوجھ بالکل نہیں ہے ــــ آہ! رات نے اپنا سیاہ پردہ چھوڑ دیا، جبکہ مَیں اپنے جسم کے تقریباً آدھے خون سے اس وادی کے پتھروں کو رنگین کر چکا ہوں“

سمعان پادری نے اپنی آستینیں کہنیوں تک چڑھالیں اور عبا کے دامن کو سمیٹ کر پیٹی سے کس لیا، اس کے بعد وہ شیطان کے پاس گیا اور اُسے اپنی پیٹھ پر لاد کر سڑک کا راستہ لیا۔

ان پُر سکوت وادیوں میں، جن کے چہرے پر رات کی سیاہ نقاب پڑی تھی، سمعان پادری اپنی پیٹھ پر ایک برہنہ جسم کو لادے گاؤں کی طرف جا رہا تھا جس کے زخموں سے خون نے بہہ بہہ کر اُس کی ڈاڑھی اور سیاہ کپڑوں کو دھبے دھبے کر دیا تھا“

(جبران خلیل جبران)

کلیاں:- عصمت چغتائی نے طنز نگاری میں ایک نئی شاہراہ خیال اختیار کی ہے جو نہایت دلکش اور حد درجہ مؤثر ہے۔ کلیاں عصمت چغتائی کے سولہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ مضامین ملک کے مقتدر رسائل میں شائع ہو کر خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ قیمت تین روپے!

ابوسعید قریشی

قصہ پانچویں درویش کا — سیر

(میرامّن کی رُوح سے معذرت کے ساتھ)

حیدرِیم، قلندرِ مستم!

اے صاحبو!

کل رات میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ میں کس طرح اپنا وطن چھوڑنے پر مجبور ہوا۔ لیکن شاید مجھے اُس جگہ کے لئے جہاں میں پیدا ہوا تھا وطن کا لفظ نہیں استعمال کرنا چاہئے ——— دراصل قلندر جہاں بھی ڈیرے ڈال دیتا ہے وہی اُس کا وطن ہے۔ سقفِ نیلوفری کے سائے میں پھیلی ہوئی یہ وسیع دُنیا اُس کی جولانگاہ ہے جس کے مختلف حصّوں کو چند سہولتوں کی خاطر الگ الگ نام دے دئے گئے ہیں۔ آج کی صحبت میں انہیں کا ذکر رہے گا۔

سب سے پہلے اُس سرزمین کا حال سُنئے جسے لوگ 'کنجنک طلائی' کہتے ہیں! یہاں قدرت نے جھولیاں بھر بھر کر خزانے لٹائے ہیں۔ گندم کے کھتّے، سونے کے ڈھیر، نیلم کی کانیں، صندل کے جنگل، زعفران کے کھیت۔ غرض کوئی چیز ایسی نہیں جس کی یہاں فراوانی نہ ہو۔ لیکن آپ کو یہ سُن کر حیرت ہوگی کہ اس پر بھی یہاں کے لوگ فاقوں مرتے ہیں اور بہتوں کو تو مرنے کے بعد کفن تک نصیب نہیں ہوتا۔ دراصل اپنے جسم کی بجائے انہیں اپنی آتما کا زیادہ فکر ہے اور وہ خود کو ساری دُنیا کی مصیبتوں سے مکت کر لینا چاہتے ہیں۔

جن دنوں میں اس ملک کی حدود میں داخل ہوا وہاں ایک نیم مستور انسان کا بہت چرچا تھا۔ اُس کا نام تو میرے ذہن سے اُتر گیا ہے۔ لیکن اس کا مطلب تھا فوق البشر ——— یہ شخص ہڈیوں کا ڈھانچ تھا اور اُس نے اپنے نفسِ امارہ کو کچھ اس طرح مارا تھا کہ اپنی بیوی کو بھی ماں کہنے لگا تھا۔ اس کے بہت سے ہم وطن اسے پیغمبر سمجھتے تھے۔ اس کی قوتِ ارادی اور روحانیت کا یہ عالم تھا کہ دنوں اناج کو نہ چھوتا۔ ایک بار اُس کی حاکمِ وقت سے چل گئی اور اُسے زندان میں ڈال دیا گیا۔ اس پر اس نے اعلان کر دیا کہ وہ بطورِ احتجاج تادمِ آخریں برت رکھے گا اور اناج کو نہ چھوئے گا۔ اور اس دھمکی کو سچ کر دکھایا۔ بیس روز تک وہ صرف انگوروں اور سنتروں کے رس پر جیتا رہا۔ چنانچہ حاکم نے مجبور ہو کر اُسے رہا کر دیا۔ لیکن فوق البشر اپنی ہٹ کا پورا تھا اُس نے رہائی کے بعد بھی حکومت کی مخالفت جاری رکھی۔ اور ایک دن جب اور کچھ نہ سوجھا تو سوت کاسنے کا ہی چلا دیا۔ اس کے مُریدوں کے گھروں میں چرخے کی گھمر گھمر سنائی دینے لگی۔ اور میں نے دیکھا کہ لوگ باگ سوت کی انٹیاں لئے بازاروں میں گھوم رہے ہیں ——— میں نے ایک راہگیر سے پوچھا کہ بھائی یہ کیا مسخرہ پن ہے؟ جواب ملا، میاں اس میں کوئی سیاسی مصلحت پوشیدہ ہے۔ میں نے کہا میں بھی تو جانوں۔ اس پر راہگیر نے کہا کہ میاں تم اپنی راہ لو، تمہیں سیاست سے کیا کام۔ اب سوچتا ہوں کہ شاید وہ سچ ہی کہہ رہا تھا۔ قلندروں کو سیاست سے کیا کام، وہ تو بس یہی جانتے ہیں کہ جو کام کرنا ہو کر گزرو۔ اور اُس وقت میرے پیشِ نظر صرف ایک کام تھا ——— سیر۔ قیام سے میرا جی اُلجھتا ہے۔ چنانچہ چلتا چلتا ایک دن میں ایک ایسے علاقے میں پہونچا جو دو ملکوں کی سرحد ہے۔ یہاں کے لوگوں کو میں نے دیوانگی کی حد تک مہمان نواز پایا۔ آپ کو یہ سُن کر تعجب ہوگا کہ فقیر کو اپنے یہاں مہمان ٹھہرانے کے سلسلہ میں دو چچیرے بھائی ایک دوسرے کو مرنے مارنے پر اُتر آئے۔ دونوں مجھے مسجد میں ملے تھے۔ اور ان میں سے ہر ایک اس بات پر مُصر تھا کہ میں اُس کی دعوت قبول کروں۔ میں نے جب دیکھا کہ بات بڑھ رہی ہے تو اسی میں خیریت جانی کہ دونوں میں سے کسی کے یہاں بھی نہ جاؤں اور مسجد ہی میں پڑا رہوں۔ خون خرابہ تو نہ ہوگا۔ لیکن شاید ان لوگوں کو مہمانوں کی خوشبو آجاتی ہے۔ دو میزبان ابھی گئے ہی تھے کہ دس اور موجود۔ آخرکار بہت لے دے کے بعد فیصلہ یہ ہوا کہ قرعہ اندازی کی جائے اور جتنے دن میں وہاں ٹھہروں باری باری سبھوں کے یہاں کھانا کھاؤں۔ بات یہاں تک رہتی تو خیر تھی۔ لیکن وہاں ایک اور مصیبت آئی۔ کہ بھوک نہ ہو تو بھی کھاؤ اور ٹھونس ٹھونس کر کھاؤ ورنہ میزبان ناراض۔ اُن کا خُلوص میرے لئے وبالِ جان بن گیا۔ اور میرا ہاضمہ کچھ ایسا بگڑا کہ دنوں صاحبِ فراش رہنا پڑا۔ .... اس علاقہ کے لوگوں میں کچھ بُرائیاں بھی میرے دیکھنے میں آئیں۔ چند سیمیں سکّوں کے عوض انہیں آسانی سے خریدا جا سکتا ہے اور ایک برّہ کی خاطر یہ کسی انسان تک کا خُون بہانے تک کو تیار ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ لوگ اُس خوفناک علتِ غیر فطری میں مُبتلا ہیں جس کی وجہ سے قومِ لوط پر عذابِ الٰہی نازل ہوا تھا۔

اس خطرناک خطّے کے جنوب میں ایک اور علاقہ ہے جس کے باشندوں کی یک رخی شبیہ مثل کلہاڑے کے ہوتی ہے۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ یہ لوگ اُن غداروں کی نسل سے ہیں جنہوں نے ایک جواں سال فاتح کے خوابوں کو چکنا چور کر دیا تھا ——— اپنے بزرگوں کی میراث اُن میں اب تک چلی آتی ہے۔ اور آج بھی وہ اسی بے تکلفی اور بے حیائی سے ضمیر فروشی کرتے ہیں ——— یہ علاقہ ٹھیٹ قسم کی طوائف الملوکی کا آئینہ دار ہے۔ جہالت یہاں کی خصوصیت امتیازی ہے۔ یہاں کے

[illegible] بڑے زمینداروں کو میں نے دیکھا ہے لیکن مگر کیا یہ بخشا . . . . وہ تک نہیں جانتے۔ شاید وہ ہمیشہ کے لئے حرص وہوا کی کمندوں میں اسیر رہنا چاہتے ہیں۔ گھوڑ سواری، نیزہ بازی، کتوں اور شکروں سے شکار اور اپنے کارندوں کی بہو بیٹیوں کی عزت پر ڈاکے ڈالنا ان لوگوں کے مشاغل ہیں۔

اس دیس سے نکل کر میں ایک ایسی سرزمین میں پہونچا جہاں قدرت نے [illegible] کھول کر جادو جگائے تھے اور چپے چپے پر ایسے جال بچھائے تھے کہ دل انسان کا [illegible] نہیں جا سکتا تھا ـــــ گاؤں گاؤں پرستان، نگر نگر طلسمات، [illegible] جائے تو لذت [illegible] جدھر آنکھ اٹھتی تھی حوروں کے جمگھٹے، پریوں کے پرے اور مغبچوں کے مجمعے دکھائی دیتے تھے۔ یہ درویش ہر قدم پر اپنے ایمان کی سلامتی [illegible] ان صورتوں [illegible] عشق کر [illegible] آسمان [illegible] بہونچ گئی ہے۔

[illegible] گیا اور ایک راہگیر سے پوچھا کہ بھائی [illegible] تم ہوش میں ہو یا خواب میں؟ جواب ملا یہ دس دریاؤں کی سرزمین ہے اور [illegible] ہو۔ اور [illegible] کا ثبوت دینے کے لئے اس نے میرے کان پر [illegible] کر احساس سے خود مجھے بھی یقین آ گیا کہ میں واقعی جاگ رہا ہوں اور خفیفت سے دوچار ہوں۔ اتنے میں راہگیر تو چلا گیا اور میں یہ سوچنے لگا کہ جب سرزمین کے عام لوگ [illegible] ہیں تو وہاں کے شاہی خاندان کا [illegible] کا کیا عالم ہوگا۔ اتنے میں [illegible] کیا دیکھتا ہوں کہ میرے سامنے [illegible] کھڑا ہے۔ اُن کی دستاروں کے طرّے آسمان سے باتیں کر رہے ہیں [illegible] چہروں پر نقابیں ہیں۔ لیکن اُن کی مغرور مونچھیں نقابوں سے [illegible] اُن کے سالار نے چھوٹتے ہی مجھ پر گالیوں کی بوچھاڑ کی اور کہا کہ تمہیں [illegible] ملکۂ [illegible] قاہر شاہ کے حرم محترم [illegible] بارے میں بے [illegible] سوچنے کے [illegible] گرفتار کیا جاتا ہے ـــــ یہ سب کچھ آنکھ کے پلکارے میں ہوا۔ یہ بات کبھی [illegible] گمان میں بھی نہ آ سکتی تھی کہ کسی مہذب ملک میں سوچنا تک [illegible] ہے۔ کوئی اور ہوتا تو یقیناً گھبرا جاتا لیکن قلندر اپنی زندگی میں اتنے صدمے سہہ چکا ہے کہ تھوڑے کھیلتے کبھی پریشان نہیں ہوتا۔ چنانچہ میں نے اپنی گرفتاری کا حکم نامہ دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس پر مجھے گالیوں کی ایک اور باڑھ ماری گئی۔ اور دوستو، کیا بتاؤں کہ وہ کیسی گالیاں تھیں۔ میرا خیال ہے کہ انہیں سُنکر شاید خود شیطان الرجیم بھی [illegible] ۔ خیر جب گالیوں کا طوفان تھما تو مجھے بتایا گیا کہ دس دریاؤں کی سرزمین میں [illegible] کرنے کے لئے حکم ناموں کی ضرورت نہیں۔ ظاہر ہے کہ ایک آزاد منش [illegible] یہ ایک نہایت ہی ظالمانہ حرکت تھی جس کے خلاف احتجاج ضروری تھا [illegible] ہمت نہ ملی۔ ایک برق انداز نے لپک کر میرے منہ میں کپڑا [illegible] مجھے کسی بقچہ کی طرح اٹھایا اور ایک پرانے قلعہ میں لا کر قید کر دیا گیا جہاں پہلے ہی کئی زندانی موجود تھے۔ سخن گو، داستان نویس اور فلسفی قسم کے انسان جو آزادی بیگم نامی ایک حسینہ کے عشق کا دم بھرتے تھے حالانکہ بادشاہ [illegible] اپنے [illegible] وقف کر رکھی تھا۔ کچھ لوگ ایسے بھی جو قانون فحاشی کی زد میں [illegible] وضاحت چاہی تو مجھے بتایا گیا کہ [illegible] عورتوں اور مردوں [illegible] اور [illegible] مکان نہیں بلکہ گوشت پوست کی [illegible] حقیقی [illegible] ہیں جس کا دل جذبات [illegible] کا مسکن ہے۔ [illegible] خواہشوں کی طرح اور بھی کئی خواہشیں موجود ہیں جب میں [illegible] اور [illegible] انسانیت بھی ہے اور حیوانیت بھی . . . اور ان [illegible] کھری کھری باتیں لکھ جاتے ہیں۔ اور ان بھیدوں کو جاننے کی [illegible] بعض لوگ [illegible] کو [illegible] ہے۔ اور ان [illegible] پارسائی کے [illegible] نہ سکیں [illegible] تاکہ وہ [illegible]

[illegible] طبقہ کے علاوہ [illegible] بوسیدہ [illegible] زندگی [illegible] اب [illegible] خطا کیا تھا [illegible] مجھے معلوم ہو رہا تھا کہ [illegible] ہوئے [illegible] نہ اٹھا [illegible] ۔ [illegible] کو [illegible] ہوئے مر جاؤ۔ اس میں یہ سوچنے لگا کہ اس [illegible] یہ مثل مشہور ہے کہ جو لوگ اپنی مدد آپ کرتے ہیں خدا بھی اُن کی مدد کرتا ہے [illegible] خیال کے آتے ہی میں نے اپنے ذہن کو [illegible] ہونا شروع کیا اور بہت رات گئے تک سوچتا رہا [illegible] کروں [illegible] فیصلہ نہ کر سکا۔ آخر [illegible] کا ارادہ کیا [illegible] کے نیچے رکھتا ہوں تو کانوں کی بالیاں تھیں اور مجھے یاد آ گیا کہ ان بظاہر موٹی موٹی اکان بھاڑ بالیوں کے بیچ ہیرے پوشیدہ ہیں۔ ایک بار ہمالہ کی برف پوش بلندیوں پر میری ایک ہندو جوگی سے ملاقات ہوئی تھی جس نے نہ جانے کس بات سے خوش ہو کر وہ بالیاں میرے کانوں میں ڈال دی تھیں اور کہا تھا کہ جا تیرے کام آئیں گی۔ ان کے اندر ہیرے پوشیدہ ہیں۔ اُس رات کال کوٹھری میں جوگی کے یہ الفاظ میرے کانوں میں گونج اُٹھے۔ میں نے کانوں سے بالیاں اتاریں اور ان کے کھلے حصّوں کو ہتھیلی پر اُلٹ دیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے روشنی کے چند قطرے منجمد ہو کر تاریکیوں کی گود میں گر پڑے ہوں۔ انہیں دیکھ کر داروغۂ زنداں کی آنکھیں چوندھیا گئیں اور چند دم [illegible] میں قلعہ کے باہر تھا۔ نیلے نیلے آسمان اور ہرے بھرے کھیتوں کو دیکھ کر میں نے اپنے خالق کا شکر ادا کیا اور میرے پاؤں پھر کسی نئی منزل کی تلاش میں

اُلجھے اور سفر کی صعوبتیں سہتا ایک روز میں ایک ایسے شہر میں پہونچا جو ایک صنّاع شہنشاہ کی سلطنت کا دارالخلافہ رہ چکا تھا۔

جس طرح ذبح ہونے کے بعد بھی بکرے کے اعضا کافی عرصہ تک پھڑکتے رہتے ہیں بعینہ اسی طرح کسی معاشرت کی موت کے بعد اُس کا بالکل کچھ دن تک پھڑکتا رہتا ہے۔ اس شہر میں مجھے کچھ ایسی ہی کیفیت کا احساس ہوا۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے وہاں کا ہر ذرہ دھڑک تو رہا ہے لیکن اسے دھڑکانے والی طاقت ختم ہو چکی۔ وہ شہر ایک ایسی تہذیب کی لاش تھی جس میں کبھی مشرق کا ناز تھا اور جو اب الگ دھڑک رہی اس زندگی کو پتہ دے رہی تھی جو اس کی موت کا باعث بنی تھی۔ —— یہاں میں نے مردوں کو عورتوں کی طرح رنگ برنگ کے کپڑے پہنے بازاروں میں اٹھلاتے دیکھا۔ آنکھوں میں سرمہ کی سیاہی، ہونٹوں پہ پان کی لالی، کان میں عطر کی پھریری، ٹھمک کے چلتے ہیں، ٹھہر ٹھہر کے بات کرتے ہیں، لفظ لفظ پر کورنش، فقرے فقرے پر آداب۔ اُن کی ہر ادا سے اور نکلتی ہر اور ہر سانس پدرم سلطان بود پکار رہا ہے ——

شاعری یہاں کسی متعدی بیماری کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ یہاں کے بقال اور کنجڑے بھی سخن فہمی اور سخن گوئی کے دعویدار تھے۔ ہر قدم پر مجھے تیرِ مژگاں کے شہید اور تیغِ ابرو کے گھائل نظر آئے لیکن کوئی تیر انداز دکھائی دیا نہ تیغ زن۔ بت سادہ نظر آیا نہ [illegible]

اس شہر میں ایک عجیب و غریب مزار بھی میرے دیکھنے میں آیا۔ معمر سفید ریش مجاور اپنی داڑھیوں سے اس مزار کو صاف کرتے ہیں اور سیاحوں کو اس کا حال بتاتے ہیں جو اس کے اندر دفن ہے۔ بادشاہوں کی داشتہ، بیگمات کی منہ چڑھی، رئیسوں کی محبوبہ اور رشکِ عروس کی معشوقہ، اُس کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ حوضِ کوثر سے نہا دھو کر دنیا میں آئی تھی۔ کتبہ پر نستعلیق حروف میں "زبان بائی" کے الفاظ کندہ ہیں۔

اس مزار کے علاوہ اس شہر کی سب سے مایہ ناز چیز ایک مسجد ہے اور میرا خیال ہے کہ اس پر جتنا بھی فخر کیا جائے کم ہے۔ میں دنیا کا کونہ کونہ گھوم چکا ہوں لیکن فنِ تعمیر کا ایسا نمونہ میرے دیکھنے میں نہیں آیا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اُسے انسانوں نے نہیں جنوں نے بنایا ہے اور پریوں نے اُس کی نوک پلک نکالی ہے۔ اُسے دیکھ کر تو ایک بار برہمن کا بھی نماز پڑھنے کو جی چاہے۔ لیکن آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ فنِ تعمیر کے اس عظیم الشان شہکار کی سیڑھیوں پر کبابیوں اور کباڑیوں کی دکانیں نظر آ رہی ہیں۔ یہ کریہہ منظر دیکھ کر ایک روز مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے ایک نمازی سے پوچھا کہ بھائی تم لوگ ان دکانوں کو یہاں سے اٹھوا کیوں نہیں دیتے۔ جواب ملا۔ دکانیں اٹھ گئیں تو مسجد کے متولی رنگ رلیاں کیسے منائیں گے۔ اسی شخص کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ مسجد کے متولیوں نے مسجد کے نام پر بازارِ حسن میں بھی کچھ جائداد دیکھی ہے جس کا کرایہ وہ خود جاکر وصول کرتے ہیں —— یہ باتیں سن کر میرا جی اُس شہر سے اسقدر بیزار ہوا کہ پل بھر کو بھی رکنا وہاں ناگوار ہوا اور شہر بہ شہر ہوتا ہوا میں جادوگروں کے دیس میں پہونچا۔

اور دوستو، کیا عرض کروں کہ ان دو آنکھوں نے وہاں کیا کیا نہ دیکھا۔ بال دیکھے اتنے گھنے اور اتنے لمبے کہ عورت کا جسم اُن میں چھپ جائے، اور منہ پر سے [illegible] بھی یہ نہ جان سکے کہ ان کے نیچے کیا ہے۔ گال دیکھے جن کی ملاحتیں کسی سادھو کے سرو سمر میں بھی کام کی اگنی سلگا دیں۔ نین دیکھے جن میں ساون کی مدماتی راتوں کے رومان سوتے ہیں، جن میں دنیا بھر کی مدہوشی کا نشہ ہے اور جنہیں دیکھ کر جیون بھر کے جاگے ہوئے تپسوی کو بھی نیند آ جائے۔ بادل دیکھے جو مانند دھنکی ہوئی روئی کے تھے۔ برکھا دیکھی جیسے موتیوں کی چیت۔ پنچھی دیکھے جن کے پروں میں قوسِ قزح کے پیوند لگے تھے۔ پھول دیکھے جن کے سترنگے کٹوروں سے روح کو مدہوش کرنے والی خوشبوئیں اٹھ رہی تھیں۔ قصہ مختصر رنگ اور روپ کا ایک دریا بہہ رہا تھا جسے دیکھ کر مجھ جیسے جہاں گرد کا بھی دل ڈول گیا۔ سمجھا کہ شاید میری منزل آ گئی لیکن مقدر کو کچھ اور ہی منظور تھا —— اس خواب آور سرزمین کے مشرق میں ایک اور ملک ہے جس کے بادشاہ کے سر میں بیٹھے بٹھائے جہاں گیری کا سودا سمایا اور اُس نے جادوگروں کے دیس پر حملہ کر دیا۔ کہتے ہیں کہ مصیبت کبھی اکیلی نہیں آتی۔ اُدھر دشمن سر پہ پہونچا اور اِدھر قحط نے سر نکالا۔ بیماریاں بیدار ہوئیں اور خلقتِ خدا کی وبا زدہ چوہوں کی طرح مرنے لگی۔ اتنے میں خبر پھیلی کہ راجدھانی میں کروڑوں من اناج موجود ہے۔ چنانچہ بھوکے اور بے کس انسانوں کے کارواں اُمید کا آسرا لئے راجدھانی کی طرف بڑھے۔ سرِ راہگذار پر کینچوں کے کینچے رینگتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ گرتاں و گریاں، افتاں و خیزاں، روٹی کی امید میں بڑھتے ہوئے قافلے —— لیکن جو ہونا چاہئیے وہ ہوتا ہی کب ہے۔ وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔ انہی دنوں وہاں کے امیروں کے دل میں اور بھی امیر بننے کا خیال آیا اور دیکھتے دیکھتے سارا غلّہ چھو منتر سے غائب ہوگیا —— بندگانِ خدا سسک سسک کر مرنے لگے، زمین کے چپہ چپہ سے آہ و بکا کی ایسی صدائیں بلند ہوئیں کہ پہاڑ پگھل پڑیں، زمین شق ہو جائے اور آسمان کے سینے میں شگاف پڑ جائیں۔ لیکن وائے انسان کہ اُس کی آنکھ پرنم نہ ہوئی، اُس کا دل نہ پسیجا —— امیروں کی آنکھوں پر دولت کے پردے پڑے ہوئے تھے، وہ دیکھ نہیں سکتے تھے۔ حکام کے کانوں میں سونا ٹھونس دیا گیا تھا وہ سن نہیں سکتے تھے۔ ضمیر کی آواز "کہ عالم دوبارہ نیست"، کے نعروں میں دب چکی تھی، اُس کی سنتا ہی کون ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ کوچہ و بازار، شہر اور دیہات لاشوں سے پٹ گئے اور میں نے

ان آنکھوں سے دیکھا کہ لاوارثوں کو کتے کھا رہے ہیں اور گدھ ان کے گرد بیٹھے ضیافتیں اڑا رہے ہیں ——— انہی دنوں کا ذکر ہے، ایک شب جب آسمان سے سرمہ برس رہا تھا اور راجدھانی کسی بیوہ کی طرح سیہ پوش نظر آ رہی تھی، میں نے اس کے کوچہ و بازار میں گشت کرنے کا ارادہ کیا اور ان جانی راہوں پر لاوارثی لاشوں سے ٹھوکریں کھاتا ہوا نہ جانے کہاں سے کہاں نکل گیا۔ اتنے میں نغمہ و سرود کی صدائیں میرے کانوں میں پڑیں۔ اس پر میری حیرت کی انتہا نہ رہی اور میں یہ جاننے کے لئے بے تاب ہو گیا کہ وہ کون سنگدل انسان ہے جو اس ماتم کدہ میں رقص و سرود سے دل بہلا رہا ہے۔ اور میں نے اپنے دل میں ٹھان لی کہ جب تک اس بھید کو نہ پالوں گا دم نہ لوں گا۔ چنانچہ میں کانوں کے بتائے ہوئے راستہ پر چلتا ہوا ایک عظیم الشان حویلی کے سامنے رکا جس کے دروازے پر دو دربان چمکتے ہوئے کٹارے ہاتھوں میں لئے پہرہ دے رہے تھے ——— کہتے ہیں 'بو بیدہ یا بندہ' ——— معلوم ہوا کہ وہ علاقہ شہر کے رؤسا اور ملک کے حکام کا مسکن ہے۔ اور وہ حویلی ایک بہت بڑے سوداگر کی نشاط گاہ ہے جس کی جادوگروں کے دیس کے مہامنتری سے گاڑھی چھنتی ہے۔ وہ منتری دیہاتی دوشیزاؤں پر دم دیتا ہے۔ چنانچہ اس کے دوست سوداگر کے گرگے کچھ "مال" گھیر کر لائے ہیں اور حویلی میں رت جگے کا انتظام ہے۔ رات بھر امیری غریبی سے لطف اٹھائے گی اور صبحدم دونوں کچھ اس ادا سے جدا ہوں گے جیسے کبھی ایک دوسرے سے کوئی سروکار ہی نہ تھا ——— اور دربانوں نے کہا: "ہر شب یہاں یہی ہوتا ہے" ——— راجدھانی کے اس علاقہ کی سیر کرتے وقت مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں کسی اور ہی دنیا میں گھوم رہا تھا۔ جہاں نہ بھوک تھی نہ عریانی، نہ بیماری تھی نہ موت ——— لیکن محلوں اور ماڑیوں کی اس دنیا سے نکل کر مجھے پھر اُن دبکے ہوئے ڈربوں سے دوچار ہونا تھا جنہیں دیکھ کر یہ گمان ہوتا تھا کہ شاید یہاں ڈھور ڈنگر رہتے ہوں گے۔ حالانکہ وہ اُن اَن گنت انسانوں کے گھر تھے جن کے لہو پسینہ سے محلوں اور ماڑیوں کی تعمیر ہوئی تھی۔

بلندی اور پستی کا یہ تضاد دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں خدا کی خدائی سے منحرف ہو رہا ہوں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ایک اور خیال میرے ذہن میں آیا۔ کوئی میرے کانوں میں کہہ رہا تھا ——— "قلندر تجھے کیا۔ جہاں 'تیرا' ہے یا 'اُس' کا۔ اس کے بنانے والے کو آپ ہی اس کی فکر ہوگی۔ تو کیوں مفت میں دبلا ہوا جاتا ہے۔ تیرے لئے تو بس یہی کافی ہونا چاہیئے کہ 'تو ہے' اور بس۔ اگر کسی اور کو زندگی سے شکایت ہے تو وہ اس کے بارے میں خود سوچے ..... "

اِن ہی خیالات میں مگن نہ جانے میں کہاں سے کہاں نکل گیا۔ دفعتاً پاؤں کسی نرم چیز کے ساتھ مس ہوئے۔ جھک کر دیکھا تو ایک نومولود بچے کی لاش تھی۔ ہاتھوں سے زمین کھود کر اُسے دفن کیا اور اُس کی موت کے بارے میں قیاس آرائیاں کرتا ہوا آگے بڑھا۔ اتنے میں مشرقی اُفق پر ایک ہلکی سی روشنی نمودار ہوئی اور دور کہیں دھندلکوں کے دامن سے ناقوس اور اذان کی آوازیں اُبھریں۔ یہ آوازیں کچھ اس خوبصورتی سے ایک دوسرے میں تحلیل ہو رہی تھیں جیسے بندوں کی بپتا دیکھ کر خداؤں کی آپس میں صلح ہو گئی ہو۔ اس وقت میرے جی میں آئی کہ ما تھے پر چندن کا ٹیکہ لگا کر کسی مندر میں نماز ادا کروں۔ لیکن اس خوبصورت خواہش کا وہی حشر ہوا جو اکثر خواہشوں کا ہوتا ہے۔ ایسی آرزوئیں پوری ہونے کے لئے نہیں ہوتیں۔ اور میں اس حسین خیال سے ایک قسم کا ذہنی لطف اٹھا کر ہی مطمئن ہو گیا ——— اس مسرت کا اثر آج تک قائم ہے۔ اس بات کو ایک عرصہ گزر چکا ہے لیکن اب بھی رات کے سناٹے میں جب میں اپنے تجربات کا جائزہ لیتا ہوں تو اُمید کی ایک ننھی سی کرن میرے ذہن میں جاگ اُٹھتی ہے اور مجھے یوں محسوس ہونے لگتا ہے کہ کبھی نہ کبھی میری یہ حسین خواہش پوری ہو کر رہے گی۔ اور انسانیت کے درمیان نفرت اور نفاق کی جو کھائیاں نظر آ رہی ہیں ایک روز پٹ جائیں گی۔

'اور اے یاراں اب میں آپ سے اجازت چاہتا ہوں۔ میرے کشکول میں کہانیاں تو بہت ہیں ——— آپ بیتیاں بھی اور جگ بیتیاں بھی، اگر چاہوں تو ساری عمر داستان گوئی کرتا رہوں لیکن وہ دیکھئے، مشرقی اُفق پر ایک پُراسرار روشنی نظر آ رہی ہے۔ اور وہاں دودھیا گنبدوں اور سنہرے کلسوں کے پیچھے سے ابھی ایک دمکتا ہوا کرہ نمودار ہوگا جس سے سارا عالم بقعہ نور بن جائے گا۔ ایسے میں قلندر بیکار نہیں بیٹھ سکتا۔ کوئی نامعلوم منزل اُسے اپنی طرف بلا رہی ہے۔ اُسے جانا ہے۔ قسمت میں ہوا تو پھر ملاقات ہوگی۔ یار زندہ صحبت باقی ——— حیدریم، قلندرم، مستم ..... '

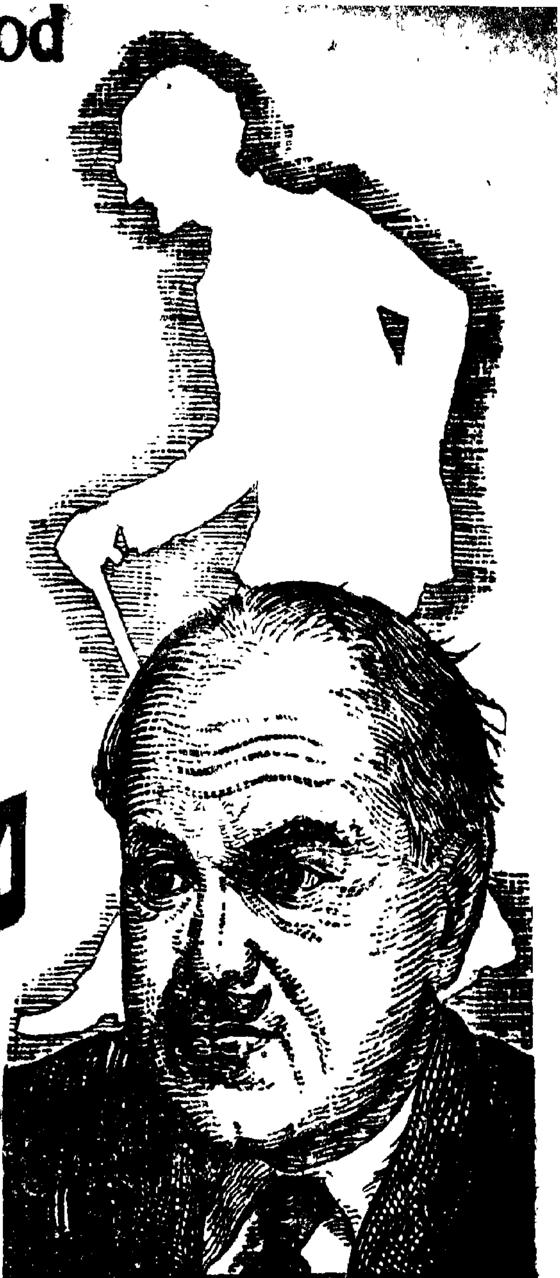
لال قلعہ کی ایک جھلک :- سید ناصر نذیر فراق دہلوی کی تصنیف ہے۔ جس میں دکھایا گیا ہے کہ سلطنت مغلیہ کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کے زمانے میں لال قلعہ کی کیا حالت تھی۔ اور اس انتہائی انحطاط کے زمانے میں بھی وہاں کی دلچسپیوں کا کیا عالم تھا۔ فراق مرحوم دہلی کے مشہور انشا پرداز تھے اور اس اسکول کے لوگوں میں سے تھے جس کا اب ایک فرد بھی باقی نہیں۔ دلی کی ٹکسالی زبان اور قلعہ معلیٰ کی ستھری ستھری بول چال اگر دیکھنی ہے تو "لال قلعہ کی ایک جھلک" کا مطالعہ کیجئے۔ قیمت صرف ایک روپیہ۔

Nature's Blood Bank

چالیس سال کے بعد آپ کو

نیا خون

درکار ہے۔ اس عمر میں اگر اپنی صحت کے متعلق
آپ نے ذرا بھی غفلت کی، تو جلد ہی آپ کی
کمر جھک جائے گی، بڑھاپا آپ کی زندگی کو
تلخ بنا دے گا، تن درست ہوں۔ یا مریض۔
دونوں حالتوں میں آپ کو ہمدرد کے
ماءاللحم کی ضرورت ہے،
کیونکہ



"It's a Blood Bank in a Bottle"

MAULLAHAM

ہمدرد کا

ماءاللحم

دوا نہیں ہے، بلکہ تازہ خون کا خزانہ ہے،
یہ حلق سے اترتے ہی خون بن جاتا ہے؛
اسے تازہ پھلوں اور مقوی میووں اور
صحت بخش غذاؤں اور خاص قیمتی دواؤں کے جوہر سے دواسازی کی جدید ترین مشینوں سے جدید اصول پر
تیار کیا جاتا ہے، دل، دماغ اور اعضاء رئیسہ میں نئی زندگی پیدا کرتا ہے۔ معالج استعمال کراتے ہیں؛
یہ جنرل ٹانک ہے۔ ہر عمر کے لوگ استعمال کر سکتے ہیں، قیمت فی بوتل پانچ روپے،

Hamdard اپنے کیمسٹ یا ہمدرد دواخانہ دہلی سے طلب کیجیے

ظریف دہلوی

ہم کیا کریں

" دیکھنا ذرا اِس کلموئی کی تو جا کر خبر لو کہاں مرگئی؟"

ہم :- کون سی کلموئی ؟

بیگم :- یہ کم بخت جُھنیا کل سے کمانے نہیں آئی سارا گھر سڑ رہا ہے ذرا جا کے دیکھو تو کیا ہوا۔

ہم :- ہمارے تو دفتر کو دیر ہو رہی ہے تم نے یہ ایک اور کام بتا دیا۔

بیگم :- تم جانو نہ جاؤ۔ یہ بھی سوچا کہ کما یہ نہ جانے گا تو آخر ہوگا کیا۔

خیر ہم بادلِ ناخواستہ اُٹھے محلے میں گئے لوگوں سے پوچھا سب نے یہی کہا کہ کل سے ہمارے ہاں بھی کمانے نہیں آئی ہم کنڑے میں گئے دیکھا کہ جُھنیا بیٹھی مزے سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی ہے۔ ہم نے کہا :

ہم :- بھاگوان! تو نے یہ کیا کیا گھر کو سنڈاس بنا دیا۔

جُھنیا :- میاں ہم سے اب اِس محلے میں نہیں کمایا جاتا تم کوئی اور بندوبست کرلو۔

ہم :- ارے اور بندوبست کیسا؟ تو بات تو بتا کیا ہے ؟

جُھنیا :- میاں پرسوں تمہاری بیگم صاحب نے مجھے جھاڑوؤں سے مارا۔ لو صاب ایک تو ان کا میلا سر پر اُٹھائے اُٹھائے پھرو اوپر سے مار بھی کھاؤ۔ نا صاب یہ ہمارے بس کا روگ نہیں۔

ہم :- ارے تو پھر تو ہی بتا اب کیا ہوگا؟ ہم خود اپنے سر پر اُٹھا اُٹھا کر پھینکیں گے ؟

جُھنیا :- یہ تو بیگم صاب سے پوچھو جنہوں نے جھاڑوؤں سے مارا ہے۔

ہم نے بہت دیر تک سمجھایا مگر وہ کسی طرح راضی نہ ہوئی تو گھر آ کر بیوی سے کہا :

ہم :- وہ تو آتی نہیں بیگم۔

بیگم :- آتی کیسے نہیں چُٹیا پکڑ کر لاؤ خطا مہ کی۔

ہم :- یہ ہمارے بس کی بات نہیں۔

بیگم :- آخر بکتی کیا ہے معلوم تو ہو۔

ہم :- وہ کہتی ہے تم نے پرسوں اُسے جھاڑوؤں سے مارا۔

بیگم :- ہاں ہاں مارا۔ اور ماروں گی۔ جھاڑوؤں سے مارا! اُسکے تو جوتیاں لگاؤں گی جوتیاں۔ لو صاحب ایک تو وقت کو نہ آئیں، فرش دھوئیں اپنی شکل کا۔ کنستر منگوا کر دیا فرش دھونے کے لئے کم بخت نے چار دن میں پیندا توڑ دیا۔ پاخانہ دھونے کے لئے پانی لے جاتی ہے تو وہاں جاتے جاتے آدھا کنستر رہ جاتا ہے۔ وہیں باہر سے کھڑے ہو کر جو پھینکتی ہے تو اِک ذرا سا پانی اندر جاتا ہے باقی سب باہر ہی گر جاتا ہے اور جو کچھ کہو تو ٹرّانا شروع کر دیتی ہے۔ ایک روپیہ مہینے کا ڈیڑھ کروا لیا اور کام ایسا دلدّر۔

ہم :- تو اب کیا ہو؟

بیگم :- ہو کیا؟ چودھری سے جا کر کہو اُسے ڈانٹو کمیٹی میں رپٹ کرد۔

ہم :- لاحول ولاقوۃ! اب میں دفتر جاؤں یا اس جھکنڈن پر پڑوں۔

بیگم :- تمہیں جھکنڈن ہی دکھائی دے رہا ہے۔ ارے میں کہتی ہوں کچھ بندوبست نہ کرو گے تو اس گھر میں رہ کیسے سکو گے۔

ہم :- بیگم! ہماری تو جان مصیبت میں آگئی۔ اُس دن تم نے دھوبن کے تھپّڑ مار دیا وہ کپڑے پھینک پھانک کے چل دی بڑی منّت خوشامد سے اُسے راضی کیا اب تم نے یہ دوسرا محاذِ جنگ قائم کر دیا۔ میں ہی رہ گیا ہوں اِن کمینوں کی خوشامد کرنے کو۔ اچھا تم کھانا تو لاؤ میرے دفتر کو دیر ہو رہی ہے۔

بیگم کھانا نکالتی جاتی تھیں اور بڑبڑاتی جاتی تھیں۔" نوج کسی کے گھر کے مرد ایسے ہوں مو منا چومنا اِن موئے کمینوں کو سر پر ہی چڑھا لیا ہے اور کوئی ہوتا تو اِس

نامراد کے لیے جوتے لگاتار یاد کر لی۔ ان سے ڈانٹ ڈپٹ بھی نہیں کی جاتی۔" ہم نے جلدی جلدی کھانا کھایا کیا دھکیلا اور دفتر بھاگے۔ بیگم کی عادت تو جانتے ہی تھے سارا دن خیال لگا رہا کہ نہ جانے کیا ہو رہا ہوگا یہ اللہ کی بندی کسی کی خاطر نہیں مانتی۔ ذرا سی بات سے اُلجھ پڑتی ہے۔ خیر دفتر میں کام بھی کرتے رہتے تھے اور دماغ میں ایک چھوٹی سی تقریر بھی تیار کر رہے تھے کہ بیگم کو یوں سمجھائیں گے یہ کہیں گے یوں قائل کریں گے آج دفتر سے ذرا سویرے سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ گھر پہنچے ہی سب سے پہلے بیگم کی صورت دیکھی کہ چہرے پر امن و امان کی نشان ہے یا آثار بگڑے ہوئے ہیں۔ انہوں نے بھی آنکھیں چار کیں اور نظروں سے سوال کیا اور اب زبان سے یوں کہا۔

بیگم:۔ کچھ اور بھی سنا تم نے؟

ہم:۔ کیا ہوا؟ کوئی نیا گل کھلا کیا؟

بیگم:۔ وہ سارے محلے والے بھی تم ہی کو بُرا کہہ رہے ہیں۔

ہم:۔ مجھے؟ ارے میں نے کیا کیا؟

بیگم:۔ یہ حُجیا کی بچی کہتی ہے کہ سارا محلہ کما دنگی مگر یہ حویلی نہیں کمانے کی۔ اور یہ محلے والے بھی اُسے ڈانٹنے سے تو رہے اور اُلٹی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں۔

ہم:۔ یہ تو بُری ہوئی۔

بیگم:۔ بُری کیسے ہوئی۔ تمہارے منہ میں زبان نہیں ہے کہتے کیوں نہیں جاکر۔

ہم:۔ بیگم سارا دن تو کاغذوں سے سر مارتے گذرا اب ان سے سر کھپاؤں۔ کیا مصیبت میں جان آئی ہے۔

بیگم:۔ پہلے زمانے میں بہادر لوگ فوجوں میں گھس جاتے تھے اور کائی سی پھاڑ کر چلے آتے تھے تم سے اتنا بھی نہیں ہوتا کہ زبان ہی سے لڑ لو۔

ہم:۔ پہلے زمانے کے لوگ گھی کھاتے تھے دودھ پیتے تھے ہم تیل کھاتے ہیں وہ بھی خالص نہیں اور لسی پیتے ہیں یہ بھی اللہ کی قدرت ہی سمجھو جو دفتر چلے جاتے ہیں اور خیر سے واپس آجاتے ہیں۔

بیگم:۔ اچھا پھر اس کا کچھ علاج بھی ہوگا یا نہیں۔

ہم:۔ ہائے پہلے زمانے کے لوگ کیسے اچھے تھے۔ دیکھنا بیگم! دن بھر روزہ رکھا اور روزہ بھی کیسا؟ یہ نہیں کہ اس پر مزاج بگڑ رہا ہے اُس پر بک جھک رہے ہیں اُسے پکڑ کر ٹھونک دیا۔ دوپہر بھر پڑے سستاتے رہے اُٹھے منہ ہاتھ دھویا بازار نکل گئے کیلے چھانٹ رہے ہیں امرود ہاتھ میں لے لے کر دیکھ رہے ہیں، انگور خرید رہے ہیں دو گھنٹے یوں گذار آئے اب بیٹھے ہوئے مرود چھیل رہے ہیں کچالو بنا رہے ہیں بیچ بیچ میں جھکتے بھی جاتے ہیں ہر دم گھڑی پر نظر ہے خدا خدا کر کے مغرب کا وقت ہوا اذان میں ابھی دو تین منٹ باقی ہیں یہ اللہ کے نیک بندے شربت کے بڑے پیالے کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے جاتے ہیں اور کہتے جاتے ہیں۔ اس محلے کی دونوں مسجدوں کے گھنٹے پیچھے ہیں بھلا دیکھو تو سہی اندھیرا ہو چلا اور مُلّا جی ابھی پڑے اونگھ ہی رہے ہیں اور اس مسجد کا وہ پٹھان مُلّا تو ایسا نامعقول ہے کہ پہلے خود روزہ کھول کر اپنا نل بھر لیتا ہے پھر اذان دینے کھڑا ہوتا ہے جاکر دیکھو تو میٹھا کھا رہا ہوگا حالانکہ صحیح حدیث یہ ہے کہ "روزہ افطار کرنے میں جتنی جلدی کی جائے اُتنا ہی زیادہ ثواب ہوتا ہے"۔ خیر صاحب خدا خدا کر کے اذان کی آواز کانوں میں آئی پھر جو آستینیں چڑھا کر ڈٹے ہیں تو کبھی پھلکیوں پر ہاتھ مارتے ہیں کبھی کچالو اُڑاتے ہیں کبھی شربت کا گلاس منہ میں انڈیلتے ہیں غرض دو نالی بھر کے اُٹھے۔ نماز پڑھنے کھڑے ہوئے ڈکاریں لے رہے ہیں اور اُٹھک بیٹھک کر رہے ہیں۔ خیال کھانے ہی میں لگا ہوا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر ان لوگوں کو مسجدوں میں امام صاحب دو دو ڈیڑھ ڈیڑھ گھنٹے تراویحوں میں نہ رگڑیں تو یہ سحری کے ردّے لگاتے لگاتے پانچ چھ ہی دن میں بیمار ہو کر پڑ جائیں۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ پہلے زمانے کے لوگ کیسے اچھے تھے کہ روزہ رکھا قرآن شریف اور نمازوں میں دن گذارا اکل حلال کی کسی نیک بھی کرتے رہے افطار کا وقت ہوا کھجور سے روزہ کھولا اور جَو کی روٹی کھا کر عبادت میں مصروف ہو گئے اور اکثر اللہ کے نیک بندے

ایسے بھی تھے کہ کھجور سے روزہ کھولا اور بغیر سحری کے دوسرا روزہ رکھ لیا۔ تو بیگم میرا مطلب یہ ہے کہ آؤ ہم بھی اللہ کے نیک اور پیارے بندے بن جائیں۔ سیر بھر کھجوریں لے آتا ہوں دو دو کھجوریں روز کھا کر روزہ رکھ لیا کریں گے نہ پیٹ میں کچھ رہے گا نہ یہ بھنگن کے نخرے اٹھانے پڑیں گے اور پھر جنت کے حقدار ہونے سو الگ۔

بیگم :- واہ واہ واہ! میں تو سمجھی تھی جنے کیا کچھ دفتر سے سوچ کر آتے ہیں کوئی اچھی سی ترکیب بتائیں گے اِنھوں نے تو ایک دم سے ولی ہی بنا دیا۔

ہم :- بیگم! ذرا غور تو کرو کیسی اچھی بات ہے کیسی نیک اور پاکیزہ زندگی ہوگی اور پھر ع نے غم دُزد نے غم کالا۔

بیگم :- اے بس رہنے دو اپنی بات وات کو۔ بات آئی ہے کہیں کی۔ جاؤ کچھ بندوبست کرو۔

ہم :- بیگم! میں نے جان کر تم سے نہیں کہا تھا کہ تم اور بھی چراغ پا ہوگی۔ بات اصل میں یہ ہے کہ میں دفتر سے آج اسی مارے جلدی اُٹھ آیا تھا یہاں گھر میں گھسنے سے پہلے میں میر صاحب کے ہاں گیا انہیں ساتھ لیکر شیخ صاحب کے پاس گیا وہاں مرزا جی اور لالہ جی بھی بیٹھے تھے بہت سی باتیں ہوئیں مگر ع مقطع میں آ پڑی ہے سخن گسترانہ بات۔

بیگم :- مقطع کیسا؟ اب لگے یہاں بھی شاعری بگھارنے؟ بات کہو بات۔

ہم :- بات کیا کہوں تم بگڑ جاؤ گی۔

بیگم :- بات تو کہو۔ سیدھی بات پر کیوں بگڑنے لگی۔ ایسی کیا دیوانی ہو گئی ہوں۔

ہم :- سیدھی ہی تو بات نہیں ہے ٹیڑھی ہے جب ہی تو کہتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔
بس سمجھو ایسے پہیلیاں۔ اب کہہ بھی چکو کسی طرح۔
بیگم! وہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم نے ہر طرح جمیا کو سمجھایا مگر وہ کسی طرح نہیں مانتی اس بات پر اڑ گئی ہے کہ
بیگم معافی مانگو
[illegible]
[illegible]

بیگم :- (اُچھل کر) کیا کہا؟ میں معافی مانگوں؟ اُس چڑیل سے؟ ارے یہ کہا اُس نامراد ناشاد نے؟ ذرا لاؤ تو اُسے پکڑ کے میرے پاس۔ ارے تم میری شکل کیا دیکھ رہے ہو۔ ذرا لاؤ تو اُس کلموئی کی چُٹیا پکڑ کے میرے سامنے۔ ارے اُٹھو اُٹھو! میرے تن بدن میں آگ لگ رہی ہے۔ اور یہ مزے سے بیٹھے مٹر مٹر دیکھے جا رہے ہیں۔ اٹھو نہ تمہیں ہو کیا گیا ہے سنتے نہیں۔

ہم :- بیگم! اسی لئے تو میں خاموش تھا تم سے کہتا نہ تھا تم نے میرے حلق میں اُنگلی ڈال کے بات نکال لی۔ اب کیا کروں کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اِدھر بھی تریاہٹ اُدھر بھی تریاہٹ۔

بیگم :- اب تو میں ایک منٹ اس محلے میں نہیں ٹھہر سکتی دوسرا مکان لے لو۔ یہاں سے اُٹھ چلو۔

ہم :- مکان بھی کیا دوکانوں پر ملتے ہیں کہ گئے اور لے آئے۔ تمہیں کچھ خبر بھی ہے کہ دلی میں مکانوں پر کیا آفت آئی ہوئی ہے، اچھے اچھے شریف اور پڑھے لکھے بابو لوگ بڑی بڑی تنخواہوں والے چھوٹے چھوٹے مکانوں میں گھُچ مُچ کر رہ رہے ہیں اور بال بچوں کو وطن میں چھوڑ رکھا ہے۔ تم کہتی ہو دوسرا مکان لے لو۔ کوئی اپنا بس ہے۔

بیگم :- تو میں تو جاتی ہوں اپنی اماں کے ہاں۔

ہم :- اچھا سنو تو سہی۔ تم بس اِتنا زبان سے کہدو کہ آئندہ جمیا کو نہیں مارونگی پھر میں سُلٹ لونگا اور سب کو راضی کر لوں گا۔

بیگم :- مارونگی سو دفعہ مارونگی۔ لو صاحب کام نہیں کریگی اور زبان چلائیگی تو میں اُس کی خوشامد کرونگی اُسکے آگے ہاتھ جوڑونگی۔ چڑیل کا مار مار کے بھُرکس نکال دوں گی۔

ہم :- تو پھر اب کیا کیا جائے ؎
ملک الموت کو ضد ہے کہ میں جاں لے کے ٹلوں
سر بسجدہ ہے مسیحا کہ مری بات رہے

بیگم :- یوں تو اُس کم بخت کا اور بھی دماغ ہوا کہ اب تو وہ مجھے لے کے جوتیوں میں ڈالیگی اور خاک بھی کام کر کے نہ دیگی۔

ہم :- نہیں ایسا نہیں ہوگا تم میری بات مان لو۔ ان کمینوں سے دو بدو کرنی بھی نہیں چاہیئے اس لئے کہ ان کی تو کوئی عزت نہیں مار کھائیں اور جھاڑ جھوڑ کر کھڑے ہو جائیں اور جو خدانخواستہ کہیں وہ بھی تمہیں ایک جھاڑو مار بیٹھے تو تمہاری عزت تو دو کوڑی کی رہ جائے نا۔

بیگم :- اے تم کہہ کیا رہے ہو؟ وہ جوانا مرگ مجھے مارے گی؟ مجھے؟ ذرا مارے تو دیکھیے کھال کھینچ کے رکھ دوں نامراد کی۔

ہم :- کھال کھینچو یا کچھ کرو عزت تو جاتی ہی رہے۔ بیگم ایک دن کا واقعہ سناؤں بالکل اپنے سامنے کا۔ میں تاشوں کی گلی میں سے جا رہا تھا۔ ایک بھنگن بھرا ہوا ڈوکرا سر پہ لیے گذر رہی تھی۔ پہلے زمانے میں بھنگی رستے میں آواز لگاتے چلتے تھے "بھنگی ہے سرکار" "بچ جائیے ماں باپ" "بچے جیتے رہیں حکم بنا رہے سرکار" اور اب تو جان جان کے بھڑکے چلتے ہیں۔ تو ایک لالہ صاحب اُجلے برف کپڑے پہنے ہوئے جا رہے تھے بھنگن اُن سے بھڑ کر نکلی۔ لالہ صاحب جلدی سے بچ تو گئے مگر کہنے لگے "اری دیکھ کے نہیں چلتی آنکھیں پھوٹ گئی ہیں" بھنگن وہیں کھڑی ہو گئی اور کہنے لگی "لالہ منہ سنبھال کے بات کرو۔ آنکھیں پھوٹی ہونگی تمہاری" لالہ صاحب نے خفا ہو کر اُسے دو چار صلواتیں سنائیں بس یقین مانو بیگم اُس بھنگن نے آؤ دیکھا نہ تاؤ وہ غلاظت کا بھرا ہوا ٹوکرا لالہ صاحب پر پھینک دیا۔ بیچارے کے سارے کپڑے خراب ہو گئے۔

بیگم :- پھر اُس چڑیل کو مارا نہیں لوگوں نے۔

ہم :- اُس کے بھی طرفدار موجود ہو گئے اور لالہ ہی کو بُرا بھلا کہنے لگے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس زمانے میں وہ مقولہ بالکل ہی صحیح ہو گیا ہے کہ "اپنی عزت اپنے ہاتھ ہے"۔

بیگم :- یہ تم ہی لوگوں نے اچھوتوں کو سر پر چڑھا دیا ہے ورنہ اِن کی مجال تھی کہ آنکھ ملا سکتے۔

ہم :- تو بس اب میں جا کر کہہ دیتا ہوں تم آئندہ اُس سے کچھ نہ بولنا۔

بیگم :- نہیں میں تو فی الحال اماں کے ہاں جاتی ہوں تم اگر کہیں اور مکان کا بندوبست کرو گے تو آجاؤنگی نہیں تو تم جانو مجھ سے یہ ذلت برداشت نہیں ہونیکی۔

میں نے بیگم کو بہتیرا سمجھایا مگر وہ کسی طرح نہ مانیں اور اپنی اماں کے ہاں چلی گئیں۔ اب ہم کیا کریں۔

تصانیف مرزا عظیم بیگ چغتائی مرحوم

دیکھا جائیگا :- مُصنف کی ادبی کاوشوں میں شاید سب سے زیادہ رنگین چیز ہے۔ ایک لکھ پتی اپنی لڑکی کی شادی کے سلسلے میں اس قدر مضحکہ خیز جنجال میں پھنس جاتا ہے کہ اس کی عقل چرخ ہو جاتی ہے۔ خود لڑکی ایک نہایت ہی عجیب و غریب مخمصہ میں پھنس جاتی ہے۔ بیحد کامیاب اور انتہا سے زیادہ دلچسپ ہے۔ اس کہانی کا ڈرامہ دلی اور لکھنؤ کے ریڈیو اسٹیشنوں سے کئی بار نشر کیا جا چکا ہے۔ بیحد مقبول تصنیف ہے۔ قیمت ایکروپیہ۔

فُل بُوٹ :- یہ چھوٹے چھوٹے اکیس باب کا ناول ہے۔ جو تین حصّوں میں منقسم ہے اور چغتائی صاحب کی تصانیف میں خاص چیز ہے۔ بلحاظ پلاٹ اور رنگین بیانی مُصنّف کی یہ بہترین تصنیف ہے۔ تخیل کی لطافت پلاٹ، عبارت کی ظرافت اور واقعات کی شوخی دیکھنے کے لائق ہے۔ پھر ان تمام باتوں کے ساتھ مُصنّف نے اپنی دلچسپ مگر سلجھی ہوئی عبارت میں جس خوبصورتی سے جذبات بھرے ہیں اس کی تعریف ناممکن ہے۔ ایسی دلکش کہانی آپ نے اب تک نہیں پڑھی ہوگی۔ قیمت ایکروپیہ۔

لفٹنٹ :- یہ ایک انتہا سے زیادہ پُر مذاق طول طویل افسانہ ہے۔ مزاحیہ افسانوں میں خاص چیز ہے۔ مُصنّف کی بہترین تصنیف ہے۔ ایک ڈاکٹر صاحب کی بیوی ہیں جو طب کی قائل ہیں اور ڈاکٹر آنریری لفٹنٹ ہو گئے ہیں۔ بس نہ پوچھئے کیا مزے آئے ہیں۔

قیمت صرف آٹھ آنے۔ علاوہ محصولڈاک۔

ملنے کا پتہ :- ساقی بُک ڈپو۔ دہلی۔

بودلیر کے جملے کا ایک حصہ فرانسیسی میں یوں ہے: ——— Mon semblable, mon frere. جوئس نے اسے یوں بدلا ہے: ——— My shemblable, my freer. یہ لفظ freer بھی بہت مزیدار ہے۔ فن کار اپنی شخصیت کا اظہار براہ راست نہیں کر سکتا، یہ بات صرف کرداروں کے ذریعے ممکن ہے۔ جو آزادی فن کار کو حاصل نہیں وہ کرداروں کو حاصل ہے۔ لہٰذا یہ کردار جوئس کی شخصیت کا زیادہ آزاد حصہ (my freer) ہوا۔ اس کردار کا نام shem ہے، جس کی آواز لفظ Sham سے ملتی جلتی ہے۔ چنانچہ جوئس نے بڑی صفائی سے اپنے آپ کو جعلیا کہہ دیا ہے۔ یہاں پھر نفسیاتی تحلیل کرنے والوں کے جعلی پن سے بچئے۔ اپنے آپ سے یہ بیزاری کوئی ذہنی بیماری نہیں ہے، بلکہ ایک صحت مندانہ اخلاقی تلاش ——— خلوص اور ریاکاری کے معنوں کی جستجو۔ جوئس میں ایک بڑا صحت مندانہ عنصر یہ ہے کہ وہ اپنے اوپر کھل کر ہنستا ہے۔ اور اپنے آپ سے بے اندازہ لطف لیتا ہے۔ میرا تو یہ حال ہے کہ میں جوئس کو جتنا پڑھتا ہوں اس کی شخصیت سے اتنی ہی محبت بڑھتی جاتی ہے۔

جوئس کی اہمیت کے متعلق مجھے ایک بات اور کہنی ہے۔ لیکن اس کے متعلق شہادتیں اور دلیلیں میں نے دو سال ہوئے جمع کی تھیں اور محض اپنے دماغ میں۔ اب تک وہ سب رفو چکر ہو گئیں۔ اس لئے ممکن ہے کہ میری بات بڑی بے بنیاد سی معلوم ہو۔ مگر بہر حال غور کے قابل ہے۔ پچھلے ڈیڑھ سو سال کے عرصے میں یورپ کے ذہن میں ایک عجیب رجحان نظر آتا ہے، یعنی چیزوں کا شعور کم ہوتا چلا جا رہا ہے۔ چیزوں سے میرا مطلب ہے یہی معمولی روزمرہ کی چیزیں، میز، کرسی، اپنے کپڑے وغیرہ۔ اس کی وجہ نظریہ بازی کی زیادتی بھی ہو سکتی ہے۔ بہر حال وجوہات پر غور کرنے کا یہ موقع نہیں۔ اس رجحان کے نشانات یورپ کے ادب میں جا بجا ملتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اپنے گرد و پیش سے انسان کی دلچسپی کم ہوتی چلی جا رہی ہے۔ لیکن یہ صورت حال بڑی خطرناک ہے محض مطلقات اور مجردات سے محبت کر کے انسان خوشی حاصل نہیں کر سکتا۔ اس لئے موجودہ زمانہ میں آرٹ کا یہ ایک زبردست فریضہ ہے کہ انسان کے شعور میں چیزوں کے احساس اور ادراک کو زندہ رکھے۔ چنانچہ Symbolism, Naturalism, the Parnasse Surrealism, Imagism ——— ہر نئی ادبی تحریک میں کسی نہ کسی حد تک یہ کوشش ضرور پائی جاتی ہے۔ اس چیز میں جوئس موجودہ زمانہ کے ہر یورپین ادیب اور شاعر سے آگے ہے۔ کیونکہ چیزوں کا احساس چیزوں کی حیثیت سے کسی کے یہاں اتنا شدید نہیں۔ فطرت نگاروں کے یہاں چیزوں کا ادراک سائنس داں کا سا ہے، فن کار کا سا نہیں۔ فلابیر کا ادراک نسبتاً زیادہ جمالیاتی ہے، مگر اس کے یہاں چیزیں بذات خود کوئی اہمیت نہیں رکھتیں، بلکہ اور چیزوں کے ساتھ مل کر کسی ذہنی کیفیت کے اظہار میں مدد دیتی ہیں۔ مارسل پروست کے ہاں چیزوں کا وجود بالکل ثانوی ہے، اُسے تو احساس سے زیادہ دلچسپی ہے، بلکہ اس کے نزدیک تو احساس چیزوں سے زیادہ ٹھوس ہے؛ اس سے بھی زیادہ یہ کہ احساس ہی چیزوں کو اصلیت اور حقیقت بخشتا ہے۔ احساس کے بغیر شاید پروست کو چیزوں کا وجود تک تسلیم نہ ہوگا۔ ایلیٹ اور دوسرے بڑے شاعروں کے یہاں چیزیں اس وجہ سے اہم اور قابل قدر نہیں ہیں کہ وہ چیزیں ہیں، بلکہ علامت ہونے کی وجہ سے۔ یوں تو جوئس بھی چیزوں کو علامت کے طور پر استعمال کرتا ہے، لیکن اُسے چیزوں کی ذات سے بھی بڑی دلچسپی ہے، اور اس کا ادراک بھی خالصتہً جمالیاتی ہے۔ وہ چیزوں کا ذکر کرتا ہے محض اس لئے کہ وہ چیزیں ہیں۔ غالباً یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ جوئس کے نزدیک چیزوں کی مدد کے بغیر احساس ممکن نہیں۔ لہٰذا چیزیں بھی اتنی ہی اہمیت رکھتی ہیں جتنی شعور۔ اس نے خود کہا ہے کہ فن کار اپنے احساس حُسن کا اظہار اسی زمین اور اسی زمین کی پیدا کی ہوئی چیزوں کے ذریعے کرتا ہے، ہماری روح اپنے قید خانہ سے رہائی پا سکتی ہے تو آواز، رنگ اور شکل کے دروازوں سے۔ چنانچہ جوئس جتنا ممکن ہو سکتا ہے چیزوں کو حسیاتی اور جمالیاتی اعتبار سے ٹھوس بنا کر پیش کرتا ہے۔ بعض نقاد کہتے ہیں کہ جوئس کا تخیل بصری نہیں ہے، اس کا بیان ہماری آنکھوں کے سامنے کوئی تصویر پیش نہیں کرتا۔ یہ ٹھیک بھی ہو، تب بھی اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جوئس چیزوں کو ٹھوس نہیں بنا سکتا۔ الفاظ آخر آوازیں ہی تو ہیں اور فن کار آوازوں سے ہر طرح کا کام لے سکتا ہے۔ اگر جوئس کے الفاظ تصویر پیش نہیں کرتے تو کیا ہے، اس کے بغیر بھی وہ ہمیں چیزوں کے ٹھوس ہونے کا احساس دلا سکتے ہیں۔ "یولی سیز" میں سے ایک فقرہ مثال کے طور پر لیجئے جہاں جوئس نے سڑک پر گھوڑوں کے

گزرنے کا ذکر کیا ہے: *Hoofirons steely ringing.*

اسی صنعت کی بنا پر جوائس کی آخری دو کتابیں صرف مجموعی حیثیت ہی سے دلچسپ نہیں، بلکہ ان کا ایک ایک فقرہ، بعض حصوں میں تو ایک ایک لفظ عجیب و غریب ہے۔ جوائس کی دنیا اتنی بھری پڑی ہے کہ اگر یورپ کی تہذیب مٹ بھی جائے تو ان دو کتابوں کی مدد سے کم سے کم دماغ میں اسے دوبارہ تعمیر کیا جا سکتا ہے۔ جوائس کے آرٹ میں یہ آب و رنگ آیا ہے تو میرے خیال میں یہاں پھر خیر و شر کے عیسوی نظریے کو بہت بڑا دخل ہے۔

اب آخر میں کمیونسٹوں کے ایک اعتراض پر بھی غور کر لینا چاہیے۔ جوائس کے سر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ اس نے اپنے آپ کو آرٹ کے محل میں بند کر لیا، اور اپنے زمانہ کی حقیقتوں کی طرف توجہ نہیں کی۔ لیکن جوائس اپنے زمانہ کی حقیقت سے زیادہ دیرپا اور بنیادی حقیقت سے الجھ رہا تھا۔ یعنی فرد اور اس کے مسائل سے جو ہر زمانے میں ایک ہی ہوتے ہیں۔ جوائس کی اخلاقیات وقتی اور ہنگامی نہیں ہیں بلکہ اتنی ہی مستقل ہیں جتنی انسانی زندگی۔ ویسے بھی جوائس کو سیاسیات سے بہت زیادہ انہماک تھا۔ اس نے سب سے پہلے جو چیز لکھی وہ سیاسی پمفلٹ تھا۔ '*Dubliners*' اور '*Portrait*' میں بھی اس نے جا بجا آئرلینڈ کی سیاست پر نکتہ چینی کی ہے، اور بعد کی آخری دو کتابوں میں وہ سیاست کو نہیں بھولا۔ صرف فرق یہ ہے کہ سخنور دوسری طرح سے سہرا کہتے ہیں۔ آخری کتاب میں یورپ کی ہر سیاسی اور علمی تحریک کا ذکر ہے۔ اور سب پر پھبتیاں کہی گئی ہیں۔ مگر یہ سب پہیلیاں ہیں اور انہیں بوجھنا پڑتا ہے۔ ایک آدھ مثال دیکھیے: بچہ سوتے میں کسی شور سے ڈر کر جاگ اٹھتا ہے۔ اس پر سونے والے کے دماغ میں یہ فقرہ آتا ہے: *So young & frendoned.* اور دیکھیے جوائس نے انگریزوں کے جھنڈے یونین جیک کی کیا گت بنائی ہے: *Unionjak and be join to yok.* متوسط طبقے پر جوائس یوں چوٹ کرتا ہے: *"Muddle crass pupils."* غرض کہ ایسی سیکڑوں مثالیں ہیں کہاں تک گنواؤں۔ مطلب یہ ہے کہ جوائس کو بھی اپنے زمانہ کے مسائل سے اتنا ہی گہرا تعلق تھا جتنا بڑے سے بڑے کمیونسٹ لیڈر کو۔ لیکن اس کے نزدیک آرٹ بڑی زیادہ حقیقت تھی، کیونکہ بقول فورسٹر کے تاریخ حرکت کرتی ہے، آرٹ اپنی جگہ کھڑا رہتا ہے۔ سیاست ہمارے زمانہ کی بہت بڑی حقیقت سہی، مگر جوائس نے شروع میں ہی سمجھ لیا تھا کہ موجودہ زمانہ کے فن کار کیلئے لازمی ہے کہ اپنی شخصیت کو عامیانہ قسم کے جوش اور مبتذل گرماگرمی کے حوالے نہ کر دے؛ اگر وہ غلطی کرتا ہے تو وہ فن کار کے شایانِ شان ہونا چاہیے، کیونکہ اس کا کام زندگی کے مواد سے نئی زندگی تخلیق کرنا ہے۔ ایک جگہ اسٹیون کہتا ہے: "آئرلینڈ میں جب کسی آدمی کے اندر روح پیدا ہوتی ہے تو اسے پرواز سے روکنے کیلئے جال پھینکتے ہیں۔ تم لوگ مجھ سے قومیت، زبان اور مذہب کی باتیں کرتے ہو۔ میں ان سب پھندوں سے بچ کر اڑ جانے کی کوشش کروں گا۔" یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ فن کار کو اپنے ماحول میں بہت سی چیزیں پسند نہ ہوں، لیکن اس ماحول سے باہر جا کر وہ تخلیقی کام نہیں کر سکتا۔ اسی لئے اسٹیون صاف لفظوں میں اعلان کر دیتا ہے: "اس نسل، اس ملک اور اس زندگی نے مجھے پیدا کیا ہے۔ میں اپنا اظہار صرف اس طرح کروں گا جیسا میں ہوں۔" جوائس کا یہ عزم درحقیقت ایک اخلاقی عزم ہے کیونکہ یہ ذاتی خواہشات اور تعصبات سے بلند ہونے کی کوشش ہے، جو بڑے فن کار کے لئے ناگزیر ہے۔ سیاست سے بلند ہونے کی کوشش کرنا اس سے الگ ہو جانا نہیں ہے۔ اگر جوائس براہ راست سیاسی مسائل کا ذکر نہیں کرتا تو کم سے کم میں اس کی تعریف کرتے ہوئے بالکل نہیں شرماتا، کیونکہ جوائس سیاسی مسائل سے زیادہ گہرے مسائل یعنی فرد کے اخلاقی مسائل پیش کر رہا تھا۔ درحقیقت ان مسائل کا حل سیاسی مسائل کا حل بھی ہے۔ اگر بیسویں صدی کے سیاسی لیڈر ان فن کاروں کی طرح اپنے آپ کو ریاکار کہہ سکتے تو سیاسی الجھنوں کا وجود ہی زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتا تھا۔

آخر میں ایک ضمنی مسئلہ اور پیش کرنا چاہتا ہوں۔ ایڈمنڈ ولسن کا خیال ہے کہ "یولی سیز" کے آخر میں تینوں بڑے کرداروں میں بڑی زبردست تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ بلوم اور اسٹیون میں صرف ایک لمحہ کیلئے روحانی ہم آہنگی قائم ہوتی ہے، لیکن اس ایک لمحے میں انھیں وہ روحانی سہارا مل جاتا ہے جس کی انھیں تلاش تھی۔ اسٹیون بلوم سے جدا ہو کر اب اپنے شاہکار کی تخلیق کریگا جو اب تک اس کے لئے ناممکن تھا۔ کیونکہ اب تک اسے کوئی روحانی ساتھی نہیں ملا تھا جو اس کی اصلیت کو سمجھ سکتا۔ اسٹیون کو تھوڑی دیر تک

سرپرستی میں رکھنے سے بلوم کو اپنی خود داری، خود اعتمادی اور مردانگی واپس مل جاتی ہے۔ بہت دنوں سے وہ صبح کو بیوی کے لئے ناشتہ تیار کرتا رہا ہے، لیکن آج سونے سے پہلے وہ میرین کو حکم دیتا ہے کہ صبح اٹھ کر ناشتہ تیار کرے۔ اسی طرح میرین، جو جذباتی اور جسمانی دونوں اعتبار سے بلوم سے دور ہٹتی چلی جا رہی تھی اب پھر اس کے قریب واپس آجاتی ہے۔ چنانچہ دن جس طرح شروع ہوا تھا اسی طرح ختم نہیں ہو جاتا، بلکہ ان لوگوں کی زندگیوں میں بہت بڑی تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں۔ اس نئے "یولی سیز" میں ایک حرکت، ایک نشوونما پائی جاتی ہے جس میں بہت بڑی اخلاقی اور روحانی معنویت ہے۔ مجھے ایڈمنڈ ولسن کی یہ تفسیر سو فیصدی قبول ہے، لیکن جوئس کے ایک اور نقاد ہیری لیون کو اس سے انکار ہے۔ اس کا خیال ہے کہ کرداروں کی زندگی میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ اور اگر تبدیلی واقع ہوتی تو یہ بات جوئس کے اصولوں کے خلاف ہوتی، کیونکہ جوئس کے نزدیک جمالیاتی جذبہ حرکی جذبہ نہیں ہے، بلکہ سکون آور، اس لئے آرٹ کا کام نہ تو خواہش پیدا کرنا ہے اور نہ نفرت۔ چنانچہ "یولی سیز" میں کسی قسم کی نشوونما کے معنی یہ ہونگے کہ جوئس کے نظریئے اور عمل میں تضاد ہے لیکن درحقیقت ہیری لیون منطقی تضاد سے خواہ مخواہ ڈر رہے ہیں۔ فن کار کے نظریئے اور عمل میں تخئیلی ہم آہنگی چاہیئے نہ کہ منطقی۔ ویسے دیکھئے تو جوئس کے نظریئے ہی میں منطقی تضاد پایا جاتا ہے۔ ایک جگہ اسٹیون کہتا ہے کہ آرٹ کا کام صرف حسن کی تخلیق ہے، لیکن کتاب کے آخر میں وہ اپنی ڈائری میں لکھتا ہے: "میں اپنی روح کی بھٹی میں اپنی نسل کا ضمیر بنانے جا رہا ہوں" یہ لفظی تضاد تو شروع ہی میں موجود ہے۔ ظاہر میں احساسِ حسن اور نسل کا ضمیر بڑی بے جوڑ باتیں معلوم ہوتی ہیں، لیکن دراصل حسن ضمیر ہی کا پیدا وار ہے، اور ضمیر احساسِ حسن سے ہی پیدا ہوتا ہے۔ مختصراً حسن صداقت ہے اور صداقت حسن۔ یہ مسئلہ بہت تفصیل چاہتا ہے، اور اس سلسلہ میں جوئس کے بجائے اور بہت سی چیزوں سے بحث کرنا پڑے گی، جس کا یہاں کوئی موقع نہیں۔ صرف یہ کہنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ "یولی سیز" میں نشوونما در حرکت جسمانی نہیں اور نہ اعصاب کا reflex action ہے جسے جوئس نے جمالیاتی احساس کے منافی بتایا ہے۔ یہ حرکت سراسر تخئیلی ہے، لہٰذا منطقی تضاد کا اعتراض یہاں زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔

روپیہ کماؤ ــــــــ امیر بن جاؤ

کم سرمایہ صنعتوں پر قابل مصنفوں کی عملی کتابیں۔ کوئی کتاب پسند نہ آنے پر قیمت واپس۔ زیادہ تفصیل کیلئے انگریزی یا اردو میں بڑی فہرست مفت منگوائیں۔

ہیناٹو ڈیری فارم	عہ	پلاسٹر آف پیرس بنانا	۲ر	ہر قسم کی ترکاریوں کی کاشت	ے	مکمل مرغی خانہ	عہ
فن موم بتی سازی	عہ	فن اشتہار بازی ہر دو حصہ	عہ	فن فنائل سازی کلی	عا	مٹی کے کھلونے بنانا	۴ر
بوٹ پالش بنانا	عہ	انگریزی و دیسی پیٹنٹ ادویات		فن رنگائی، ڈھلائی،		لاکھ و چپڑا لاکھ کی صنعت	۴ر
سرکہ سازی	۱۲ر	بنانیکا راز	عا	ڈرائی کلیننگ	عہ	الیکٹرو پلیٹنگ گائڈ	ے
ہیاک بنانا	۴ر	کامیاب سفری ایجنٹ بننا	۱۰ر	پرانی ٹکٹوں میں دولت	۱۲ر	تعلیم صابن	عہ
خضاب سازی	۱۲ر	خوشبودار تیل بنانیکے راز	عہ	مکھیاں پالنا و شہد تیار کرنا	۱۲ر	اصول تجارت	۱۲ر
آئینہ سازی	عہ	سلیٹ پنسل و لوہے کی سلیٹ		عمل دنداں سازی	عا	حلوہ، مربے، اچار چٹنی	۸ر
فن رفوگری	عہ	بنانا	۴ر	ہر دھات کی ڈھلائی		کتھ بنانا	۴ر
با صفا اشیا بنانا	۸ر	دانتوں کے پوڈر پیسٹ کریم بنانا	عہ	بیبی فونڈری شاپ	ے	مرلیش بنانا	۴ر
فوٹو گرافی مکمل	[illegible]	پھلوں کو ڈبوں میں بند کرنے اور		بیروزگاری کا علاج	۲ر	کامیاب تجارتی نسخہ جات	۱۲ر
وائیر وائنڈنگ	۵ر	سبزیوں کو خشک کرنے کے		ہر قسم کی بیٹریاں بجلی کی گھنٹی		طبیب مرغی خانہ	ے
فن ... تنائی سازی	عا	سائنٹیفک طریقے	عہ	انگوٹھی۔ بجلی کی جونی جیبی		تجارتی مرغی خانہ	عا
... سازی	۸ر	خوشبوؤں کے پوڈر سنو		لیمپ بنانا	۱۲ر	کامیاب مرغی خانہ	عا
... تی بنانا	۴ر	اور کریمیں بنانا	۱۲ر	رسالہ صابن گری	۴ر	.. ..	..

کمرشیل سنڈیکیٹ نمبر ۱ چوک متی۔ لاہور

ممی خانہ

حجاب امتیاز علی کے جدید ہیبت ناک افسانوں کا

مجموعہ

یوں کہیے! یہ افسانے ایک دائمی قوس قزح۔ دائمی رنگ و بو، دائمی حسن و عشق کی دنیا ہیں۔ یہاں پھول کھلتے ہیں۔ سرو و صنوبر و شمشاد پر نغمہ سنج پرندے گاتے ہیں یا سیٹیاں بجاتے ہیں۔ فرانسیسی دریچوں میں سے سمندر کا نظارہ ہوتا ہے۔ اس میں وضاحت ہے عریانی نہیں شوخی ہے بے باکی نہیں

قیمت

ایک روپیہ بارہ آنے عہ

نگارستان

مولانا ظفر علی خاں کا دوسرا

مجموعہ

نگارستان کیا ہے؟ اثر کہنہ کے نالۂ جاں گنی کی تصویر، مستقبل کے قہقہوں کا نقشہ، رفتار زمانہ اور اس کے تقاضے کی صدا، دور حاضرہ کی استادانہ شاعری کا کمال یافتہ نمونہ۔

قیمت مجلد للعہ

چار روپے آٹھ آنے۔

انارکلی

امتیاز علی تاج کا لکھا ہوا مشہور ڈرامہ چھپ گیا ہے

قیمت عہ

تاریخ سلطنت خداداد

محمود خاں بنگلوری نے ہندوستان کی طویل اسلامی تاریخ کے دو مجاہد حیدر علی اور ٹیپو سلطان کی مکمل سوانح حیات لکھی ہے۔ ان کی جنگی کارروائیاں سلطان کی شہادت ہے ہندوستان پر انقلاب اور ملک کی موجودہ حالت کے اسباب درج ہیں۔ ۳۰ فوٹو بلاک، ۸۰۰ صفحات

قیمت: مجلد چھ روپے بارہ آنے (۱۲/۶)

مفصل فہرست طلب کریں۔

چمنستان

تیسرا مجموعہ کلام

مولانا ظفر علی خاں کا کلام دور حاضر کے مقتضیات کا ہنگامہ ہے جس میں مظلوموں کی صدائیں، آزادی کے نعرے، مجاہدانہ رجز، قلب زمانے کی دھڑکنیں اور ماضی و مستقبل کی صدائیں سنائی دے رہی ہیں۔ قیمت: مجلد پانچ روپے۔

چند جدید ناول، شمع پانچ روپے۔ تصویر چار روپے۔ تشنگی چار روپے۔ ظالم محبت عہ۔ روشنک بیگم ڈیڑھ روپیہ آٹھ آنہ

پتہ:- پبلشرز یونائیٹڈ۔ چوک انارکلی۔ لاہور۔

شمع ہدایت

(یعنی)

قرآن مجید مکمل صرف اردو زبان میں

جن بھائیوں نے قرآن مجید عربی زبان میں نہیں پڑھا۔ یا عربی زبان سمجھ نہیں سکتے ان کیلئے یہ تحفہ مبارک طبع کیا گیا ہے۔ تاکہ وہ بھائی جو صرف اردو ہی جانتے ہوں دین و دنیا کی سعادت حاصل کریں۔ ہدیہ قسم خاص۔ قسم اول۔ قسم دوم۔ قسم چہارم [illegible] یہ گرانقدر تحفہ آج ہی طلب کیجئے۔ نوٹ:۔ آرڈر دیتے وقت اخبار اور قسم کا حوالہ ضرور دیں

ملنے کا پتہ:۔ شیخ ظفر محمد اینڈ سنز تاجران کتب کشمیری بازار۔ لاہور

روپئے ضائع نہ کیجئے

جب کسی کتاب کی ضرورت ہو تو شیخ ظفر محمد اینڈ سنز کشمیری بازار لاہور سے خرید فرمائیے۔ جہاں کتاب آپکی پسند کے مطابق اور بازار سے بارعایت دستیاب ہوگی۔ کاغذ اور سامان طباعت کی گرانی کے باوجود ہم نے اپنی کتابوں کی قیمتوں میں کوئی اضافہ نہیں کیا امید ہے کہ آپ اس نیک مشورہ پر نہ صرف خود عمل پیرا ہونگے بلکہ اپنے احباب کو بھی مجبور کرینگے کہ وہ اپنی ضرورت کی کتابیں ہمارے یہاں سے خریدیں۔ ہمارے یہاں ہر قسم کی نئی و پرانی کتابیں بہت عمدہ اور بارعایت فروخت ہوتی ہیں۔

شیخ ظفر محمد اینڈ سنز تاجران کتب کشمیری بازار۔ لاہور

عکسی تعویذی قرآن مجید

آپ اسے بغیر کسی عینک کے بھی تلاوت کر سکتے ہیں، اور اگر اسی کو زیادہ جلی حروف میں دیکھنا چاہیں تو جس خوبصورت ڈبیہ میں بند ہے اُسمیں تلاوت کرنیوالا آئینہ جڑا ہوا ہے، اس آئینہ سے حروف چار گنا جلی دکھائی دیتے ہیں۔ آپکو اگر ضرورت در پیش ہو تو نہایت آسانی سے اس کلام پاک کی تلاوت بھی کر سکتے ہیں۔ اور گلے میں حمائل یا بازو پر تعویذ بھی کر سکتے ہیں۔ ہر مسلمان کا عقیدہ ہے کہ کلام ربانی سے بڑھکر دنیا میں کوئی چیز بابرکت اور مشکل کشا نہیں۔ اسلئے ہر بھائی کا فرض ہے کہ سب سے پہلی فرصت میں قرآن مجید منگوا کر اپنے پاس رکھے۔ یہ تحفہ پہلے جرمنی سے آتا تھا جنگ کے باعث بالکل نایاب تھا۔ اسلئے ہم نے صرف لاکشیر تیار کیا ہے۔ شائقین جلد از جلد فرمائشیں بھیج دیں۔ ہدیہ قسم اول کاغذ گلیز گلٹ کی ڈبیہ والا تین روپے۔ چاندی کی ڈبیہ والا چھ روپے۔ قسم دوئم کاغذ رف گلٹ کی ڈبیہ والا دو روپے۔ چاندی کی ڈبیہ والا پانچ روپے۔

(نوٹ) فرمائش بھیجتے وقت قسم کا حوالہ ضرور دیں۔

ملنے کا پتہ:۔ شیخ ظفر محمد اینڈ سنز تاجران کتب کشمیری بازار لاہور

"ہندوستان میں دو کتابیں الہامی ہیں ایک وید مقدس اور دوسری دیوان غالب"

ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری

الہامات غالب یعنی شرح دیوان غالب

دیوان غالب کی یوں تو بہت سی شرحیں لکھی گئیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ "الہامات غالب" جس [illegible] وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ دیوان غالب کے مشکل اور پیچیدہ اشعار پر اس خوبی سے نقد و تبصرہ کر کے اس کی گتھیوں کو سلجھایا گیا ہے کہ مطالعہ [illegible] نکل جاتا ہے۔ صرف اتنا کہہ کر "مطلب صاف ہے" ٹالنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ بلکہ طلبا کے ذہن و وجدان اور ان کی تعلیمی [illegible] رکھتے ہوئے ہر ایک لفظ محاورہ، تلمیحات، اشارات وغیرہ کو صاف صاف بیان کیا گیا ہے۔ [illegible] ہے۔ اس کی موجودگی میں کسی شرح یا لغت کی ضرورت نہیں رہتی۔ کتاب کی خوبی اور [illegible] ہوں گے۔ آج سب سے پہلی فرصت میں خریداری کیلئے فرمائش بھیجئے

کتابت وطباعت، کاغذ عمدہ

قیمت صرف تین روپیہ۔ علاوہ محصول ڈاک۔

ملنے کا پتہ:۔ شیخ ظفر محمد اینڈ سنز تاجران کتب کشمیری [illegible] لاہور

ایجنسی:۔ آفتاب بک ڈپو موہن لال روڈ بیرون موری گیٹ۔ لاہور

ہماری کتابیں

۱:- "ہیا" اور دوسری نظمیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سید مطلبی فرید آبادی۔

۲:- نام وننگ (نظمیں) ۔ ۔ ۔ ۔ عبد المجید بھٹی۔

۳:- سات کھیل ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ راجندر سنگھ بیدی۔

۴:- بہتا دریا (And Quiet flows the Don) ترجمہ سید مطلبی فرید آبادی۔

۵:- پُل پر (Bridge of San Louis Rey) ترجمہ۔ بشیر محمد اختر "اور ناجو"

۶:- سحر ہونے تک (چرکوف کا ایک روسی ناول) ترجمہ۔ "ابن انشا"

۷:- ایک آدمی (An ordinary Life) ترجمہ سید نذیر نیازی۔

سنگم پبلشرز لمیٹڈ۔ گیتا بھون، مکلوڈ روڈ۔ لاہور۔ (فون نمبر ۲۶۲۸)

علمی ادبی و صنعتی کتابیں

علم و ادب

رنگین دن رات زاہد رضوی کے افسانہ جات کا مجموعہ۔ ادبیات میں ایک نیا اضافہ ہے۔ یہ نومبر ۱۹۴۵ء کی تازہ ترین کتاب ہے جو ابھی ابھی چھپ کر مارکیٹ میں آئی ہے اور بیحد مقبول ہے۔ قیمت صرف ڈیڑھ روپیہ۔

نوک جھونک یہ طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا دلچسپ مجموعہ ہے جو منظور حسین صاحب زیدی کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ یہ کتاب بھی حال ہی میں شائع ہوئی ہے اور بہت مقبول ہو رہی ہے۔ قیمت صرف عہ

فارسی معلم فارسی سیکھنے والوں کیلئے اور ان طلبا کے لئے جو میٹرک یا منشی فاضل کے امتحانات کی تیاری کر رہے ہوں فارسی میں مدد لینے کیلئے یہ بہترین امدادی کتاب ہے اس میں فارسی گرامر کے مفید نوٹ اور جدید فارسی الفاظ و محاورات کی مختصر لغت دینے کے بعد ترجمہ کی مشقیں دی گئی ہیں آخر میں یونیورسٹی کے فارسی پرچہ جات کے سوالات مع جوابات کے دیئے گئے ہیں۔ قیمت صرف دو روپے

صنعت و حرفت

اُستادِ درزیاں مشہور ماہر فن ٹیلر ماسٹر محمد حسین دلاوری کی تصنیف ہے اس میں مردانہ زنانہ اور بچوں کے ہر فیشن کے کپڑے قطع کرنے اور تیار کرنیکی پوری ترکیبیں ہیں۔ کٹنگ کے نقشہ جات ابچوں کی صحیح پیمائش کے مطابق دیئے گئے ہیں ہر قسم کی تصاویر نہایت واضح اور صاف ہیں جو ایک معمولی سمجھ کا آدمی اور عورت بآسانی سمجھ سکتا ہے قیمت عہ

اُستادِ روزگار صنعت و حرفت کی کتاب ہے اس میں سیکڑوں ایسی چیزوں کے تیار کرنیکی ترکیبیں ہیں جن کی تجارت سے ہزاروں روپے پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ اس زمانہ میں صنعتی کاموں سے ہزاروں لوگ لکھ پتی بن گئے ہیں۔

آپ بھی اگر صنعت کے کاموں سے دولت کمانا چاہتے ہیں تو اس کتاب کو ضرور منگوائیں۔ قیمت عہ۔ ہر کتاب کا محصول بذمہ خریدار ہوگا

ملنے کا پتہ:- قریشی بک ایجنسی (م) لاہور

چند ہر دلعزیز مطبوعات

عظمتِ محمدؐ (انگریزی) قدسی بی۔ اے پیغمبر کائنات کے حالات زندگی سادہ زبان میں۔ مجلد عہ

مارچ آف نیشن (انگریزی) قائد اعظم محمد علی جناح کی تقاریر۔ مجلد ۱۲ روپے

تاریخ سلطنت خداداد محمود بنگلوری۔ ہندستان کے مجاہدین نواب حیدر علی اور ٹیپو سلطان کی مکمل سوانح حیات مع فوٹو بلاک۔ حجم ۵۰۰ صفحات ۱۲ روپے

ہندستان کی فیصلہ کن جنگیں محمود بنگلوری۔ مسلمانوں کے سیاسی عروج و زوال کی زندہ اور مکمل داستان مجلد عہ

انقلابات زمانہ محمود بنگلوری۔ چند تاریخی افسانوں کا مجموعہ یہ افسانے نہیں، تاریخ کے مختلف دوروں کے واقعات ہیں۔ مجلد عہ

تحفۃ النسا سید بشارت حسین۔ نسوانی زندگی کیلئے مشعل راہ۔ حفظ صحت غذا، مشروبات، دامن، ورزش، آرائش جمال اور سامان اکل و شرب تیار کرنے کے متعلق دلچسپ ہدایات۔ مجلد عہ

آیاتِ زندگی ناصر کمال بخاری پیمبر حریت۔ شہید اعظم حضرت امام حسینؑ کا فلسفہ شہادت۔ ۱۲ر

عورت گنہگار فارغ بخاری۔ مظلوم عورت کی خونچکاں داستان حیات اور مرد کی ہوسناکی کا شرمناک مرقع۔ مجلد عہ

فلسفہ تاریخ غلام محمد احمد۔ قوموں کی آبادی اور بربادی کے اسباب۔ مجلد عہ

دیہاتیوں کی اوقات فرصت سید شوکت حسین۔ اہل دیہات کی فرصت کیلئے بہترین مشاغل۔ مجلد ۵ر

خطبات اقبال سید شوکت حسین۔ علامہ اقبال کے فلسفیانہ لیکچروں پر نئے پہلو سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ ۴ر

جمہوریت خداداد پاکستان :- از اختر ۶ر

مکمل فہرست کتب مفت طلب فرمائیں

ملنے کا پتہ:- ملک بکڈپو۔ کوچہ زینیاں اسٹریٹ۔ لاہور۔

دفتر ۶۲ خلاصی پالیم
بنگلور سٹی

نیا دَور

ایڈیٹر
صمد شاہین

'نیا دَور' نکلے ہوئے ایک سال ہوتا ہے۔ اس کے پہلے چار نمبروں میں دوسروں کے علاوہ ان ادیبوں کے مضامین بھی شریک اشاعت رہے:-

حسرت موہانی۔ جوش ملیح آبادی۔ قاضی عبدالغفار۔ کرشن چندر۔ راجندر سنگھ بیدی۔ احمد علی۔
فراق گورکھپوری۔ عبدالقادر سروری۔ سجاد ظہیر۔ احتشام حسین۔ اوپندر ناتھ اشک۔
سعادت حسن منٹو۔ اختر انصاری۔ احمد ندیم قاسمی۔ آل احمد سرور۔ فیض احمد فیض۔ ن۔م۔ راشد
مدھوسودن۔ معین احسن جذبی۔ اختر الایمان۔ مخدوم محی الدین۔ ممتاز شیریں۔ سلام مچھلی شہری
عطا محمد۔ مجیب الرحمٰن۔

اور اس میں غیر ملکی اور دوسری ہندوستانی زبانوں کے شہ پاروں کے تراجم بھی پیش ہوتے رہے ہیں۔ ان ادیبوں کی کہانیاں شامل تھیں:-

ماستی وینکٹیش آئنگار (کنڑی) اجنت لما رسین گپتا (بنگالی) رادھا کرشن (ہندی) اننت کانیکر (مرہٹی) مائیکیل شالوخوف (روسی) اگینز یو سلونے (اطالوی) چینگ تین یہ (چینی) پرل بک (امریکی) واندا واسلیکا یولش۔

ان نمبروں کیلئے ابتک اتنی فرمائشیں آرہی ہیں کہ ان سب کا فرداً فرداً جواب دینا ناممکن نہیں اسلیئے اطلاعاً عرض ہو کہ پچھلے چار نمبر ختم ہیں۔ اور اب **نمبر ۵ شائع ہوگیا ہے**۔ اسکے مضامین کی فہرست ملاحظہ فرمائیے (سب مضامین غیر مطبوعہ ہیں):-

مضامین:- احتشام حسین "اقبال بحیثیت شاعر و فلسفی" (۲) عبدالقادر سروری "ظفر علی اور انکی شاعری" (۳) علی عباس حسینی "اردو ناول نویسوں کا نیا دور" (۴) عطا محمد "نئے نقاد" (۱) فراق گورکھپوری (۵) صمد شاہین "جنگ اور ادب"۔

افسانے:- مہندر ناتھ "سالی کہیں کی" (۲) مدھوسودن "شمع پروانے اندھیرا" (۳) امرت رائے "عفار ماسٹر (ہندی)" (۴) قرۃ العین حیدر "ہم لوگ" (۵) سرلادیوی "کلنک"۔ (۶) س۔م۔ ہند و چی (چینی)

نظمیں:- احمد ندیم قاسمی۔ وامق جونپوری، الطاف مشہدی۔ فکر تونسوی، شور علیگ، عزیز حامد مدنی۔ خورشید الاسلام، اجابر علی، نصیر حیدر۔
اور ایک طویل نظم تاریک سیارہ: از اختر الایمان۔

نمبر ۶ مرتب ہوگیا ہے۔ اور اس کی کتابت ہو رہی ہے۔ اسکے مضامین بھی نیا دور کے لئے بھیجے گئے ہیں۔ لکھنے والوں کی فہرست ملاحظہ کیجئے
کرشن چندر۔ احمد علی۔ اختر رائے پوری۔ اختر اورینوی۔ احمد ندیم قاسمی۔ رامانند ساگر۔ قدرت اللہ شہاب۔ انور۔ وشوامتر عادل۔ مخمور جالندھری۔ وامق جونپوری۔ مجیب الرحمٰن۔ شور علیگ۔ ابن انشا۔ دیوتی سرن شرما وغیرہ۔ تراجم: وی ایس پریچٹ کی بہترین کہانی (SAILOR) مترجمہ شبلی۔ بی کام۔ اور ایک فرانسیسی کہانی: مترجمہ ممتاز شیریں۔

سالانہ چندہ چھ روپے (۶) قیمت فی پرچہ ایک روپیہ چار آنے (۱؎۴) ۱۶۰ صفحات کتابی سائز
(نمونہ مفت نہیں بھیجا جا سکتا)

دفتر ۶۲ خلاصی پالیم، بنگلور سٹی

مطبوعات کتب خانہ علم و ادب دہلی

مسلمانانِ ہند کی حیاتِ سیاسی؟!

ہندوستان کے مسلمانوں کی صد سالہ سیاسی زندگی کا مکمل جائزہ!
اہم وطنی تحریکوں میں مسلمانوں نے کیا شاندار قربانیاں پیش کیں ۔۔۔؟
ایک شاندار مرقع!!

سیاست ماقبل اور مابعد جنگ پر نہایت بے لاگ مدلل اور بصیرت افروز تبصرہ!! نظریہ قومیت متحدہ کا بطلان خالص سیاسی اور منطقی نقطۂ نظر سے، کانگرس کی متعصبانہ سرگرمیوں اور ریاکارانہ سیاسی چالاکیوں کا صحیح ترین نقشہ، خود اس کی پچاس سالہ زندگی کی تاریخ کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ ۱۸۵۷ء کے بعد سے اب تک مسلم سیاست میں جو نشیب و فراز پیدا ہوئے ان پر بڑی جامعیت اور سیاسی بصیرت کے ساتھ ایک بلیغ اندازِ تحریر میں روشنی ڈالی گئی ہے اور ان سب اہم ملکی مسائل کا پوری شرح و بسط کے ساتھ احاطہ کیا گیا ہے جن سے اس وقت جداگانہ مسلم قومیت کی تعمیر ہو رہی ہے۔

مسلم لیگ کے درخشاں کارناموں، اور اس کے سیاسی مسلمات، اور جداگانہ مسلم سلطنت کے قیام کی اسکیم کا صحیح جائزہ اور دوسری "نیم سیاسی نیم مذہبی جماعتوں (خلافت، جمعیۃ العلماء، احرار وغیرہ) کی مکمل تاریخ اور ان کا نصب العین بھی پیش کر دیا گیا ہے اور ملک کے حالات و واقعات کی روشنی میں یہ دکھایا گیا ہے کہ یہ جماعتیں کس حد تک مسلمانوں میں انتشار اور لامرکزیت پیدا کرنے کی ذمہ دار ہیں!

غرض مسلم سیاست پر یہ ایسی جامع کتاب ہے کہ اس سے بہتر کتاب آج تک نہیں لکھی گئی۔ جو مصنف کتاب محمد مرزا صاحب کے سالہا سال کے سیاسی افکار و مطالعہ اور صحافی تجربہ کا نتیجہ ہے ضخامت ۲۵۶ صفحات کتابت طباعت نہایت پاکیزہ اور دیدہ زیب۔ مجلد قیمت صرف ایک روپیہ آٹھ آنے (۱؎۸)

دوسری جنگ عظیم

(مشہور سیاست نویس محمد مرزا دہلوی کے قلم سے)

یہ جنگ عظیم کیوں ہوئی؟ کن عناصر نے اقوام عالم کو متحارب بنایا؟ جنگ اور انسانیت کی تاریخ کیا کہتی ہے۔ مجلس اقوام نے دنیا کے لئے کیا کیا؟ ہندوستان اور مشرق قریب میں اضطراب کن اسباب کی بنا پر ہوا؟ فلانڈرس کا سانحہ، سوویٹ روس اور جاپان کے سیاسی تعلقات۔

نازی پارٹی۔ محوری طاقتیں اور جنگ عظیم ثانی کے مابعد اثرات۔

غرض اس قسم کے تمام سوالوں کا جواب اس مبسوط تاریخ میں ہے۔ جدید رجحانات عالم اور یورپ کی موجودہ کشمکش کا بہترین مطالعہ اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے۔ قیمت دو روپے (عہ)

دیوان حالی حالی	۱؎	زلفی مولوی عنایت اللہ	۱؎
مقدمہ شعر و شاعری "	۱؎	خواب پریشاں "	۸؍

سچی کہانیاں؟

"حقیقت افسانے سے زیادہ دلکش ہوتی ہے" اور اگر یہ دونوں یکجا ہو جائیں تو؟

زندگی آرٹ کے سانچے میں ڈھل جاتی ہے! "پریم پجاری" نے اردو افسانہ نگاری میں ایک نئے اسلوب کا اضافہ کیا ہے۔ یہ اسلوب جدید بھی ہے اور لذیذ بھی۔ زندگی کی تلخ حقیقتوں کو رومان کی شیرینی میں سمو کر اس طرح پیش کرنا کہ پڑھنے والے کے دل میں یہ کڑوی مٹھاس میٹھا میٹھا درد پیدا کر دے صرف پریم پجاری ہی کو آتا ہے۔ اس شاعر ادیب کی پندرہ سچی کہانیوں کا حسین مجموعہ منگا کر اپنے ذوق لطیف کی تسکین کیجئے۔ مجلد اور نظر فریب گردپوش سے آراستہ۔ دوسرا ایڈیشن قیمت ہے،

جھروکے

وہ زبان جو شاہجہاں کے لشکر میں پیدا ہوئی جس میں بھانت بھانت کی بولیاں جذب ہوئیں، جب نکھر کر منظر عام پر آئی تو اس نے اس غضب کا رنگ روپ نکالا کہ بادشاہ اور بیگمات بھی اس پر فریفتہ ہو گئیں۔ یوں ریختہ "اردوئے معلّٰی" کہلائی۔ لال قلعہ میں پہونچ کر اس کی سج دھج نے سارے ہندوستان کا دل موہ لیا۔ غدر ۱۸۵۷ء میں سلطنت مغلیہ کی بساط لپیٹ گئی انگریزوں کے تسلط کے ساتھ انگریزی نے رواج پایا اور دلّی کی ٹکسالی زبان معدوم ہونے لگی یہاں تک کہ اب ہندوستان کے معدودے چند نفوس ہی اس کے صحیح خد و خال سے واقف ہیں۔ یوں ہی ہمارے ایک مولانا اشرف صبوحی دہلوی ہیں جن کا سینہ اس آفتاب کے نور سے منور ہے۔ مولانا کی موصوف کی کئی کتابیں شائع ہو کر ہاتھوں ہاتھ لی گئی ہیں۔ "جھروکے" ان کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ دلی کی البیلی زبان اور بیگمات کے تیکھے محاورے آپ کو صرف صبوحی صاحب ہی سنا سکتے ہیں۔ کتاب مجلد اور دلکش سرورق سے آراستہ ہے۔ قیمت ۱؎

بے پَر کی

جھوٹ سچ تو سب ہی سناتے ہیں۔ کوئی غپ اُڑاتا ہے اور کوئی زٹل چھوڑتا ہے۔ کوئی زمین آسمان کے قلابے ملاتا ہے اور کوئی آسمان پھاڑ کر اس میں تھگلی لگاتا ہے۔ مگر جو لطف بے پر کی اُڑانے میں آتا ہے وہ کسی اور میں نہیں آتا۔ بے پر کی اڑانے کے لئے ضروری ہے کہ اصل واقعہ کی کوئی پختہ بنیاد ہو۔ رتن ناتھ سرشار نے فسانۂ آزاد کی چار جلدوں میں بے پر کی اڑائی ہے۔ حضرت "آوارہ" ان ہی کے نقش قدم پر چلے ہیں مگر آجکل کی روشنی میں۔ آوارہ صاحب مضحکہ خیز واقعات کو بڑی چٹپٹی زبان میں لکھتے ہیں۔ ان کا ہر فقرہ ایک مسکراتا پھول اور ہر مضمون ایک کشتِ زعفران

کتب خانہ علم و ادب اردو بازار دہلی سے طلب فرمائیے

ہوتا ہے۔ اس کے مضامین کے دوران مطالعہ میں آپ کے دل میں گدگدی ہو گی، آپ مسکرائیں گے، آپ ہنسیں گے اور بے اختیار ہو کر قہقہے لگانے لگیں گے۔ ان کے منتخب خندہ خیز مضامین اور افسانوں کا مجموعہ "بے پرکی" شائع ہو گیا ہے۔ اگر آپ مصائب و آلام زندگی سے نجات پانا چاہتے ہیں تو "بے پرکی" منگائیے اور غم و الم کو قہقہوں میں اڑا دیجئے۔
کتاب مجلد و نظر فریب سرورق سے آراستہ ہے۔ قیمت عہ/ ۱۲/

بھابی جان

اردو میں ہنسانے والی کتابوں کی بہت کمی ہے۔ فضل حق قریشی نے اردوئے ادب لطیف میں "بھابی جان" کا پر لطف کردار پیش کر کے اس کمی کو بہت کچھ پورا کر دیا ہے۔ بھابی جان اور ان کے ننھے کی نوک جھونک ایسی مزیدار ہے کہ پڑھنے والا بے حال ہو جاتا ہے۔ مضحکہ خیز واقعات اور عورتوں کی ٹکسالی زبان نے اس کتاب میں ایک مخصوص دلکشی پیدا کر دی ہے۔ اس کا ہر باب ایک افسانہ ہے اور یہ سب افسانے مل کر ایک ناول کا روپ دھار لیتے ہیں۔ "بھابی جان" کا آغاز مزاح و طنز سے ہوتا ہے لیکن محسوس طور پر اس میں آہستہ آہستہ واقعات کی کچھ ایسی تبدیلی ہوتی ہے کہ جب ہم کتاب ختم کرتے ہیں تو ہماری آنکھوں میں آنسو ہوتے ہیں۔ کیا ہنسنے اور رونے کا واقعی چولی دامن کا ساتھ ہے؟ یہ آپ کو "بھابی جان" کے مطالعہ سے معلوم ہو گا۔ کتاب مجلد ہے اور سرورق سے آراستہ۔ قیمت عہ/

سلمے

ایک دفعہ کا ذکر ہے ——— "ایک لبندہ ومان بغداد"
ہر کہانی بلاشبہ یوں ہی شروع ہوتی ہے۔ اور ملک کے نامور ادیب جناب اشرف صبوحی نے بھی "بغداد کے جوہری" کا قصہ اپنے دلربا طرز بیان کے ساتھ یوں ہی شروع کیا ہے۔ مگر اردو زبان میں فطرت انسانی کی ایسی لاجواب تفسیر ایسے دلکش انداز میں شاید ہی کبھی پیش کی گئی ہو۔ یہ ناول ایک نفیس و دلچسپ نفسیاتی نکتہ کا حل پیش کرتا ہے۔ عورت کی شوہر پرستی اور وفاداری اسے ہر نوع کی قربانی پیش کرنے کے لئے کیوں مجبور کر دیتی ہے۔
ہوس پرست حسن بین، عاشق زار، شوہر سے محبت کرنے والی بیوی کو کس جنونی جذبہ کے ماتحت آزمائشوں میں ڈالتا ہے اور عورت اس کا جواب کس ہمت بیدار کے ساتھ دیتی ہے اس کا جواب اس ناول میں آپ سطر بہ سطر پائیں گے۔
بہت سے شوہر بغداد کے احمد جوہری کے آئینۂ زندگی میں اپنا مجرم چہرہ پائیں گے۔ اکثر نیک نفس بیویاں سلمٰی جیسی عفت مآب اور دیوانہ شوہر بیوی بننا پسند کریں گی۔
خلیفۂ معزز کے حرم کے راز سربستہ۔ بغداد کی روزمرہ زندگی خلاصہ الف لیلوی ماحول عیش و تنعم کی دہکتی ہوئی آگ۔ روح کی بیباک سنائیں۔ عورت کا [illegible] بوالہوس مرد کی ہوس کارانہ جنوں سامانیاں پُر تکلف ایوان لق و دق صحرا رنج و راحت، مسرت و کلفت پہلو بہ پہلو۔
احمد جوہری اور سلمے کی پرسوز حیرت انگیز داستان محبت و زندگی آپ کو ایک طلسم بے خودی میں لیجا کر چھوڑ دے گی۔ بہت بلند پایہ تصنیف ہے اور بلاشبہ افسانہ طرازی کا ایک اعجاز ہے۔ نفیس عبارت۔ بلیغ طرز بیان۔ چست و رواں، عبارت پڑھنے والے کے حواس پر چھا جاتی ہے۔ سرورق نہایت خوشنما مجلد قیمت دو روپے (عہ)

بن باسی دیوی

(از اشرف صبوحی) انسان جب اپنے دور وحشت میں سے گذر رہا تھا اور تہذیب نے اسے کوئی جامہ نہیں پہنایا تھا اس وقت وہ کس طرح رہتا تھا۔ کس طرح پیدا ہوتا، محبت کرتا اور مر جاتا تھا۔ ایک حسین عورت کس طرح ایک بڑے بھاری قبیلے کی سرداری کرتی ہے۔ یہ سب عناصر ہیں اس دلچسپ داستان کے جو "بغداد کے جوہری" کے مصنف سید اشرف صبوحی دہلوی نے خاص اپنے انداز تحریر میں تحریر کئے ہیں۔ اس ناول میں انشاء پردازی کے [illegible] دکھلائے گئے ہیں۔ و فیسر مرزا محمد سعید صاحب آئی ای ایس کا بیش قیمت مقدمہ شامل کتاب ہے۔ دوسرا اڈیشن معہ تصویر و خوبصورت گرد پوش۔ قیمت تین روپے (سے ر)

"ٹوٹے ہوئے پر"

سرزمین شام کے آتش نگار شاعر اور سحر نگار ادیب جبران خلیل جبران کے ایک ناول کا ترجمہ جس میں حسن و عشق کی فسوں کاریوں کو اتنے دلچسپ اور پُراثر انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ آپ اسے پڑھتے وقت خود کو اس عالم سے دور ——— بہت دور ایک اور عالم میں پائیں گے جہاں ہر طرف روح کی حکومت ہے اور جس کا ہر ذرہ حساس دل کی طرح دھڑکتا ہے۔
مصنف کا طرز ادا اور اسلوب تحریر اس قدر اچھوتا ہے کہ عربی کے ہر بڑے ادیب نے اس کا اعتراف کیا ہے اور مترجم نے اپنی محنت سے ترجمہ کیا ہے کہ اصل کی تمام خوبیاں اردو میں منتقل کر دی ہیں یہاں تک کہ جبران کا اسلوب تحریر بھی قائم رکھا گیا ہے۔ ہندوستان کے ہر ادیب و نقاد نے تسلیم کیا ہے کہ یہ ترجمہ اردو کے دامن کا ایک سدا بہار پھول ہے۔ مترجمہ اشعر دہلوی۔ مجلد معہ گرد پوش۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے (عہ)

گمہت

یہ قیسی رامپوری کا وہ زندہ ناول ہے جس کی آواز آنے والی نسلیں ہمیشہ سنتی رہیں گی۔ بے شک ہمارے اعمال ہمیشہ طہارت و پاکیزگی میں ملبوس نہیں رہ سکتے لیکن وہ بلند اصولوں کے تحت بلند ہو سکتے ہیں۔ عکاس فطرت حضرت قیسی رامپوری کا یہ ناول جیتے جاگتے کرداروں کا ایک حسین خاکہ ہے جس میں بدکرداری کا عکس نام کو نہیں ہے۔ یہ کتاب بڑے اطمینان سے شریف بہو بیٹیوں کو تحفے میں دی جا سکتی ہے۔ پھر دلچسپ اتنی ہے کہ ایک مرتبہ شروع کرنے کے بعد جب تک ختم نہ ہو جائے۔ ہاتھ سے رکھنے کو جی

نہیں چاہتا۔ کتاب مجلد اور خوش نما سرورق سے آراستہ دوسرا اڈیشن قریب الختم ہے۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے (۲؍۸)

جہاں آرا ؟

مغلوں کے رنگ محل کی ــــــــ ایک خونابہ فشاں داستان

ہندوستان میں ایک بادشاہ گذرا ہے شاہجہاں،
وہ اپنی اولاد کے ہاتھوں کتنا نالاں و مجبور رہا!
اس کی ایک لڑکی تھی "جہاں آرا"۔ وہ دنیا میں کیسی دکھی رہی۔!
وہ مغلوں کے حرم جن کی اتنی شہرت ہے اندر کیا تھے اور باہر سے کیا معلوم ہوتے تھے۔
وہ لڑکی روشن آرا اپنی بڑی بہن سے کیوں جلتی تھی۔
مغلوں کے دربار اور حرم کے بیچ میں کون کونسی ہستیاں کیا کیا کام سرانجام دیتی تھیں،
مغلوں کے رسوم و قومی خصائل، بہنوں اور بھائیوں کی اور بشمول شاہجہاں کی بے بسی "جہاں آرا"، کی زندگی کا پاکیزہ المیہ حیات ہزاروں خواجہ سراؤں، کنیزوں۔ غلاموں۔ خادموں۔ سپاہیوں۔ نوابوں کی ایک بھیڑ ہے اس قلمی فلم میں آپ کو دکھائی دے گی۔
ہندوستان کے تخت کے لئے بھائی بھائی سے دست و گریباں۔
ایک مجبور حیات بے بس بوڑھا جو بادشاہ وقت تھا۔
ایک شکار زندگی کی آہنی زنجیروں کا۔
"جہاں آرا"، کا ہر سانحہ مغلوں کی حرم کی سیر بیں ہے۔
نیم تاریخی رومان۔ فلم کے سے واقعات ہر سانحہ نشتر، ہر فقرہ دلگیر!
از ظفر قریشی بی اے دہلوی۔ نہایت خوبصورت گرد پوش مجلد، دوسرا اڈیشن۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے (۲؍۸)

سمن پوش

ملک کے نامور فسانہ نگار مجنوں گورکھپوری نے بعض المناک افسردہ، پرتاثیر افسانے کچھ اس ڈھنگ سے لکھے ہیں کہ ہم انہیں اردو کا ہارڈی کہتے ہیں۔ "سمن پوش"، اور اس کے ساتھ دوسرے حیرت فزا افسانے ایک دوسری دنیا کی خبر دیتے ہیں جنہیں ظاہری حواس نہیں پہچانتے۔ روحانیت کی دنیا۔ زندگی کی اسی صبح و شام کا ماورائی پرتو۔ عشق مجبور جب ستاروں سے آگے والی دنیا میں پہنچ کر اس جہان کے افسانوں پر اثر انداز ہوتا ہے تو کیا ہلچل پیدا ہوتی ہے۔ "سمن پوش"، ایک بیحد غمناک پر اسرار کہانی ہے اور اس کے ساتھ کچھ اور افسانے بھی اسی دوسری دنیا کے ہیں جسے نہ آنکھ دیکھ سکتی ہے نہ ہاتھ چھو سکتے ہیں مگر روح سے وجدان حاصل ہو سکتا ہے۔ سرورق نہایت خوش نما دوسرا اڈیشن قیمت مجلد ایک روپیہ آٹھ آنے (۱؍۸)

دیوان حالی	حالی	۱؍۸	زلفی	مولوی عنایت اللہ	۱؍۸
مقدمہ شعر و شاعری	؍؍	۱؍۸	خواب پریشان	؍؍	۱؍۴

"گردش"

حضرت مجنوں گورکھپوری عرصہ ادب کے مشہور شہسوار ہیں۔ ان کا مخصوص موضوع فکر، مخصوص انداز نگارش اور مخصوص اسلوب بیان انگریزی کے عدیم المثال ناول نگار ٹامس ہارڈی سے اس قدر ملتا جلتا ہے کہ ہم بلا شبہ انہیں اردو کا ہارڈی کہہ سکتے ہیں۔ "گردش" مجنوں صاحب کا طویل افسانہ (ناولٹ) ہے، جس کی بنا ہارڈی کے ایک ناول پر رکھی گئی ہے۔ اس ناولٹ میں دکھایا گیا ہے کہ انسان کی شخصی و اجتماعی زندگی کی خوبیاں اور برائیاں، کامیابیاں اور ناکامیاں، الذتیں اور کلفتیں، انفرادی کردار کے گرد گھومتی ہیں۔ انفرادی کردار اگرچہ خارجی اسباب سے بنتا ہے لیکن اگر وہ منضبط اور قوی ہے تو اس کی تاثیر خوشگوار اور اس کے سارے ماحول کو بدل کر رکھ دیتی ہے۔ زبان صاف، انداز بیان سنجیدہ اور اسلوب نگارش دلپذیر ہے۔ کتاب اچھے کاغذ اور اچھی کتابت و طباعت کے ساتھ خوشنما چھاپی گئی ہے مجلد مع رنگین گردپوش۔ دوسرا اڈیشن قیمت مجلد ایک روپیہ چار آنہ (۱؍۴)

"پنکھڑیاں"

شیریں کے بارہ افسانوں کا مجموعہ، جن میں شریفانہ محبت کی رعنائیاں بھی ہیں اور سرمایہ دارانہ کمزوریوں پر طنز بھی، نفسیاتی اشارے بھی ہیں اور زندگی کے بعض سطحی حقائق کی ترجمانی بھی۔ زبان نہایت صاف اور شیریں۔ انداز بیان سلجھا ہوا۔ کتاب مجلد اور خوش نما گرد پوش سے آراستہ۔ قیمت دو روپیہ چار آنے (۲؍۴)

دوشیزۂ صحرا

صحرائے عرب کی خوں آشام زہرہ کا فسانۂ محبت۔ اس پرفسوں و سحر خیز داستان میں مصنف نے رنگین حسن کا ایک انوکھا قصۂ عشق سنایا ہے، جس میں محبت و نفرت، ستم و انتقام، ظلم و ستم اور جنگ و جدل کبھی آپ کے رونگٹے کھڑے کر دیں گے اور کبھی حسن کی سرگوشیاں، عشق کی کارفرمائیاں اور رقابت کی سوختیں آپ کو انگشت بدنداں کر دیں گی۔
بنت شیخ کی تعیش گاہ، اجڑی ہوئی خانقاہ کی الوہیت، ہیلن کی جرأت و مردانگی، الفت کا پیمان وفا الاسد کا جنون رفاقت نابینا یوسف کا لرزہ براندام کر دینے والا انتقام اور حسین و جمیل زہرہ کا ــــــ جس کی دہشتناک خونریزی اور بے پناہ قتل و غارت سے ریگستان عرب کا ذرہ ذرہ کانپ اٹھتا ہے ــــــ ہیلن کے محبوب کی الفت میں گرفتار ہونا، مگر حصول مقصد میں ناکام و مایوس ہو کر وہ صحرا کو پاؤں تلے روندتے ہوئے فرار شدہ محبت و محبوب کو تہ تیغ کر دینے کی کوشش کرنا ــــــ
یہ سب چیزیں آپ کو ایک نئی دنیا میں لے جائیں گی۔
اس ناول کو پڑھکر آپ عرب اور عرب کے جنگجو لوگوں کے جملہ حالات مثلاً ان کے رسم و رواج، ان کی مہمان نوازی، عادات و خصائل بھی

جرأت فنون حرب سے آگاہی، رہنے سہنے کے طریقے، مذہب معاشرت وغیرہ وغیرہ سے بخوبی واقف ہوجائیں گے از صادق الخیری ایم اے دہلوی کتابت طباعت بہترین۔ سرورق نہایت خوشنما قیمت مجلد عگ

لالہ رُخ

مصور اڈیشن:۔ انگلستان کے مشہور شاعر طامس مور کی مثنوی جو خالص مشرقی تصورات اور نازک تخیلات عشق پر مبنی ہے۔ تین ہزار رنگین دے کر لانگ مین کمپنی نے اسے شائع کیا تھا اور تمام انگریزی داں طبقہ اس کو دیکھکر چونک پڑا تھا۔ افسانے کا پلاٹ رومان اور طلسم کی ایسی دنیا میں آپ کو پہنچا دیگا کہ آپ خود اس قصہ کا ایک کردار بننا پسند کریں گے۔ مقنع (نقاب پوش پیغمبر) "آتش پرستان فارس"، "پری اور بہشت" اور "نور محل" چار قصے ہیں۔ کتب خانہ علم و ادب نے اس کو مصور چھاپنے کے لئے تقریباً تین درجن آرٹ کی بہترین تصاویر کا اہتمام کیا ہے جو اس کے ایک نایاب ولایتی اڈیشن سے خاص طور پر زر کثیر خرچ کر کے حاصل کی گئی ہیں۔ اردو میں ایسی بے مثل کتاب نہیں چھپی۔ بہترین کاغذ، بے بہا ادب و رومان، دل نشیں تصاویر اور دیدہ زیب آرائش کے ساتھ اس نادر ادبی کارنامہ کو شائع کیا گیا ہے قیمت مجلد معہ خوبصورت گرد پوش۔ قیمت سے

اُردو کے افسانوی ادب میں ایسی کتاب آج تک شائع نہیں ہوئی

یک قصہ بیش نیست غم عشق وایں عجب
از ہر کسے کہ می شنوی نامکرر است

سات تارے

یگانگت کا یہ عالم کہ اصل سب کی ایک تضاد یہ کہ جداشان ہر فسانے کی

ایک ہی پلاٹ پر سات مشہور افسانہ نگار صاحبان

ایم اسلم قیسی رامپوری۔ شاہد احمد۔ انصار ناصری فضل حق قریشی۔ اشرف صبوحی ابو طاہر طاہر دد کے شاہکار افسانے۔ ہر افسانہ کچھ ایسے پیرایہ میں لکھا گیا ہے کہ اچھوتا معلوم ہوتا ہے ہر افسانہ نگار نے اپنی انشاپردازی کا سارا زور صرف کر دیا ہے۔ اس ہفت رنگ مجموعہ میں ادب لطیف کا کمال دیکھیے۔ پلاٹ ایک ہی ہے لیکن ہر افسانہ نگار کی جنبش قلم نے کچھ اس طرح پیش کیا ہے کہ کہانی بالکل نئی چیز معلوم ہوتی ہے۔ حسن کاری کا ایسا نادر مجموعہ آپ کو غیر زبانوں میں بھی نہیں مل سکتا۔ پلاٹ یہ ہے۔

ایک شخص غیر متعارف خاتون سے خط و کتابت۔ رومانی فضا اور دلبستگی
——— ایک حسینہ سے تعارف ——— محبت ——— ازدواج ———
مسرت و انبساط ——— شکر رنجیاں کشیدگی ——— بیزاری ———
ایام گذشتہ کی یاد ——— سابقہ مراسلت کی تجدید ——— تحصیل سکون۔
اتفاقیہ طور پر انکشاف حقیقت مراسلہ نگار خاتون کی اصل شخصیت ———
شریک حیات!!

دوسرا اڈیشن

لکھائی چھپائی کاغذ عمدہ۔ خوبصورت کور کے ساتھ۔ مجلد قیمت سے

بہادر شاہ اور پھول والوں کی سیر از مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی قیمت ۶ر

رقاصہ

انسان کی شقی القلبی و سفاکی کی حیرت ناک داستانیں پڑھکر آپ ششدر رہ جائیں گے۔ انسان پر جب حیوانیت چھاجاتی ہے تو درندوں سے زیادہ بے رحم اور شیطان سے زیادہ سیاہ کار ہوجاتا ہے۔ ملک کے مشہور ادیب ایم اسلم نے خوفناک جرائم کو افسانوں کے پیرایہ میں لکھ کر اُردو افسانہ نگاری میں ہیتناک افسانوں کا اضافہ کیا ہے۔

رقاصہ اور دوسرے خوفناک افسانے:۔ جب آپ پڑھیں گے تو سانس بھی روک کر لیں گے۔ بعض مقامات ایسے بھیانک ہیں کہ آپ کے رونگٹے کھڑے ہوجائیں گے۔ مثلاً رقاصہ جب اپنے گھر پہونچی تو اس کا آدھا منہ ہمیشہ کے لئے نیلا ہوچکا تھا۔ کیوں؟ یہ آپکو پڑھنے کے بعد معلوم ہوگا۔ یا "شادی کی رات" میں جنگ بہادر نے شوہر ماکو اسکے عاشق اور ہونیوالے شوہر کا خون چھاڑ کر پلایا اور جب اس نے منہ بند کرلیا تو اس کے ہونٹ کاٹ کر خون پلایا۔ زندہ آدمی کا گوشت کاٹ کاٹ کر کتے کو کھلایا۔ انتقام کی آگ سرد کرنے کے لئے چونے کے بھٹے میں زندہ آدمی کو ڈالکر اوپر سے پانی ڈالدیا گیا۔ نار جہنم سے بھی زیادہ شدید تھی یہ آگ! اور خوفناک اذیتوں کی ایک طویل فہرست ہے جو یہاں پیش نہیں کی جاسکتی۔ جب آپ ان سات دہشتناک افسانوں کو پڑھیں گے تو انسانی سرشت کی خباثت دیکھ کر انگشت بدنداں رہ جائینگے۔

مجلد قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے (عہر) تیسرا اڈیشن

کھرپا بہادر

مرزا عظیم بیگ چغتائی نے اس ناول میں ایک عجیب و غریب قصہ پیش کیا ہے۔ ایک بدمعاش لفنگے کی سرگزشت سے اس ناول کی ابتدا ہوتی ہے۔ روزانہ اس کے سر پر پولیس والوں کے جوتے پڑتے ہیں اور کئی دفعہ سزا بھی پاتا ہے۔ اس بدمعاش کی شادی ایک نواب صاحب نے ضد میں آکر اپنی چہیتی اور بجد لاڈلی بیٹی سے زبردستی کردی اور اُسے کھرپا بہادر کا خطاب دیا۔ اس بدمعاش پر شاہی محلات میں جو کیفیت طاری ہوتی ہے وہ الف لیلیٰ کے سوتے جاگتے (ابوالحسن کے قصے سے بھی زیادہ دلچسپ اور مضحکہ خیز ہے۔ اسی ناول میں ریاست لنکران کے ساتھ ساتھ ریاست کفترہ کے غمناک واقعات بھی بیان کئے گئے ہیں۔ ایک بیگم پر طرح طرح کے ظلم توڑے جاتے ہیں، یہاں تک کہ اسے کوا ہنکنی بنادیا جاتا ہے، محلات کی جگمگاتی فضا میں آپ عجیب عجیب ریگستان دیکھیں گے کہیں ہنسی اور کہیں قہقہے کہیں آنسو اور کہیں خون کی بوندیں "کھرپا بہادر" کو پڑھ کر آپ شرر کے "مور بار حرام پور" کو بھول جائیں گے تقریباً دو سنو؟ نہایت دلفریب صفحات کی کتاب ہے اور قیمت عہر۔ چوتھا اڈیشن

مراۃ العروس	مولوی نذیر احمد	عہر	چند پند	مولوی نذیر احمد	۱۰ر
بنات النعش	"	۸ر	منتخب الحکایات	"	۱۰ر
توبۃ النصوح	"	۸ر	معاشقہ نپولین	آزاد	۶ر

افسانۂ پدمنی

(از قلم مولوی احتشام الدین دہلوی ایم اے علیگ)

چتوڑ کی رانی پدمنی سے سلطان علاؤالدین خلجی کے عشق و اشتیاق کی داستان اور اس کی مورخانہ تحقیق و تنقید۔

بناوٹی قصہ پدمنی پر بے لاگ و مدلل جرح۔ اصل قصہ نہایت دلکش انداز میں بے اصل "تاریخی" شواہد کا بطلان۔ وہ کونسا علاؤالدین تھا جس سے یہ قصہ فی الحقیقت منسوب ہونا چاہیئے۔ غلط تاریخ کس طرح بنتی چلی گئی اس کی دنبالہ داری اور خوردبینی تحقیق کے لئے اس مفکر ادیب و عالم کے نام کی ضمانت ہی کافی ہے۔ قیمت عہ/

شمع انجمن

اس صادق القلم مصنف کا دوررس ذہن اور بے پناہ جائزہ زندگی ایک ایسا کارنامہ ہے کہ اسے بقول دلفگار "اردو کا جراح ادیب" کہا جا سکتا ہے سماج کے جسم بیمار کے لئے اس کا قلم واقعی نشتر بیداد سے کم نہیں۔ حقیقت نگاری کے (۱۶) دل آویز رومانی نمونے۔ تخیل رفیع و بلند زبان شستہ و شاعرانہ اور نفسیاتی تحلیل و قصہ گوئی کے الف لیلوی طرز سے تو وہ بعض اوقات "اردو کا ڈراورہینری" معلوم ہونے لگتا ہے! صادق الخیری ایم اے دہلوی۔ مجلد معہ خوبصورت گردپوش قیمت ۱۲/

بزم آخر

مصنفہ منشی فیض الدین صاحب مرحوم

غدر سے پہلے جب قلعہ لال حویلی کہلاتا تھا — جب اس لال حویلی کا سہاگ اجڑ چکا تھا۔ جب لال حویلی کی چار دیواری میں آخری مغلیہ شمع جھلملا رہی تھی۔ جب مغلیہ خاندان کے آخری تاجدار کی حیثیت شاہ شطرنج سے زیادہ نہ تھی۔ اُس وقت بھی لال قلعہ میں دردیاں دمامے نوبت اور نقارے بجتے تھے۔ بادشاہ بیگمیں، شاہزادے شہزادیاں عیش و راحت کے گہواروں میں جھولا جھولتی تھیں۔ ان کا کھانا پینا، اوڑھنا بچھونا، کھیل کود۔ تیج تہوار، رسم و رواج، بولیاں ٹھولیاں کچھ ایسی عجیب و غریب اور من موہنی تھیں کہ آجتک ان کی یاد دلوں کو گدگدا رہی ہے۔

بزم آخر اسی لال حویلی کی تہذیب و معاشرت، رسم و رواج اور زبان کا وہ زندہ جاوید مرقع ہے جس کی صداقت اور اہمیت سے کسی کو انکار کی جرأت نہیں۔ اس لئے کہ ان باتوں کو ایسے منشی نے رقم کیا ہے جن کی پرورش قلعہ میں ہوئی اور وہیں چھوٹے سے بڑے ہوئے جو کچھ انہوں نے لکھا اس کی تصدیق مرزا محمد سلیمان شاہ صاحب سرپرست خاندان تیموریہ نے خود اپنی قلم سے کی ہے۔ کاغذ عمدہ سفید مجلد قیمت ڈیڑھ روپیہ (۱۸/)

نئی شہسوار بلقیس بیگم ۴/ — پیغام فطرت۔ جاذب دہلوی ۲/

خطوط کی ستم ظریفی

مرزا عظیم بیگ چغتائی نے یہ بہترین اپنے مخصوص رنگ میں لکھا ہے پلاٹ اس قدر عجیب و غریب ہے کہ ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جاتے ہیں اور ساتھ ہی حیرت و استعجاب کی لہریں دل و دماغ میں دوڑ جائیں گی یہ صرف کتابیں نہیں ہنسنے ہنسانے کا مستقل ذریعہ ہے بہترین کتابت و طباعت کے ساتھ خوبصورت ترین سائز پر شائع کی گئی ہے۔

تیسرا اڈیشن قیمت ۱۰/۔

سلاسل

(جاں نثار اختر ایم۔ اے۔ علیگ) اگر آپ قدیم و فرسودہ رنگ غزل سے متنفر ہو چکے ہیں۔

اگر آپ جدید رجحانات ادب و شعر سے ربط رکھنا چاہتے ہیں۔

آنے والے انقلاب کی آواز نغمے سے اگر آپ کی روح چونکنا چاہتی ہے تو رومان و نغمہ اور شباب انقلاب کے اس شعری پیکر کو دیکھئے سماج کے احساس قدامت کے لئے ایک ضرب ہے اور روح کو فردوسی نغموں سے سرشار کر دینے والی پُرجوش شاعری ہے کتابت بہترین طباعتی خوبیوں سے آراستہ ہو کر شائع ہو چکی ہے حضرت اختر نے ہندوستان کی روح کی ترجمانی کی ہے اور کس قدر دلنشیں انداز میں کہ اردو اس پر ہمیشہ فخر کرے گی۔ قیمت ایک روپیہ چار آنے (۱۴/) مجلد مع گردپوش

ایک کہانی

چھ ادیبوں کی زبانی

اردو میں اس طرز کی آج تک کوئی کہانی نہیں لکھی گئی کہ چھ مشہور انشاپردازوں نے مل کر اسے لکھا ہے۔ یہ دلچسپ کہانی اور بھی زیادہ دلچسپ اس وجہ سے ہو گئی ہے کہ ہر انشاپرداز نے اپنا پورا زور بیان صرف کر دیا ہے۔ علامہ نیاز فتحپوری نے قصہ کا آغاز کیا ہے اور پروفیسر علی عباس حسینی، سجاد حیدر یلدرم۔ لطیف الدین احمد۔ امتیاز علی تاج اور حکیم احمد شجاع نے کہانی کی مختلف کڑیاں پیش کی ہیں۔ کہانی کا موضوع ہے "نئی اور پرانی تہذیب کی ٹکر" دو عجیب و غریب نتائج غایت درجہ دلکش ہیں اور جی چاہتا ہے کہ اس کہانی کو بار بار پڑھا جائے۔

دوسرا اڈیشن کاغذ عمدہ سرورق رنگین۔ قیمت صرف

دکن کی پری فراق دہلوی ۶/ — تھوری تارا ماتھے چاند۔ اشرف صبوحی ۴/
مضامین فراق 〃 عہ/ — شہزادہ نے نواز 〃 ۴/
دلی کا اجڑا ہوا لال قلعہ 〃 ۴/ — فاؤسٹ شاہد احمد ۱۲/
سات طلاقنوں کی کہانیاں 〃 ۴/ — گمنام عورت کا خط ظفر قریشی ۴/
بیگموں کی چھیڑ چھاڑ 〃 ۴/ — عشق کی گولیاں۔ مرزا فرحت اللہ بیگ ۴/
صبر بادشاہ زادہ اشرف صبوحی ۴/ — تماشہ پر تماشہ ناکارہ ۴/
لعل شہزادہ 〃 ۴/ — انکشاف حقیقت۔ صادق الخیری ۴/

مشہور مصنفین کے دلکش ناول

ناول	مصنف	قیمت
پیتی باتیں	ایم اسلم	ہے
رقص بہار	〃	للعہ
شمع	〃	[illegible]
[illegible]	〃	[illegible]
طلسم سامری	〃	[illegible]
[illegible]	〃	[illegible]
[illegible]	〃	[illegible]
نرگس	〃	عا
[illegible]	〃	[illegible]
[illegible]	〃	[illegible]
حسن سوگوار	〃	ــے
شام غریباں	〃	للعہ
شرم گناہ	〃	عا
تبسم	[illegible]	للعہ
چوراسا	〃	[illegible]
تہمت	〃	عا
اپاہج	〃	عا
برہنہ	〃	عا
رونق	〃	ہے
[illegible]	〃	عہ
آخری فیصلہ	〃	[illegible]
دلکی آواز	〃	[illegible]
[illegible]	〃	[illegible]
تشنگی	رشید اختر	للعہ
سودائی	〃	[illegible]
سوز دروں	〃	عا
ساز شکستہ	〃	[illegible]
بن باسی دیوی	اشرف صبوحی	ہے
سلیلے	〃	عا
غبن	منشی پریم چند	للعہ
پردہ مجاز	〃	صہ
کربلا	〃	[illegible]
بیوہ	〃	[illegible]
پتہ بیچنے والی	ٹیگور	ہے
شمع الفت	〃	ہے
منزل عشق	〃	[illegible]
ساحرہ	〃	[illegible]

ناول	مصنف	قیمت
طوفان زندگی	ٹیگور	[illegible]
دلہن	〃	[illegible]
[illegible]	سرت چندر چٹرجی	للعہ
آوارہ	〃	للعہ
[illegible]	〃	عا
بڑی دیدی	〃	[illegible]
دیوی داس	〃	[illegible]
[illegible] سماج	〃	[illegible]
[illegible] برباد	〃	ہے
[illegible]	قاضی عبد الغفار	[illegible]
[illegible]	〃	[illegible]
سیب کا درخت	〃	[illegible]
لیلیٰ کے خطوط	〃	[illegible]
شمع	اے۔ آر۔ خاتون	صہ
تصویر	〃	للعہ
[illegible] حصہ اول	حمیدہ سلطانہ	ہے
بکواس	شوکت تھانوی	[illegible]
بیوی	〃	[illegible]
سوتیا چاہ	〃	[illegible]
خانم خاں	〃	[illegible]
دل پھینک	〃	[illegible]
بڑبھس	〃	عا
معمہ خاتون	〃	[illegible]
شیطان کی ڈائری	〃	[illegible]
گرگٹ	〃	[illegible]
زارینہ	محمد رحیم	[illegible]
تازیانہ	〃	[illegible]
چاند سورج کی چوری	〃	[illegible]
گریز	عزیز احمد	للعہ
ہوس	〃	عا
مرمر اور خون	〃	[illegible]
ٹوٹے ہوئے پر	جبران خلیل جبران	[illegible]
[illegible]	سجاد حیدر	[illegible]
جانباز	〃	[illegible]
ہما خانم	سجاد حیدر یلدرم	[illegible]
ستاروں کے کھیل	اوپندر ناتھ اشک	[illegible]
شکست	کرشن چندر	ہے

ناول	مصنف	قیمت
شمع فروزاں	صادق الخیری	[illegible]
دوشیزۂ صحرا	〃	[illegible]
نوشلب	محمود احمد ایم اے	[illegible]
بھابی جان	فضل حق قریشی	[illegible]
فرعون	〃	[illegible]
سگ لیلیٰ	〃	[illegible]
پتھر سے ہیرا	ڈاکٹر سعید احمد	[illegible]
شاہد رعنا	سرفراز حسین	ہے
بھانسی	شاہد احمد	عا
فاؤسٹ	〃	[illegible]
سرگزشت عروس	〃	عا
باغی	رئیس احمد جعفری	للعہ
طوفان	〃	ہے
دنیا کے تین بہترین ناول	احسان الحق بی اے	ہے
یاما	الیگزنڈر	صہ
سرنوشت	مجنوں گورکھپوری	عا
صیدزبوں	〃	عا
گردش	〃	[illegible]
سلامبو	مولوی عنایت اللہ	للعہ
نجم السحر	〃	ہے
تائیس	〃	[illegible]
شاعر کا انجام	نیاز فتحپوری	۱۲
وحشی	انصار ناصری	عہ
چندرا موہنی	〃	عہ
جہاں آرا	ظفر قریشی بی اے	[illegible]
لالہ رخ	طامس مور	ہے
تاجدار رقاصہ	فصیح الدین احمد	[illegible]
ناہید	آغا شاعر	عہ
ایک حمام میں	خواجہ محمد شفیع	عا
ماہ ملک	شرر لکھنوی	ہے
مقدس نازنین	〃	[illegible]
قیس ولبنیٰ	〃	[illegible]
حسن کا ڈاکو	〃	[illegible]
نیکی کا پھل	〃	[illegible]
غیب داں دلہن	〃	[illegible]
ملک العزیز ورجنا	〃	[illegible]
حسن انجلینا	〃	[illegible]
منصور موہنا	〃	[illegible]
الفانسو	〃	عہ

ناول	مصنف	قیمت
بابک خرمی	شرر لکھنوی	[illegible]
آغا صادق کی شادی	〃	عہ
عزیزہ مصر	〃	[illegible]
مفتوح فاتح	〃	[illegible]
طاہرہ	〃	عا
لعبت چین	〃	[illegible]
چراغ تلے اندھیرا	تیرتھ رام	[illegible]
نظارہ لندن	〃	[illegible]
ویرانہ ہستی	〃	[illegible]
ہولناک اسرار	〃	[illegible]
جویائے حق	زیر طبع	معہ
شمیم	فیاض علی زیر طبع	معہ
انور	〃	معہ
آندھی	تیرتھ رام فیروزپوری	[illegible]
عشق اور موت	〃	[illegible]
لعل مقدس	〃	ہے
نازک کٹار	〃	[illegible]
تلاش اکسیر	〃	ہے
خونی چکر	〃	ہے
خنجر بیداد	〃	ہے
انمول ہیرا	〃	عا
انصاف	〃	عا
دورنگی دنیا	〃	عا
مکافات عمل	〃	[illegible]
کارنامہ جات آرسی لوپن	〃	[illegible]
سنہری لاش	〃	[illegible]
للتا	〃	ہے
قسمت کا شکار	〃	ہے
ڈاکہ بگولا	〃	ہے
جڑیا کی تکی	〃	ہے
مہر خاموشی	〃	ہے
شاہی خزانہ	〃	ہے
انقلاب زندگی	〃	[illegible]
ستم پرور شہزادی	〃	ہے
دنیا کا پتلا	〃	[illegible]
آتشی گتہ	〃	[illegible]
گردش آفاق	〃	[illegible]
حور ظلمات	〃	[illegible]
ہیروں کا بادشاہ	〃	[illegible]

کتب خانہ علم و ادب اردو بازار دہلی سے طلب فرمایئے

خونی خواب — تیرتھ رام — ٭
اسیر تقدیر — ” — عہ
پہلا ہیرا — ” — ٭
خودکشی — ٹالسٹائی — ٭
آخری راستہ — ” — ۸ر
اسکاگناہ — ٹیگور — ۸ر
بیٹے — پرل بک — ٭
طیفہ — ” — ۸ر
اس کی کہانی — پرویز — ۸ر
قدرت کے کھیل — سدرشن — عہ
مجموعہ — مسولینی — ۸ر
[illegible] — راجہ مہدی علی خاں — ۸ر
کون کسی کا — ٹیگور — ۱۲ر
بغاوت فرانس — اے ایچ آغا — عہ
کاروان حیات — سیتا دیوی چٹرجی — ۸ر
افسانہ [illegible] — اسمار — عہ
[illegible] — آتش — عہ
نغمہ — آغا اشرف — عہ
[illegible] — سرت چندر — ۸ر
شمع زندگی — ” — عہ
[illegible] — انتصار — عہ
رقص و شباب — ” — ۸ر

بدلتی دنیا — محمد حسین خاں — ۸ر
الجھن — ٹیگور — ۸ر
اس پار — تیرتھ رام — عہ
موت کا تحفہ — مرزا دیب — عہ
بیکسی — ” — عہ
زلزلہ — سرت چندر — ۸ر
عورت — ” — ۸ر
سمرقند کی دوشیزہ — آتش — ۸ر
ماہ درخشاں — بیگم احمد علی — ٭
رزم بزم — دو حصے — للعہ
مرد میدان — دو حصے — للعہ
اسرار حرم — منشی احمد الدین — عہ
رسوائیاں — احسان علی شاہ — ۸ر
اپنا گھر — مائل ملیح آبادی — ۸ر
آنسو — سیتا دیوی چٹرجی — عہ
[illegible] کے دن — [illegible] — عہ
راج سنگھ — سدرشن — ۸ر
خونی بھید — مرزا [illegible] — عہ
خونی جیرو — ” — ۱۲ر
فرحت جہاں — ایم اسلم — عہ
دل کی آگ — — عہ
روپ [illegible] — — عہ

مشہور مصنفین کے افسانے

سہانے نظارے — ایم اسلم — للعہ
جام شکستہ — ” — ٭
شرابی — ” — ۸ر
گل و فرنگ — ” — ۸ر
بادہ گلرنگ — ” — ۸ر
رقاصہ — ” — ۱۲ر
گنہگار — ” — عہ
[illegible] — ” — ۸ر

تلخ و شیریں — صلاح الدین — ۸ر
نانزو — اختر انصاری — عہ
اندھی دنیا — ” — عہ
زادراہ — منشی پریم چند — ۸ر
واردات — ” — ۸ر
خواب و خیال — ” — ۸ر
دودھ کی قیمت — ” — ۸ر
آخری تحفہ — ” — ۸ر
بڑے خدا — کرشن چندر — ۸ر
ہوائی قلعے — ” — ۸ر
دروازہ — ” — [illegible]
نغمے کی موت — ” — ۸ر
نئے افسانے — ” — للعہ
[illegible] — ” — [illegible]

گھونگھٹ میں گوری جلے — کرشن چندر — ۸ر
زندگی کے موڑ پر — ” — ۸ر
سفینے — صادق الخیری — ٭
شمع انجمن — ” — ۸ر
پرواز — شفیق الرحمان — ٭
مدوجزر — ” — ۸ر
شگوفے — ” — ۱۲ر
لہریں — ” — ٭
ضربیں — [illegible] امپوری — ٭
غبار — ” — ۸ر
کیف نان — ” — عہ
ڈونگی چھوٹنگ — اوژر چاندپوری — ۱۲ر
[illegible] — ” — ۱۲ر
رنگین [illegible] — ” — ۸ر
[illegible] — ” — ۱۲ر
موج کوثر — ” — ۱۲ر
آنچل — احمد ندیم قاسمی — ۱۲ر
سیلاب — ” — ٭
کیسہ کیاہے — ” — ۸ر
قفس — ادیب رنا [illegible] — عہ
[illegible] — ” — ۸ر
[illegible] — — ۸ر
نئے محل — ظفر [illegible] — ۸ر
سادہ رنگین — ” — ۸ر
گذرگاہ خیال — ” — ۸ر
دریچے — ” — ۸ر
گمنام عورت کا خط — ” — ۴ر
موت کا راگ — مرزا دیب — ۸ر
صحرانورد کے خطوط — — للعہ
صحرانورد کے رومان — ” — ٭
شمع حرم — راجہ مہدی علی خاں — ٭
سولہ سنگار — سدرشن — ٭
طائر قدس — ” — [illegible]
[illegible] — ” — [illegible]
[illegible] — ” — [illegible]
اپنے — [illegible] — [illegible]
[illegible] — ” — [illegible]
[illegible] — ” — [illegible]
[illegible] — ” — [illegible]

جھونکے — اشرف صبوحی — ۸ر
دانہ و دام — بیدی — ۸ر
چاندی کے تار — مہندر ناتھ — ۸ر
مونپاساں کے افسانے — نصیر حمید — ۸ر
انشائے لطیف — ل. احمد — ۸ر
جلوئے — آغا اشرف — عہ
سلئے — شیر محمد اختر — عہ
کھنڈ — ” — عہ
بادلوں میں — ” — ۸ر
کلیاں — عصمت چغتائی — ٭
چوٹیں — ” — ۸ر
دشینے — [illegible] — ۸ر
[illegible] کے — [illegible] مستور — ۸ر
[illegible] — ہاجرہ مسرور — ۸ر
سفینے — قمر انبالوی — ۸ر
ارضی دیوتا — جبران خلیل جبران — ۸ر
آنسو اور مسکراہٹ — ” — ۸ر
گناہ و غربت — طالب [illegible] — ۱۲ر
ٹالسٹائی کے افسانے — ” — ۸ر
ٹالسٹائی کی کہانیاں — ” — ۱۲ر
تارانے — الطاف مشہدی — ۸ر
سچی کہانیاں — پریم پجاری — ٭
زرد چہرے — ابراہیم جلیس — ۸ر
مشرق و مغرب کے افسانے — عاشق بٹالوی — ٭
جوار بھاٹا — راما نند ساگر — ٭
آئینے — ” — ٭
ساتارے — سات مختلف ادیب — ٭
چند افسانے — خواجہ محمد شفیع — ۱۲ر
آئینہ حیرت — رفیق حسین — ۸ر
[illegible] — [illegible] — ۸ر
ٹوٹے ہوئے دل — جمیل احمد ایم اے — ۸ر
[illegible] — ” — [illegible]
[illegible] — [illegible] — عہ
[illegible] — ” — عہ
[illegible] — [illegible] — [illegible]
[illegible] — ” — ۱۲ر
[illegible] — [illegible] — ٭
[illegible] — [illegible] — ۸ر
[illegible] — [illegible] — ۱۲ر

[illegible]

بچھڑے ہم	محمد عمر	عگ
لاشوں کا شہر	مسٹر عبدالقادر	عگ
مطلب کے یار	〃	عگ
خاموش حسن	ٹیگور	عہ
پھول اور کلیاں	〃	عگ
نئے پرانے	سہیل عظیم آبادی	عگ
الاؤ	〃	عہ
کہکشاں	رفیق اجمیری	ہے
جلوے	شمشیر سنگھ	عہ
حسن کی قیمت	احمد شجاع	عگ
افسانچے	دتاتریا کیفی	عگ
زنجیریں	محمد دین شرق پوری	عگ
پیچھے	〃	عگ
مجھے تجھ سے محبت ہے	نقی نور	عگ
نہ بھولنے والی بات		عگ
گرد و پیش	مختلف ادیب	سے
ممی خانہ	حجاب امتیاز علی	عگ
ستارے	قمر تسکین	عگ
جام و مینا	حکیم یوسف حسن	عگ
سبز و سرخ	خانصاحب احمد حسین	عہ
قلو پطرہ کی ایک رات	تشبلی	عگ
نفرت	گوپال متل	عگ
نئی فضائیں	قمر تسکین	عگ
نئی کروٹیں	〃	عگ
الجھنیں	عطاء اللہ پالوی	عگ
ان داتا	مرزا ادیب	عگ
پہلا گناہ	خلیل احمد	عہ
باندی	انصار	عہ
خلش	خالد حسن	عگ
کنول	اعظم کریوی	عگ
روپ سنگار	〃	عگ

خوشبوئیں	شبلی بی اے	سے
مغربی افسانے	〃	عگ
شعائیں	〃	ہے
تاریخی رومان	〃	عگ
پردیں	عطاء اللہ	عگ
ریزہ مینا	پچاس ادیب	صہ
مسکراتے آنسو	بھارت چند	عہ
خودکشی	پر عبیدی	ہے
تار و پود	بلونت سنگھ	سے
دنیا ہماری	پیرزلیسی	عگ
موج نیل	منفلوطی	عگ
مشعل راہ	ٹیگور	عہ
ہماری گلی	احمد علی	عہ
قید خانہ	〃	عہ
داستانیں	قمر انبالوی	عگ
سفید چنگاوڑ	جمیل احمد	عگ
شہید نفس	سیاح سامی	عگ
شرت چند۔ چڑجی کے بہترین افسانے		عگ
سپیرت	بابو پریم چند	عہ
سہرا گاہے	منظور	عگ
شوخیاں	ٹیگور	عہ
طلسمات	عابد علی عابد	عہ
عجیب	قاضی عبدالغفار	عہ
لمحات رنگین	زبیدہ سلطانہ	عگ
ساغر و مینا	اسلم کاشہری	عگ
درد کی تصویریں	تڑپ	عہ
پروانے	رشید جاوید	عہ
دنیا کی رنگین مزاج عورتیں	مہری علی	عگ
غریب کی آہ	روشن بی اے	عہ
باغبان	ٹیگور	عہ

مزاحیہ کتابیں

خانم	مرزا عظیم بیگ چغتائی	للعہ
چغتائی کے افسانے	〃	صہ
کولتار	〃	عگ
پھریری	〃	عگ
روح ظرافت	〃	عگ
روح لطافت	〃	عگ

کھرپا بہادر	مرزا عظیم بیگ چغتائی	عہ
کمزوری	〃	عہ
مسز گرڈھلے	〃	عہ
شریر بیوی	〃	عہ
فل بوٹ	〃	عہ
مرزا جنگی	〃	۸ر

چینی کی انگوٹھی	مرزا عظیم بیگ چغتائی	۸ر
ملفوظات ٹامی	〃	۱۲ر
خطوط کی ستم ظریفی	〃	۱۰ر
مقراضی محبت	〃	۶ر
قدردان	〃	۶ر
فرزند سرحد	〃	۶ر
ناتی عشق	راشد الخیری	۱۰ر
ولائتی ننھی	〃	۸ر
دادالال بھجکڑ		۱۰ر
پطرس کے مضامین	پطرس بخاری	عگ
روسی ظرافت		عگ
بے پر کی	آوارہ	عگ
مضامین لق لق	حاجی لق لق	عہ
آواز لق لق	〃	عہ
درانتی	〃	عہ
لقلقہ	〃	عہ
منقار لق لق	〃	عہ
گہوارہ تبسم	ظریف	۴ر
ایک کہانی	چھا دیو کی زبانی	۸ر
شیش محل	شوکت تھانوی	عگ
سنی سنائی	〃	عگ
طوفان تبسم	〃	عگ
لاہوریات	〃	عہ
سوتیا چاہ	〃	عہ
مابدولت	〃	عگ
مجھے خرید لو	〃	عہ
کیلے کا چھلکا	سندباد جہازی	عگ
آب حیات کے لطیفے	آغا محمد اشرف	عگ
سنگ و خشت	کنہیا لال کپور	عگ
شیشہ و تیشہ	〃	عگ
روسی ظرافت	مسلم چغتائی	عگ
جدید جغرافیہ پنجاب	سندباد جہازی	عہ
رنگین لفافہ	ابو تمیم	عہ
گدھوں میں بیداری	〃	عہ
ہنسی کی باتیں	آ نازلی	۱۴ر
مسکراہٹیں	کوثر چاندپوری	عگ
صمدانی	ناکارہ حیدرآبادی	عگ
تماشہ پر تماشہ	〃	۴ر
نواب صاحب کی ڈائری	فرحت	ہے

مضامین فرحت حصہ اول	مرزا فرحت اللہ بیگ	عہ
مضامین فرحت حصہ دوم	〃	ہے
عشق کی گولیاں	〃	عہ
بیوی کی تلاش	آتش	عگ
مزاحیہ ڈرامے	خلیل احمد	عگ
چودھری سلطان کے ڈرامے		سے

مذہب و سیاست

خطبات آزاد	ابوالکلام آزاد	ہے
مسلمان عورت	〃	عگ
انتخاب الہلال	〃	عگ
مضامین ابوالکلام آزاد	〃	سے
مضامین البلاغ	〃	سے
انسانیت موت کے دروازے پر	〃	عگ
تصریحات آزاد	〃	عگ
تعمیر ملت	شریف چشتی	عہ
مسلمانان ہند کی حیات سیاسی	محمد مرزا	عہ
دوسری جنگ عظیم	〃	عگ
جنگ زدہ ممالک	پیر حسن ایم اے	عگ
عہد حاضر کے بڑے لوگ	محمد مرزا	للعہ
اسلام کیسے شروع ہوا	عبدالواحد سندھی	سے
اسلام کیسے پھیلا	〃	ہے
اسلام کے سیاسی تصورات	غلام دستگیر	ہے
جرم و سزا	باری	عہ
خطبات عبیداللہ سندھی		عگ
آج کا مصر	محمد حسن	عگ
سیاست ملیہ	محمد دین	سے
سی۔پی میں کانگریسی راج	اسرار احمد	سے
بیر سابرمتی	اندلال یاجنک	للعہ
ایضاً انگریزی اڈیشن	〃	صہ
جواہر لال کی کہانی	محمد رحیم	صہ
اٹھارہ مہینے ہندوستان میں	جواہر لعل	ہے
سرخ چین کا رہنما	اسرار احمد آزاد	سے
خدا کی باتیں	مولانا احمد سعید	سے
مضامین احمد سعید	〃	عگ
تقریر سیرت جلد اول	〃	عگ
ایضاً جلد دوم	〃	عگ
جنت کی کنجی	〃	عگ
دوزخ کا کھٹکا	〃	عہ
رسول کی باتیں	〃	عگ

کتب خانہ علم و ادب اردو بازار دہلی سے طلب فرمائیے

صادق الخیری اور دیگر مصنفین کی دلپسند کتابیں

پیشکردہ: اُردو نشرگاہ: دہلی

شمع انجمن

بقولِ دل فگار ہندوستان کے "جراح ادیب"
صادق الخیری ایم۔اے کے سولہ منتخب افسانے
اِن افسانوں کی بے باکی اور صداقت آپ کو
انگشت بہ دنداں کردے گی۔ قیمت عہ

دوشیزۂ صحرا

ستارہ جبیں زہرہ کا یہ دلگداز رومان
ختم کرنے کے بعد آپ مُصر ہونگے کہ ایک بار پھر
ہمیں کوئی اُسی وادیٔ عشق میں لے جائے۔
صحرائے عرب کی یہ دلربا کہانی،
صادق الخیری کی زبانی سُنیئے۔ قیمت عہ

شاہدِ رعنا

اُس گل رو کی داستانِ حیات جسکے
متعلق مشہور تھا:—
اس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا چمک جائے ہے آواز تو دیکھو
"شاہدِ رعنا" قاری سرفراز حسین مرحوم دہلوی
کا غیر فانی شاہکار اور ہمارے لٹریچر کا مایۂ ناز ناول
ہے۔ قیمت سے۔

پھانسی

دُنیا کا عجیب ترین ناول مترجمہ شاہد احمد
دہلوی ایڈیٹر ساقی۔ جب زندگی نے موت کا ہولناک
ناچ دیکھا تو وہ کسطرح لرزنے لگی۔ اُردو زبان
میں بالکل نئی چیز۔ قیمت عہ

سفینے

دُنیا کے بہترین فن کاروں کا پُر ہجوم کارواں!
مشرق و مغرب کے دلکش رومانوں اور ترقی پسند
افسانوں کا ہمہ گیر مجموعہ۔ ان کا انتخاب اور ترجمہ
"اُردو کے سحر نگار مترجم" صادق الخیری نے کیا
ہے۔ قیمت عہ

اُردو

کی ہر کتاب، خواہ وہ کہیں چھپی ہو
یا
آپ اُس کا اشتہار کہیں پڑھیں
بہ کفایت اور بہ عجلت منگانے کا پتہ:-
خاتون کتاب گھر، دہلی

قمر جہاں

اُس شعلۂ رنگین کی داستان جسے خود غرضی اور
ہوسناکی نے بیدار کیا۔ از بیگم ضیاء الحسن۔
قیمت عہ

بلقیس

سچ جب عریاں کردیا جائے تو کتنا تلخ ہوتا
ہے؟ اور حقیقت بے نقاب ہوکر کس قدر سحر
کرتی ہے؟ یہ آپ صادق الخیری کے ان
افسانوں میں دیکھئے۔ اس مجموعہ میں شائستگیٔ
خیال اور پاکیزگیٔ بیان آپکا دل موہ لیں گی۔
قیمت عہ

دھنک

صادق الخیری کے وہ رنگین وہ دلآویز رومان جنہوں نے
آنریبل سر سلطان احمد اور آنریبل سر شیخ عبدالقادر
جیسے حضرات سے خراجِ تحسین حاصل کیا۔ ان افسانوں کی ہر ہر
سطر مستی و سرشاری سے لبریز ہے حُسن و عشق کی جیتیاں
"دھنک" میں دیکھئے۔ قیمت عہ

شمع فروزاں

ایک باوفا مشرقی عورت کی داستان جو شمع کی مانند
جلتی رہی۔ ایک بے حیا مرد کا قصہ جو مغرب کی چمکتی
ہوئی آندھی سے متاثر ہوکر ظلم و ستم کے تیر چلاتا رہا۔
مصنفہ پرل بک (نوبل پرائیز یافتہ) مترجمہ صادق الخیری
قیمت عہ

نوشاب

اپنے دیس کا تازہ ترین ترقی پسند ناول جسکا پس منظر
سرزمین پنجاب ہے۔ وہی پنجاب جہاں زندگی ہنستی کھیلتی
اور گاتی ناچتی گذر جاتی ہے۔ یہ ناول طوفانی ہونے
کے باوجود خاتمے تک پہنچتے پہنچتے نرم روندی کا
سا میٹھا گیت بن جاتا ہے۔ مصنفہ رضیہ سلطانہ ادیب
فاضل۔ قیمت عہ

زہراب

عصمت و حُسن کی خونچکاں داستان جسے پڑھکر کلیجہ منہ
کو آتا ہے۔ اس ناول پر مصنف کو ناز ہے اور اسکا ترجمہ
اسقدر خوبصورت ہے کہ اصل معلوم ہوتا ہے۔ مترجمہ
محمود احمد خاں ایم۔اے۔ قیمت عہ

مکمل فہرست کُتب
تین پیسے کا ٹکٹ بھیجکر منگائیے

ملنے کا پتہ:-
خاتون کتاب گھر، اُردو بازار، دہلی

لائبریریوں کو اور ریش(?) ڈیلے
کی کتابیں منگانے پر رعایت ہوجاتی ہے

یہ بھی ایک جنون ہے بقیہ سلسلہ صفحہ ۲۶۴

بیوی نے اندر سے بھری ہوئی آواز میں جواب دیا:

—— ہماری طرف سے بھاڑ میں جاؤ کہیں جاؤ ہم کیا کریں؟

اب نصری نے بیوی بچوں کو اپنا نشانہ بنایا اور دیر تک اول فول بکتا رہا۔ ہار کر وہ دروازے سے نکل آیا۔ اس وقت وہ خود نہیں جانتا تھا کہ اسے کہاں جانا ہے۔

نصری نے مختلف سڑکوں پر گھوم پھر کر کئی گھنٹے گزارے آخر اُس نے محسوس کیا کہ ٹانگوں کی جان نکل چکی ہے۔ جب اس نے کسی سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ رات کا ایک بج چکا ہے۔ دیر تک سوچنے کے بعد وہ سڑک کے ایک تاریک گوشے کی طرف چلا اور زمین پر دراز ہو گیا اور صبح تک پڑا سوتا رہا۔

سورج نکلتے ہی نصری کی آنکھ کھلی۔ جمعہ کا دن تھا۔ وہ سیدھا اپنے دوست لطفی کے مکان کی طرف چلا۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ لطفی سے کچھ قرض لے کر کسی نہ کسی طرح اپنی جان چھڑانی ہے۔ لطفی ابھی سو رہا تھا۔ وہ دن چڑھے تک اس کا انتظار کرتا رہا۔ لطفی نے بہت کچھ بچنا چاہا لیکن یہ کیسے ممکن تھا۔ نصری نے ایسے مؤثر انداز میں اسے کچھ کہا کہ اس کا دل پسیج گیا۔ لطفی ہمیشہ سے بہت رحمدل تھا اور یہ سب جانتے تھے جب نصری اندر آیا تو اُس نے جھک کر لطفی کے ہاتھ چوم لئے اور پھر گرم گرم آنسوؤں کی دھار اس کے ہاتھ پر بہہ نکلی۔ روتے روتے اُس نے اپنی ساری بپتا سنا ڈالی اور آخر میں بڑے دردبھرے لہجے میں کہنے لگا:

—— پیارے دوست! ذرا سوچو تو سہی۔ میری بیوی اور چاروں بچوں نے تقریباً چوبیس گھنٹے سے کچھ نہیں کھایا ہے۔ ایک چھوٹا سا معصوم بچہ بالکل ننگا ہے میری حالت اتنی خراب ہے کہ میرے پاس اس کا جسم ڈھانکنے کے لئے بھی کچھ نہیں ہے۔ مکان دار میری جان کا دشمن ہے اُس نے تہیہ کر لیا ہے کہ جب تک کرایہ نہیں لے لیگا ہرگز کنجی نہیں دیگا۔ میں مصیبت زدہ ہوں اور ایک ایک کوڑی کو محتاج ہوں ..... اس وقت مجھے تم سے ہی اُمید ہے کہ میری کچھ مدد کرو گے۔ واقعی میں پہلے بھی بارہا تم سے کچھ نہ کچھ لیتا رہا ہوں۔ لیکن اس دفعہ مجھے یقین ہے کہ پھر کبھی تمہیں تکلیف نہیں دوں گا۔ اس وقت میرے پاس سگریٹ تک کیلئے بھی کچھ نہیں ہے! .....

لطفی کا دل بھر آیا اور اُس نے جیب سے کچھ نکالا اور نصری کے ہاتھ پر رکھکر کہنے لگا:

—— میرا خیال ہے کہ تنخواہ ملنے تک شاید اس سے تمہارا کام نکل سکے گا۔

اس کے بعد ہی اس نے ذرا ناصحانہ انداز میں ڈانٹا:

—— لیکن نصری! کیا تمہیں کبھی ہوش نہیں آئیگا جو گذشتہ غلطیوں کی کچھ تلافی ہو سکے۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ تم شرافت کے ساتھ زندگی بسر کرو اور اپنی آمدنی بال بچوں ہی پر خرچ کرو۔ اور کسی نہ کسی طرح اپنی بیوی کی جائداد چھڑا کر آرام سے زندگی کے دن گزارو۔

نصری نے خوشی خوشی روپے ہاتھوں میں دبا لئے اور نظریں جھکا کر کہنے لگا:

—— پیارے دوست! میں آئندہ ضرور تمہاری نصیحت پر عمل کروں گا۔

نصری جب اپنے دوست کے مکان سے نکلا ہے تو دل ہی دل میں سوچ رہا تھا:

—— اب میں سیدھا مکاندار کے پاس جاتا ہوں اور سارا کرایہ ادا کئے دیتا ہوں۔ پھر مارکیٹ سے کچھ کھانے پینے کا سامان اور "ماتوسیاں" سگریٹ کا ٹین لیکر درزی خانے سے چھوٹے بچے کے لئے کچھ کپڑے خریدونگا۔

یہ سوچتے سوچتے وہ اپنی بھدی آواز میں کچھ گانے لگا۔ اس دوران میں وہ میدان خانزندار کے قریب پہنچ چکا تھا۔ وہ گنگناتا چلا جا رہا تھا سامنے سے ایک کرائے کی گاڑی نظر آئی جس میں ایک نوجوان لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ جان کر گاڑی کے ذرا قریب سے گزرا اور تیز تیز نظروں سے کچھ پہچاننے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ اُس کی پرانی آشنا انجیئہ کی ایک تیسری تھی۔ اچانک اُس کے منہ سے ایک چیخ نکلی اور ہیلو کہتا ہوا دروازے کی طرف لپکا۔ پُرمعنی مسکراہٹ کے ساتھ دونوں نے ایک دوسرے کا خیر مقدم کیا اور باتیں ہونے لگیں:

—— میرا خیال ہے آپ شاید کسی کا انتظار کر رہی ہیں۔

—— جی ہاں! آپ کا ہی تو انتظار تھا۔

—— میرا؟ یہ کیسے؟

کتب خانہ جامعہ ملیہ اسلامیہ

—— آج کچھ میرے دل میں آئی تھی کہ آپ سے ضرور ملاقات ہوگی۔ ویسے بھی آپ یاد آتے ہیں۔ آپ تو اب کچھ الگ الگ رہنے لگے ہیں۔ لیکن آج میں نے دل میں ٹھان لی تھی اور دیکھیے آپ آخر مل ہی گئے۔

—— واقعی عجیب اتفاق ہے! آپ کو میرے ساتھ چلنے میں کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟

—— جی نہیں، بالکل نہیں۔

وہ گاڑی میں اطمینان سے بیٹھ گیا اور کوچوان سے جزیرے کی طرف چلنے کو کہکر سگریٹ سلگانے لگا۔

نصری نے سارا دن اسی طرح گزار دیا اور ایک ایک پیسہ خرچ کر ڈالا۔ وہ شاید اپنے بھوک سے تڑپتے ہوئے بیوی بچوں اور ہونے والے بچے کے برہنہ جسم کو بھول چکا تھا یا بھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ (محمود تیمور)

تصانیف مرزا عظیم بیگ چغتائی مرحوم

ویمپائر: ایک پاکباز لڑکی کی خوفناک کہانی خود اسی کی زبانی۔ بارہ باب کا ایک مختصر ناول۔ اگر آپ دیکھنا چاہتے ہیں کہ پاکبازی کیا ہے، نسوانی شرم وحیا کیا ہے، نسوانی وقار کس کو کہتے ہیں۔ اور اگر آپ دیکھنا چاہتے ہیں کہ حیوانیت کیا ہے، خباثت کیا ہے، شیطنت کیا ہے، خونی کون ہے، ضمیر کی سیاہی کیا ہے تو ادب لطیف کے شہ پارے "ویمپائر" کو دیکھئے۔ دیکھئے کس طرح ایک ظالم ایک معصوم کو روند ڈالتا ہے۔ کس طرح سیاہی روشنی پر غالب آتی ہے۔ ڈرامہ کی تفصیل آنکھوں کے آگے آجائے گی۔ قیمت ایک روپیہ۔

تفویض: یہ ایک دلچسپ کتاب ہے جس میں نہایت ہی مضحکہ خیز پلاٹ پیش کیا گیا ہے۔ ایک پوسٹ گریجویٹ خواب میں لڑکی بن جاتا ہے۔ اسکی شادی خواب ہی خواب میں محلہ کے مولوی صاحب سے ہو جاتی ہے جس سے دن رات بحث رہا کرتی تھی بہت ہی پُرلطف قصہ ہے۔ قیمت آٹھ آنے۔ علاوہ محصولڈاک۔

ملنے کا پتہ:- ساقی بک ڈپو، دہلی۔

روح کائنات:- فراق گورکھپوری کی معرکہ آرا اور جہد آفریں نظموں اور منتخب غزلوں کا پہلا ضخیم مجموعہ۔ قیمت فی جلد چار روپے آٹھ آنے۔

اُردو کی عشقیہ شاعری:- فراق گورکھپوری نے ڈھائی سو برس سے ابتک کی عشقیہ شاعری کا نفسیاتی، فنی، اخلاقی اور تمدنی جائزہ آفاقی کلچر کی روشنی میں لیا ہے۔ قیمت فی جلد دو روپے بارہ آنے۔

پرواز:- علی سردار جعفری اشتراکی فلسفہ وفکریات کے روشن خیال شاعر ہیں۔ "پرواز" ان کی نظموں کا پہلا مجموعہ ہے جو ابھی ابھی شائع ہوا ہے۔ قیمت دو روپے۔

اقبال:- مجنوں گورکھپوری نے یونیورسٹی کے طلبا کے لئے بلند پایہ اور بصیرت افروز تبصرہ اقبال کی شاعری پر کیا ہے۔ قیمت [illegible] روپیہ بارہ آنے۔

ترقی پسند ادب:- پروفیسر عزیز احمد کی معرکہ آرا تصنیف نئے اُردو ادب کا بصیرت افروز جائزہ ترقی پسندی اور اخلاقی قدروں پر فاضلانہ بحث۔ قیمت دو روپے چودہ آنے۔ (رعٰیہ)

ملنے کا پتہ:- سنگم پبلشنگ ہاؤس۔ بینک روڈ، الہ آباد

کتب مصنفہ حضرت بہزاد لکھنوی

نغمۂ نور، کیف وسرور، موج طہور، چراغ طور: ہر مجموعہ میں حمد، حمد، غزلیں، گیت، نظمیں، انجمن شامل ہیں۔ ملک کے مشہور مصوروں نے ان مجموعوں کے سرورق بنائے ہیں۔ شعروشاعری سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کیلئے ان چاروں جلدوں کا اپنے پاس رکھنا از بس ضروری ہے۔ ہر مجموعہ کی قیمت ایک روپیہ ہے

موج نور:- یہ کتاب بہزاد لکھنوی کے ان گیتوں کا مجموعہ ہے ایسے رسیلے مدھ بھرے گیت آپنے کبھی نہیں پڑھے ہونگے۔ قیمت ایک روپیہ

بیان حضور:- حضور سرور کائنات صلعم سے بہزاد لکھنوی کے والہانہ عشق کا پاکیزہ حاصل بہترین منظوم سیرت نبوی۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

کتب خانہ جامعہ ملیہ اسلامیہ
دہلی - قرول باغ
۳۲۴

"دار البلاغ" لاہور کی شہرت یافتہ معیاری کتابیں

خط کا جواب

؎ تری نوکِ قلم سے دل میں گہرے زخم آئے ہیں
ہزاروں نشتر مجھ سے خط کا جواب آیا
حضرت ایم - اسلم نے اسی شعر سے کتاب شروع کی ہے اور یہی اس کا موضوع ہے - مجلد قیمت - ۔ -|۸|۲

بادۂ گلرنگ

حضرت ایم - اسلم کے گیارہ دلچسپ افسانوں کا لاجواب مجموعہ - جس میں انسانی زندگی کے اسرار کو بے نقاب کیا گیا ہے - ہر افسانہ عبرت کا مرقع اور درد کی تصویر ہے - گرد پوش دیدہ زیب چہار رنگا - قیمت ۔ ۔ ۰|۱۲|۲

رنگین نظارے

حضرت ایم - اسلم کے افسانے پھولوں کی پتیوں کی طرح نازک - چاند کی کرنوں کی طرح لطیف - شفق کے گلابی آنچلوں کی طرح دل آویز اور حسین ہونٹوں کی غیر محدود مسکراہٹوں کی طرح پراسرار ہوتے ہیں - ان کے بیانات میں جھرنوں کی مترنم روانی ان کی زبان میں نسیم صبح کی مستی اور ان کے اسلوب میں پہاڑوں کی سی سنجیدگی اور سمندروں کی سی گہرائی ہے - رنگین نظارے ایسی ہی دس رنگین کہانیوں کا لاجواب مجموعہ ہے - مجلد رنگین گرد پوش قیمت صرف ۔ ۔ -|۸|۳

رُوپ سنگار

ڈاکٹر اعظم کریوی ان چند گنے چنے ادباء میں سے ہیں - جو طرزِ نگارش کے موجد سمجھے جاتے ہیں انہوں نے دیہاتی زندگی کی ترجمانی کی ہے - یہ انہی کے چودہ منتخب اور بے حد دلچسپ افسانوں کا دل آویز مجموعہ ہے مجلد رنگین گرد پوش - قیمت صرف ۔ ۔ ۔ -|-|۲

الطاف کے نغمے - الطاف مشہدی کے تازہ ترین کلام کا مجموعہ - قیمت -|۸|۱

اشک و شرر

کوثر چاندپوری کے پُر سوز و رقت انگیز افسانوں کا شاندار مجموعہ - رنگین گرد پوش - قیمت - ۔ -|۱۲|۲

ہماری زیرِ طبع کتابیں

- اشک و شرر (بار دوم) افسانے - از کوثر چاندپوری
- آخری رات ناول از ایم - اسلم
- راز و نیاز " از ایم - اسلم
- داسی " از ایم - اسلم
- شراب خانہ ساز افسانے از ایم اسلم
- پرُدسن افسانے از ایم - اسلم
- بچوں کی بارہ کہانیوں کا سیٹ } از ایم اسلم
- تعزیہ ناول از ابوالفضل صدیقی
- یادِ ایام ناول از انتصار میونتوی
- آوازیں - ریڈیائی ڈرامے - از انتصار میونتوی

رام کلی

اس تازہ ترین ناول میں نقاشِ فطرت حضرت ایم اسلم نے رومانوں کی دُنیا بسائی ہے اور اکبرہ محبت کی بہترین جذبات نگاری کی ہے - اس ناول کا ہیرو ایک اندھا خوبصورت نوجوان ہے جس کی شادی بچپن میں اس کے ساتھ کھیلی ہوئی لڑکی سے ہوتی ہے شادی کے بعد بدقسمتی سے لڑکا اندھا ہو جاتا ہے تعلیم ترک ہو جاتی ہے - لڑکی والے رخصتی سے انکار کر دیتے ہیں - لڑکی بڑی ہو کر حسن کا لاجواب نمونہ پیش کرتی ہے اور کالج میں اپنے خاوند کے دوست کے ہمراہ تعلیم پاتی ہے - مگر اس دوست کو یہ علم نہیں کہ یہ لڑکی اس کے دوست کی بیوی ہے - دونوں کی محبت کے پیشِ نظر اندھا نوجوان ایثار سے کام لیتا ہے اور انتہائی ضبط سے کام لے کر اپنے حق سے دست بردار ہو جاتا ہے - اندھے نوجوان کی ماں مر چکی ہے - سوتیلی ماں کی سختیوں اور ناکامی محبت سے تنگ آ کر وہ گھر سے ایک جوگی کے ہمراہ نکل جاتا ہے یہ اندھا ستار کا بہت شوقین ہے - اس کے مردانہ حسن اور موسیقی سے متاثر ہو کر رام کلی ایک دیہاتی حسینہ اس پر سو جان سے فریفتہ ہو جاتی ہے اس دلچسپ ناول کو پڑھ کر آپ جھوم جھوم جائیں گے - اندھے ہیرو کی بیوی کی کالج لائف کا نقشہ نہایت ہی دلکش انداز میں پیش کیا گیا ہے - کالج کی شوخ و شنگ جذباتی طالبات اور کھلنڈرے لڑکوں کی آپس میں چہلیں اور مخلوط تعلیم کے خوفناک نتائج کا نقشہ بھی ہی دلچسپ پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے - دلکش اور رنگین ناول گلمرگ (کشمیر) کی پُر فضا وادی میں لکھا گیا ہے - اس سے آپ اس شاندار ناول کی دلکشیوں کا اندازہ لگا سکتے ہیں - گرد پوش کی پھڑکا دینے والی تصویر رسالہ کے ٹائیٹل پر ملاحظہ فرمائیے مجلد قیمت -|۱|۳

جامِ شکستہ

غم و فراق کی بے چین کردینے والی یاس و حرماں کے مضطرب نالے ایک اچھوتی کتاب رنگین کی شکل میں پیش کئے گئے ہیں - حضرت ایم - اسلم کے گیارہ افسانوں کا تازہ ترین اور دلآویز مجموعہ - جس کا ہر افسانہ عشق و محبت میں ڈوبا ہوا ہے مجلد گرد پوش سہ رنگا -
قیمت صرف - -|-|۳

قاتل

حضرت ایم - اسلم کے سات دلکش افسانوں کا دلپذیر مجموعہ - آپ ان افسانوں کو پڑھ کر محسوس کریں گے کہ آپ افسانوں کی دُنیا میں حرکت کر رہے ہیں - مجلد قیمت -|۸|۲

مُرغی خانہ پر ہماری شاندار باتصویر کتابیں

طبیب مرغی خانہ حصہ اوّل قیمت -|-|۳ ✧ تجارتی مرغی خانہ حصہ دوم قیمت -|-|۲
کامیاب مرغی خانہ حصہ سوم قیمت -|-|۲ ✧ بطخ - فیل مرغ و دیگر پرندے قیمت -|-|۲ ✧ طبیب مویشی قیمت -|-|۲

محصول ڈاک بذمہ خریدار

ملنے کا پتہ :- منیجر دار البلاغ محمد نگر - میو روڈ - لاہور



ملنے کا پتہ :۔ کتب خانہ دارالبلاغ ۔ محمد نگر ۔ میورو' ۔ لاہور

Regd. No. L. 2027

کتب خانہ جامعہ ملیہ اسلامیہ
دہلی - قرولباغ



Printed at the Mahbob-ul-Matabe Press, Delhi & Published by
Shahid Ahmad B.A Hons from the officeof the "SAQI" Delhi
Only Cover Printed by Calcutta Art Press, Delhi